پیغمبرِ اعظم و آخر
صلی اللہ علیہ وسلم
ڈاکٹر نصیر احمد ناصر
Ferozsons Limited
فیروز سنز
لاہور - راولپنڈی - کراچی
Rs. 350.00

نَحمَدُہٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُولِہِ الکَرِیم

پیغمبرِ اعظم و آخر ﷺ

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

ایم۔ اے۔ ڈی لٹ

سابق وائس چانسلر

اسلامیہ یونیورسٹی۔ بہاولپور

فیروز سنز لمیٹڈ

لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی

بار اوّل ـــــــ ۱۹۸۸ء

مطبع :- فیروز سنز لاہور

کوڈ نمبر :-

مجلّد :- 969 0 00619 3

غیر مجلّد :- 969 0 00773 4

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمؐ

دیباچہ

عظیم انسانوں کے سوانح حیات پڑھنے کا مجھے بچپن ہی سے شوق رہا ہے۔ ہر سوانح عمری پڑھ کر ہمیشہ میرے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا کہ وہ شخص عظیم کیسے بن گیا؟ حبیبِ خداؐ محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ پڑھی تو پھر یہی سوال پیدا ہوا۔ عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ سیرتِ طیبہ پر نئی نئی کتابیں زیرِ مطالعہ آتی رہیں اور یہ سوال مختلف انداز سے اور زیادہ شدّت اختیار کرتا گیا، لیکن سیرت کی کتابوں میں اس کا تسلّی بخش جواب اس واسطے نہ مل سکا کہ ان سیرت نگاروں نے معجزہ اور نصرتِ الٰہی کو نبیؐ کی شخصیت سے جدا عامل بتانے کی کوشش کی ہے، حالانکہ نبیؐ کی ذات ہی معجزہ ہوتی ہے اور اس کی شخصیت ہی نصرتِ ایزدی کا پیکر ہوتی ہے۔ اس لیے جو کچھ آپؐ نے کیا یہ صرف آپؐ ہی کا کمال تھا، اسی لیے آپؐ کی سیرتِ طیبہ ہمارے لیے اُسوۂ حسنہ یا حسین نمونہؐ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ :

"یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ (کی زندگی) میں حسین نمونہ ہے، (لیکن اصل میں) اس کے لیے ہے، جسے اللہ سے ملنے اور آخرت کے دن (کے آنے) کی امّید ہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتا ہو۔" (الاحزاب - ۳۳ : ۲۱) ﴿

پھر اس سوال کا جواب معلوم کرنے کی خاطر میں نے آپؐ کی سیرتِ طیبہ کے حوالے سے قرآن مجید کے ایک ایک گوشے کا خلوصِ دل اور تحقیق کی نظروں سے مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ شب و روز کے مطالعہ و تفکّر سے میری حیرت بڑھتی گئی اور دل میں نئے نئے سوال پیدا ہوتے گئے۔ حیرت اس بات کی تھی کہ آپؐ اُمّی یعنی لکھے پڑھے نہ تھے۔ کسی سے تعلیم و تربیت نہ پائی تھی۔ آپؐ نے بچپن میں بکریاں چرائیں اور پھر سوداگری کی۔ چالیس برس تک آپؐ نے لوگوں میں ایک عام مگر اچھے، سچے، دیانت دار اور راست باز شہری کی طرح زندگی گزاری۔ پھر آپؐ نے ایک دن یکایک کیوں اعلان کر دیا کہ "میں اللہ کا نبی و رسولؐ ہوں"۔ پھر آپؐ نے تن تنہا کس برتے پر تحریکِ اسلامؐ کے ذریعے عالمی معاشرے میں ہمہ گیر چھا لیا تی

انقلابؐ لانے ، بنی نوع انسان کو شرک و بت پرستی کے اندھیروں سے نکالنے اور فرعونی، ہامانی اور قارونی طاقتوں کے پنجۂ استبداد سے نجات دلانے ، اور ان کے لیے ایک حسین و مثالی معاشرے کی تعمیر کرنے کا بیڑا اُٹھایا ، جس میں وہ عزت و احترام ، امن و سلامتی اور آزادی و اخوت کے ساتھ زندگی گزار سکیں ؟ پھر یہ کیوں اور کیسے ممکن ہوا کہ بائیس تیئیس برس کے اندر اندر انتہائی نامساعد و شکیب رُبا حالات اور تمام عرب کی مخالفت و جارحیت کے باوجود آپؐ اپنے اس بے مثال و تاریخ ساز مشن[8] میں کامیاب بھی ہو گئے ؟ نیز آپؐ نے اس دوران میں جو پیش گوئیاں کیں وہ سب کی سب سچی ثابت ہوئیں ؟ اس سے پھر دوسرے سوال پیدا ہوئے ، مثلاً :

(۱) جزیرہ نما عرب، جس میں ہمیشہ نراج (لاحکومتی) کی حالت رہتی تھی اور مرکزی حکومت کبھی قائم نہیں ہوئی تھی ، آپؐ نے اس میں کیسے اور کیونکر ایک ناقابلِ تسخیر قومی و مرکزی حکومت قائم کر دی ؟

(۲) عرب جو صدیوں سے تضاد و تخالف کا شکار اور باہم برسرِ پیکار رہتے تھے ، ان میں آپؐ نے کیسے اخوت و محبت اور وحدت و یک جہتی پیدا کر دی اور انھیں ملّی و قومی تشخص بخشا اور ایک متحد و ناقابلِ تسخیر ملت بنا دیا ؟

(۳) آپؐ نے وحشی و جنگجو قبائل کو کیسے دو عشروں کے اندر مہذب و ترقی یافتہ بنایا اور کیسے ان کی تعلیم و تربیت کی کہ تاریخ نے اقوامِ عالم کی امامت ان کو تفویض کر دی ؟

(۴) آپؐ نے کسی سے فنِ حرب میں نظری یا عملی تعلیم حاصل نہیں کی۔ ہجرت سے پہلے آپؐ نے جنگِ فجار کے سوا کسی جنگ میں حصہ نہ لیا تھا ، پھر یہ کیسے ہوا کہ آپؐ نے اپنے جنگی منصوبوں اور چالوں سے اپنے اندرونی و بیرونی دشمنوں کو مسخر کر کے انھیں تحریکِ اسلام میں شامل کر لیا ؟

(۵) یہ کیسے ہوا کہ آپؐ نے ایک عشرے کے اندر عرب کا بارہ لاکھ مربع میل علاقہ فتح کر لیا اور پھر اسے پہلی مرتبہ ایک آزاد و خود مختار جمہوریہ بنا دیا ؟

(۶) اگر اسلام دشمن مستشرقین[9] کے اس مفروضے کو بحث کی خاطر تسلیم کر لیا جائے کہ قرآنِ مجید اللہ تعالیٰ کی وحی و تنزیل نہیں بلکہ آپؐ کی تصنیف ہے تو پھر یہ کیسے ہوا کہ ایک ان پڑھ انسان ایسی کتاب تصنیف کرے جو علم و حکمت کا سرچشمہ ، بلاغت کا بے مثال نمونہ اور

رُشد و ہدایت کا نیّرِ درخشاں ہے ، اور جس نے اپنی صداقت کے ثبوت میں چودہ صدیوں سے زمانے کو یہ چیلنج دے رکھا ہے کہ اس کے مقابلے کی ایک سورت یا ایک آیت ہی لکھ کر دکھا دے[10]۔

(۷) اسلام کے منکروں کے اس دعوے کو تسلیم کیا جائے کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول اور نبی نہیں تھے تو پھر ضروری تھا کہ حکومت حاصل کرنے کے بعد آپؐ بادشاہوں کی طرح عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ، لیکن آپؐ نے کیوں ایسا نہیں کیا ؟ اس کے برعکس آپؐ کیوں عمر بھر اللہ تعالیٰ کی عبادت اور خدمتِ خلق میں مشغول رہے ؟ آپؐ نے کیوں زُہد و تقویٰ ، امانت و دیانت اور صداقت و صالحیت کو اپنا شعار بنایا ؟ حکومت و امانت اور مال و دولت ملنے کے باوجود آپؐ نے کیوں فقر و فاقہ کی زندگی کو پسند کیا اور کیوں آپؐ نے اپنے اہل و عیال کے لیے حکومت اور مال و دولت کو پسند نہ کیا اور اُن کے لیے ترکے میں کچھ نہ چھوڑا ؟ سب سے بڑھ کر یہ کہ آپؐ نے کیوں ہر حال میں دُنیوی زندگی پر اُخروی زندگی کو ترجیح دی ؟

(۸) حیرت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آپؐ نے عمر بھر نہ لکھا نہ پڑھا ، لیکن اس کے باوجود آپؐ نے قرآنِ حکیم ایسی عظیم و بے مثال کتاب ، جو علم و حکمت کا سرچشمہ ہے ، لوگوں کو سکھائی اور اس کے علوم و معارف اور مطالب و معانی سے انھیں آگاہ کیا اور اس کی تفسیر میں علم و حکمت کے وہ گراں بہا ملفوظات چھوڑے جنھیں "احادیث" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(۹) حیرت کا ایک مقام یہ بھی ہے کہ آپؐ کی ذاتِ اقدس میں وہ اوصافِ حمیدہ اور کمالاتِ حسنہ کیسے مجتمع ہو گئے جو کسی انسان میں آج تک جمع نہیں ہوئے اور جن کی بدولت آپؐ عظیم و بے نظیر مفکر و حکیم ، ہادی و رہنما ، مصلح و معلمِ انسانیت ، مدبر و سیاستدان ، ماہرِ حربیات و سپہ سالار ، فاتح و حکمران ، منتظم و قاضی اور ماہرِ معاشیات و اخلاقیات بن گئے ، اور تاریخ نے آپؐ کو عظیم و عہد آفرین شخصیت ، رحمۃ للعالمین اور پیغمبرِ اعظم و آخرؐ تسلیم کر لیا ؟

شاید میری یہ حیرت اس دانا و بینا اور بزرگ و برتر ہستی کو پسند آ گئی جو سب کا اِلٰہ و رب ہے کہ اس نے مجھے ان سوالوں کے حوالے سے آپؐ کی سیرتِ طیبہ لکھنے کی توفیق بخشی۔

۱۹۵۸ء کا واقعہ ہے۔ کوئٹے کے ایک ریستوراں میں چند دوست خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ ان میں ایک لادین قسم کا انگریزی خواں نوجوان بھی تھا' جسے اسلام کے خلاف زہر چکانی اور بحث و نزاع کی عادت تھی۔ ان دوستوں کے اصرار پر میں ان کے ساتھ چائے پینے لگا تو اس نوجوان نے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا اور مجھ سے سوال پوچھا : یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ دنیا میں بڑے بڑے عالم و فاضل ، حکیم و دانا' مدبّر و سیاست دان ، اہلِ قوت و اقتدار اور زاہد و عابد انسان موجود تھے ، ان کے ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے کیوں اور کیسے صحرائے عرب کے ایک ان پڑھ شخص کو نبوّت عطا کی اور اسے پیغمبرِ اعظم و آخر بنایا؟ ساتھ ہی اس نے دوسرا سوال بھی پوچھ لیا کہ آپ کے پاس اس بات کی کیا دلیل ہے کہ قرآن کلامِ الٰہی ہے؟ میرے نزدیک تو یہ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی تصنیف ہے۔

میں اس کے ان غیر متوقع سوالوں کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھا۔ لیکن بات اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی تھی ، لہٰذا میں نے ان سوالوں کے جو جواب دیے' ان کا خُلاصہ یہ ہے :

اگر اللہ تعالیٰ پر تمھارا ایمان ہوتا تو میرا یہ جواب ہوتا کہ اللہ تعالیٰ علیم و حکیم اور قادرِ مطلق ہے۔ اس کی جو مرضی تھی ، اس نے کیا اور اس کی مشیّت کو کوئی بندہ چیلنج نہیں کر سکتا اور نہ یہ اس کا منصب ہی ہے۔ لیکن چونکہ تم دولتِ ایمان سے محروم ہو اس لیے اس کا منطق کی رُو سے جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے منصبِ نبوّت کے لیے آپؐ کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ آپؐ دنیا کے تمام انسانوں سے زیادہ اس منصب کے اہل و حقدار تھے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ آپؐ کو چالیس برس کی عمر میں نبوّت عطا ہوئی یا بقول تمھارے آپؐ نے اس کا دعوٰی کیا تھا اور جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہے صرف بائیس تیئیس برس کے اندر آپؐ تحریکِ اسلام کے ذریعے کُل عالمِ انسانی کے لیے عرب بھر میں عالم گیر و ہمہ گیر اور تاریخ ساز جمالیاتی انقلاب لے آئے ، اس معاشرے کو طاغوتی و استحصالی قوتوں سے پاک و صاف کیا اور خالص توحید ، حُسن و صداقت ، اخوت و مساوات او محبّت و رحمت کی بنیادوں پر ایک ایسے معاشرے کی تشکیل و تعمیر کی جو ہر اعتبار سے مثالی یعنی تمام اقوام کے لیے حسین نمونہ (ماڈل) تھا۔ اس طرح آپؐ نے جس بات کا دعوٰی کیا تھا ، اسے سچا کر دکھایا۔ آپؐ کا یہ تاریخ ساز کارنامہ خود اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ آپؐ ہی حقیقت میں نبوّت کے سزاوار و مستحق تھے' اور اللہ تعالیٰ کا انتخاب نہ تو غلط ہو سکتا تھا اور نہ ہوا۔ اب تم بتاؤ کہ اس زمانے میں کسی اور شخص نے دُنیا بھر میں اس شان کا کوئی کارنامہ سرانجام

دیا جس کی بنا پر اسے آپؐ سے زیادہ نبوّت کا اہل و حقدار سمجھیں ؟ اس کا جواب اس کے پاس حیرت و سکوت کے سوا کچھ نہ تھا۔

دوسرے سوال کے جواب میں مَیں نے کہا : تمھارا یہ دعوٰی کہ قرآنِ مجید کلامِ الٰہی نہیں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تصنیف ہے' دو حال سے خالی نہیں : ایک یہ کہ آپؐ نے اَن پڑھ ہو کر علم و حکمت کی ایسی سچی ، پاکیزہ ، بلیغ اور بے مثال کتاب اس لیے تصنیف کی کہ آپؐ کو کسی مافوق البشر قوت کی تائید و نصرت حاصل تھی ، یا یہ کہ آپؐ خود مافوق البشر تھے اور آپؐ پر اللہ تعالیٰ نے اپنا کلام بذریعہ وحی نازل کیا تھا جو حسین و مطمئن اور خوشحال و کامیاب زندگی گزارنے کی رہنما کتاب ہے ، اور جس کے اصولوں پر عمل پیرا ہو کر آپؐ ایک عالم گیر و ہمہ گیر تاریخ ساز جمالیاتی انقلاب لانے اور مثالی معاشرے کی تشکیل و تعمیر کرنے میں کامیاب ہوئے۔ قرآنِ مجید نے اپنے من جانب اللہ ہونے کی دلیل میں یہ دعوٰی کیا تھا کہ ایک کیا بہت سے اشخاص مل کر بھی کوشش کریں تو اس جیسی کتاب کیا' اس کی چھوٹی سے چھوٹی سُورت جیسی کوئی سُورت تصنیف نہیں کر سکتے۔ یہ دعوٰی کیے چودہ سو برس ہو چکے ہیں۔ عرب و عجم میں عربی زبان کے بڑے بڑے مصنّف' شاعر ، ادیب ، خطیب اور عالم و حکیم گزرے ہیں لیکن کسی کی تصنیف آج تک قرآن حکیم کے دعوے کو جُھٹلا نہیں سکی۔ بڑے بڑے اسلام دشمن مستشرقین آج تک اس چیلنج کا جواب نہیں دے سکے۔ کیوں ؟ اس لیے کہ قرآنِ مجید کلامِ الٰہی ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک ان پڑھ شخص ، جس نے عمر بھر نہ لکھا' نہ پڑھا۔ جس کا نہ کوئی اُستاد تھا اور نہ وہ کسی کا شاگرد ، اور جس کا بچپن صحرا میں بکریاں چرانے اور جوانی تجارت اور رفاہِ عامہ کے کام کرنے میں گزری ، کیسے ایسی کتاب تصنیف کر سکتا تھا' جس کا آج تک جواب پیدا نہ ہوا' اور جس کے علوم و فنون ، معارف و حقائق اور بلاغت و فصاحت پر لاکھوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں ؟

یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ علم و حکمت اور فصاحت و بلاغت کے اس بے مثل شاہکار کو ، جو انقلاب آفریں و تاریخ ساز تھا' آپؐ نے کیوں اپنی تصنیف نہیں کہا بلکہ کلامِ الٰہی کہا ؟ عقلِ سلیم کا جواب یہ ہے کہ ایسی عظیم و عہد آفریں' صاحبِ حُسن و سرور ، رحمۃ للعالمین اور امین و صادق شخصیت کے مُنہ سے سچ کے سوا کوئی بات نہ نکل سکتی تھی اور نہ نکلی۔ اس سلسلے میں ایک اور بات بھی قابلِ توجّہ ہے۔ اہلِ ذوق و نظر آیاتِ قرآنی اور احادیث

طیبہ میں واضح فرق محسوس کرتے ہیں، حالانکہ دونوں کلام ایک ہی زبانِ مبارک سے نکلے ہیں۔ ایسا کیوں ہے کہ انھیں ایک کلام الہامی و سماوی اور دوسرا انسانی و زمینی محسوس و معلوم ہوتا ہے؟ ایک میں کیوں اللہ تعالیٰ اور دوسرے میں کیوں اس کا رسول بولتا محسوس ہوتا ہے؟ کیا یہ فرق اس حقیقت کا زندہ ثبوت نہیں ہے کہ قرآنِ مجید کلامِ الٰہی اور احادیثِ طیبہ کلامِ نبویؐ ہیں؟

بہرحال، یہ بات خاص طور سے سیرت کے طالبِ علم اور قاری کے ہمیشہ پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ آپؐ نے بنی نوعِ انسان کے لیے ایک ایسی کتاب چھوڑی ہے جو علم و حکمت کا سرچشمہ اور زندگی کے راہنما اصولوں کی زندۂ جاوید کتاب ہے، جو زندگی کے ہر گوشے میں افراد اور قوموں کی رہنمائی کرتی اور انھیں منزلِ مقصود پر پہنچاتی ہے، جو حق و باطل، حسن و قبح، اور خیر و شر کا عالمگیر فطری معیار ہے، جو انسان کے جذبۂ عبودیت کی تشفّی کر کے اسے طمانیت بخشتی اور اسے اس کے حقیقی اِلٰہ سے ملا کر اسے عارف و اہلِ نظر اور صاحبِ حُسن و سرور بناتی ہے۔ مختصر یہ کہ وہ افراد اور اقوام دونوں کو عظیم و کامیاب بناتی اور انھیں امن و سلامتی سے زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔ یہ کتاب قرآنِ حکیم ہے جس کی عملی و حسین تفسیر کبیر کو سیرتِ رسولؐ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جسے اس کے حقیقی جمالیاتی تناظر میں پیش کرنے کی کوشش کا حاصل یہ کتاب ہے جسے پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے نام سے موسوم کیا ہے۔

وحُوش و طیُور کو سدھانا اتنا مشکل نہیں جتنا انسان کو سدھانا۔ بگڑے ہوئے انسان کو انسان بنانا، تین وجُوہ سے ازبس دُشوار ہوتا ہے۔ اوّلاً وہ قلب یعنی عقل و فکر، ارادہ و اختیار، نظریات و اعتقادات اور جذبات و تعصبات (عصبیّتیں) اور حافظہ رکھتا ہے۔ ثانیاً انسان جب اپنے مقامِ انسانیت سے گِرتا ہے تو بہیمیّت کی انتہائی پستیوں میں پہنچ جاتا ہے اور وہاں سے اسے نکالنا اور پھر مقامِ انسانیت پر متمکّن کرنا ہوتا ہے۔ ثالثاً جب کوئی معاشرہ بہیمیّت کے تحت الثریٰ میں گِر چکا ہو تو اسے انسانیت کے بلند مقام پر پہنچانا اور بھی زیادہ مشکل کام ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کو ایسے ہی غیر معمُولی نوعیت کے مشکل کام کے لیے مبعوث فرمایا تھا اور آپؐ کی نبوّت کی صداقت کی ایک ناقابلِ تردید اور بصیرت افروز دلیل یہ ہے کہ آپؐ نے اس کام کو جسے دنیا ناممکن سمجھتی تھی، ایسے حسین و کامیاب طریق سے سرانجام دیا کہ تاریخ اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔

مارکسیّت[11] بھی ایک انقلابی تحریک ہے، لیکن یہ تحریک روحانی لحاظ سے منفی اور مادّی اعتبار سے مُثبت ہے کیونکہ یہ روحانی اور مطلق و عالمگیر قدروں[12] کی منکر ہے، لہٰذا اس کے نزدیک بگڑا ہوا معاشرہ وہ ہے جس میں لوگوں کا مادّی طور سے استحصال ہوتا ہو اور اس کی اصلاح کا منہاج ایسا معاشی انقلاب ہے جس کے ذریعے استحصالی قوتوں کا استیصال کر دیا جائے۔ مختصر یہ کہ مارکسی نظامِ فکر میں فرد کی روحانی و اخلاقی اصلاح کا کوئی مُثبت تصوّر نہیں ہے۔ اس کے برعکس اسلام کے نزدیک کسی معاشرے کی اصلاح کا منہاج موضوعی معروضی جمالیاتی انقلاب[13] ہے، جسے دینی انقلاب سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ موضوعی انقلاب سے مُراد یہ ہے کہ انسان میں اپنی ذات کا اور معاشرے میں اپنی حالت کا شعور اور اس حالت کو بدلنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔ معروضی انقلاب سے کُل معاشرتی انقلاب مُراد ہے یعنی ثقافتی، معاشی، سیاسی، تمدّنی، تہذیبی، علمی، ادبی، فنّی وغیرہ۔

انقلاب عموماً انقلابی تحریک کے ذریعے لایا جاتا ہے، اور تحریک ایسی مستقل حرکتِ عمل سے عبارت ہے جس کا محرّک اس کا نعرہ[14] ہوتا ہے اور یہ نعرہ تحریک کے عقایدِ جلیلہ و محرّکہ اور نصب العین کی علامت ہوتا ہے۔ اس سے یہ مستنبط ہوا کہ موضوعی انقلاب میں جہاں کسی قوم میں اپنی موجودہ حالت کے بدلنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے، وہاں اس میں اس تحریک کے اعتقاداتِ جلیلہ و محرّکہ کو قبول کرنے اور داعیِ انقلاب کے نقشِ قدم پر چلنے کی امنگ بھی پیدا ہوتی ہے جو تسلیم و رضا کے بعد ایقان و اذعان (ایمان) کے درجے کو پہنچ جاتی ہے۔ اس اعتبار سے اسلام حقیقی معنوں میں ایک انقلابی جمالیاتی تحریک ہے، جس کا مقصد افراد کے قلوب کی اصلاح کر کے ان کے اخلاق کو عظیم اور کردار کو حسین بنانا، اور ان کے لیے استحصالی (اصطلاحِ قرآنی میں فرعونی، ہامانی، قارونی) قوتوں سے پاک و صاف ایک ایسا حسین معاشرہ تعمیر کرنا ہے جس کا اِلٰہ (معبُود و محبُوب اور مطلُوب و مقصُود) اور ربّ (رزاق و پروردگار اور آقا و مالک) صرف اور تنہا اللہ تعالیٰ ہو۔ مختصر یہ کہ تحریکِ اسلام کی غایت بنی نوعِ انسان کی موضوعی و معروضی دونوں حالتوں کی اصلاح کرنا اور انھیں حسین طریقے سے انفرادی و اجتماعی زندگی کے قابل بنانا ہے۔ اسلام کے نزدیک حسین طریقے سے زندگی گزارنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے اِلٰہ و ربّ کی یاد و پرستش سے اپنے دل کی دُنیا کو حسین و منوّر اور مطمئن و مسرور بنائے اور پھر اس کی خوشنودی کے لیے اس کے احکام و قوانین کے مُطابق لوگوں کے

ساتھ عدل و احسان کرتا رہے، یعنی ان کی زندگیوں کو حسین و منوّر اور مطمئن و مسرور بنانے کی کوشش کرے۔ مختصر یہ کہ انسان کو صاحبِ حُسن و سرور، محسنِ انسانیت اور عظیم و آفاقی بنانا تحریکِ اسلام کی غایت ہے۔ آپؐ کو چونکہ رحمۃ للعالمین بناکر مبعوث کیا گیا تھا، اس رعایت سے تحریکِ اسلام کو تحریکِ رحمۃ للعالمینی سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے، جس میں شامل ہو کر انسان مسلمان کہلاتا ہے۔ تحریکِ اسلام میں شامل ہونے کا مطلب ہے اس کے عقاید و تعلیمات کو دل و جان سے ماننا اور اس کا زبان و عمل سے اظہار کرنا اور اپنے کُل وسائل کے ساتھ اس سے تعاون کرنا، جس کی بہترین مثال ہمیں آپؐ کی سیرتِ طیّبہ میں ملتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ آپؐ کی تحریکِ اسلام کا ایک بنیادی مقصد انسان کو استحصالی قوتوں سے نجات دلانا اور اسے معاشرے میں آزادی و عزت کا حسین مقام دلانا تھا اور وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہو گئی۔ لیکن معاشرتی زندگی کے تقاضوں اور ذمّے داریوں کی نوعیّت کچھ ایسی ہے کہ آزادی نہ تو مطلق و غیر محدود ہو سکتی تھی اور نہ ہوئی۔ جس طرح انسان کی سوچ، اختیار، انتخاب، قوّت، قابلیت، استعداد محدود ہے، اسی طرح اس کی آزادی بھی محدود ہونی چاہیے تھی، اور ہے۔ انسان میں جنگلی زندگی سے متمدّن و مہذّب زندگی کی طرف سفر کے دوران میں ایک تو معاشرتی زندگی کی ذمّے داریوں کا اور دُوسرے اپنی آزادی کے تحفّظ کی خاطر دوسروں کی آزادی کے احترام کا شعُور بیدار ہوا اور اس کا یہ شعور ہی اس کی آزادی کے حدود کی تعیین و تحدید کرتا ہے۔ یہ تعیین و تحدید ہی دراصل آزادی کا وہ حصار ہے جو اس کی حفاظت و احترام کا ضامن ہے۔ اس اصول کا اطلاق فرد اور قوم دونوں کی آزادی پر ہوتا ہے۔

تمام حیاتیاتی وجودوں میں سب سے زیادہ مجبور و محتاج وجودِ انسانی ہے۔ انسان اپنی پیدائش سے لے کر بلوغت تک اپنی جسمانی بقا اور حِسّی و قلبی نشو و نما کے لیے دوسروں کا اس قدر محتاج رہتا ہے کہ دوسرا کوئی حیاتیاتی وجود اتنا محتاج نہیں ہے۔ احتیاجات کی فراوانی و بوقلمونی نے ایک طرف انسان کی ذمہ داریوں میں اسی نسبت سے اضافہ کر دیا ہے اور دوسری جانب اس کی آزادی کے آفاق محدود و متعیّن کر دیے ہیں۔ اطلاق کا تعیّنات کو قبول کرنا فطری تھا کیونکہ اس کے بغیر انسان معاشرتی زندگی کی ذمہ داریوں کو قبول نہیں کر سکتا تھا اور نہ اس میں دوسروں کی آزادی کے احترام کا شعور ہی پیدا ہو سکتا تھا۔ اس سے منطقی طور پر یہ

نتیجہ نکلا کہ تہذیب و تمدّن کی ترقی سے انسان کی معاشرتی ذمہ داریوں میں اضافہ اور اس کی آزادی کے حدود میں تحدید و تعیین ہوتی جاتی ہے۔

اسلام دیگر تمام ادیان و مذاہب، مکاتبِ فکر اور ازمز[15] سے زیادہ انسانی آزادی کا احترام کرتا ہے۔ انسان سے متعلّق اس کا رویّہ یہ ہے کہ وہ محترم و مکرّم ہستی ہے، یہ کائنات اپنی کل نعمتوں کے ساتھ اس کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ لہٰذا عالمِ زمان و مکان کو اس کے لیے مسخّر کر دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کائنات کی چیزوں میں مسخّر ہونے کی قابلیّت ہے، اسی طرح انسان میں انھیں مسخّر کرنے کی استعداد ہے، جسے قوّت سے فعل میں لانا اس کی اپنی ذمّے داری ہے۔ انسان کے اندر طرح طرح کی استعدادوں کے خزینے ودیعت کیے گئے ہیں، جنھیں تعلیم و تربیت اور تزکیۂ نفس سے قوّت سے فعل میں لایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کا اِلٰہ ہی نہیں اس کا ربّ بھی ہے، اس لیے اس نے بنی نوعِ انسان کی تعلیم و تربیت اور تزکیہ کے لیے انھیں میں سے اپنا ایک نمائندہ منتخب کیا اور اسے نبوّت و رسالت کی ذمّے داریاں تفویض کیں۔ یہ ذمّے داریاں چونکہ بے حد اہم و عظیم تھیں، لہٰذا ان سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے اس پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کو رحمۃ للعالمین[16] بنا کر مبعوث فرمایا۔ دُوسروں کے لیے رحمت بننے کی ایک ناگزیر شرط یہ ہے کہ انسان طبعاً اخلاقِ حسنہ کا مالک ہو، لہٰذا آپؐ صاحبِ خُلقِ عظیم[17] تھے۔ آپؐ کا خُلق اس قدر حسین و عظیم تھا کہ اس کی تاثیرِ حُسن یعنی رحمت تمام جہانوں کو محیط تھی اور ہے۔

اسلام نے انسان کو اس کی آزادی کی ضمانت عقیدۂ توحید سے فراہم کی ہے۔ اس ضمانت کی ایک امتیازی خصُوصیت یہ ہے کہ انسان جب تک خود اس عقیدے کو اپنی زندگی سے نہیں نکالتا، اس کی آزادی کو کوئی گزند نہیں پہنچتا۔ عقیدۂ توحید کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس نے معاشرے میں انسان کی حیثیت اور حدودِ آزادی کی تعیین کر دی ہے۔

انسان کی حیثیت یہ ہے کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کا عبد اور مربوب ہے، لہٰذا کوئی شخص، ہستی یا شے اس کا اِلٰہ یا رب نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ یہ حیثیت عقیدۂ توحید نے متعیّن کی ہے جس کی علامت یہ کلمۂ طیّبہ ہے: لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں ہے۔ اس "لا" نے اسلامی یا انسانی معاشرے میں کسی فرعون، ہامان یا قارُون کے لیے قطعاً گنجائش نہیں چھوڑی، اور اس طرح استحصالی و طاغوتی قوتوں کا سدِّباب کر دیا۔ اس

سے اسلامی اور غیر اسلامی معاشرے میں امتیاز کرنے کا معیار فراہم ہوتا ہے کہ جس معاشرے میں فرعون، ہامان یا قارون ہوں وہ توحید پرست یا اسلامی نہیں ہو سکتا۔ اس سے یہ مستنبط ہوا کہ توحید پرست معاشرہ ان استحصالی و طاغوتی قوتوں سے منزّہ ہوتا ہے جو افراد کی آزادی کو پامال اور ان کے حقوق کو سلب کرتی ہیں۔

توحید انسان کی فطری آزادی کی ضمانت دیتی ہے اور فطری آزادی سے مراد ایسی متعیّن و محدود آزادی ہے جسے انسان طبعاً اپنے لیے اختیار یا پسند کرتا ہے۔ انسان چونکہ یہ پسند نہیں کرتا کہ کوئی دوسرا اس کی آزادی کو پائمال یا سلب کرے، اس لیے وہ دوسروں کی آزادی کا احترام کرنے پر مجبور ہے اور اس مجبوری نے انسان کے اخلاق میں رفعت و عظمت پیدا کرنے اور اسے مہذّب بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اسلام انسان کی آزادیِ بیان و ابلاغ کے حق کو تسلیم کرتا ہے، لیکن وہ اس آزادی کے غلط استعمال کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ انسان کو دوسروں سے حُسن و خوبی اور حق و صداقت کی باتیں کرنے کی اجازت تو دیتا ہے، لیکن قبیح و شر انگیز باتیں کہنے سے منع کرتا ہے۔ اسی طرح اسلام انسان کو کسب کی آزادی تو دیتا ہے، لیکن کسبِ حرام کی آزادی نہیں دیتا۔ اسلام میں انسان کو دوسروں کے ساتھ عدل و احسان کرنے کی تو آزادی ہے، لیکن اسے ظلم و استحصال کرنے کی آزادی نہیں ہے۔ اسلام انسان کو اپنی پسند کا مذہب یا دین اختیار کرنے کی اجازت تو دیتا ہے، لیکن اس حق سے دوسروں کو محروم کرنے کی اسے اجازت نہیں دیتا۔ اسلام کیوں آزادی کو متعیّن و محدود یا مشروط کرتا ہے؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ انسان جو چیز اپنے لیے پسند کرتا ہے اسے دوسروں کے لیے بھی وہی چیز پسند کرنی چاہیے۔

دورِ حاضر کا نوجوان مطلق آزادی کی باتیں اور مطالبہ کرتا ہے، حالانکہ وہ دل سے اس آزادی کا قائل نہیں ہے، لیکن اسے اس کا شعور نہیں ہے۔ وہ صرف اپنے سفلی جنسی جذبات کی تسکین کے لیے ایسی مطلق آزادی کا طلب گار ہے جو شاید بہائم و طیور کو بھی حاصل نہ ہو۔ اس کی یہ طلب جھوٹی ہے، کیونکہ وہ دوسروں کو ایسی مطلق آزادی دینے کے لیے طبعاً آمادہ نہیں ہو سکتا۔

اسلام اپنے عقیدۂ توحید کے ذریعے فرد و قوم کو آزادی کی ضمانت تو دیتا ہے، مگر دوسروں کی آزادی کے تحفّظ کی خاطر ان کی آزادی کو حقوق اللہ اور حقوق العباد کی شرط سے

مشروط کرتا ہے۔ یہ شرط بظاہر انسان کی آزادی کی تحدید ہے لیکن حقیقت میں اس کی آزادی کی توسیع ہے کیونکہ یہ فطری ہے۔ ان حقوق کے احترام سے انسان میں اپنے مقامِ عبدیّت کا شعور جاگ اٹھتا ہے اور پھر اس شعور سے اس کی آرزوئے الٰہ بھی زندہ و بیدار ہو جاتی ہے، اور اس کا نتیجہ اللہ تعالیٰ اور اس کی حسین ترین مخلوق انسان کی محبت کی صورت میں نکلتا ہے۔ اس "مکمل" محبت سے اس کے دل کی دنیا روحِ الٰہی اور روحِ انسانیت سے معمور ہو جاتی ہے اور انسان کو تنہائی میں بھی احساسِ تنہائی نہیں ہوتا۔[۱۸]

عصرِ حاضر کے انسان کا سب سے بڑا روگ احساسِ تنہائی ہے، اور اس کا حقیقی سبب "مکمل محبت[۱۹]" کا فُقدان یا کمی ہے۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر معلوم کریں گے، آپؐ کی سیرتِ طیبہ کا سب سے نمایاں اور اہم ترین پہلو محبت آفرینی ہے۔ آپؐ نے عرب ایسے سرکش و قسی القلب انسانوں میں مکمل محبت کی شمع روشن کی۔ جس کے سوز سے ان کے دلوں میں ایک طرف تقوٰی اور دوسری جانب غمِ انسانیت پیدا ہوا اور وہ اپنے مقامِ عبدیّت پر متمکّن ہو کر دوسروں کے لیے "رحمت" بن گئے۔ یہ شمعِ محبت، جس کے مقدّر میں بُجھنا نہیں ہے، انسانیّت کے کسی نہ کسی گوشے میں روشن رہتی ہے اور اس سے دُوسرے عوالم کی مخلوق بھی مستفید ہوتی ہے۔ یہ آپؐ کی تحریکِ رحمۃٌ للعالمینی[۲۰] کا عالمگیر و سرمدی فیضان ہے۔

عظیم انسان وہ ہیں جو دوسروں کے لیے جیتے ہیں اور ان کے سوانحِ حیات ہمیں اس حقیقت کی یاد دہانی کراتے ہیں کہ ہم بھی اپنی زندگیوں کو عظیم بنا سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے ان کا مطالعہ ازبس مفید اور اہم ہے اور اسی نقطۂ نظر سے کرنا بھی چاہیے۔ جہاں تک دنیا کے عظیم ترین انسان اور پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کا تعلق ہے، اس کا مطالعہ مُسلمانوں پر فرض ہے، کیونکہ وہ اُن کے لیے "اُسوۂ حسنہ" یعنی حسین نمونہ ہے۔ ظاہر ہے جب تک آپؐ کی سیرتِ حسنہ کا گوشہ گوشہ ہمارے پیشِ نظر نہیں ہوگا ہم کیسے اپنی زندگی کو اس کے مطابق ڈھال سکیں اور اپنے فکر و عمل کی راہوں کو متعیّن کر سکیں گے؟ غیر مسلم قاری کی حیثیت سے بھی آپؐ کی سیرتِ طیبہ کا مطالعہ ازبس افادیّت و اہمیّت رکھتا ہے، کیونکہ آپؐ بلاشبہ ہر لحاظ سے عظیم اور ہر زمان و مکان کے لیے مثالی انسان تھے، ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ آپؐ عالمِ انسانیت میں جو انقلاب لائے، وہ ہمہ گیر و عالمگیر اور حسین ہے اور اس نے ذہنِ انسانی پر یہ حقیقت آشکارا کی کہ زندگی ایک نامیاتی تامّہ[۲۱] اور وحدت ہے،

نیز وہ جمیل و جلیل اور حرکی و ارتقائی ہے، اور اس کی حرکت و گردش کا ایک محور ہے جو اللہ تعالیٰ ہے اور صرف وہی اس کا اِلٰہ (معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود) اور ربّ (نشو و ارتقا کرنے والا آقا و مالک) ہے۔ اس جمالیاتی دینی انقلاب نے انسان کی موضوعی یعنی حسّی و قلبی اور معروضی یعنی معاشرتی دنیا پر ایسے حسین و گہرے اثرات مرتب کیے ہیں جو انمٹ ہیں۔

اصل یہ ہے کہ اسلام کا جمالیاتی انقلاب زندگی کے کسی ایک شعبے میں نہیں تھا، بلکہ تمام شعبوں میں تھا اور یہی اس کی ازبس اہم اور امتیازی خوبی ہے۔ اس کی دوسری اہم خوبی یہ ہے کہ وہ فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ تھا، یعنی فطرتِ انسانی اپنی موضوعی و معروضی[۲۲] دنیا میں جس قسم کی حسین تبدیلیوں کی طلب و آرزو رکھتی تھی، اسلام کی تحریکِ رحمۃٌ للعالمینی اس قسم کی تبدیلیاں لائی۔ اس میں شک نہیں کہ انسان کے فطری تقاضوں کی فہرست طویل ہے مگر اس کا اہم بنیادی تقاضا "سلامتی" ہے، جسے موضوعی لحاظ سے "طمانیتِ دل" اور معروضی اعتبار سے "امن" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چونکہ اسلام کا اوّلین اور بنیادی مقصد "سلامتی" ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس دین کو "اسلام" اور اس کے پیروکاروں کو "مسلم" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ سلامتی محض انسان ہی کے لیے نہیں بلکہ کُل مخلوقات کے لیے رحمت ہے، اس لیے ربُّ العالمین نے اپنے آخری پیغمبرِ اسلام صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کو رحمۃٌ للعالمین بنا کر بھیجا تھا، اور اس نسبت سے ہم نے آپؐ کی تحریکِ اسلام کو "تحریکِ رحمۃٌ للعالمینی" سے تعبیر کیا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ آپؐ ایک ایسا ہمہ گیر جمالیاتی انقلاب لائے جس کی حریف نہ تو عرب کی جنگجویانہ خصلت، حرّیت پسند طبیعت اور قبائلی عصبیت ہی ہو سکی اور نہ قیصر و کسریٰ کی قوّت و سطوت اور عجمی ثقافت ہی۔ ایسا کیوں اور کیسے ہوا؟ آپؐ اُمّی یا ناخواندہ تھے، لیکن اس کا راز کیا ہے کہ آپؐ نے حیاتِ انسانی کے دامن کو علم و حکمت کے سچے موتیوں سے بھر دیا اور مکارمِ اخلاق کی تکمیل کر دی، نیز انسان کو مہذّب با ذوق بنا دیا اور ایسا حسین و حرکی معاشرہ تعمیر کیا جس میں فرعونیت، ہامانیت اور قارونیت کے داخل ہونے کی تمام امکانی راہیں مسدود کر دی گئی تھیں۔ یہ وہ بنیادی مسائل ہیں جو ہماری تفتیش و تحقیق کا مقصود ہیں اور اسی حوالے سے ہم نے آپؐ کی سیرتِ طیبّہ لکھنے کی جسارت کی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ جسارت مجھ جیسا کم علم و کم نظر کیسے کر سکتا تھا، اگر "اُدھر" سے اشارہ نہ ہوتا۔[۲۳]

پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کی سیرتِ طیبّہ پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں اور

لکھی جائیں گی، اس لیے کہ آپؐ "محمّدؐ" ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو "مقامِ محمود"[۲۴] پر متمکن فرمایا ہے۔ لہٰذا زبان و قلم دونوں آپؐ کے اوصافِ حمیدہ بیان کرتے رہیں گے۔ آپؐ کی شخصیت بے حد عظیم، پہلودار اور جامع ہے، لہٰذا اس کے نئے نئے گوشوں کا سُراغ ملتا رہے گا اور دنیا اس سے مستفید ہوتی رہے گی۔ اسلام عالمگیر و ہمہ گیر دینی تحریک ہے، جس کی الہامی کتاب قرآنِ حکیم ہے، جو ہر زمان و مکان کے انسان کی ہر گوشۂ حیات میں رہنمائی کرتا رہے گا۔ اس زندہ کتاب کی زندہ تفسیر آپؐ کی سیرتِ طیبّہ ہے۔ اس سے یہ مستنبط ہوا کہ آپؐ کی سیرت کُل حیاتِ انسانی کی زندہ تفسیر ہے جو حسین، جامع اور سچّی ہے۔ اس لحاظ سے دینِ فطرت یا اسلام، قرآنِ مجید اور سیرتِ طیبّہ ایک ہی سلسلے کی تین مربوط و لاینفک کڑیاں ہیں۔

دنیا میں ایسے انسانوں کے سوانح موجود ہیں جن کو اہلِ دنیا نے عبقری یا عظیم تسلیم کیا ہے۔ ان میں کوئی عالم و حکیم ہے تو کوئی حکیم و فنکار، کوئی شاعر و ادیب ہے تو کوئی موجد و مخترع، کوئی سائنسدان و صنّاع ہے تو کوئی شہنشاہ و فاتح، کوئی سپہ سالار و پہلوان ہے تو کوئی زاہد و متقی، کوئی خطیب و معلّم ہے تو کوئی فیاض و سخی۔ مختصر یہ کہ زندگی کے کسی ایک گوشے میں کمال حاصل کرنے والوں کے حالاتِ زندگی میسر و دستیاب ہیں، لیکن آپؐ کی سیرتِ طیبّہ کی ایک امتیازی و بے مثال خصوصیّت یہ ہے کہ وہ "کمالِ زندگی" کی آئینہ دار ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ نے زندگی کے ہر گوشے میں کمال حاصل کیا۔ اس لیے آپؐ کی سیرت کا بامقصد مطالعہ قاری کو کُل زندگی میں کمال حاصل کرنے کی حسین و مستقیم راہ دکھاتا اور اس میں اپنی شخصیت کو عظیم، ہمہ گیر اور کامیاب بنانے کا داعیہ پیدا کرتا ہے۔ اسی لیے تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اللہ تعالیٰ کے رسول (آخر و اعظم کی سیرت) میں تمھارے لیے حسین نمونہ ہے۔"

(الاحزاب ۳۳: ۲۱)

اللہ تعالیٰ، اِسلام اور روحِ انسانی تینوں کی آرزو "حُسن" ہے۔ حُسن کیا ہے؟ زندگی، کائنات اور اللہ تعالیٰ سے اس کا رشتہ کیا ہے؟ یہ اور حُسن سے متعلق دیگر سوالات کا جواب ہمیں قرآنِ حکیم میں ملتا ہے[۲۵] اور وہ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ اپنی کُل زندگی کو حسین بنانے کا بہترین منہاج و راستہ کون سا ہے؟ اس میں قطعاً شک نہیں کہ قرآنِ مجید زندہ خدا کی زندہ اور زندگی کے راہنما اصولوں کی جامع و مانع کتاب ہے، لیکن کتاب بہرحال کتاب ہے۔ اس کے اصولوں پر عمل کرنا اور ایسی مخلوق میں رہ کر عمل کرنا جو صاحبِ ارادہ و اختیار ہے اور جسے

خیر و شر دونوں راہوں کا طبعاً علم ہے اور ان پر چلنے کی قابلیت بھی ہے، انسان کے لیے واقعی ازبس دشوار کام تھا' جسے آسان بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمتِ بے پایاں سے ایک ایسے انسان کو مبعوث فرمایا' جس نے عرب ایسے استحصالی معاشرے میں رہ کر زندگی کے ہر گوشے میں اپنے اور اپنے دوستوں کے لیے صرف حُسن کو پسند و اختیار کیا' قلب و نظر اور فکر و عمل کو حسین رکھا اور ان کے لیے ہر حال میں حُسن ہی روا رکھا۔ یہ عظیم' صاحبِ حُسن و سُرور اور مثالی انسان "محمد" صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم ہیں۔ چونکہ سائنس کی ترقی اور تسخیرِ زمان و مکان کا دَور آنے والا تھا اور اقوامِ عالم کو ایک نقطے پر سمٹ آنا تھا' لہٰذا ربّ العالمین نے آپؐ کو خاتم النبیّین اور رحمۃٌ للعالمین بنا کر مبعوث کیا۔ اس میں یہ نکتہ مضمر ہے کہ ختمِ نبوّت اور رحمۃٌ للعالمینی لازم و ملزوم ہیں۔ چونکہ آپؐ ہر زمان و مکان کے لیے رحمت ہیں لہٰذا آپؐ کے بعد رسالت و نبوّت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ عقلِ انسانی نے چونکہ اپنے ارتقا کے اس مقام پر پہنچ جانا تھا' جہاں اسے اسرارِ کائنات و حیات کا سُراغ لگانے کے قابل ہو جانا تھا اُس لیے اسے قرآنِ حکیم میں حسن کے اسرار و رموز کا سراغ لگانے کے لیے تنہا چھوڑ دینا' مشیّتِ ایزدی ہوئی' لیکن رحمتِ الٰہی نے عقل کو عملی حکمت سکھانے کے لیے آپؐ کی سیرت کو حسین و کامل نمونہ بنا دیا۔ یہ نمونۂ زندگی چونکہ کُل حیاتِ انسانی کا نمونہ ہے' اس لیے ہر زمان و مکان کے انسان کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے آپؐ کی سیرتِ طیبہ کو اسی طرح دکھایا ہے' اور میں نے جو کچھ دیکھا' اسے اپنی زبان میں بیان کرنے اور زبان و اسلوبِ بیان کو عصری تقاضوں کے مطابق بنانے کی مخلصانہ کوشش کی ہے۔ ہر دَور کے کچھ اپنے مسائل ہوتے ہیں بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ہر عہد میں مسائل تو وہی رہتے ہیں، لیکن مختلف شکلیں اور انداز اختیار کر لیتے ہیں' پھر زبان و اسلوبِ بیان میں بھی تبدیلی آجاتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ رنگ تو وہی رہتا ہے' لیکن اس کے انداز[۲۶] بدلتے رہتے ہیں۔ اسی طرح فطرتِ انسانی تو وہی رہتی ہے' البتہ ذوقِ انسانی میں تنوّع و بوقلمونی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہی ہے۔

آپؐ کی سیرت ایک ایسے بے مثال معلّمِ انسانیت کی سیرت ہے جس نے اپنے اُسوۂ حسنہ کے ذریعے انسان کو مقامِ عبدیّت پر متمکّن رہ کر اپنے الٰہ و ربّ اور اس کی مخلوقات خصوصاً بنی نوعِ انسان سے محبّت کرنا' ان کے لیے رحمت بن جانا اور ان کی خاطر بڑی سے

بڑی قربانی سے دریغ نہ کرنا' بے کسی و بے چارگی کے عالم میں بھی اللہ تعالیٰ پر بھروسا رکھنا، شدائد و آلام میں صبر کرنا، تلواروں کے سائے میں ثابت قدم رہنا' حق و صداقت کی خاطر بڑی سے بڑی قوّت سے ٹکرا جانا' اعلیٰ نصب العین کی خاطر امارت و حکومت اور دولت و قوّت سب کو ٹھکرا دینا اور حُسن و صداقت کی راہ پر گامزن رہ کر حقیقی منزلِ مقصود پر پہنچ جانا' سکھایا ہے۔

انسان اپنی فطرت میں عبد ہے اور عبدیّت اس کا خاصّہ ہے اور عبدیّت کا تقاضا عبودیت یعنی اپنے اِلٰہ کی پرستش کرنا ہے۔ پرستش دراصل اپنے اِلٰہ سے محبّت و نیازمندی' تسلیم و رضا' طاعت و قربانی اور اس کے قرب و دید اور خوشنودی کی سچّی طلب و آرزو سے عبارت ہے۔ انسان بلکہ ہر مخلوق کا اِلٰہ صرف اور تنہا اللہ تعالیٰ ہے' جو اپنی حقیقت میں حُسن ہے۔ اس لحاظ سے انسان کو فطرۃً اپنے اِلٰہ سے محبّت اور آرزو ہوتی ہے۔ یہ جمیل و جلیل اِلٰہ چونکہ کُل مخلوقات کا خالق ہے اور اس کی ہر مخلوق حسین ہے' اس لیے انسان کو طبعاً تمام حسین مخلوقات خصوصاً اپنے ہم نوع یعنی انسان سے محبت ہے۔ اپنے اِلٰہ کے حوالے سے انسان کو فطرۃً حسن کی طلب و جستجو رہتی ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے' لیکن یہ ایک اعتبار سے اس کی سب سے بڑی کمزوری بھی ہے کہ شیطان اس سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اسے گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ شیطان کا طریقِ فریب دہی یہ ہے کہ وہ فواحش و منکرات کو مُزیّن کر کے دکھاتا ہے اور انسان انھیں حسین سمجھ کر جرم و گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس طریقِ فریب دہی کو اس کی معنوی رعایت کی بنا پر "جمالیاتی فریب" سے تعبیر کیا گیا ہے[۲۷]۔ انسان کس طرح شیطان کے اس جمالیاتی فریب سے محفوظ رہ سکتا ہے؟ اس ازبس اہم سوال کا عملی جواب آپؐ کی سیرتِ طیبہ میں ملتا ہے۔

آپؐ کی سیرتِ طیبہ سے یہ حقیقت بھی آشکارا ہوتی ہے کہ انسان کس طرح اپنے اِلٰہ کا قُرب و رضوان حاصل کر کے اپنے جذبۂ عبودیت کی تشفّی کر سکتا ہے۔ جذبۂ عبودیت سلامت رہے تو اللہ کا بندہ نہ صرف یہ کہ ابلیس کا جمالیاتی فریب نہیں کھاتا' بلکہ اسے عبدیّت کا وہ ارفع مقام حاصل ہوتا ہے جس پر متمکّن رہ کر انسان عالمِ انسانی کے علاوہ دیگر عوالم مثلاً حیوانی، نباتاتی اور جماداتی کے لیے بھی رحمت بن جاتا ہے۔ اس مقام پر انسان کو طمانیتِ نفس ملتی ہے اور وہ صاحبِ حُسن و سرور بن جاتا ہے۔ اسلام کی رُو سے

صاحبِ حُسن و سروری کامیاب انسان ہوتا ہے، اور عظیم بننے کے لیے پہلے صاحبِ سرور بننا لازمی ہے۔ ماحصلِ گفتگو یہ ہوا کہ سیرتِ طیبہ کا مطالعہ ان لوگوں کو کرنا چاہیے جو صاحبِ حُسن و سرور اور عظیم بننے کی سچی آرزو رکھتے ہیں۔ ہمیں یہ اصل یاد رکھنی چاہیے کہ آرزُو وہ سچی ہوتی ہے جس کے حصول کے لیے انسان ذوق و شوق سے مسلسل جدّوجہد کرتا اور کسی قربانی سے دریغ نہیں کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آرزو سعی و مشقت اور ایثار و قربانی ہی سے معتبر اور سچی بنتی ہے۔

اہلِ ذوق و نظر کے لیے آپؐ کی سیرتِ طیبہ کا ہر گوشہ حُسن و کمال اور صدق و رحمت کا مظہر ہے، لیکن اس کی اہم ترین خصوصیت ایسے حسین معاشرے کی تشکیل و تعمیر ہے جس کی بنیادیں تقویٰ، عدل و احسان، احترامِ انسانیت، اُخوّت و محبّت اور حُرّیت و مساوات پر اٹھائی گئی تھیں اور وہ ہر قسم کی شیطانی و استحصالی قوتوں اور معبودانِ باطلہ مثلاً فرعونوں، ہامانوں اور نمرودوں سے پاک تھا۔ آپؐ کی تحریکِ اسلام کا بنیادی مقصد بھی یہی تھا۔ تحریکِ اسلام عمل میں انقلابی اور غایت میں جمالیاتی و رحمۃٌ لّلعالمینی ہے۔ انقلاب کا تقاضا معاشرے کے وجود سے "سرطانی" و مردہ عناصر اور مفاسد و امراض کو دُور کرنا ہے، جبکہ رحمت کا تقاضا اس کے وجود کو فطری اور سچّے عقایدِ جلیلہ و محرّکہ اور حُسنِ عمل کے ذریعے زندہ و توانا اور صالح و صحت مند بنانا ہے۔ اس دَور کے "بے خدا" لوگوں کو شاید یہ بات عجیب، احمقانہ اور لایعنی محسوس ہو کہ معاشرے میں فساد کا بنیادی سبب "شرک" ہے۔ شرک ایک سے زائد معبودوں کی عبودیّت پر دلالت کرتا ہے، حالانکہ ایک دل میں دو معبود نہیں سما سکتے اور انسان کے سینے میں ایک سے زائد دل نہیں ہوتے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ مشرک کے دل میں اپنے حقیقی اِلٰہ کی سچی آرزو نہیں ہوتی اور اس نے اپنا کوئی اِلٰہ بنا لیا ہوتا ہے، اگرچہ اسے اس حقیقت کا شعُور نہیں ہوتا۔

شرک سے انسان اپنی شخصیت کو پارہ پارہ کر کے اپنے اوپر ظلم کرتا ہے اور معاشرے کو بھی ظلم کے حوالے کرتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ نفسِ انسان کا اِلٰہ بن جائے تو اس میں فرعون، ہامان اور قارون بننے کا، اور دوسری جانب ان استحصالی و "سرطانی" قوّتوں کی پرستش کرنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔ یہاں اس نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ فرعون، ہامان اور قارُون تین طاغوتی، استحصالی یا انسان دُشمن کردار ہیں جو معاشرے میں شرک و بُت پرستی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ تاریخی کردار بھی ہیں اور علامات بھی۔ فرعونیت آمریّت و استبدادیّت اور اِدّعائے

اُلوہیت و ربُوبیت کی، ہامانیت پرستاریِ فرعونیت، جاگیرداری و نوکرشاہی اور منافقت و خوشامد کی، اور قارونیت پرستاریِ فرعونیت و ہامانیت نیز سرمایہ داری و جاگیرداری، تجمّل و جذبۂ تکاثر اور اکتناز و احتکار کی علامت ہے۔ بالفاظِ دیگر فرعونیّت اِلٰہ و ربّ بننے کی خواہش پر، ہامانیّت جاہ و حشم، قوت و صولت اور حاکمیت کی ہوس پر اور قارونیّت پرستشِ زر و زمین، جذبۂ تکاثر اور تجمّل پر دلالت کرتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ان تینوں کرداروں میں ادّعائے خُدائی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی تحریکِ رحمۃٌ لّلعالمینی کا بنیادی مقصد دنیا سے شرک کو نیست و نابود کرنا ہے تاکہ انسانی معاشرے میں کوئی فرعون، ہامان یا قارون نہ رہے اور افرادِ نسلِ انسانی کا اِلٰہ و ربّ صرف اللّٰہ تعالیٰ ہو۔ سب کو اسی کی طلب و جستجو ہو۔ سب مقامِ عبدیّت پر متمکّن ہوں، سب کی زندگی حسین و مطمئن اور آزاد و مکرّم ہو۔ غرضیکہ سب اہلِ حُسن و سرور بن جائیں۔ اس مقصد کے حصول میں آپؐ کو جو جدّوجہد کرنا پڑی اور جن جن تجربات و امتحانات میں سے گزرنا پڑا، ان کی روداد عبارت ہے سیرتِ طیّبہ سے، اور اس حسین و پاکیزہ اور حکمت آموز و بصیرت افروز داستان کو بیان کرنے کی کوششِ ناتمام کا حاصل یہ کتاب ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب دنیا میں مختلف زبانوں میں سیرتِ طیبہ پر بیشمار کتابیں موجود ہیں اور خاص کر اُردُو میں بھی اس موضوع پر معتدبہ لٹریچر دستیاب ہے تو پھر مجھے یہ کتاب لکھنے کی ضرورت کیوں محسُوس ہوئی؟ اس سوال کا ایک جواب تو دیا جا چکا ہے اور دوسرا خود یہ کتاب ہے۔ لیکن احوالِ واقعی کے طور پر چند ایسی بنیادی خصُوصیّات کی نشان دہی کی جاتی ہے جو اس اور دیگر کُتبِ سیرت میں مابہ الامتیاز ہیں:

(۱) احوال و واقعات میں ترتیبِ زمانی کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور تاریخی تسلسل کو قائم رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔ ہجری تاریخوں کے ساتھ عیسوی تاریخیں بھی درج ہیں۔

(۲) مطالعے کی دلچسپی کو قائم رکھنے کی خاطر سیرت کے واقعات کے ربط و ضبط اور تسلسل کو انحراف و انقطاع سے محفوظ رکھا گیا ہے، لہٰذا متن میں ان واقعات اور اُن کی جُزئیات و تفصیلات، نیز مباحث کو جگہ نہیں دی گئی جو قاری کی توجہ کو اصل موضوع سے ہٹا دیتے ہیں۔

(۳) آپؐ اللّٰہ تعالیٰ کے سچّے اور آخری نبی اور رسول تھے اور ہیں۔ نیز عظیم و ہمہ جہت

عبقری شخصیت بھی تھے، لہٰذا اعتذاری (APOLOGETIC) اسلوب بیان سے احتراز کیا گیا ہے لیکن اسلام دشمن مستشرقین کے اعتراضات کو مدلل طریقے سے ردّ کرنے میں کوتاہی نہیں کی گئی۔

(۴) اسلوبِ بیان، لب و لہجہ اور الفاظ کے انتخاب میں جدید دور کے لسانی و ذوقی تقاضوں کا احترام کیا گیا ہے، لیکن اپنی روایت کا پاس بھی ملحوظ رہا ہے۔

(۵) آپؐ کی سیرت کے ایک ایک واقعے کو سب سے پہلے وحی و تنزیل' پھر کتبِ حدیث و تاریخ کی روشنی میں دیکھا ہے۔ بعدازاں عقلیاتی اور سائنٹفک انداز میں استقصا کر کے اس کے متحقق پہلوؤں کو قلمبند کیا ہے۔

(۶) اسلام ایک زندہ و فطری دین ہے' جس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں قوتِ حیات و ارتقا بھی ہے اور قوتِ قیومیت بھی، نیز اس میں حق و صداقت بھی ہے، لہٰذا وہ جامد و مردہ نظامِ فکر و عمل نہیں بلکہ ایک تحریک ہے؛ 'زندۂ جاوید تحریک' اور اس کتاب میں اسے تحریکِ رحمۃ للعالمینی کے طور پر ہی پیش کیا گیا ہے۔

(۷) غزوات و سرایا کی اصل حقیقت کیا تھی؟ ان کے محرکات و اسباب کیا تھے؟ ان کا تاریخ سے کیا تعلق تھا؟ مسلمانوں کی ہر محاذ پر فتوحات و کامیابیوں کے اصل عوامل کیا تھے؟ ان تمام سوالوں کا جواب حربیاتی و عقلیاتی انداز میں دیا گیا ہے۔

(۸) اصولِ سیرت نگاری کی رُو سے جن واقعات و تفصیلات اور مباحث و تشریحات کا متن متحمل نہیں ہو سکتا تھا' انھیں حواشی و تشریحات میں' اور حواشی و تشریحات کو ہر باب کے آخر میں رکھا ہے اور وہیں حوالے بھی درج ہیں۔

(۹) قرآنِ مجید کی رُو سے آپؐ کی حیاتِ طیبہ ہر زمان و مکان کے انسان کے لیے بہترین نمونہ (اُسوۂ حسنہ) ہے' اور اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آپؐ نے زندگی کے ہر شعبے میں جو کمالات حاصل کیے وہ بحیثیت انسان کے حاصل کیے اور اسی لیے آپؐ کی سیرت ہمارے لیے سُنّتِ حسنہ ہے۔ لہٰذا اس کتاب میں آپؐ کو اسی طرح پیش کرنے کی مخلصانہ کوشش کی گئی ہے جس طرح قرآنِ مجید نے آپؐ کو پیش کیا ہے۔

(۱۰) آپؐ بلاشبہ ہمہ جہت عبقری شخصیت تھے' اس لیے بعض اربابِ سیرت نے آپؐ کی مختلف حیثیتوں سے علیحدہ علیحدہ بحث کی ہے اور بعض نے ان سے صرفِ نظر کیا ہے'

لیکن اس کتاب میں آپؐ کی ہر حیثیت کو تسلسل کے ساتھ متن ہی کے اندر بیان کیا ہے' جو سچا اسلوبِ سیرت نگاری ہے۔ اس سے نہ تو سیرت کا تسلسل ٹوٹا ہے اور نہ اس کے ربط و ضبط کو نقصان پہنچا ہے۔

(۱۱) انسان کی شخصیت خواہ کتنا ہی نشو و ارتقا کر جائے اور عظیم و پہلودار ہو جائے' اس میں وحدت برقرار رہتی ہے' جو اس کا محور ہوتی ہے۔ اصولِ سیرت نگاری یہ ہے کہ سیرت نگار کی فکر و نظر اس محور پر مرتکز رہنی چاہیے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس کتاب میں ایسی ہی کوشش کی گئی ہے تو یہ مبالغہ نہیں' اظہارِ واقعیت ہوگا۔

(۱۲) آپؐ ایک عہد آفریں شخصیت تھے اور آپؐ کی سیرت کا تاریخ سے گہرا تعلق تھا علاوہ بریں چونکہ آپؐ اللہ تعالیٰ کی منتخب تاریخ ساز شخصیتوں کے سلسلے کی آخری کڑی تھے، لہٰذا آپؐ کا تعلق تاریخ کے نقطۂ آغاز سے بھی تھا اور چونکہ آپ تاریخ کے نقطۂ اختتام تک کے لیے نبی ہیں' لہٰذا آپؐ کی سیرت کا تعلق ماضی و حال کی طرح مستقبل اور مستقبلِ بعید سے بھی ہے، اس اعتبار سے آپؐ کی سیرت تاریخِ انسانی کی آئینہ دار اور آپؐ ماضی، حال اور مستقبل کے شاہد ہیں[۲۵] اس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ آپؐ کی ذات میں روحِ تاریخ مضمر تھی' جسے آپؐ کی سیرت کا محور بنانا اور اس کے حوالے سے متعلقہ احوال و واقعات کو دیکھنا' پرکھنا اور خلوصِ نیت سے بیان کرنا آپؐ کے سیرت نگاروں کا بنیادی فریضہ ہے' اور اس کتاب میں یہ فریضہ ادا کرنے کی مخلصانہ کوشش کی گئی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ کوشش اس اور دیگر کتبِ سیرت کے درمیان مابہ الامتیاز ہے تو یہ مبالغہ نہیں' اعترافِ حقیقت ہوگا۔

انسان کی صورت اس کی کس قدر آئینہ دار ہوتی ہے' یہ شاید بحث طلب مسئلہ ہو، لیکن جہاں تک آپؐ کی ذاتِ اقدس کا تعلق ہے، آپؐ کی صورت آپؐ کی سیرت کی طرح جمیل و جلیل اور دلکش و نظر افروز تھی۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ انبیاء علیہم السلام صورت و سیرت دونوں لحاظ سے حسین تھے۔ چنانچہ حضرت قتادہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جو نبی بھی مبعوث کیا' وہ خوب صورت اور اس کی آواز حسین تھی' یہاں تک کہ تمھارے نبی کو بھی حُسنِ صورت اور حسنِ آواز دے کر مبعوث کیا۔[۲۹] مصنف کی طرح قاری کو بھی یہ معلوم کرنے کی طلب و جستجو ہوتی ہے کہ جس شخص کی سیرت اس نے پڑھنی ہے' وہ شکل و صورت کے اعتبار

سے کیسا تھا؟ وہ کس سرزمین، ماحول، قوم اور خاندان میں پیدا ہوا، اور ان کے خصائص کیا تھے؟ ان معلومات سے ایک تو قاری کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے، اور دوسرے اسے سیرت کو بہتر طور سے سمجھنے میں مدد بھی ملتی ہے۔ اس مقصد کی خاطر پہلے آپؐ کے شمائل و فضائل اور پھر آپؐ کے خاندان اور ملک و قوم کے حالات بیان کیے جائیں گے۔ چونکہ اسلام کے نظامِ فکر و عمل میں اخلاق کو اساسی حیثیت حاصل ہے، لہٰذا پہلے آپؐ کے اخلاق اور نظامِ اخلاق کی خصوصیات کی بھی نشاندہی کی جائے گی۔ حضرت جعفر بن محمدؒ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم جب آئینہ دیکھتے تو فرماتے : "حمد و ثنا صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے جس نے میرے خَلق یعنی ہیئت و صورت اور قد و قامت کو اور میرے خُلق یعنی سرشت اور عادات و خصائل کو حسین بنایا ہے۔"[۳۰] آپؐ کے حُسنِ صورت و قامت یا حلیہ مُبارک سے متعلّق چند روایات نقل کی جاتی ہیں۔ حضرت علیؓ بن ابی طالب فرماتے ہیں : نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نہ تو لانبے تھے اور نہ پستہ قد، بلکہ متوسط قامت تھے (یہ بات پیشِ نظر رہے کہ عہدِ نبویؐ میں عربوں کا اوسط قد بھی ایک طویل قامت پاکستانی کے برابر تھا)۔ آپؐ کے بال نہ تو گھونگھریالے تھے، نہ بالکل سیدھے، بلکہ قدرے بل کھائے ہوئے تھے۔ آپؐ نہ تو زیادہ فربہ تھے اور نہ دُبلے پتلے۔ آپؐ کا چہرہ گول، اور رنگ سُرخی مائل سفید تھا۔ آنکھیں سیاہ اور پلکیں لمبی تھیں۔ آپؐ کے جوڑ مضبُوط تھے اور بدن پر بال نہیں تھے۔ صرف بالوں کی ایک لکیر تھی جو سینے سے ناف تک چلی گئی تھی۔ ہاتھ اور پاؤں پُر گوشت تھے۔ جب آپؐ چلنے کے لیے قدم اُٹھاتے تو یوں لگتا جیسے آپؐ بلندی سے نیچے اُتر رہے ہیں اور جب آپؐ کسی کی طرف دیکھتے تو پورے جسم کے ساتھ متوجہ ہوتے تھے۔ آپؐ کے دونوں شانوں کے درمیان مُہرِ نبوّت تھی اور آپؐ خاتم النّبیّین تھے۔ آپؐ لوگوں میں نہایت کشادہ دل اور فیّاض اور زبان کے نہایت سچّے تھے۔ آپؐ صاف اور غیر مبہم لب و لہجہ میں گفتگو فرماتے تھے۔ آپؐ طبیعت کے بہت نرم اور خانوادے کے لحاظ سے مکرّم و معزّز تھے۔ اگر کوئی شخص آپؐ کو پہلے پہل دیکھتا تو اس پر ہیبت طاری ہو جاتی، اور جو شخص آپؐ کو پہچان کر آپؐ سے گھُل مل جاتا تو آپؐ سے محبّت کرنے لگتا۔ حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی وفات سے پہلے اور نہ آپؐ کی وفات کے بعد میں نے آپؐ جیسا شخص دیکھا (صلّی اللہ علیہ وسلّم)۔[۳۱]

سیّدُ المرسلینؐ صاحب جمال و جلال تھے۔ آپؐ کے جلالِ شخصیت سے اغیار مرعوب ہو جاتے، لیکن اپنوں کو آپؐ پیکرِ جمال دکھائی دیتے اور ان کے دل گرویدہ ہو جاتے۔ یہاں اس

جمالیاتی نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ جمال و جلال حُسن ہی کے دو مظاہر یا صفات ہیں۔[۳۲] آپؐ کا جلال مانندِ آفتاب اور جمال چاند صفت تھا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ کسی راوی نے آپؐ کے روئے مبارک کو آفتاب سے تشبیہ دی ہے تو کسی نے چاند سے۔ حضرت ابو عبیدہ بن محمّد بن عمارؓ بن یاسر کہتے ہیں کہ میں نے ربیع بنت مسعودؓ بن عفرا سے کہا : رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی صفت کریں۔ انھوں نے کہا : بیٹا! اگر تو آپؐ کو دیکھتا تو تجھے یوں دکھائی دیتا جیسے آفتاب نکلا ہوا ہے۔ (یعنی آپؐ کا چہرہ سورج کی طرح مُنوّر و پُرجلال تھا)[۳۳]

حضرت جابرؓ بن سمرہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو چاندرات میں دیکھا میں کبھی آپؐ کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی چاند کی طرف۔ آپؐ اس وقت سُرخ لباس پہنے ہوئے تھے میرے نزدیک آپؐ چاند سے زیادہ حسین تھے[۳۴]۔ حضرت کعبؓ بن مالک کہتے ہیں کہ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم جب خوش ہوتے تو آپؐ کا چہرۂ مبارک کِھل اُٹھتا اور یوں لگتا جیسے وہ چاند کا ٹکڑا ہے۔[۳۵]

ورقہ بن نوفل نے جو اُمّ المومنین حضرت خدیجہ طاہرہؓ کے چچیرے بھائی تھے، رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے شمائل اس طرح بیان کیے ہیں : اس کا چہرہ چاند سا، پیشانی روشن، آنکھیں سیاہ۔ اس کی خوشبو مشک سے زیادہ مُعطّر اور اس کی بات شیریں ہے۔ جب وہ چلتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے چودھویں رات کا چاند متحرّک ہو اور ابرِ رحمت برس رہا ہو...... وہ پیکرِ حُسن اور عالی نسب ہے۔ وہ حُسنِ سیرت میں دُنیا بھر میں بہترین اور اخلاقِ حسنہ کا مرکّب ہے۔ جب وہ چلتا ہے تو اس کے لٹکے ہوئے بالوں سے سیاہی ٹپک ٹپک پڑتی ہے۔ اس کے رُخسار گلاب کی کلی سے زیادہ شاداب ہیں، اور اس کی خوشبُو خالص مشک سے زیادہ معطّر اور اس کی باتیں شہد و شکر سے زیادہ شیریں ہیں۔[۳۶]

ایک دفعہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کاروانِ تجارت کے ساتھ شام جانے لگے۔ آپؐ کا سِنِ مبارک ۲۴ برس کے لگ بھگ تھا۔ اہلِ مکہ قافلے کو الوداع کہنے کے لیے میدان میں جمع تھے۔ آپؐ کو دیکھ کر آپ کے چچا حضرت عباسؓ نے فی البدیہہ شعر کہے۔ ان میں سے دو شعروں کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے :

اے آفتاب اور بدرِ مُنیر کو اپنے جمال و جلال سے شرمندہ کرنے والے!
تُو جب مسکراتا ہے تو برق سی لہرا جاتی ہے!

ہم نے تجھ سے بہت سے معجزات دیکھے ہیں
اے سردار! تیرا ذکر بیماروں کو شفا دیتا ہے![۳۷]

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے رنگ میں لطافت و چمک تھی۔ آپؐ کے پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح تھے۔ جب آپؐ چلتے تو آگے کی طرف جھکے سے ہوتے۔ میں نے دیبا و ریشم کو بھی آپؐ کی ہتھیلیوں سے زیادہ نرم نہیں پایا، اور میں نے کوئی مشک و عنبر نہیں سونگھا جس کی خوشبو نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خوشبو سے بہتر ہو۔[۳۸]

کتبِ حدیث و سیرت سے یہ بات ثابت ہے کہ آپؐ قہقہہ لگا کر نہیں ہنستے تھے، بلکہ تبسم فرمایا کرتے تھے[۳۹]۔ آپؐ کا اُٹھنا بیٹھنا اور چلنا دلآویز تھا۔ اصل یہ ہے کہ آپؐ کا خَلق اور خُلق دونوں حسین و دلکش تھے[۴۰]۔ فیاضی، سخاوت، شجاعت میں آپؐ اپنا جواب تھے۔ آپؐ چونکہ رحمۃ للعالمین تھے، اس لیے آپؐ کے دل میں بنی نوعِ انسان کی محبّت بدرجۂ اتم موجود تھی۔ محبت جب تک عملاً اظہار میں نہ آئے، معتبر نہیں ہوتی، نیز وہ احسان ہی کے ذریعے رحمت بنتی ہے۔ لہٰذا آپؐ احسان پیشہ اور محسنِ اعظم تھے۔ آپؐ ازبس رحم دل، نرم خُو اور حلیم و کریم تھے۔ آپؐ نے کبھی کسی شخص کے لیے بھی زجر و توبیخ کو روا نہ رکھا۔ آپؐ کو جب کسی پر غصّہ آتا تو صرف اتنا فرماتے: تیری پیشانی خاک آلودہ ہو، تو کیا کرتا ہے؟[۴۱] آپؐ کافروں تک کو بددعا نہیں دیا کرتے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے عرض کیا گیا کہ مشرکوں کے حق میں بددعا فرمائیں۔ آپؐ نے فرمایا: مجھے لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے[۴۲]۔ سخاوت و فیاضی کا یہ عالم تھا کہ آپؐ سے کوئی چیز مانگی گئی تو آپؐ نے کبھی انکار نہ کیا۔[۴۳] آپؐ کے حلم و بُردباری کا اندازہ حضرت انسؓ کی اس روایت سے لگایا جا سکتا ہے: "میں نے دس برس نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت کی، لیکن اس دوران میں آپؐ نے کبھی مجھے اُف تک نہیں کہی اور نہ کبھی یہ فرمایا کہ یہ کام تو نے کیوں کیا یا یہ کام تو نے کیوں نہیں کیا؟[۴۴]

حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایات میں ہے کہ آپؐ نے اپنی ذات کے لیے کبھی کسی بات میں کسی سے انتقام نہیں لیا اور نہ آپؐ نے کبھی کسی جان دار چیز کو اپنے ہاتھ سے مارا[۴۵]۔ مدینۂ منوّرہ میں آپؐ سربراہِ مملکت تھے، لیکن آپؐ نہ صرف اپنے گھر بار کا بلکہ دوسروں کا کام کاج بھی کر دیا کرتے تھے۔ محنت سے آپؐ کو قطعاً عار نہ تھی۔ چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹاتے اور گھر والوں کی خدمت کرتے تھے اور

جب نماز کا وقت آجاتا تو نماز کو چلے جاتے[۴۶]۔ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ ہی کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اپنی جوتیاں خود مرمّت کر لیا کرتے تھے، اپنے کپڑے خود سی لیتے اور اپنے گھر میں اسی طرح کام کرتے تھے جس طرح تم اپنے گھروں میں کرتے ہو۔ آپؐ اپنی بکری کا دُودھ خود دوھ لیتے اور اپنا کام خود کر لیا کرتے تھے[۴۷]۔ آپؐ کی رحمت اور انسان دوستی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپؐ کو جو شخص بھی مدد کے لیے جہاں لے جانا چاہتا، آپؐ چلے جاتے اور اس کا کام کر دیتے[۴۸]۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ساری عمر اللہ تعالیٰ کے حکمِ اِنفاق بالعفو پر عمل کیا، لہٰذا آپؐ کبھی صاحبِ نصاب نہ ہوئے۔ یہاں تک کہ آپؐ اپنے لیے کوئی چیز کل کے لیے جمع نہ کرتے تھے۔[۴۹] قرآنِ مجید اور کتبِ حدیث و سیرت میں آپؐ کے بیشمار فضائل مذکور ہیں جن میں سے معدودے چند بیان کیے جاتے ہیں:

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضرت محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: مجھے دوسرے انبیاؑ پر چھ باتوں میں فضیلت دی گئی ہے: (۱) **جوامع الکلم**: یعنی میری بات مختصر ہونے کے باوجود جامع و مانع ہے۔ آپؐ ہی کا ارشاد ہے کہ میں تمام لوگوں سے زیادہ فصیح البیان ہوں۔ چنانچہ آپؐ کے خطبات اور احادیثِ طیبہ اس دعوے کے زندہ ثبوت ہیں۔ (۲) **نُصرت بالرُعب**: یعنی رُعب سے مجھے فتح عطا کی گئی ہے۔ غزوات کے مطالعے سے یہ بات متحقّق ہو جاتی ہے کہ دشمنوں کی شکستوں کا ایک بنیادی سبب آپؐ کا رُعب تھا۔ فتحِ مکّہ اس کا بیّن ثبوت ہے۔ (۳) **احلّت لی الغنائم**: یعنی مالِ غنیمت میرے لیے حلال کیا گیا۔ کتبِ سیرت و حدیث شاہد ہیں کہ آپؐ مالِ غنیمت مُجاہدین اور معاشرے کے اہلِ احتیاج افراد میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ (۴) **جعلت لی الارض مسجداً وطہوراً**: یعنی ساری زمین کو میرے لیے مسجد اور پاک بنا دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان مسجد کے علاوہ بھی ہر جگہ نماز پڑھ سکتے ہیں۔ نماز و عبادت مسجد کے ساتھ مشروط نہیں ہے، جیسا کہ دیگر مذاہب میں رواج تھا اور اب بھی ہے۔ (۵) **ارسلت الی الخلق کافۃً**: یعنی مجھے ساری مخلوق کے لیے نبی بنا کر بھیجا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ آپؐ سے فرماتا ہے: (اے محمّدؐ!) ہم نے آپؐ کو تمام افرادِ نسلِ انسانی کے لیے مژدہ دینے اور متنبّہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (سبا ۳۴: ۲۸) اس سے عیسائی مشنریوں اور اسلام دشمن

مستشرقین کے اس گمراہ کُن پراپیگنڈے کا بُطلان ہوجاتا ہے کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم صرف عربوں کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔ **(۶) خـتم بی النّبیّیون** : انبیاءؑ کا مجھ پر خاتمہ ہوگیا ہے۔[۵۰] اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی پیدا نہیں ہوگا۔ اس پر مندرجۂ ذیل آیت قرآنی سے بھی استشہاد کیا جاسکتا ہے : (حضرت) محمدؐ تمھارے مردوں میں سے کسی کے والد نہیں ہیں بلکہ اللہ کے رسول اور نبیوں کو ختم کر دینے والے ہیں (الاحزاب ۳۳ : ۴۰)۔

قرآن مجید اور احادیثِ طیبہّ سے قطعی طور سے ثابت ہے اور اس پر ہمیشہ ہی امّت کا اجماع رہا ہے کہ آپؐ آخری نبی ہیں اور آپؐ کے ساتھ نبوّت و رسالت اور وحی و تنزیل کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوچکا ہے، لہٰذا آپؐ کے بعد کسی اور نبی (ظلّی یا بروزی، باکتاب یا بے کتاب) کے مبعوث ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آخر میں صحیحین کی ایک حدیث نقل کی جاتی ہے جو اس بارے میں قولِ فیصل اور حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ میری اور دوسرے انبیاءؑ کی مثال اس محل کی سی ہے جس کی عمارت نہایت حسین ہو، لیکن دیوار میں ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہو۔ دیکھنے والوں نے اس کو چاروں طرف سے دیکھا اور اس کے حُسنِ تعمیر سے دنگ رہ گئے، لیکن ایک اینٹ کی جگہ خالی دیکھ کر انھیں حیرت ہوئی۔ اس اینٹ کی جگہ مجھ ہی سے پُر کی گئی ہے اور مجھ ہی سے اس عمارت کی تکمیل کی گئی ہے اور مجھ ہی پر رسُولوں کا خاتمہ کیا گیا ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ میں ہی وہ اینٹ ہوں اور میں ہی انبیاءؑ کے سلسلے کو ختم کرنے والا ہوں۔ (خاتم النّبیّین)[۵۱]

حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ایک امتیازی وصف یہ ہے کہ آپؐ رحمۃٌ للعالمین یعنی تمام عالموں کے لیے رحمت ہیں : اور (اے محمدؐ) ہم نے آپؐ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے (الانبیاء ۲۱ : ۱۰۷)۔ اس آیت میں یہ بصیرت افروز نکتہ مضمر ہے کہ چونکہ آپؐ ہر زمان و مکان کے تمام انسانوں کے لیے رحمت ہیں، اس لیے اب کسی اور نبی یا رسول کے مبعوث ہونے کی حاجت نہیں۔ آپؐ چونکہ قیامت تک کے لیے تمام بنی نوع انسان کے لیے نبی ہیں، اس لیے آپؐ پر جو کتاب نازل کی گئی ہے، وہ بھی زندۂ جاوید ہے۔ چنانچہ زندہ خُدا کی یہ زندہ کتاب آپؐ کا سب سے بڑا اور امتیازی معجزہ ہے، جیسا کہ مندرجۂ ذیل حدیثِ طیبہ سے ثابت ہے :

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا : ہر ایک

نبی کو معجزات میں سے صرف اِتنا دیا گیا جتنا کہ انسان اس پر ایمان لا سکے (یعنی ہر ایک نبی کو اس کے زمانے کے حالات و ظروف کے مطابق معجزہ دیا گیا اور اس کا اعجاز ختم ہوگیا)۔ لیکن مجھے وحی کا معجزہ دیا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے جو کلام بذریعہ وحی مجھ پر نازل کیا ہے (یعنی قرآن مجید) وہ دائمی معجزہ ہے، اس لیے مجھے امید ہے کہ قیامت کے دن میرے متّبعین کی تعداد تمام انبیاءؑ کے متّبعین سے زیادہ ہوگی۔[۵۲] (بُخاری و مُسلم) قرآنِ مجید اور سنّتِ طیبہّ سے متعلق آپؐ کا ارشاد ہے کہ جب تک مسلمان ان دو چیزوں کو مضبوط پکڑے رکھیں گے، یعنی ان پر سختی سے عمل پیرا رہیں گے، وہ گمراہ نہ ہوں گے۔ آپؐ کی محوّلہ بالا حدیثِ طیبہ اس آیتِ قرآنی کی تفسیر ہے :

واعتصمو بحبل اللّٰه جمیعاً وّ لاتفرقوا : اور سب مل کر اللہ تعالیٰ کی رسی (یعنی قرآنِ مجید) کو مضبوط پکڑے رہنا اور متفرق نہ ہوجانا (آلِ عمران ۳ : ۱۰۳)[۵۳]۔ اس آیتِ کریمہ سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں تشتّت و افتراق اور تضادات کا بنیادی سبب یہ ہے کہ انھوں نے قرآنِ مجید کو چھوڑ رکھا ہے اور اس پر اس طرح عمل نہیں کرتے جس طرح عمل کرنے کا حق ہے۔ بالفاظِ دیگر وہ قرآنِ مجید پر اس طرح عمل نہیں کرتے جس طرح نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم عمل کیا کرتے تھے۔

آپؐ کا ایک وصف یہ ہے کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے محبوب و دوست ہیں۔ زمانے کے لحاظ سے آپؐ اور آپ کی اُمّت آخری ہیں، لیکن درجہ و رتبہ میں افضل ہیں۔ چنانچہ حضرت عمروؓ بن قیس سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ ہم (زمانے کے اعتبار سے) آخر میں ہیں، لیکن قیامت کے دن ہم سابق و اوّل ہوں گے اور میں تم سے کسی فخر کے بغیر ایک بات کہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ابراہیمؑ خلیل اللہ (اللہ کے دوست) اور موسیٰؑ صفی اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ ہیں اور میں حبیب اللہ یعنی اس کا پیارا دوست ہوں اور قیامت کے دن میرے ساتھ حمد کا عَلَم ہوگا۔[۵۴] آخری قول کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ چونکہ بیک وقت احمد و محمدؐ ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی حمد کرنا آپؐ کا خُلق ہے اور آپؐ اللہ تعالیٰ اور خلائق کے ممدوح بھی ہیں، لہٰذا عَلَمِ حمد آپؐ کا اِمتیازی نشان ہوگا۔

نبیِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نہ صرف تمام بنی نوعِ انسان سے بلکہ جُملہ انبیاء علیہم السلام سے افضل اور ان کے امام و قائد ہیں۔ حضرت ابیؓ بن کعبؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: قیامت کے دن میں انبیاء کا امام و خطیب اور ان کی شفاعت کرنے والا ہوں گا اور اس پر مجھے فخر نہیں ہے۔[۵۵] حضرت

ابو موسیٰ اشعریؓ کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا : میں محمدؐ ہوں، (یعنی ممدوحِ خلائق ہوں)، میں احمد ہوں (یعنی اللہ تعالےٰ کی بہت زیادہ حمد وثنا کرنے والا ہوں)، میں حاشر ہوں (یعنی قیامت کے دن لوگوں کو جمع کرنے والا)، میں نبیِ توبہ ہوں (اس کے دو معنی ہیں : ایک یہ کہ میں بہت زیادہ توبہ کرنے والا ہوں اور دوسرے یہ کہ میری وجہ سے لوگ توبہ کیا کریں گے اور ان کی توبہ قبول ہوگی) : اور میں نبیِ رحمت ہوں، اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تمام جہانوں کے لیے باعثِ رحمت ہوں۔[56]

خُلق شخصیتِ انسانی کا آئینہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے آپؐ کے خُلق سے متعلّق فرمایا ہے کہ وہ عظیم ہے۔[57] عظمتِ خُلق کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ کے ظرف میں وُسعت و پہنائی اور عادات و خصائل اور افعال و کردار میں رفعت و خوبی بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔ آپؐ چونکہ نبیِ رحمت تھے، اس لیے آپؐ کی بعثت کی غایتِ حقیقی مکارمِ اخلاق اور محاسنِ افعال کی اِتمام و تکمیل تھی۔ حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا : مجھے محاسنِ اخلاق و افعال کی تکمیل و اتمام کے لیے مبعوث کیا گیا ہے۔[58] اس سے ملتی جلتی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا : میں حُسنِ اخلاق کی تکمیل و اتمام کرنے کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں۔[59] اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو دنیا میں حُسنِ اخلاق و کردار کا عظیم ترین معیار قائم کرنے کے لیے مبعوث فرمایا تھا۔ چنانچہ آپؐ نے نظری طور سے نہیں، جیساکہ فلاسفہ اور علمائے اخلاقیات کا طریقہ ہے، بلکہ عملی طور سے عظمتِ خلق کا معیار قائم کیا اور یہ آپؐ کی ایک ما بہ الامتیاز خصوصیت ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے آپؐ سے فرمایا : اور آپؐ کے اخلاق عظیم ہیں۔ (القلم ۶۸ : ۴)۔ اور پھر یہ بھی فرمایا: اور ہم نے آپؐ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ (الانبیآء ۲۱ : ۱۰۷)۔ اس سے یہ کلیہ مستنبط ہوا کہ خُلقِ عظیم اور رحمۃٌ لِّلعالمینی لازم و ملزوم ہیں۔ اسی طرح رحمۃٌ لِّلعالمینی اور ختمِ نبوّت لازم و ملزوم ہیں۔

حُسنِ خُلق بہت بڑی نعمت ہے۔ چنانچہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم اس نعمت کے لیے اللہ کا شکر بجا لاتے تھے۔ حضرت جعفر بن محمدؓ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم جب آئینہ دیکھتے تو فرماتے : حمد و ستائش کا سزاوار صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے میری ظاہری شکل و صورت، ہیئت، قد و قامت (خَلق) کو اور عادات و خصائل اور سرشت (خُلق) کو حسین بنایا۔[60] حُسنِ خُلق کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس حدیثِ پاک سے لگایا

جاسکتا ہے کہ ایمان میں زیادہ کامل وہ لوگ ہیں جن کے اخلاق زیادہ حسین ہیں۔[61]

چونکہ اسلام آرزوئے حُسن ہے، لہٰذا زندگی کا کوئی شعبہ ہو، وہ ہر بات، ہر چیز اور ہر قول و فعل کو حُسن ہی کے حوالے سے دیکھتا ہے اور یہی اس کے نزدیک نیکی و بدی، خیر و شر اور حسنہ و سیئۃ کا معیار ہے۔ حُسن دراصل جمالیاتی قدر ہے۔[62] انسان کی صوری جمالیاتی اقدار کو حُسنِ خَلق اور معنوی جمالیاتی اقدار کو حُسنِ خُلق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے، اور جیساکہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، اخلاقی اقدار اور جمالیاتی اقدار ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔[63] چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے نظامِ زندگی میں اخلاقی اقدار کو اساسی حیثیت حاصل ہے، لہٰذا اسی حوالے سے ہمیں پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرت یا آپؐ کی انقلابی تعمیری سرگرمیوں کا مطالعہ کرنا ہوگا، اور اس کے لیے ہمیں آپؐ یا اسلام کے نظامِ اخلاقیات سے آگاہی حاصل کرلینا ضروری ہے۔

سب سے پہلے ہمیں یہ معلوم کرلینا چاہیے کہ اخلاق کے معانی کیا ہیں؟ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں : خَلق اور خُلق اصل میں دونوں ایک ہیں جیسے شَرب و شُرب اور صَرم و الصُّرم، لیکن ان میں فرق یہ ہے کہ خَلق ہیئات، اشکال اور صور کے ساتھ مخصوص ہے، جن کا تعلق ادراکِ بصر سے ہے اور خُلق مخصوص ہے قویٰ و سجایا یعنی فطری خصائل و طبائع سے جن کا تعلق بصیرت سے ہے۔[64] بحث کو آگے بڑھانے سے پہلے اس اہم نکتے کی طرف اشارہ کردینا ضروری ہے کہ اسلام کے فلسفۂ حیات کی اساس حُسن ہے، لہٰذا اس کی اخلاقیات کی بنیاد بھی حُسن پر قائم ہے بالفاظِ دیگر اخلاقی قدریں اصلاً جمالیاتی اقدار ہیں۔ چنانچہ انسان کے خَلق اور خُلق سے متعلق اسلام کا واضح اور قطعی موقف یہ ہے کہ وہ دونوں حسین ہیں۔ اس کی ایک واضح دلیل جو قرآنِ حکیم کا قولِ فیصل اور حرفِ آخر ہے، یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر تخلیق کو، جس میں انسان کا خَلق اور خُلق دونوں شامل ہیں، حسین بنایا ہے : وہ یعنی اللہ تعالیٰ غیب و شہود کا عالم اور صاحبِ عزّت و رحمت ہے۔ اس نے جو چیز بھی تخلیق کی، اسے حسین بنایا۔[65]

انسان کے خُلق یعنی طبیعت یا فطرت کے حسین ہونے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اسے طبعاً حُسن سے محبت اور اس کی آرزو و جستجو ہے۔ یہ جمالیاتی حقیقت ہے جس پر اسلام کے نظامِ فکر اور فلسفۂ حیات کی اساس ہے، لہٰذا قرآنِ حکیم اور اس کے مفسّرِ اعظم پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی تعلیمات میں اس کی بکثرت تصریحات ملتی ہیں، جن میں سے چند ایک کی نشان دہی

کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سورہ الانفطار میں فرماتا ہے : اے انسان! کس چیز نے تجھے اپنے اس ربِّ کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا، جس نے تیری تخلیق کی یعنی تیرا ہیولیٰ تیار کیا، پھر تجھے (یعنی تیرے خَلق یا قد و قامت اور اعضا و جوارح) کو موزوں و ہم آہنگ بنایا۔ پھر تجھ (تیرے خُلق یعنی فطرت و طبیعت) کو متناسب و معتدل بنایا، پھر جس صورت میں چاہا، تیری ترکیب کر دی۔[66]

ان آیات سے یہ معلوم ہوا کہ وجودِ انسانی میں صوری و معنوی طور پر تسویہ و تعدیل کی جمالیاتی قدریں پائی جاتی ہیں۔ تسویہ و تعدیل کا عمل دراصل تحسین کا عمل یا حسن کاری ہے۔ قرآنِ حکیم نے عملِ تقدیر کو بھی قریب قریب اسی مفہوم میں استعمال کیا ہے : الَّذی خَلَقَ فَسَوّٰی۔ وہ (ربِّ اعلیٰ ہے) جس نے انسان کی تخلیق کی، پھر (اس کے قد و قامت اور اعضاء و جوارح کو) ہم آہنگ و موزوں بنایا اور جس نے اس کی قدریں مقرر کیں اور اس کو ہدایتِ معنوی دی۔[67]

دوسری جگہ فرمایا : اس نے ہر ایک چیز کی تخلیق کی، پھر اس کی قدرِ مطلق مقرر کی۔[68]

چنانچہ اس عملی تقدیر کا نتیجہ ہے کہ جو چیز پیدا ہوتی ہے، موزوں ہی ہوتی ہے : ہم نے اس زمین میں ہر چیز موزوں پیدا کی ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ہر چیز کو حسین بنایا ہے۔[69] اس سے یہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ موزونی ہی اصلِ حُسن ہے اور اس کا اندازہ ہی قدر ہے۔ چونکہ موزونی عملِ تقدیر یا عملِ تسویہ و تعدیل کا حاصل ہوتی ہے، اس لیے قدر دراصل جمالیاتی قدر ہوتی ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کا تخلیقی عمل چونکہ اصل میں تسویہ و تعدیل یا تحسین و تقدیر کا عمل ہے، اس لیے اس کی ہر تخلیق خصوصاً انسان موضوعی و معروضی یا صوری و معنوی اعتبار سے حسین ہے، جیسا کہ آیاتِ قرآنی سے ثابت ہے : اس نے تمھاری صورتیں بنائیں تو بڑی ہی حسین صورتیں بنائیں۔[70]

دوسری جگہ فرمایا : ہم نے انسان کو نہایت حسین طبیعت یا سرشت میں پیدا کیا ہے۔[71] سورۂ رُوم میں ارشاد ہوتا ہے : اپنی توجّہ کو یکسُو ہو کر دین پر لگا دو، یعنی اللہ تعالیٰ کی فطرت پر جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خلقت یا فطرت میں کوئی تغیّر و تبدل نہیں ہوتا۔ یہی سیدھا اور قائم رہنے والا دین ہے، لیکن اکثر لوگ یہ نہیں جانتے۔[72]

قرآنِ مجید کے مہبط و شارحِ اعظم نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس آیت کی تفسیر اس طرح فرمائی ہے کہ جو بچّہ بھی پیدا ہوتا ہے وہ (حسین) فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے والدین اسے

یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ جس طرح ایک چوپایہ جانور کامل چوپایہ بچّہ جنتا ہے۔ کیا تم اس میں کوئی نقص پاتے ہو؟ پھر آپؐ نے یہ آیت پڑھی : فطرت اللہِ التی فطر الناس علیہا۔[73] اس بحث سے یہ تین حقائق مستنبط ہوئے : ایک یہ کہ انسان فطرتاً حسین پیدا ہوا ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ طبعاً حُسن سے محبّت رکھتا ہے اور تیسرا یہ کہ انسان کی جمالیاتی حِس[74] نہیں بدلتی۔ البتّہ خانگی و معاشرتی ماحول اس کے جمالیاتی ذوق[75] کو بدل ڈالتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی فطرت کے متعلّق آپؐ کا یہ ارشاد جتنا مشہور ہے اتنا سچّا بھی ہے کہ اللّٰہُ جَمِیلٌ یُحِبُّ الْجَمَالَ یعنی اللہ حسین ہے اور حُسن سے محبّت رکھتا ہے۔[76] انسان چونکہ اللہ تعالیٰ کی فطرت پر پیدا ہوا ہے، اس لیے وہ بھی فطرۃً یا طبعاً حُسن سے محبّت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے متعلّق قرآنِ مجید اور احادیثِ طیبہّ میں بکثرت آیا ہے کہ وہ صاحبِ رحمت[77]، رحمان و رحیم[78] ہے۔ اس نے رحمت کو اپنے نفس پر لازم کر لیا ہے[79] اور اس کی رحمت ہر شے کو محیط ہے۔[80] لہٰذا انسان میں بھی طبعاً رحمت کا داعیہ پایا جاتا ہے۔ رحمت کو اگر تمام اخلاقِ حسنہ اور نیکیوں کا سرچشمہ کہا جائے تو یہ مبالغہ نہیں، اعترافِ حقیقت ہوگا۔ بہر کیف، اللہ تعالیٰ چونکہ انسان کا اِلٰہ و ربّ ہے، اس لیے اس میں جملہ صفاتِ حَسَنہ پائی جاتی ہیں، جو انسان کے علم و قیاس میں آ سکتی ہیں۔ جیسا کہ مندرجۂ ذیل آیتِ قرآنی سے ثابت ہے : اللہ ہی اِلٰہ (یعنی معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود) ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ تمام حسین صفات اسی کی ہیں۔[81]

ان صفاتِ حسنہ کو اپنے اندر پیدا کرنا ہی اصلِ دین یا اصلِ خُلق ہے، اور یہ بات کتاب و حدیث سے ثابت ہے۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : (کہہ دو کہ ہم نے) اللہ کا رنگ (صفاتِ الٰہی) اختیار کر لیا ہے اور رنگ کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ سے حسین تر کون ہو سکتا ہے اور ہم تو اسی کی عبادت کرنے والے ہیں۔[82]

رنگِ الٰہی سے مراد اس کی صفاتِ حسنہ یا اخلاق ہیں اور ان کو اپنے اندر پیدا کرنے ہی سے اِنسان صاحبِ کردار اور حاملِ خُلقِ عظیم بنتا ہے۔ چنانچہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے : تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللہِ۔[83] یعنی اپنے اندر اللہ تعالیٰ کے اخلاق (صفاتِ حسنہ) پیدا کرو۔

اس جگہ اس عمل کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ تخلیقی عمل میں ارادہ و شعور اور حُسنِ نیّت پایا جاتا ہے۔ اس سے بادی النظر میں یہ مغالطہ سا ہوتا ہے کہ جب انسان اللہ تعالیٰ کی فطرت پر پیدا ہوا ہے، اس لیے وہ طبعاً حسین و حُسن پسند ہے تو پھر اسے اپنے اندر حسین صفات پیدا کرنے کی

کیا ضرورت ہے؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ صفاتِ الٰہی انسان میں بالقوہ موجود ہیں اور انھیں قوت سے فعل میں لانا انسان کا اپنا کام اور ذمّے داری ہے اور تخلقوا بِاَخلاقِ اللہ سے یہی مراد ہے۔

پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی رُو سے خیر و شر مثبت و منفی اخلاقی قدریں ہیں، ان سے متعلق آپؐ نے ایک ایسی حکیمانہ و بصیرت افروز بات کہی ہے جو اخلاقیات کا اصل الاصول ہے اور وہ یہ ہے کہ: اَلخَیرُ عَادَۃٌ وَالشَّرُّ حَاجَۃٌ[۸۵]؛ یعنی خیر انسان کا طبعی یا فطری تقاضا و خاصّہ ہے اور شر غیر فطری یا نفسیاتی خواہش ہے۔

حاجت دراصل کانٹے کو کہتے ہیں۔ لہٰذا شر ایک کانٹا ہے جو دل میں تیرِ نیم کش کی طرح چُبھ جاتا اور خلش پیدا کرتا ہے۔ اس مفہوم کی صراحت آپؐ کی ایک حدیثِ طیبہؐ میں بڑے بلیغ انداز میں کی گئی ہے: حضرت ابی امامہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہؐ سے پوچھا: ایمان کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: جب تیری حسنہ یا نیکی تجھے مسرت بخشے اور تیری سیئہ یا بدی تجھے بُری لگے اور غم لائے، تب تو مومن ہے۔ اس نے پھر پوچھا: یارسول اللہؐ! گناہ یا شر کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: جب کوئی چیز تیرے دل میں خلش اور اشتباہ پیدا کرے تو اسے چھوڑ دے (کیونکہ وہ گناہ یا شر ہے[۸۶])۔ اسی مضمون کی ایک اور حدیثِ طیبہؐ ہے۔ حضرت نواسؓ بن سمعان کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے البِرُّ وَالاِثمُ یعنی نیکی اور بدی کی ماہیت سے متعلق دریافت کیا۔ آپؐ نے فرمایا: نیکی حُسنِ خُلق ہے اور بدی یا گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں خلش پیدا کرے اور تو اس امر کو بُرا سمجھے کہ لوگ اس سے واقف ہوجائیں[۸۷]۔

ان احادیثِ طیبہؐ میں خیر و شر کا ایک عالمگیر و فطری معیار بتایا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ نیکی چونکہ حسنہ یا حسین چیز ہے اس لیے وہ دل کو مسرت بخشتی ہے اور بدی چونکہ سیّئہ یا قبیح چیز ہے اس لیے اس سے دل میں خوف و حُزن کا کانٹا چُبھ کر خلش پیدا کرتا ہے لہٰذا اسے ترک کردینا چاہیے۔ اس جگہ اس جمالیاتی حقیقت کی طرف اشارہ کردیا جاتا ہے کہ حسن کا خاصّہ طمانیت آفرینی و سرور انگیزی ہے اور اس کی ضد قبح کا خاصّہ غم انگیزی و خوف آفرینی ہے۔ نیز طمانیت و مسرت سے دل کو ٹھنڈک پہنچتی ہے جب کہ خوف و حُزن سے اس کو آگ سی لگ جاتی ہے۔ اس سے یہ مستنبط ہوا کہ صاحبِ حُسن و سرور وہ شخص ہوتا ہے یا ہوسکتا ہے جس کے اخلاق حسین ہوں یا بالفاظِ دیگر جو رنگِ الٰہی سے مزیّن یا صفاتِ الٰہیہ سے متصف ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ ایمان اور حُسنِ خُلق لازم و ملزوم ہیں چنانچہ حضرت عمروؓ بن عنبسہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ سے پوچھا: اَیُّ الاِیمَانُ اَفضَلُ؟ یعنی ایمان کی افضل و اعلیٰ بات کون سی ہے؟ آپؐ نے فرمایا خُلق یعنی حُسنِ خُلق[۸۸]۔ آپؐ چونکہ رسول اللہؐ یا نبی و رسول اور صاحب وحی و تنزیل تھے، اس لیے ایمانؐ کے لحاظ سے آپؐ کا تمام انسانوں میں افضل ہونا قدرتی امر تھا، نیز چونکہ ایمان کو حُسنِ خُلق مُستلزم ہے، اس لیے آپؐ کا حُسنِ خُلق بھی عظیم تھا۔ جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (اے پیغمبرؐ) بلاشبہ تمھارا خُلق عظیم ہے[۸۹]۔ آپؐ کے اخلاقِ حسنہ کی عظمت یعنی وسعت و گیرائی کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ نہ صرف عالمِ انسانی بلکہ دیگر عوالم کو بھی محیط تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ کے اخلاقِ حسنہ سے تمام عالَم مستفید ہوتے تھے اور ہو رہے ہیں۔ اس مفہوم کو دوسری طرح سے یوں بھی ادا کرسکتے ہیں کہ آپؐ کے اخلاقِ حسنہ تمام عالموں کے لیے باعثِ رحمت تھے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے متعلق فرمایا ہے: اے محمدؐ! ہم نے آپؐ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بناکر بھیجا ہے[۹۰]۔

چونکہ حُسنِ خُلق کو رحمت مستلزم ہے اور رحمۃٌ للعالمینی کا ایک بنیادی تقاضا لوگوں کے اخلاق کی تحسین و تکمیل ہے، لہٰذا یہی آپؐ کی نبوّت کا بنیادی وظیفہ تھا، جیسا کہ آپؐ کے اس ارشاد سے ثابت ہے کہ میری بعثت کا مقصد حُسنِ اخلاق کو مکمّل و کامل بنانا ہے[۹۱]۔ اس سے ملتی جلتی حدیث کے الفاظ ہیں: میں تو مکارمِ اخلاق کو مکمل و کامل کرنے کے لیے مبعوث ہوا ہوں[۹۲]۔ اس امر کے باوصف کہ خود اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے خُلقِ عظیم کی شہادت دی ہے، آپ پھر بھی بقول حضرتِ عائشہؓ یہ دعا فرمایا کرتے تھے: اے اللہ! تُو نے میرے خَلق یعنی قد و قامت اور شکل و صورت کو حسین بنایا ہے، تو میرے خُلق کو بھی حسین بنا[۹۳]۔ اس سے آپؐ کی نظر میں حُسنِ خُلق کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

آپؐ نے حُسنِ خُلق کو بھلائی اور نیکوکاری کا معیار قرار دیا ہے چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: یعنی تم میں نیک ترین شخص وہ ہے جس کے اخلاق حسین[۹۴] ہیں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ایمان میں کامل وہ لوگ ہیں جن کے اخلاق حسین[۹۵] ہیں۔ جس طرح صدق کا اعتبار حق گوئی و تصدیقِ حق ہے، اسی طرح حُسنِ خُلق کا اعتبار حُسنِ سلوک و احسان ہے۔ دوسرے لفظوں میں حسنِ خلق و احسان ہی سے معتبر بنتا ہے اور یہی اصل آپؐ کی اس حدیثِ پاک

میں مضمر ہے۔ حضرت معاذؓ کہتے ہیں کہ جب میں یمن کو روانہ ہونے لگا اور گھوڑے پر پا بہ رکاب ہوا تو رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مجھے آخری نصیحت فرمائی : اے معاذ! لوگوں کے لیے اپنے خُلق کو حسین بنا۔[96] اس سے یہ نتیجہ مستنبط ہوتا ہے کہ صاحبِ حُسنِ خلق کے لیے محسن ہونا ناگزیر ہے اور مُحسن کا مطلب دوسروں کے ساتھ ہمیشہ احسان کرنے والا ہے، اور احسان ایسے حُسنِ سلوک کو کہتے ہیں جس سے دوسرے مطمئن و خوش ہو جائیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ احسان حُسن سے مشتق ہے، جس کا خاصّہ طمانیت آفرینی و سرور انگیزی ہے جُسنِ خُلق سے احسان کرنیوالے میں جاذبیّت و محبوبیّت پیدا ہوتی ہے۔ اس حکیمانہ نکتے کو پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے بلیغ و سہلِ مُمتنع انداز میں اس طرح بیان فرمایا ہے : تم میں سے وہ شخص مجھے سب سے پیارا ہے جس کے اخلاق سب سے زیادہ حسین ہیں۔[97]

خُلق کے بے شمار محاسن ہیں، لیکن آپؐ کے ارشاد کے مطابق حیا اسلام کا خصوصی خُلق ہے۔ چنانچہ حضرت زید بن طلحہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا : ہر دین کا ایک خُلق یا خصوصی وصف ہوتا ہے اور اسلام کا خُلق حیا ہے۔[98] اسلام میں حیا کی غیر معمولی اہمیّت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ ایمان کا جُزوِ لاینفک ہے، جیساکہ اس حدیثِ پاک سے ثابت ہے : حضرت ابنِ عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ حیا اور ایمان کو یکجا کر دیا گیا ہے، یعنی ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا گیا ہے، لہٰذا ان میں سے جب ایک کو اٹھا لیا جاتا ہے تو دوسرے کو بھی اٹھا لیا جاتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں ہے کہ جب ان میں سے کسی ایک کو دور کیا جاتا ہے تو دوسرا بھی سلب ہو جاتا ہے۔[99]

حیا اسلامی ثقافت کی ایک امتیازی خوبی ہے کیونکہ یہ ایمان اور حُسنِ خُلق کو مُستلزم ہے۔ حیا ایمان کا ایک جزوِ لاینفک ہے اور جنّت میں صرف ایمان دار لوگ ہی جائیں گے۔ لہٰذا اس سے یہ استنتاج کر سکتے ہیں کہ حیا حصولِ جنّت کی ایک پیش شرط (Pre-requisite) ہے۔ اس پر اس حدیث پاک سے استشہاد کیا جا سکتا ہے :

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا : حیا ایمان میں سے ہے۔ یعنی اس کا جزو ہے اور ایمان دار جنت میں جائے گا۔ نیز بے حیائی بدی میں سے ہے اور بدکار شخص دوزخ میں جائے گا۔[100] تمام انبیآء علیہم السّلام کی تعلیمات میں یہ اصلُ الاصُول پایا جاتا ہے کہ حیا ایک ایسا فطری حجاب ہے جو انسان کو فواحش و منکرات سے محفوظ رکھتا ہے،

لیکن جب یہ حجاب اُٹھ جاتا ہے تو وہ کھُل کھیلنے میں باک محسوس نہیں کرتا۔ چنانچہ حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے کہ انبیآءِ سابقین کے کلام میں جو بات لوگوں کو ملی ہے، وہ یہ ہے کہ جب تُو نے شرم و حیا کو اُٹھا کر رکھ دیا تو اب جو تیرا دل چاہے کر۔[101] آپؐ نے حیا کی ایک امتیازی خوبی یہ بتائی ہے کہ اس کے نتائج و عواقب ہمیشہ اچھے ہی نکلتے ہیں کیونکہ یہ سر تا سر خیر ہے۔ حضرت عمران بن حصینؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے کہ حیا بھلائی اور نیکی کے سوا کوئی بات پیدا نہیں کرتی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حیا سر تا سر بھلائی اور نیکی ہے۔[102]

کتبِ حدیث و سیرت کے مطالعے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ آپؐ کی تعلیمات میں حُسنِ خُلق کو ازبس اہمیّت حاصل ہے، کیونکہ اسے حاصلِ ایمان و اسلام قرار دیا گیا ہے۔ اس دعوے کی صراحت و دلیل کے طور پر مزید چند احادیثِ طیّبہ پیش کی جاتی ہیں :

بیہقی کی روایت ہے کہ صحابہ کرامؓ نے پوچھا : یارسُول اللہ ماخیرَ مَا اُعْطِیَ الْاِنْسَان ؟ یعنی انسان کو قدرت کی طرف سے جو چیزیں عطا کی گئی ہیں ان میں سے بہتر چیز کون سی ہے؟ آپؐ نے فرمایا : الخُلُقُ الحُسن یعنی حُسنِ خُلق۔[103] حُسنِ خُلق کے اللہ تعالیٰ کی بہترین نعمت ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ اس کی بدولت انسان احسان و تقویٰ کا بلند ترین مقام حاصل کر لیتا ہے، جیساکہ آپؐ کے اس ارشاد سے ظاہر ہے : حضرت عائشہ صدیقہؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ مومن اپنے حُسنِ خُلق کے ذریعے رات کو عبادت کرنے اور دن کو روزہ رکھنے والے شخص کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔[104] اس کی توجیہہ آپؐ ہی کی ایک حدیثِ پاک سے یوں ہو جاتی ہے کہ اجر و ثواب کے لحاظ سے حُسنِ خُلق تمام نیکیوں پر بھاری ہے : حضرت ابودرداؓ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن مومن کے ترازو میں جو چیزیں (یعنی نیکیاں) رکھی جائیں گی، ان میں سب سے وزنی چیز حُسنِ خُلق ہے اور اللہ تعالیٰ فحش بکنے والے بیہودہ گو کو اپنا دشمن سمجھتا ہے۔[105]

اس حدیث سے یہ اصل معلوم ہوئی کہ فحش نگاری و بدگوئی بدخُلقی ہے اور ایسا شخص دشمنِ خدا ہے۔ ظاہر ہے، دشمنِ خدا جنّتی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ حضرت حارثہ بن وہبؓ کہتے ہیں کہ بدخلق، بخیل اور بدگو شخص جنّت میں داخل نہ ہوگا۔[106]

محاسنِ اخلاق میں سے رِفق یعنی لُطف و مہربانی کو آپؐ کی تعلیمات میں بڑی اہمیّت حاصل

ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ رَفِیْقٌ وَّیُحِبُّ الرِّفْقَ : یعنی اللہ تعالیٰ لطیف و مہربان ہے اور لطف و مہربانی سے محبت رکھتا ہے اور انسان کو نرمی و مہربانی پر وہ چیز عطا کرتا ہے جو درشتی و سختی پر عطا نہیں کرتا اور نہ نرمی و مہربانی کے علاوہ کسی اور چیز پر۔ اس سے ملتی جلتی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا : نرمی و مہربانی کو اپنے اوپر لازم کر لو، سختی و درشتی اور بے حیائی سے اپنے آپ کو بچاؤ، اس لیے کہ جس چیز میں رِفق ہوتا ہے وہ رِفق اس کی زینت بنتا ہے اور جس چیز سے رِفق نکال لیا جاتا ہے، وہ عیب دار ہو جاتی ہے۔[۱۰۷] رِفق شخصیتِ انسانی کا حُسن ہی نہیں دل کی سعادت بھی ہے اور اس سے سعید دلوں ہی میں نیکیوں کے سوتے پھُوٹتے ہیں۔ چنانچہ آپؐ کا ارشاد ہے کہ جس شخص کو نرمی و سعادت سے محروم کیا جاتا ہے اسے نیکی اور بھلائی سے محروم کر دیا جاتا ہے۔[۱۰۸] اس مضمون کی ایک اور حدیث ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس گھرانے میں اللہ تعالیٰ رِفق پسند کرتا ہے، اس کی بدولت اسے فائدہ پہنچتا ہے، بصورتِ دیگر اسے نقصان پہنچتا ہے۔[۱۰۹]

معائبِ خُلق میں غصّہ اور تکبّر آپؐ کی نظر میں خاص طور پر انفرادی و اجتماعی زندگی گزارنے کے لیے مضرّت رساں ہیں۔ ایک بار کسی شخص نے آپؐ سے عرض کیا کہ مجھے نصیحت فرمائیے۔ آپؐ نے فرمایا : لَاتَغْضَبْ، یعنی غُصّہ نہ کر۔ اس شخص نے کئی مرتبہ یہی بات کہی اور ہر دفعہ آپؐ نے یہی فرمایا : غصّہ نہ کر۔[۱۱۰] غصّے سے چونکہ عقل مفلوج اور جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں، لہٰذا آپؐ کے ارشاد کے مطابق ایسی حالت میں اپنے آپ پر قابُو پانے والا شخص ہی شہ زور و پہلوان ہوتا ہے۔[۱۱۱]

تکبّر بھی معائبِ خُلق میں سے ہے۔ یہ انسان میں فرعونیّت و فارونیت پیدا کرتا ہے اور اس طرح اسے اس کے مقامِ عبدیّت سے گِرا کر اسفل السّافلین میں پہنچا دیتا ہے۔ چنانچہ آپؐ کا ارشاد ہے کہ جس شخص کے دل میں رائی برابر بھی ایمان ہوگا وہ دوزخ میں داخل نہ ہوگا اور جس شخص کے دل میں رائی برابر بھی کبر و غرور ہوگا، وہ جنّت میں داخل نہ ہوگا۔[۱۱۲] ایک اور حدیثِ پاک میں آپؐ نے تین قسم کے بدخُلق انسانوں کو دوزخی قرار دیا ہے۔ ان میں سے ایک عُتُل ہے، یعنی لغو اور جھُوٹی بات پر سخت جھگڑا کرنے والا، دوسرا جواظ یعنی درشت یا بدمزاج، اور تیسرا مستکبر یعنی مغرور اور متکبّر۔[۱۱۳]

آخر میں حُسنِ خُلق اور بدخُلقی سے متعلق ایک حدیثِ طیبہ حرفِ آخر کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے ممبر پر کھڑے ہو کر فرمایا : اے لوگو! تواضُع اختیار کرو، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو یہ کہتے سُنا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی خاطر تواضع کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے

مرتبے کو بلند کرتا ہے اور جو شخص اپنے آپ کو اپنی نظر میں حقیر سمجھتا ہے اور لوگوں کی نظر میں وہ بزرگ و عظیم ہوتا ہے، لیکن جو شخص غرور و تکبّر کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو پست کر دیتا ہے، پھر وہ لوگوں کی نگاہ میں حقیر و ذلیل ہو جاتا ہے اور اپنے دل میں اپنے آپ کو بڑا خیال کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ لوگوں کی نگاہ میں کتّے اور سوُر سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔[۱۱۴]

ان تمام مباحث کا ماحصل یہ نکلا کہ اسلام کے نظامِ فکر و عمل میں حُسنِ خُلق کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، اور حُسنِ خُلق عبارت ہے جمالیاتی اخلاقی اقدار سے[۱۱۵]، جو اسلامی ثقافت[۱۱۶] کی بنیادیں فراہم کرتی ہیں۔

سُنّتِ حَسَنہ :

انسان کی عظمت و کمال، اس کے اخلاق و کردار اور روشِ زندگی (سُنّت) کے مرہُونِ منّت ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید نے آپؐ کی سُنّتِ حسنہ کو تمام بنی نوعِ انسان کے لیے ایک مثالی نمونہ قرار دیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپؐ کی سُنّتِ حسنہ کیا ہے؟ قرآن مجید اور احادیثِ طیبّہ میں اسے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ بعض اصحاب نے اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے یہی سوال اس طرح پوچھا کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا خُلق و کردار کیا ہے؟ انھوں نے فرمایا : کیا تم نے قرآن مجید پڑھا ہے؟ انھوں نے جواب دیا : ہاں۔ حضرت صدّیقہؓ نے فرمایا : یہی تو رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا خُلق یا اُسوۂ حَسَنہ ہے۔[۱۱۷] آپؐ کی سیرت دراصل آپؐ کی سُنّتِ حسنہ ہی ہے، جو قرآن مجید کی عملی تفسیر ہے۔ بہرحال آپؐ نے اپنی سُنّتِ حسنہ کو ایجازِ بلاغت سے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ دریائے معانی کو الفاظ کے کوزے میں بند کر دیا ہے۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے عرض کیا : آپؐ کی سنّت کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا : معرفت میرا راسُ المال (سرمایۂ زندگی ہے)، عقل میرے دین کی اصل ہے۔ محبت میری بنیاد ہے۔ شوق میرا مرکب (سواری) ہے۔ ذکرِ الٰہی میرا انیس ہے۔ اعتماد میرا خزانہ ہے۔ غم میرا رفیق ہے۔ علم میرا ہتھیار ہے۔ صبر میرا لباس ہے۔ رضا میرا مالِ غنیمت ہے۔ عجز میرا فخر ہے۔ زُہد میرا پیشہ ہے۔ یقین میری قوّت ہے۔ صدق میرا حامی و سفارشی ہے۔ طاعت میری کفایت کرنے والی ہے۔ جہاد میرا خُلق ہے اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔[۱۱۸] دیکھنے میں یہ سترہ[۱۷] چھوٹے چھوٹے جملے ہیں، لیکن یہ کتاب فلسفۂ حیات

کے جملہ سترہ[17] ابواب ہیں اور ہر باب اپنے موضوع کا آئینہ ہے۔ اب آپ ﷺ کے ان ارشادات عالیہ کو واضح طور سے سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے :

(۱) معرفت میرا راس المال ہے :

معرفت کے معنی ہیں، پہچاننا۔ معرفت دو قسم کی ہے : معرفتِ نفس اور معرفتِ الٰہی۔

(ا) معرفتِ نفس کے متعلق علامہ اقبال فرماتے ہیں[119] :

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سُراغِ زندگی
تُو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن

معرفت کا سرچشمہ غور و فکر ہے۔ انسان خلوصِ نیّت کے ساتھ پہلے سوچے سمجھے نظریات و معتقدات، علمی و مذہبی تعصّبات وغیرہ سے دل کو صاف کر کے اپنی ہستی پر غور و فکر کرے تو اسے اپنی ذات میں مضمر صلاحیتوں کا پتا چلتا ہے' اس پر اس کا مقصدِ حیات منکشف ہوتا ہے۔ اسے کائنات اور اپنے اِلٰہ و ربّ کے رشتے کی نوعیّت کا عِلم ہوتا ہے۔ اس طرح معرفتِ نفس سے معرفتِ الٰہی حاصل ہوتی ہے۔ صوفیہ کے مندرجۂ ذیل قول کا یہی مطلب ہے :

مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ : جس کسی نے اپنے نفس کو پہچان لیا' اس نے اپنے ربّ کو پہچان لیا۔ معرفتِ نفس سے انسان میں اپنی حیثیتِ عبدیّت اور اللہ تعالیٰ کے مقامِ الوہیّت کا ایقان و اذعان پیدا ہوتا ہے۔ اس سے نہ تو اس میں فرعونیّت، ہامانیّت اور قارونیّت پیدا ہوتی ہے اور نہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو اپنا اِلٰہ ہی بناتا یا سمجھتا ہے۔ علاوہ ازیں جب وہ اپنی ذات میں مُضمر صلاحیّتوں کو دریافت کرتا ہے تو اس کے دل میں ان کو کام میں لانے کا داعیّہ پیدا ہوتا ہے اور وہ انھیں قوت سے فعل میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ کوشش اس کی عظمت و کامیابی کی ضامن بن جاتی ہے۔

(ب) معرفتِ الٰہی سے انسان مُوحّد بنتا ہے۔ شرک و بُت پرستی سے اسے سخت نفرت ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ جمیل و جلیل ہے۔ اس کے جمال و جلال کے مشاہدے سے اس پر نہ صرف حقیقتِ حُسن آشکارا ہوتی ہے بلکہ اس میں جمالیاتی ذوق بھی پیدا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے ایک تو حُسن سے محبت ہو جاتی ہے' لہٰذا وہ قبح سے نفرت کرنے لگتا ہے اور دوسرے اس میں حُسن و قبح اور خیر و شر میں تمیز کرنے کی حس بیدار ہو جاتی ہے۔ عارف میں جُوں جُوں صفاتِ الٰہی

کی پہچان بڑھتی جاتی ہے، اس میں ان صفات کو اپنے اندر پیدا کر لینے کا شوق پیدا ہوتا جاتا ہے۔ اس شوق کی بدولت ہی عارف صفاتِ الٰہی سے اپنی شخصیّت کو متّصف کر لیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ اپنی زندگی کو رنگِ الٰہی (صبغۃُ اللہ) میں رنگ لیتا ہے[120]۔ یہی دین کی غایت' رُوحِ انسانی کی آرزو اور اللہ تعالیٰ کی مشیّت ہے۔ اس لحاظ سے معرفت حیاتِ انسانی کا حقیقی سرمایہ ہے' جس کی بدولت وہ اپنے لیے زیادہ سے زیادہ نیکیاں کما سکتا ہے۔ راسُ المال اس مال و دولت کو کہتے ہیں جو صنعت و حرفت اور تجارت میں سرمائے کے طور پر لگایا جاتا ہے[121]۔

(۲) عقل میرے دین کی اصل ہے :

اصل کے معنی جڑ ہیں۔ پودا یا درخت اصل ہی پر قائم ہوتا ہے اور اسی پر اس کی نشو و نما اور بقا کا دار و مدار ہوتا ہے۔ اس منطقی قیاس کی بنا پر حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہوا کہ دینِ اسلام کی بقا اور نشو و ارتقا کا دار و مدار عقل پر ہے۔ بالفاظِ دیگر، عقل کے بغیر دین بے اصل ہے۔ اس سے یہ مستنبط ہوا کہ بے عقل لوگوں کا دین بے اصل ہوتا ہے لہٰذا جو قوم عقل سے کام لینا چھوڑ دیتی ہے' اس کے دین کا شجر برگ و بار لانا چھوڑ دیتا ہے اور وہ صرف بے ثمر ہی نہیں ہو جاتا بلکہ بے بنیاد بھی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بے عقل فرد کی طرح بے عقل قوم کی زندگی بھی بے مقصد ہوتی ہے اور اس کے فکر و عمل کی نہ تو کوئی منزل ہوتی ہے اور نہ جہت۔ وہ اپنی خواہشوں کو اپنا اِلٰہ بنا لیتی ہے' جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے نفسِ امّارہ کی محکوم و مطیع بن جاتی ہے۔ اس کا ضمیر کمزور بلکہ مُردہ ہو جاتا ہے۔ بے عقل لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : اور اللہ تعالیٰ بے عقل لوگوں پر نجاست ڈالتا ہے[122]۔ اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر اس نفسیاتی حقیقت کی صراحت کر دی ہے کہ عقل سے کام نہ لینا دراصل بیماریِ دل کی وجہ سے ہوتا ہے' اور جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہوتی ہے ان کے دل و دماغ بلکہ ساری زندگی ناپاک و پلید ہوتی ہے اور ان کی موت کفر پر ہوتی ہے[123]' اور جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہے' اللہ تعالیٰ نے ان کی پلیدی پر پلیدی کو زیادہ کیا اور وہ کفر کی حالت ہی میں مر گئے۔

عقل اس لیے بھی دین کی اساس ہے کہ قرآنِ مجید کو عقل ہی کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے[124]۔ قرآنِ مجید اور حدیثِ پاک سے ثابت ہوا کہ عقل اور دین لازم و ملزوم ہیں۔ عقل ہی کے ذریعے

انسان دین کے اغراض و مقاصد، قرآنِ مجید اور احادیثِ طیبہ کے معارف، اسرار و رموز اور علوم وغیرہ سے آگاہی حاصل کر سکتا، حکمت سیکھ سکتا اور اس کا اظہار و ابلاغ کر سکتا ہے یعنی تبلیغ کا فریضہ ادا کر سکتا ہے۔ چنانچہ قرآنِ مجید نے عبادُ الرحمٰن یعنی اللہ تعالیٰ کے بندوں کی ایک پہچان یہ بتائی ہے کہ انھیں اللہ تعالیٰ کی باتیں سمجھائی جاتی ہیں تو وہ ان پر اندھے اور بہرے ہو کر نہیں گرتے بلکہ عقل و ہوش سے ان پر غور و فکر کرتے ہیں۔[۱۲] عقل ہی وہ غوّاص ہے جو آیاتِ الٰہی کے بحرِ زخار میں سے گوہرِ معانی کو نکالتی ہے، لہٰذا جو لوگ فہمِ قرآن میں عقل سے کام نہیں لیتے اور آیاتِ الٰہی میں غور و فکر نہیں کرتے وہ کفرانِ نعمت کرتے ہیں اور یہ حقیقت بھول جاتے ہیں کہ فرد ہو یا قوم جو بھی اللہ تعالیٰ کی جس نعمت سے کام لینا چھوڑ دیتا ہے، قدرت اس سے وہ نعمت چھین لیتی ہے۔ زوالِ اُمت کے بعد اس کا سب سے بڑا زیاں یہ ہوا ہے کہ اس سے عقل چھین لی گئی ہے اور وہ اس کے دین کی اساس نہیں رہی۔ حاصلِ کلام یہ کہ ملتِ اسلامیہ کی نشاۃِ ثانیہ اور احیائے علوم اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک وہ سُنّتِ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم پر عمل کرتے ہوئے عقل کو اپنے دین کی اساس نہیں بناتی۔

(۳) محبّت میری بُنیاد ہے :

اسلام کا یہ بنیادی عقیدہ ہے کہ محبّتِ الٰہی انسان کو طبعًا ودیعت کی گئی ہے، اور اسے اس حقیقت کا فطری اذعان ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا الٰہ یعنی معبُود و محبُوب اور مطلُوب و مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبّت کا یہ اقتضا بھی ہے اور خاصّہ بھی کہ اس کی مخلوقات خصوصًا بنی نوعِ انسان سے محبّت کی جائے۔ محبّتِ انسانی کا مطلب یہ ہے کہ بنی نوعِ انسان سے ہمدردی و غمگساری اور عدل و احسان کیا جائے اور ان کی خاطر ایثار و قربانی سے دریغ نہ کیا جائے۔ محبّت جب حیاتِ انسانی کی اساس بن جاتی ہے تو وہ اپنی ذات، نیز اپنوں اور بیگانوں سب کے لیے رحمت بن جاتی ہے۔ چونکہ محبّت (اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کی) آپؐ کی حیاتِ طیبہ کی بنیاد تھی، اس لیے آپؐ نہ صرف عالمِ انسانی بلکہ تمام عالموں کے لیے بھی رحمت تھے اور ہیں۔

تقویٰ یا خشیّتِ الٰہی محبّت ہی کی پیداوار ہے، اور تقویٰ ایک طرف اللہ تعالیٰ کے قانونِ مکافاتِ عمل کے شعُور پر اور دوسری جانب انسان کے اپنی ذات سے سچّی محبّت پر دلالت

کرتا ہے، جس کی بدولت ایک تو وہ اپنے نفس اور اپنے اہلِ عیال کو آتشِ خوف و حُزن سے بچانے کی کوشش کرتا ہے اور دوسرے اپنے اِلٰہ کے قرب و رِضوان کی خاطر اسے اپنی حقیقی راہ و منزل کی طلب و جستجو ہوتی ہے۔

حُسن چونکہ معروضِ محبّت ہے اس لیے حُسن و محبّت لازم و ملزوم ہوئے۔ اس سے یہ کُلیّہ مستخرج ہوا کہ جس دل میں جس قدر حُسن ہوگا، اسی قدر اس میں محبت ہوگی اور یہی مثل معاشرے پر بھی صادق آتی ہے۔ اس کا نقیض یہ ہوا کہ جس دل یا معاشرے میں محبّت نہیں ہوگی وہ حسین بھی نہیں ہوگا۔ چونکہ آپؐ کی حیاتِ طیبہّ کی اساس محبت تھی، اس لیے آپؐ پیکرِ حُسن و محبّت تھے۔ محبت جب حُسنِ عمل یا انسان کے ذریعے قوت سے فعل میں آتی ہے تو رحمت بن جاتی ہے، لہٰذا آپؐ کے رحمۃ للعالمین ہونے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ آپؐ کی ذاتِ اقدس حُسن و محبّت کا جہانِ بے کراں تھی۔

(۴) شوق میرا مرکب (سواری) ہے :

شوق سے آپؐ کی مُراد طلب و جستجو یا آرزو ہے جس سے زندگی میں حرکی فعالیّت پیدا ہوتی ہے۔ "شوق میرا مرکب" کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ کی تمام انقلابی و تعمیری سرگرمیوں کا محرّک حقیقی شوق یا سوزِ آرزو تھا۔ آپؐ کی بعثت کا جو مقصد تھا یا بالفاظِ دیگر قدرت کی طرف سے آپؐ کو جو مشن تفویض کیا گیا تھا، اس سے آپؐ کو عشق بھی تھا اور اسے پورا کرنے کی طلب و جستجو بھی۔ چنانچہ یہ عشق و آرزو ہی آپؐ کے عظیم الشان مشن میں کامیابی کے بنیادی عوامل تھے۔

آرزو و جستجو کی اہمیّت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاتا ہے کہ اس کے فقدان سے حیاتِ انسانی میں جمُود و تعطُّل پیدا ہو جاتا ہے اور یہ منفی عمل اس کے انحطاط و اضمحلال اور ضُعف و زوال پر منتج ہوتا ہے۔ کسی فرد یا قوم کی یہ حالت ہو تو اسے مجازًا مُردہ کہتے ہیں۔ ہمیں یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگر کوئی قوم فقدانِ آرزُو کے باعث مُردہ ہو جاتی ہے تو سوزِ آرزُو ہی کے ذریعے وہ دوبارہ زندہ بھی ہو جاتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ آرزُو حیاتِ انسانی کے ارتقا کی ایک ناگزیر پیش شرط ہے یا بالفاظِ دیگر سوزِ آرزُو اور ارتقائے حیات لازم و ملزوم ہیں۔ حاصلِ کلام یہ ہے کہ اپنے نصب العین یا مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اپنے اندر آرزو کو زندہ و بیدار کرنا اور پھر سوزِ آرزو سے اپنی ذات کو زندہ رکھنا ناگزیر بھی ہے اور آپؐ کی سنّتِ حسنہ بھی۔

(۵) ذکرِ الٰہی میرا انیس ہے :

اصل جُملہ جتنا مختصر ہے' معانی و مطالب اتنے ہی وسیع و بلیغ ہیں۔ انیس کے معانی ہیں اُنس رکھنے اور محبت کرنے والا۔ یہ مقولہ بھی جتنا مشہور ہے اتنا سچا ہے کہ " دل را بدل رہیست " یعنی دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ چنانچہ جب ایک دوست دوسرے دوست کو یاد کرتا ہے تو اُس کے دل میں بھی اپنے دوست کی یاد آتی ہے۔ یہ تو انسانی دل کا حال ہے لیکن جب ایک بندہ اپنے اِلٰہ (معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود) کو یاد کرتا ہے جو دلوں کا حال جانتا ہے' تو وہ اپنے بندے کو کتنا یاد کرتا ہوگا' اس کا اندازہ اس کی رحمتِ بے پایاں سے لگایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کس پیار سے اپنے بندے سے کہتا ہے : مجھے یاد کرو، میں تمھیں یاد کروں گا[۱۲۶]۔ ظاہر ہے جس بندے کو اس کا اِلٰہ یاد کرے' جو خدائے متعال و ربّ جلیل ہے' اس سے بڑھ کر بندے کی اور خوش قسمتی کیا ہوسکتی ہے؟

دوست وجۂ طمانیّت و مسرّت ہوتا ہے اور ذکرِ الٰہی بھی وجۂ طمانیّت ہے[۱۲۷]، لہٰذا وہ بھی انسان کا دوست ہوا۔

آپؐ کے زیرِ نظر جملے میں یہ بھی ایک بلیغ و بصیرت افروز نکتہ ہے کہ آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ کو بہت یاد کرتا ہوں بلکہ یہ فرمایا کہ ذکرِ الٰہی میرا انیس ہے اور اس میں یہ نکتہ مضمر ہے کہ ایک تو اللہ تعالیٰ کا ذکر مجھے محبوب و مرغوب ہے' دوسرے اس سے مجھے اس کا پیار ملتا ہے جو سامانِ طمانیّتِ دل ہے۔ تیسرے محبوب کو دل ہر وقت یاد کرتا رہتا ہے' کیونکہ اس کی یاد تو تیرِ نیم کش کی طرح دل میں پیوست ہوتی ہے۔ صوفیہ کا یہ قول کہ " جو دم غافل سو دم کافر " اسی حقیقت کا غمّاز ہے۔

(۶) اِعتماد میرا خزانہ ہے :

اصل میں ہے " الثقۃُ کنزی " یہ دو لفظی جُملہ معانی کا گنجینہ ہے۔ کلام کے سیاق و سباق اور آپؐ کی سیرتِ طیبہ کے لحاظ سے آپؐ کے اعتماد کی نوعیت سہ گونہ تھی۔ آپؐ کو ایک تو ذاتِ الٰہی پر' دوسرے اپنی ذات پر اور تیسرے اپنے صحابہؓ یعنی اسلام کی تحریکِ انقلاب کے رُفقا پر اعتماد تھا۔ اللہ تعالیٰ پر اعتماد عبارت ہے توکّلِ الٰہی سے۔ توکّلِ الٰہی عبارت ہے انسان

کے اس ایقان و اُمید سے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرتا ہے جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں' اور وہ کسی کی محنت رائیگاں نہیں کرتا ہے۔ جد و جہد اور مساعئ جمیلہ کے بعد نُصرتِ الٰہی کی امید رکھنا توکل سے عبارت ہے۔ توکّلِ الٰہی تین چیزوں پر دلالت کرتا ہے : ایک ایمان باللہ' یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات مثلاً قُدرت' علم' رحمت وغیرہ پر' دوم قُدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل پر' اور تیسرے انسان کی رجائیت پسندی پر۔ ان تینوں چیزوں میں ایسی قوّت مضمر ہے جو انسان کی شخصیت کو عظیم و ناقابلِ تسخیر بناتی ہے۔

خود اعتمادی کامیابی کی ایک پیش شرط ہے۔ انقلابی عمل جو آپؐ کی بعثت کا بُنیادی مقصد تھا اور جس کے ذریعے آپؐ ایک عظیم و ہمہ گیر جمالیاتی معاشرتی انقلاب لانے میں کامیاب ہوئے، اس کی اساس خود اعتمادی پر ہے۔ خود اعتمادی کے بغیر شخصیّتِ انسانی کٹے پتنگ کی طرح ہوتی ہے' لہٰذا اس میں بادِ مخالف کا مقابلہ کرنے کی قوّت نہیں ہوتی۔ زمانے کی حریف قوّتوں کا کامیابی سے مقابلہ کرنے، کوئی عظیم کارنامہ سرانجام دینے اور زندگی کے تجربات سے گزرنے کے لیے خود اعتمادی ناگزیر ہے۔

رُفقا پر اعتماد کا مطلب سہ گونہ ہے۔ ان میں خود اعتمادی پیدا کرنا، ان کا اعتماد حاصل کرنا اور انھیں اپنا معتمد اور قابلِ اعتبار بنانا۔ ظاہر ہے اس اعتماد کے بغیر نہ تو کوئی قائد اپنے مشن میں کامیاب ہوسکتا ہے اور نہ کوئی سپہ سالار کامیابی سے جنگیں لڑ سکتا ہے۔ سیاسی اور عسکری میدان میں رفقا پر اعتماد کامیابی کی ایک لازمی پیش شرط ہے۔

مختصر یہ کہ اعتماد اپنی کُلّی حیثیت میں قوّت کا خزینہ ہے اور یہ قوّت شخصیّتِ انسانی کو ناقابلِ تسخیر بناتی ہے، نیز اس کی عظمت و کامیابی کی ایک پیش شرط اور قیادت کی ایک لازمی صفت ہے۔

(۷) غم میرا رفیق ہے :

غم دو قسم کا ہوتا ہے[۱۲۸]: ایک غمِ ذات اور دوسرا غمِ انسانیت' جسے غمِ روزگار اور غمِ عشق بھی کہتے ہیں۔ اپنی ذات کا غم شخصیّت کو مضمحل و ناتواں اور محدود و سوگوار بناتا ہے اور اگر یہ بہت بڑھ جائے تو زندگی کا بارِ گراں بن جاتا ہے۔ اس غم سے دل کو آتشِ خاموش لگ جاتی ہے اور وہ اذیت ناک عذاب بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس غمِ انسانیت میں ایک تو ذاتی و دُنیوی تمام غموں کو مٹا ڈالنے اور دوسرے شخصیّت کو بے کراں بنانے کی صلاحیّت پائی جاتی ہے،

علاوہ ازیں اس غم کی بدولت انسان میں بڑے سے بڑے امتحان سے بے خطر گزر جانے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔

قرآنِ مجید، احادیثِ طیبہ اور کُتبِ سیرت سے ثابت ہے کہ آپؐ کو اپنی ذات کا نہیں، انسانیت کا غم تھا اور اس غمِ انسانیت کی نوعیت محض مادّی یا دنیوی نہیں تھی، بلکہ مادّی رُوحانی یا دُنیوی اُخروی تھی۔ آپؐ ایک تو بنی نوعِ انسان کو ہر قسم کی استحصالی و طاغوتی (مثلاً فرعونی، ہامانی اور قارونی) قوّتوں سے، نیز شرک و بُت پرستی کے عقاید و عبادات سے نجات دلانا چاہتے تھے اور دوسرے ان کے لیے اخوّت و محبّت اور آزادی و مساوات کی بنیادوں پر ایک حسین و مثالی معاشرہ تشکیل و تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ آپؐ کا یہ مشن تھا اور اس کی تکمیل کا آپؐ کو غم تھا۔ اس غم کی شمع ہر وقت آپؐ کے قلبِ مبارک میں فروزاں رہتی تھی جس کی روشنی میں حسن کی تابانی اور سوز میں آنکھوں کی ٹھنڈک تھی۔ آپؐ کا غم آپؐ کی رحمت کی طرح عالمِ انسانی کو ہی نہیں، تمام عالموں کو محیط تھا۔ اس سے آپؐ کی شخصیّت کی عظمت و بے کرانی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

(۸) عِلم میرا ہتھیار ہے :

اسلام میں علم کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے جس کا اندازہ مندرجۂ ذیل امور سے لگایا جاسکتا ہے : اوّل، نبی کی حیثیت سے آپؐ کا اہم ترین فریضہ بنی نوعِ انسان کو علم و حکمت سکھانا تھا۔[۱۲۹] دوم، قرآنِ مجید، جو علم و حکمت کا سرچشمہ اور مرشد و ہادی ہے، اس سے متقی لوگ ہی ہدایت و روشنی حاصل کرتے ہیں[۱۳۰] اور اہلِ علم ہی میں خشیتِ الٰہی یا تقویٰ ہوتا ہے۔[۱۳۱] اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ تقویٰ، ایمان اور علم ایک ہی سلسلے کی تین کڑیاں ہیں۔ سوم، علم میں قوّتِ تسخیر پائی جاتی ہے جس کے سامنے ملائکہ سربسجود ہیں اور اس کو تسلیم نہ کرنا شیطنت کا خاصہ ہے۔

عِلم تین قسم کا ہے : موضوعی، معروضی اور ماورائی۔ موضوعی علم سے مراد معرفتِ نفس ہے۔ اس سے انسان کو اپنے اندر مضمر قوتوں کے خزینوں کا پتا چلتا ہے، جن کو فعل میں لاکر وہ عظیم و کامیاب بن سکتا ہے۔ اگر انسان اپنی ان قوتوں سے بے خبر رہے تو ظاہر ہے، وہ ان سے کام نہیں لے گا اور وہ ضائع ہو جائیں گی، جسے کُفرانِ نعمت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآنِ مجید اسے "خسران" یا نقصان پذیری بھی کہتا ہے۔[۱۳۲]

معروضی عِلم کا مطلب حقائقِ اشیاء کو جاننا ہے۔ اس علم سے انسان میں تخلیق و تعمیر، ایجاد و اختراع اور زمان و مکان کو تسخیر کرنے کی قوّت پیدا ہوتی ہے۔ علاوہ بریں معروضی علم سے انسانوں اور قوموں کے نفسیاتی حقائق، دشمنوں کے منصوبوں اور ان کی مادّی و اخلاقی قوّت کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ معلومات فتح و کامرانی کی پیش شرائط ہیں۔

ماورائی عِلم سے مراد اللہ تعالیٰ کی صفات و آیات کی معرفت ہے۔ اس کے من جملہ دیگر فوائد کے ایک یہ ہے کہ اس سے فکر و نظر میں تاریخ کے تیور پہچاننے کی صلاحیت اور زمان و مکان کی حدود سے ماورا جانے کی قوّت پیدا ہوتی ہے، جسے اصطلاحِ قرآنی میں "سلطان" سے تعبیر کیا گیا ہے۔[۱۳۳] اس عِلم سے انسان میں مستقبل بینی کی صلاحیت کے علاوہ قدرت کے قانونِ مکافات اور اُخروی زندگی کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ حکمت، جسے قرآنِ حکیم نے خیرِ کثیر کہا ہے،[۱۳۴] اس کی ناگزیر پیش شرط علم ہے۔ لہٰذا علم و قوت اور حکمت و خیرِ کثیر ایک ہی سلسلے کی مربُوط و لاینفک کڑیاں ہیں۔

آپؐ اسلام کی تحریکِ انقلاب کے علمبردار تھے، اور اس انقلابی عمل میں آپؐ کو کفّار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ کی اجتماعی قوتوں کا مقابلہ کرنا پڑا تھا اور یہ مقابلہ آپؐ نے علم کی قوت سے کیا تھا، جیسا کہ آپؐ کے ارشاد اَلعِلمُ سَلاَحِی (علم میرا ہتھیار ہے) سے ثابت ہے۔ آپؐ کے اس ارشاد میں یہ ازبس اہم نکتہ بھی مضمر ہے کہ آپؐ نے تلوار کے ذریعے نہیں بلکہ علم کی قوت سے اسلام دشمن قوتوں پر کامیابی حاصل کی اور ان کے دلوں کو مسخّر کر کے انھیں اپنی تحریکِ اسلام میں شامل کیا۔ اس سے صلیبی و صیہونی مستشرقین کے اس غلط اور گمراہ کن پروپگنڈے کی تردید ہو جاتی ہے کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے۔

(۹) صبر میرا لباس ہے :

لباس عُریانی اور جسمانی معائب کی پردہ پوشی کرتا، شدایدِ موسم سے بچاتا، نیز آراستگی و تزئین کے کام بھی آتا ہے۔ لہٰذا صبر بھی انسان کی کئی قسم کی نفسیاتی و مادّی کمزوریوں اور عیوب کی پردہ پوشی کرتا، اسے خوف و غم کی اذیّتوں، اغیار کی شماتت و تشنیع اور طنز و استہزا سے بچاتا اور عزّتِ نفس کی حفاظت کرتا ہے۔ نیز وہ انسان کا بھرم قائم رکھتا اور اس کی ہوا اکھڑنے نہیں دیتا۔

آپؐ اسلام کی تحریکِ انقلاب کے قائد تھے اور اس راہ میں آپؐ کو قدم قدم پر خطرناک اور شکیب رُبا دشواریوں اور مصائب سے دوچار ہونا پڑا، لیکن آپؐ نے نہ تو کبھی کسی قسم کی کمزوری، بزدلی اور خوف و خطر کا مظاہرہ کیا، نہ آپؐ کے پائے عزم و ثبات میں لغزش آئی اور نہ کبھی راہِ فرار اختیار کرنے کی کوشش ہی کی، بلکہ شجاعت و مردانگی سے ان کا مقابلہ کیا اور تیروں اور تلواروں کے سائے میں بھی آپؐ چٹان کی طرح ثابت قدم رہے۔ نتیجتاً نصرتِ الٰہی ہمیشہ ہی آپؐ کے شاملِ حال رہی۔

قرآن مجید نے بار بار یہ حقیقت بے نقاب کی ہے کہ نصرتِ الٰہی صبر کرنے والوں کے شاملِ حال ہوتی ہے۔[۱۳۵] صبر ان چار چیزوں میں سے ہے جو انسان کو انفرادی اور اجتماعی طور پر تاریخ کی حریف قوتوں کی مضرتوں، معاشرتی و نفسیاتی اور اخلاقی و روحانی بیماریوں اور زندگی کے جمود و تعطل کے نتائج سے محفوظ رکھتا ہے۔[۱۳۶] صبر کو لباس بنانے میں یہ نکتہ مضمر ہے کہ انسان کو حسین انداز میں صبر کرنا چاہیے یا دوسرے لفظوں میں اس کو صبرِ جمیل کرنا چاہیے۔[۱۳۷]

(۱۰) رضا میرا مالِ غنیمت ہے :

رضا سے مراد رضائے الٰہی ہے اور جنگ میں دشمن کا جو ساز و سامان اور مال و دولت ہاتھ لگے، اسے مالِ غنیمت کہتے ہیں۔ قرونِ وسطیٰ میں فوجی سپاہیوں کو مالِ غنیمت کا لالچ تھا اور یہ لالچ جنگ و جدال کا ایک زبردست محرک تھا۔ اسلام نے ایسی جنگوں کے خاتمے اور پائدار بین الاقوامی امن کی خاطر مالِ غنیمت کے لالچ کو بڑے حکیمانہ طریق سے ختم کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس نے اہلِ ایمان میں اس حقیقت کا اذعان و ایقان پیدا کیا کہ جنگ فقط اللہ تعالیٰ کی راہ اور رضا کے لیے ہونی چاہیے جسے جہاد فی سبیل اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔[۱۳۸] نیز مالِ غنیمت کے لالچ میں لڑنے والوں کو کوئی اجر نہیں ملتا، چاہے وہ جان ہی کیوں نہ دے ڈالیں۔[۱۳۹] اسلام کے نزدیک مجاہد وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد و قتال کرتا ہے اور اگر اس میں ہلاک ہو جاتا ہے تو وہ شہید ہوتا ہے اور شہادت کا اجر جنّت کی حیاتِ ابدی ہے۔[۱۴۰]

"رضائے الٰہی میرا مالِ غنیمت ہے۔" آپؐ کے اس ارشاد سے مستشرقین اور دیگر اعدائے اسلام کے اس گمراہ کن پروپیگنڈے کا بُطلان ہو جاتا ہے کہ آپؐ مالِ غنیمت اور کشور کُشائی کے لیے جنگیں لڑتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض جنگوں میں مالِ غنیمت بھی

ہاتھ لگا، لیکن آپؐ نے ہمیشہ اسے لوگوں میں تقسیم کر دیا اور اپنے لیے کچھ نہ رکھا۔ کُتبِ حدیث و سیرت شاہد ہیں کہ آپؐ اور آپؐ کے اہل و عیال نے عمر بھر فقر و فاقہ میں زندگی بسر کی۔ آپؐ کی انقلابی اور تعمیری سرگرمیوں کی غایتِ حقیقی فقط رضائے الٰہی تھی۔ صحابہ کرامؓ جو آپؐ کی سنّتِ طیبہ کی بڑی سختی سے پیروی کرنے والے تھے، ان کی زندگی کا مقصودِ حقیقی بھی رضائے الٰہی تھا۔[۱۴۱]

(۱۱) عجز میرا فخر ہے :

انسان خِلقی طور پر کمزور، اللہ تعالیٰ کا محتاج اور اس کا بندہ ہے، اس لیے بندۂ محتاج کو عجز و تواضع ہی سزاوار ہے۔ کبریائی کا سزاوار فقط اللہ تعالیٰ ہے۔ انسان کا حقیقی مقام عبدیّت ہے اور یہ مقام حاصل کرنا ہی اس کی سب سے بڑی کامیابی ہے اور عظمت کی دلیل بھی۔ انسان جب اس مقام پر متمکّن ہو جاتا ہے تو اس کا دل غرور و تکبّر سے پاک و صاف اور عجز و انکسار سے معمور ہو جاتا ہے اور یہ متاعِ عجز و انکسار ہی اس کا سرمایۂ عزّت و افتخار ہے۔

تقویٰ اور ایمان لازم و ملزوم ہیں اور تقویٰ یا خشیّتِ الٰہی کا خاصّہ عجز و انکسار ہے، لہٰذا مومن کے کردار، گفتار میں عجز و انکسار ہوتا ہے جو ایمان کا خاصّہ بھی ہے اور اس کی شناخت بھی، اور مومن اسے حُسنِ خُلق اور سرمایۂ افتخار سمجھتا ہے۔ چونکہ آپؐ تقویٰ اور ایمان میں سب افرادِ نسلِ انسانی سے افضل تھے، اس لیے عجز و انکسار میں بھی آپؐ سب پر افضلیّت و فوقیّت رکھتے تھے۔ حالانکہ آپؐ بیک وقت پیغمبرِ اعظم و آخر بھی تھے اور حکمران بھی، ہادی و مُرشد بھی تھے اور مُعلّم و سپہ سالار بھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمان آپؐ کے ایک اشارے پر مال و جان اور اہل و عیال قربان کر دینے کو اپنی خوش قسمتی سمجھتے تھے۔

عظمتِ انسانی کے بلند ترین مقامِ محمود پر متمکّن پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کا اپنے عجز و انکسار کو اپنا سرمایۂ افتخار سمجھنا، ہمیں اس حقیقت کی یاد دہانی کراتا ہے کہ بندے کو عجز ہی سزاوار ہے اور اسی کو اپنے لیے وجہِ افتخار سمجھنا چاہیے۔

(۱۲) زُہد میرا پیشہ ہے :

زُہد کی حقیقت آپؐ کی سیرت کے حوالے سے مندرجۂ ذیل آیات سے واضح ہو جاتی ہے

"جب تم فراغت پاؤ تو عبادت میں لگ جاؤ اور اپنے ربّ ہی کی طرف راغب رہو۔"[۱۴۲]

چنانچہ آپؐ کا عمر بھر یہ شعار رہا کہ آپؐ تحریکِ اسلام و تبلیغ کے امور سے فارغ ہوتے تو اپنے اِلٰہ (معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود) کی رضا و دید کے لیے اس کی بارگاہِ حُسن میں پہنچ جاتے۔ اس کی یاد تیرِ نیمکش کی طرح آپؐ کے قلبِ مبارک میں پیوست تھی، اس لیے کہ دوست کے بغیر کسی کروٹ آپؐ کو قرار نہ تھا۔ لہٰذا راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر "بارگاہِ دوست" میں حاضر ہونا، اس کی حمد و ثنا میں رطب اللسان رہنا، کبھی عجز و نیاز سے رکوع و سجود کرنا اور کبھی آہ و فغاں اور گریہ و زاری سے دردِ محبت کا اظہار کرنا آپؐ کا دستورِ زندگی تھا۔

(۱۳) یقین میری قوّت ہے :

یقین کی تین قسمیں ہیں : عِلمُ الیقین[۱۴۳]، عینُ الیقین[۱۴۴] اور حقُّ الیقین[۱۴۵]، اور یہی اس کے اِرتقائی مدارج ہیں۔ عِلمُ الیقین عقل سے، عینُ الیقین مشاہدے سے اور حقُّ الیقین تجربے سے حاصل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر دُھواں نظر آئے تو عقل آگ پر قیاس کرتی ہے اور اُسے علم الیقین کہتے ہیں، لیکن آگ نظر آئے تو اسے عینُ الیقین اور جب آگ کے لمس سے اس کی حدّت و سوزش محسوس ہو تو اسے حقُّ الیقین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یقین چونکہ عقل، مشاہدے اور تجربے سے حاصل ہوتا ہے، اس لیے اس میں عِلم، واقعیت اور صداقت کی قوّت ہوتی ہے۔ اس قوّت سے دل میں صدق و طمانیت، عزم و ہمّت اور صبر و استقامت ایسے خصائص پیدا ہوتے ہیں جن کی بدولت انسان بڑی سے بڑی قربانی کرنے سے دریغ نہیں کرتا اور بڑے سے بڑے امتحان و تجربے سے گزر جاتا ہے۔ یقین کی قوّت ہی سے عقاید میں جلالت و حرکت پیدا ہوتی ہے اور عقایدِ جلیلہ و محرکہ ہی فرد و قوم کی قوّت و عظمت اور ترقی و کامیابی کے ضامن ہوتے ہیں۔ ہمیں یہ اصل یاد رکھنی چاہیے کہ یقین کی قوّت کے بغیر عقاید و ایمانیات بے جان ہوتے ہیں اور ان کی حیثیت نظریات و خیالات کی سی ہو جاتی ہے۔ مُردہ عقاید کی نوعیت "مردہ بدستِ زندہ" کی سی ہوتی ہے۔ اس سے اس امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ مردہ قومیں کیوں زندہ اقوام کی تقلید کرتی ہیں۔ قوتِ یقین سے محروم ہونے کے باعث جب کسی قوم کے عقاید مردہ یا بے جان ہو جاتے ہیں تو اسے "مردہ قوم" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس قوّتِ یقین کی بدولت جس قوم کے عقاید زندہ، جلیل اور حرکی ہوتے ہیں، وہ زندہ کہلاتی ہے اور زندہ قومیں ہی قوّت و سطوت کی مالک، ترقی کی راہ پر گامزن، زمانے کی راکب اور مُردہ قوموں کی قائد ہوتی ہیں۔

بحیثیت پیغمبرِ اعظم و آخرؐ اور رحمۃ للعالمینؐ کے آپؐ کا مشن ہمہ گیر و عالمگیر تھا اور آپؐ کو اس کی صداقت و اہمیّت کا حق الیقین تھا، اس لیے آپؐ کا یقین اور اس کی قوّت بھی اسی نسبت سے غیر محدُود تھی۔ اس یقین نے بلاشبہ آپؐ کی عظیم و بے مثال کامیابیوں میں ازبس اہّم کردار ادا کیا تھا۔

(۱۴) صدق میرا حامی و سفارشی ہے :

امام راغب اصفہانیؒ کے نزدیک الصِدق کے معنی ہیں : دل و زبان کی ہم آہنگی اور بات کا نفسِ واقعہ کے مطابق ہونا۔ اگر دونوں میں کوئی ایک شرط نہ پائی جائے تو کامل صدق باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ صدّیق اس شخص کو کہتے ہیں جو طبعاً سچّا ہو اور سچ بولنا اس کی عادت ہو۔[۱۴۶] اصل یہ ہے کہ قلب اپنی فطری یعنی خالص و حسین حالت پر ہو تو اس میں صِدق ہوتا ہے۔ یہ موضوعی صِدق ہے جو معرضِ اظہار میں آئے تو معتبر بنتا ہے۔

انسان طبعاً سچ کو پسند کرتا اور اس سے مثبت طور پر متاثّر ہوتا ہے، کیونکہ سچ میں حُسن کی تاثیر ہوتی ہے۔ چنانچہ جس بات اور کام میں صدق ہو، اس میں قوّتِ اثر و نفوذ ہوتی ہے، جو اس کے فاعل یا کرنے والے کی حامی و ناصر (شفیع) بن جاتی ہے۔ یہ مقولہ کہ سچ کو آنچ نہیں، اسی حقیقت کا غمّاز ہے۔

جس طرح صِدّیق قرآنِ مجید کی رُو سے صالح و شہید بھی ہوتا ہے، اسی طرح نبی کا صدّیق ہونا بھی ناگزیر ہے۔ چونکہ انبیاء علیہمُ السّلام انسان کے مُعلّم و ہادی اور مُرشد و مُربّی بن کر مبعُوث ہوتے تھے، لہٰذا قدرت ان کے قلوب کی حفاظت کرتی اور انھیں ان کی فطری یعنی حُسن و صدق کی حالت پر رکھتی تھی۔ چنانچہ آپؐ بعثت سے پہلے بھی صِدّیق تھے اور صادق و امین کے لقب سے معروف تھے۔ آپؐ چونکہ اسلام کی انقلابی تحریک کے بانی و علمبردار تھے، جو دنیا کے تمام معاشروں کے لیے ایک چیلنج تھی، اس لیے آپؐ کو اپنے زمانے کی طاغوتی و فرعونی اور ہامانی و قارونی قوّتوں کی زبردست مزاحمت و مخالفت کا سامنا کرنا پڑا" اور ازبس خطرناک امتحانوں اور تجربوں میں سے گزرنا پڑا تھا، اور جیسا کہ آپ کا ارشاد ہے، آپؐ کا یہ صدق تھا جس نے قدم قدم پر آپؐ کی حمایت و تائید کی اور لوگوں کے دلوں کو مرعوب و مسخّر اور رام کرنے میں ازبس اہّم کردار ادا کیا۔

(۱۵) طاعت میری کفایت کرنے والی ہے :

طاعت سے مراد اطاعتِ الٰہی ہے اور اس کے معنی ہیں : فرماں برداری، نظم و ضبط کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے احکام (اوامر و نواہی) کی تعمیل اور عبادت کرنا۔ اللہ تعالیٰ کی طاعت کا مطلب اس کا بندہ بن جانا ہے اور بندگی سے خدا ملتا ہے، اور جسے خدا مل جائے، وہ اس کے لیے کافی ہو جاتا ہے اور اسے دنیا سے مُستغنی کر دیتا ہے۔ اسے تصوّف میں فقر و غنا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ اللہ میرے لیے کافی ہے، بلکہ یہ فرمایا کہ اس کی طاعت میرے لیے کافی ہے۔ اس میں دو لطیف نکات مضمر ہیں : ایک یہ کہ آپؐ کے اس ارشاد میں عجز و انکسار پایا جاتا ہے جو آپؐ کا حُسنِ شعار تھا اور دوسرا یہ کہ طاعت سے خدا ملتا ہے، بہرحال آپؐ کی ساری زندگی طاعتِ الٰہی میں گزری اور آپؐ کی سیرتِ طیبہ طاعتِ الٰہی کا حسین نمونہ ہے، اسی لیے طاعتِ الٰہی کے ساتھ آپؐ کی اطاعت کو بھی مسلمانوں پر فرض قرار دیا گیا[۱۴۷]۔

(۱۶) جہاد میرا خُلق ہے :

جہاد مقدور بھر جدّوجہد اور مساعیٔ جمیلہ سے عبارت ہے۔ امام راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں : الجِهادُ والمُجَاهدة کے معنی دشمن کے مقابلے میں پوری طاقت صرف کرنے کے ہیں۔ جہاد کی تین قسمیں ہیں : (۱) کُفّار سے (۲) شیطان سے اور (۳) اپنے نفس سے۔ اس کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال و جان کے ساتھ جدّوجہد کرنا، جس میں جنگ و قتال بھی شامل ہے[۱۴۸]۔

خَلق اور خُلق اصل میں دونوں ایک ہی ہیں، جیسے شَرب و شُرب، مگر ان میں فرق یہ ہے کہ خَلق بمعنی خلقت یعنی ہیئت اور شکل و صورت پر بولا جاتا ہے جس کا تعلّق ادراکِ بصر سے ہوتا ہے۔ خُلق کا لفظ عادت اور خصلت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جس کا تعلّق بصیرت سے ہوتا ہے[۱۴۹]۔ آپؐ کی سیرتِ طیبہ شاہد ہے کہ آپؐ کی ساری عمر مسلسل جدّوجہد، مقدور بھر محنت و مشقّت اور مساعیٔ جمیلہ میں گزری۔ بعثت سے پہلے آپؐ کا جہاد نفس و شیطان کے خلاف تھا اور بعثت کے بعد اس میں کُفّار و مُشرکین کے خلاف جہاد کا بھی اضافہ ہو گیا۔ لہٰذا آپؐ

کی عظیم و کامیاب اور بے نظیر و مثالی زندگی ہمیں اس حقیقت کی یاد دلاتی ہے کہ عظمت و کامیابی کی راہ مسلسل جدّوجہد، مقدور بھر محنت و مشقّت اور مساعیٔ جمیلہ کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جہاد کو اسلام میں ازبس اہمیّت حاصل ہے۔

(۱۷) نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے :

اصل میں ہے : قُرَّةُ عَينِي فِي الصَّلٰوةِ۔ قُرّۃ کے لغوی معنی ہیں ٹھنڈک، جو طمانیّت و مسرّت کا حاصل ہے۔ الصلوٰۃ کے معنی نماز ہیں، لیکن جس نماز سے دل کو طمانیّت و مسرّت کی ٹھنڈک پہنچتی ہے، اسے حدیثِ طیبہ میں "احسان" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ احسان مقامِ شہود ہے۔ آپؐ نے اس کی حقیقت اس طرح بیان فرمائی ہے کہ عبادت کے وقت انسان یہ محسوس کرے کہ گویا وہ اپنے الٰہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے۔ اگر یہ مقام حاصل نہ ہو تو وہ یہ محسوس کرے گویا اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے[۱۵۰]۔

اللہ تعالیٰ کے متعلّق اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ حُسنِ حقیقی ہے اور بنی نوعِ انسان کا الٰہ اور ربِّ رحیم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے جذبۂ محبت کی تشفّی اپنے حقیقی الٰہ کے قرب و حضوری اور دید و لقا سے ہوتی ہے اور اس کا ایک بہترین ذریعہ نماز ہے۔ نیز اس جذبۂ محبت کی تشفی سے انسان کو ایسی طمانیّت و مسرّت ملتی ہے جس کا حاصل ٹھنڈک ہوتا ہے۔ آپؐ چونکہ مستقلاً احسان یعنی مقامِ شاہدیّت پر متمکن تھے جسے "مقامِ محمود" سے تعبیر کیا گیا ہے[۱۵۱]، اس لیے آپؐ کو نماز میں ہمیشہ ہی "دیدِ الٰہ" میسر آتی تھی، اور اس کی بدولت آپؐ کا قلبِ مبارک کیف و سُرور سے معمور ہو جاتا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ مستنبط ہوا کہ نماز اصل میں وہ ہے جو آنکھوں کی ٹھنڈک ہو اور نماز کو اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک بنانا آپؐ کی سُنّتِ حسنہ ہے اور زندگی کا مقصود اور عبادات کا حاصل ہے۔ چنانچہ مولانا رومؒ فرماتے ہیں :

آدمی دید است باقی پوست است — دید آں باشد کہ دیدِ دوست است
جُملہ تن را درگداز اندر بصر — در نظر رو، در نظر رو، در نظر

یعنی انسان حقیقت میں شہود یا دید ہے۔ دید کا مطلب رُؤیتِ الٰہی ہے یعنی اپنے الٰہ کا دیدار۔ لہٰذا اپنے اندر دیکھنے کی قوت پیدا کرنے کی خاطر ریاضت و مشقّت کے ذریعے اپنے وُجود کو شمع کی طرح گھلا ڈالو (اور پھر مقامِ شاہدیت پر متمکن ہو کر) ہمیشہ اسے دیکھتے رہو[۱۵۲]۔

حاصلِ کلام یہ کہ آپؐ کے محوّلہ بالا اخلاقِ حسنہ کو اپنے اندر پیدا کرنا اور انھیں معرضِ اظہار میں لانا، نیز آپؐ کی سیرتِ طیبہ کے سانچے میں اپنی زندگی کو ڈھالنا ہی اصل میں سُنّتِ حسنہ کی پیروی کرنا ہے اور یہی آرزوئے اِسلام ، غایتِ زندگی ، مشیّتِ ایزدی اور فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس طرح ہی انسان عظیم و کامیاب اور صاحبِ حُسن و سُرور بن سکتا ہے۔

حواشی و تشریحات

(۱) جلیبِ خدا : حضرت ابنِ عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے صحابہؓ بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ رسول اللہؐ تشریف لے آئے اور آپؐ نے اُن کی یہ باتیں سُنیں۔ ایک صحابی نے کہا : اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السّلام کو اپنا خلیل یا دوست بنالیا۔ دوسرے نے کہا : موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے باتیں کیں۔ تیسرا بولا : عیسیٰ علیہ السّلام اللہ کا کلمہ اور اس کی رُوح تھے۔ چوتھے نے کہا : آدمؑ کو اللہ تعالیٰ نے برگزیدہ فرمایا۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے سب کی باتیں سُن کر فرمایا : میں نے تمھاری باتوں کو سُنا اور تمھارے اس تعجّب کو محسُوس کیا کہ ابراہیمؑ اللہ کے دوست ہیں اور حقیقت میں وہ ایسے ہی ہیں ، یہ کہ موسیٰؑ اللہ کے ہمراز و ہمکلام ہیں، اور حقیقت میں وہ ایسے ہی ہیں ، یہ کہ عیسیٰؑ اللہ کی روح اور اس کا کلمہ ہیں اور حقیقت میں وہ ایسے ہی ہیں اور آدمؑ کو اللہ تعالیٰ نے برگزیدہ کیا اور وہ فی الحقیقت برگزیدہ ہی ہیں، لیکن سُنو! میں اللہ کا حبیب ہوں، اور یہ بات میں فخر کے طور پر نہیں کہتا اور قیامت کے دن میں "پرچمِ حمد" کا حامل ہوں گا، جس کے نیچے آدم اور دُوسرے پیغمبر ہوں گے اور اس پر مجھے فخر نہیں ہے۔ نیز قیامت کے دن میں پہلا شفاعت کرنے والا (شافع) اور پہلا کامیاب شفاعت کرنے والا (مُشفّع) ہوں گا اور اس پر مجھے فخر نہیں ہے۔ میں پہلا شخص ہوں گا جو جنّت کے دروازے کو حرکت دے گا اور اللہ تعالیٰ اسے میرے لیے کھول دے گا، مجھے اس میں داخل کرے گا۔ میرے ساتھ ایمان دار فقراء ہوں گے اور اس پر مجھے فخر نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک میں اگلے اور پچھلے تمام انسانوں سے زیادہ معزّز و افضل (اکرم) ہُوں اور اس پر مجھے فخر نہیں ہے۔

(رواۃ الترمذی و الدارمی در مشکوٰۃ المصابیح ، باب فضائلِ سیّد المرسلین ، ح ۳۲)۔

(۲) مُحَمّد : حضرت جُبیر بن مطعمؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم

کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ "میرے بہت سے نام ہیں : میں مُحمّد (جس کی بکثرت حمد و ستائش کی جائے) ہوں، میں احمد (حمد و ستائش کرنے والا) ہوں، میں ماحی (محو یا مٹانے والا) ہوں، یعنی اللہ تعالیٰ میرے ذریعے کفر کو مٹاتا ہے، اور میں حاشر ہوں یعنی قیامت کے دن لوگ میرے قدم یا مقام پر جمع ہوں گے اور میں عاقب ہوں اور عاقب وہ ہے جس کے بعد کوئی نبی نہیں۔" (بخاری و مسلم در مشکوٰۃ باب شمائل النبی وصفاتہ، ح ۱)

اس سے ملتی جلتی حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ کی روایت میں ہے کہ "میں محمد ہوں، احمد ہوں، المُقفی (یعنی تمام انبیاء علیہم السلام کے پیچھے آنے والا) ہوں، حاشر (لوگوں کو جمع کرنے والا) ہوں، میں نبیِ توبہ (یعنی کثرت سے توبہ و استغفار کرنے والا نبی) ہوں اور میں نبیِ رحمت ہوں (مسلم، موضوع مذکور، ح ۲)۔

قریش عداوت کی وجہ سے آپؐ کو مُحمّد کی بجائے مُذمّم کہتے تھے اور مُذمّم کے نام پر گالیاں دیتے تھے۔ چنانچہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا : کیا تمھیں اس بات پر تعجب نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے کیسے مجھے قریش کی گالیوں اور لعنتوں سے بچالیا۔ وہ مُذمّم کو گالیاں دیتے اور مُذمّم پر لعنت کرتے ہیں اور میں مُحمّد ہوں۔"
(راوی حضرت ابو ہریرہؓ، بخاری اور مشکوٰۃ، باب مذکور، ح ۳)۔

(۳) **آپؐ** : نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا بار بار اسمِ مبارک لکھتے ہوئے مجھے چھوٹا منہ بڑی بات محسوس ہوئی۔ لہٰذا میں نے ادب و احترام کے پیشِ نظر "آپؐ" کا لفظ استعمال کیا ہے اور اس کتاب میں "آپؐ" کا لفظ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے سوا کسی اور کے لیے استعمال نہیں ہوا :

ہزار بار بشویم دہن زِ مُشک و گلاب
ہنوز نامِ تو گفتن کمال بے ادبی است

(۴) **اُسوۂ حسنہ** : اس کا مطلب حسین و بہترین نمونہ ہے جسے انگریزی میں (Fxeellent model) کہہ سکتے ہیں۔

(۵) اس آیت کے اصل الفاظ یہ ہیں : لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللهَ كَثِيْرًا۔
(الاحزاب ۳۳ : ۲۱)۔

(۶) **تحریکِ اسلام** : قرآنِ حکیم اور سیرتِ طیبہ کی رُو سے اسلام محض جامد و نظری اصولوں اور قواعد و ضوابط کا نام نہیں، یہ ایک زندہ و حرکی نظامِ زندگی ہے، جس کے عقاید فطری و زندہ ہیں۔ لہٰذا اس میں حرکیّت (Dvnamicism) اور قیّومیّت (ثبات و دوام) پائی جاتی ہے۔ چونکہ اسلام کی تبلیغ ہر مسلمان پر واجب ہے اور ہر مسلمان کے لیے مبلغ و مجاہد ہونا لازمی ہے، جس طرح آپؐ اور صحابہ کرامؓ تھے، لہٰذا اسلام دراصل تحریک ہے۔

(۷) ہمہ گیر جمالیاتی انقلاب سے مراد داخلی و خارجی انقلاب ہے۔ داخلی انقلاب کو عموماً ذہنی انقلاب سے اور خارجی انقلاب کو معاشرتی یا ثقافتی انقلاب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآنِ حکیم کے حوالے سے اس کی جامع و مانع تعبیر "دینی انقلاب" کی ہے۔ کیونکہ دین انفرادی و اجتماعی، مادّی و رُوحانی اور دنیوی و اُخروی یا دوسرے لفظوں میں "کُل زندگی" پر حاوی ہے۔

(۸) **مشن** (Mission) : اس سے مراد ایسا نصبُ العین ہے جو دینی، آفاقی اور ہمیشہ جاری رہنے والا ہو۔

(۹) **مستشرقین** (Orientalists) : ان سے عموماً وہ عُلماء مُراد لیے جاتے ہیں (خصُوصاً مغربی اقوام کے)، جو السنۂ شرقیہ، نیز علوم و فنونِ شرقیہ میں دسترس و دلچسپی رکھتے ہوں، لیکن حقیقت میں یہ وہ صلیبی و صیہونی عُلماء ہیں جو اپنی زندگی اسلام اور پیغمبرِ اسلامؐ کے خلاف ابلیسی پراپیگنڈا کرنے کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ اس جماعت کا ظہور آٹھویں / چودھویں صدی میں ہوا۔ یورپ کی عیسائی طاقتیں، جنھیں یہودیوں کی حمایت بھی حاصل تھی، ۴۸۹ھ / ۱۰۹۶ء سے ۶۶۹ھ / ۱۲۷۰ء تک مسلمانوں کے استیصال کی خاطر صلیبی جنگیں (Crusades) لڑتی رہیں لیکن انھیں کامیابی نہ ہوئی۔ تلوار سے مایوس ہو کر انھوں نے قلم کے ذریعے اپنا مشن جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ آٹھویں / چودھویں صدی میں صلیبی و صیہونی طاقتوں نے مشترکہ طور سے اسلام کے استیصال کا طویل المدت منصوبہ بنایا اور اسے عملی جامہ پہنانے کی غرض سے انھوں نے یونیورسٹیوں، کلیساؤں وغیرہ میں مشرقی زبانوں خصُوصاً مُسلمانوں کی زبانوں (مثلاً عربی، فارسی، ترکی) اور ان کی دینی کتابوں اور علوم و فنون کی تعلیم دینے کا بندوبست

کیا اور مستشرقین کی ایک ایسی جماعت تیار کر لی جس کا مشن اسلام اور پیغمبرِ اسلام صلّی اللہ علیہ وسلّم کے خلاف قلم کے ذریعے بالخصوص عالمگیر سطح پر ابلیسی طرز کا پروپیگنڈا کرنا تھا۔ یہ جماعت جسے لامحدود وسائل حاصل ہیں، بڑی فعّال ہے اور اپنے ابلیسی جمالیاتی فریب کے ذریعے مسلمانوں میں بالخصوص اور غیر مسلموں میں بالعموم اسلام اور پیغمبرِ اسلام صلّی اللہ علیہ وسلّم کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کی غرض سے اسلام کی تعلیمات اور آپؐ کی سیرتِ طیبّہ کو مسخ کر کے پیش کرتی رہتی ہے۔

(۱۰) دیکھیے البقرہ ۲ : ۲۳، یونس ۱۰ : ۳۸، ہود ۱۱ : ۱۳۔

(۱۱) مارکسیت :(Marxism)، کارل مارکس (Karl Marx) (۱۸۱۸ تا ۱۸۸۳ء)، یہودی نژاد فلسفی کا مکتبِ فکر جو اشتراکیت (Socialism) اور اشتمالیت (Communism) کا علمبردار ہے۔

(۱۲) قدروں (Values)۔

(۱۳) Subjective-objective aesthetic revolution

(۱۴) نعرہ (Slogan)

(۱۵) ازمز (Isms)

(۱۶) دیکھیے الانبیاء ۲۱ : ۱۰۷۔

(۱۷) دیکھیے القلم ۶۸ : ۴۔

(۱۸) **احساسِ تنہائی** : دَورِ حاضر کی نفسیاتی بیماری۔ اس سے انسان کو یہ وہم ہو جاتا ہے کہ اس دنیا میں اس کا کوئی خدا ہے نہ ربّ، کوئی دوست ہے نہ غمخوار، کوئی شریکِ غم و درد ہے نہ شریکِ راحت و مسرّت۔ احساسِ تنہائی اب ایک فلسفیانہ نظریہ بن گیا ہے، جسے وجُودیت Existencialism کی پیداوار سمجھا جاتا ہے۔ احساسِ تنہائی کو مرزا غالب نے اپنی زبان میں اس طرح بیان کیا ہے :

گفتنی نیست کہ بر غالبِ ناکام چہ رفت
ایں قدر ہست کہ ایں بندہ خداوند نداشت

(۱۹) مکمّل محبت سے مراد محبّتِ الٰہی اور محبّتِ انسانیت ہے۔

(۲۰) **تحریکِ رحمۃٌ لِلعالمینی** : آپؐ چونکہ تحریکِ اسلام کے مُبلّغ و داعی

بھی ہیں اور رحمۃٌ لِلعالمین بھی، اس نسبت اور رعایت سے تحریکِ اسلام کو تحریکِ رحمۃٌ لِلعالمینی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۲۱) **نامیاتی تامّلہ** : Organic whole

(۲۲) Subjective and objective

(۲۳) یہ اشارہ کس کا تھا؟ کیسے ہوا؟ اس کی عجیب داستان ہے۔ یہ رازِ محبت آشکارا کرنے کو دل نہ مانتا تھا، لیکن ایسا نہ کرنا کتمانِ حق ہوتا، لہٰذا اسے نہایت اختصار سے بیان کیا جاتا ہے : علم و شہادت کی دعا مانگنا، گریہ وزاری کرنا اور حیات و کائنات پر غور و فکر کرنا میرا بچپن سے معمول تھا۔ دل کو کس کی آرزو تھی؟ شوق کیا چاہتا تھا؟ مجھے کچھ معلوم نہ تھا۔ آخر ۱۹۴۲ء میں میرے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا جس نے میری کایا پلٹ کر رکھ دی۔ وہ رات ہزار لیلۃ القدر سے بہتر تھی جس میں مجھے وہ واقعہ پیش آیا۔ میں ایک نہایت وسیع و حسین مسجد میں کھڑا تھا۔ دفعتاً برقِ حُسن لہرائی اور حُسنِ انسانی کا چاند جلوہ افروز ہوا۔ دل نے پہچان لیا کہ میرے ہادی و آقاؐ ہیں۔ آپؐ نے دُور ہی سے اپنا دستِ مبارک دکھایا اور برقِ نور لہرائی۔ زبان سے نکلا : یدِ بیضا۔ میرے قلب و نظر نہ تو حریفِ نظّارہ ہو سکتے تھے اور نہ ہوئے۔ میں غش کھا کر گرا، تڑپا اور مر گیا۔ یہ موت میرے لیے ہزار زندگیوں سے افضل اور ہزار شہادتوں سے احسن تھی، کیونکہ اس سے میں حُسنِ آقا کا شہید ہو گیا تھا اور اس کے عوض مجھے آپؐ کی چاکری کی سعادت اور "حیاتِ محض" ملنے والی تھی۔ اسی عالم میں برقِ حسن آواز لہرائی اور مجھے زندہ کر گئی۔ یہ آواز فردوسِ گوش و جانِ آفریں تھی یا یہ میرے مسیحا کی آواز "کُن آسا" تھی : یہ میرے آقا کا ارشاد تھی : اُٹھ ناصر تفسیرِ کبیر پڑھ! اُٹھ ناصر! تفسیرِ کبیر لکھ!" حُسنِ آواز کی تاثیر تھی کہ میں زندہ و بیدار ہو گیا اور دیکھا کہ میں حضورِ پُرنُور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے مبارک قدموں میں پڑا ہوں۔ دل نے چاہا کہ رفتارِ زمانہ ختم ہو جائے اور میں قدموں میں پڑا رہوں لیکن جسم میں زندگی کی ایک لہر اُٹھی اور میں خود بخود کھڑا ہو گیا۔ میں اُٹھا تو قیامت گزر گئی۔ میرے آقا، میرے مسیحاؐ تشریف لے جا چکے تھے۔ دل پر کیا گزری؟ اللہ نفسِ جبرئیل دے تو بیان کروں۔ میں سارا دن ایک عجیب عالمِ کیف و سُرور میں رہا۔ رات آئی تو پھر یہی معاملہ پیش آیا۔ میں شہیدِ نظارہ ہو کر پھر زندہ ہوا۔ مجھے پھر وہی حکم ملا۔

میں نے ملازمت چھوڑ دی اور اس ارشاد کی تعمیل میں لگ گیا۔ "حُسن" کی شرح و تفسیر پڑھتا اور لکھتا رہا۔ ۱۹۵۳ء میں میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا اور مجھ پر اسرارِ حُسن کُھلتے چلے گئے۔ قرآنِ مجید میرے لیے ناطق ہو گیا اور اس میں مجھے حُسن کا ایک عجیب جہاں نظر آیا۔ میں اس کی تفسیر پڑھتا اور لکھتا رہا۔ آخر ۱۹۶۲ء میں آپؐ کے حُسنِ سیرت کی تفسیر لکھنے کی آرزو پیدا ہوئی۔ اندر سے مسلسل یہ آواز آتی رہی کہ آپؐ کی سیرت ہی حُسن و قرآن کی تفسیرِ کبیر ہے۔ اُٹھ اور اسے لکھ! میں سوچنے لگا کہ کیا لکھوں؟ حیران تھا کہ اتنی زیادہ اور مستند و اعلیٰ کُتبِ سیر کی موجودگی میں کیا لکھوں؟ مجھے اپنی کم علمی اور بے بضاعتی کا شعور تھا۔ اسی سوچ اور غم میں دو برس گزر گئے۔ خلوتِ شب میں آہ و فغاں اور گریہ زاری کرنا مقدر بن گیا۔ آخر قسمت کا تارا ایک بار پھر چمکا۔ ۱۹۶۴ کا ایک سال اور رمضان المبارک کی ایک رات میں، جو میرے لیے ہزار لیلۃ القدر سے بہتر تھی، بائیس برس کے اس مہجور پر "آقا" کی نظرِ کرم ہوئی۔ وہ "ماہِ حُسنِ مجسّمؐ" جلوہ افروز ہوا۔ شبستانِ دل اس حُسن و نور سے حُسنُ المآب بن گیا۔ شاید یہ تقدیرِ محبت ہے کہ فراق کا زمانہ جتنا طویل و صبر آزما ہوتا ہے، وصل کی گھڑیاں اتنی ہی مختصر و گریزپا ہوتی ہیں۔ عیدِ نظّارہ آئی اور گزر گئی اور فراق و انتظار کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ لیکن اب کے اس عالمِ فراق میں بھی قرب و حضوری کا عالم تھا۔ آپؐ کی سیرتِ طیبہ کے نئے نئے گوشے آشکارا ہونے لگے اور زندگی کے شب و روز ان کو دیکھنے اور ان پر غور و فکر کرنے میں گزرنے لگے۔ اس عالمِ حُسن و سرور میں مشاہدات و واردات کی کثرت نے کیا رنگ اختیار کیا؟ اس کی داستان نہ پُوچھیے۔

محبّت کی باتیں بھی عجیب ہوتی ہیں اور وہ ایسے ایسے رنگ اختیار کرتی ہے کہ دل حیران رہ جاتا ہے۔ یہ دولتِ بیش بہا میسّر آئی تو دل مچل گیا۔ اس نے اپنے اللہ سے کہا: "حُسنِ مجسّم" کی تفسیرِ کبیر لکھنے کا آغاز روضۂ مبارک پر جا کر کروں گا اور اس کا بندوبست بھی تجھے ہی کرنا ہے۔ دل کو اپنی عبدیّت پر ناز تھا، لیکن "دوست" ٹھہرا بے نیاز۔ اس نے بارہ برس خوب تڑپایا اور رُلایا، لیکن اس کی رحمت برابر میری آتشِ شوق کو تیز، عزم کو پختہ اور مجھ پر سیرتِ طیّبہ کے اسرار و رموز آشکارا کرتی رہی۔ اس عالمِ انتظار میں کہ "دوست" روضۂ مبارک پر لے جائے۔ دل پر قیامتیں ٹوٹتی رہیں۔ ایک ایک لمحہ لمحۂ جاودانی بننے لگا۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ اعضاء مضمحل ہونے لگے۔ شوق مقتضی تھا کہ سیرت کا کام جلد شروع کروں، لیکن دلِ آشنا کو یہ ضد تھی کہ روضۂ مبارک پر جاؤں تو اس کی ابتدا کروں۔ آخر اس عالمِ اضطراب

میں ایک رات سجدہ و گریہ نے خُوب کام کیا۔ "دوست" کو ترس آ ہی گیا۔ شاید اس کی مشیّت ہی یہ تھی۔ ۱۱-۱۲ ربیع الاوّل ۱۳۹۴ھ کی درمیانی رات تھی جو میرے لیے شبِ مبارک بن کر آئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میں نماز پڑھنے کے لیے بیت اللہ کے سامنے کھڑا ہوں۔ جگہ کم اور اہلِ محبت کا ہجوم تھا۔ نماز پڑھی تو "دوست" سے روضۂ مُبارک پر لے جانے کی دُعا کی۔ اس کی رحمت کا سمندر جوش پر تھا۔ میں دوسرے لمحے روضۂ مُبارک کے ایک دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ دل پھر مچلا اور "دوست" سے ملتجی ہوا کہ "حضورِ پُرنورؐ" کی حضوری چاہیے۔ "دوست" مہربان تھا، یہ آرزو بھی پوری ہوئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میں ایک بہت بڑے کمرے کی دہلیز پر کھڑا ہوں۔ بزمِ اصحابؓ آراستہ ہے۔ آپؐ میرِ مجلس بھی ہیں اور شمعِ محفل بھی۔ بزم آپؐ ہی کے حُسن و نور سے حُسن و رنگ کی جنّت بنی ہوئی تھی۔ یہ نظّارہ کتنا دلآویز، نظر افروز اور سرور انگیز تھا، بیان نہیں ہو سکتا۔ خود میرا دل حسن و سرور کا فردوس بن گیا۔

دل میں اتنی تیز سرور انگیز ٹھنڈک پیدا ہوئی کہ میں بیدار ہو گیا۔ میں عالمِ حیرت و مستی میں تھا کہ آواز آئی: "تیری توقع سے زیادہ تیری آرزو پوری ہوئی اور تجھے وہ کچھ عطا ہوا جس کا تو تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اب اُٹھ اور حُسنِ مجسّمؐ کی تفسیرِ کبیر لکھ!" ۱۲ ربیعُ الاوّل کی صبح ہوئی، میں نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ یہ دن میرے لیے ہزار عیدوں سے زیادہ پرمسّرت و مُبارک تھا۔ میں نے جسم و لباس اور قلم و قرطاس کو عطر میں بسایا، اور "دوست" کے نام سے اس کے "دوست" کی سیرتِ حسنہ لکھنے کا آغاز کر دیا۔

(۲۴) **مقامِ محمود** : عَسٰٓی اَنۡ یَّبۡعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا۔
(الاسراء ۱۷ : ۷۹)
"عنقریب تمھارا رب تمھیں مقامِ محمود پر فائز کر دے گا۔ اس سے مراد ہے حسن و محبوبیت اور حمد و ستائش کا مقام، جس پر فائز ہونا معراجِ اِنسانیت ہے۔"

(۲۵) حُسن کے مسئلے پر قرآنِ مجید کے بصائر و حقائق کے لیے دیکھیے مصنّف کی کتاب "جمالیات، قرآنِ حکیم کی روشنی میں" طبع دوم، پاکستان بک فاؤنڈیشن، لاہور (۱۳۹۶ھ/ ۱۹۷۶ء)۔

(۲۶) انداز۔ انگریزی میں Shades اور اُردو میں رُوپ اور سبھاؤ۔

(۲۷) **ابلیس کا جمالیاتی فریب** : اس موضوع پر مفصل بحث کے لیے دیکھیے

مصنّف کا اسی نام کا مقالہ" در اقبال ریویو" ۱۹۷۲ء، ص ۷۳ تا ۹۰۔

(۲۸) شاھد : دیکھیے الاحزاب ۳۳ : ۴۵، الفتح ۴۸ : ۸۔

(۲۹) ابن سعد، ۱ : ۳۷۶۔

(۳۰) البہیقی : شعب الایمان، در مشکوٰۃ، بابُ الرّفق والحیاَ وحسن الخُلق، ۲۵۷۔

(۳۱) ترمذی، بحوالہ مشکوٰۃ، باب اسمآء النّبیؐ وصفاتہٖ، ح ۱۶۔

(۳۲) جمال وجلال پر مفصل بحث کے لیے دیکھیے مصنّف کی کتاب جمالیات' قرآنِ حکیم کی روشنی میں۔ طبع دوم، ص ۱۷۶ ببعد۔

(۳۳) دارمی، در مشکوٰۃ، موضوع مذکور، ح ۱۷۸۔

(۳۴) ترمذی، دارمی، در مشکوٰۃ، موضوع مذکور، ح ۱۹۔

(۳۵) بخاری ومسلم، در مشکوٰۃ، موضوع مذکور ح ۲۳۔

(۳۶) مولوی محمّد عبد اللہ : خطبات نبویؐ، دائرۃ المعارف، لاہور ۱۹۲۴ء ص ۲۳، ۲۴۔

(۳۷) حضرت عبّاسؓ کے اشعار یہ تھے :

یا مخجل الشمس والبدر المنیر اذا
تبسم الثغر لمع البرق منہ اضا
کم معجزاتٍ راینا منک قد ظہرت
یا سیّد ذکرہ یشفی بہ المرضٰی

(مولوی محمد عبد اللہ : خطباتِ نبویؐ، ص ۱۳)۔

(۳۸) بخاری ومسلم، در مشکوٰۃ، موضوع مذکور، ح ۱۱۔

(۳۹) بخاری، در مشکوٰۃ، باب فی اخلاقہٖ وشمائلہٖ، ح ۱۴۔

(۴۰) البیہقی در شعب الایمان، بحوالہ مشکوٰۃ، باب الرّفق والحیاَ وحسن الخلق، ح ۲۵، ۲۶۔

(۴۱) بخاری، در مشکوٰۃ، باب فی اخلاقہٖ وشمائلہٖ، ح ۱۱۔

(۴۲) مسلم، موضوع مذکور، ح ۱۲۔

(۴۳) بخاری ومسلم، موضوع مذکور، ح ۵۔

(۴۴) بخاری ومسلم، موضوع مذکور، ح ۱۔

(۴۵) بخاری ومسلم، موضوع مذکور، ح ۱۷، نیز دیکھیے ح ۱۸۔

(۴۶) بخاری، موضوع مذکور، ح ۱۶۔

(۴۷) ترمذی، موضوع مذکور ح ۲۲۔

(۴۸) بخاری، موضوع مذکور، ح ۹، نیز دیکھیے مسلم، موضوع مذکور، ح ۱۰۔

(۴۹) ترمذی، موضوع مذکور، ح ۲۵۔

(۵۰) مسلم، در مشکوٰۃ، باب فضائل سید المرسلینؐ، ح ۱۰۔

(۵۱) بخاری ومسلم، موضوع مذکور، ح ۷۔

(۵۲) بخاری ومسلم، موضوع مذکور، ح ۸۔

(۵۳) وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَاتَفَرَّقُوْا (آل عمران ۳ : ۱۰۳)

(۵۴) دارمی، در مشکوٰۃ، موضوع مذکور، ح ۲۳۔

(۵۵) ترمذی، موضوع مذکور، ح ۲۸۔

(۵۶) مسلم، در مشکوٰۃ، باب اسماء النّبیؐ، ح ۲۔

(۵۷) وانّک لعلیٰ خُلقٍ عظیم (القلم ۶۸ : ۴) اور آپؐ کے اخلاق عظیم ہیں۔

(۵۸) بعثنی لتمام مکارم الاخلاق وکمال محاسن الافعال (شرح السنّۃ در مشکوٰۃ، باب فضائل سیّد المرسلینؐ، ح ۳۰)

(۵۹) وعن مالك بلغہ انّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ بعثت لِأُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ (مؤطا میں یہ مرسلاً مروی ہے اور احمد نے اسے ابی ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ بحوالہ مشکوٰۃ، باب الرّفق والحیاَ وحسن الخلق، ح ۲۴۔

(۶۰) البیہقی در شعب الایمان، بحوالہ مشکوٰۃ، باب مذکور، ح ۲۵۔

(۶۱) احمد، موضوع مذکور، ح ۲۷۔

(۶۲) جمالیاتی اقدار Aesthetic values

(۶۳) Ethical values

(۶۴) امام راغب اصفہانی کی اصل عبارت یہ ہے : والخَلق والخُلق فی الاصل واحد کالشَّرب والشُّرب والصَّرم والصّرم لکن خصّ الخلق بالھیئات والاشکال والصّور المدرکہ بالصبر وخصّ الخلق

بالقوی والسّجایا المدرکۃ بالبصیرۃ قال تعالیٰ وانّک لعلیٰ خُلق عظیم۔ (مفردات، بذیل مادّہ خلق)

(۶۵) ذٰلِکَ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ الَّذِیْ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَہٗ (التجدہ ۳۲ : ۶-۷)

(۶۶) یٰاَیُّھَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْمِ الَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوّٰکَ فَعَدَلَکَ فِیْ اَیِّ صُوْرَۃٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ۔ (الانفطار ۸۲ : ۶ تا ۸)

(۶۷) اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَھَدٰی۔ (الاعلیٰ ۸۷ : ۲-۳)

(۶۸) وَخَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَہٗ تَقْدِیْرًا۔ (الفرقان ۲۵ : ۲)

(۶۹) وَاَنْبَتْنَا فِیْھَا مِنْ کُلِّ شَیْءٍ مَّوْزُوْنٍ۔ (الحجر ۱۵ : ۱۹)

(۷۰) وَصَوَّرَکُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَکُمْ۔ (التغابن ۶۴ : ۳)

(۷۱) لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔ (التین ۹۵ : ۴)

(۷۲) فَاَقِمْ وَجْھَکَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ (الروم ۳۰ : ۳۰)

(۷۳) بخاری ومسلم، درمشکوٰۃ، کتاب الایمان، باب الکبائر وعلامات النفاق، ح ۱۲۔

(۷۴) جمالیاتی حس Aesthetic sense

(۷۵) جمالیاتی ذوق Aesthetic taste کی مثال اصل اور فرع کی ہے۔ مفصل بحث کے لیے دیکھیے مصنف کی کتاب جمالیات، قرآنِ حکیم کی روشنی میں، طبع دوم، ص

(۷۶) حدیثِ نبویؐ۔

(۷۷) الانعام ۶ : ۱۳۴، ۱۴۶۔

(۷۸) الفاتحہ ۱ : ۱ و بمواضع کثیرہ۔

(۷۹) الانعام ۶: ۱۲، ۵۴۔

(۸۰) الاعراف ۷ : ۱۵۶۔

(۸۱) اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ لَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی (طٰہٰ ۲۰ : ۸)

(۸۲) صِبْغَۃَ اللّٰہِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ صِبْغَۃً وَّنَحْنُ لَہٗ عٰبِدُوْنَ ۝ (البقرہ ۲ : ۱۳۸)

(۸۳) حدیث نبویؐ۔

(۸۴) ابنِ ماجہ، مقدمہ۔

(۸۵) محیط، بذیل مادّہ۔ ح و ج۔

(۸۶) حدیثِ پاک کا متن یہ ہے : وعن ابی امامۃ انّ رجلاً سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما الایمان قال اذا سرّتک حسنتک وساءتک سیئتک فانت مؤمنٌ قال یارسول اللہ فما الاثم قال اذا حاک فی نفسک شی فدعہ (احمد درمشکوٰۃ، کتاب الایمان، ح ۴۰۔)

(۸۷) مسلم، درمشکوٰۃ، کتاب الاداب، باب الرّفق والحیاءً وحسن الخلق، ح ۶۔

(۸۸) احمدؒ درمشکوٰۃ، کتاب الایمان، ح ۴۱۔

(۸۹) وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ۝ (القلم ۶۸ : ۴)۔

(۹۰) وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝ (الانبیاء ۲۱ : ۱۰۷)۔

(۹۱) بعثت لاتمم حُسن الاخلاق (موطا میں یہ مرسلاً مروی ہے اور احمد نے اسے ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے) درمشکوٰۃ، کتاب الاداب، باب الرّفق والحیاءً وحسن الخلق، ح ۴۴۔

(۹۲) شرح السنہ درمشکوٰۃ، باب فضائل سیدالمرسلینؐ، ح ۳۰۔

(۹۳) اللّٰھُمَّ احسنت خلقی فاحسن خُلقی (احمدؒ درمشکوٰۃ، کتاب الاداب، باب الرّفق والحیاءً وحسن الخلق، ح ۲۶۔

(۹۴) انّ من خیارکم احسنکم اخلاقاً (بخاری ومسلم، موضوع مذکور، ح ۸)۔

(۹۵) اکمل المومنین ایماناً احسنھم اخلاقاً (احمد، موضوع مذکور، ح ۲۷)۔

(۹۶) یامعاذ احسن خلقک للنّاس (مالک، موضوع مذکور، ح ۲۳)۔

(۹۷) انّ من احبّکم الیّ احسنکم اخلاقاً (بخاری، موضوع مذکور، ح ۷)

(۹۸) انّ لِکُلّ دین خلقاً وخلق الاسلام الحیاء (مالک نے اسے مرسلاً روایت کیا ہے، ابنِ ماجہ اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت انسؓ اور حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت کیا ہے، موضوع مذکور، ح ۲۱۔)

(۹۹) بیہقی، موضوع مذکور، ح ۶۶۔

(۱۰۰) الحیاء من الایمان والایمان فی الجنّۃ والبذاء من الجفاء والجفاء

فی النار (ترمذی ، موضوع مذکور، ح ۱۰)

(۱۰۱) اذا لم تستحی فاصنع ما شئت (بخاری ، موضوع مذکور ، ح ۵)۔

(۱۰۲) الحیاء لا یاتی الا بخیر فی روایۃ الحیاء خیر کلہ (متفق علیہ ، در مشکوٰۃ، موضوع مذکور ح ۴)۔

(۱۰۳) البیہقی : فی شعب الایمان ، شرح السنۃ میں یہ حدیث اسامۃ بن شریک سے مروی ہے۔ در مشکوٰۃ ، موضوع مذکور ، ح ۱۱۔

(۱۰۴) ان المؤمن لیدرک بحسن خلقہ درجۃ قائم اللیل وصائم النھار۔
(ابوداؤد ، در مشکوٰۃ ، موضوع مذکور، ح ۱۴)۔

(۱۰۵) ترمذی و ابوداؤد ، موضوع مذکور ، ح ۱۳۔

(۱۰۶) ابوداؤد ، بیہقی ، المصابیح میں یہ حدیث عکرمہ بن وہبؓ سے مروی ہے اور اس کے الفاظ ہیں کہ لا یدخل الجنۃ الجواظ ولا الجعظری قال والجواظ الغلیظ الفظ (ابوداؤد فی سنتہ والبیہقی فی شعب الایمان۔ المصابیح میں یہ حدیث عکرمۃ بن وہبؓ سے مروی ہے اور اس کے الفاظ ہیں کہ جواظ وہ شخص ہے جو مال جمع کرتا ہو اور دوسروں کو نہ دیتا ہو، اور جعظری سخت بدگو کو کہتے ہیں۔ بحوالہ مشکوٰۃ باب مذکور، ح ۱۲)

(۱۰۷) مسلم، موضوع مذکور، ح ۱۔

(۱۰۸) من یحرم الرفق یحرم الخیر۔ (مسلم ، موضوع مذکور، ح ۲)۔

(۱۰۹) بیہقی ، موضوع مذکور ، ح ۳۔

(۱۱۰) بخاری ، در مشکوٰۃ ، کتاب الاداب ، باب الغضب والکبر ، ح ۱۔

(۱۱۱) بخاری و مسلم ، موضوع مذکور، ح ۲۔

(۱۱۲) وعن ابن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یدخل النار احد فی قلبہ مثقال حبۃ من خردل من ایمان ولا یدخل الجنۃ احد فی قلبہ مثقال حبۃ من خردل من کبر (رواہ مسلم، موضوع مذکور ح ۴)۔

(۱۱۳) مسلم ، موضوع مذکور، ح ۳۔

(۱۱۴) بیہقی ، موضوع مذکور، ح ۱۶۔

(۱۱۵) Aesthetic - ethetical values

(۱۱۶) Islamic culture

(۱۱۷) حضرت عائشہ صدیقہؓ کا جواب تھا : ان خلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان القرآن (ابوداؤد ، باب الصلوٰۃ)۔

(۱۱۸) حدیث کا متن یہ ہے : عن علی رضی اللہ عنہ قال سالت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن سنتہ فقال المعرفۃ راس مالی والعقل اصل دینی والحب اساسی والشوق مرکبی وذکر اللہ انیسی والثقۃ کنزی والحزن رفیقی والعلم سلاحی والصبر ردائی والرضا غنیمتی والعجز فخری والزھد حرفتی والیقین قوتی والصدق شفیعی والطاعۃ حسبی والجھاد خلقی وقرۃ عینی فی الصلوٰۃ۔
(قاضی عیاض : کتاب الشفا)۔

(۱۱۹) بالِ جبریل۔

(۱۲۰) صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ۝ (البقرۃ ۲ : ۱۳۸)۔

(۱۲۱) راس المال۔

(۱۲۲) وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ (یونس ۱۰ : ۱۰۰)۔

(۱۲۳) وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ۔ (التوبہ ۹ : ۱۲۵)۔

(۱۲۴) یوسف ۱۲ : ۲۔

(۱۲۵) الفرقان ۲۵ : ۷۳۔

(۱۲۶) فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ (البقرہ ۲ : ۱۵۲)۔

(۱۲۷) الرعد ۱۳ : ۲۸

(۱۲۸) علامہ اقبال فرماتے ہیں :

غم دو قسم است اے برادر گوش کن — شعلۂ ما را چراغ ہوش کن

یک غم است آں غم کہ آدم را خورد — آں غمِ دیگر کہ ہر غم را خورد
اندرو ہنگامہ ہائے غرب و شرق — بحر و در وے جملہ موجُودات غرق
چوں نشیمن می کند اندر دلے — دل ازو گردد یمِ بے ساحلے

(زبورِ عجم، ص ۲۵۲)۔

(۱۲۹) البقرہ ۲ : ۱۲۹ ، الجمعۃ ۶۲ : ۲۔
(۱۳۰) البقرہ ۲ : ۲۔
(۱۳۱) فاطر ۳۵ : ۲۸۔
(۱۳۲) العصر ۱۰۳ : ۲۔
(۱۳۳) الرحمٰن ۵۵ : ۳۳۔
(۱۳۴) البقرہ ۲ : ۲۶۹۔
(۱۳۵) البقرہ ۲ : ۱۵۳۔
(۱۳۶) العصر ۱۰۳ : ۳۔
(۱۳۷) المعارج ۷۰ : ۵۔
(۱۳۸) البقرہ ۲ : ۱۲۸ ، الصّف ۶۱ : ۱۱ وبمواضع کثیرہ۔
(۱۳۹) دیکھیے مشکوٰۃ ، کتاب الجہاد۔
(۱۴۰) موضوع مذکور۔
(۱۴۱) دیکھیے التوبہ ۹ : ۱۰۰ ، المجادلۃ ۵۸ : ۲۲۔
(۱۴۲) فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ ○ (الانشراح ۹۴ : ۷-۸)۔
(۱۴۳) علم الیقین : التّکاثر ۱۰۲ : ۵۔
(۱۴۴) عین الیقین : التّکاثر ۱۰۲ : ۷۔
(۱۴۵) حق الیقین : الواقعہ ۵۶ : ۹۵ ، الحاقہ ۶۹ : ۵۱۔
(۱۴۶) مفردات ، بذیل مادّہ ۔ ص دق۔
(۱۴۷) آل عمران ۳ : ۳۲ وبمواضع کثیرہ۔
(۱۴۸) مفردات، بذیل مادّہ ج ہ د۔
(۱۴۹) مفردات، بذیل مادّہ خ ل ق۔

(۱۵۰) بخاری ، کتاب الایمان۔
(۱۵۱) مفصّل بحث کے لیے مصنّف کا مقالہ " علاّمہ اقبال کا فلسفہ دید و نظر" در اقبال ریویو ، کراچی جولائی ۱۹۶۵ء ، ص ۶۶ تا ۸۰ ،

مقدّمہ

سیرت نگاری کا منہاج :

سیرت نگاری کا فن اتنا آسان نہیں جتنا نظر آتا ہے۔ انسان، جس کے لیے اپنی نفسی یا قلبی کیفیّات کو پہچاننا ازبس دُشوار ہے، اس کے لیے کسی عظیم انسان کے نفسیاتی احوال وظروف کا ادراک کرنا، اور اس روشنی میں اس کے کردار، رویّوں اور اخلاق و اعمال کا مشاہدہ و استقصار کرنا، اور حاصل مشاہدہ و ادراک کو "مخلصانہ طریقے" سے معرضِ اظہار میں لانا، یقیناً غیر معمولی مُشکل کام ہے۔ مخلصانہ طریقے کا مطلب یہ ہے کہ سیرت کے مطالعہ و اظہار کے موقعوں پر انسان کا قلب (دل و دماغ) ہر قسم کے تعصّبات (دینی ہوں یا مذہبی، قومی ہوں یا جماعتی، علاقائی ہوں یا الوانی، ثقافتی ہوں یا لسانی)، عقاید و نظریات اور افکار و تصورات سے منزّہ ہو اور اس کی نیّت میں اخلاص ہو۔ یعنی اس کا یہ پختہ ارادہ ہو کہ جو کچھ وہ بیان کرے گا، سچائی، دیانت داری اور حسن و خوبی سے بیان کرے گا اور کتمانِ حق نہیں کرے گا اور نہ التباسِ ذہنی یا تشکیک پیدا کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس منہاج کو "حقیقی جمالیاتی منہاج[1]" سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

سیرت کا مطالعہ تاریخ کے حوالے سے بھی کرنا ہوتا ہے، جسے تاریخی منہاج[2] سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جہاں تک پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرت کا تعلق ہے، اس کا مطالعہ "مکمّل تاریخی[3] تناظُر" میں کرنا ہوگا، جس سے مراد یہ ہے کہ آپؐ کے عہد کے علاوہ ماقبل اور لبعد کے تاریخی حالات کے حوالے سے بھی سیرت کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ "تاریخی حالات" سے مراد ہے اقوامِ عالم کی "موضوعی و معروضی" زندگی کے احوال وظروف۔ موضوعی زندگی سے عقاید جلیلہ و محرّکہ اور معروضی زندگی سے کُل خارجی زندگی مراد ہے۔ یعنی معاشی، سیاسی، معاشرتی، ثقافتی (علمی و ادبی اور فنی وغیرہ) زندگی۔ اس قسم کے مطالعہ کی وجہ ضرورت یہ

ہے کہ آپؐ، جیساکہ قرآن وحدیث کا دعویٰ ہے، انبیآء علیہم السّلام کے سلسلے کی آخری کڑی ہیں اور آپؐ کی سیرتِ طیبہ ابد تک کے لیے بنی نوعِ انسانی کے لیے رشد وہدایت کا سراجِ منیر، اور دُنیوی و اُخروی فواید کا سرچشمہ ہے۔ علاوہ بریں آپؐ نے تمام انبیآء علیہم السّلام اور کتبِ سماوی کی تصدیق کی ہے اور اسے ایمان کا جُزوِ لاینفک قرار دیا ہے۔ لہٰذا ہمیں آپؐ کی سیرت کے حوالے سے تاریخ کے تینوں ادوار (یعنی ماضی، حال اور مستقبل) کا تحقیقی اور حقیقی جمالیاتی انداز میں مطالعہ کرنا ہوگا۔ تاریخ عہد آفرین افراد اور اقوام کی کُل زندگی کے ریکارڈ سے عبارت ہے۔ کُل زندگی سے موضوعی - معروضی زندگی مراد ہے۔ سیرت نگاری کے اس منہاج کے لیے ہم نے تاریخی حقیقی جمالیاتی منہاجؒ کی تعبیر اختیار کی ہے، جو اپنی نوعیت میں "سائنٹفک" ہے اور جس کی سچی اور بہترین مثال قرآن حکیم میں ملتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہم نے بھی یہی منہاج اختیار کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے تو یہ مبالغہ نہیں، اظہارِ حقیقت ہوگا۔

ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ تاریخی حقیقی جمالیاتی منہاج میں محبت کا رنگ ہونا چاہیے کیونکہ اس سے بیان میں حُسن پیدا ہوتا ہے، لیکن محبتؔ ادب واحترام اور عقل کے دائرے کے اندر رہنی چاہیے، اور اس کا محور حق وصداقت اور عدل و واقعیت ہونا چاہیے۔ علاوہ بریں جس طرح انسان کو اپنی سیرت کا مطالعہ کرنے کی خاطر اپنے نفس کی گہرائیوں میں اُترنا اور اس سے آشنا و مانوس ہونا پڑتا ہے، اسی طرح غوّاصِ فکر ونظر کو اس انسان کے نفس کی گہرائیوں میں اُترنا اور اس سے آشنا و مانوس ہونا پڑتا ہے جس کی سیرت کا مطالعہ مقصود ہو۔ جہاں تک آپؐ کی سیرت اور میرے مطالعے کا تعلق ہے، میرا تجزیہ یہ ہے کہ یہ مشکل کام دو طریقوں سے سرانجام دیا جاسکتا ہے: اوّلاً، تدبّرِ قرآن : آپؐ کی سیرت کے حوالے سے بالخصوص قرآنِ حکیم کا تاریخی و حقیقی جمالیاتی طریقے سے بامقصد مطالعہ کرتے اور اُٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے، چلتے، پھرتے اس پر غور وفکر کرتے رہنا۔ ثانیاً قرآن مجید کی روشنی میں کُتبِ حدیث وسیرت کا تاریخی و حقیقی جمالیاتی طریق سے مطالعہ کرنا۔ مطالعۂ سیرت کا یہ منہاج اختیار کرنے سے اللہ تعالیٰ انسان کا تزکیہ کر کے اس کی چشمِ قلب کو روشن کر دیتا ہے جس کی بدولت وہ سیرت کو اس کے حقیقی جمالیاتی تناظر میں دیکھ سکتا ہے۔ الہام والقا اور کشف ومشاہدہ کا یہ طریق بلاشبہ فیضانِ ربّی ہے لیکن سیرتِ طیبہ کو اس کے حقیقی جمالیاتی تناظر میں دیکھنے کے

لیے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اس جگہ صلیبی، صیہونی، مارکسی وغیرہ اسلام دشمن قوتوں کی تلبیس کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے جو ابلیس کے جمالیاتی فریبؒ کی طرح اس قدر خوشنما، نظر فریب اور مرعوب کُن ہے کہ اغیار تو اغیار اپنے بھی اس کے شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ اعدائِ اسلام اسلام دوستی اور علم وتحقیق کا لبادہ اوڑھ کر یہ پروپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ سیرت کا مطالعہ اس طریقے سے کرنا چاہیے جس طرح بیسویں صدی کے مغربی مستشرقین کر رہے ہیں اور اس متعصبانہ و گمراہ کن طریقے کو وہ سائنٹفک تاریخی منہاجؒ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کی یہ بات بادی النظر میں علمی ومعقول نظر آتی ہے، لیکن حقیقت میں ان دونوں مصطلحات سے مقصود مسلموں اور غیر مسلموں کے دلوں میں اسلام کے خلاف تشکیک و بدظنی پیدا کرنا ہے۔

سائنٹفک منہاج طبیعی علوم کے لیے موزوں بلکہ ناگزیر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان علوم کا تعلق مادّے کی ماہیت سے ہوتا ہے اور متعلقہ معلومات تجربے کی متوجب ہوتی ہیں اور تجربہ ہی ان کی صحت کا معیار ہوتا ہے۔ لیکن سوانح حیات کا معیار تجربہ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا سیرت کا مُطالعہ "سائنٹفک" منہاج کے ذریعے کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ علاوہ بریں کسی کی زندگی کے حالات و واقعات کا انحصار کُتبِ سیرت وتاریخ پر ہوتا ہے۔ تاریخ ملفوظات، کُتب اور آثار میں مرقوم ہوتی ہے۔ کُتبِ سیرت وتاریخ چونکہ انسان کی لکھی ہوئی ہوتی ہیں، اس لیے ان میں مؤلف کے اپنے معتقدات ونظریات، افکار وخیالات، جذبات واحساسات اور تعصبات و مدرکات بھی شامل ہوتے ہیں، لہٰذا سیرت نگاری کا منہاج سائنٹفک نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اعدائِ اسلام کے ایسا کہنے یا سائنٹفک منہاج اختیار کرنے کا دعویٰ کرنے کے دو مقاصد ہیں : اولاً اسلامی وغیر اسلامی دنیا کو تلبیسی علمی انداز میں گمراہ کرنا اور انھیں یہ باور کرانا ہے کہ سیرتِ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے متعلق ان کی معلومات ونگارشات وغیرہ متحقق و معتبر ہیں۔ ثانیاً سیرتِ طیبہ کے دو حقیقی وبنیادی مآخذ (قرآن وسنّت) کی اہمیت کا استیصال کرنا اور ان سے مسلموں اور غیر مسلموں کو روگردان کرانا ہے۔ مسلمانوں کا ایمان ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا سچا کلام ہے، جو شک وشبہ سے ماورا اور علم وحکمت کا سرچشمہ ہے اور اس کی ہر بات متحقّق ومستند ہے۔ جہاں تک سنّت کا تعلق ہے، اس کے دو مآخذ ہیں : (الف) اُمّت کا تواترِ عمل اور (ب) احادیثِ طیبہ۔ اوّل الذکر کی حیثیت ایک طرح سے مشاہدہ وتجربہ

کی سی ہے، لہٰذا اس کی صحت میں شک و شبہ کی بہت کم گنجائش ہے۔ البتہ احادیثِ طیبہ میں مزید تحقیق کی گنجائش ہو سکتی ہے لیکن کُتبِ تاریخ و سیر کے مقابلے میں صحاحِ ستہ صحت و سند کے اعتبار سے یقیناً افضل ہیں۔

عظیم انسان سے عموماً ایسی تاریخ ساز شخصیت مراد لی جاتی ہے جس نے زندگی کے کسی ایک یا ایک سے زائد شعبوں میں اس کی بقا یا نشو و ارتقا کے لیے کوئی انقلاب انگیز یا عہد آفریں کارنامہ سر انجام دیا ہو یا تاریخ کا رُخ اس کی صحیح سمت موڑ دیا ہو، یا حیاتِ انسانی کو جزوی یا کُلی سلامتی سے ہمکنار کیا ہو۔ اگر عظیم انسان کی یہ تعریف درست ہے اور اسے درست تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی تو ہمیں اس معیارِ تعریف پر آپ ﷺ کی سیرت کو جانچنا ہوگا۔

آپ ﷺ کی تحریکِ اسلام ایک ہمہ گیر و عالمگیر انقلابی و تعمیری تحریک تھی اور ہے، اور اس کا نصب العین بنی نوع انسان کو مشرکانہ عقاید و اوہام اور مناسکِ بت پرستی سے اور ہر قسم کی استحصالی قوتوں کی محکومی و غلامی سے نجات دلانا، نیز ان کے لیے ایک حسین و مثالی معاشرے کی تشکیل و تعمیر کرنا تھا، جس میں وہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے حسن و سلامتی کے ساتھ موضوعی۔ معروضی زندگی[10] گزار سکیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ آپ ﷺ نے یہ مقصد انتہائی نامساعد اور شکیب رُبا حالات پر قابو پا کر حاصل کر لیا، اور اس طرح آپ ﷺ نے تاریخ کے رخ کو اس کی صحیح و صالح سمت کی طرف موڑ کر ایک نئے حسین و درخشاں دَور کا آغاز کیا۔

اسلام کو دراصل اس لیے اس نام سے موسوم کیا گیا ہے کہ وہ کُلّی یعنی موضوعی، معروضی اور اُخروی سلامتی کا نقیب و علمبردار ہے۔ قرآن مجید کی رُو سے سلامتی کے معنی ہیں خوف و حُزن کا فقدان اور امن و اطمینان کی حالت۔ اس اعتبار سے موضوعی سلامتی کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا قلب خوف و خطر، غم و الم، تضاد و انتشار اور اندیشہ ہائے گوناگوں سے پاک و صاف ہو اور وہ اپنی حالت پر قانع و مطمئن ہو۔ معروضی سلامتی سے مراد قومی و بین الاقوامی یا عالمگیر معاشرتی امن و سلامتی ہے۔ معاشرہ ایک نامیاتی کُل[11] ہے، جس کے متعدد شعبے ہیں، مثلاً معاشی، سیاسی، عسکری، تمدنی، ثقافتی وغیرہ۔ مختصر یہ کہ معروضی سلامتی سے عالمگیر و ہمہ گیر معاشرتی امن و سلامتی مراد ہے۔ اُخروی سلامتی کا مطلب حیات بعد الممات کی سلامتی ہے۔

اسلام کی رو سے حیاتِ انسانی اللہ تعالیٰ کی ایک با مقصد حسین تخلیق ہے، مداومت و ابدیت جس کی تقدیر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس دنیا میں موت حیاتِ انسانی کی تقدیر ہے، لیکن

موت کا وظیفہ روح یا نفس کو جو اصلِ حیات ہے، جسدِ خاکی سے جدا کرنا اور اسے عالمِ زمان و مکان سے نکال کر "الحیوان" میں پہنچا دینا ہے۔ الحیوان میں چونکہ موت نہیں ہے، اس لیے وہاں انسان ہمیشہ ارتقائی زندگی بسر کرے گا۔ سلیم القلب انسانوں یا اہلِ حُسن و سرور کو وہاں حسن المآب[12] میں اور اہلِ خوف و حزن یا اہلِ نار کو شرِ مآب[13] میں رہنا ہوگا۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ آپ ﷺ کی تحریکِ اسلام کی غایت ہر زمان و مکان کے انسان کو موضوعی۔ معروضی اُخروی سلامتی سے ہمکنار کرنا تھا اور ہے، اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو رحمۃ للعالمین ﷺ اور حاملِ خُلقِ عظیم ایسے عظیم و بے مثال القاب سے ملقب کیا ہے۔

اس دُنیا میں بہت سے ایسے انسان ہو گزرے ہیں جنھوں نے زندگی کے کسی ایک شعبے میں کمال حاصل کیا اور تاریخ ساز کارنامہ سر انجام دیا، لیکن انسانوں کی تعداد قلیل ہے جنھوں نے ایک سے زائد شعبوں میں عظمت حاصل کی ہو۔ ایسے عظیم انسانوں میں اللہ تعالیٰ کے پیغمبر بھی ہیں اور مصلحین و اولیاء اللہ بھی، فاتح و سپہ سالار بھی ہیں اور مدبّر و سیاست دان بھی، عالم و حکیم بھی ہیں اور ادیب و فن کار بھی، معلّم بھی ہیں اور سائنسدان بھی، مصنف و مؤلف بھی ہیں اور موجد و مخترع بھی، لیکن زندگی کے کل شعبوں میں حسین انقلاب لانے اور عہد آفریں و تاریخ ساز مثبت تعمیری کارنامے سر انجام دینے والی صرف ایک ہی شخصیت ہے جو محمّد ہے (صلّی اللہ علیہ وسلّم) عظیم ترین مثالی انسان۔ آپ ﷺ کی ہمہ جہتی شخصیت کی عظمت پر تاریخ کے مندرجۂ ذیل شواہد دال ہیں :

(۱) آپ ﷺ مثالی مجاہد و انقلابی شخصیّت ہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے شرک و بُت پرستی، جہالت و ناخواندگی، محکومی و غلامی، فرعونیت و ہامانیت اور قارونیت و پیشوائیت ایسی تمام استحصالی قوتوں کے خلاف کامیابی کے ساتھ مردانہ وار جہاد کیا اور کامیاب ہوئے۔

(۲) آپ ﷺ حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کے عظیم علمبردار تھے، چنانچہ آپ ﷺ نے انتہائی نامساعد حالات میں اسلام کی انقلاب انگیز تحریک رحمۃ للعالمینی کو کامیاب بنایا اور ایسے حرکی و ارتقائی اور حسین و ہمہ گیر مثالی معاشرے کی تشکیل و تعمیر کی جو ہر قسم کے ظلم و استحصال سے منزّہ اور اخوّت و محبت اور حریّت و مساوات کی بنیادوں پر استوار تھا اور اس میں عالمگیر بننے کی صلاحیت تھی۔

(۳) خانہ جنگی عرب کی تاریخی خصوصیت تھی، لیکن آپؐ نے متخاصم و متحارب قبائل میں اخوت و محبت اور وحدتِ فکر و عمل پیدا کر دی، نیز انھیں ایک باشعور و فعال مثالی امت یا ملت بنا دیا، جس نے کم و بیش آٹھ صدیاں اقوامِ عالم کی قیادت کی۔

(۴) ایک سپہ سالار و فاتح کی حیثیت سے آپؐ نے عربوں کے جنگجو قبائل اور رومۃ الکبریٰ Roman Empire کا کامیابی سے مقابلہ کیا اور آپؐ کی بے مثال جنگی حکمتِ عملی کی وجہ سے ان تمام لڑائیوں میں فریقین کے ایک ہزار سے کم فوجی ہلاک ہوئے لیکن دس سال کی مختصر مدت میں آپؐ نے بارہ لاکھ میل کا علاقہ فتح کر لیا اور عرب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ آپؐ نے پورے جزیرہ نمائے عرب میں ایک ایسی مضبوط و طاقتور مرکزی حکومت قائم کی جس سے ٹکرا کر قیصر و کسریٰ کی عظیم سلطنتیں پاش پاش ہو گئیں۔

(۵) آپؐ نے وحشی و صحرائی قبائل کو اسلام کے عقائد جلیلہ و محرکہ اور تعلیم و تربیت کے ذریعے ایسی مہذب و ترقی یافتہ قوم بنا دیا کہ تاریخ نے اقوامِ عالم کی قیادت و سیادت اسے تفویض کر دی۔

(۶) بانیِ ثقافت کی حیثیت سے آپؐ نے جمالیاتی، اخلاقی بنیادوں پر ایک ایسی تہذیب و ثقافت کی داغ بیل ڈالی جو اپنی سرشت میں حرکی و ارتقائی ہے۔

(۷) آپؐ ایک عظیم و مثالی داعی تھے، دلیل یہ ہے کہ ایک تو آپؐ کی دعوتِ اسلام کی نوعیت عالمگیر و ہمہ گیر ہے۔ دوسرے آپؐ کا طریقِ دعوت حسین اور سائنٹفک تھا۔ تیسرے آپؐ فصیح البیان اور صاحب جوامع الکلم تھے اور خطابت و بلاغت میں آپؐ اپنی مثال تھے، جیسا کہ آپؐ کے خطبات اور احادیثِ طیبہ سے ثابت ہے۔ چوتھے آپؐ نے عوام و خواص، امیر و فقیر اور گدا و شہنشاہ سب کو دعوتِ اسلام دی۔

(۸) آپؐ کی تحریک اسلام کی قوتِ محرکہ و رہبرانہ عقیدۂ توحید تھا جو وحدتِ انسانی کا علمبردار ہے۔

(۹) آپؐ عالم و حکیم بھی ہیں اور مفکر و مدبر بھی، آپؐ معلم علم و حکمت بھی ہیں اور مزکی و مربی بھی، نیز آپؐ ہادی و مرشد بھی ہیں۔ ان تمام حیثیتوں میں آپؐ عظیم و مثالی ہیں۔

(۱۰) میرے نزدیک آپؐ کی عظمتِ بے مثال کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ آپؐ رحمۃ للعالمین، حاملِ خُلقِ عظیم اور مکارمِ اخلاق کی تکمیل کرنے والے تھے۔

(۱۱) صدق و تقویٰ، امانت و دیانت اور زُہد و عبادت میں آپؐ اپنی مثال ہیں۔

(۱۲) آپؐ ایک شہری، ہمسائے، دوست، باپ، رشتے دار، غرضیکہ ہر حیثیت سے مثالی تھے۔

(۱۳) بحیثیتِ نبی و رسول آپؐ کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ آپؐ کا مشن ہمہ گیر و عالمگیر تھا جبکہ دیگر انبیاء و مرسلین علیہم السّلام کا مشن قومی و علاقائی نوعیت کا تھا، اور اس امر کے باوجود آپؐ ان سب سے کہیں زیادہ اپنے مشن میں کامیاب ہوئے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ آپؐ کی کامیابی عظیم و بے مثال ہے۔ علاوہ بریں آپؐ خاتم النبیین اور سیّد المرسلین ہیں۔ آپؐ کے سوا ہر پیغمبر کو وقتی و عارضی نوعیت کا معجزہ عطا ہوا لیکن آپؐ کو جو معجزہ ملا وہ زندۂ جاوید اور ہر زمان و مکان کے لیے ہے نیز وہ علم و حکمت کا سرچشمۂ جاری اور رشد و ہدایت کا مہرِ منیر ہے، جسے اس کی مکتوبی نوعیت کی بنا پر "الکتاب"[۱۴] اور ملفوظی نوعیت کے باعث القرآن[۱۵] اور حق و باطل، حسن و قبح اور خیر و شر کا عالمگیر اور سچا معیار ہونے کی بنا پر الفرقان[۱۶] سے تعبیر کیا گیا ہے۔

انسان کس طرح عظیم بن سکتا ہے؟ وہ وقت کی طاغوتی، فرعونی، ہامانی اور قارونی قوتوں کی غلامی و محکومی سے کس طرح نجات حاصل کر سکتا ہے؟ ایسے معاشرے کی تشکیل و تعمیر کیسے کی جا سکتی ہے جس میں تمام انسان آزادی، اطمینان، امن و سلامتی اور عزت و آبرو کے ساتھ خوشحال زندگی گزار سکیں؟ یہ تین ایسے اہم سوال ہیں جنھوں نے عصرِ حاضر کی توجہ اپنی طرف مبذول کر رکھی ہے۔ وہ ان سوالوں کا ایسا حل چاہتے ہیں جو عقل و دل دونوں کو مطمئن کر سکے۔ ظاہر ہے سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ قسم کے نظاموں میں ان سوالوں کا معقول و طمانیت بخش جواب نہیں مل سکتا کیونکہ وہ ناکام ثابت ہو چکے ہیں اور نوجوان طبقہ بالخصوص ان کے تجربوں کی ناکامی سے مایوس ہو چکا ہے اور کسی ایسے نظام کی طلب و تلاش میں ہے جو ان کے سوالوں کا کوئی معقول و اطمینان بخش حل پیش کرے۔ وہ آزادی چاہتے ہیں، نہ صرف استحصالی قوتوں سے بلکہ ان قوموں سے بھی جنھوں نے جماعتی تنظیم اور ملکی نظم و نسق کے نام پر فکر و عمل پر جبر و تشدد کے پہرے بٹھا رکھے ہیں۔ وہ ایسا نظام نہیں چاہتے جس میں وجود کی بقا کا سامان تو ہو، لیکن

رُوح کو درخورِ اعتنا ہی نہ سمجھا جائے، یا اس کی ہستی کو تسلیم ہی نہ کیا جائے۔ انسان طبعًا ایسا نظام نہیں چاہتا جو زندگی کی فانیت و عدمیّت کا قائل ہو کیونکہ وہ ہمیشہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ بہر حال اشتمالی انقلابی تجربے میں جو چین میں بالخصوص ابھی تک کامیابی سے جاری ہے' ان سوالوں کا جواب موجود ہے، لیکن وہ جامع نہیں، ادھورا ہے، کیونکہ اس میں جُزوی صداقت پائی جاتی ہے۔

چین کا اشتمالی انقلاب اپنے عقاید کے مطابق صرف مادّی ہے' روحانی نہیں۔ اس انقلاب نے جہاں انسان کو استحصالی قوتوں سے نجات دی ہے' وہاں اس نے بندوں کو ان کے حقیقی و فطری "اِلٰہ" سے جدا کر دیا ہے اور ان دونوں کے درمیان خلیج حائل کر کے اسے بعید سے بعید تر کرتا جا رہا ہے۔ چونکہ یہ عمل غیر فطری یعنی فطرتِ انسانی کے منافی ہے، اس لیے اس کے خلاف فطری ردِّ عمل ناگزیر ہے۔ ہمیں یہ اصل نہیں بھولنی چاہیے کہ انسان فطرۃً عبد ہے اور عبدیّتِ اِلٰہ کو چاہتی ہے اور جذبۂ عبودیّت کی تشفّی پرستشِ اِلٰہ کے بغیر ممکن نہیں، اور اس تشفّی ہی میں طمانیتِ قلب کا راز مضمر ہے [۱۷]۔

اسلام کی رُو سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو فطرۃً عبد بنایا ہے یعنی اس میں آرزوئے اِلٰہ ودیعت کی ہے، جو اس میں جذبۂ محبت و رحمت کی نشو و نما کرتی ہے۔ اس جذبۂ محبت و رحمت کی بدولت انسان بڑی سے بڑی قربانی دینے سے دریغ نہیں کرتا اور صبر آزما و شکیب رُبا امتحان میں سے گزر جاتا ہے۔ بہر حال اس آرزوئے اِلٰہ کی تشفّی کے بغیر انسان کو اس دُنیا میں عیش و عشرت اور امن و سلامتی کی جنّت بھی میسّر آ جائے تو بھی اسے طمانیتِ قلب نصیب نہیں ہو سکتی۔ اس اعتبار سے اشتمالی انقلاب ادھورا ہے' اگرچہ مادّی لحاظ سے یہ تجربہ خاصا کامیاب دکھائی دیتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اسلام کا جمالیاتی دینی انقلاب مادّی و رُوحانی اور دُنیوی و اُخروی ہر اعتبار سے مکمل و حسین اور فطری ہے۔ اس کا تجربہ اس قدر کامیاب ثابت ہوا ہے کہ اسلامی معاشرہ صدیوں تک مثالی سمجھا جاتا رہا اور اس نے علم و حکمت' ادب و فن' صنعت و حرفت، سیاحت و حرب، معاشیات و فقاہت غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے میں عظیم و باکمال اور نابغۂ روزگار شخصیتیں پیدا کیں اور اُمّتِ مسلمہ نے سات آٹھ صدیوں تک اقوامِ عالم کی قیادت کی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اسلامی نظام کو پھر قائم کر دیا جائے تو دُنیا اسے پھر مثالی سمجھنے پر مجبور ہو جائے گی۔

آج کے جواں فکر انسان کو جن مذکورۂ بالا سوالوں نے پریشان کر رکھا ہے' ان کا جامع و مانع جواب نظری و علمی دونوں صورتوں میں آپؐ کی سیرتِ طیبہ میں ملتا ہے۔ جس شخص نے اپنی زندگی کو حسین و منوّر، مطمئن و مسرور اور کامیاب و عظیم بنانا ہو اور جسے ایک حسین و عالمگیر جمالیاتی انقلاب کو دیکھنے یا لانے اور مثالی معاشرے کو دیکھنے یا اس کی تشکیل و تعمیر کرنے کی طلب و جستجو ہو' اس کے لیے آپؐ کی سیرتِ طیبہ رہنما اصولوں یعنی رُشد و ہدایت کی زندہ و قابلِ اعتماد کتاب، بلکہ زندہ و متحرک تصویروں کا ایک بڑا ہی خیال آفریں، سبق آموز' عبرت انگیز اور بصیرت افروز مرقع ہے۔

زندگی کا مسئلہ آج کے نوجوانوں کے لیے لاینحل بن گیا ہے حالانکہ وہ ایسا نہیں ہے۔ اسلام کے نزدیک زندگی اللہ تعالیٰ کا انمول عطیہ ہے جس کی قدر نہ کرنا کفرانِ نعمت ہے اور اس کا نتیجہ انسان کی محرومی و نامرادی کی صورت میں نکلتا ہے۔ زندگی کو بھیانک عذاب یا لایعنی سمجھنا' زندگی اور اس کے عطا کرنے والے دونوں کی تحقیر ہے۔ اس سوچ یا نظریے سے انسان خود اپنی تحقیر کرتا ہے۔ چنانچہ زندگی سے فرار کی ہر کوشش چاہے رہبانیت کے ذریعے ہو یا نشہ و عشرت کے، کفرانِ نعمت ہے۔ اسی طرح ظلم و استحصال یا گمراہ کن افکار و نظریات کے ذریعے دوسروں کو زندگی سے لُطف اندوز نہ ہونے دینا یا زندگی کی نعمتوں سے محروم رکھنا یا ایسی کوشش کرنا تحقیرِ زندگی ہے، اس سے خود انسان زندگی کی لذّتِ حقیقی سے محروم ہو جاتا ہے۔

اسلام کے فلسفۂ حیات کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ دوسروں کو زندگی عطا کرنے سے زندگی ملتی ہے اور دوسروں سے زندگی چھیننے سے اپنی زندگی چھن جاتی ہے۔ لہٰذا جسے اپنا دامنِ زندگی مسرّتوں سے بھرنا ہو' اسے دوسروں کو مسرّتیں دیتے رہنا چاہیے۔ اس فلسفۂ حیات کی ایک دلکش عملی تفسیر آپؐ کی سیرتِ طیبہ میں ملتی ہے۔ اس اعتبار سے بھی عصرِ حاضر کے نوجوانوں کے لیے سیرتِ طیبہ کا مطالعہ بے حد مفید، دلچسپ اور ضروری ہے۔

سیرت کی یہ کتاب اس مثالی انسان کی ہے جو عظیم و آفاقی اور رحمۃ للعالمین نیز پیغمبرِ اعظم و آخرؐ تھا۔ لہٰذا یہ سب کے لیے ہے اور سب کے لیے لکھی گئی ہے۔ لیکن یہ دراصل ان کے لیے ہے جنھیں حق و صداقت کی تلاش اور طمانیت و مسرّت اور معاشرتی امن کی

طلب و جستجو ہے، نیز جو عظیم و کامیاب انسان بننا چاہتے ہیں۔ سیرتِ طیبہ کا مطالعہ کرتے اور لکھتے وقت میرے پیشِ نظر وہ لوگ بھی تھے جو درود و سلام، نعت و قوالی اور وجد و حال کے ذریعے عشقِ رسولؐ کا دم بھرتے ہیں، حالانکہ ان کے فکر و عمل کا مرقع آپؐ کی سیرتِ طیبہ کے رنگوں سے معرا ہوتا ہے۔ عشقِ رسولؐ جیسا کہ قرآنِ مجید اور احادیث طیبہ سے ثابت ہے، آپؐ کے اتباع و اطاعت میں مضمر ہے۔

اہلِ طریقت کے لیے بھی سیرتِ طیبہ مُرشدِ کامل ہے۔ وہ انھیں اس حقیقت سے عملاً آشنا کرتی ہے کہ کتاب و حکمت کی تعلیم اور تزکیۂ نفس کے ذریعے وہ کس طرح اداشناسِ فطرت اور مزاج دانِ رسولؐ بن سکتے اور کس طرح مقامِ مشہُودیت سے ترقی کر کے مقامِ شاہدیت پر متمکّن ہو سکتے ہیں۔ سیرتِ طیبہّ ان میں اس حقیقت کا بھی اذعان و ایقان پیدا کرتی ہے کہ سالک و صوفی اللہ تعالیٰ کے فقیر مگر اہلِ دنیا سے مُستغنی ہوتے ہیں، نیز وہ تحریکِ اسلام کے فعّال کارکن ہوتے ہیں۔ معاشرتی کاموں میں اپنے اِلٰہ کے حوالے سے بھرپُور حصّہ لیتے ہیں۔ وہ صائم الدھر اور قائم اللیل بھی ہوتے ہیں اور مجاہد و محنت کش بھی۔ انھیں نہ صرف اللہ تعالیٰ، اس کے رسولِ مقبولؐ سے، بلکہ اس کی کُل مخلوقات خصُوصاً انسان سے سچّی محبت ہوتی ہے، اور اس محبّت کے طفیل وہ اہلِ حسن و سرُور، زبان شناسِ فطرت، صاحبِ اسرار اور مُحسنِ انسانیت بنتے ہیں۔ لہٰذا اس کتابِ سیرت میں اہلِ حسن و صفا کے ذوق کی تسکین کا سامان بھی موجود ہے۔

جو شخص دوسروں کے لیے جیتا ہے، اسے اپنا دل بہت بڑا کر کے جینا پڑتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے دوسروں کی خاطر مصائب جھیلنے، رنج و محن اُٹھانے، قربانیاں کرنے اور ایثار سے کام لینا پڑتا ہے۔ آپؐ کی زندگی بھی دوسروں کے لیے تھی کیونکہ آپؐ رحمۃ للعالمین[۴] بن کر مبعوث ہوئے تھے۔ چونکہ آپؐ کی زندگی نہ صرف اپنے عہد کے بلکہ ہر زمان و مکان کے انسان کے لیے رحمت بننے والی تھی، اس لیے آپؐ ایمان و اعمالِ صالحہ، عدل و احسان، محنت و مشقت، ایثار و قربانی، عزم و ہمت اور صبر و استقامت کے پیکر تھے۔ نیز آپؐ کا مشن چونکہ عالمگیر، عظیم ترین اور ہر زمان و مکان کے لیے تھا، اس لیے آپؐ کا کردار اتنا ہی عظیم، اخلاق اتنے ہی حسین اور راہِ عمل اتنی ہی پُرخار و صبر آزما تھی۔ اس اعتبار سے آپؐ کی عظمتِ بے مثال کا ایک زندہ ثبوت یہ ہے کہ آپؐ نے اپنے اس مشن کو حیرت انگیز کامیابی کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ اس سے اس امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ قرآنِ مجید نے کیوں آپؐ

کے فکر و عمل کے ہر رویّے کو ہر زمان و مکان کے انسان کے لیے "حسین مثالی نمونہ" (اُسوۂ حسنہ) قرار دیا ہے۔

آپؐ کی سیرت اس حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ اسلام ایک جامد و رجعت پسند مذہب نہیں، بلکہ یہ ایک زندہ فطری دینی تحریک ہے۔ چونکہ زندگی کا خاصّہ حرکت اور تقاضا انقلاب ہے، اس لیے یہ اپنے مزاج میں انقلابی تحریک ہے، لیکن فطری دین ہونے کے باعث اس کے عقایدِ جلیلہ و مُحرّکہ ناقابل تغیّر و تبدّل، اس کی راہ و منزل متعیّن و معلوم ہے۔ لہٰذا مسلمان ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اس تحریک کے عقاید جلیلہ و محرّکہ اور غرض و غایت کو سچے دل سے تسلیم کیا جائے، اور اس میں عملاً حصّہ لیا جائے۔ بالفاظِ دیگر سچّا اور کامل مسلمان وہ ہوتا ہے جو اسلام کے عقاید کو اپنے اندر اسطرح جذب کر لے کہ وہ اس کی زندگی کے اجزائے لاینفک بن جائیں۔ نیز اس کی سیرت اس طرح ہو جائے جس طرح آپؐ کی سیرتِ طیبہ تھی اور آپؐ کی سیرتِ طیبہ کیا تھی؟ اس کو قرآن مجید نے اپنے چار جملوں میں پیش کر کے کوزۂ الفاظ میں دریائے معانی کو بند کر دیا ہے: (اے محمدؐ!) کہہ دو، میرے ربّ نے بالیقین مجھے سیدھے راستے پر چلا دیا ہے، بالکل ٹھیک دین، جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں، (یہ وہی حضرتِ ابراہیمؑ کا طریق ہے جسے اس نے یکسو ہو کر اختیار کیا تھا، اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا۔ کہہ دو! میری نماز اور میرے تمام مناسک عبودیّت، اور میرا مرنا اور میرا جینا، سب کچھ اللہ ربّ العالمین کے لیے ہے، جس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے اسی بات کا حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سرِ اطاعت جُھکانے والا میں ہوں۔

کہو! کیا میں اللہ کے سوا کوئی رب تلاش کروں؟ حالانکہ وہی ہر چیز کا ربّ ہے۔ ہر شخص جو کچھ کماتا ہے، اس کا ذمّہ دار وہ خود ہے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھاتا۔ پھر تم سب کو بالآخر اپنے ربّ کی طرف لوٹنا ہے۔ اس وقت وہ تمھارے اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دے گا[۱۸]۔

ان آیات میں آپؐ کی سیرتِ طیبہ کے جن اہم و نمایاں پہلوؤں کی نشاندھی کی گئی ہے، ان سے قدرے تفصیل سے گفتگو کی جاتی ہے:

اوّل: آپؐ کی روشِ زندگی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح تھی، جو مُوحِّد و صادق تھے، مشرک نہ تھے۔ آپؐ کے فکر و عمل کی راہ مستقیم تھی، یعنی ایسی راہ جس پر ہر سلیم الفطرت اِنسان

چلنا پسند کرتا ہے اور جو انسان کو اس کے اِلٰہ (معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود) اور رب (پروردگار و آقا) تک پہنچاتی ہے۔

دوم: آپؐ کی نماز، ہر عبادت، فکر و عمل کی ہر روش، غرضیکہ زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کے لیے تھی۔ زندگی کا اللہ تعالیٰ کے لیے ہونے کا مطلب، جیسا کہ آپؐ کی سیرت طیبہ سے ثابت ہے یہ ہے کہ انسان اسے بندگانِ خدا کی تعلیم و تربیت تزکیۂ نفس، فلاح و بہبود، ان کے حقوق، آزادی اور بقا کی حفاظت، نیز ان کی ثقافتی زندگی کو (جس سے مراد فکری و رُوحانی، سیاسی و معاشی اور معاشرتی زندگی ہے) ظلم و استحصال اور جبر و غلامی سے نجات دلانے کے لیے وقف کر دے۔
موت ہی کسی فرد کی سیرت کی اقدار کی تعیین کرتی ہے۔ چنانچہ مومن کی موت اللہ تعالیٰ کے لیے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا اس کے نام کو بلند کرنے اور اس کے دین اور اہلِ دین کی حفاظت و دفاع، نیز جملہ بنی نوع انسان بلکہ مخلوقات کے حقوق و مفادات کی خاطر اس قدر جدوجہد کرتے رہنا کہ اسے اپنی جان تک کی پروا نہ رہے اور اسی کوشش میں جان دے دے۔ مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے اس کے بندوں کے لیے رحمت بن کر جینے اور اس کوشش میں اپنی جان تک کی پروا نہ کرنے والے انسان کی زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتی ہے۔ یہ کامیاب کوشش ہی دراصل آپؐ کا اُسوۂ حسنہ اور آپؐ کی سیرت کا لبِّ لُباب ہے۔

سوم: توحید پرستی اور شرک اجتماعِ ضدین ہے، جو محال ہے، لہٰذا آپؐ کے اسوۂ حسنہ کا اصل الاصول یہ ہے کہ شرک نہ کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو اپنا الٰہ یا ربّ نہ سمجھا جائے اور نہ بنایا ہی جائے، اور نہ کسی خیالی یا واقعی ہستی کو اس کی ذات و صفات یا اس کے کاروبارِ خدائی میں شریک ہی سمجھا جائے۔
علاوہ بریں، کسی فرد یا جماعت کے ایسے نظریات و اصول اور احکام و قوانین کو سچا سمجھ کر تسلیم نہ کر لیا جائے جو اللہ تعالیٰ کی کتابِ آخر کی تعلیمات و احکام سے متعارض و متصادم ہوں۔
ہمیں کسی حال میں بھی اس حقیقت سے صرفِ نظر نہیں کرنا چاہیے کہ کسی معاشرے میں فرعونیت، ہامانیت اور قارونیت کے جنم لینے کا مطلب اس میں شرک کا پیدا

ہو جانا، ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کو تسلیم کرنا، ان سے تعاون کرنا یا ان سے مفاہمت کر لینا شرک ہے۔ جس معاشرے میں فرعون پیدا ہو جائے، اس میں ساتھ ہی ہامان اور قارون بھی جنم لیتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہامانیّت و قارونیّت دراصل فرعونیّت کی ضمنی پیداوار ہیں۔ بہر حال جہاں فرعون کی حکومت ہو، وہاں نہ تو اللہ تعالیٰ کا حکم چلتا ہے اور نہ اس کی اُلوہیّت و ربوبیّت کو عملاً تسلیم ہی کیا جاتا ہے۔ لہٰذا مُوحّد دراصل وہ ہوتا ہے جو پیغمبرانِ خدا کی طرح وقت کے ہر فرعون، ہامان اور قارون کو اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کا دشمن سمجھتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص انھیں ایسا نہیں سمجھتا اور ان کے ساتھ تعاون کرتا یا ان کے قصیدے لکھتا اور گُن گاتا ہے یا اس سے محبت کرتا اور اُمّیدیں وابستہ کرتا ہے، وہ درحقیقت شرک کرتا ہے، اس لیے مُشرک ہے۔ مختصر یہ کہ شرک کی ہر صورت سے بچنا آپؐ کا اُسوۂ حسنہ ہے۔

چہارم: اللہ تعالیٰ کے احکام کو سب سے پہلے تسلیم کرنا، بجا لانا یا ایسا کرنے کی کوشش کرنا۔ ایسی کوشش کرنے والے اہلِ ایمان کے لیے قرآنِ مجید نے "سابقون" کی تعبیر اختیار کی ہے۔ خیر و حسنہ، عدل و احسان اور محبت و رحمت کے ہر کام میں سبقت لے جانا یا ایسا کرنے کی مخلصانہ کوشش کرنا آپؐ کا اسوۂ حسنہ ہے۔

پنجم: اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور "ربّ" کی طلب و جستجو نہ کرنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وقت کے کسی فرعون، ہامان یا قارون سے امیدیں وابستہ کر لینا، نفع کی خاطر ان سے تعاون کرنا، ان کی خوشامد کی خاطر ضمیر و عزّتِ نفس اور زبان و قلم کو بیچ ڈالنا یا لوگوں پر ظلم کرنا یا ان کا استحصال کرنے سے دریغ نہ کرنا۔ بعض لوگ پیروں فقیروں مزاروں اور آستانوں سے مرادیں مانگتے اور ان کے احکام و تعلیمات کو اس طرح تسلیم کرتے ہیں جیسے وہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور تعلیمات ہوں۔ اسلام کے نزدیک ایسا کرنا ان کو اپنا "ربّ" بنا لینا ہے، اور یہ شرک ہے۔ لہٰذا آپؐ کا اسوۂ حسنہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو بھی اپنا "اِلٰہ و ربّ" نہ سمجھا اور نہ بنایا جائے۔

ششم: قدرت کے قانونِ مکافات کو تسلیم کرنا: قرآنِ مجید اور احادیثِ طیّبہ سے ثابت ہے کہ آپؐ لوگوں میں ہمیشہ اس حقیقت کا اذعان و ایقان پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ سفرِ زندگی میں کوئی کسی کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا۔ اپنا غم اپنا اور اپنی

خوشی اپنی ہی ہوتی ہے۔ کوئی کسی کے دل کی آتش خوف و حُزن لینا بھی چاہے تو نہیں لے سکتا۔ یہ قدرت کا قانونِ مکافات ہے۔ جو لوگ "پیر و مرشد" بن کر اپنے سادہ لوح مریدوں کو دھوکا دیتے ہیں کہ ان کے گناہوں کا بوجھ خود اُٹھاتے ہیں، وہ کھُلّم کھُلا قرآنِ مجید اور قدرت کے قانونِ مکافات کی تکذیب کرتے ہیں۔

قدرت کا قانونِ مکافات یہ ہے کہ کشتِ ارضی ہو یا مزرعِ حیات، جیسا بو دگے ویسا ہی پھل پاؤ گے۔ حیاتِ انسانی چونکہ ایک مستقل ارتقائی عمل ہے اور اس کا سلسلہ موت کے بعد بھی چلتا رہتا ہے، اس لیے انسان کو اس کے اعمال کا پھل حیاتِ اُخروی میں بھی ملتا رہے گا۔ اس سے اس کو مفر نہیں۔ یہ اس کی تقدیر ہے۔ اس تقدیر پر ایمان لانا یعنی قانونِ مکافاتِ عمل کے عقیدے کو اپنی فکری و عملی زندگی کا جزوِ لاینفک بنا لینا آپؐ کا اسوۂ حسنہ ہے۔

ان عقاید و اعمال سے انسان اہلِ حسن و محبت بن جاتا ہے، جسے اللہ تعالیٰ کے حوالے سے "بندۂ رحمٰن"، معاشرے کے حوالے سے صالح، انسانیت کے حوالے سے محسن اور کُل مخلوقات کے حوالے سے رحمۃ للعالمین کہہ سکتے ہیں جس کی ایک مکمل و جامع مثال آپؐ کی حیاتِ طیبہ ہے جس میں ہر زمان و مکان کے انسان کے لیے اُسوۂ حسنہ یعنی ایک حسین و کامل نمونۂ حیات ہے۔

زندگی ایک حرکی و ارتقائی اور دم بدم ایک نئے عالم میں ظہور پذیر ہونے والی حسین شے ہے، لہٰذا زندہ فرد اور قوم کی ایک شناخت یہ ہے کہ وہ مسلسل حسین و ارتقائی حرکت و عمل میں رہتے ہیں۔ جس طرح صدق کا خاصّہ تصدیق، علم کا خاصّہ روشنی اور حکمت کا خاصّہ رہنمائی ہے، اسی طرح حُسن کا خاصّہ احسان اور محبت کا خاصہ رحمت ہے۔ چونکہ یہ تمام چیزیں اپنے خواص کے بغیر معتبر نہیں ہوتیں لہٰذا اہلِ حُسن و محبت کو اہلِ احسان و رحمت بننے کے لیے مسلسل حسنِ فکر و عمل کی حاجت ہوتی ہے۔

اسلام کی آرزو اور غایت ہی بنی نوع انسان کو اہلِ احسان و رحمت بنانا ہے۔ اہلِ احسان کا مطلب اللہ تعالیٰ کے حوالے سے عبدیّت کے مقامِ شہود پر متمکن ہو جانا ہے۔ اس مقام کی پہلی منزل مقامِ مشہودیّت ہے۔ اس مقام پر بندے کو عبادت کے وقت بالخصوص ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا اِلٰہ اسے دیکھ رہا ہے۔ اس سے اس میں ذاتِ الٰہی کا علم الیقین

پیدا ہوتا ہے جس سے ایمان میں توانائی اور دل میں طمانیت پیدا ہوتی ہے اور یہ سلسلہ بڑھتا رہتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بندے کو اس سے اعلیٰ و احسن مقام عطا ہوتا ہے جسے مقامِ "شاہدیّت" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس مقام پر انسان کو پہلے یہ محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اپنے اِلٰہ کو دیکھ رہا ہے۔ اسے اس کی موجودگی، پھر قرب کا احساس ہوتا ہے اور آخر کار وہ اس کا "شاہد" بن جاتا ہے اور مشاہدات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ان مشاہدات میں بوقلمونی و تنوّع کے ساتھ ارتقاء بھی پایا جاتا ہے، اور ان سے "شاہد" کے دل میں عین الیقین اور حق الیقین پیدا ہوتا ہے اور انسان نتیجۃً "عارف"، ولی اور صاحبِ حُسن و سرور بن جاتا ہے۔

بنی نوع انسان کے حوالے سے احسان سے مراد ان کی مادّی، اخلاقی اور رُوحانی زندگی کو حسین و مطمئن بنانا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کی معیشت کو کُشادہ اور ان کے نفس کا تزکیہ کیا جائے۔ ان کے اخلاق کی تہذیب و تحسین کی جائے اور ان کے دلوں کو زندہ و بیدار اور حسین و منوّر کیا جائے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر ایسے حسین و صالح کام کرتے ہیں وہ اہلِ احسان ہوتے ہیں۔

محبت جب احسان و ایثار کے ساتھ معرضِ اظہار میں آتی ہے تو "رحمت" بنتی ہے اور محبت مسلسل جدّ و جہد، جہاد اور ایثار و قربانی کے بغیر رحمت نہیں بن سکتی۔ انفرادی رحمت تو ایک طرح کا احسان ہی ہوتی ہے، جب اس کا دائرہ وسیع ہو کر قومی یا بین الاقوامی ہو جائے تو "بعض حالات" میں یہ انقلاب کی متقاضی ہوتی ہے۔ "بعض حالات" سے مراد یہ ہے کہ جب انسانی معاشرے میں فرعونیّت، ہامانیّت اور قارونیّت اقتدار حاصل کر لے، انسان کے حقوق پامال اور غصب ہونے لگیں، اس کے استحصال کا سلسلہ شروع ہو جائے، اور اللہ تعالیٰ کی راہ اس کے بندوں پر مسدود کر دی جائے، (یاد رہے استحصال فقط جسمانی محنت ہی کا نہیں ہوتا بلکہ زبان و قلم اور عزتِ نفس کا بھی ہوتا ہے) تو ایسے معاشرے میں فساد اور جمود و تعطّل پیدا ہو جاتا ہے اور تاریخ کی حریف قوتیں، مرئی اور غیر مرئی دونوں اس کے استیصال کے لیے گھات میں لگ جاتی ہیں۔ اس سے اس پر خوف و حُزن اور یاس و بے یقینی کے بادل چھا جاتے ہیں۔ افراد انتشارِ ذہنی کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان پر زندگی کا دباؤ بڑھتے بڑھتے ناقابلِ برداشت اور انقلاب شُدنی ہو جاتا ہے۔ انقلاب رضاکارانہ ہو تو کشت و خون کے بغیر وقوع پذیر ہوتا ہے، لیکن ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے، انقلاب عموماً جبر سے لایا جاتا ہے —

انقلاب بالجبر کی دو قسمیں ہیں : انقلاب بالقوم اور انقلاب بالغیر۔ انقلاب بالقوم سے مراد اندرونی انقلاب ہے جسے قوم کے افراد قوّت کے ذریعے خود لاتے ہیں، چاہے اس میں صرف قوّت کا مظاہرہ ہو یا اس کا اِستعمال۔ اس کے برعکس انقلاب بالغیر وہ ہوتا ہے جسے کوئی بیرونی حملہ آور حکومت لاتی ہے۔ انقلاب اپنی نوعیت کے لحاظ سے دو قسم کا ہوتا ہے : جمالیّاتی یا غیر جمالیّاتی۔ جمالیّاتی انقلاب صالح ہوتا ہے اور اس کی شناخت یہ ہے کہ وہ لوگوں کے لیے خوش آیند اور باعثِ رحمت ہوتا ہے۔ اس کا نقیض یہ ہوا کہ غیر جمالیّاتی یا طالح انقلاب لوگوں کے لیے ناگوار اور ذلّت و مسکنت اور زحمت کا سبب ہوتا ہے۔ اسلام کے جمالیّاتی انقلاب کی ایک امتیازی خوبی یہ ہے کہ وہ انقلاب بالقوم بھی تھا اور انقلاب بالغیر بھی، لیکن دونوں صورتوں میں وہ ان ملکوں اور قوموں بلکہ کُل نوعِ انسانی کے لیے رحمت کا باعث تھا۔ چونکہ اسلام مستقل تحریک رحمت للعالمینی ہے، اس لیے وہ اِنسان کے لیے رحمت ہے اور ہمیشہ رحمت ہی رہے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام آرزوئے رحمتِ تمام ہے اور اس کے لیے چونکہ معاشرے میں بُرائیوں کو دُور کرنا نیز مفسد و شرانگیز عناصر سے اسے پاک و صاف کرنا پڑتا ہے، اس لیے معنوی رعایت سے اسے انقلابی تحریکِ رحمة للعالمینی سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اسلام کی تاریخی بنیادیں :

اسلام کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی انسان کی اجتماعی زندگی کی تاریخ پرانی ہے۔ انسان کی حسّی و قلبی استعدادیں قوّت سے فعل میں آئیں اور اس نے معاشرتی زندگی کا آغاز کیا تو اس پر اجتماعی زندگی کی ذمّے داریاں عاید ہوئیں، اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے حدُود کی تعیین، اس کی ذمّے داریوں اور فرد و قوم کے حقوق و آزادی کے مسائل پیدا ہوئے۔ انسان حسّی و قلبی تقاضے رکھنے کے ساتھ چونکہ ارادہ و اختیار بھی رکھتا ہے، اس لیے افرادِ معاشرہ میں نظری و عملی تضادات کا پیدا ہونا ایک فطری امر تھا، اور انھیں دُور کر کے معاشرے میں وحدتِ فکر و عمل پیدا کرنا بھی ضروری تھا کیونکہ یہ امن و سلامتی کی ایک لازمی شرط ہے۔ علاوہ بریں انسان اپنی ذات میں ایک صاحبِ ارادہ و اختیار نامیاتی کُل یا نفس ہے۔ نفس کی ایک اپنی آزاد و خود مختار دنیا ہے، جس میں اس کے اپنے ہم نفس افراد آباد ہیں، مثلاً (الف) نفسِ امّارہ، نفسِ لوّامہ وغیرہ۔ (ب) حواسِ خمسہ : سامعہ، باصرہ، شامّہ، ذائقہ اور لامسہ۔ (ج) دل : جبلّتیں، جیسے جنس، صیانتِ ذات، محبّت، خوف، نفرت، غصّہ و انتقام، بخل و اکتناز، غیرت و حمیّت، تکاثر و خود نمائی وغیرہ۔ (د) دماغ : عقل و فکر، وہم و خیال، ظن و تصوّر، حافظہ، ضمیر وغیرہ، (ہ) رُوح : آرزوئے اِلٰہ۔

نفس کی دنیا کے یہ افراد بھی اپنی اپنی دنیا میں صاحبِ ارادہ و اختیار ہیں۔ ان کے اپنے تقاضے ہیں جن کی تکمیل کی انھیں اضطراری طور سے طلب و جستجُو رہتی ہے اور جس کے باعث نفسِ کُلّی لحاظ سے بھی تضادات کا شکار رہتا ہے۔ ان تضادات کو دُور کیے بغیر انسان کی موضوعی دنیا میں ہم آہنگی و وحدت پیدا نہیں ہو سکتی، جو اس کی طمانیت کی ایک لازمی شرط ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے موضوعی و معروضی تضادات دُور کرنے اور اس کی نفسیاتی و معاشرتی دنیاؤں میں ہم آہنگی و وحدت اور امن و سلامتی پیدا کرنے کی خاطر ربوبیّت کا معنوی نظام قائم کیا۔ یہ نظام علمی و تربیتی تھا۔ اس نے انسان کی رُشد و ہدایت کے لیے وحی و تنزیل اور اس کی تعلیم و تربیت کے لیے انبیاؑ و رُسل کا سلسلہ شروع کیا۔ اس نظام کے لیے قرآنِ مجید نے "دین" کی تعبیر اختیار کی ہے۔ انبیاؑ و رُسل علیہمُ السّلام کی تعلیم و تربیت کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ وہ نظری و عملی ہونے کے علاوہ بذریعہ تجربہ و مثال بھی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انبیاؑ علیہم السلام نہ صرف لوگوں کو فطری انداز میں زندگی گزارنا سکھاتے تھے بلکہ خود ایسی زندگی گزار کر ان کے اور متاخرین کے لیے ایک حسین و مثالی نمونہ قائم کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نہ صرف خود حسین ہے بلکہ اس نے اپنی ہر تخلیق کو حسین بنایا ہے۔ انسان اس کا اس لحاظ سے تخلیقی شاہکار ہے کہ اس کی صورت و سیرت دونوں حسین ہیں اور اسے جمالیّاتی حس بھی ودیعت ہوئی ہے، جس کی بدولت اس میں حُسن کی آرزو و جُستجو ہے لیکن اس کے باوجود وہ نفسِ امّارہ یا ابلیس کے جمالیاتی فریب میں آ کر فسق و فجور، جُرم و گناہ اور ظلم و شرکی بھی قابلیت و اختیار رکھتا ہے۔ انسان کی اس طبعی کمزوری کو اللہ تعالیٰ جو فاطر ہستی ہے، خوب جانتا ہے۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ کو یہ بھی علم ہے کہ نفسِ انسانی کے مادّی و نفسیاتی تقاضے اور آرزوئیں کیا ہیں؟ اور انھیں صرف حسین طریقے ہی سے پورا کیا جا سکتا ہے؟ حسین طریقے سے مراد ایسا موزوں طریقہ ہے جو حالات و ظروف کے لحاظ سے بہترین ہو اور جس سے دوسروں کی فطری آرزوؤں، تقاضوں اور آزادی سے غیر فطری تصادم نہ ہوتا ہو، اور نہ معاشرے میں

تضاد و ناآہنگی اور فتنہ و فساد ہی برپا ہوتا ہو۔ اس حسین و فطری طریقے کو اللہ تعالیٰ نے صراطی،[19] سوار السّبیل[20] اور صراطِ مستقیم[21] سے تعبیر کیا ہے اور یہی اس کے نزدیک دینِ قیّم[22] یا اسلام[23] ہے۔ اسلام نہ صرف مشیّتِ الٰہی بلکہ فطرتِ انسانی کے بھی مطابق ہے، اس لیے یہ فطری دین ہے۔ چونکہ فطرتِ انسانی اور سنّتِ الٰہی دونوں غیر مبدّل اور اٹل ہیں، اس لیے اسلام ایک عالمگیر ازلی و ابدی دین ہے۔ اصل یہ ہے کہ اسلام یا دین فطرتِ انسانی کی آرزو ہے اور اس کی تاریخ اجتماعی زندگی کی تاریخ سے بھی قدیم تر ہے۔

اس جگہ اس اہم نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ دین حقیقت میں ایک ہے اور وہ اسلام ہے۔ یہ انسان کا اپنا فعل ہے کہ اس نے ابلیس کے جمالیاتی فریب میں آکر دین میں تحریفات کیں اور اسے مختلف ناموں سے موسوم کر دیا۔ یہ سلسلہ جو پیغمبرِ اوّل حضرت آدم علیہ السّلام سے شروع ہوا تھا، چلتا رہا، یہاں تک کہ انسان کی حسّی و قلبی بلوغت کا عہد آگیا اور اسے انبیاء علیہم السلام کی انگلی پکڑ کر چلنے کی حاجت نہ رہی۔ چنانچہ مشیّتِ ایزدی کا فیصلہ یہ ہوا کہ ہر زمان و مکان کے افرادِ نسلِ انسانی کے لیے آخری پیغمبر مبعوث اور اس پر آخری کتاب نازل کر کے نبوّت و رسالت اور وحی و تنزیل کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے منقطع کر دیا جائے۔ یہ آخری پیغمبر حضرت محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اور آخری کتاب قرآنِ مجید ہے، جسے ہر قسم کی لفظی و معنوی تحریف سے محفوظ رکھنے کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھی ہے[24]۔ ہمیں یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیے کہ اسلام کوئی جامد و ساکن دین نہیں بلکہ یہ زندہ و حرکی دینِ قیّم ہے اور اس میں اپنی صداقت، حرکیّت[25] اور ترقی پذیری کے باعث حیاتِ انسانی کے نو بنو ارتقائی تقاضوں کی تشفی کرنے کی قابلیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اس اعتبار سے یہ تحریک ہے۔

اسلام کی ایک امتیازی خوبی یہ ہے کہ اس نے بنی نوعِ انسان کو زندگی کے امتحان سے کامیابی کے ساتھ گزر جانے کے لیے دو بے مثال و لازوال چیزیں عطا کی ہیں: قرآنِ حکیم جو زندہ خدا کی زندہ و لافانی کتاب ہے اور پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کا اُسوۂ حسنہ۔ قرآنِ حکیم زندگی کے رہنما اصولوں کی جامع و مانع کتاب ہے تو اُسوۂ حسنہ ان اصولوں کا حسین و کامیاب تجربی و علمی اور مثالی مظاہرہ ہے، جسے سیرتِ طیبہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے آپؐ کی سیرتِ طیبہ کا اصلی مأخذ قرآنِ مجید ہے، لہٰذا اس کتاب کا بھی سب سے بڑا مأخذ قرآنِ حکیم

ہے جو حق کے ساتھ کلام کرتا ہے، لیکن ان کے ساتھ جو مندرجۂ ذیل صفات سے متّصف ہوں:

(۱) **طمانیّتِ نفس**: ان کا نفس پاکیزہ، حسین اور مطمئن ہو۔

(۲) **تقویٰ**: وہ مُتّقی ہوں، یعنی ان میں صدق و اخلاص کے ساتھ حق و صداقت کی طلب و جستجو بھی پائی جاتی ہو۔

(۳) ذوقِ تفکّر و قرآن رکھتے ہوں۔

(۴) آپؐ کے **ارشادات** اور سیرتِ طیبّہ کے ایک ایک پہلو پر ان کی نظر ہو۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ اسلام اپنی تاریخ کے لحاظ سے ایک ازلی و ابدی، فطری، سچا اور عالمگیر و ہمہ گیر دین ہے۔

حیاتیاتی وحدت:

اسلام انسان کی حیاتیاتی وحدت کے عقیدے کا علمبردار ہے۔ چنانچہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے سب سے پہلے اہلِ عرب کے سامنے یہ عقیدہ پیش کیا تو ان کے دل اس کے حریف نہ ہو سکے۔ ان کے قبائلی نظام میں اس عقیدے کو تسلیم کرنا تو کجا، کوئی اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اسی طرح سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظاموں میں بھی حیاتیاتی وحدت کے عقیدے کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ جو معاشرہ طبقات میں منقسم ہو، اس معاشرے کا دل پارہ پارہ ہوتا ہے۔ وہاں حیاتیاتی وحدت کے عقیدے کو تسلیم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسلام نے اپنے اس عقیدے کی بنا پر اخوّت و مساوات کا عقیدہ پیش کیا اور ساتھ ہی معاشرے میں تقوے کو عزّت و تکریم کا معیار قرار دیا۔ قریش اور سردارانِ قبائل کے لیے بالخصوص یہ عقیدہ ان کے علوئے مرتبت، شرف و عزّت اور امارت و سیادت کے خلاف نعرۂ بغاوت تھا۔ اس عقیدے کو قبول کرنے کا مطلب ان چیزوں سے محرومی تھا جو انھیں جان سے بھی عزیز تھیں اور ان چیزوں سے دست برداری و محرومی کی یہ بات ان کے لیے ان سُنی، ان دیکھی، انہونی اور ناشدنی تھی۔ چنانچہ انھوں نے تحریکِ اسلام کو براہِ راست اپنے خلاف سمجھ کر اس کی زبردست مخالفت کی اور اسے کچل دینے کی جو کوششیں اور سازشیں کیں، ان کی اور ان کے ردِّ عمل کی داستان دلچسپ و خیال آفریں اور بصیرت افروز و عبرت انگیز ہے۔

تحریکِ اسلام اس اعتبار سے انقلابی ہے کہ اس کا مقصد انسانوں کے درمیان تمام

مصنوعی و باطل امتیازات کو ختم کرنا ہے، اور اس لحاظ سے رحمۃ للعالمینی ہے کہ وہ اخوت و مساوات اور حریت و رحمت کی بنیادوں پر معاشرۂ انسانی کو استوار کرنا چاہتی ہے۔ آپؐ کا ایک ازبس اہم کارنامہ یہ ہے کہ آپؐ نے دورِ جاہلیت کے فرسودہ و جامد استحصالی معاشرے کا استیصال کر کے اس کی جگہ اخوت و محبت اور حریت و رحمت کی بنیادوں پر ایک زندہ و حرکی اور حسین و پاکیزہ معاشرہ تشکیل و تعمیر کیا۔

توحید اور حیاتیاتی وحدت کے عقاید اور ان کے قیاساتِ منطقی[۲۶] ایک ایسی بنیاد فراہم کرتے ہیں جن پر ایک عالمگیر برادری کی تشکیل و تعمیر ہو سکتی ہے۔ اسلام کوئی جامد و ساکت دین نہیں بلکہ وہ زندہ و حرکی اور محکم و فطری دین ہے۔ وہ دراصل فطرتِ انسانی کی تحریک ہے، جس کی نوعیت انقلابی و تعمیری ہے، جسے اس کے بانی رحمۃ للعالمینؐ کی سیرتِ طیبہ کے حوالے سے انقلاب انگیز تحریک رحمۃ للعالمینی سے موسوم کر سکتے ہیں۔ اسلام کے عقایدِ جلیلہ و محرکہ کی قوت و توانائی نے اسے تحریک بنایا اور اس میں دیگر ادیان، مذاہب اور ازمز[۲۷] پر غالب آنے کی قابلیت پیدا کی[۲۸]۔ چنانچہ آپؐ کی دلولہ انگیز قیادت میں تحریکِ اسلام نے عرب کے تمام ادیان کو مسخر کر لیا تھا۔ اسلام چونکہ فطرتِ انسانی کی تحریک ہے، اس میں تسخیرِ قلوب کی استعداد پائی جاتی ہے اور استعداد کو جب بھی قوت سے فعل میں لایا گیا، تحریکِ اسلام بلاشبہ تمام ادیان بشمول مذاہب ازمز پر غلبہ حاصل کرے گی۔ لیکن یہ کارنامہ وہی قیادتِ صالحہ سرانجام دے سکے گی جو آپؐ کی سنتِ حسنہ پر عمل کرے گی۔

تحریکِ اسلام میں چند صدیوں سے جو جمود و تعطل پیدا ہو چکا ہے، اس کی بنا پر اسلام دشمن قوتیں بالخصوص مستشرقین یہ پراپیگنڈا کر رہے ہیں کہ اسلام نہ تو تحریک ہے، نہ یہ کل حیاتِ انسانی کو محیط ہے اور نہ یہ ہر زمان و مکان کے لیے ہی ہے، بلکہ یہ تو محض روحانی قسم کی عبادات اور اخلاقی اقدار کا مذہب ہے۔ یہ پراپیگنڈا اتنا مزین کر کے کیا جاتا ہے کہ "دانشور" قسم کے مسلمان بھی اسلام کے متعلق ان کی طرح سوچتے ہیں اور ان کی یہ سوچ ہی ملتِ اسلامیہ کے لیے انتہائی مضرت رساں بلکہ مہلک ہے۔ میرے نزدیک یہ مسلمانوں کی جہالت و پسماندگی اور ذلت و مسکنت کے اہم ترین اسباب میں سے ہے۔

اسلام درحقیقت فطرتِ انسانی کی آرزو ہے، اسی لیے اسے دینِ فطرت کہتے ہیں۔ یہ آرزو اسے اپنے الٰہ کی ہے تاکہ اسے اطمینان اور سچی خوشی حاصل ہو، لیکن نفس کے اپنے

مطالبات اور خواہشات ہوتی ہیں جن کو زندگی بسر کرنے کے لیے پورا کرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں انسان معاشرتی بشر ہے۔ اس لیے اسے اپنی معاشرتی ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونا بھی پڑتا ہے۔ اس معاشرتی زندگی میں نفس کی گوناگوں خواہشات کے ان گنت راستے ہیں، لیکن اس کی "آرزو" کا ایک ہی راستہ ہے۔ نفس کی خواہشوں کے راستوں کی منزل زمان و مکان میں مقید ہے۔ ان راستوں میں مسافر کو لذائذِ نفسانی تو حاصل ہو سکتے ہیں، مگر وہ سچی خوشی نہیں جو صرف "آرزو" ہی کے راستے میں ملتی ہے جس کی ایک منزل یہ عالمِ زمان و مکان یا عالمِ موت و حیات ہے اور دوسری منزل آخرت یا "الحیوان"[۲۹] ہے۔ الحیوان دراصل موت و فنا سے ناآشنا قیدِ میت و حیات کا عالم ہے۔ اس عالم میں اس راہِ آرزو کی منزل حسن مآب ہے، جسے جنت سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ حسن مآب، جمال و جلال اور لذت و سرور کا ایک ایسا عالمِ بیکراں ہے جس میں انسان کو اس کے "الٰہ" کی دید میسر آئے گی، جو حاصلِ زندگانی ہے۔

انسان صراطِ مستقیم پر گامزن رہتے ہوئے نفس کے جائز تقاضوں اور خواہشوں کو پورا کرے تو وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے، لیکن اگر راہِ مستقیم کو چھوڑ کر کوئی دوسری راہ اختیار کرتا ہے تو اپنی منزل مقصود سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ راہِ مستقیم پر چلنے کو "ہدایت" اور اس کو چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کرنے کو "ضلالت" یا گمراہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ "ہدایت" کی راہ میں دل کو طمانیت اور معاشرے کو امن حاصل ہوتا ہے اور "الحیوان" میں انسان کو حسن المآب کی حیاتِ محض ملتی ہے۔ حیاتِ محض سے مراد طمانیت و مسرت کی حرکی و ارتقائی حیاتِ مدام ہے۔

انسان اس دنیا میں معاشرتی زندگی بسر کرنے پر طبعاً و حاجتاً مجبور ہے۔ اسے انفرادی و معاشرتی زندگی کی ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے حسی و قلبی قوتیں ودیعت کی گئی ہیں، ساتھ ہی اسے ایسا کرنے یا نہ کرنے کا ارادہ و اختیار بھی عطا کر دیا گیا ہے۔ فطرتِ انسانی، مشیتِ ایزدی اور اسلام تینوں کی یہ آرزو ہے کہ انسان اپنے سفرِ زندگی کے لیے آرزو کی صراطِ مستقیم (راہِ ہدایت) اختیار کرے اور اپنی منزلِ مقصود پہ پہنچ جائے جو "دوست" کی دید والا مقامِ محمود ہے۔

"ارادہ و اختیار" دراصل آزادی کی امانت ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو ودیعت ہوئی ہے۔ یہ امانت جس قدر بیش بہا ہے اسی قدر گراں بار بھی ہے[۳۰]۔ اسی امانت کی

وجہ سے انسان اپنی ذاتی و معاشرتی ذمّے داریوں کو پورا کرنے کا مکلّف ہے اور یہ دُنیا اس کے لیے دار الامتحان اور الحیوان و دار الجزا بن گیا ہے۔ جو خوش نصیب انسان اس امانتِ آزادی میں خیانت نہیں کرتے، وہ اخیار ہوتے ہیں، اور جو خیانت کرتے ہیں' وہ اشرار کہلاتے ہیں۔ انسانوں کے یہ دو واضح گروہ ہیں، جو ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ خیر کا خاصّہ امن و سلامتی اور تعمیر و تحسین ہے، جبکہ شر کا خاصّہ فتنہ و فساد، خوف و حُزن اور تخریب و تقبیح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں گروہ ہمیشہ متخالف و متصادم رہے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ لہٰذا خیر کو شر کی قوتوں پر غلبہ پانے کے لیے قوّتِ تسخیر اور جہاد کی حاجت ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے اسلام مجاہدوں کی انقلاب انگیز تحریکِ رحمۃ للعالمینی ہے۔

انسانی معاشرہ ایک نامیاتی وجودِ کُل کی طرح ہے۔ اگر نامیاتی وجود کے کسی جارحہ یا عضو کو ایسی بیماری یا زخم وغیرہ لگ جائے' جس کا علاج عملِ جراحی (آپریشن[31]) ہو تو یہ تکلیف دہ عمل دراصل اس مریض کے لیے باعثِ رحمت ہوتا ہے۔ یہی بات اِنسانی معاشرے پر صادق آتی ہے' جو ایک کُل نامیاتی وجود ہے۔ اس کے کسی حصّے کی بیماری کے علاج بالجراحت[32] کو "جہاد" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے اسلام تحریکِ رحمۃ للعالمینی بھی ہے، تحریکِ جہاد بھی اور تحریکِ انقلاب بھی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ آپؐ اور آپؐ کے متّبعین مجاہد و انقلاب پسند بھی تھے اور بنی نوعِ انسان کے محسن اور ان کے لیے باعثِ رحمت بھی تھے۔

مختصر یہ کہ اسلام انسان کی فطری آرزو ہے' جس کی تکمیل کی کوشش و کامیابی کی بصیرت افروز و سبق آموز اور کامل و ہمہ جہت روداد عبارت ہے سیرتِ رسول اللہؐ سے۔ آپؐ کی سیرتِ طیبہ ہمیں اس حقیقت کی یاد دلاتی ہے کہ آپؐ کے نقشِ قدم پر چل کر ہم بھی اپنی زندگی کو عظیم و کامیاب بنا سکتے ہیں، لہٰذا ہمیں اسی نقطۂ نظر سے اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

تاریخ کی یہ بڑی ہی عبرت ناک و سبق آموز واقعیت ہے کہ لوگوں نے ہر زمان و مکان میں انبیاء علیہم السّلام کو جو اپنے عہد کے سب سے زیادہ عقلمند و ہوشمند' دانا و بینا اور اہلِ علم و حکمت تھے، ساحر و مجنون کہا۔ چونکہ آپؐ بھی انبیاء علیہم السّلام کے سلسلے کی آخری کڑی تھے، لہٰذا لوگوں نے آپؐ کو بھی ساحر[33] و مجنوں[34] کہا۔ کیوں؟ اس کا جواب ایک لفظ میں دینا ہو تو وہ "عشقِ کامل" ہے۔ عشقِ کامل کا مطلب ہے' اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوقات

خصُوصًا بنی نوعِ انسان سے والہانہ محبّت۔ عشق رضائے "دوست" چاہتا ہے اور اس کی خاطر جذبات و خواہشات، نظریات و معتقدات، آرام و راحت، جان و مال، غرضیکہ ہر چیز کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ چونکہ مشرک و بُت پرست لوگ لذّتِ عشق سے ناآشنا ہوتے ہیں' اس لیے وہ "عشق" کی حقیقت سے بھی بے خبر ہوتے ہیں' لہٰذا "عاشقِ اِلٰہ" ان کی نظر میں دیوانہ ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیے۔ چونکہ آپؐ کو اللہ تعالیٰ سے بے پناہ محبّت تھی' اس لیے ان کے بندوں سے بھی آپؐ کو والہانہ محبت تھی۔ اس محبت میں آپؐ از حد تلخ و ناگوار اور انتہائی خطرناک و شکیب رُبا تجرِبات سے گزرتے رہتے تھے۔ یہ شیوۂ عاشقی اہلِ دنیا کے لیے دیوانگی و سحر زدگی تھا۔ اس عالم میں قریش نے آپؐ کو اسلام کی تحریکِ انقلاب سے دست بردار ہو جانے کے عوض بار بار سرداری و حکومت، دولت و امارت اور حسین عورتوں کی پیش کش کی' اور آپؐ نے اسے کمال بے نیازی سے ٹھکرا دیا تو اہلِ دنیا کی نظر میں آپؐ کا یہ فعل انتہائی مجنونانہ تھا۔ چنانچہ لوگوں کا آپؐ کو مجنون کہنا اس حقیقت پر دال تھا کہ آپؐ سچے نبی تھے اور آپؐ کو اپنے عظیم مشن سے سچّی محبّت تھی۔

جب لوگ آپؐ کی زبان مبارک سے کلامِ الٰہی سُنتے اور اس کی بلاغت سے مسحور ہو جاتے تو آپؐ کو ساحر کہتے۔ یہ سحر قرآن مجید کے حسن و صداقت، علم و حکمت اور اس کی زبان و معنویت کی بلاغت کا سحر تھا۔ اس اعتبار سے اہلِ عرب آپؐ کو ایک ہی زبان سے مجنون بھی کہتے اور ساحر بھی، اور اس طرح خود ہی اپنی تنقیص و تکذیب کرتے تھے۔ اصل یہ ہے کہ عشق ہی انسان کو اپنے مشن میں کامیاب نیز عظیم بناتا ہے اور آپؐ کی سیرتِ طیبہ کو اگر ایک لفظ میں بیان کرنا ہو تو وہ "عشقِ کامل" ہے۔ اسے حکایتِ مہر و وفا کہیے یا داستانِ عشق و جنوں' اسے سیرتِ رسولؐ کہیے یا رودادِ انقلابِ حقیقی و جمالیاتی' بات ایک ہی ہے۔

پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلّم کی سیرتِ طیبہ کی ایک امتیازی خوبی یہ ہے کہ آپؐ نے بنی نوعِ انسان کے معلّم کی حیثیت سے لوگوں کی ایسی اور ایسے پیمانے پر تعلیم و تربیت کی کہ معاشرہ مردم خیز بن گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس میں اس کثرت سے عظیم انسان پیدا ہوئے کہ اس کی نظیر تاریخ پیش کرنے سے عاجز ہے۔ ان عظیم انسانوں میں عالم و حکیم، معلّم و خطیب' مصلح و رہنما، زاہد و عابد، مدبّر و سیاست دان' فقیہ و قاضی، حاکم و والی' سپہ سالار و ماہرِ حربیات، فاتح و حکمران اور فنّان و صانع تھے' جنھوں نے دُنیا کے گوشے گوشے میں اپنی

عظمت و عبقریت کے جھنڈے گاڑ دیے۔ میرے نزدیک اس کے دو بنیادی اسباب تھے: ایک قرآنِ مجید اور دوسرا فکر و نظر اور اظہار و عمل کی آزادی۔ یہ دوسرا سبب دراصل پہلے کا ہی فرعیہ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ قرآنِ مجید اسلام کے نظامِ تعلیم کی بنیاد عقلیّات پر استوار کرنا چاہتا ہے۔ عقلیات ایسے نظام سے عبارت ہے جس میں حواس اور عقل و فکر نظم و ضبط کے ساتھ آزادانہ و حکیمانہ طریقے سے کام کرتے ہیں اور عقلیات پسند لوگوں ہی کو وہ سچے عاقل و دانا سمجھتا ہے:

بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور دن رات کے باری باری آنے جانے میں سچے عقلمندوں کے لیے نشانیاں ہیں، (جن کا شیوہ یہ ہے کہ) وہ اُٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے، ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی ساخت میں غور و فکر کرتے رہتے ہیں (اور جس نتیجے پر پہنچتے ہیں اس کا بے ساختہ اظہار یوں کرتے ہیں کہ) ہمارے ربّ! یہ سب کچھ تو نے فضول و بے مقصد نہیں بنایا ہے۔ تو پاک و منزّہ ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔ پس ہمیں آگ کے عذاب سے محفوظ رکھ[۳۵]۔

چنانچہ قرآن مجید کی رُو سے وہ لوگ جو عقل سے کام نہیں لیتے، بہرے، گونگے اور بدترین حیوان ہیں: یقیناً اللہ کے نزدیک بدترین حیوان وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے[۳۶]۔

عقل و فکر سے کام نہ لینے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ضمیر مُردہ، جمالیاتی حس مفلوج اور ذوق بگڑ جاتا ہے اور انسان کور ذوق اور حُسن کور بن جاتا ہے۔ چونکہ ایسے شخص میں حُسن و قبح اور پاکیزگی و گندگی میں تمیز کرنے کی قوّت مفلوج ہو جاتی ہے، لہٰذا اس کی زندگی گندگی میں ڈوب جاتی ہے: اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے، وہ ان پر گندگی ڈال دیتا ہے[۳۷]۔

قرآنِ مجید عقلیّات کا اس قدر مبلّغ و علمبردار ہے کہ وہ خود اپنے متعلق اپنے پیرووَں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس کی آیات کی کورانہ تقلید نہ کریں اور اندھوں اور بہروں کی طرح ان پر ٹوٹ نہ پڑیں بلکہ ان پر غور و فکر کریں۔ چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں (عبادُالرّحمٰن) کا ایک شناختی یا امتیازی وصف یہ بیان کرتا ہے کہ "اگر انھیں ان کے ربّ کی آیات سُنا کر نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے بن کر نہیں گر پڑتے" (بلکہ ہوش و حواس اور عقل و فکر سے کام لیتے ہیں)[۳۸]۔

اس بحث سے جہاں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اسلام حُرّیتِ فکر و نظر کا زبردست نقیب ہے، وہاں ان صلیبی و صیہونی مستشرقین کے اس غلط و گمراہ کن پراپیگنڈے کی قلعی بھی کھُل جاتی ہے اور ساتھ ہی اس کا بُطلان بھی ہو جاتا ہے کہ آپؐ نے اپنے صحابۂ کرامؓ کے ہوش و خرد کو مسحور و مفلوج کر دیا تھا، اس لیے وہ آپؐ کی کورانہ تقلید کرتے تھے[۳۹]۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم سے پہلے تمام انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی قوم کے لیے مبعوث ہوتے رہے تھے، اس لحاظ سے ان کی نبوّت کا دائرۂ کار محدود و مقامی تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں بُدھ مت اور عیسائیت دو ایسے ادیان تھے جن کے پیرووَں نے بہت عرصے بعد انھیں تبلیغی بنایا اور ان کی اشاعت بیرونی دُنیا میں کی۔ بدھ مت تو تبلیغی دین نہیں رہا، اس لیے اس میں جمود و تعطّل پیدا ہو گیا ہے، البتہ عیسائیت اب بھی تبلیغی دین ہے، اگرچہ خود انجیلِ مُقدّس کی رُو سے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی رسالت کا دائرہ بنی اسرائیل کی دُنیا تک محدود تھا۔ اسلام کی ایک خوبی جو اس کے اور دیگر ادیان میں مابہ الامتیاز ہے، یہ ہے کہ وہ عالمگیر، زمان و مکان کی قیود سے آزاد اور جملہ نسلِ انسانی کا دین ہے۔ اس کی دوسری خوبی یہ ہے کہ دنیا کے تمام ادیان و مذاہب میں وہ واحد دین ہے جو اپنے سے پہلے تمام ادیان اور ان کے پیغمبروں اور آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتا اور ان پر ایمان لانے کو ناگزیر سمجھتا ہے۔ اگرچہ اسلام کی یہ خوبی اس کے سچّا ہونے کی ایک واضح دلیل تھی لیکن دُوسرے مذاہب کے پیرووں کی نظروں کا کانٹا بن گئی۔ اسلام کا یہ عقیدہ و موقف دینی رواداری، حق شناسی اور تصدیقِ حق کی ایک ایسی مثال ہے، جس کے ذریعے اس نے ایک عالمگیر اتحاد اور امن کی ایک ٹھوس بنیاد فراہم کر دی ہے۔

قرآنِ مجید اور احادیثِ طیبّہ سے ثابت ہے کہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم تمام بنی نوعِ انسان کے لیے مبعوث ہوئے تھے:

"(اے محمدؐ) ہم نے تمھیں تمام بنی نوعِ انسان کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اللہ ہی (اس حقیقت کا) گواہ کافی ہے"[۴۰]۔

اللہ تعالیٰ چونکہ عالم الغیب ہے، جانتا تھا کہ صلیبی و صیہونی قوتیں اپنے مستشرقین کے ذریعے لوگوں کو یہ غلط تاثر دینے اور ان میں تشکیک پیدا کرنے کی کوشش کریں گی کہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم صرف عرب کے لیے مبعوث ہوئے تھے، اس نے سورۂ سبا میں اس امر کی

صراحت کر دی کہ آپؐ جملہ بنی نوع انسان کے لیے مبعوث ہیں، لہٰذا کوئی قوم، گروہ یا جماعت آپؐ کے حلقۂ رسالت یعنی دینِ اسلام کے باہر رہ نہیں سکتی :

(اے محمدؐ!) ہم نے تمھیں جملہ بنی نوع انسان کے لیے بشیر یعنی حسنِ یقین و عمل کے اجرِ حسنہ کی خوشخبری دینے والا اور نذیر یعنی بدعملیوں کے بُرے نتائج و عواقب سے مُتنبہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے، لیکن اکثر لوگ (یہ حقیقت) نہیں جانتے۔[۴۱]

اس جگہ اس خیال آفریں و بصیرت افروز نکتے کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ آپؐ چونکہ ہر زمان و مکان کے انسان کے لیے مبعوث ہوئے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو "خاتم النّبیّین" اور رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا تھا : محمدؐ تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن اللہ کے رسول اور نبیوں کے ختم کرنے والے ہیں اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔[۴۲]

آپؐ نے خاتم النبیّین کی جو تشریح فرمائی ہے وہ صحاحِ ستہ میں موجود ہے اور مُتّفق علیہ حدیث ہے۔ آپؐ نے فرمایا : "میری مثال اور دوسرے انبیاء کی مثال ایک ایسے شخص کی مثال ہے جس نے ایک گھر بنایا اور اسے حسین و جمیل بنایا، بجُز ایک کونے کی اینٹ کے۔ لوگ اس کے گرد گھومتے اور تعجب کرتے کہ یہ اینٹ کیوں نہیں لگائی۔ سو میں وہ اینٹ ہوں اور میں خاتم النّبیّین ہوں۔" مسلم، ترمذی اور نسائی کی ایک حدیث میں اس لفظ کی اس طرح صراحت کی گئی ہے کہ ختم بی النّبیُّون یعنی میرے ساتھ نبی ختم کر دیے گئے ہیں۔[۴۳]

چونکہ آپؐ کے ساتھ نبوّت و رسالت اور وحی و تنزیل کا سلسلہ ختم ہو جانا تھا، اس لیے آپؐ کی نبوّت کے فیضان کو ہمہ گیر و عالمگیر اور ابدی بنا دیا گیا، با قرآن مجید کے الفاظ میں :

(اے محمدؐ) ہم نے تم کو سارے جہانوں کے لیے رحمت ہی رحمت بنا کر بھیجا ہے۔[۴۴]

اس سے ثابت ہوا کہ اسلام کی عالمگیری و ابدیّت، ختمِ نبوّت اور رحمۃ للعالمینی ایک ہی سلسلے کی مربوط و لاینفک کڑیاں ہیں۔ نیز اس سے یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ اعدائے اسلام کا یہ پراپیگنڈا لغو و بے بنیاد ہے کہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم صرف عرب کے لیے مبعوث ہوئے تھے اور اسلام زمان و مکان کے لحاظ سے محدود و علاقائی دین ہے۔

کائنات کا ذرّہ، جسے حقیر و ناچیز خیال کر کے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا تھا، آخر کار اہلِ علم کی نظر نے اس میں توانائی کا خزینہ دریافت کر لیا۔ اگر یہ حقیقت ہے اور یقیناً ہے کہ ذرّہ اپنی توانائی کی بدولت قیامت بداماں ہے تو پھر یہ حقیقت ہمیں یاد دلاتی ہے کہ نظر وہ

ہے جو کائنات کی بظاہر حقیر چیز کو اور زندگی کے بظاہر معمولی سے معمولی واقعے کو دیدۂ بینا و عبرت آموز سے دیکھے اور سامعہ وہ ہے جو ہر آواز کو گوشِ حق نیوش سے سُنے، فکر وہ ہے جو ہر سُنی اور دیکھی بات پر حُسنِ نیّت سے غور کرے اور عقل وہ ہے جو خلوص سے ان کے حُسن و قبح پر حکم لگائے۔ جس شخص کی حسّی و قلبی قوتیں اس طرح فعّال و صالح ہوں، وہی درحقیقت حکیم و مفکّر اور دانا و بینا ہے۔ آپؐ کی حسّی و قلبی قوتیں بچپن ہی سے فعّال و صالح تھیں اور عمر کے ساتھ ان کی فعّالیت و صالحیت بھی بڑھتی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو مبعوث کیا تو آپؐ کی سوچ کی جہت اور منزلِ آخر متعیّن ہو گئی۔ اس اعتبار سے آپؐ ایک مثالی حکیم و مفکّر اور دانا و بینا بھی تھے۔ اگر آپؐ ایسے نہ ہوتے تو معلّمِ انسانیت بھی نہ ہوتے۔ علاوہ بریں آپؐ صاحبِ حُسن و سُرور بھی تھے، اس لیے آپ معلّمِ اخلاق بھی تھے۔ چنانچہ اسلام کے نزدیک سچّا حکیم، مفکّر اور دانا بینا وہ شخص ہے جو صاحبِ حُسن و سُرور بھی ہو، جیسا کہ آپؐ تھے۔ ہم معلوم کر چکے ہیں کہ حُسن و سرور مقامِ شہود میسر آنے سے حاصل ہوتا ہے۔ مقامِ شہود کی منزلِ اوّل مشہودیت اور منزلِ آخر شاہدیت ہے جس پر متمکن ہو کر انسان اہلِ نظر بنتا ہے۔ اسلام کی آرزو اور آپؐ کی بعثت کی غایتِ حقیقی ہی یہ ہے کہ انسان اہلِ نظر بنے اور اہلِ نظر ہی صاحبِ حُسن و سُرور ہوتا ہے۔

علم و نظر دونوں کی انتہا حیرت ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ علم کی حیرت سے معرفتِ الٰہی حاصل ہوتی ہے جبکہ نظر کی حیرت کا حاصل دیدِ الٰہ ہے۔[۴۵] حیرتِ علم و نظر ہی فلسفے کا مقصودِ حقیقی، حیاتِ انسانی کی غایت، فطرتِ انسانی اور اور اسلام کی آرزو اور اللہ تعالیٰ کی مشیّت ہے۔ آپؐ کی سیرتِ طیبّہ حیرتِ علم و نظر کی ایک حسین، سچّی اور سبق آموز داستان ہے جو اس سوال کا جامع و مانع جواب بھی ہے کہ انسان کس طرح حیرتِ علم و نظر کے مقام پر پہنچ سکتا ہے۔

آپؐ کی سیرت ایک ایسے مثالی انسان کی سچّی کہانی ہے جو پیدا ہوتے ہی یتیم تھا، اسے کسی مدرسے یا اُستاد سے پڑھنے لکھنے کا موقع نہ ملا۔ اس نے زندگی گزارنے کے لیے بکریاں چرائیں اور سوداگری کی اور زندگی بنانے کے لیے اپنے چشم و گوش کو ہمیشہ وا اور قلب کو بیدار رکھا، ہر بات کو گوشِ ہوش سے سنا اور ہر چیز کو دیدۂ عبرت نگاہ سے دیکھا، ہر معاملے پر فکرِ صالح سے غور کیا اور ہر فیصلہ عقلِ سلیم کی مدد سے کیا۔ غرضیکہ آپؐ کا دن دیگر مشاغل کے علاوہ کتابِ فطرت پڑھنے اور اہلِ علم و دانش کی باتیں سُننے میں اور رات ذکر و فکر میں گزرتی یعنی اپنے اِلٰہ کی یاد اور اس کے حوالے سے حقائقِ کائنات و حیات پر حکیمانہ غور و فکر کرتے بیت جاتی۔

اس طرح آپؐ کو دن میں بصیرتِ علم اور رات کو بصیرتِ نظر حاصل ہوتی تھی۔

عظیم انسان کی زندگی اپنے لیے نہیں دوسروں کے لیے بھی ہوتی ہے، بلکہ اپنے اِلٰہ کے حوالے سے دوسروں ہی کے لیے ہوتی ہے۔ زندگی دوسروں کے لیے نہ ہو تو انسان صاحبِ دل اور محسن نہیں بن سکتا۔ اہلِ محبت کو صاحبِ دل اور اہلِ احسان کو مُحسن کہتے ہیں۔ احسان کا مطلب ہے دوسروں سے اس طرح حُسنِ سلوک کرنا کہ وہ خوش ہو جائیں۔ چنانچہ محبت پر احسان کا رنگ غالب آجاتا ہے تو اسے رحمت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ وہی انسان دوسروں کے لیے رحمت بن سکتا ہے جو پہلے خود سراپا دردِ محبّت، پیکرِ جُود و کرم اور مُجسمۂ عفو و درگذر بن جائے، اور " دوست " کی راہ میں جد و جہد، محنت و مشقت، صبر و رضا اور ایثار و قربانی اس کی فطرت ثانیہ بن چکی ہو۔ تاریخ شاہد ہے کہ آپؐ ایسے ہی تھے۔ رحمت کا دائرہ جتنا وسیع ہوتا جاتا ہے، انسان اتنا ہی عظیم ہوتا جاتا ہے۔ آپؐ کی سیرت کی سب سے بڑی اور امتیازی خوبی یہ ہے کہ آپؐ کی رحمت کا دائرہ وسیع ہوتے ہوتے کُل عوالم کو محیط ہو گیا اور یہی آپؐ کی زندگی کا مقصودِ حقیقی تھا۔[۴۶] چونکہ آپؐ کی رحمت بیکراں ہے، اس لیے آپؐ کی عظمت کی بھی انتہا نہیں۔ آپؐ چونکہ ہر زمان و مکان کے لیے رحمت ہیں، اس لیے آپؐ ہر دَور کے عظیم ترین انسان ہیں۔ اس سے دو حقائق مستنبط ہوئے : ایک یہ کہ رحمت میں عظمتِ انسانی کا راز مضمر ہے اور یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ دوسرے یہ کہ رحمۃٌ لِلعالمینی آپؐ کا اسوۂ حسنہ ہے اور آپؐ کی سنت حسنہ پر عمل کرنے کا مطلب دوسروں کے لیے رحمت بن جانا ہے۔ اصل یہ ہے کہ دین کی غایت بھی یہی، حاصل علم و نظر بھی یہی، فطرتِ انسانی کی آرزو بھی یہی اور اس کتاب کا مقصودِ حقیقی بھی یہی ہے۔

حواشی و تشریحات

(۱) True - aesthetic method

(۲) Historical method

(۳) Complete historical perspective

(۴) البقرہ ۲ : ۲۸۵

(۵) Historical-true-aesthetic method

(۶) Scientific

(۷) آل عمران ۳ : ۱۹۱۔

(۸) ابلیس کا جمالیاتی فریب : اس سے مراد تلبیسِ ابلیس ہے، اور اس کا منہاج یہ ہے کہ وہ ہر قبیح چیز (مثلاً ظلم و استحصال، جرم و گناہ، بدی و شر وغیرہ) کو خوشنما و نظر افروز بنا کر دکھاتا ہے۔

(۹) Scientific-historical method

(۱۰) Subjective-objective

(۱۱) Organic whole

(۱۲) حُسن المآب یا حُسن مآب : آل عمران ۳ : ۱۴، الرعد ۱۳ : ۲۹ و بمواضع کثیرہ۔

(۱۳) شرّ مآب : صٓ ۳۸ : ۵۵۔

(۱۴) الکتاب : البقرہ ۲ : ۲۔

(۱۵) القرآن = البقرہ ۲ : ۱۸۵ و بمواضع کثیرہ۔

(۱۶) الفرقان = البقرہ ۲ : ۵۳ و بمواضع کثیرہ۔

(۱۷) فلسفۂ عبودیت کے اس پہلو کو قرآنِ مجید نے اپنے الہامی انداز میں اس طرح بیان کیا ہے:

اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُھُمْ بِذِکْرِ اللّٰہِ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ. (الرعد ۱۳ : ۲۸)۔

(۱۸) الانعام ۶ : ۱۶۲ تا ۱۶۵۔

(۱۹) صراطی : الانعام ۶ : ۱۵۳۔

(۲۰) سواءالسبیل : البقرہ ۲ : ۱۰۸ وبمواضع کثیرہ۔

(۲۱) صراطِ مستقیم : الفاتحہ ۱ : ۶ وبمواضع کثیرہ۔

(۲۲) الرّوم ۳۰ : ۳۰

(۲۳) آل عمران ۳ : ۱۹ وبمواضع کثیرہ۔

(۲۴) الحجر ۱۵ : ۹۔

(۲۵) حرکیت : Dynamic ۔ اسے قوتِ محرکہ بھی کہتے ہیں۔

(۲۶) قیاساتِ منطقی Corollaries

(۲۷) Isms

(۲۸) التوبہ ۹ : ۳۳ ، الفتح ۴۸ : ۲۸، الصّف ۶۱ : ۹۔

(۲۹) الحیوان : العنکبوت ۲۹ : ۶۴۔

(۳۰) الاحزاب ۳۳ : ۷۲۔

(۳۱) عملِ جرّاحی Operation

(۳۲) علاج بالجراحت Treatment with operation

(۳۳) ساحر : یونس ۱۰ : ۲۔

(۳۴) مجنون : الحجر ۱۵ : ۶۔

(۳۵) آلِ عمران ۳ : ۱۹۰۔ ۱۹۱۔

(۳۶) الانفال ۸ : ۲۲۔

(۳۷) یونس ۱۰ : ۱۰۔

(۳۸) الفرقان ۲۵ : ۷۳۔

(۳۹) مثلاً منٹگمری واٹ Montogomery Watt نے اپنی کتاب Mohummed: Prophet and Statesman میں یہ بیہودہ اعتراض کیا ہے۔

(۴۰) النّسآء ۴ : ۷۹۔

(۴۱) سبا ۳۴ : ۲۸۔

(۴۲) خاتم النّبیین : الاحزاب ۳۳ : ۴۰۔

(۴۳) بخاری ومسلم در مشکوٰۃ ، باب فضائل سیدالمرسلینؐ، ح ۷۔

(۴۴) الانبیآء ۲۱ : ۱۰۷۔

(۴۵) اس موضوع پر مفصل بحث کے لیے دیکھیے مصنّف کا مقالہ "علامہ اقبال کا فلسفہ دید ونظر" در نذرِ رحمان لاہور ۱۹۶۶ء ، ص ۷۵ تا ۱۰۴۔

(۴۶) الانبیآء ۲۱ : ۱۰۷۔

اِصطلاحات

زوال پذیری کے وقت قوموں کو عموماً لسانیاتی المیّہ سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ لسانیاتی المیّہ یہ ہے کہ کفرانِ نعمت کی وجہ سے جب قوموں کی نفسیاتی حالت بدلتی ہے تو ان کی علمی۔ لسانیاتی دنیا میں بھی چپکے چپکے غیر مرئی انقلاب آجاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عوام بلکہ خواص کے ذہنوں میں بھی عام و اہّم مصطلحات تک کا مفہوم بدل جاتا ہے۔ بعض طبائع کو یہ تبدیلی بظاہر معمولی ہی کیوں نہ معلوم ہوتی ہو، حقیقت میں بڑی اہم اور دُور رس نتائج کی حامل ہوتی ہے۔ تاتاریوں کی یورشوں اور ان کے ہاتھوں سلسلۂ خلافت کے انقطاع کے بعد اُمّتِ مسلمہ پر بھی یہ علمی۔ لسانیاتی المیّہ گزرا، لیکن اسلام کی ایک مابہ الامتیاز خصوصیّت یہ ہے کہ اس کی وحی و تنزیل یعنی قرآن مجید لفظی و معنوی ہر اعتبار سے محفوظ ہے۔ قرآنِ مجید کا ایک علمی۔ لسانیاتی اعجاز یہ ہے کہ اس نے اپنے مفردات یعنی الفاظ و مصطلحات کے معانی و مفاہیم کی خود ہی تشریح و تصریح کر دی ہے اور یہ تشریحات و تصریحات اس کے متن میں موجود و محفوظ ہیں، لہٰذا اس لحاظ سے اُمّتِ مسلمہ ہمیشہ کے لیے گمراہ نہیں ہو سکتی جس طرح کہ دوسری اقوام ایسے المیّے کے بعد گمراہ ہو چکی ہیں، مثلاً یہود و نصاریٰ اور ہنود و مجوس وغیرہ۔ اس سے یہ مستنبط ہوا کہ اسلام کی علمی و لسانیاتی نشاۃِ ثانیہ کا امکان موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا۔ نیز اُمّتِ مسلمہ کبھی ان علمی۔ لسانیاتی مغالطوں میں ہمیشہ کے لیے مبتلا نہیں رہ سکتی جیسی کہ دوسری اقوام مبتلا ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان قوموں کے پاس اپنے علمی۔ لسانیاتی معانی و مفاہیم کا کوئی الہامی یا حقیقی ماٰخذ موجود نہیں۔ اس کے علی الرغم اُمّتِ مُسلمہ کے پاس قرآنِ مجید کی صورت میں الہامی حقیقی ماٰخذ موجود و محفوظ ہے۔

چنانچہ قرآنِ حکیم کی بعض بنیادی اصطلاحات، جو مسلمانوں کے عقایدِ جلیلہ و محرّکہ کی مظہر ہیں اور عام بھی ہیں، لیکن ان کے معانی و مطالب مُستشرقین اور مغربی طرز کے تعلیم یافتہ

لوگوں کے ذہنوں پر بالخصوص واضح نہیں ہیں ، ان کی صراحت کردی جاتی ہے۔ اس سے عام قاری کو بھی اسلام کے عقاید و تعلیمات کو جامع طور سے سمجھنے اور سیرتِ طیبّہ کو اس کے حقیقی تناظر میں دیکھنے میں بڑی مدد ملے گی۔

(۱) **تقویٰ** (مادّہ و ق ی) : اس کے اصل معنی نفس کو ہر اس چیز سے بچانے کے ہیں جس سے گزند پہنچنے کا اندیشہ ہو، لیکن کبھی کبھی لفظ تقویٰ اور خوف ایک دوسرے کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں جس طرح کہ سبب بول کر مسبّب اور مسبّب بول کر سبب مراد لیا جاتا ہے۔ اصطلاحِ شریعت میں نفس کو ہر اس چیز سے بچانے کا نام تقویٰ ہے' جو گناہ کا موجب ہو' اور یہ بات محظوراتِ شرعیّہ (شرعاً ممنوعات اور حرام چیزوں) کے ترک کرنے سے حاصل ہوتی ہے[۱]۔

حضرت عمرؓ نے حضرت ابی بن کعبؓ سے پوچھا تھا کہ تقویٰ کی حقیقت کیا ہے؟ انھوں نے کہا: کیا آپ کبھی ایسے راستے پر نہیں چلے جس میں کانٹے ہوں؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا: ہاں۔ پوچھا: اس حالت میں آپ نے کیا کیا؟ فرمایا: میں نے کوشش کی کہ کانٹوں سے بچ کر نکل جاؤں۔ کہا: یہی تقویٰ ہے[۲]۔ یہ قرآن حکیم کی اہم ترین بنیادی اصطلاحات میں سے ہے۔ اس کے آغاز ہی میں اللہ تعالیٰ نے قرآنی ہدایت کو تقویٰ سے مشروط کیا ہے، یعنی قرآنِ مجید سے ہدایت حاصل کرنے کے لیے متّقی ہونا لازمی ہے[۳]۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ تقویٰ اور ہدایت کیوں لازم و ملزوم ہیں؟ اس کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ ہدایت اسے ملتی ہے جسے اس کی طلب و جستجو ہو۔ علم کی طلب و جستجو ہو تو آدمی طالبِ علم ہوتا ہے اور طالب علم ہی علم حاصل کرتا ہے۔ معلّم ان بچّوں یا بڑوں کو ہی تعلیم و تربیت دے سکتا ہے جن میں تحصیلِ علم کی سچی آرزو و جستجو ہوتی ہے اور یہ سچّی آرزو و جستجو ہی تقویٰ سے عبارت ہے۔ تقویٰ صدق و خلوص پر بھی دلالت کرتا ہے۔ طالبِ علم کا خلوص یہ ہوتا ہے کہ وہ خالی الذّہن ہو کر معلّم کی باتوں کو غور کے کانوں سے سنے اور ایقان و اذعان کے ساتھ انھیں قبول کرے۔ اُستاد جسے غَلَط کہے اسے غَلَط اور جسے درست کہے اُسے درست سمجھے' وہ جو کہے اس پر عمل کرے، جس سے منع کرے' اسے نہ کرے۔ اسی طرح سالک یا راہی کے لیے بھی لازم ہے کہ وہ اپنے ہادی و مُرشد کی ہدایات کو خلوصِ دل کے ساتھ سُنے اور سچّا سمجھے اور ایقان و اذعان

کے ساتھ ان پر عمل کرے۔ اسے قرآن مجید کی اصطلاح میں "ایمان بالغیب" کہتے ہیں[۴]۔

خشیّت یا ڈر بھی تقویٰ کا ایک معنیٰ ہے لیکن جب قرآن مجید یہ کہتا ہے کہ اتقوا اللہ یعنی اللہ سے ڈرو[۵] تو یہ ڈر محبّت کی پیداوار ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر خشیّت الٰہی میں محبتِ الٰہی مضمر ہوتی ہے۔ اس کی وضاحت ایک مثال سے کی جاتی ہے۔ ہمارا روزمرّہ کا مشاہدہ ہے کہ ماں باپ کتنے ہی شفیق کیوں نہ ہوں اور وہ اپنی اولاد سے کتنا ہی پیار و محبّت کیوں نہ کرتے ہوں اور اولاد کو بھی ان سے والہانہ محبّت کیوں نہ ہو' لیکن اولاد کو والدین کا خوف بھی ہوتا ہے جو اسے بُرے کاموں اور بے راہ روی سے محفوظ رکھتا ہے۔ یہ خوف اس بات کا ہوتا ہے کہ بُرے کاموں کی وجہ سے کہیں وہ اپنے والدین کو ناراض کرکے ان کی محبّت سے محروم نہ ہو جائے۔ اس سے ثابت ہوا کہ اولاد کا خوف اس کی والدین سے محبّت کی پیداوار ہوتا ہے۔ تقویٰ کی صورت بھی بعینہٖ یہی ہے۔ چنانچہ وہ انسان کی اپنے الٰہ و ربّ کی شدّتِ محبت پر دلالت کرتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اسلام کے نزدیک انسان کے لیے قرآن مجید سے علم و حکمت اور رشد و ہدایت حاصل کرنے' نیز کامرانیِ حیات کے جادۂ مستقیم پر چلنے اور اپنی منزلِ مقصود' حُسنِ مآب پر پہنچنے کے لیے تقویٰ ایک ناگزیر پیش شرط ہے[۶]۔ اس جگہ لطیف نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ تلاوتِ قرآن مجید' صوم و صلوٰۃ اور حج و زکوٰۃ وغیرہ تمام عبادات کا مقصودِ حقیقی تقویٰ آفرینی ہے اور یہی ان کا خاصّہ بھی ہے۔ علاوہ بریں اللہ تعالیٰ متّقی انسانوں کو ہی دوست رکھتا ہے[۷]۔ تحریکِ اسلام کا مقصد متّقی لوگوں کی جماعت تیار کرنا تھا جو دنیا میں حسین انقلاب لاکر انسانی معاشرے میں طاغوتی و استحصالی (فرعونی ، ہامانی اور قارونی) قوتوں کا استیصال کریں اور بنی نوع انسان کے لیے ایک مثالی معاشرے کی تعمیر کریں۔ اصل یہ ہے کہ تقویٰ اور عقلِ سلیم لازم و ملزوم ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ خرد ہی کو حق و صداقت کی طلب و جستجو ہوتی ہے اور انھیں ہی اللہ تعالیٰ سے محبّت اور اس کے قانونِ مکافاتِ عمل کا خوف ہوتا ہے[۸]۔ لہٰذا وہی کامیاب انسان ہوتے ہیں جنھیں اہلِ جنّت کہا جاتا ہے۔

(۲) **اِسلام** : اس کا مادّہ س ل م بڑے ہی اہم' خیال انگیز اور متنوّع معانی پر دلالت کرتا ہے' جن سے آگاہی اس اصطلاح کو جامع طور سے سمجھنے میں بڑی مدد دے سکتی ہے:

۱ : عیوب و نقائص سے پاک و صاف اور اپنی اصل (حسین) حالت پر ہونا[۹]۔

۲ : روحانی و جسمانی آفات، حوادث اور خطرات سے نجات پانا اور محفوظ ہونا۔ [10]

۳ : خوف و حُزن سے حفظ و امان اور امن و سلامتی۔ [11]

۴ : السّلام : اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنہ میں سے ہے۔ [12]

۵ : قلبِ سلیم سے مراد ایسا قلب ہے جو جرم و گناہ کی آگ سے محفوظ اور اپنی اصل حسین حالت پر صحیح و سالم ہو۔ [13] اسی معنویت کی بنا پر قلبِ سلیم کو نفسِ مُطمئنّہ سے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ [14]

۶ : سلّم الیہ : مطیع و فرماں بردار ہونا۔ سلّم الشیٔ : خالص ہونا۔ سلّم بالامر : راضی ہونا۔ سلّمہٗ الی فلاں : سپرد کر دینا۔ سلّمہٗ من الآفۃ : محفوظ رکھنا۔ سلّمہ الشی فتسلّمہٗ : کسی کو کوئی چیز تفویض کرنا اور اس کا قبول کر لینا۔

۷ : سالمہ : مصالحت کر لینا۔ اسلم : مطیع و فرماں بردار ہونا، دینِ اسلام قبول کر لینا۔ اسلم اُمرہ الی اللہ اس نے اپنے کو مشیّتِ ایزدی کے سپرد کر دیا۔

۸ : تسلّم : مسلمان ہونا۔

۹ : تسالم (القوم) : باہم مصالحت و موافقت کر لینا۔

۱۰ : السّلمہ : سلامتی، فرماں برداری۔

۱۱ : السّلّم : سیڑھی، وسیلہ، رفعت و ترقی کا زینہ۔

۱۲ : دار السّلام : سلامتی کا گھر، جنّت۔ [15]

۱۳ : سلاما : لغو و اثم کی ضد۔ [16]

۱۴ : السِّلم و السَّلَم والسّلام کے معنی صلح کے ہیں : اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : "جو شخص تم کو سلام کرے، اس سے یہ نہ کہو کہ تم مومن نہیں۔" [17] نیز فرمایا : اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ! [18]

۱۵ : الاسلام : اس کے اصل معنی سلم یعنی صلح میں داخل ہو جانے کے ہیں، اور صلح کے معنی ہیں کہ فریقین باہم ایک دوسرے سے تکلیف پہنچنے سے بے خوف ہو جائیں۔ شرعاً اسلام کی دو قسمیں ہیں : اوّلاً، کوئی شخص محض زبان سے اسلام کا اقرار کرے، دل سے معتقد ہو یا نہ ہو، اس سے اس کا مال و دولت، جان اور عزّت محفوظ ہو جاتی ہے۔ اس کا درجہ ایمان سے کم ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : "دیہاتی

کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ کہہ دو! تم ایمان نہیں لائے (بلکہ یوں) کہو کہ ہم اسلام لائے ہیں۔" [19]

ثانیاً، اسلام کا درجہ ایمان سے بھی بڑھ کر ہے، اور وہ یہ ہے کہ زبان سے اعتراف کے ساتھ ساتھ دلی اعتقاد بھی ہو، اور عملاً اس کے تقاضوں کو پورا بھی کرے۔ مزید برآں یہ کہ ہر طرح سے قضا و قدرِ الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے :

جب ان (یعنی حضرت ابراہیمؑ) کے ربّ نے ان سے کہا : اسلام لے آؤ (یعنی مطیع و فرماں بردار ہو جاؤ) تو انھوں نے جواب دیا : میں جہانوں کے ربّ کے سامنے سرِ تسلیم و اطاعت خم کرتا ہوں۔ [20] یہی روشِ انسانی، یہی رویّہ اور یہی دستورِ حیات اللہ تعالیٰ کے نزدیک دینِ اسلام ہے : دین تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسلام ہے۔ [21]

ایمان و اسلام لازم و ملزوم ہیں۔ [22]

الغرض مُسلم وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کو مانتا اور اس کی اطاعت کرتا ہو اور مُشرک نہ ہو۔ [23] مُشرک اور مُسلم ایک دُوسرے کی ضد ہیں۔ انسان کا دین صرف اسلام ہے، لہٰذا دین میں فرقے بنانا مسلمانوں کا شعار نہیں، کیونکہ ایسا کرنا شرک ہے۔ [24] علاوہ بریں مسلمان نہ تو کفرانِ نعمت کرتا ہے [25] نہ کُفر کی باتیں ہی کرتا ہے [26] اور نہ وہ مُجرم ہی ہوتا ہے۔ [27]

اللہ تعالیٰ نے دینِ اسلام کے متعلّق اس اہم حقیقت کی بھی نشاندہی کر دی ہے کہ چونکہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہُ علیہ وسلّم "خاتم النّبیّین [28]" تھے، اور آپؐ کے بعد پھر کسی کو نبی مبعوث نہیں ہونا تھا، لہٰذا آپؐ کے عہدِ بعثت میں دینِ اسلام کی تکمیل کر دی گئی۔ [29]

اسلام دینِ فطرت ہے۔ اس کے دو مفہوم ہیں : ایک یہ کہ یہ فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے معتقدات و تعلیمات اور اوامر و نواہی بعینہٖ وہی ہیں جو انسان فطرۃً چاہتا ہے، دوسرے اس کے احکام و قوانین اللہ تعالیٰ کے ہیں جو فاطرِ ہستی ہے۔ چونکہ نہ تو نوامیسِ فطرت بدلتے ہیں اور نہ فطرتِ انسانی ہی، لہٰذا دینِ اسلام غیر مبدّل و ناقابلِ تغیّر ہے، جس کے لیے قرآنِ مجید "دینِ قیّم" کی تعبیر اختیار کرتا ہے۔ [30] یہ دین ایک ناقابلِ تقسیم "کُل" ہے، اس لیے اسے دینِ توحید بھی کہتے ہیں۔ اس سے اس امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں اسلام میں فرقہ بندی کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ [31] اسلام کا خدا چونکہ رحمان و رحیم [32] اور لطیف و کریم [33] ہے، اس لیے اس نے رحمت کو اپنے اُوپر

واجب قرار دیا ہے[34] اور اس کی آخری زندۂ جاوید کتاب، 'قرآنِ مجید' بھی رحمت ہے[35] نیز اس کا پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم بھی رحمۃ للعالمین[36] ہے، لہٰذا اسلام دینِ رحمت تمام بھی ہے اور تحریکِ رحمۃ للعالمینی بھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام نہ صرف عالمِ انسانی بلکہ جملہ حیوانی و نباتاتی و جماداتی عوالم کے لیے رحمت ہے۔ رحمت کی اصطلاح ہمدردی و غم خواری، ایثار و قربانی، شفقت و محبّت اور عدل و احسان کے عملی اظہار پر دلالت کرتی ہے، جس سے دوسروں کو مادّی یا روحانی یا دونوں طرح کا فائدہ پہنچے۔[37] علاوہ بریں یہ ہمہ گیر و عالمگیر اور ابدی تحریک ہے۔

اِسلام و ایمان :

اسلام اور ایمان حکماً جُدا جُدا نہیں ہیں تصدیق میں دونوں متّحد ہیں، البتّہ مفہوم میں مختلف ہیں۔ ایمان کا مفہوم تصدیقِ قلب ہے اور اسلام کا مفہوم اعمالِ جوارح۔ شرع میں یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی کو مومن کہیں اور مسلم نہ کہیں یا مسلم کہیں اور مومن نہ کہیں، اور وحدت سے ہماری یہی مراد ہے۔[38]

اصل یہ ہے کہ اسلام عقیدہ و اقرار بھی ہے، عمل بھی اور مکمّل ضابطۂ حیات و دستورالعمل بھی اور اس کا مجموعی نام دین ہے جس میں (۱) عقاید (۲) عبادات اور (۳) معاملات (انفرادی، منزلی، اجتماعی، سیاسی، اقتصادی، عسکری، عدالتی اور بین الاقوامی) سب شامل ہیں۔ ویسے تو دینِ اسلام سب پیغمبروں نے پیش کیا جس میں اتحاد باعتبار اصولِ دین ہے اور اختلاف باعتبار فروع کے، لیکن یہاں اسلام سے مراد وہ شریعت اور دین ہے جو حضرت محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے بنی نوعِ انسان کے لیے بھیجا۔[39]

قرونِ اُولیٰ میں اسلام کے برق رفتار نشو و ارتقاء کا ایک بنیادی سبب اس کے عقایدِ جلیلہ و محرکہ تھے نیز غیر مسلموں کے ساتھ اس کی رواداری، حُسنِ سلوک اور عدل و انصاف نے اس کی حیرت انگیز اشاعت و مقبولیت میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ علاوہ ازیں مواخات و حرّیت اور مساوات کی وہ جو دعوت دیتا ہے، اس کی مثال کسی اور دین میں نہیں ملتی تھی، اس لیے جس معاشرے سے اس کا رابطہ قائم ہوتا تھا، اس کے لوگ اسلام میں بے پناہ کشش و جاذبیّت محسوس کرتے تھے۔

اسلام کی ابدیت اور اس کی آیندہ عالمگیر سیادت و قیادت کی ضامن اس کی متعدد صفات ہیں، جن میں ایک بنیادی صفت اس کی وحدت و کُلیت ہے۔ 'وحدت' سے مراد یہ ہے کہ اسلام تمام ادیانِ عالم کو اصلاً ایک سمجھتا ہے، صرف شرع و منہاج کے اختلاف کو تسلیم کرتا ہے۔ کُلیت کا مطلب یہ ہے کہ اسلام حقیقت، زندگی اور دین سب کو ایک ناقابلِ تقسیم کُل تسلیم کرتا ہے، لہٰذا وہ زندگی یا دین کی روحانی و مادّی یا دُنیوی و اُخروی تقسیم کو ناجائز، غیر فطری، باطل اور شرک قرار دیتا ہے۔

(۳) **ایمان** (مادہ أ م ن) : امام راغب اصفہانی رح لکھتے ہیں : اصل میں اس کے معنی نفس کے مطمئن ہونے اور خوف کے زائل ہونے کے ہیں ——— اور کبھی ایمان کا لفظ بطور مدح استعمال ہوتا ہے، اور اس سے مراد نفس کی تصدیق کے طور سے حق کی تسلیم و اطاعت ہے، اور یہ بات ان تین چیزوں کے یکجا ہونے سے حاصل ہوتی ہے : (۱) تصدیق بالقلب (۲) اقرار باللسان اور (۳) ان کے مطابق عمل بالجوارح۔[40] اسلام کے نزدیک ایمان کے ارکانِ خمسہ یہ ہیں : (۱) اللہ تعالیٰ (۲) انبیاء و رُسل (۳) کُتب سماوی (۴) ملائکہ اور (۵) آخرت۔[41]

ایمان سے متعلّق ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس کا تعلّق انسان کی قلبی (جذباتی و فکری) اور عملی زندگی سے ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو عقیدہ انسان کی کُل زندگی (جذباتی، فکری اور عملی زندگی) میں اس طرح رچ بس جائے جس طرح جسم میں خون رچ بس جاتا ہے، وہ صحیح معنوں میں "ایمان" ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے جو کام خون جسم کے لیے کرتا ہے، وہی کام ایمان حیاتِ انسانی کے لیے کرتا ہے۔ ایمان ہی شخصیت کو فردی ہو یا قوم کی زندگی و توانائی بخشتا اور اس کے نشو و ارتقاء میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ لیکن ایمان کی اپنی زندگی و توانائی اور نشو و ارتقا کا انحصار انسان کے فکر و عمل پر ہوتا ہے۔ چنانچہ ایمان کا رشتہ فکر و عمل سے منقطع ہو جائے تو وہ محض بے جان نظریہ بن کر رہ جاتا ہے۔ ایسے ایمان کو ضعیف یا مردہ کہتے ہیں جو انسان کے لیے بے کار ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ایمان و عمل لازم و ملزوم ہیں، لہٰذا ایمان کے بغیر عمل اور عمل کے بغیر ایمان غیر معتبر ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید ایمان اور اعمالِ صالحہ کا ذکر ایک ساتھ اور لازم و ملزوم کی طرح کرتا ہے[42] اور ان دونوں کو اسلامی

زندگی کی بنیاد ہی قرار دیتا ہے۔ اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کی غایت بھی بنی نوعِ انسان کو مومن و صالح بنانا ہے اور ایسے لوگوں ہی کو خوف و حُزن اور زیان و خسران سے محفوظ اور کامیاب انسان قرار دیتا ہے[۴۳]۔

(۴) **اِنسان** (مادہ ان س) : انسان چونکہ فطرتاً ہی کچھ اس قسم کا واقع ہوا ہے کہ اس کی زندگی کا مزاج باہم انس اور میل جول کے بغیر نہیں بن سکتا، اس لیے اسے انسان کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ انسان طبعاً متمدن واقع ہوا ہے (مغربی فلسفے میں کہتے ہیں کہ انسان معاشرتی حیوان ہے)[۴۴]، کیونکہ وہ آپس میں میل جول کے بغیر نہیں رہ سکتا، اور نہ اکیلا ضروریاتِ زندگی کا انتظام ہی کر سکتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کی اصل انسیان (بروزن افعلان) ہے، اور چونکہ وہ اپنے عہد کو بھول گیا تھا (طٰہٰ ۲۰ : ۱۱۵) اس لیے یہ نسیان سے مشتق ہے[۴۵]۔

قرآن مجید میں بنی نوعِ انسان سے متعلق جو قصہ بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عالمِ بالا میں ان کی ارواح کو اپنی ذاتِ حسن و رحمت کا شاہد بنا کر پوچھا تھا : اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ؟ (کیا میں تمھارا ربّ نہیں ہوں؟) اور انھوں نے جواب دیا تھا : بَلٰی[۴۶]، یعنی ہاں، تو اس حقیقت سے یہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ بنی نوع انسان طبعاً اللہ تعالیٰ سے، نیز ایک دوسرے سے مانوس ہیں۔ بہر حال ان تصریحات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسانیت کا خاصّہ اور اقتضا محبت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان طبعاً محبت کرنا بھی چاہتا ہے اور یہ بھی چاہتا ہے کہ دوسرے اس سے محبت کریں۔ چنانچہ اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی محبتِ انسانی کی علمبردار ہے۔

قرآنِ حکیم نے انسان کے متعلق جو حقائق منکشف کیے، ان کا ملخّص پیش کیا جاتا ہے:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو صوری و معنوی طور سے حسین بنایا[۴۷] اور اسے حسّی اور قلبی قوتیں عطا کی ہیں[۴۸]، جن کی بدولت وہ حُسن و قبح، خیر و شر، حسنہ و سیئہ اور گناہ و ثواب میں امتیاز کرنے کے قابل[۴۹] اور اپنے اعمال کا جواب دہ ہوا ہے[۵۰]۔ انسان کو مکرّم و محترم بنایا گیا ہے[۵۱] اور وہ مسجودِ ملائکہ[۵۲] ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم، بیان اور قلم سے لکھنا سکھایا ہے[۵۳]۔ انسان کی جان اللہ تعالیٰ کو اتنی عزیز ہے کہ ایک فرد کا قتل کُل نوعِ انسانی کے قتل کے برابر[۵۴]

ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی انسان پر اس کی قوت و ہمّت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا[۵۵]، اور نہ کسی کے جُرم و گناہ کا بوجھ دوسرے پر ڈالتا ہے، کیونکہ ہر شخص اپنے اعمال کا ذمّے دار ہے[۵۶]۔ یہ کائنات انسان کے لیے بنائی گئی ہے تاکہ اس کا امتحان لیا جائے[۵۷]۔ انسان کو یہ بات محال نظر آتی ہے کہ مرنے کے بعد اس کی ہڈیاں تک گل سڑ جائیں گی تو اسے دوبارہ زندہ کیا جائے گا، حالانکہ ایسا ہوگا اور اللہ تعالیٰ ایسا کرنے پر قادر ہے[۵۸]۔ انسان قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل کا مستوجب ہے، لہٰذا جیسا کرے گا ویسا بھرے گا[۵۹]۔ اگر وہ دنیا میں عقل و فکر سے کام نہیں لیتا اور اندھوں کی طرح زندگی گزارتا ہے تو آخرت میں بھی وہ اندھا اُٹھے گا[۶۰]۔ اسی طرح اگر وہ مومن و صالح ہوگا تو اسے جنت کی ابدی زندگی میسر آئے گی[۶۱]، ورنہ بصورتِ دیگر اسے دوزخ میں رہنا ہوگا[۶۲]۔

انسان سے متعلق اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ تمام افرادِ نسلِ انسانی نفسِ واحدہ کی طرح ہیں[۶۳]، وہ اس زمین میں پیدا ہوئے اور یہیں دفن ہوں گے۔ تخلیق و تکوین اور موت و حیات کے لحاظ سے وہ سب برابر ہیں اور ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ شُعُوب و قبائل کا فرق نسل و خلقت کا نہیں، محض تعارفی فرق ہے[۶۴]۔ اس سے یہ استنتاج کر سکتے ہیں کہ قبیلے، قوم، برادری، خانوادے یا ذات پات وغیرہ کے تمام امتیازات فروعی ہیں، اور ان کی وجہ سے کسی کو بھی دوسرے پر برتری، فوقیت، فضیلت یا عزت حاصل نہیں۔ عزّت و تکریم کا معیار صرف تقویٰ ہے۔

انسان اپنی فطرت میں عبد ہے اور عبدیت اپنے محبوب کو چاہتی ہے جو صرف اللہ تعالیٰ ہے[۶۵]۔ اس سے یہ مستنبط ہوا کہ انسان کو بحیثیت عبد کے اپنے معبود یعنی اللہ تعالیٰ کی آرزو ودیعت کی گئی ہے۔ یہ آرزو ہی اس کی زندگی میں سوزِ محبت پیدا کرتی ہے اور چونکہ وہ فطری ہے، اس لیے لافانی بھی ہے۔ انسان اسے نفسانی خواہش کے نیچے دبا تو دیتا ہے لیکن اسے فنا نہیں کر سکتا۔ یہ آرزو زمین کی طرح مردہ تو ہو جاتی ہے مگر اسی طرح زندہ بھی ہو جاتی ہے۔ چونکہ اس آرزو کے احیا کا ہمیشہ امکان رہتا ہے، اس لیے انسان کے تائب ہونے کا بھی ہمیشہ امکان رہتا ہے، اس لیے اس پر عمر بھر درِ توبہ کھلا رہتا اور اجابت دُعا و توبہ کی منتظر رہتی ہے۔ اس بنا پر پند و نصیحت اور موعظت و تبلیغ میں استقلال و استمرار اور ثبات و دوام کی ضرورت و اہمیت کے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں[۶۶]۔

اسلام کا ایک موقف یہ بھی ہے کہ انسان طبعاً و خلقاً حسین مخلوق ہے۔ وہ جس طرح

راست قامت اور خوب صورت ہے، اسی طرح اس کی فطرت حسین ہے، یعنی اس کے نظامِ باطنی میں توازن و اعتدال ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس میں جمالیاتی حس پائی جاتی ہے لہٰذا وہ طبعاً حُسن و حسنہ سے محبت کرتا اور قبیح و سیّئہ سے نفرت کرتا ہے، نیز حسن و حسنہ سے اسے طمانیت و مسرّت ملتی ہے اور قبیح و سیّئہ سے اسے خوف و حُزن لاحق ہوتا ہے۔ طمانیت و مسرّت سے دل کو ٹھنڈک پہنچتی اور خوف و حُزن سے آگ لگتی ہے[67]۔ یہ کائنات انسان کے لیے پیدا اور مسخّر کی گئی ہے تاکہ انسان اس سے متمتع و مستفید ہو[68]۔ انسان عالمِ زمان و مکان کو علم کی قوّت سے مسخّر کر سکتا ہے اور اس کی استعداد اسے ودیعت کر دی گئی ہے۔ علم کی استعداد کو قوت سے فعل میں لانے اور اس کے نشو و ارتقا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسے حسّی و قلبی قوتیں ودیعت کی ہیں۔ حواسِ خمسہ میں سے سامعہ و باصرہ اس ضمن میں اہم ترین کردار ادا کرتی ہیں[69]۔ علم معرفتِ الٰہی کا بھی ایک ذریعہ ہے، جس کا حقیقی سرچشمہ کلامِ الٰہی ہے۔

(۵) **اللہ** : اس ذات کا اسمِ علم ہے جو واجب الوجود ہے اور جس میں تمام صفاتِ کمال جمع ہیں اور یہ غیر مشتق ہے[70]۔ اسلام سے پہلے بھی عربی میں اللہ کا لفظ خدا کے لیے بطور اسمِ ذات کے مستعمل تھا، یعنی خدا کی تمام صفات اُس کی طرف منسوب کی جاتی تھیں۔ یہ کسی خاص صفت کے لیے نہیں بولا جاتا تھا، جیسا کہ شعرائے جاہلیت کے کلام سے ظاہر ہے[71]۔ قرآنِ حکیم نے بھی خدا کے لیے اللہ کا لفظ بطور اسمِ ذات کے اختیار کیا اور تمام صفاتِ حسنہ کو اس سے منسوب کیا:

اور اللہ کے لیے حسین نام (اسمآءُ الحسنیٰ یا حسین صفات) ہیں۔ لہٰذا اُن صفاتِ حسنہ سے اسے پکارو[72]۔

دوسری جگہ فرمایا:

اللہ ہی (اللہ) ہے، کوئی اِلٰہ (معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود) نہیں ہے اس کے سوا۔ اسی کے لیے حسین نام ہیں[73]۔

قرآنِ مجید کی یہ خصوصیت ہے کہ اس نے محوّلہ بالا آیات کے ذریعے اللہ کے نام کو ایسا جامع و مانع بنا دیا ہے کہ اسے سُنتے یا دیکھتے ہی ایک ایسی بزرگ و برتر ہستی کا تصوّر ذہن میں اُبھرتا ہے جو جمیع صفاتِ حسنہ سے متّصف ہو۔ علاوہ ازیں اِلٰہ کا لفظ نزولِ قرآن سے پہلے عربی

میں مطلقاً معبود کے لیے مستعمل تھا، خواہ یہ معبود باطل ہو یا حق، لیکن قرآنِ مجید نے اِلٰہ کے لفظ کو مختلف مقامات پر اس طرح استعمال کیا ہے کہ اس سے اس کے معنی و مفہوم میں جامعیت پیدا ہو گئی ہے اور اس کے یہ معنی ہو گئے ہیں: معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود[74]۔ اسلام نے ساری دنیا پر یہ حقیقت منکشف کر دی کہ انسان کا اِلٰہ صرف ایک ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ہے[75]۔ وہ کل بنی نوعِ انسان کا اِلٰہ ہے[76]، لہٰذا صرف اللہ تعالیٰ ہی کو پکارنا چاہیے۔ اس کے ساتھ کسی اور کو اللہ سمجھ کر ہرگز پکارنا نہیں چاہیے، کیونکہ یہ شرک ہے۔ نیز اس کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں ہے۔ اللہ ہی زندۂ جاوید ہے، باقی ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے۔ علاوہ ازیں وہی ایک انسان کو آئین و قوانین یا احکام دینے والا ہے اور انسان کو جواب دہی کے لیے آخر کار اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے[77]۔ قرآنِ حکیم جملہ نوعِ انسانی پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہے کہ دُعا اور عبادت کے لائق اور نفع و ضرر کی مالک صرف ایک ہی ہستی ہے اور وہ اللہ ہے۔

دنیا کی کسی زبان میں ایسا کوئی لفظ نہیں ملے گا جو معنیٔ اللہ کا مترادف ہو۔ قرآن مجید ہی کی بدولت اس کا سلبی و ایجابی مفہوم متعیّن ہوا۔ سلبی اعتبار سے یوں کہ قرآن مجید نے عرب اور بیرونِ عرب یعنی وثنی الخیال دُنیا کے ان سب عقاید کی نفی کی جو کفّار و مشرکین نے وضع کر رکھے تھے۔ مثلاً عربِ جاہلیّت کا یہ عقیدہ کہ اللہ کے سوا اور بھی معبود (اِلٰہ) ہیں[78] یا یہ کہ اس میں کچھ شریک ہیں[79]، اس میں اور جنّوں میں باہم کوئی رشتہ قائم ہے[80]، اس کے بیٹے بیٹیاں ہیں[81]، اسے قربانیوں کی ضرورت ہے اور وہ گوشت اور خون کا محتاج ہے[82]۔ قرآن مجید نے کفر و شرک کی دنیا سے نہایت واضح الفاظ میں خطاب کیا اور کہا: تم جن کو اپنا اِلٰہ ٹھہراتے ہو، ان کا کہیں وجود نہیں[83]۔ وجود ہے تو صرف اللہ کا۔ اللہ ہی تمھارا اِلٰہ (معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود) ہے[84]۔ لہٰذا اس کے سوا کوئی معبود نہیں، نہ آسمانوں میں نہ زمین میں۔ آسمانوں میں بھی وہی اِلٰہ ہے اور زمین میں بھی وہی اِلٰہ ہے[85]۔ اس کے سوا کسی کو معبود نہ ٹھہراؤ[86]۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معبود قرار دینا ایسی بات ہے جس کی کوئی دلیل ہے نہ بُرہان[87]، لیکن انسان کی نظر تو محسوس کی خوگر ہے۔ اس کی جہالت اور توہّم پرستی نے بہ شکلِ اصنام کئی ایک معبود پیدا کر رکھے تھے۔ وہ اینٹ اور پتھر یا ایسی ہی دوسری مادّی اشیا کو خداؤں کی شکل دیتا اور خداؤں ہی کی طرح ان کی پرستش کرتا اور نہیں سوچتا تھا کہ ان میں اتنی بھی طاقت نہیں کہ مکھی ایسی حقیر چیز پیدا کر سکیں، یا مکھی ان سے کچھ چھین لے تو اس سے واپس لے لیں[88]۔ وہ ان کے کسی کام نہیں آئیں گے[89]۔ نہ

کسی سے عذاب کو دُور رکھ سکیں گے۔[۹۰] وہ نہیں سمجھتے کہ اگر اللہ کے سوا کچھ اور بھی معبُود ہوتے تو دنیا جہان میں فساد پھیل جاتا۔[۹۱] ہر ایک اپنی اپنی مخلوق کو اُڑا لے جاتا اور دوسرے پر برتری حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔[۹۲] یہ انھیں کیوں مانتے ہیں؟ وہ ماننے کی چیز نہیں ہیں۔ ان کا کوئی وجود ہے نہ حقیقت۔

ذاتِ باری کا غلط تصوّر صرف غیر مہذّب اقوام تک محدود نہ تھا بلکہ متمدّن دُنیا بھی اس سے محفوظ نہ تھی۔ یونان میں بھی متعدد دیوی دیوتاؤں کا تصوّر موجود تھا۔ زرتشتیت[۹۳] ثنویت کا شکار تھی۔ بُدھ مت میں تو ذاتِ باری کا کوئی مثبت تصوّر ہی نہ تھا (لیکن پھر بھی اس کے پیرو بُدھ کے مجسّمے بناتے اور اسے پُوجتے تھے)۔ اسی طرح یہود و نصاریٰ کے ہاں بھی عقیدۂ الوہیّت مسخ ہو چکا تھا۔ یہود اور بالخصوص نصاریٰ نے کچھ ایسے عقاید اختیار کر لیے جن کی رُوح بڑی حد تک وثنی، یعنی شرک اور کفر کی دنیا سے مأخوذ تھی۔ یہود کہتے ہیں کہ عُزیرؑ اللہ کا بیٹا ہے۔ عیسائی کہتے ہیں کہ مسیحؑ اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ محض ان کے کہنے کی بات ہے۔[۹۴] وہ لوگ کفر کے مرتکب ہوئے جنھوں نے کہا مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔[۹۵] اور وہ بھی جو کہتے ہیں اللہ تینوں میں سے تیسرا ہے۔[۹۶] اسے تین مت کہو، باز آجاؤ۔[۹۷] مسیح (علیہ السلام) کہتا تو یہ تھا کہ میں نے تو یہ نہیں کہا تھا، مجھے اور میری ماں کو معبُود مانو۔[۹۸] عیسائیوں نے یہ دو معبود کیوں اختیار کر رکھے ہیں؟[۹۹] اس کا کوئی بیٹا ہے نہ بیوی۔[۱۰۰] یہ بہت بری بات ہے جس میں وہ اُلجھ گئے ہیں۔ قریب ہے آسمان پھٹ پڑیں، زمین ٹکڑے ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر جائیں کہ ان کا قول ہے کہ اللہ کا کوئی بیٹا ہے۔ اللہ کی ہرگز یہ شان نہیں کہ کوئی اس کا بیٹا ہو۔[۱۰۱] یہود اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور دوست ہیں۔[۱۰۲] وہ کہتے ہیں کہ کوئی جنّت میں نہیں جائے گا، مگر ہم۔[۱۰۳] یہود کا دعویٰ ہے کہ ہم اللہ کی چہیتی قوم ہیں اور دارِ آخرت صرف ہمارے لیے ہے۔[۱۰۴] ہمیں آگ نہیں چھوئے گی مگر چند دن۔[۱۰۵] وہ ایسی بے بنیاد باتیں کیوں کہتے ہیں؟ یہود و نصاریٰ نے اللہ کو چھوڑ کر احبار و رہبان کو اپنا ربّ بنا رکھا ہے اور عیسٰی بن مریمؑ کو بھی۔[۱۰۶] انھوں نے اللہ کی شانِ اُلوہیت کا اندازہ نہیں کیا۔ اس کی قدر نہیں پہچانی جیسا کہ اس کا حق ہے۔[۱۰۷، ۱۰۸]

"الستُ؟ بلٰی"[۱۰۹] کی قرآنی حقیقت سے ثابت ہے کہ انسان کی فطرت میں اللہ یعنی اپنے اِلٰہ و ربّ کا علم و شعُور مضمر ہے۔ اللہ تعالیٰ حسین و اِلٰہ ہے اور انسان عبد و حسن پسند (اپنی جمالیاتی حِسّ کی بدولت)، لہٰذا وہ فطرۃً اللہ تعالیٰ کی آرزو و جستجو رکھتا ہے۔ یہ آرزو و جستجو ایک تو انسان کو

اس کے مقامِ عبدیّت پر متمکّن رکھنے اور دُوسرے اسے زندگی کی راہِ مستقیم پر گامزن رکھنے میں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے۔

انسان کی آرزوئے اِلٰہ جب اس کی نفسیاتی خواہشات کے بوجھ تلے دب جاتی ہے تو وہ ابلیس کے جمالیاتی فریب میں آکر اللہ تعالیٰ کے سوا بھی دوسری چیزوں کو اپنا اِلٰہ بنا لیتا ہے۔[۱۱۰] اللہ تعالیٰ کے سوا چونکہ ہر چیز مخلوق ہے، اس لیے کسی مخلوق کو اپنا اِلٰہ بنانا، انسان کے ظلم و جہل پر دلالت کرتا ہے، اور یہ شرک ہے، جو ناقابلِ عفو گناہ ہے۔ ابلیس کے فریب خوردہ انسان کی اس سلسلے میں سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنی نفسانی خواہشات کو اپنا اِلٰہ بنا لیتا ہے۔[۱۱۱] ابلیس کے جمالیاتی فریب کی وجہ سے اسے اپنی قبیح خواہشات حسین و دلفریب نظر آنے لگتی ہیں اور وہ ان کی محبت میں اندھا اور بہرا ہو جاتا ہے اور ان کو پورا کرنے کی کوشش میں اس طرح لگ جاتا ہے کہ اسے حرام و حلال، گناہ و ثواب اور جائز و ناجائز کا پاس و لحاظ نہیں رہتا اور قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل سے نڈر ہو جاتا ہے، جس سے کسی انسان کو مفر نہیں۔

آرزوئے اِلٰہ جب خواہشات کے بوجھ تلے دب کر رہ جاتی ہے[۱۱۲] تو اس کے نتائج انسان کے حق میں بڑے بھیانک ہوتے ہیں، مثلاً انسان کی حِسّی و قلبی قوتیں مفلوج ہو جاتی ہیں، حقیقی کامیابی کی راہ و منزل اس کی نظر سے اوجھل ہو جاتی ہیں، اس کے دل کو خوف و حُزن کی آگ لگ جاتی ہے۔ اس کی زندگی پر دباؤ اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ وہ اجیرن ہو جاتی ہے۔ انسان بھری دنیا میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے اور یہ احساسِ تنہائی اس کے لیے مستقل عذاب بن جاتا ہے۔ انجام کار کائنات و حیات کو وہ بے معنی و قبیح اور زنداں محسُوس کرنے اور اس سے چھٹکارا پانے میں اپنی نجات خیال کرنے لگتا ہے۔ اسی کے عقیدۂ ربوبیّت کی رُو سے اللہ تعالیٰ تمام جہانوں اور قوموں اور انسانوں کا ربّ ہے اور تمام بنی نوعِ انسان اس کے عیال ہیں۔[۱۱۳] اس اعتبار سے وہ سب ایک ہی برادری کے افراد ہیں، جن کے لیے کائنات نعمتوں کا دسترخوان ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے استفادہ اور تمتّع کے لیے بچھایا ہے۔ لہٰذا کسی فرد، جماعت، طبقے، گروہ یا قوم کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس دسترخوان کے کسی حصّے پر قبضہ جما کر اللہ تعالیٰ کے دوسرے بندوں کو ان کے حصّے سے جزوی یا کلّی طور سے محروم کر دے۔ جو قوم، جماعت یا فرد ایسا کرتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر ناجائز تصرّف کر کے اس کے بندوں کی حق تلفی کرتا ہے اور اس طرح گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ علاوہ بریں جو شخص وسائلِ رزق پر قبضہ کر کے دُوسروں

کو اس سے جزوی یا کلّی طور پر محروم کرتا یا کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ در اصل اللہ تعالیٰ کی صفت و نظامِ ربوبیّت میں اپنی شرکت کا مظاہرہ کرنا چاہتا ہے اور یہ اسلام کی نظر میں دعوائے خدائی ہے[۱۱۴]۔

عہدِ رسالت مآبؐ میں مشرکوں کا اپنے اصنام کے متعلق یہ عقیدہ تھا کہ ان کی پرستش اور وسیلے سے انھیں تقرّبِ الٰہی حاصل ہوتا ہے[۱۱۵]۔ اسلام اسے شرک قرار دیتا ہے۔ قرآنِ مجید نے اس جھوٹے اور مشرکانہ عقیدے کے بُطلان کے لیے گوناگوں اسالیبِ استدلال اختیار کیے ہیں۔ اس کا موقف ہے کہ تماثیل و اصنام ہوں یا استھان اور مقبرے، مظاہرِ فطرت ہوں یا مرحوم اولیاء اللہ، اوّل تو وہ پجاریوں وغیرہ کی کسی دعا و آواز کو سُن ہی نہیں سکتے، دوسرے کوئی زندہ و مُردہ انسان، خواہ کتنا بزرگ اور خدا رسیدہ کیوں نہ ہو، اس بات کا مجاز نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر اس سے کسی کی سفارش کرے، نیز اب کون ہے جو یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئی ہے اور وحی کے ذریعے اسے سفارش کرنے کا پروانہ ملا ہے؟ آج کی طرح اس دَور میں بھی یہ عقیدہ پایا جاتا تھا کہ اولیاء اللہ کو قدرت کے نظامِ ربوبیّت میں دخل دینے کی قوّت حاصل ہے اور وہ لوگوں کی احتیاجات پورا کرنے کا بالواسطہ یا بلاواسطہ اختیار رکھتے ہیں۔ اسلام کے نزدیک یہ اور اس سے ملتے جلتے تمام عقاید مشرکانہ ہیں، اور ان کی بیخ کنی کرنا اس کا اوّلین مقصد ہے۔

اسلام کی رُو سے اللہ تعالیٰ کائنات اور اس کی نعمتوں کا مالک ہے، اس نے آسمانوں اور زمین کے اندر، باہر اور درمیان میں جو کچھ پیدا کیا ہے، وہ کُل افرادِ نسلِ انسانی کے تمتّع کے لیے ہے[۱۱۶]۔ لفظ تمتّع اس لحاظ سے ازبس اہمیّت رکھتا ہے کہ اس سے مروّجہ تصوّرِ ملکیّت کی نفی ہوتی ہے۔ اسلام کا اس بارے میں یہ موقف ہے کہ اس دُنیا میں ہر چیز اللہ تعالیٰ کی ملکیّت ہے، نیز بنی نوعِ انسان چونکہ اس کے بندے ہیں، اس لیے ان پر حکومت کرنے کا حق بھی صرف اسی کو حاصل ہے، البتّہ حکومت کا کاروبار چلانے کے لیے لوگ جس شخص کو اس کا سربراہ منتخب کریں، وہ صرف اللہ کی طرف سے اس کے احکام کے ساتھ کاروبارِ حکومت چلانے کا مجاز ہے۔ اس ضمن میں پیغمبرِ اسلام صلّی اللہ علیہ وسلّم کا اُسوۂ حسنہ یہ ہے کہ آپؐ نے اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق آئینِ قرآنی کو نافذ کیا اور نظامِ ربوبیّت قائم کیا۔

اب اس ازبس اہم نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ شریعت نے نجی ملکیّت کو قانونی مقتضیات کے پیشِ نظر بلاشبہ جائز قرار دیا ہے، مگر یہ ملکیّت حقیقی نہیں، قانونی ہے، نیز اللہ تعالیٰ

کے حکمِ انفاق سے مشروط بھی ہے۔ یہ تو ظاہر بات ہے کہ مہذّب دنیا کا قانون کسی شخص یا جماعت کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی شخص یا گروہ کسی فرد کے مال و دولت کو ناجائز طور سے اس سے چھین لے۔ لیکن ساتھ ہی قانون کسی شخص کو اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے اہل و عیال کو ہلاک یا محبُوس کر دے یا ان کو ذہنی و جسمانی اذیّت پہنچائے یا انھیں ان کے حقوق سے محروم کر دے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اسے اپنی جان تک کو ہلاک کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ کیوں؟ اس لیے کہ کوئی قانون کسی شخص کو اس کے اہل و عیال، حتّیٰ کہ جسم و جان کا بھی مالک نہیں امین سمجھتا ہے۔ بعینہٖ اسلام انسان کو اس کے مال و دولت کا امین سمجھتا ہے، مالک نہیں۔ لہٰذا اسے اپنے مال و دولت کو ہلاک و محبوس کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ مال و دولت کو ہلاک کرنے کا مطلب اسراف و تبذیر ہے[۱۱۷] اور محبوس کرنے کا مطلب اکتناز و احتکار وغیرہ[۱۱۸] سے اسے محجوب[۱۱۹] و ناکارہ[۱۲۰] بنانا ہے۔ اکتناز سے قومی دولت کی گردش میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے، جو وجودِ معاشرہ کے لیے اسی طرح خطرناک ہوتی ہے جس طرح گردشِ خون کی رکاوٹ نامیاتی وجود کے لیے خطرناک ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں اکتناز و احتکار اور بُخل ممنوع ہیں[۱۲۱]، اس کے برعکس وہ زکوٰۃ، صدقات و خیرات اور انفاق العفو کا حکم دیتا ہے[۱۲۲]۔

مختصر یہ کہ اسلام معاشرۂ انسانی میں نظامِ ربوبیّت قائم کرنے کا حکم دیتا ہے، جس میں ہر شخص کو جائز طریقے اور محنت سے مال و دولت کمانے کی آزادی ہوتی ہے، لیکن اپنی کمائی میں اسراف و تبذیر نیز اکتناز و احتکار اور بُخل کی اجازت نہیں ہوتی۔ علاوہ بریں اس میں لوگوں کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنا حکومت کی ذمے داری ہوتی ہے۔ انسان کی بنیادی ضروریات میں روٹی، کپڑا، مکان کے علاوہ تعلیم و تربیت اور صحت و تفریح بھی شامل ہیں۔

(۶) کائنات : دنیا میں کائنات سے متعلق جو نظریے پائے جاتے ہیں، ان میں سے اہم ترین یہ ہیں : اوّلاً، کائنات قدیم ہے، یعنی وہ مخلوق و حادث نہیں ازلی و ابدی ہے۔ یہ نظریہ قدیم و جدید دہریوں کا بھی ہے اور ہندو مت، جین مت اور بُدھ مت کا بھی۔ اس سے ملتا جلتا ایک نظریہ یہ ہے کہ یہ کائنات بے مقصد و لایعنی ہے۔ یہ نظریہ بھی قدیم ہے، لیکن عصرِ حاضر میں وجودی[۱۲۳] اور رسلی[۱۲۴] مکاتبِ فکر اس کے علمبردار ہیں۔ زرتشتیت کا نظریہ یہ ہے کہ کائنات کی تخلیق میں دو ازلی و ابدی قوّتوں نے حصّہ لیا ہے جنھیں وہ یزدان و اہرمن کے الفاظ سے تعبیر

کرتے ہیں۔ اس میں حُسن و نور اور خیر و حسنہ تو یزداں کی تخلیق ہیں جب کہ اہرمن نے قُبح، ظُلمت، شر اور سیّئہ پیدا کیے ہیں۔ قرآنِ حکیم جس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ حق و باطل میں امتیاز کرنے والا[125]، جھوٹے اور سچّے اقوال و نظریات میں حق کے ساتھ فیصلہ کرنے والا[126] اور ہر معاملے میں سند ہے کائنات کے متعلق فرماتا ہے کہ وہ تخلیق بالحق ہے[127]۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات قدیم نہیں، مخلوق و حادث ہے اور اس کی خلقت میں حق کے باعث حیات و قیومیت، حُسن و صداقت افادیت و مقصدیت اور معنویت و غایت پائی جاتی ہے۔ اس سے محوّلہ بالا تمام نظریات کا بطلان و ردّ ہو جاتا ہے۔

اس کائنات میں یہ جو جمال و جلال اور بوقلموں و بے شمار نعمتوں کے لامتناہی خزینے پائے جاتے ہیں، انھیں اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوعِ انسان کے لیے پیدا کیا ہے۔ ہر انسان کو اس کی سعی و محنت کے مطابق اس میں حصّہ ملنا چاہیے، لیکن عدل و احسان ہر حال میں ملحوظ رہنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے ایک طرف کائنات میں مسخّر ہونے کی اور دوسری جانب انسان میں اسے مسخّر کرنے کی قابلیت پیدا کر دی ہے تاکہ وہ اس کی نعمتوں سے متمتّع ہو سکے۔ اسلام انسان کو ان نعمتوں سے اپنی محنت و سعی کے مطابق تمتّع یا استفادہ کرنے کی اجازت تو دیتا ہے، مگر کوئی فرد یا گروہ وسائلِ پیداوار پر قبضہ کر کے یا مال و دولت کا اکتناز و احتکار کر کے دوسروں کو اس سے محروم نہیں کر سکتا۔

اِس نظامِ کائنات کو چلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے کارپرداز یا عوامل مقرّر کیے ہوئے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے انسان کی قوّتِ علم[128] کے آگے سربسجود ہیں یعنی اس کے مطیع و فرماں بردار ہیں۔

(۷) **نفس و قلب و حواس** : نفس کے متعدّد معانی ہیں، مثلاً رُوح، وجود اور وجُود و رُوح پر مشتمل ذاتِ انسانی[129]، جسے ایگو[130]، انا[131] یا خودی[132] سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

قرآنِ حکیم نے اس سلسلے میں ایک بڑی خیال آفریں اور بصیرت افروز بات کہی ہے کہ انسان میں حِسّی و قلبی قوتوں کا ظُہور اس وقت ہوتا ہے، جب اللہ تعالیٰ اس میں اپنی روح پھُونکتا ہے[133]۔ اس سے یہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ حِسّی و قلبی قوّتوں پر مشتمل زندہ و حرکی اور شعوری و ارادی نظام عبارت ہے نفسِ انسانی سے۔ حِسّی قوّتوں سے مراد حواسِ خمسہ ہیں : سامعہ، باصرہ، شامّہ، لامسہ اور ذائقہ۔ چونکہ تعلیم و تربیت اور جمالیاتی مشاہدے میں سامعہ و باصرہ ہی اہم اور قابلِ ذکر کردار ادا کرتے

ہیں، اس لیے قرآنِ مجید صرف ان دونوں ہی کا ذکر کرتا اور انھیں قابلِ مواخذہ قرار دیتا ہے[134]۔

اگرچہ ہر حاسّہ کا اپنا علیحدہ نظام ہے، لیکن پانچوں حواس کے نظام آپس میں گہرا ربط و ضبط رکھتے ہیں جن کے "کُل" کو حِسّی نظام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ حسّی نظام قلبی نظام سے اس قدر مربُوط اور منضبط ہے کہ اس کا جزوِ لاینفک ہے۔ قلب ایک مکمّل و خود کار و خود اختیار غیر مرئی نظام ہے جو متعدّد نظاموں کا نامیاتی کُل ہے۔ اس نظام کے دو بڑے حصّے ہیں : ایک کو دماغ اور دوسرے کو دل سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ نظامِ دماغ خود متعدّد نظاموں کا مجمُوعہ ہے، مثلاً ارادہ، اختیار، عقل، فکر، شعور، حافظہ، ضمیر اور جمالیاتی حِس وغیرہ۔ اسی طرح نظام دل بھی متعدّد نظاموں پر مشتمل ہے، مثلاً جذبات (محبّت و نفرت کے) احساسات، خواہشات، عصبیات وغیرہ۔

نفس دراصل حسّی و قلبی نظاموں پر مشتمل ایک نظام ہے جو صاحبِ ارادہ و اختیار نامیاتی کُل ہے۔ اس کے دو بڑے وظائف ہیں : رُوح اور وجُود کے تقاضوں کو پُورا کرنا۔ رُوح کا تقاضا دراصل اس کی آرزُوئے اِلٰہ ہے، یعنی اپنے اِلٰہ کی پرستش، دید اور تقرّب کی طلب و جستجو۔ چونکہ یہ کائنات بشمول حیوان اور انسان، اس کے اِلٰہ کی تخلیق ہے، اس لیے اس میں دیگر چیزوں سے بالعموم اور انسان کے لیے بالخصوص محبّت کا جذبہ پایا جاتا ہے، جس کی تشفّی کی وہ متقاضی رہتی ہے۔ وجود کے تقاضوں کو جدید نفسیات کی اصطلاح میں جبلّتوں[135] سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ نفس اگر اپنے جبلّی تقاضوں کی تشفی کرنے کی دُھن میں رُوح کے تقاضوں سے غافل ہو جائے تو ابلیس اس کی اس غفلت سے فائدہ اُٹھانے کے کسی موقع کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ چونکہ ابلیس جانتا ہے کہ انسان فطرۃً حُسن، حسنہ اور خیر سے محبت اور قُبح، سیّئہ اور شر سے نفرت کرتا ہے، اس لیے اس کا طریقِ واردات[136] یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک تو نفس میں اپنے وسوسوں کے ذریعے پیہم و مسلسل خواہشات پیدا کرتا رہتا ہے[137] اور دوسرے ان خواہشات کو چاہے وہ کتنی قبیح، بُری اور شر انگیز کیوں نہ ہوں، خوشنما و دلفریب بنا کر دکھاتا ہے[138]۔ نفس اگر اس دھوکے میں آجائے تو اسے قبح پر حُسن کا، شر پر خیر کا اور بدی پر نیکی کا گماں ہونے لگتا ہے اور وہ اچھّی اور بری خواہشات یا جبلّی تقاضوں کی تشفی کرنے کی کوشش میں فطری حدود سے تجاوز کر جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو قرآنِ مجید "حزب الشیطٰن"[139] یعنی شیطان کی جماعت اور نفس کو نفسِ امّارہ[140] سے تعبیر کرتا ہے۔ نفس کے بے حد پیچیدہ اور محیّر العقول نظام کے اندر ایک اور طاقتور نظام ہے جس کا وظیفہ نفسِ امّارہ کو حدِّ اعتدال یا فطری

حدود سے تجاوز کرنے سے روکنا اور اس کے نتائج و عواقب سے متنبہ کرنا ہے اور اگر وہ نہ رُکے اور فطری حدود سے تجاوز کر جائے تو اسے ملامت و شرمسار کرنا اور توبہ و استغفار کی ترغیب دینا ہے۔ نفس کے اس نظام کے لیے قرآنِ حکیم نے نفسِ لوّامہ[۱۴۱] کی تعبیر اختیار کی ہے۔ اس طرح نفسِ امّارہ اور نفسِ لوّامہ مستقلاً برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ اس کشاکش کی ہار جیت ہی حیاتِ انسانی کی کامیابی و ناکامی کا فیصلہ کرتی ہے۔ نفسِ امّارہ جیت جائے تو وہ شیطان کا دوست و مطیع ہو کر اسی کی طرح شیطان و شریر بن جاتا ہے۔ شیطنت اسے انسانیت کی صفات اور نعمتوں سے محروم کر کے اس کے اندر خوف و حُزن کی آگ لگا دیتی ہے۔ ایسے نفوس کا مآل زندگی کے قانونِ مکافاتِ عمل[۱۴۲] کی رُو سے یہ ہوتا ہے کہ آخرت میں انھیں شرِّ مآب[۱۴۳] میں رہنا پڑتا ہے، جیسے النّار، جہنّم، سقر، ہاویہ وغیرہ کئی ناموں سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس اگر نفسِ لوّامہ جیت جائے تو انسان "بندۂ رحمٰن" بن جاتا ہے اور اس کی زندگی "حیاتِ محض" بن جاتی ہے۔ حیاتِ محض سے مراد خالص زندگی ہے یعنی حسین و مطمئن اور مسرور و ابدی زندگی۔ ایسے انسان کو قرآنِ مجید نے نفسِ مطمئنہ[۱۴۴] سے تعبیر کیا ہے، جسے اس حُسنِ عمل کے صلے میں آخرت میں حُسنِ مآب یا[۱۴۵] جنّت کی حیاتِ محض عطا کی جائے گی۔

نفسِ لوّامہ کی جیت کی نوعیت یہ ہے کہ وہ جب نفسِ امّارہ کو مغلوب کر لیتا ہے تو اس پر ابلیس کے جمالیاتی فریب کا طلسم ٹُوٹ جاتا ہے۔ اس کے دو نتائج نکلتے ہیں: ایک یہ کہ اسے ہر شر، بدی یا گناہ اپنی اصل گھناؤنی اور مکروہ شکل میں دکھائی دینے لگتا ہے۔ ایسی صورت میں انسان طبعاً گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا، بلکہ کر نہیں سکتا، جیسے ہر سلیم الطبع انسان آنکھ سے دیکھ کر مکھی یا گندگی نہیں کھا سکتا۔ نفس کی اس مستقل و طبعی حالت کے لیے "عصمت" کی اور اہلِ عصمت کے لیے "معصوم" کی تعبیر اختیار کی جاتی ہے۔ دوسرا یہ کہ انسان شیطان یا ابلیس کو اچھی طرح سے پہچان لیتا ہے اور اسے اس حقیقت کا عین الیقین ہو جاتا ہے کہ وہ ہر حال میں اس کا دشمن ہے، لہٰذا وہ اس سے ہر حال میں دُور رہتا اور دُور رہنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ علاوہ بریں نفس پر خواہشات کا غیر ضروری دباؤ دُور ہو جاتا ہے جس سے انتشار و تضادات ختم ہو جاتے ہیں اور اس کی آرزوئے الٰہ پُوری طرح زندہ و بیدار اور حرکی و توانا ہو جاتی ہے اور انسان کو پیکرِ محبّت و رحمت بنا دیتی ہے۔ ایسے انسان ہی اسلام کی نظر میں اولیاء اللہ،[۱۴۶] عباد الرحمٰن،[۱۴۷] انعام یافتہ[۱۴۸] اور کامیاب[۱۴۹] ہوتے ہیں۔

اگرچہ نفس کو طبعاً حُسن، نیکی اور خیر سے محبّت اور ان کی طلب و جستجو ہوتی ہے، لیکن اسے قُبح، بدی اور شر کا شعور اور ان متضاد و متناقص چیزوں کے انتخاب کا ارادہ و اختیار بھی دیا گیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ارادہ و اختیار کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے، اس نے انسان کے احوال و ظروف کے مطابق اسے ارادہ و اختیار کی قوّت امانت کے طور پر تفویض کی ہے۔ قرآن مجید کی رُو سے اس بارِ امانت کو اٹھانے کا فیصلہ خود انسان نے اپنی مرضی سے کر کے اپنے آپ کو قُدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل کا مستوجب بنا لیا۔ اس طرح اس نے امتحانِ زندگی میں سے گزرنے کا فیصلہ کر کے ایک تو اپنے آپ پر ظلم کیا اور دوسرے اپنے جہل کو ثابت کر دیا۔ یہ بھی انسان کا ظلم و جہل ہے کہ وہ اپنے علم پر بھروسہ کر کے اللہ تعالیٰ اور علمِ حقیقی کا انکار کر دیتا ہے۔ بہر حال اس ارادہ و اختیار کی پاداش میں یہ دنیا انسان کے لیے دار الامتحان اور آخرت دار الجزاء بنا دی گئی ہے۔

(۸) قانونِ مکافاتِ عمل یا قانون جزا و سزا: قدرت کا یہ قانون ہے کہ "جیسا بوؤ گے ویسا کاٹو گے" یا "جیسا کرو گے ویسا بھرو گے"۔ یہ قانونِ مکافات جس طرح عالمِ طبیعی میں جاری و ساری ہے، اسی طرح عالمِ انسانی میں بھی جاری و ساری ہے۔ اس سے کسی شخص کو مفر نہیں۔ لہٰذا انسان کے اعمال کا ہر گھڑی محاسبہ ہوتا رہتا ہے اور اسے ان کی جزا و سزا بھی ملتی رہتی ہے، لیکن "مکافات" کا ایک حقیقی دن ہے جو اصطلاحِ قرآنی میں یوم الدّین[۱۵۰] ہے اور وہ قیامت کا دن ہوگا۔ مکافاتِ عمل کا عقیدہ جتنا سچّا ہے، اتنا عالمگیر بھی ہے اور ہر دین و ملّت میں پایا جاتا ہے۔ چونکہ اس سے انکار ممکن نہیں تھا، اس لیے دینی پیشہ ور پیشواؤں نے لوگوں کو اپنا مطیع و فرماں بردار بنانے اور ان کا استحصال کرنے کی خاطر اس کی طرح طرح سے گمراہ کن تاویلیں کی ہیں، نیز اس عقیدے کو غیر مؤثر بنانے کی خاطر انھوں نے شفاعت اور نسلی امتیاز کے عقاید وضع کیے۔

یہود کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ حضرت یعقوب علیہ السّلام کی اولاد ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی چہیتی قوم ہیں[۱۵۱] اور صرف ایک وہی ناجی[۱۵۲] اور قیادتِ عالم کے مستحق ہیں۔ بنی اسرائیل کے علاوہ چونکہ دیگر تمام اقوام اللہ تعالیٰ کی مغضوب و مقہور ہیں، اس لیے ان پر ظلم کرنا یا ان کا استحصال کرنا ان کے لیے جائز ہے۔ اپنے اس نسلی امتیاز کے ذریعے وہ صاف صاف قُدرت کے قانون

مکافاتِ عمل کی تکذیب کرتے ہیں۔ نصاریٰ نے نسلی امتیاز کے عقیدے کے مقابلے میں شفاعت کا عقیدہ وضع کر لیا۔ ان کا قول ہے کہ باپ یعنی اللہ تعالیٰ بنی آدم کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی خاطر اپنے بیٹے یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے روپ میں تولد و مصلوب ہوا۔ لہٰذا جو شخص اس عقیدے کو قبول کرے گا وہی شفاعتِ یسوعؑ کا مستحق ہوگا اور نجات پائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نجات کا انحصار اعمالِ صالحہ پر نہیں، عقیدۂ شفاعتِ یسوعؑ پر ہے۔ نصاریٰ اس طرح عقیدۂ مکافات کی تکذیب کرتے ہیں۔ ہنود کا ایک نظریہ نسلی امتیاز کا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ دیوتاؤں کی اولاد ہیں، اس لیے صرف وہی پوتّر (پاک) ہیں اور باقی تمام انسان ملیچھ (ناپاک) ہیں، اور نجات پوتّر انسانوں ہی کی ہوگی۔ ان کا دوسرا عقیدہ شفاعت کا ہے، جو یہ ہے کہ اوتاروں اور دیوتاؤں کے مجسّموں اور مورتیوں کی پرستش کرنے سے وہ اپنے پجاریوں کے شفیع بنتے ہیں۔ حاصلِ کلام یہ ہے کہ دنیا میں صرف وہی پوتّر اور ناجی قوم ہیں۔

اسلام نسلی امتیاز اور شفاعت کے ان تمام عقاید کی واشگاف الفاظ میں تردید کرتا ہے اور انھیں انسان کی ضلالت کے زبردست عوامل قرار دیتا ہے۔ وہ تمام اقوامِ عالم کے سامنے نجات کا یہ عالمگیر اصول پیش کرتا ہے کہ نجات کا دارومدار ایمان و اعمالِ صالحہ پر ہے۔ کوئی شخص چاہے وہ پیغمبر ہو یا شہید، امام ہو یا ولی، پیر ہو یا فقیر، خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا[153] اور نہ دوسروں کے گناہوں کا کفّارہ ادا کر سکتا ہے۔ ہر نفس کو اپنا بوجھ خود ہی اُٹھانا پڑتا ہے، کیونکہ حیاتِ انسانی رہینِ اعمال ہے[154] لہٰذا کوئی شخص بھی اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر اس کے پاس کسی کی شفاعت کرنے کا مجاز نہیں۔[155] اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ تمام بنی نوعِ انسان اصلاً و نسلاً ایک ہی ہیں لہٰذا قبیلے، قوم یا خاندان کی بنا پر کوئی کسی پر فضیلت نہیں رکھتا اور نہ ان پر نجات منحصر ہے۔

مختصر یہ کہ ہر انسان کو اس دُنیا میں عمر بھر امتحان دینا اور اس کا نتیجہ بھگتنا ہے۔ جو شخص جیسا اس دنیا میں اپنے آپ کو بنائے گا، ویسا ہی "الحیوان" یا دارالآخرت میں ہوگا۔ اگر اس نے دنیا میں اپنی سیاہ کاریوں سے اپنے قلب کو اندھا بنایا ہوگا تو الحیوان میں وہ اندھا اُٹھے گا۔[156] اگر وہ یہاں حُسنِ یقین و عمل سے صاحبِ حُسن و سرُور ہوگا تو الحیوان میں بھی وہ ایسا ہی ہوگا۔ اس کے رہنے کے لیے وہاں حسنِ مآب ہوگا، جہاں اسے ان دیکھی، ان سنی، لامتناہی و بے مثال نعمتیں میسّر ہوں گی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے اپنے اِلٰہ کی دید[157] اور اس کے دوستوں

کی رفاقت نصیب ہوگی۔[158] اس کے برعکس اہلِ شر، جو یہاں آتش بجاں ہوں گے، وہاں ان کا ٹھکانا شرِّمآب میں ہوگا، جہاں انھیں سکراتِ موت کے عالم میں زندگی کرنا ہوگی۔[159]

(۹) **حیات و ممات** : اسلام کے نزدیک زندگی ربِّ رحیم کا عطیہ ہے۔ یہ انسان کا استحقاق نہیں ہے۔ جہاں تک حیاتِ انسانی کا تعلّق ہے، اسے فنا و عدمیّت لازم نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "رُوح" جو اصل حیاتِ انسانی ہے وہ روحِ الٰہی ہے،[160] اس لیے اس میں دیگر صفاتِ الٰہی کے علاوہ حیات و قیّومیّت کی صفات بھی پائی جاتی ہیں۔[161] موت اس کے لیے گہری نیند جیسی ہے،[162] جو اسے مادّی دنیا و عناصر سے رہا و منزّہ کر کے الحیوان میں پہنچا دیتی ہے جہاں زندگی ہی زندگی ہے، موت و فنا یا ہلاکت و عدمیّت نہیں ہے۔

الحیوان کے دو عالم ہیں : ایک حسین و منوّر، جسے حسنِ مآب یا حسن المآب سے تعبیر کیا گیا ہے اور دوسرا قبیح و تاریک، جس کے لیے شرّمآب کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ حسنِ مآب کے اور بھی کئی صفاتی نام ہیں مثلاً جنّت، فردوس، خلد وغیرہ۔ اسی طرح شرّمآب کو بھی متعدّد ناموں سے موسوم کیا گیا ہے، مثلاً جہنّم، النّار، سقر، ہاویہ وغیرہ۔ ان دونوں عالموں میں چونکہ موت نہیں، اس لیے وہاں ہمیشہ زندہ رہنا انسان کا مقدر ہے۔ اس سے انسان ان عالموں کی نعمتوں، خوشیوں، اذیتوں اور زمان و مکان کی نوعیّت کا معمولی سا تصوّر کر سکتا ہے۔

زندگی جو خالص ہو، یعنی موت کے الوان و اثرات سے منزّہ ہو تو اسے "حیاتِ محض" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حیاتِ محض میں یہ خواص پائے جاتے ہیں : حسن و نور، لذّت و سرور، حرکتِ مدام و ثباتِ دوام اور عقل و شعور۔ اس اعتبار سے زندگی لافانی و سرمدی حقیقت ہے۔ اس کے برعکس موت اس عالمِ حیات و ممات کی پیداوار ہے[163] اور اس کی اصل عدمیّت ہے لہٰذا وہ عالمِ خفا میں رہتی ہے اور اپنا وظیفہ سرانجام دے کر ہمیشہ کے لیے معدوم ہو جاتی ہے۔[164] موت چونکہ وجودِ انسانی کو ہلاک کرتی ہے، اس لیے ہر نامیاتی وجود کی طرح نفسِ انسانی اس سے طبعاً متنفّر، گریزاں اور خائف رہتا ہے۔ لیکن موت دیگر نامیاتی وجودوں سے کہیں زیادہ نفسِ انسانی کی دوست ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ موت کا وظیفہ رُوحِ انسانی کو عالمِ ممات و حیات سے نکال کر الحیوان میں پہنچا دیتا ہے جو اس کا اصلی گھر ہے، جہاں اسے اپنے اِلٰہ کی دید اور اس کے دوستوں کی صحبت و رفاقت میسّر آتی ہے۔ علاوہ بریں موت اپنا یہ وظیفہ ایسے طریقے سے

سرانجام دیتی ہے کہ نفسِ انسانی کو اس بے حد دُور و دراز سفر کی صعوبتوں اور دُشواریوں کا مطلقاً شعور و احساس نہیں ہوتا۔ جس طرح سرجن مریض کو بے ہوش کر کے اس پر عملِ جراحی کرتا ہے تاکہ اسے درد کا احساس نہ ہو، اسی طرح موت بھی طبیبِ مہربان بن کر نفسِ انسانی کو اپنے ذائقے سے آشنا کر کے اس کا احساس و شعور عارضی طور سے سلب کر لیتی ہے اور ان گنت زمان و مکان کا سفر آنکھ لگتے ہی طے ہو جاتا ہے۔

موت کتنی حسین و رحیم ہے، اس کا اندازہ وہ لوگ کر سکتے ہیں جو ناقابلِ برداشت جسمانی و روحانی اذیتوں میں مبتلا ہو کر زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہوں۔ اس عالم میں موت ان کے لیے فرشتۂ حسن و رحمت ہوتی ہے۔ اس حقیقت کو قرآنِ حکیم نے اپنے الہامی انداز میں اس طرح سمجھایا ہے کہ دوزخ کی آتش بجاں زندگی کی اذیتیں اس قدر رُوح فرسا ناقابلِ برداشت ہوں گی کہ انسان موت کو ترسے گا اور اس کے لیے دعائیں مانگے گا[165]، اور اس کی آرزو میں گھُل گھُل کر جینے پر مجبور ہو گا، کیونکہ الحیوان میں موت نہیں[166]۔

اس سے یہ بات یاد آئی کہ زندگی اللہ تعالیٰ کی ایک حسین و گرانقدر امانت ہے، اس لیے خودکشی حرام و ممنوع ہے۔ لہٰذا مسکرات یا نشہ آور چیزیں چونکہ زندگی کے قوائے ہوش و شعور کو متاثر کرتی ہیں، اس لیے ان کا استعمال خُودکُشی ہی کی ایک شکل ہے، اس لیے حرام ہے۔

(۱۰) **وحی و رسالت** : وحی کی دو بڑی قسمیں ہیں : موضوعی اور معروضی۔ موضوعی وحی کی مثال قرآنِ مجید نے شہد کی مکھّی کے طبعی الہام سے دی ہے۔ موضوعی وحی دراصل اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے، جو اس نے اپنی سب مخلوقات کی طبیعت میں ودیعت کر دی ہے۔ یہ وحی بالمعنیٰ ہوتی ہے، اس کی ایک ارفع شکل وجدانی وحی ہے جسے الہام، کشف، واردات وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے[167]۔ انسان کی بڑی بڑی ایجادات و اختراعات، فنی، ادبی اور علمی شاہکار اسی وجدانی وحی کے مرہُونِ منت ہوتے ہیں۔ موضوعی وحی کی یہ دونوں قسمیں عام ہیں اور ان کا سلسلہ جو ازل سے جاری ہے، ابد تک قائم رہے گا۔ لیکن معروضی وحی کا سلسلہ جو اللہ تعالیٰ کے پہلے پیغمبر حضرت آدم علیہ السّلام سے شروع ہوا تھا، اس کے آخری پیغمبرِ اسلام حضرت محمّد رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی ذاتِ بابرکات پر منقطع ہو گیا۔ اس وحی کی نوعیت مخصوص تھی اور اسے اللہ تعالیٰ صرف اپنے انبیاء علیہم السلام کے قلبِ مبارک

پر حضرت جبرئیل علیہ السّلام کے ذریعے الفاظ و معانی کے ساتھ نازل کرتا تھا[168]۔ یہ معروضی وحی چونکہ ملفوظی و مکتوبی ہوتی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری وحی کو القرآن اور الکتاب، نیز تنزیل کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے[169]۔ یہ وحی چونکہ نبوّت و رسالت کا جزوِ لاینفک (یا اٹوٹ انگ) تھی، اس لیے سلسلۂ نبوّت کے انقطاع کے ساتھ اس کا سلسلہ بھی ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گیا۔ چنانچہ اب نہ تو کوئی نبی مبعوث ہو گا اور نہ کسی پر وحی نازل ہو گی۔ وحی معروضی کی ایک قسم غیر ملفوظی بھی ہے۔ یہ احادیثِ رسول کی شکل میں محفوظ ہے۔ اسے وحی خفی یا غیر متلو کا نام دیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے وحی سے متعلّق دو اور حقائق سے بھی انسان کو آگاہ کیا ہے : ایک یہ کہ قرآن مجید وحی و تنزیل[170] ہے۔ دوسرے یہ کہ پیغمبرانہ وحی میں رسول اللہؐ کے اپنے خیالات و خواہشات کا قطعاً عمل دخل نہیں ہوتا۔

(۱۱) **حُبِّ رسُول** : حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم ہر اعتبار سے معروضِ محبّت ہیں۔ سب سے پہلے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں اور اللہ تعالیٰ کُل بنی نوعِ انسان کا اِلٰہ ہے۔ لہٰذا مہر و وفا کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے اِلٰہ کے محبوب سے محبّت کریں اور اسے معروضِ محبّت بنا لیں۔ جمالیاتی نقطۂ نظر سے بھی آپؐ معروضِ محبت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حُسن سے محبّت کرنا فطرتِ انسانی کا خاصّہ ہے اور آپؐ صورت و سیرت ہر لحاظ سے پیکرِ حُسن تھے۔ آپؐ نے مثالی انسان کی حیثیت سے محاسنِ اخلاق کی تکمیل کی، انفرادی و معاشرتی زندگی کو اتنا حسین بنایا اور بنانا سکھایا۔ نیز آپؐ نے ایک پاکیزہ و حسین ثقافت (اپنے وسیع ترین مفہوم میں) ورثے میں چھوڑی، جس کے کُل افرادِ نسلِ انسانی کے وارث ہیں۔

حُسن کی تصدیق صداقت سے اور محبّت کی تصدیق احسان سے ہوتی ہے۔ چنانچہ آپؐ صادق و امین بھی تھے اور عادل و مُحسن بھی، بلکہ آپؐ تو رحمۃ للعالمینؐ تھے اور ہیں، کیونکہ آپؐ نے دلِ انسانی میں رحمت کی جو شمع روشن کی تھی، وہ ابھی تک فروزاں ہے۔ آپؐ نے انسان کو شرک و جہل اور طاغوتی قوتوں، مثلاً فرعونوں، ہامانوں اور قارونوں سے نجات دلائی، اسے بھائیوں کی طرح آزادی و محبت سے رہنا سہنا اور اپنا تزکیۂ نفس کرنا سکھایا۔ اس کے

لیے علم و حکمت کے چشمے جاری کیے جو آج بھی مزرعِ حیات انسانی کو سیراب کرتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ آپؐ نے آدمی کو انسان اور انسان کو صاحبِ حُسن و سُرور بننا سکھایا۔ کیا ایسا انسان جو مُحسنِ انسانیتؐ اور رحمۃ للعالمینؐ ہو، معروضِ محبت نہیں ہوگا؟ یقیناً ہوگا۔ وہ انسان ہی کا نہیں، تمام مخلوقات کا معروضِ محبّت ہے اور یہ بات رحمۃ للعالمینی کے اسرار میں سے ہے۔

دُنیوی ہی نہیں، اُخروی زندگی کے لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو آپؐ کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی پر تن، من، دھن سب کچھ قربان کر دینے کو جی چاہتا ہے، جس کی بدولت ہم اسلام میں اور ایمان میں داخل ہوئے۔ ہم میں اپنے اِلٰہ کی خوابیدہ آرزو بیدار ہوئی، ہم پر اس کی راہِ مستقیم عیاں ہوئی اور ہمیں اپنی حقیقی منزلِ مقصود کا علم ہوا۔ کیا اس سے زیادہ کوئی چیز انسان کے لیے عزیز و محبوب ہو سکتی ہے؟ اگر نہیں ہو سکتی اور یقیناً نہیں ہو سکتی تو ایسے محبوب و محسن انسان کی محبّت میں جس نے ہمیں جہنّم کی مرگِ مسلسل سے بچایا اور جنّت کی حیاتِ ابدی کا حصُول سہل و ممکن بنایا، دنیا کی عارضی و فانی زندگی قربان کر دینا بے حد سستا سودا ہے۔

انسان کے لیے ایسی مخلوق میں رہنا جو صاحبِ ارادہ و اختیار ہو، اور ایسے معاشرے میں رہنا جہاں پوشیدہ و ظاہر فرعون، ہامان اور قارون ہوں اور جہاں ابلیس اپنی ذرّیت کے ساتھ قدم قدم پر دامِ ہمرنگ زمین بچھاتا ہو، ازبس دشوار ہوتا، اگر اللہ تعالیٰ آپؐ کو مثالی انسان بناکر مبعوث نہ فرماتا۔ آپؐ نے انسان کو اپنی انقلاب انگیز تحریکِ اسلام کے ذریعے ابلیس کے جمالیاتی فریب سے محفوظ رہنا اور شرک و بت پرستی اور طاغوتی و استحصالی قوتوں سے منزّہ معاشرے کی تشکیل و تعمیر کرنے کا طریقہ سکھایا۔ اس اعتبار سے بھی آپؐ معروضِ محبّت ہیں۔

محبّت کی دنیا میں آپؐ ہمارے اِلٰہ کے قاصد و نامہ بر ہیں۔ آپؐ کی وساطت سے ہمیں اپنے اِلٰہ کا ارمغانِ بیش بہا و بے مثال ملا، جو قرآنِ مجید ہے۔ قرآنِ مجید بھی آپؐ کی طرح روشنی میں آفتاب اور حُسن میں ماہتاب ہے۔ وہ زندہ خدا کا زندہ کلام ہے اور حق کے ساتھ باتیں کرتا ہے۔ چونکہ آپؐ ہمارے اِلٰہ کے پیارے اور آخری قاصد و پیامبر ہیں، اس لیے محبُوبِ سبحانی ہی نہیں، محبُوبِ انسانی بھی ہیں۔

دین کی دُنیا میں آپؐ اللہ تعالیٰ کے آخری رسولؐ و نبیؐ ہیں، اور یہ ایسا اعزاز و منصب ہے جس کی عظمت کا فکرِ انسانی اندازہ نہیں کر سکتی۔ کسی بادشاہ یا حکمران کا قاصد و نامہ بر ہونا بہت بڑا اعزاز و منصب سمجھا جاتا ہے لیکن اللہ جلّ شانہٗ کے سامنے بڑے سے بڑا شہنشاہ یا حکمران پرِ کاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتا۔ علاوہ بریں آپؐ تو پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم ہیں اور رحمۃ للعالمینؐ بھی، آپؐ سے بڑھ کر نہ تو کوئی انسان کا محبوب ہو سکتا ہے اور نہ ہے اور نہ ہوگا۔

مختصر یہ کہ اگر انسان کو اپنے آپ سے سچّی محبّت ہو، یعنی اسے اس دُنیا میں صاحبِ حُسن و سُرور بننے اور الحیوان میں حسنِ تاب، حیاتِ محض اور دیدِ دوست کی طلب و آرزو ہو تو اسے آپؐ سے زیادہ کوئی اور چیز محبوب نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کے لیے محبّتِ رسولؐ ان کے ایمان و اسلام کا معیار ہے۔ لیکن ہمیں یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ محبّتِ رسولؐ کی حقیقت "فاتبّعونی" (میرا اتباع کرو) میں مضمر ہے[۱۷۱]۔ مسلمان جب تک اس راز سے آشنا یعنی صاحبِ اسرار رہے، انھوں نے آپؐ کی تحریکِ اسلام کو جاری و ساری رکھا اور ہر گوشۂ حیات میں اقوامِ عالم کی رہنمائی کی۔ اصل یہ ہے کہ آپؐ کے اتباعِ کامل کے بغیر محبّتِ رسول ناقابلِ اعتبار ہے۔

میلاد بلاشبہ محبّتِ رسولؐ کے اظہار کا ایک حسین طریقہ ہے، لیکن میلاد کی محفلیں سجانے کے صاحبِ اسرار مسلمان ہی سزاوار ہیں۔ اس سے مراد آپؐ کے سچّے پیروکار ہیں جو زندگی کے ہر شعبے میں آپؐ کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں، جو آپؐ ہی کی انقلاب انگیز تحریکِ اسلام میں فعّال کارکنوں کی طرح حصّہ لیتے ہیں، جو شرک و بُت پرستی نیز وقت کے فرعونوں، ہامانوں اور قارونوں کے خلاف مسلسل جہاد کرتے اور آپؐ کی طرح معاشرے کی تشکیل و تعمیر میں بھرپور حصّہ لیتے ہیں۔ علاوہ ازیں جو آپؐ کی طرح اخوّت و مساوات کے دلدادہ ہیں، اور آپؐ کی طرح اللہ تعالیٰ کے حکمِ انفاق بالعفو پر عمل کرتے ہیں اور جن کے عمل میں حُسن اور عبادت میں احسان ہے۔ الغرض جو اہلِ حسن و محبّت اور سراپا رحمت ہیں۔

حرفِ آخر یہ ہے کہ حُبّ رسولؐ کی تین علامتیں ہیں: حُبّ الٰہی، حُبّ ذات اور حُبّ انسانیّت۔

(۱۲) **اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی**: اس سے مُراد دینی یعنی مکمّل جمالیاتی، ثقافتی

انقلاب[۱۷۲] کے ذریعے انفرادی و اجتماعی زندگی کا تزکیہ کرنا ہے۔ تزکیہ کا مطلب ہے انسانی زندگی سے تمام ناروا دباؤں[۱۷۳] کو دور کرنا، اور اسے ہر قسم کے طفیلی و استحصالی عناصر سے پاک و صاف کرنا، نیز اس کی اس طرح تربیت کرنا کہ اس کی وہبی یا فطری استعدادیں قوت سے فعل میں آ کر طبیعی انداز میں نشو و نما کرنے لگیں۔ اس انقلاب کے ذریعے پہلے انسان کے قلب یعنی ذہن و دل میں، پھر معاشرے میں مطلوبہ تبدیلیاں لائی جاتی ہیں۔ انقلاب چونکہ تحریک کے عقایدِ جلیلہ و محرّکہ کے ذریعے لایا جاتا ہے، اس لیے قلبی انقلاب کا مطلب معتقدات و نظریات، افکار و تصوّرات، نیز جذبات و عصبیّات اور امیال و عواطف میں تبدیلی لانا، اور ان کی جگہ تحریکِ انقلاب کے عقاید اور آرزوؤں کو جاگزیں کرنا ہے۔ اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کا مقصد قرآن مجید کے احکام اور تعلیمات کے ذریعے آپؐ کے اسوۂ حسنہ کے مطابق دینی یا مکمل جمالیاتی۔ ثقافتی انقلاب[۱۷۴] لانا ہے۔ مکمّل ثقافتی انقلاب کی نوعیت موضوعی۔ معروضی ہے۔ جیساکہ قرآنِ حکیم اور آپؐ کے اسوۂ حسنہ سے ثابت ہے، موضوعی یا نفسیاتی انقلاب تزکیۂ نفس اور تعلیم کتاب و حکمت کے ذریعے لایا جاتا ہے، لیکن معروضی یا معاشرتی انقلاب میں جہاد کا عنصر بھی شامل کرنا پڑتا ہے۔ جہاد کی تین قسمیں ہیں: جہاد باللسان، جہاد بالقلم اور جہاد بالسّیف۔ جہاد بالسّیف کی نوعیت اس وقت آتی ہے، جب جہاد کی پہلی دونوں قسمیں ناکام ہو جائیں۔ ہمیں یہ اصل یاد رکھنی چاہیے کہ جہاد اللہ تعالیٰ کے حوالے سے اس کے بندوں کے لیے کیا جاتا ہے، یعنی بنی نوع انسان کو شرک و بُت پرستی، نیز ہر قسم کی طاغوتی و استحصالی قوتوں مثلاً فرعونوں، ہامانوں اور قارونوں کی غلامی و محکومی سے نجات دلانے کے لیے۔ جہاد دفاعِ ملک و ملت، حق و صداقت اور عدل و انصاف کی خاطر، نیز معاشرے کو مفسد و شریر عناصر سے پاک و صاف کرنے کے لیے بھی کیا جاتا ہے۔ جہاد چونکہ تعمیری و مثبت مقاصد کی خاطر کیا جاتا ہے، اس لیے اس میں خونِ انسانی کا احترام اور احترامِ انسانی کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔[۱۷۵]

(۱۳) **اِنقلاب**: اس کے معنی ہیں معاشرے کے اندر کسی بڑی تبدیلی کا آنا یا لانا۔ اس کی دو بڑی قسمیں ہیں: مذہبی اور دینی۔ ہر انقلاب مذہبی ہوتا ہے یا دینی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ہر انقلاب تحریک کا رہینِ منّت ہوتا ہے جس کا اپنا نعرہ ہوتا ہے اور نعرہ اس کی آئیڈیالوجی کا مظہر اور آئیڈیالوجی تحریک کی توانائی کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ یہ تو سامنے کی بات ہے کہ نازیت،

فاشیت اور اشتراکیت سب تحریکیں تھیں اور ان کی اپنی اپنی آئیڈیالوجی تھی، اس لیے وہ مذہبی تحریکیں تھیں۔ اشتراکی اپنے انقلاب کو غیر مذہبی اور مادّی کہتے ہیں لیکن وہ اس حقیقت کو تسلیم کریں یا نہ کریں، ان کی تحریک مذہبی ہے۔ مذہبی انقلاب کا محرّکِ حقیقی کسی ایک جبلّی تقاضے کی تشفّی ہوتا ہے، مثلاً نازیت اور فاشیت کا محرّک حصولِ قوت کا جبلّی تقاضا تھا جبکہ روس اور چین کے انقلاب کا محرّک "تن پروری" کا جبلّی تقاضا تھا۔ اس کے برعکس دینی انقلاب اپنی نوعیت میں کُلّی ہوتا ہے کیونکہ یہ انسان کے تن اور من کے یا جبلّی و معنوی تقاضوں کی تشفّی کے لیے لایا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق لایا جاتا ہے۔ اس کی بہترین مثال اسلامی انقلاب ہے۔

زندگی کا خاصّہ حرکت و نمو ہے، اس لیے وہ تغیّرِ مدام کو چاہتی ہے۔ اسے زندگی کے طبعی انقلاب سے تعبیر کر سکتے ہیں، لیکن جب زندگی پر حرکت و نمو کی راہیں مسدود کر دی جاتی ہیں یا اس کی آماجگاہ محدود ہو کر رہ جاتی ہے تو وہ ایک بڑے تغیّر و تبدّل یا انقلاب کا تقاضا کرتی ہے، جسے جبری یا تاریخی انقلاب کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح عالمِ طبیعی میں داخلی و خارجی عوامل کی وجہ سے مرئی و غیر مرئی تغیّرات کا عمل جاری و ساری رہتا ہے اسی طرح عالمِ حیاتِ انسانی میں بھی اس قسم کے تغیّرات کا عمل جاری و ساری رہتا ہے۔ انسان چونکہ ایک ذی علم و حکمت اور صاحبِ ارادہ و اختیار مخلوق ہے، اس لیے وہ ان تغیّرات کی نوعیت کو بدلنے کی قدرت رکھتا ہے۔ قرآنِ حکیم کی رُو سے ان تغیّرات کو بدلنے یا ان کے مضر اثرات سے محفوظ رہنے کی چار پیش شرائط ہیں: ایمان۔ اعمالِ صالحہ۔ تواصی بالحقّ اور تواصی بالصّبر۔[۱۷۶]

(ا) **ایمان** عبارت ہے اپنے معتقداتِ جلیلہ و محرّکہ کے مطابق زندگی بسر کرنے سے۔ اسلام کی رو سے یہ معتقدات پانچ ہیں: اللہ، انبیاءؑ، کتبِ سماوی، ملائکہ اور آخرت۔ اعتقادات زندگی کے اجزائے لاینفک بنتے ہیں تو ان میں زندگی کا جمال و جلال، حرکی توانائی اور قوتِ تسخیر پیدا ہوتی ہے۔ ایمان زندگی میں جذب ہو جائے تو زندہ و توانا ہوتا ہے لیکن اگر ان دونوں میں بُعد واقع ہو جائے تو وہ زندگی کی صفات سے محروم ہو کر مُردہ و جامد ہو جاتا ہے۔

(ب) **ایک اعتبار سے** اعمالِ صالحہ اور ایمان لازم و ملزوم ہیں۔ ایمان اور زندگی شیر و شکر ہو جاتے ہیں تو انسان کے فکر و عمل میں ہم آہنگی اور دونوں میں توازن و اعتدال پیدا ہوتا ہے،

جسے صالحیّت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ایسے عمل کو صالح کہتے ہیں۔ یہ عمل اقدامات کے تسلسل و دوام پر دلالت کرتا ہے۔ جن اقدامات سے معاشرتی زندگی میں توازن برقرار رہے، یا بالفاظِ دیگر ان سے تضاد و فساد کی صورتِ حال کی اصلاح ہوتی ہو تو اس کے سلسلے کو اعمالِ صالحہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ایمان کو زندہ و حرکی اور توانا و ارتقائی رکھنے کے لیے اسے زندگی میں جذب رکھنا ناگزیر ہے، اسی عملِ صالح کے تسلسل کو قائم و دائم رکھنے کے لیے اس کا رشتہ ایمان سے قائم رکھنا بھی لازمی ہے اور ایسا کرنے کا ایک سچا اور مجرّب قرآنی نسخہ بھی ہے، جس کی دو شقیں ہیں : تواصی بالحق اور تواصی بالصّبر

(ج) تواصی بالحق : اس کا مطلب یہ ہے کہ افرادِ معاشرہ آپس میں ایک دُوسرے کو حق و صداقت پر قائم رہنے کی موعظت و نصیحت کرتے رہیں اور اس کے لیے تمام ذرائع ابلاغ کو استعمال کریں۔ حق تو ایمان، اعمالِ صالحہ اور حُسنِ زندگی کا اعتبار ہے۔ علاوہ ازیں اس کے بغیر انسان کی موضوعی۔ معروضی یا اجتماعی زندگی میں توازن برقرار نہیں رہتا۔

(د) تواصی بالصّبر : ایمان، حق، حُسن، صالحیّت سب کو صبر ہی سے ثبات و دوام ملتا ہے، لہٰذا اسلام نے حق و صبر کی نصیحتِ باہمی کو لازمی قرار دیا ہے۔ صبر مصائب و تکالیف کو برداشت کرنے کی قوت و ہمّت پرُخوف و خطر کے وقت حوصلہ و پامردی اور ثبات و استقلال نیز مشکلات و موانع پر عبور حاصل کرنے، اپنے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے، اپنی منزلِ مقصُود تک پہنچنے اور اپنا مقصود حاصل کرنے کے عزمِ راسخ پر دلالت کرتا ہے۔ بالفاظِ دیگر کسی امتحان و تجربے سے گزرتے وقت قوّتِ برداشت، حوصلے اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنا صبر سے عبارت ہے۔

طبعی و تاریخی انقلاب لازم و ملزوم ہوتے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اگر کسی نامیاتی وجود کو مناسب آب و ہوا اور متوازن غذا نہ ملے تو اس کی صحت و تندرستی برقرار نہیں رہتی اور اس میں اضمحلال و انحطاط کے منفی عمل کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہی قانونِ صحت معاشرتی وجود میں بھی جاری و ساری ہے۔ چنانچہ جب کسی قوم کی زندگی کا اپنے عقایدِ جلیلہ و محرّکہ سے رشتے کے انقطاع کا عمل شروع ہو جاتا ہے تو اس کی قوت و توانائی میں کمی واقع ہونے لگتی ہے، پھر اضمحلال و انحطاط کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ علاوہ بریں اس منفی عمل سے فرد و قوم میں مغائرت و بُعد پیدا ہوتا ہے، اس سے افراد میں نظری و عملی تضادات جنم لیتے ہیں اور اس کا نتیجہ موضوعی و معروضی

فساد کی صورت میں نکلتا ہے۔

طبعی انقلاب کے منفی عمل کے سبب کسی قوم میں انحطاط و اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے تو تاریخ کی حریف قوتیں اس کے خلاف نبرد آزما ہونے لگتی ہیں تاکہ اسے اپنا مطیع و محکوم یا غلام بنا لیں۔ محکوم و غلام قوم جمُود و تعطّل کا شکار ہو جاتی ہے اور وہ اس وقت تک اس حالت سے نجات حاصل نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کے اندر اس حالت سے نکلنے کی سچّی آرزو پیدا نہ ہو جائے۔[۱۷۸] انقلاب کی سچّی آرزو سے مُراد ایسا انقلابی جذبہ ہے جو مساعیِ جمیلہ اور ایثار و قربانی کے جذبے کے ہمراہ ہو۔

اسلام کی رُو سے انقلاب کا بنیادی سبب کُفرانِ نعمت ہوتا ہے۔[۱۷۹] نعمت مادّی بھی ہوتی ہے اور معنوی بھی۔ کفرانِ نعمت کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو مادّی اور معنوی نعمتیں عطا کی ہیں، ان کی قدر نہ کرنا، یعنی ان کی پروا نہ کرنا، ان سے استفادہ نہ کرنا یا کم کرنا یا ان کا غلط استعمال کرنا۔ قرآنِ مجید نے تاریخ کے حوالے سے کفرانِ نعمت کی متعدد مثالیں دی ہیں۔ مادّی نعمتوں میں آزادی اہم ترین نعمت ہے۔ آزادی کا مطلب ہے کسی قوم کا خطّۂ سرزمین کا وارث ہو جانا اور اس میں آزادی سے زندگی بسر کرنا۔ اس کی ایک تازہ و زندہ مثال پاکستان ہے۔ تاریخ اور قرآنِ حکیم دونوں سے ثابت ہے کہ جس قوم نے اپنی آزادی کی قدر نہ کی، یعنی نہ تو اس کی حفاظت کا مناسب بند و بست کیا اور نہ اپنے آپ کو اس کی حفاظت کرنے کے لیے تیار کیا، تاریخ کی حریف قوتوں نے جبری انقلاب کے ذریعے اس کی آزادی کو سلب کر لیا۔ کفرانِ نعمتِ آزادی کو کُفرانِ سیاسی[۱۸۰] سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اسی طرح جو قوم اپنے وسائل دولت، سرمائے، صنعتی و تجارتی اعتبار یا ساکھ کا غلط استعمال کرتی ہے تو اس کے معاشی ڈھانچے میں اختلال رونما ہونے لگتا ہے اور اس کے سلبی اثرات زندگی کے دوسرے شعبوں پر بھی پڑتے ہیں اور منفی انقلاب کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اسے "کفرانِ معاشی"[۱۸۱] سے موسوم کر سکتے ہیں۔ سیاسی کُفران کی ایک جامع مثال ہمیں فرعونی معاشرے میں ملتی ہے۔ یہ معاشرہ طاغوتی و استحصالی اور مختلف طبقوں میں منقسم تھا، جو معاشی قوت کے بل پر عوام کا استحصال کرتے تھے۔ ان طاغوتی قوتوں کے ظلم و استحصال کی وجہ سے معاشرے میں غیر مرئی طور سے تشتّت و افتراق کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور اس کا نتیجہ معاشرے کے عناصرِ ترکیبی میں اختلال و اضمحلال کی صورت میں نکلتا ہے۔ بالفاظِ دیگر قوم میں طبعی منفی انقلاب کے عمل کا آغاز ہو جاتا ہے۔ تاریخ کی حریف قوتیں جو ایسے طبعی انقلاب کی گھات میں لگی رہتی ہیں، سرگرمِ عمل

ہوجاتی ہیں اور مضمحل استحصالی معاشرہ ان کی حریفانہ قوت کی تاب لانے کے قابل نہیں ہوتا اور انقلاب کا شکار ہوجاتا ہے۔

اسلام نے فلسفۂ انقلاب کے اس پہلو پر بہت زور دیا ہے کہ مادّی نعمتوں کی تکفیر کا بنیادی سبب معنوی نعمتوں کی تکفیر ہوتا ہے[۱۸۲]۔ اللہ کی عظیم ترین معنوی نعمت توحید ہے، جسے چھوڑ کر شرک و بُت پرستی اختیار کرنا اس کی تکفیر ہے۔ کوئی قوم جب اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور بھی اِلٰہ بنا لیتی ہے تو اس کے دو نتائج نکلتے ہیں : ایک یہ کہ اس سے فرد و قوم دونوں کی شخصیت دو یا دو سے زائد حصّوں میں منقسم ہوجاتی ہے۔ شخصیت ایک نامیاتی کُل ہے۔ اگر یہ دو یا اس سے زائد حصّوں میں منقسم ہوجائے تو اس میں اختلال یا اضمحلال کا عمل شروع ہوجاتا ہے اور اس کے نشوو ارتقاء کا عمل بند ہوجاتا ہے۔ غیر اللہ کو اپنا اِلٰہ بنانے سے انسان میں خوئے محکومی و غلامی پیدا ہوجاتی ہے، گو اسے اپنی اس نفسیاتی حقیقت کا شعور نہیں رہتا۔ یہ ایک ایسی کمزوری ہے جو طبعی انقلاب کے عمل کو بھی تیز تر کر دیتی ہے۔ دوسرا نتیجہ معاشرے کی طبقاتی تقسیم کی صورت میں نکلتا ہے۔ استحصالی و طاغوتی قوتوں کے ظلم و تشدّد کی وجہ سے معاشرہ تضادات و منافرت کا شکار ہوجاتا ہے اور یہ صورتِ حال خانہ جنگی پر منتج ہوتی ہے اور اس کا انجام طبعی و تاریخی انقلاب ہوتا ہے۔

منفی و تخریبی یا طبعی و تاریخی انقلاب کا اصول یہ ہے کہ وہ کفرانِ نعمت کے باعث وقوع پذیر ہوتا ہے، لیکن مثبت و تعمیری انقلاب کا اصول یہ ہے کہ وہ مثبت و ارادی ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی قوم میں جب تک ایسے انقلاب کی سچّی آرزو و جستجو پیدا نہیں ہوتی اور اس کے عقایدِ جلیلہ و محرّکہ اس کی زندگی میں جذب ہوکر شیر و شکر نہیں بن جاتے، اس میں تعمیری و مثبت انقلاب وقوع پذیر نہیں ہوسکتا۔ انقلاب کے یہ دونوں اصول قرآنِ مجید کی الہامی زبان میں اس طرح بیان ہوئے ہیں :

(قوموں کی ہلاکت) اس لیے ہوئی کہ جو نعمت اللہ تعالیٰ کسی قوم کو دیا کرتا ہے اسے وہ اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنی نفسیاتی حالت کو نہ بدل ڈالیں اور اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ (الانفال ۸ : ۵۳-۵۴)۔ چنانچہ (اس اصول کے مطابق) فرعون کی قوم اور ان سے پہلی قوموں کا حال ہوا۔ انھوں نے اپنے پروردگار و آقا کی نشانیوں کو جھٹلایا تو ہم نے ان کے گناہوں کے سبب ان کو ہلاک کر ڈالا، اور فرعون کے لوگوں کو ڈبو دیا اور وہ سب ظالم تھے۔

سُورۃ الرّعد میں ارشاد ہوتا ہے :

بلاشبہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت کو اس وقت تک نہیں بدلتا، جب تک کہ وہ اپنی نفسیاتی حالت کو نہیں بدلتی۔ (الرّعد ۱۳ : ۱۱)

انقلاب کے یہ دونوں اصول پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کی انقلابی تحریکِ اسلام کے رہنما اصول تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تحریکِ اسلام جب تک مکّے میں رہی، آپؐ اور رفقائے تحریک کی فکری کاوشیں اور عملی کوششیں لوگوں میں نفسیاتی انقلاب لانے ہی پر مرتکز رہیں۔

(۱۴) **اِحسان** سے متعلّق یہ اصل ہمیشہ ہمارے پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اس کا مادّہ حُسن ہے جس میں موزونیت و سرُور انگیزی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں (ا) احسان فی العبادات اور (ب) احسان فی العمل۔

(ا) **احسان فی العبادات** : حضرت جبریل علیہ السلام کے اس سوال کے جواب میں کہ اِحسان کیا ہے؟ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا : تو اللہ تعالیٰ کی عبادت (عالمِ حضوری میں) اس طرح کرے جیسے تو اسے دیکھ رہا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو (یعنی یہ مقامِ شاہدیّت میسّر نہ ہو) تو پھر یہ (مقامِ مشہودیّت میسّر) ہو کہ جیسے وہ تجھے دیکھ رہا ہے[۱۸۳]۔

آپؐ کا یہ ارشاد سرِّ حسن و محبّت کا امین ہے جیسا کہ ہم معلوم کر چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے حسن و رحمت یا صفاتِ الوہیّت و ربُوبیّت اور انسان کی فطرتِ عبدیّت کے باعث اس کا اِلٰہ ہے۔ معروضِ حُسن و محبّت مشہود و موجود ہو تو اس کی حمد و ثنا اور پرستش سے جو جمالیاتی حظ[۱۸۴] یا کیف و سرور حاصل ہوتا ہے، اس کی کیفیّت و کمیّت کا اندازہ دلِ عاشقِ مہجُور ہی کر سکتا ہے۔ دیدِ اِلٰہ کے اس مقام پر پہنچنا عَبدیّت کی معراج اور عبادت کی غایت ہے، اسے مقامِ شاہدیّت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ عابد کو اِلٰہ کی حضوری نصیب ہو اور اسے یہ بھی تیقّن ہو کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے، گو اس کی دید میسّر نہ بھی ہو تو پھر بھی اسے طمانیّت و مسرّت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے لیے ہم نے مقامِ مشہودیّت کی تعبیر اختیار کی ہے۔ معروضِ حُسن و محبّت یا اِلٰہ کی پرستش کی ان دونوں حالتوں کو آپؐ نے "احسان" سے تعبیر کیا ہے، جسے مقامِ شہود سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔

(ب) **احسان فی العمل** : اس کے ایک معنی یہ ہیں کہ نیّت اور عمل دونوں میں حُسن ہونا

چاہیے۔ اس کو حسنہ ، خیر، حُسنِ عمل ، عملِ صالح ، نیکی وغیرہ متعدّد الفاظ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ دوسروں کے ساتھ کشادہ دلی وحُسنِ نیّت کے ساتھ ایسا اور اس طرح حُسنِ سلوک کرنا کہ وہ مطمئن وخوش ہو جائیں۔ احسان میں دوسروں کی زندگیوں کو حسین وخوشحال بنانے کا مفہوم مضمر ہے۔ اس کی احسن وجامع تفسیر قرآن مجید کے ان مختصر الفاظ میں ملتی ہے:

اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (القصص ۲۸ : ۷۷) : جیسا اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمھارے ساتھ احسان کیا ہے، تم بھی لوگوں کے ساتھ ایسا ہی احسان یعنی حُسنِ سلوک کرو۔

یہ بات ہمیشہ ہمارے ذہن میں رہنی چاہیے کہ اصطلاحِ احسان کا صرف وہ مفہوم یا مطلب نہیں ہے اور نہ لینا ہی چاہیے جو اُردو میں لیا جاتا ہے، جیسے "آپ کا مجھ پر احسان ہے"۔ قرآنِ مجید جب یہ ارشاد فرماتا ہے کہ ماں باپ یا رشتے داروں وغیرہ سے احسان کرو، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم ان کے ساتھ حُسنِ نیّت، خندہ پیشانی اور احسن طریق سے حُسنِ سلوک کریں کہ وہ مطمئن اور خوش دِل ہو جائیں۔

(۱۵) انفاق و بخل : یہ قرآن حکیم کی دو بنیادی اصطلاحات ہیں :

۱ : انفاق سے مراد یہ ہے کہ اپنی جائز کمائی اللہ تعالیٰ کی راہ (فی سبیل اللہ) میں خرچ کرنا۔[185] اللہ کی راہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے اس کے بندوں کی فلاح و بہبود، تعلیم و تربیت معاشرے کی ترقی و خوش حالی، تحریکِ اسلام کو جاری و ساری رکھنے، جہاد، دفاع، ملک و ملت، جذبۂ عبودیّت کی تشفّی اور ثقافتی سرگرمیوں کے لیے مساجد کی تعمیر پر، نیز افرادِ معاشرہ کو بالخصوص اور افرادِ نسلِ انسانی کو بالعموم بھوک ننگ، بیماری مفلسی، بیروزگاری، ناخواندگی و جہالت اور شرک و بُت پرستی سے اور ان کی ذمّے دار ہر قسم کی استحصالی قوتوں سے نجات دلانے کی خاطر اپنا مال و دولت خرچ کرنا۔

معاشی اعتبار سے انفاق کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ دولت صرف دولت مندوں کے درمیان ہی گردش نہ کرتی رہے، بلکہ معاشرے میں اس طرح گردش کرے، جس طرح نامیاتی وجُود میں خُون طبیعی انداز میں گردش کرتا رہتا ہے۔ جس طرح نامیاتی وجُود کی صحت و نشوونما کا انحصار خون کی طبیعی یا معتدل و متوازن گردش پر ہوتا ہے، اسی طرح معاشرتی وجُود کی صحت و نشوونما دولت کی فطری یا معتدل و متوازن گردش پر منحصر ہوتی ہے۔ طب کا یہ مسلّمہ اصول ہے کہ نامیاتی وجُود میں خون کی گردش معتدل و متوازن نہ رہے تو وہ بیمار یا مفلوج ہو جاتا ہے، بعینہٖ اس اُصول کا اطلاق

معاشرے اور اس کی گردشِ دولت پر ہوتا ہے۔

انفاق کی کئی شکلیں ہیں : خیرات وصدقات، نذر و نیاز اور زکوٰۃ وغیرہ۔ لیکن یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی اگر دولت بچ رہے اور اس کا کوئی نجی مصرف نہ رہے تو پھر اس پر اللہ تعالیٰ کے حکم "العفو"[186] کا اطلاق ہوتا ہے، جس کا مطلب اپنی فالتو دولت کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اسلام اکتناز و احتکار، قماربازی، سودکاری، نیز اسراف و تبذیر وغیرہ کی اجازت نہیں دیتا۔

۲ : بخل[188] کا مطلب اِنفاقِ مطلق اور اِنفاق بالعفو کے حکمِ الٰہی پر عمل نہ کرنا اور دولت کو جمع کرنا ہے۔ لہٰذا اکتناز و احتکار، قماربازی، سُودکاری وغیرہ کی تمام شکلیں بخل میں شامل ہیں۔ انفاق اور بخل کے بارے میں اس ازبس اہم نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ اِنفاق سے نفسِ انسانی اور نفسِ معاشرہ دونوں کا تزکیہ ہوتا ہے جس کی بدولت وہ نفسیاتی و معاشرتی بیماریوں سے پاک وصاف ہو کر نہ صرف صحت مند و توانا ہو جاتے ہیں، بلکہ ان کے نشوو ارتقا کا عمل جاری رہتا ہے۔ اس کے برعکس بُخل سے یہ دونوں نفس اس کی بُرائیوں کے بوجھ تلے دب کر برباد ہو جاتے ہیں۔[189]

(۱۶) ابلیس کا جمالیاتی فریب : اسلام کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے انسان کا ہیولیٰ مٹّی سے، ملائکہ کا نور سے اور جنّوں کا نار سے بنایا تھا۔ ابلیس، جسے اس کے شر اور شیطنت کے سبب شیطان بھی کہتے ہیں، جنّوں میں سے ہے، اس لیے وہ ناری ہے۔ اس کے نزدیک نار کو مٹّی پر فضیلت حاصل تھی، اس لیے اسے نسلی تکبّر تھا اور اسی بنا پر اس نے حکمِ الٰہی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے انسان کی عظمت کو، جو اسے علم کی بدولت حاصل ہوئی تھی، تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ نتیجتہً ذلیل وخوار اور مقہور و مغضُوب ہوا۔ یہ علمی استعداد اللہ تعالیٰ نے انسان کو ودیعت کی تھی۔ علم میں ایک نورانی قسم کی قوتِ تسخیر ہوتی ہے، جسے اصطلاحِ قرآنی میں "سُلطان"[190] سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ابلیس اپنے انکار کی وجہ سے مقہور و مغضوب ہوا تو وہ انسان کا دشمن بن گیا، اور اس کی درخواست پر اللہ تعالیٰ نے اسے قیامت تک کے لیے مہلت دے دی کہ اگر وہ انسان کو گمراہ کر سکتا ہے تو کر دکھائے۔ اس طرح ابلیس انسان کے لیے فتنہ یا آزمائش بن گیا، جس کے باعث انسان و شیطان میں جو جنگ شروع ہوئی تھی، وہ ابد تک رہے گی۔

اگر یہ کہا جائے کہ ابلیس کی وجہ سے یہ دنیا انسان کے لیے دارالامتحان بنی ہے تو مبالغہ

نہیں، اعترافِ حقیقت ہوگا۔ بہر حال ابلیس جس طریقے سے انسان کو اللہ تعالیٰ کے راستے جسے صراطِ مستقیم سے تعبیر کیا گیا ہے، سے گمراہ کرتا ہے، وہ اپنی نوعیت میں جمالیاتی ہے۔ ابلیس اس حقیقت سے واقف ہے کہ انسان کو جمالیاتی حس ودیعت کی گئی ہے، جس کی بدولت وہ حسین چیزوں کو پسند کرتا اور ان کو محبوب رکھتا ہے، جبکہ قبیح چیزیں اسے قطعاً ناپسند ہیں اور وہ ان سے نفرت کرتا ہے۔ انسان کی اس نفسیاتی حقیقت کے پیشِ نظر ابلیس اسے ہر قبیح چیز (جسے منکر، بدی، شر، ظلم، گناہ، جرم وغیرہ بہت سے ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے) کو مزین یعنی خوشنما، آراستہ اور دلفریب بنا کر دکھاتا ہے۔[191] اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانوں میں سے بیشتر ابلیس کے اس خوشنما یا جمالیاتی دھوکے میں آکر جرم و گناہ کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ اس بنا پر ابلیس کے طریقِ واردات کے لیے ہم نے "جمالیاتی فریب" کی تعبیر اختیار کی ہے۔[192]

ابلیس ایسی منفرد شعوری قوت ہے جو انسان کے خون میں جاری و ساری ہے اور اس کے نفس تک اس کی رسائی ہے، اور وسوسہ و ترغیب کے ذریعے انسان کو ورغلانا، اسے سبز باغ دکھانا، شر کو خیر اور قبح کو حُسن بنا کر دکھانا یا اسے جمالیاتی فریب دینا یا دینے کی کوشش کرتے رہنا اس کا کام ہے۔ جو لوگ ابلیس کے وسوسوں اور بہلاوے میں آکر اس کے دامِ فریب میں پھنس جاتے اور اسے اپنا ناصح و دوست سمجھ بیٹھتے ہیں، انھیں حزبِ شیطان[193] اور جو نہیں پھنستے اور اسے اپنا دشمن سمجھتے ہیں، انھیں "حزب اللہ"[194] کہا گیا ہے۔

(۱۷) **شُکر اور کُفرانِ نعمت** : اللہ تعالیٰ کی موضوعی و معروضی نعمتوں اور احسانات کے احساس و شعور کا پیدا ہونا، ان نعمتوں سے پورا پورا اور صحیح طور سے استفادہ و تمتع کرنا اور پھر مُنعمِ حقیقی کے لیے دل میں جذباتِ ممنونیت کا پیدا ہونا اور حمد و ثنا اور ذکر کی صورت میں ان کا اظہار کرنا شُکر سے عبارت ہے۔ اس کے برعکس ان نعمتوں اور احسانات کے احساس و شعور کا نہ ہونا، اور ان سے کم یا بالکل استفادہ و تمتع نہ کرنا، یا ان نعمتوں کا ناجائز استعمال کرنا کفرانِ نعمت سے عبارت[195] ہے۔ قرآنِ حکیم نے تاریخ کے حوالے سے ہمیں بار بار اس حقیقت سے آگاہ کیا ہے کہ کُفرانِ نعمت انسان کے ظلم و جہل پر دلالت کرتا ہے اور یہ صورتِ حال اقوام کے لیے ذلّت و مسکنت، محرومی و نامرادی اور ہلاکت و بربادی کا سبب بن جایا کرتی ہے۔ اس کے برعکس شکرِ نعمت و دانش پر دال ہے۔[196] اور جو قومیں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر کرتی ہیں وہ خوشحال اور

کامران ہوتی ہیں۔[197]

(۱۸) **معروف و مُنکَر** : قرآن مجید نے نیکی، خیر، حَسَنہ، احسان یا عملِ صالح کے لیے "معرُوف" کی، اور بدی، شر، سیئۃ، ظلم، جُرم، گناہ وغیرہ کے لیے مُنکر کی تعبیر اختیار کی ہے۔ یہ دونوں تعبیریں از حد بلیغ و فطری ہیں۔ معروف کی اصطلاح میں یہ نکتہ مضمر ہے کہ انسان نیکی، خیر، حسنہ وغیرہ کو وجدانی و عقلی طور سے جانتا پہچانتا ہے اور اس سے مانوس ہے، جس طرح شہد کی مکھی محض وجدانی طور سے پھولوں کو جانتی پہچانتی ہے اور اس سے مانوس ہوتی ہے۔ جہاں تک مُنکر کا تعلق ہے، انسان اسے بھی طبعاً و عقلاً جانتا پہچانتا ہے، لیکن اس سے نفرت کرتا ہے جس طرح درندے طبعاً آگ سے ترساں و گریزاں ہوتے ہیں۔ ان اصطلاحات میں ایک نکتہ بھی مضمر ہے اور وہ یہ کہ معروف یا نیکی ایسی صفت یا خُلق ہے کہ ہر انسان اس سے معروف و مشہور ہونا پسند کرتا ہے۔ اس کے علی الرغم منکر یا بدی ایسی بُری صفت یا خُلق ہے جس سے انسان طبعاً و عقلاً معروف و منسوب ہونا پسند نہیں کرتا۔[198]

قلب معروف و مُنکر کا سچّا معیار ہے، مثلاً جو قول و فعل انسان کو طبعاً و عقلاً اچھا لگتا ہو اور اس سے اس کے قلب کو طمانیت حاصل ہو، نیز وہ اسے اپنی طرف منسوب کرنا پسند کرتا ہو، وہ معروف یعنی خیر، حسنہ یا نیکی ہے۔ اس کے برعکس اگر کسی قول و فعل سے قلب میں خلش اور سوزشِ خوف و حُزن پیدا ہو، اور انسان اس سے نفرت و ندامت محسوس کرے، اور اسے اپنی طرف منسُوب کرنے سے اُسے عار بھی آتی ہو تو وہ مُنکر یعنی بدی، شر یا گناہ ہے۔[199]

معروف ایسے قول و فعل کو کہتے ہیں جس میں صالحیّت، موزونی یا حُسن پایا جاتے، لہٰذا ہر حسین چیز جسے نیکی، خیر، حسنہ، احسان یا صالح عمل سے تعبیر کیا جاتا ہے، معروف ہے۔ اس کے علی الرغم منکر اس قول و فعل کو کہتے ہیں جس میں قبح و طالحیّت پائی جاتی ہے، لہٰذا ہر قبیح چیز، جسے جرم و گناہ، عدوان و شر، ظلم یا بدی وغیرہ ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے، "مُنکر" ہے۔ تاریخ، مشاہدہ اور تجربہ سب اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ سلیم طبائع نے مُنکر کو کبھی اپنی طرف منسُوب کرنا پسند نہیں کیا اور اسے ہمیشہ بُرا اور منفی اخلاقی قدر ہی سمجھا اور معروف کو ہمیشہ اچھا اور ایجابی قدر سمجھا۔ اس سے یہ استنباط کرنا مستبعد نہ ہوگا کہ اخلاقی اقدار مطلق اور عالمگیر ہیں۔[200]

(۱۹) **کامیابی**[201] : انسان کی کامیابی کیا ہے؟ کامیاب انسان کسے کہتے ہیں؟ کامیاب

زندگی سے مراد کس نوع کی زندگی ہے؟ عصرِ حاضر کی رُوح ان سوالوں کا سچّا جواب معلوم کرنے کی طلب و جستجو رکھتی ہے۔

عصرِ حاضر کے انسان کو جن دو فلسفیانہ مذاہب نے متأثّر اور مرعوب تو کیا ہے مگر مطمئن نہیں وہ یہ ہیں: مارکسیت و وجودیّت۔ مارکسیّت کے نزدیک معاشی احتیاجات سے نجات حاصل کرنا کامیابی ہے۔ وجودیّت کی رائے میں زندگی بے معنی، کائنات بے مقصد اور معاشرہ فرد کی آزادی کا رہزن ہے، لہٰذا معاشرے سے نجات حاصل کرنے اور بے اصول و بے مہار زندگی بسر کرنے میں آزادی کا راز مضمر ہے اور یہی کامیابی ہے۔

دین کے نزدیک انسان کی کامیابی یہ ہے کہ وہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کے ذریعے دُنیا میں صاحبِ حسن و سرور بن کر جنت میں جانے کے قابل ہو جائے۔ اسلام کے سوا چونکہ باقی تمام ادیان میں تحریف ہو چکی ہے اور ان کی الہامی کتابیں اپنی اصل حالت میں محفوظ نہیں رہی ہیں، اس لیے حصولِ کامیابی کے بارے میں اختلافات و تضادات پائے جاتے ہیں، جن کی وجہ سے عصرِ حاضر کی رُوح کو اپنے سوال کا سچّا جواب نہیں ملتا۔ آریہ مذاہب مثلاً ہندومت، بُدھ مت وغیرہ کا یہ عقیدہ ہے کہ زندگی ہی انسان کے دُکھوں کا باعث ہے اور انسان موت و حیات کے چکّر میں پھنسا ہُوا ہے، جس سے نجات حاصل کرنا ہی اس کی حقیقی کامیابی ہے، کیونکہ اس طرح روح (یا آتما) اپنی اصل رُوحِ مطلق و اکبر (پرماتما) میں فنا ہو کر مکتی و شانتی حاصل کر لیتی ہے۔ ہندومت کے نزدیک صرف پیدائشی ہندو ہی مکتی حاصل کر سکتا ہے، کیونکہ وہ دیوتاؤں کی اولاد ہونے کی وجہ سے پوتّر یعنی پاک مخلوق ہے۔ ہندومت میں شرک و بُت پرستی، جاگیرداری و سرمایہ داری اور سودکاری وغیرہ جائز و روا ہیں۔ بدھ مت کے نزدیک رُہبانیّت ہی مکتی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ نظری اور انفرادی طور پر تو یہ عقیدہ بڑا خوش آیند نظر آتا ہے، لیکن اجتماعی نقطۂ نظر سے یہ ناقابلِ عمل ہے۔ معاشرے کا ایک حصّہ تو ترکِ دنیا کر کے دوسروں کی خیرات پر زندگی گزار سکتا ہے لیکن تمام معاشرہ تو ایسا نہیں کر سکتا، لہٰذا جلد ہی اس مذہب میں سرمایہ داری و جاگیرداری اور شرک و بُت پرستی جائز قرار دے دی گئی۔

سامی ادیان[۲۰۲] میں یہود کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السّلام کی اولاد یا بنی اسرائیل میں سے ہونا ہی کامیابی کی ضمانت ہے، کیونکہ صرف وہی ایک قوم پاک، اللہ تعالیٰ کی چہیتی اور ناجی ہے۔ دوسری اقوام چونکہ اللہ تعالیٰ کی مقہور و مغضوب ہیں، اس لیے یہُود کا ان پر ظلم کرنا روا و جائز

ہے۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے دنیا و آخرت کی بادشاہت کا صرف یہود ہی کو وارث بنایا ہے۔ ظاہر ہے۔ یہ دین نہ تو عالم گیر ہو سکتا تھا اور نہ ہوا۔ اس دین میں سرمایہ داری، جاگیرداری، اکتناز و احتکار اور غیر یہود کا استحصال روا و جائز ہے۔ نصرانیت بلاشبہ ایک تبلیغی دین ہے لیکن اس کے نزدیک کامیابی کا راز بپتسمہ لینے میں مضمر ہے کیونکہ اس طرح انسان کے گناہوں کا کفّارہ ادا ہو جاتا ہے اور وہ آسمان کی بادشاہت میں جانے کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اس عقیدے سے قُدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل کی نفی ہوتی ہے، جو دین کی بنیاد ہے۔ ابنیت، تثلیث یا اقانیمِ ثلاثہ کے عقیدے نے عیسائیت میں شرک و بت پرستی کے تمام دروازے کھول دیے ہیں۔ علاوہ ازیں اس مذہب میں سرمایہ داری، جاگیرداری، سودکاری، قماربازی، شراب نوشی وغیرہ تمام معاشرتی بُرائیوں کو جائز قرار دے دیا گیا ہے۔ اگرچہ سلیم الفطرت انسان انھیں ناجائز و حرام اعمال ہی خیال کرتے ہیں۔

کامیابی سے متعلق اسلام کا عقیدہ ایک لفظ میں بیان کرنا ہو تو وہ ہے "حُسن"۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حُسنِ حقیقی کی، جو انسان کا اِلٰہ ہے، خلوص و محبّت کے ساتھ پرستش و عبادت کرنا، حُسنِ فکر و یقین کے ساتھ احسان و حُسنِ عمل کرنا اور زندگی کی حسین راہ پر چل کر اپنی حقیقی منزلِ مقصود پر پہنچ جانا جو حسن المآب ہے، جہاں اسے اہلِ حسن و سرور کی صحبت و رفاقت، لذّت و مسرّت کے سامان اور سب سے بڑھ کر اپنے اِلٰہ کا دیدار و رضوان حاصل ہو گا، حقیقی کامیابی ہے۔ مختصر یہ کہ انسان کا صاحبِ حسن و سرور بننا ہی اس کی حقیقی کامیابی ہے اور صاحبِ حُسن و سرور ہی کے لیے جنّت تیار کی گئی ہے، جہاں ہر قسم کی نعمتوں کے علاوہ انسان کو اپنے اِلٰہ کی دید میسّر آئے گی۔[۲۰۳]

(۲۰) **خوف و حُزن** : اسلام کے فلسفۂ حیات کے دو اہم پہلو یہ ہیں: ایک یہ کہ حیاتِ انسانی میں قُدرت کا قانونِ مکافاتِ عمل جاری و ساری ہے۔ دوسرا یہ کہ حسنِ یقین (ایمان) اور حسنِ عمل (یعنی احسان و حسنہ یا خیر و نیکی یا عملِ صالح) سے حیاتِ معنوی میں حسن و نور اور اطمینان و سرور پیدا ہوتا ہے جبکہ کُفر و تکذیب اور اعمالِ سُوء (یعنی جرم و گناہ، ظلم و عدوان، فسق و فجور یا شر و بدی وغیرہ) سے حیاتِ معنوی میں قبُح، تاریکی اور خوف و حزن پیدا ہوتا ہے۔ حسن سے سرُور اور سرُور سے دل میں ٹھنڈک پیدا ہوتی ہے جو اصلِ ثواب و کامیابی ہے۔ اس کے برعکس خوف و حُزن سے دل میں اضطراب اور بے قراری کی آگ لگ جاتی ہے۔ یہ آگ ہی اصلِ عذاب و گناہ اور محرومی و ناکامی ہے۔

خوف کے لُغوی معنی ہیں: قرائن و شواہد سے کسی آنے والے خطرے کا اندیشہ کرنا، جیسا کہ

رجاء اور طمع کا لفظ قرائن و شواہد کی بنا پر کسی فائدے کی توقع پر بولا جاتا ہے۔ خوف کی ضد امن ہے اور یہ امورِ دُنیوی و اُخروی دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔[۲۰۴]

اللہ تعالیٰ کے خوف کی نوعیت اس وفا شعار بیوی کے خوف جیسی ہے جو اسے اپنے محبّ، وفا شعار اور پیارے شوہر سے ہوتا ہے، کہیں کوئی غلط قدم شوہر کو ناراض کر کے اسے اس کی محبّت و رحمت سے محروم نہ کر دے۔ خوفِ الٰہی محبّت کی ضمنی پیداوار ہے۔

حُزن : الحُزن و الحَزن کے معنی زمین کی سختی کے ہیں۔ نیز غم کی وجہ سے جو بے قراری سی طبیعت کے اندر پیدا ہو جاتی ہے، اسے بھی حُزن یا حزن کہا جاتا ہے۔ اس کی ضد فرح ہیں۔[۲۰۵] خوف و حزن دراصل امن و طمانیت کی ضد ہیں۔ امن و طمانیت سے دل میں سرور انگیز ٹھنڈک رہتی ہے[۲۰۶] جب کہ خوف و حزن سے اس میں اذیت ناک آگ لگ جاتی ہے جو اس کو اس طرح محیط ہو جاتی ہے کہ اس سے چھٹکارا پانا محال ہو جاتا ہے۔[۲۰۷] خوف و حزن علامت ہے انسان کے ناکام و نامراد اور دوزخی ہونے کی۔ قرآنِ مجید کی رُو سے اللہ کے دوستوں (اولیاء اللہ) کو خوف و حزن نہیں ہوتا۔[۲۰۸] یعنی وہ مطمئن ہوتے ہیں اور یہ حالت کامیاب انسانوں اور اہلِ جنّت کی علامت ہے۔[۲۰۹]

(۲۱) طمانیّت و مسرّت :[۲۱۰] خوف و حُزن کی ماہیّت آگ یا تپش و سوزش اور طمانیت و مسرّت کی ماہیّت ٹھنڈک ہے۔ کفر و شرک، ظلم و شر یا جرم و گناہ کا حاصل آتشِ خوف و حزن ہے جو قلب کو محیط ہو جاتی ہے اور یہ اصلِ عذاب ہے۔ اس کے برعکس ایمان و اعمالِ صالحہ یا خیر و حسنہ، احسان و عدل سے قلب کو ایسی ٹھنڈک پہنچتی ہے جس سے وہ مطمئن ہو جاتا ہے۔ یہ ٹھنڈک کمیّت و کیفیّت میں زیادہ اعلیٰ ہو تو اسے مسرّت یا سرور یا جمالیاتی حظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قلب اس اعتبار سے اخلاقی و روحانی اقدار یا خیر و شر کے جانچنے کا ایک سچّا اور عالم گیر معیار ہے۔ اس معیار کے ذریعے انسان یہ معلوم کر سکتا ہے کہ وہ نیک و صالح ہے یا گنہگار و طالح۔ اگر اس کا نفس مطمئن ہے تو وہ نیک و صالح، ولی اللہ اور وارثِ جنّت ہے لیکن اگر اس کا قلب آتشِ خوف و حزن کی وجہ سے مضطرب و بے قرار ہو تو وہ بدکار و گناہگار، اور اہلِ دوزخ میں سے ہے۔

یہاں اس امر کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ طمانیت قلب کی موت نہیں، جیسا کہ ایک مکتبِ فکر کا خیال ہے بلکہ یہ اس کی حیاتِ محض ہے۔ اس مکتبِ فکر کے نزدیک دل مطمئن ہو جائے تو اس میں ارتقا کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے اور اس کا نتیجہ زندگی کے جمود و تعطّل کی صورت میں نکلتا ہے۔

یہ زبردست منطقی مغالطہ ہے، حالانکہ صورتِ حال بالکل اس کے برعکس ہے۔ تخلیقی فعلیّتوں اور تعمیری کاموں کے لیے طمانیتِ قلب ایک لازمی پیش شرط ہے۔ قلب مطمئن ہو تو انسان کی عقلِ سلیم اور فکر صالح ہونے کے ساتھ ان کی فعلیّت زیادہ، کارکردگی بہتر اور جہت دُرست ہو جاتی ہے۔

حواشی و تشریحات

(۱) امام راغب اصفہانی : مفردات ، بذیل مادہ وق ی۔

(۲) بحوالہ ترجمان القرآن ، ۱ : ۲۰۸۔

(۳) البقرہ ۲ : ۲

(۴) البقرہ ۲ : ۴

(۵) البقرہ ۲ : ۱۹۴

(۶) آل عمران ۳ : ۱۵، ۱۳۳، ۱۷۲، ۱۹۸ و بمواضع کثیرہ۔

(۷) آلِ عمران ۳ : ۷۶ و بمواضع کثیرہ۔

(۸) الطلاق ۶۵ : ۱۰

(۹) البقرہ ۲ : ۲۱

(۱۰) الانفال ۸ : ۴۳

(۱۱) الحجر ۱۵ : ۴۶، ہود ۱۱ : ۴۸

(۱۲) الحشر ۵۹ : ۳

(۱۳) الشعراء ۲۶ : ۸۹

(۱۴) الفجر ۸۹ : ۲۷

(۱۵) الانعام ۶ : ۱۲۸

(۱۶) الواقعہ ۵۶ : ۲۵ ببعد، مریم ۱۹ : ۶۲

(۱۷) النسآء ۴ : ۹۴

(۱۸) البقرہ ۲ : ۲۰۸

(۱۹) الحجرات ۴۹ : ۱۴

(۲۰) البقرہ ۲ : ۱۳۱

(۲۱) آل عمران ۳ : ۱۹

(۲۲) الروم ۳۰ : ۵۳

(۲۳) آل عمران ۳ : ۶۷ نیز الحج ۲۲ : ۷۸

(۲۴) الروم ۳۰ : ۳۱-۳۲

(۲۵) النحل ۱۶ : 112

(۲۶) التوبہ ۹ : ۴۷

(۲۷) القلم ۶۸ : ۳۵

(۲۸) الاحزاب ۳۳ : ۴۰

(۲۹) المائدہ ۵ : ۳

(۳۰) الروم ۳۰ : ۳۰

(۳۱) الروم ۳۰ : ۳۱-۳۲

(۳۲) الفاتحہ ۱ : ۲

(۳۳) الانفطار ۸۲ : ۶ ، الشوریٰ ۴۲ : ۱۹

(۳۴) الانعام ۶ : ۱۲-۵۴- ۱۳۳ ، المؤمن ۴۰ : ۷۰

(۳۵) النحل ۲۷ : ۷۷، یونس ۱۰ : ۵۷

(۳۶) الانبیآء ۲۱ : ۱۰۷

(۳۷) الروم ۳۰ : ۳۶، نیز کتب لغات مثلاً مفردات ، لسان ، بذیل مادّہ رح م۔

(۳۸) القسطلانی : ارشاد الساری ، جلد اوّل ، بحث کتاب الایمان۔

(۳۹) اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ ، پنجاب یونیورسٹی لاہور ، ۲ : ۶۷۰ تا ۶۷۲۔

(۴۰) مفردات ، بذیل مادّہ أم ن۔

(۴۱) البقرہ ۲ : ۲۸۵۔

(۴۲) المائدہ ۵ : ۶۹، الکہف ۱۸ : ۸۸، الفرقان ۲۵ : ۷۰ و بمواضع کثیرہ۔

(۴۳) المائدہ ۵ : ۶۹ ، الانعام ۶ : ۴۸، مریم ۱۹ : ۶۰، العصر ۱۰۳ : ۲ تا ۳

(۴۴) انگریزی زبان میں کہتے ہیں : (Man is a social animal)

(۴۵) مفردات ، بذیل مادّہ ان س۔

(۴۶) الاعراف ۷ : ۱۷۲-

(۴۷) صوری حُسن = غافر ۴۰ : ۶۴، معنوی حُسن = التّین ۹۵ : ۴، نیز السّجدہ ۳۲ : ۷

(۴۸) النّحل ۱۶ : ۷۸، المومنون ۲۳ : ۷۸

(۴۹) آلِ عمران ۳ : ۸، الانسان ۷۶ : ۳

(۵۰) النّحل ۱۶ : ۵۶، ۹۳، الاسرآء ۱۷ : ۳۶، ۳۴، الصّافات ۳۷ : ۲۴، التّکاثر ۱۰۲ : ۸-

(۵۱) الاسراء ۱۷ : ۷۰

(۵۲) الاعراف ۷ : ۱۱، الاسراء ۱۷ : ۶۱، الکہف ۱۸ : ۵۰

(۵۳) الرّحمٰن ۵۵ : ۴، العلق ۹۶ : ۲

(۵۴) المائدہ ۵ : ۳۲

(۵۵) الانعام ۶ : ۱۵۲، المؤمنون ۲۳ : ۶۲

(۵۶) الانعام ۶ : ۱۶۴، الاسراء ۱۷ : ۱۵، فاطر ۳۵ : ۱۸

(۵۷) ہود ۱۱ : ۷

(۵۸) مریم ۱۹ : ۶۶، ۶۷، القیامۃ ۷۵ : ۳

(۵۹) النّحل ۱۶ : ۹۶، ۹۷، العنکبوت ۲۹ : ۷، فصلت ۴۱ : ۲۷

(۶۰) الاسراء ۱۷ : ۷۲

(۶۱) ہود ۱۱ : ۲۳، العنکبوت ۲۹ : ۲۸ وبمواضع کثیرہ۔

(۶۲) آلِ عمران ۳ : ۱۲۰، النسآء ۴ : ۵۵، ۹۳، ۹۷، ۱۱۵، ۱۲۱، ۱۴۰ وبمواضع کثیرہ۔

(۶۳) لقمان ۳۱ : ۲۸

(۶۴) الحجرات ۴۹ : ۱۳

(۶۵) البقرہ ۲ : ۱۶۳، الکہف ۱۸ : ۱۱۰ وبمواضع کثیرہ۔

(۶۶) العصر ۱۰۳ وبمواضع کثیرہ۔

(۶۷) الھمزہ ۱۰۴ : ۶ ببعد۔

(۶۸) البقرہ ۲ : ۳۶، الاعراف ۷ : ۲۴ وبمواضع کثیرہ۔

(۶۹) النّحل ۱۶ : ۷۸، الاسراء ۱۷ : ۳۶، المومنون ۲۳ : ۷۸

(۷۰) الزبیدی اسے اصح قول قرار دیتا ہے (تاج العروس، بذیل مادّہ ال ہ)، نیز المہائمی : تبصیر الرحمٰن، تفسیر سورۃ الفاتحہ۔

(۷۱) زہیر بن ابی سُلمٰی کا شعر ہے :

فلا تکتمن اللہ ما فی نفوسکم

لیخفٰی ومہما یکتم اللہ یعلم (المعلّقات، معلّقہ زہیر)

ترجمہ : جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے اسے ہرگز نہ چھپاؤ، کیونکہ خواہ کتنا ہی چھپایا جائے اللہ اسے ضرور جان لے گا۔

(۷۲) اصل میں ہے : وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا (الاعراف ۷ : ۱۷۹)۔

(۷۳) اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى (طٰہٰ ۲۰ : ۸)

(۷۴) یہ معانی اس آیت سے اخذ کیے ہیں : اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰي عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰي سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰي بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ۭ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (الجاثیہ ۴۵ : ۲۳)۔

ترجمہ : پھر کیا تم نے اس شخص کی حالت پر غور کیا جس نے اپنی خواہش کو اپنا اِلٰہ بنا رکھا ہے اور اللہ نے (اس وجہ سے اس کے) علم کے باوجود اسے گمراہی میں پھینک دیا اور اس کے کانوں اور قلب پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ اللہ کے بعد اب کون ہے جو اسے ہدایت دے ؟

(مصنّف نے مفردات القرآن سے معانی و مفاہیم اخذ و استنباط کرنے کا ایک فارمولا قرآن مجید ہی کی مدد سے تیار کیا ہے، جس کے لیے دیکھیے رسالہ قرآن کا لغوی فارمولا۔ (غیر مطبوعہ)۔

(۷۵) البقرہ ۲ : ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۵، الاعراف ۷ : ۵۹، ۶۵، ۷۳، ۸۵، ۱۸۵ وبمواضع کثیرہ۔

(۷۶) النّاس ۱۱۴ : ۳

(۷۷) القصص ۲۸ : ۸۸

(۷۸) مریم ۱۹ : ۸۱

(۷۹) الانعام ۶ : ۱۰۰

(۸۰) الصّٰفّٰت ۳۷ : ۱۵۸

(۸۱) النّحل ۱۶ : ۵۷، الانعام ۶ : ۱۰۰

(۸۲) الحجّ ۲۲ : ۳۷

(۸۳) یوسف ۱۲ : ۴۰

(۸۴) النحل ۱۶ : ۲۲

(۸۵) الزخرف ۴۳ : ۸۴

(۸۶) القصص ۲۸ : ۸۸

(۸۷) المؤمنون ۲۳ : ۱۱۷، الانبیآء ۲۱ : ۲۴

(۸۸) الحج ۲۲ : ۷۳

(۸۹) ہود ۱۱ : ۱۰۱

(۹۰) الانبیآء ۲۱ : ۹۸، ۹۹

(۹۱) الانبیآء ۲۱ : ۲۲

(۹۲) المؤمنون ۲۳ : ۹۱

(۹۳) Zoroastrianism قبل اسلام ایران کے اس دین کا بانی زرتشت (Zarathustra - Zoroaster) تھا، جس کا زمانہ تقریباً ایک ہزار قبل مسیح کا مانا جاتا ہے۔ Webster's Collegiate Dictionary) طبع سوم لندن ۱۹۲۸ء بذیل مادہ)۔

(۹۴) التوبہ ۹ : ۳۰

(۹۵) المائدہ ۵ : ۱۷

(۹۶) المائدہ ۵ : ۷۳

(۹۷) النسآء ۴ : ۱۷۱

(۹۸) المائدہ ۵ : ۱۶

(۹۹) النحل ۱۶ : ۵۱

(۱۰۰) الانعام ۶ : ۱۰۱

(۱۰۱) مریم ۱۹ : ۸۹، ۹۲

(۱۰۲) المائدہ ۵ : ۱۸

(۱۰۳) البقرہ ۲ : ۱۱۱

(۱۰۴) البقرہ ۲ : ۹۴

(۱۰۵) آل عمران ۳ : ۲۴

(۱۰۶) التوبہ ۹ : ۳۱

(۱۰۷) الانعام ۶ : ۹۱

(۱۰۸) اُردو دائرہ معارفِ اسلامیہ، بذیل مادہ اللہ، ۳ : ۱۴۴ تا ۱۴۸۔

(۱۰۹) الاعراف ۷ : ۱۷۲

(۱۱۰) التوبہ ۹ : ۳۱، الحجر ۱۵ : ۹۶، قٓ ۵۰ : ۲۶ وبمواضع کثیرہ۔

(۱۱۱) الفرقان ۲۵ : ۴۳، الجاثیہ ۴۵ : ۲۳

(۱۱۲) الشمس ۹۱ : ۱۰

(۱۱۳) حدیثِ طیبہ۔

(۱۱۴) القصص ۲۸ : ۳۸

(۱۱۵) الزمر ۳۹ : ۳

(۱۱۶) البقرہ ۲ : ۳۶، الاعراف ۷ : ۲۴ وبمواضع کثیرہ۔

(۱۱۷) الاعراف ۷ : ۳۱، الانبیآء ۲۱ : ۹، الاسرآء ۱۷ : ۲۶، ۲۷۔

(۱۱۸) التوبہ ۹ : ۳۴

(۱۱۹) Shy

(۱۲۰) Idle

(۱۲۱) النسآء ۴ : ۳۷، آل عمران ۳ : ۱۸۰، الحشر ۵۹ : ۹، التغابن ۶۴ : ۱۶۔

(۱۲۲) البقرہ ۲ : ۲۶۲، الرعد ۱۳ : ۲۲، البقرہ ۲ : ۲۱۹ وبمواضع کثیرہ۔

(۱۲۳) Existentialism

(۱۲۴) Existential philosophy

(۱۲۵) الفرقان : الفرقان ۲۵ : ۱

(۱۲۶) قولِ فیصل : الطارق ۸۶ : ۱۳

(۱۲۷) تخلیق بالحق : الانعام ۶ : ۷۳ وبمواضع کثیرہ۔

(۱۲۸) وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ - البقرہ ۲ : ۳۱

(۱۲۹) Personality

(۱۳۰) الیغو Ego

(۱۳۱) انا I-am-ness

(۱۳۲) خودی Self

(۱۳۳) السجدہ ۳۲ : ۹

(۱۳۴) الاسراء ۱۷ : ۳۶

(۱۳۵) Instincts

(۱۳۶) Modus operandi

(۱۳۷) النّاس ۱۱۴ : ۴ تا ۶ ، یوسف ۱۲ : ۵۳

(۱۳۸) الانعام ۶ : ۴۳ ومواضع کثیرہ۔

(۱۳۹) حزب الشیطٰن : المجادلہ ۵۸ : ۱۹

(۱۴۰) نفسِ امارہ : یوسف ۱۲ : ۵۳

(۱۴۱) نفسِ لوّامہ : القیامۃ ۷۵ : ۲۔

(۱۴۲) قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل کو قانونِ جزآ و ثواب بھی کہتے ہیں۔

(۱۴۳) شرِ مآب : صٓ ۳۸ : ۵۵

(۱۴۴) نفسِ مطمئنّہ : الفجر ۸۹ : ۲۷ تا ۳۰

(۱۴۵) حُسنِ مآب : الرعد ۱۳ : ۲۹ ، یاحسن الماب ، آل عمران ۳ : ۱۴

(۱۴۶) اولیاء اللہ : یونس ۱۰ : ۶۲

(۱۴۷) عبادالرحمٰن : الفرقان ۲۵ : ۶۳

(۱۴۸) انعام یافتہ : الفاتحہ ۱ : ۷

(۱۴۹) کامیاب : فائزون : التّوبہ ۹ : ۲۰ ، المؤمنون ۲۳ : ۱۱۱ ومواضع کثیرہ ، نیز

(۱۵۰) دیکھیے مفلحون : البقرہ ۲ : ۵ ومواضع کثیرہ۔

یوم الدّین : البقرہ ۲ : ۱ : ۳

(۱۵۱) المائدہ ۵ : ۱۸

(۱۵۲) البقرہ ۲ : ۹۴ ، ۱۱۱

(۱۵۳) فاطر ۳۵ : ۱۸ ، الزّمر ۳۹ : ۷

(۱۵۴) الطور ۵۲ : ۲۱ ، المدثّر ۷۴ : ۳۸ ، البقرہ ۲ : ۸۶

(۱۵۵) شفاعت : البقرہ ۲ : ۵۵ ، الانعام ۶ : ۵۱ ، ۷۰ ومواضع کثیرہ۔

(۱۵۶) الاسراء ۱۷ : ۷۲

(۱۵۷) القیامۃ ۷۵ : ۲۳

(۱۵۸) الفجر ۸۹ : ۲۹

(۱۵۹) طٰہٰ ۲۰ : ۷۴ ، الاعلیٰ ۸۷ : ۱۳

(۱۶۰) الحجر ۱۵ : ۲۹ ، صٓ ۳۸ : ۷۲

(۱۶۱) البقرہ ۲ : ۲۵۵ ، آل عمران ۳ : ۲

(۱۶۲) الزّمر ۳۹ : ۴۲

(۱۶۳) الملک ۶۷ : ۲

(۱۶۴) الدّخان ۴۴ : ۵۶

(۱۶۵) الفرقان ۲۵ : ۱۴

(۱۶۶) طٰہٰ ۲۰ : ۷۴ ، الاعلیٰ ۸۷ : ۱۳

(۱۶۷) دیکھیے کُتبِ لُغت ، مثلاً مفردات ، لسّان ، اقرب الموارد ، لین ، تاج العروس ، ابن فارس بذیل مادّہ و ح ی۔

(۱۶۸) البقرہ ۲ : ۹۷

(۱۶۹) موضوع مذکور کے علاوہ دیکھیے کتبِ لُغت ، خصُوصًا مفردات ، لسّان اور لین۔

(۱۷۰) الانعام ۶ : ۱۹

(۱۷۱) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : اے پیغمبر! لوگوں سے کہہ دو اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو پھر میری پیروی کرو ، اللہ تم سے محبّت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ تو بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے (آلِ عمران ۳ : ۳۱)۔

(۱۷۲) Complete aesthetic-cultural revolution - اس سے مراد مکمل موضوعی و معروضی انقلاب ہے۔ موضوعی انقلاب کا مطلب ہے : نفسیاتی انقلاب ، یعنی نظری و فکری اور اعتقادی و جذباتی انقلاب۔ مکمل معروضی انقلاب سے مُراد زندگی کے

ہر شعبے میں انقلاب ہے۔

(۱۷۳) دباؤ : Stresses ۔نفسیاتی دباؤ کئی طرح کے ہوتے ہیں، مثلاً احساسی وجذباتی، خشیتی و حُزنی اور تضاداتی و اضطرابی وغیرہ۔ دباؤ زندگی کا بارِگراں بن جائیں تو اسے اجیرن بنا دیتے ہیں۔

(۱۷۴) Psycho-social revolution

(۱۷۵) اس موضوع کے مآخذ کتاب وسُنّت ہیں۔

(۱۷۶) Revolution

(۱۷۷) دیکھیے سورۃ العصر ۱۰۳ : ۱ تا ۳

(۱۷۸) الانفال ۸ : ۵۳-۵۴

(۱۷۹) النّحل ۱۶ : ۱۱۲ ، ھود ۱۱ : ۸۴ ببعد۔

(۱۸۰) "کُفرانِ سیاسی" کی مثال فرعون اور اس کی قوم میں ملتی ہے۔ دیکھیے سورۃ البقرہ، آل عمران، الاعراف و دیگر سورتیں۔

(۱۸۱) "کُفرانِ معاشی" کی مثالوں کے لیے دیکھیے النّحل ۱۶ : ۱۱۲، ہود ۱۱: ۸۴ تا ۹۴۔

(۱۸۲) النّحل ۱۶ : ۱۱۲ ، ہود ۱۱ : ۸۴ ، الانعام ۸ : ۵۳ ببعد۔

(۱۸۳) بخاری ومسلم ، بحوالہ مشکوٰۃ، کتاب الایمان، ح ۱۔

(۱۸۴) Aesthetic pleasure

(۱۸۵) انفاق : اس کے لغوی اور اصطلاحی معانی کیلیے دیکھیے کتبِ لغت خصوصًا مفردات اور لسان العرب بذیل مادّہ ن ف ق۔

(۱۸۶) الحشر ۵۹ : ۷

(۱۸۷) البقرہ ۲ : ۲۱۹

(۱۸۸) بخل : راغب اصفہانی، ابن فارس، لین بذیل مادّہ ب خ ل۔

(۱۸۹) الشمس ۹۱ : ۹ ببعد۔

(۱۹۰) سلطان : الرحمٰن ۵۵ : ۳۳

(۱۹۱) الانعام ۶ : ۴۳ ، ۱۳۷ ، الانفال ۸ : ۴۸ وبمواضع کثیرہ۔

(۱۹۲) مفصل بحث کے لیے دیکھیے مصنّف کا رسالہ "ابلیس کا جمالیاتی فریب"۔

(۱۹۳) حزب الشیطان : المجادلۃ ۵۸ : ۱۹

(۱۹۴) المائدہ ۵ : ۵۶، المجادلۃ ۵۸ : ۲۲

(۱۹۵) مفردات ولسان ، بذیل مادہ ش ک ر و ک ف ر۔

(۱۹۶) لقمٰن ۳۱ : ۱۲

(۱۹۷) النّحل ۱۶ : ۱۱۲ ، ہود ۱۱ : ۹۴ ببعد۔

(۱۹۸) معروف ومنکر : دیکھیے مفردات ، لسان العرب ، ابن فارس اور لین۔ بذیل مادّہ ع ر ف و ن ک ر۔

(۱۹۹) احمد در مشکوٰۃ ، کتاب الایمان ، ح ۴۔

(۲۰۰) کتبِ حدیث میں اس موضوع پر مستقل باب ہے۔ دیکھیے مشکوٰۃ ، کتاب الآداب ، باب الأمر بالمعروف۔

(۲۰۱) کامیابی کے لیے قرآنِ مجید عمومًا دو الفاظ استعمال کرتا ہے : فوز اور فلاح ۔الفوز کے معنی سلامتی کے ساتھ بھلائی حاصل کرنے کے ہیں (مفردات ، بذیل مادّہ ف و ز)۔
قرآن مجید میں ہے : ذلك الفوز الكبير (البروج ۸۵ : ۱۱): یہی بڑی کامیابی ہے۔
فلاح (مادّہ ف ل ح) : فلاح کے معنی کامیابی اور مراد پانے کے ہیں۔ ہر دو قسم دُنیوی و اُخروی۔ قرآنِ حکیم اسے عمومًا دونوں معنوں میں استعمال کرتا ہے۔
قرآن مجید میں ہے : اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (المجادلۃ ۵۸:۲۲): سُن رکھو! اللہ کی جماعت ہی کامیاب ہونے والی ہے، لیکن کافر فلاح پانے یا کامیابی حاصل کرنے والے نہیں ہیں۔ (المؤمنون ۲۳ : ۱۱۷)۔ سورۃ الشمس میں اس لفظ کے خود ہی معنی بتا دیے ہیں : قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا (الشمس ۹۱ : ۹ ، ۱۰) : جس نے تزکیہ کر لیا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اسے گاڑ دیا (یعنی نفس کی نشوونما نہ کی) وہ ناکام ونامراد ہوا (مفردات بذیل مادّہ ف ل ح)۔

(۲۰۲) Semitic Religions

(۲۰۳) اس موضوع کی تیاری میں قرآن مجید کے علاوہ کُتبِ لغت سے بھی مدد لی گئی ہے خصوصًا مفردات اور لسان۔

(۲۰۴) خوف : مفردات ، بذیل مادہ خ و ف۔

(۲۰۵) حزن : مفردات ، بذیل مادہ ح ز ن۔

(۲۰۶) سرور انگیز ٹھنڈک : قرآنِ مجید نے اس کے لیے "قُرَّةَ اَعْیُن" (آنکھوں کی ٹھنڈک) کی تعبیر اختیار کی ہے۔ دیکھیے الفرقان ۲۵ : ۷۴ ، السجدہ ۳۲ : ۱۷۔

(۲۰۷) الھمزہ ۱۰۴ : ۶ تا ۹۔

(۲۰۸) اولیاء اللہ: یونس ۱۰ : ۶۲۔

(۲۰۹) نفسِ مطمئنّہ : الفجر ۸۹ : ۲۷ تا ۳۰۔

(۲۱۰) طمانیّت و مسرّت کے لیے دیکھیے قرآن مجید کے علاوہ خصوصاً لسان العرب ، لین اور ابنِ فارس ، بذیل مادہ ط م ن اور س ر ر۔

تاریخی پس منظر

نبیؐ کا تاریخ سے گہرا تعلّق ہوتا ہے ، کیونکہ ایک تو وہ تاریخ کی جہت درست کرنے کے لیے مبعوث ہوتا ہے اور دوسرے وہ اللہ تعالیٰ کی برگزیدہ و منتخب شخصیّتوں کے سلسلے کی ایک کڑی ہوتا ہے۔ جہاں تک پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کی شخصیت کا تعلّق ہے ، وہ "مکمّل تاریخ" کی آئینہ دار ہے ، کیونکہ ایک تو آپؐ اس سلسلۂ نبوّت کی آخری کڑی ہیں اور آپؐ کا اعجازِ نبوّت قرآنِ حکیم ، تحریف اور دست بردِ زمانہ سے محفوظ ہے اور دوسرے یہ کہ قرآنِ حکیم کے عقاید و اصولؔ اوامر و نواہی اور ہدایات و نوامیس فطری اور سچّے ہیں۔ فطری اس اعتبار سے کہ ایک تو وہ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے ہیں ، جو فاطرِ ہستی ہے اور دوسرے وہ ایسے ہیں جیسے فطرتِ انسانی چاہتی ہے۔ سچّے اس لحاظ سے کہ وہ تحریفات سے محفوظ ، اپنی اصل شکل صورت میں کلامِ الٰہی میں محفوظ ہیں۔ چنانچہ ان صفات و خُصُوصیّات کی وجہ سے اسلامی عقاید و نوامیس ہیں تمام وضعی و غیر فطری عقاید و نوامیس پر غالب آجانے کی استعداد پائی جاتی ہے اور اس بنا پر وہ مستقبل میں ہمیشہ "قطب نُما" کا کردار ادا کرتے رہیں گے۔ غالباً اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو "شاہد" کہا ہے :

"اے نبیؐ! ہم نے تمھیں شاہد اور خوشخبری دینے والا اور متنبہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے[۱]۔"

اور آپؐ کی اُمّت کو بھی اسی لقب سے ملقّب کیا ہے :

"اور اسی طرح ہم نے تم کو امّتِ معتدل بنایا ہے تاکہ تم بنی نوعِ انسان پر شاہد رہو اور پیغمبرِ (اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم) تم پر شاہد رہیں[۲]۔"

بہر حال اس "شاہدِ تاریخی" کی شخصیّت کا مطالعہ کرنے سے پہلے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم اس عہد کا جائزہ لیں ، جس میں آپؐ کا ظہور ہُوا۔ اللہ تعالیٰ نے اس عہد سے متعلّق جو بات کہی ہے ، وہ انتہائی مختصر ، سچّی اور جامع ہے کہ واقعی دریائے معانی کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے :

"بحر و بر یعنی دنیا کے ہر گوشے میں فساد برپا ہو گیا ہے، لوگوں کے اپنے ہاتھوں کے کیے سے تاکہ ان کو، ان کے بعض اعمال کا مزہ چکھائے، شاید کہ وہ باز آئیں"۔[۳]

اس آیت کو اس کے وسیع ترین تناظر میں دیکھنے اور اسے جامع طور پر سمجھنے کی خاطر ہمیں پہلے فساد کے معنی و مفہوم سے آگاہی حاصل کر لینی چاہیے۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں: فساد کے معنی ہیں کسی چیز کا حدِ اعتدال سے تجاوز کر جانا، چاہے وہ افراط ہو یا تفریط۔ یہ اصل میں صلاح کی ضد ہے اور نفس، بدن اور اس چیز سے متعلق استعمال ہوتا ہے، جو حالتِ استقامت سے نکل چکی ہو۔[۴] صلاح کے معنی ہیں حالات و ظروف کا مستقیم و متوازن رہنا، لہٰذا فساد کے معنی ہیں توازن کا بگڑ جانا اور بدنظمی، بے ترتیبی اور انتشار کا پیدا ہو جانا۔[۵] لحمِ فاسد اس گوشت کو کہتے ہیں جو گل سڑ کر بدبودار اور بے کار اور مضرِ صحت ہو گیا ہو۔ معاشرۂ انسانی بھی ایک نامیاتی وجود ہے۔ لہٰذا اس میں فساد برپا ہو جانے کا مطلب یہ ہوا کہ اس میں زندگی و توانائی، جمال و جلال، وحدت و ہم آہنگی نہیں رہی، بلکہ ان کی جگہ اس میں جمود و تعطل، اضمحلال و انتشار، تضادات و تخالف، فتنہ و شر اور قبح و زشتی نے لے لی ہے۔ محولہ بالا آیتِ قرآنی کی رو سے معاشرۂ انسانی کی ایسی ہی حالت تھی، جب اللہ تعالیٰ نے اس کی اصلاح کے لیے پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ قرونِ مظلمہ[۶] کے معاشرۂ انسانی میں فساد نے جو مختلف اشکال و صور اختیار کر لی تھیں، ان کا قدرے تفصیل سے جائزہ لینے کی کوشش کی جاتی ہے :

(ا) مذہبی یا روحانی و اخلاقی حالت :

اس عہد کے بڑے ادیان یہ تھے : عیسائیت، یہودیت، مجوسیت، بدھ مت اور ہندو مت۔ عرب بت پرست ہونے کے باوجود اپنے آپ کو دینِ ابراہیمیؑ پر سمجھتے تھے۔ اگرچہ ان جملہ مذاہب کی اساس توحید تھی، لیکن ان میں شرک راہ پا گیا تھا اور ان کی الہامی کتابیں دست بردِ زمانہ سے محفوظ نہیں رہی تھیں۔ ان میں اس قدر تحریف ہو چکی تھی کہ اصل و نقل میں امتیاز کرنا ممکن نہ رہا تھا۔ اسلام کی رو سے شرک ظلم ہے۔ دلیل یہ ہے کہ اس سے انسان شعوری یا لاشعوری طور سے اللہ تعالیٰ کی خدائی میں غیر اللہ کو شریک مانتا ہے اور اس طرح اس کی حاکمیتِ مطلقہ کو چیلنج کرتا ہے۔ علاوہ بریں اللہ کے سوا غیر اللہ کو بھی اپنا اِلٰہ و ربّ مانتا ہے اور یہ سراسر ناانصافی، زیادتی یا ظلم ہے۔ شرک اس وجہ سے بھی ظلم ہے کہ ایسا کرنے سے انسان ایک تو

اپنے آپ کو دھوکا دیتا اور دوسرے اپنے آپ کو اپنے ارفع و قابلِ احترام مقامِ عبدیت سے نیچے گرا دیتا ہے۔[۷] نیز ایک سے زائد اِلٰہ و ربّ تسلیم کرنے سے انسان خود ہی اپنی شخصیت کو جو ایک "کُل" ہے، ایک سے زائد حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ نتیجتاً اس کا نشو و ارتقاء رُک جاتا ہے، اور اس کا سلسلہ شرک سے توبہ کیے اور عقیدۂ توحید کو اپنی زندگی کا جزوِ لاینفک بنائے بغیر جاری نہیں ہو سکتا۔

شرک سے معاشرے میں چار بڑی بدعتیں پیدا ہوتی ہیں : (۱) پیشوائیت (۲) طبقہ بندی (۳) بُت پرستی اور (۴) غیر فطری رسوم و قیود۔ چنانچہ مذاہبِ عالم کی تاریخ شاہد ہے کہ ان میں یہ سب بدعتیں اپنے انسانیت سوز نتائج و عواقب کے ساتھ پائی جاتی تھیں جن کی وجہ سے انسان کی دنیا میں اندھیرا چھایا ہُوا تھا اور اس اندھیرے میں رُوحِ انسانی اپنی راہ و منزل سے دُور خوف و حزن کی وادیوں میں بھٹکتی پھرتی تھی، اور اسے روشنی کی طلب و جستجو تھی۔ چونکہ اس عہد کی مذہبی حالت کا تفصیل سے جائزہ لینے کا یہ موقع نہیں، لہٰذا اس کے اہم پہلوؤں کی نشاندہی کی جاتی ہے :

(۱) انسان نے اللہ تعالیٰ کے سوا اپنے متعدد اِلٰہ اور ربّ بنا لیے تھے۔ نتیجتاً اللہ کے نام پر اس کی جگہ پیشوائیت نے لے لی تھی۔

(۲) بُت پرستی زمانے کا دستور بن گیا تھا۔

(۳) شرک و بت پرستی کی وجہ سے انسان ایک تو طرح طرح کی قلبی بیماریوں میں مبتلا ہو گیا تھا، دوسرے اس کی شخصیت پارہ پارہ ہو چکی تھی۔ نتیجتاً اس کی شخصیت کا نشو و ارتقاء رُک گیا تھا۔ تیسرے اس کا دل طمانیت سے محروم ہو کر خوف و حزن کا شکار ہو گیا تھا۔ اجتماعی طور پر وہ تضادات کا شکار ہو گیا تھا۔

(۴) علم و فن شرک و بت پرستی کا غلام بن گیا تھا۔

(۵) انسان کی جمالیاتی حس مفلوج ہو گئی تھی اور جمالیاتی ذوق بگڑ چکا تھا، نتیجتاً اس میں جمالیاتی اخلاقی اقدار کا شعور و احترام بہت کم رہ گیا تھا اور حلال و حرام، گناہ و ثواب اور خیر و شر کی تمیز کم سے کم ہو گئی تھی۔

(۶) اللہ تعالیٰ اور انسان میں بُعد کی خلیج بہت وسیع ہو چکی تھی جس کی وجہ سے انسان اس بھری دُنیا میں بھی اپنے آپ کو "تنہا" محسوس کرتا تھا اور یہ احساسِ تنہائی

خوف وحزن کا ناگ بن کر اس کی روح کو ڈستا رہتا تھا۔

(۷) علم وحکمت کی جگہ جہل وظلم اور ظنّیات و اوہام نے لے لی تھی۔ اگر علم کہیں تھا بھی تو اہلِ علم تضادات وتعصبات اور حسد وبُغض کے سبب اس سے لوگوں کو گمراہ کرنے اور ان کا استحصال کرنے کا کام لیتے تھے۔

(۸) کورانہ تقلید پرستی کا عام رواج تھا اور اس کے سبب انسان نے سمع وبصر اور عقل وفکر سے کام لینا چھوڑ دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس کی عادات وخصائل میں حیوانی عنصر غالب آگیا تھا۔

(۹) انسان اپنے مقامِ انسانیّت سے نیچے گر چکا تھا، نتیجۃً وہ اپنے حقیقی مقصدِ حیات کو بھول چکا تھا اور اسے نہ تو حقوق اللہ کا شعور رہا تھا اور نہ حقوق العباد کا۔

(۱۰) دینی ومذہبی عصبیّت اور دیگر عوامل کی وجہ سے انسان سعادت سے محروم ہو کر شقی القلب ہو گیا تھا، لہٰذا اس کا مجرم وگناہگار بن جانا ایک فطری امر تھا۔

(۱۱) چونکہ پیشوا شرک وبُت پرستی کے علمبردار اور راہ گم کردہ تھے، اس لیے ان کے متّبعین کا گُم راہ ہونا لازمی تھا اور یہ گمراہی عالمگیر تھی۔

(۱۲) الہامی کتابوں کے مُحرّف ہو جانے اور ان کی غلط وگمراہ کُن تاویلات کرنے کی وجہ سے لوگوں کا اعتماد پیشواؤں پر سے اُٹھتا جا رہا تھا اور وہ کسی نجات دہندہ کی آمد کے طلب گار و منتظر تھے۔

(۱۳) ایمانیّات ومعتقدات کا تعلّق عملی زندگی سے منقطع ہو جانے کے باعث انسان مُردہ ہو چکا تھا اور عبادت کی جگہ رسوم اور زُہد کی جگہ ریاکاری نے لے لی تھی۔

(۱۴) پیشوائیت نے لوگوں کا استحصال کرنے کی خاطر ان کو طرح طرح کے غلط اور بُرے رسم ورواج کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا، جس کے باعث وہ عذابِ عظیم میں مبتلا تھے۔

(۱۵) قرآنِ مجید کی رُو سے ہر دین کی بنیاد صلوٰۃ وزکوٰۃ کے نظاموں پر قائم کی گئی تھی لیکن اس عہد میں یہ دونوں نظام معطّل وبے کار ہو چکے تھے۔

مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ سے دُوری اور شرک وبُت پرستی کی وجہ سے انسانیت مرگِ مسلسل میں مبتلا تھی اور اسے اپنی نشاۃ ثانیہ کے لیے مسیحا نفس رحمۃ للعالمین کی طلب وجستجو تھی کہ آپؐ کا ظہور ہوا اور آپؐ نے احکامِ الٰہی کے مطابق دنیا سے شرک وبت پرستی کا استیصال کرنے اور

اس کے اندھیروں میں مستغرق عالمِ انسانیّت کو آفتابِ توحید سے روشن کرنے اور انسان کے لیے ایک حسین ومُنوّر جہانِ نو بنانے کی غرض سے تحریکِ اسلام کا پرچم بلند کیا۔

سیاسی حالت :

زندگی ایک نامیاتی کُل ہے۔ جس طرح وجود کے کسی عضو کو تکلیف پہنچتی ہے تو سارے اعضا وجوارح متاثّر ہوتے ہیں، اسی طرح زندگی کے کسی ایک شعبے میں کوئی فساد رونما ہو تو اس کا اثر اس کے دوسرے شعبوں پر بھی پڑتا ہے۔ چنانچہ شرک سے اجتماعی زندگی کے تمام شعبے متاثّر ہوتے ہیں۔ سیاسی شعبے میں شرک پیشوائیت کی معاونت سے فرعونیت کو جنم دیتا ہے۔ پھر فرعونیت اپنی قوّت وصولت اور پیشوائیت کی حمایت سے اپنے آپ کو الوہیّت وربوبیّت کے مقام پر متمکّن کرنے کی کوشش کرتی اور اس کی مدّعی بھی بن جاتی ہے۔ علاوہ بریں فرعونیت پروپیگنڈے کے زور اور پیشوائیت کی مدد سے احکامِ الٰہی کو عملی زندگی سے نکال کر صرف نظری زندگی میں مقید کر دیتی ہے اور اس طرح اپنی حاکمیت مطلقہ کو قائم کر دیتی ہے۔ اللہ صرف برائے نام رہ جاتا ہے اور حکم فرعونِ وقت کا چلتا ہے۔

شرک کی کوکھ سے پیشوائیّت وفرعونیّت کے علاوہ ہامانیّت وقارونیّت بھی پیدا ہوتی ہیں۔ ہامانیّت سے مراد امرا وعمائدینِ سلطنت کا طبقہ ہے جو فرعونیت کا پُشتیبان ہوتا ہے۔ یہ طبقہ فرعون کے نام پر لوگوں پر حکومت اور ان کا استحصال کرتا ہے۔ فرعونیّت وہامانیّت کے ہیولے میں تکاثُر کی صورت مضمر ہوتی ہے۔ "تکاثُر" ایک ایسی خطرناک قلبی بیماری ہے جس سے دوسری بہت سی قلبی بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں۔ مثلاً نمود پرستی، خوشامد پسندی، تکبّر وغرور، تعیّش پرستی اور سامراجیّت پسندی۔ یہ خواہشات نشے کی صُورت اختیار کر لیتی ہیں۔ چونکہ ان کی تکمیل دولت کے بغیر نہیں ہو سکتی، لہٰذا اس کے حصُول کے لیے قارُونیّت جنم لیتی ہے۔ قارُونیّت سے استحصالی قوتوں کا وہ طبقہ مُراد ہے جو عوام کا استحصال کر کے فرعونی وہامانی طبقوں کے علاوہ اپنے لیے بھی دولت فراہم کرتا ہے۔ قارونیّت علامت ہے سرمایہ داری، جاگیرداری، سرداری اور سودکاری وغیرہ نظاموں کی۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ اس عہد میں اقوامِ عالم میں فرعونی، ہامانی طرزِ حکومت قائم تھی جس کے نمایاں خدوخال یہ تھے :

(۱) خدائی آئین و قوانین کی جگہ فرعونی و ہامانی قوانین کی حکومت۔
(۲) مطلق العنانیت و استبدادیت۔
(۳) فرعونی، ہامانی اور قارونی طبقوں کی قانون سے مصئونیت۔
(۴) عوام کی سیاسی حقوق سے محرومی۔
(۵) حکومت و عوام میں مغائرت و بُعد۔
(۶) رعایا کی زبان بندی یا آزادئ تقریر و تحریر کا فقدان۔
(۷) نظریاتی تضاد و تخالف اور طبقاتی کش مکش۔
(۸) خانہ جنگیاں اور لڑائیاں۔
(۹) سامراجیت۔
(۱۰) ناراج۔
(۱۱) تاخت و تاراج، قزاقی و رہزنی اور اسیری و غلامی کا دستور۔
(۱۲) جان و مال اور عزت و ناموس کا عدمِ تحفظ۔
(۱۳) قومی، مذہبی، الوانی، لسانی، نسلی، قبائلی اور علاقائی عصبیتیں اور ان کے بھیانک نتائج و عواقب۔

معاشی حالت :

فرعونی معاشرے کی ایک پہچان یہ ہے کہ اس میں دولت کی تقسیم عدل و احسان کے اصول پر نہیں کی جاتی، لہٰذا اس کی گردش کا دائرہ سمٹ کر قریب قریب فرعونی، ہامانی اور قارونی طبقوں میں محدود ہو کر رہ جاتا ہے اور معاشرے کے باقی حصوں میں دولت کا بہاؤ انتہائی کم اور اس کی رفتار بے حد سست اور غیر متوازن ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ معاشرہ سقیم و مریض اور کمزور و مضمحل ہو جاتا ہے۔ اگرچہ فرعونی۔ ہامانی اور قارونی شان و شوکت کے نظر فریب پردوں کی وجہ سے وہ بظاہر ایسا دکھائی نہیں دیتا۔

فرعونی، ہامانی معاشرے کی دوسری پہچان یہ ہے کہ اس میں طبقاتی کش مکش پائی جاتی ہے اور اس کا نتیجہ بے کاری، احتیاج، افلاس، رہبانیت، ضمیر فروشی، قوم فروشی، فحاشی، تجارتی کردار کی گراوٹ کی صورت میں نکلتا ہے۔ اس کی تیسری پہچان یہ ہے کہ اس کی معیشت

کا انحصار سُود خواری، استحصال، احتکار و اکتناز اور اجارہ داری پر ہوتا ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں استحصال کی چار بڑی صورتیں تھیں: ایک غلامی، دوسری محصولات کی بھرمار، تیسری مضاربت اور چوتھی پیداوار کی ظالمانہ تقسیم۔ رومۃ الکُبریٰ میں غلام ہی زراعت، تجارت اور صنعت و حرفت کا کام کرتے تھے۔ گھر کا کام کاج بھی وہی کرتے تھے، حتّٰی کہ تعلیم و تربیت کی ذمہ داریاں بھی انہی کو تفویض کر دی گئی تھیں لیکن ان کے ساتھ انسانیت سوز سلوک کیا جاتا تھا۔ ان کی حالت پالتُو جانوروں سے بھی بدتر تھی۔ قریب قریب یہی حالت موروثی مزارعوں اور محنت کشوں کی تھی۔ انھیں آبائی پیشہ چھوڑنے یا اپنی مرضی کا پیشہ اختیار کرنے کی اجازت نہ تھی۔ جاگیردار ان کا حاکم، آقا اور ان داتا ہوتا تھا۔ ہندوستان میں بھی جاگیرداری نظام قائم تھا اور وہاں بھی لوگ اپنے آبائی پیشوں کو اختیار کرنے پر مجبور تھے اور اس کا نتیجہ ذات پات کی صورت میں نکلا۔ کسان اور ہر قسم کے محنت کش ارذل اور ان کی کمائی پر پلنے والے برہمن، جاگیردار، ساہوکار، راجے اشرف سمجھے جاتے تھے۔ قریب قریب یہی صورتِ حال دیگر اقوام و ممالک کی تھی۔ مختصر یہ کہ اس عہد میں دنیا کے تقریبًا تمام معاشروں میں مندرجۂ ذیل معاشی بیماریاں پھیلی ہوئی تھیں:

محنت کی تحقیر و تذلیل، آزادیِ کسب کا فقدان، پیداوار کی غیر منصفانہ تقسیم، اجارہ داری، وسائلِ پیداوار پر ناجائز تصرفات، غیر متوازن گردشِ دولت اور اس کے دائرے کی محدودیت، ظلم و استحصال، سودکاری، اِکتناز و احتکار، بخل و تکاثر، معاشی احتیاج، معاشی محکومی و غلامی، افلاس، بھوک، ننگ اور بنیادی معاشی حقوق کا فقدان۔

اگر یہ کہا جائے کہ اسلام کی انقلابی تحریک، رحمۃ للعالمینی کا ایک بنیادی مقصد معاشرے سے ان بیماریوں کو دُور کرنا تھا، تو یہ مبالغہ نہیں، حقیقت کا اعتراف ہوگا۔

ثقافتی حالت :

انسان کے اندر کی دنیا تاریک و پلید ہو تو اس کے باہر کی دنیا بھی تاریک و پلید ہوتی ہے چاہے ظاہرہ صفائی و تزیّنات سے وہ بظاہر ایسی دکھائی نہ دیتی ہو۔ اس دَور میں عالمِ انسانی شرک و بُت پرستی کی وجہ سے تاریک و پلید اور حسّی و عقلی روشنی، نیز توحید اور علم و حکمت کے نور سے محروم تھا۔ انسان کا ضمیر خوابیدہ، جمالیاتی حس مفلوج اور ذوق کثیف تھا۔ بالفاظِ دیگر وہ حُسن کور و کور ذوق ہو گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ثقافتی زندگی میں ایک تو حُسن و صدق اور طہارت و حیا کی قدروں کی

بے حد کمی تھی، دوسرے ان ثقافتی اقدار کا مفہوم بھی ایک حد تک بگڑ چکا تھا۔ ضرورتِ ایجاز کے پیشِ نظر اس عہد کی ثقافتی زندگی کے نمایاں پہلوؤں کی طرف مختصر اشارے کیے جاتے ہیں :

(۱) جیسا کہ سرمایہ داری و جاگیرداری نظاموں میں ہوا کرتا ہے، اس عہد کے عالمی معاشرے میں احترامِ انسانی کا معیار اخلاقی، روحانی اقدار کے بجائے مال و دولت تھا۔

(۲) جذبۂ تکاثر کی شدت کے باعث نام و نمود، سازوسامان اور تکلّفات و تعیّشات کو شرف و امارت اور ثقافتی زندگی کے لوازمات تصوّر کیا جاتا تھا۔

(۳) رقص و سرود، بادہ نوشی اور قماربازی ثقافتی زندگی کے چار اہم عناصر تھے۔

(۴) فحاشی اور لہو و لعب زمانے کا فیشن بن چکے تھے اور انھیں بڑائی، جدیدیّت اور ترقّی کی علامات خیال کیا جاتا تھا۔

(۵) عورت ثقافتی زندگی میں جنسی۔ جمالیاتی معروض تھی، لیکن سماجی زندگی میں وہ اپنے پیدائشی اور معاشرتی حقوق سے محروم تھی جو اسے بعد میں تحریک اسلام کی بدولت حاصل ہوئے۔

(۶) عورت کو مرد کی کنیز سمجھا جاتا تھا اور اس کا وظیفۂ حیات مرد کی خدمت کرنا تھا۔ چنانچہ مرد کا عورت پر جبر و تشدّد کرنا جائز اور اس پر عورت کا احتجاج کرنا گناہ تھا۔

(۷) عورت اشیائے صرف کی طرح منڈیوں میں بکتی تھی۔

(۸) بعض ممالک مثلاً ہندوستان میں بیوہ عورت کو منحوس اور ڈائن سمجھا جاتا تھا، لہٰذا اسے ستی ہونے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ اگر وہ ستی ہونے سے بچ جاتی تو اپنے بیگانے سبھی اس سے محترز و گریزاں رہتے تھے اور اسے ثقافتی زندگی میں حصّہ لینے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔

(۹) عورت اوّل تو حقِ وراثت سے محروم تھی، اگر کسی صورت میں اسے ورثہ مل بھی جاتا تو حق صرف اس کے شوہر یا ولی کو حاصل ہو جاتا۔

(۱۰) بچّوں کی تعلیم و تربیت کا مسئلہ صرف امرا کا تھا۔ عوام کو مفلوک الحالی اور جہالت کے سبب اس کا شعور نہ تھا۔

(۱۱) چونکہ نفاق، ریاکاری، تملّق، خوشامد، خودغرضی، عصبیّت، ضمیر فروشی، دروغ گوئی وغیرہ بیماریاں تاریخی۔ بامانی معاشرے کی پیداوار ہیں، لہٰذا اس عہد کے عالمی معاشرے

میں انھوں نے وبا کی صورت اختیار کر لی تھی۔

(۱۲) غلامی ثقافتِ انسانی کے چہرے پر ایک بدنما داغ تھی اور معاشرے کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہی تھی۔

مختصر یہ کہ جس طرح عموماً رات کی تاریکی میں مجرم وارداتیں کرتے ہیں اور فحاشی و عصمت فروشی کی محفلیں جمتی ہیں، اسی طرح ہیئتِ اجتماعیہ میں شرک و جہل کی تاریکی چھا جائے تو معاشرہ ہر قسم کے جرم و گناہ کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ قرونِ مُظلمہ میں انسانی معاشرہ ایسا ہی بن چکا تھا تو یہ مبالغہ نہیں، اعترافِ حقیقت ہوگا۔

حواشی و تشریحات

(۱) الاحزاب ۳۳ : ۴۵

(۲) البقرہ ۲ : ۱۴۳

(۳) الرّوم ۳۰ : ۴۱

(۴) مفردات ، بذیل مادّہ ف س د

(۵) لین ، تاج العروس ، بذیل مادّہ ف س د

(۶) قُرونِ مُظلمہ : Dark ages : قُرونِ وُسطیٰ۔

(۷) قرآن مجید نے یہ حقیقت اس طرح بیان کی ہے : ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۔ (التّین ۹۵ : ۵ بعد)

پہلا حصّہ

مکّی زندگی

- تلاشِ حق سے ظہورِ حق تک
- تحریکِ اسلامی انقلاب کی پُرخار راہوں میں
- ہجرت

باب : ۱

ولادتِ سعید، بچپن اور عُنفوانِ شباب

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

سید عبداللہ

سید عبدالمطلب

سید ہاشم

عبد مناف

قصیّ

شجرۂ نسب

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم   نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْم

باب : ۱

ولادتِ سعید سے عُنفوانِ شباب تک

مُنتظَرِ حیات و زمانہ کا ظہور (۹ ربیعُ الاوّل ۵۲ قبل ہجرت / ۲۰-۲۱ اپریل ۵۷۱ء) :

عالمِ انسانی اندھیروں میں ڈوب چکا تھا۔ کاروانِ زندگی اپنی راہ و منزل کو گُم کر کے بھول بھلیّوں میں سرگرداں تھا۔ چونکہ جرم و گناہ تاریکی ہی میں نشوونما پاتے اور کھُل کھیلتے ہیں، اس لیے حیاتِ انسانی مُجرموں، ظالموں اور استحصالی قوتوں کی محکوم و غلام تھی۔ کوئی فریاد رس و غم خوار نہ تھا۔ رہنما خود گم کردہ راہ تھے۔ تشتّت و افتراق اور تضاد و تخالف کی وجہ سے ہر گوشۂ حیات میں فساد برپا تھا۔ حیاتِ انسانی کا وجود شرک و بُت پرستی سے پارہ پارہ ہو چکا تھا۔ خوف و حُزن کے موت اَفگن سائے پھیل کر کُل حیاتِ انسانی کو محیط ہو چکے تھے۔ انسان تضادات کا شکار تھا اور ہر گوشۂ حیات میں ابتری و برہمی پھیل چکی تھی۔[1] رُوحِ انسانی بلکہ روحِ کائنات ہی مضطرب و پریشان اور آتشِ خوف و حُزن میں جل رہی تھی۔ اسے اس نجات دہندہ ہستی کا انتظار تھا جس نے رحمۃ للعالمین بن کر ظہور کرنا تھا۔ وہ عظیم ہستی جو مُنتظَرِ حیات و زمانہ تھی، انسانیّت ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام عوالم کے لیے رحمتِ تمام تھی، وہ ختم الرسل اور خاتم النّبیّین تھی اور اسے دنیا میں ایک عالمگیر و ہمہ گیر حسین و منوّر اور مثالی و لاثانی انقلاب لانا اور حسین و منور مثالی معاشرے کی تشکیل و تعمیر کرنا تھی جس سے تمام بنی نوعِ انسان نے بالخصوص ابد تک کے لیے مستفید ہونا تھا۔ وہ ہستی تاریخ ساز و عہد آفریں تھی، لہٰذا ربِّ رحیم و جمیل کی نگاہ میں تھی اور رُوحِ انسانیت کو صدیوں سے اس کا انتظار تھا۔

عمر ہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں[2]

آخر وہ ساعتِ سعید اور مبارک دن آ گیا جس کا زمانہ منتظر تھا۔ صحرائے عرب کی دوشیزہ سرزمین، بیت اللہ کے امین مکّہ معظمہ کا مقدّس شہر حضرت عبد المطلب کا گھر، واقعۂ فیل کا پہلا سال ربیع الاوّل کی ۹ تاریخ اور دوشنبہ کی صبحِ سعادت تھی[3] کہ صاحب جمال و جلال، نبیِ رحمت[4]، پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ظہور ہوا۔ (۹ ربیع الاوّل ۵۲ قبل ہجرت/ ۲۰-۲۱ اپریل ۵۷۱ء)۔

عالمِ انسانی پر قیامت کی طویل و سیاہ رات چھائی ہوئی تھی اور وہ جُرم و گناہ کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ رُشد و ہدایت کا آفتاب درخشاں طلوع ہوا اور انسان پر دُنیوی و اُخروی کامیابیوں کی راہ و منزل وا ہو گئی۔ اس طرح کاروانِ انسانیت نبیِ رحمت، پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کی قیادت و متابعت میں ترقی و کامیابی کی راہ پر گامزن ہو گیا۔ اس اعتبار سے یہ انسانیت کے مقدّر کی رات اور خیر و برکت میں ان گنت راتوں سے افضل و اعلیٰ تھی۔

آپؐ کے والد بزرگوار کا نام حضرت عبد اللہؓ اور والدۂ ماجدہ کا حضرت آمنہ تھا۔ شادی ہوئے تین ماہ ہی ہوئے تھے کہ حضرت عبد اللہ تجارت کے لیے بیرونِ ملک گئے اور واپسی پر مدینہ منوّرہ میں انتقال کر گئے۔ اس طرح دنیائے انسانیت کا دُرِّ یتیم یتیم پیدا ہوا۔ قبائلی نظام میں بالخصوص بھائی دست و بازو ہوتا ہے اور اولادِ نرینہ ہی پر خاندان کی قوّت و صولت، اثر و رسُوخ اور خوشحالی کا دار و مدار ہوتا ہے لہٰذا عرب میں نرینہ اولاد کو غیر معمولی اہمیّت حاصل تھی۔ آپؐ کو پدری و اخوی شفقت و قوّت سے محروم رکھنے میں اللہ تعالیٰ کی یہ حکمت نظر آتی ہے کہ آپؐ میں خود اعتمادی و توکّل بدرجۂ اتم پیدا ہو، نیز چونکہ قدرت تحریکِ اسلام سے متعلّق آپؐ سے والدین اور بھائیوں کے اختلاف کے پیدا ہو جانے کے امکان سے صرفِ نظر نہیں کر سکتی تھی، لہٰذا اس نے اس امکان ہی کو ختم کر دیا۔

حضرت عبد المطلبؓ آپؐ کے دادا جان تھے اور انھیں اپنے جواں مرگ بیٹے حضرت عبد اللہ سے بڑی محبت تھی۔ چنانچہ جب انھوں نے ان کے فرزندِ ارجمند یعنی آپؐ کی ولادتِ مبارک کی نویدِ جانفزا سُنی تو انتہائی خوش ہوئے، آپؐ کو یُمن و سعادت اور دعا کے لیے خانہ کعبہ میں لے گئے، ساتویں دن قربانی (عقیقہ) کی اور خویش و اقارب کو دعوت دی۔ حضرت عبد المطلب نے آپؐ کا نام محمّد رکھا جو قبائلی روایتِ تسمیّہ سے انحراف تھا۔ قریش چونکہ سخت روایت پسند تھے لہٰذا انھوں نے یہ نیا نام سُن کر تعجّب کا اظہار کیا۔ حضرت عبد المطلب نے کہا: میری خواہش ہے کہ میرا بچہ دنیا بھر کا ممدُوح بنے۔ ان کی آرزو الہامی تھی، آپؐ تو ممدوحِ الٰہ و انسانیت بن کر تشریف

لائے تھے، اس لیے بھی کہ قدرت نے آپؐ کو فطرتاً "احمد" بنایا تھا، یعنی اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرنا آپؐ کی طبیعت کا خاصّہ تھا اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو رحمۃ للعالمین بنا کر دنیا میں بھیجا تھا، اور آپؐ کو مقامِ محمُود پر فائز کرنا تھا۔ آپؐ کی والدہ ماجدہ نے رویائے صادقہ کی بنا پر آپؐ کا نام اُحمد رکھا۔ اس نام سے فاطرِ ہستی روزِ ازل سے آپؐ کو موسوم کر چکی تھی اور صحائفِ سماوی میں آپؐ کی بعثت کی پیش گوئی بھی موجود تھی۔[9]

طلاقت و شجاعت عربوں کے دو امتیازی اوصاف تھے جو صحرائی ماحول ہی میں پیدا ہو سکتے تھے، لہٰذا اہلِ مکّہ اپنے نومولود بچّوں کو رضاعت کے لیے بدویوں کے گھرانوں میں بھیج دیا کرتے تھے۔ طلاقت عربی زبان کا خاصّہ ہے۔ وہ صحرائی زبان ہے۔ صحرا میں پیدا ہوئی، وہیں پھلی پھولی، اس لیے وہ وضعیّت سے محفوظ رہی جو مدنیّت کا فطری تقاضا ہے۔ عربی کی دوسری خصوصیّت یہ ہے کہ اس کا قوام مادّوں سے تیار ہوا ہے اور مادّوں کا خمیر سچّے مشاہدہ اور تجربے سے اٹھا ہے، لہٰذا ہر مادّہ سچّے معانی و صورت (ملفوظی و مکتوبی) سے فطری انداز میں ممزوج ہے۔ چنانچہ اس وجہ سے بھی عربی لسانیاتی اعتبار سے تحریفِ معنوی سے محفوظ رہی ہے اور اس میں طلاقت و بلاغت بدرجۂ اتمّ موجود ہے اور اس میں دنیا کی کوئی زبان اس کی حریف نہیں ہو سکتی۔

عرب چونکہ طبعاً فطرت پسند تھے، اس لیے انھیں فطری صحرائی ماحول اور اس کی فطری و خالص زبان سے والہانہ محبّت تھی۔ چنانچہ اہلِ مکّہ کے صاحبِ استطاعت گھرانے اپنے بچّوں کی رضاعت صحرائی ماحول میں کراتے تھے تاکہ وہ بدویوں میں رہ کر خالص عربی زبان سیکھ کر فصیح البیان ہوں اور ان کی جسمانی و قلبی بنیادیں مضبوط و مستحکم ہو جائیں۔ علاوہ بریں فطرت کے قریب رہ کر بچّے ایک تو فطرت کے دلدادہ اور حقیقت پسند ہو جاتے تھے اور دوسرے ان کا قلبی نشو و ارتقاء صحرائی ماحول و روایات کے مطابق ہوتا تھا، جن کے چند خصائص کی نشان دہی کی جاتی ہے :

(۱) **توکّل پسندی :** صحرائی زندگی کا فطری تقاضا یہ ہے کہ انسان متوکّل ہو۔ بدوی زندگی (انسانی و حیوانی) کا انحصار گیاہ و نخل پر ہوتا ہے اور اس کے لیے بارش ضروری تھی، اور بارش کا انحصار فیضانِ قدرت پر تھا، لہٰذا بدوی طبعاً توکّل پسند ہوتے تھے۔

(۲) **جذبۂ مبارزت** : بدویت و مُبارزت لازم و ملزوم تھیں۔ صحرائی و قبائلی زندگی میں صیانتِ ذات اور بقا کے لیے مبارز بننا ناگزیر تھا اور اس کی خاطر اس عہد کے اعتبار سے مندرجۂ ذیل اوصاف پیدا کرنا ہر بدوی کے لیے لازمی تھا : (۱) جفاکشی و خود اعتمادی (۲) جُرأت و شجاعت (۳) جسمانی توانائی (۴) شہسواری (۵) فنِ حرب سے واقفیت، مثلاً اسلحہ کا استعمال اور جنگی چالوں سے واقفیت و تجربہ وغیرہ (۶) فراست (۷) صبر و شکیب (۸) پیش اقدامی (۹) بیباکی و جانفروشی۔

(۳) **صَید افگنی** صحرائی زندگی کے لوازمات میں سے تھی۔ لہٰذا ایک بدوی میں عموماً یہ چھ اوصاف پائے جاتے تھے : (۱) شکار کی عادات و نفسیات سے واقفیت (۲) گھات میں بیٹھنے کا تجربہ (۳) نشانہ بازی میں مہارت (۴) شہسواری (۵) ترت پھرت اور (۶) حملے میں پہل کرنے کا حوصلہ۔

(۴) **عزّتِ نفس کی پاسداری** بدوی زندگی کا خاصّہ تھا۔ ایک بدوی کے لیے اس کی عزّتِ نفس پر حملہ اس کے جان و مال پر حملہ کرنے کے مترادف بلکہ زیادہ تھا، لہٰذا ان کی آزادی و خودمختاری بہت حد تک اس جذبے کی مرہونِ منّت تھی۔

(۵) **عصبیّت** قبائلی زندگی کے خمیر سے اُٹھتی ہے، اس لیے اس کا ایک ناگزیر عنصرِ ترکیبی ہے۔

(۶) **ثار یا اِنتقامِ خون** : اس کا مطلب ہے خُون کا بدلہ خُون۔ عربوں میں ثار ان کی عزّتِ نفس، قومی غیرت و حمیّت اور شجاعت و مردانگی کی علامت اور خانہ جنگی کا ایک مستقل سبب تھا۔

(۷) **مہمان نوازی** بدوی زندگی کا خاصّہ اور وجۂ شرف تھی، چنانچہ عربوں کی مہمان نوازی ضرب المثل تھی اور اس جذبہ و عادت نے ان میں فیاضی و ایثار کے اوصاف پیدا کر دیے تھے۔

(۸) **محنت و جفاکشی** اور صحرائی زندگی لازم و ملزوم ہیں۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ علم و ہنر میں کمال و نام پیدا کرنے کے لیے محنت و جفاکشی کی عادت لازمی پیش شرط ہے اور عبقریت کا جوہرِ قابل محنت ہی کی بدولت گوہرِ تابدار بنتا ہے۔ نیز قوموں کی عظمت و قوت اور صولت و سیادت ہمیشہ ہی محنت و جفاکشی کی مرہونِ منّت رہی ہے۔

(۹) **سادگی و سادہ دلی** : صحرا میں زندگی تکلفات سے بے نیاز و ناآشنا تھی۔ اس کا نتیجہ تھا کہ بدوی طبعاً سادہ دل اور سادگی پسند ہوتے تھے۔ ایسے ہی دلوں میں حق و صداقت قبول کرنے کی استعداد پائی جاتی ہے۔

(۱۰) **فطریّت پسندی** : صدیوں فطرت کے آغوش میں رہنے سہنے کے باعث عرب بدوی فطرت شناس ہو گئے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فطرت کی آیات یعنی اس کی زبان اور رویّے سے واقف تھے۔ فطرت شناسی انسان کو حق شناس اور اس کی قوّتِ ممیزہ کو فعّال بناتی ہے۔ علاوہ بریں فطرت شناسی جمالیاتی حس کو زندہ و بیدار کرتی ہے اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ فن و ادب کی تخلیق کے لیے جمالیاتی حِس کی فعالیت ایک لازمی پیش شرط ہے۔

(۱۱) **قلب و نظر کی وُسعت** : صحرا کی دسعت و پہنائی کا مستقل نظّارہ قلب و نظر میں زندگی دو وُسعت پیدا کرتا ہے۔ صحرائی زندگی کی یہ ایک غیر معمولی خصُوصیّت ہے۔

اِن اور دیگر خصوصیات کی بنا پر ربِّ رحیم و علیم نے اقوامِ عالم کی ہدایت و امامت کے لیے عرب کے صحرا نشینوں کو منتخب کیا اور ان میں سے اپنا پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کو مبعوث کیا اور ایسے قبیلے میں آپؐ کی تربیت کا اہتمام کر دیا جو فصیح البیانی میں بالخصوص مشہور تھا۔ اس کا نام بنی سعد یا ہوازن تھا۔ اس قبیلے کی جس خاتُون کو پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کی رضاعی ماں بننے کا اعزاز و رتبہ ملنے والا تھا، اس کا نامِ گرامی حضرت حلیمہ سعدیہؓ ہے (۱۶ ربیع الاوّل، ۵۲ قبل ہجرت -/ ۲۷ اپریل ۵۷۱ء) ان کی ایک صاحب زادی جن کا نام شیماء تھا، آپؐ کو کھلاتی پلاتی اور دیکھ بھال کرتی تھیں۔ آپؐ پہلی مرتبہ دو برس اس خاندان میں رہے۔ اہلِ ہوازن کو کیا معلوم تھا کہ یہ یتیم بچہ قدرت کا دُرِّ یتیم ہے جس نے بڑے ہو کر ان کی زندگیوں کی کایا پلٹ کرنی اور ان کی استعدادوں کو قوت سے فعل میں لا کر انھیں اقوامِ عالم کا قائد بنانا ہے۔

۵۰ قبل ہجرت /۵۷۳ء میں دو برس کی مُدّتِ رضاعت ختم ہوئی تو حضرت حلیمہؓ آپؐ کو واپس کرنے کے لیے مکّہ معظّمہ تشریف لائیں، لیکن مشیتِ الٰہی کو یہ منظور نہ تھا۔ وہ تو ابھی چار برس اور آپؐ کو صحرا کی پہنائیوں میں رکھنا چاہتی تھی تاکہ آپؐ کے قلب و نظر میں وسعتِ آفاقی اور دیگر صحرائی خصوصیات پیدا ہو جائیں۔ لہٰذا مکّے میں وبا پھیل جانے کی وجہ سے نہ تو ماں کی مامتا کو اور نہ قدرت ہی کو یہ گوارا ہوا کہ آپؐ وہاں رہیں۔ آپؐ کو مزید چار برس کے لیے

واپس حضرت حلیمہ کے سپرد کر دیا گیا۔ وہ بچّہ جسے قدرت نے بنی نوعِ انسان کے لیے مثالی نمونہ بنانا تھا، صحرا میں پرورش پانے لگا۔ روایت ہے کہ آپؐ دوسری بار قبیلہ ہوازن میں لائے گئے تو آپؐ کو شق الصدر کا واقعہ پیش آیا۔[۱۲] آپؐ بلاشبہ برگزیدہ و محبوبِ خدا اور ختمی مرتبت تھے، لیکن انسان تھے اور انسان کی عظمت و کمال کا راز محنت و مشقت میں مضمر ہے' اس لیے آپؐ کو راحت و آرام سے دُور محنت و مشقت میں رکھا گیا۔ آپؐ نے چونکہ اسلام کی تحریکِ انقلاب عوام کی مدد سے چلانی اور ان کے لیے ایک عظیم و بے عدیل حقیقی و کلّی انقلاب لانا تھا، نیز ان کے لیے ایک حسین و مثالی معاشرے کی تشکیل و تعمیر کرنی تھی' اس لیے آپؐ کو پیدا ہوتے ہی عوام میں رکھا گیا اور آپؐ عمر بھر عوام میں رہے۔ آپؐ نے عوام کی طرح کھایا' پیا اور پہنا' ان کی طرح کام کیا اور زندگی بسر کی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آپؐ ان کی نفسیات سے پوری طرح واقف تھے اور ان کے مسائلِ زندگی سے آپؐ کو بہت دلچسپی تھی۔

آپؐ یقیناً پانچ چھ برس کے لڑکے تھے' لیکن آپؐ کا قلب جو ایک عظیم انسان اور سیّد المرسلین کا زندہ و فعّال اور حسین و منوّر قلب تھا' کائنات و حیات پر غور کرنے کا عادی بن گیا۔

یتیمی کی تکمیل : ۴۷ قبل ہجرت / ۵۷۷ء

محبّت کے انداز نرالے ہوتے ہیں۔ اسرارِ محبّت کی آگاہی اہلِ حسن و محبّت ہی کے حِصّے میں آتی ہے۔ محبّت کی راہیں پُرخار و دشوار گزار ہوتی ہیں، جہاں اہلِ مہر و وفا کو برہنہ پا و تنہا گزرنا پڑتا ہے کیونکہ محبّت و رشک لازم و ملزوم ہیں' اس لیے وہ دوئی پسند نہیں۔ "دوست" کو یہ منظور نہ تھا کہ اس کے اور اس کے "منظورِ نظر" کے درمیان "مامتا" بھی حائل ہو، لہٰذا "دوست" کا فیصلہ یہ ہوا کہ دُرِّ یتیم کو باپ کے بعد "ماں" سے بھی محروم کر دیا جائے۔

آپؐ چھ برس کے تھے[۱۳] اور صحرا سے واپس آئے ہی تھے' ماں نے ابھی آپؐ کو جی بھر کے پیار بھی نہیں کیا تھا۔ چاند سے بیٹے کو دیکھا تو اس کے باپ کی یاد آئی: "وہ ہوتے اور اپنے لختِ جگر کو دیکھتے تو کتنے خوش ہوتے! ان کی رُوح یقیناً اپنے بچّے کو دیکھنے کے لیے بے قرار ہوگی۔" ان خیالات میں غلطاں و پیچاں حضرت آمنہ نے بیٹے کو باپ کی قبر پر لے جانے کا فیصلہ کیا۔

رضاعی ماں کے ساتھ تو کئی سفر کیے تھے' لیکن حقیقی ماں کے ساتھ آپؐ کا پہلا اور

آخری سفر تھا۔ حضرت آمنہ آپؐ کو اور آپؐ کی دایہ حضرت اُمّ ایمن کو لے کر مدینہ منوّرہ روانہ ہوئیں جہاں ان کے شوہر حضرت عبداللہ مدفون تھے۔ مدینہ منوّرہ میں انھوں نے خاندانِ نجّار میں قیام کیا جو ان کی سُسرال کے رشتے دار تھے۔ چند ہفتوں کی ازدواجی زندگی کی مسرّتوں کے بعد چھ سات برس کے فراقِ لامتناہی کی اذیّتیں برداشت کرتے کرتے ان کا دل نڈھال ہو گیا تھا۔ عرب میں نوجوان عورت کے بیوہ رہنے کا رواج نہ تھا۔ عقدِ ثانی کا دستور تھا، لیکن جس طرح پیغمبرِ خدا کی بیوی اُمّ المومنین ہوتی ہے اور اس کا دوبارہ نکاح نہیں ہو سکتا' اسی طرح قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کی والدۂ ماجدہ جو کہ اُمّ بنی آدم تھیں، ان کا نکاحِ ثانی ہوتا، لیکن قدرت سے ان کی زندگی کی ویرانی اور جوانی کی بربادی دیکھی نہ گئی اور نہ اسے یہ گوارا ہی ہوا کہ وہ فراقِ مُسلسل اور یاس و غم کے عالم میں سوگوار رہیں، لہٰذا مشیّتِ ایزدی یہ ہوئی کہ انھیں دنیا سے الحیوان میں بلا لیا جائے۔

حضرت آمنہ کو مرقدِ شوہر کی زیارت کرنے اور چھُپ چھُپ کر گریہ وزاری کرنے اور آتشِ غم میں جلتے ایک ماہ گزر گیا۔ مراجعت ضروری تھی، مگر دل کو وہاں سے جانا گوارا نہ تھا۔ بہرحال انھوں نے واپسی کا فیصلہ کر لیا۔ سفر کرتے ہوئے جب جحفہ سے کوئی ۲۳ میل دُور ابوا نامی گاؤں میں اتریں تو دل مزید جدائی کا حریف نہ ہو سکا۔ وہ ۴۷ قبل ہجرت / ۵۷۷ء میں اپنے شوہر کی امانت کو آپؐ کی دایہ کے سپرد کر کے خود اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئیں۔ یہیں مدفون ہوئیں۔ آپؐ بالکل تنہا رہ گئے۔ اُمّ ایمن آپؐ کو لے کر مکّہ معظّمہ پہنچیں اور آپؐ کو حضرت عبدالمطلب کے سپرد کر دیا۔[۱۴]

آپؐ نے اپنی والدۂ ماجدہ کے ہمراہ مدینہ منوّرہ میں صرف ایک ماہ قیام کیا۔ لیکن اس مختصر عرصہ اور کمسنی ہی میں آپؐ نے تیراکی سیکھ لی۔ مدینے کے اس قیام و سفر کے اثرات آپؐ کے قلبِ مبارک پر اس طرح مُرتسم ہوئے کہ زمانہ اسے محو نہ کر سکا۔ چنانچہ آپؐ کبھی کبھی اس واقعہ کو یاد کر کے فرمایا کرتے تھے :

"مجھے وہ زمانہ یاد ہے جب ہم (بچے) بنی النّجار کی گڑھی کے سامنے کھیلا کرتے تھے۔ گڑھی پر کوئی چڑیا آ کر بیٹھتی تو اسے اُڑانا ہمارا محبوب مشغلہ تھا۔ ہمجولیوں میں ہمارے ساتھ ایک لڑکی بھی کھیلا کرتی تھی، جس کا نام انیسہ تھا" ــــــ بعد میں آپؐ جب بھی ابوا سے گزرتے' والدۂ ماجدہ کی قبر پر حاضری دیتے اور آپؐ پر رِقّت طاری ہو جاتی۔[۱۵]

ایک اور داغِ مفارقت : (۴۴ قبل ہجرت / ۵۷۹ء)

دادا کو آپؐ سے بہت پیار تھا۔ ایک تو آپؐ پیارے ہی بہت تھے، دوسرے آپؐ کے والدِ مرحوم حضرت عبداللہ سے حضرت عبدالمطّلب کو بہت پیار تھا، لیکن پیار کی یہ زندگی بھی بڑی مختصر تھی۔ انسان نے جتنا عظیم ہونا ہوتا ہے، اتنا ہی اسے عظیم تجربوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے اور عظمتِ زندگی رنج و محن کی مرہونِ منّت ہوتی ہے۔ والدۂ مرحومہ کی جُدائی کے زخم مندمل ہونے نہیں پائے تھے کہ دادا کی رحلت و جدائی سے وہ پھر ہرے ہو گئے۔ ۴۴ قبل ہجرت یعنی ۵۷۹ء میں حضرت عبدالمطّلب بیاسی برس کی عمر میں فوت ہوئے تھے۔ اوروں کے لیے تو یہ عمرِ طبیعی تھی اور غم بھی اسی مناسبت سے تھا، لیکن آٹھ برس کے بچّے کے لیے یہ غم صبر آزما بلکہ شکیب رُبا تھا۔ زندگی کیا دُکھوں کا نام ہے؟ یہ کیوں ایک حالت پر نہیں رہتی؟ موت کتنی بے رحم ہے؟ محبّت کتنی حسین و طمانیّت انگیز ہے! لیکن وہ گریز پا کیوں ہے؟ محبّت اور زندگی کسی کو بھی ثبات نہیں، کیوں؟ جوہر قابل ہو تو دکھ قلب کو زندہ و بیدار اور فعّال و حرکی بنا دیتے ہیں۔ یہ اور اس قسم کے مسائل حیات تھے، جن پر غور و فکر کرنا آپؐ کی فطرتِ ثانیہ بن گئی۔

ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ جب آپؐ بکریاں چرانے شہر سے دور جاتے تو کسی درخت کے سائے میں پہروں ایسے مسائلِ حیات پر غور و فکر کرتے رہتے۔ ہمجولی لڑکے کھیل تماشوں میں لگے رہتے اور آپؐ غور و فکر میں مشغول رہتے۔ بڑے ہوئے تو ان مسائل کے حل کی طلب و جستجو میں صاحبِ دل و دانا لوگوں کی صحبت میں بیٹھنا پسند کرتے۔ کاروبار کے سلسلے میں آپؐ بیرونِ ملک جاتے تو جہاں کہیں کوئی اہلِ علم و حکمت مِلتا اس سے تبادلۂ خیال کرتے، اس کی باتوں کو گوشِ ہوش سے سُنتے اور ان پر غور و فکر کرتے رہتے۔ اس طرح آپؐ کی حسّی و قلبی عادات کی تربیت ہوتی رہی اور وہ فعّال و حرکی ہو گئیں۔ سُننا، دیکھنا اور سوچنا آ جائے تو انسان حکیم و دانا اور عارف و عالم بن جاتا ہے۔

شادی ہوئی، ازدواجی زندگی کی مسرّتیں ملیں، خوش حالی نصیب ہوئی، غمِ دنیا رُخصت ہوا، لیکن "غمِ عشق" اور بڑھ گیا۔ نوجوانی کا عالم، پھر انسانِ کامل کا، دل میں جذبات کے طوفان اُمڈتے تھے، لیکن آپؐ گھر کے حسنِ مآب سے نکل کر دُور غارِ حرا کی تنگنا میں

ہفتوں ان مسائل پر غور و فکر کرتے رہتے۔ اس "عشق" کے غم میں آپؐ کو اپنا غم نہ رہا نہ بیوی بچّوں کا، غم تھا تو انسانیت کا۔ آپؐ انسانیت کو دُکھوں سے رہائی دلانا چاہتے تھے۔ آپؐ کی آرزو تھی تو یہ تھی، آپؐ کو غم تھا تو اس بات کا۔ آپؐ کے دل میں غمِ انسانیت کا جو تیر بچپن میں لگا تھا، وہ تیرِ نیمکش تھا۔ اسے نہ نکلنا تھا اور نہ نکلا۔ اسی میں تو "رحمۃ للعالمینی" کا راز مضمر تھا۔

چچا کی آغوشِ تربیت میں :

دادا کے انتقال کے بعد آپؐ کی تربیت و کفالت کی ذمہ داری آپؐ کے سگے چچا حضرت ابوطالب نے قبول کی[17] جن کے بیٹے حضرت علیؓ کی تربیت و کفالت آپؐ نے آگے چل کر خود کرنی تھی۔ دادا کی طرح چچا کو بھی آپؐ سے بڑی محبّت تھی، اور انھیں آپؐ کی جُدائی شاق گزرتی تھی ـــ آپؐ کو بھی چچا سے بڑا پیار تھا، کیونکہ باپ کی شفقت، ماں کی مامتا، دادا کا پیار سب چچا کی ذات میں مجتمع ہو گئے تھے۔ اس عہد میں اہلِ مکّہ میں تجارت اور بھیڑ بکریاں پالنا شرفا کے پیشے تھے۔ چنانچہ آپؐ نے بھی بکریاں چرائیں[18] یہ سُنّتِ انبیا بھی تھی اور تاریخ کے ان ادوار میں بالخصوص اس پیشے کے فوائد بھی تھے۔ جہاں تک آپؐ کی ذات کا تعلّق ہے اس پیشے نے آپؐ کو متفکر و حکیم اور اہلِ درد و محبّت بنانے میں ازبس اہم کردار ادا کیا۔ صبح سے شام تک خلوت گزینی میں حکیمانہ تفکّرِ مسلسل کا آپؐ کو موقع ملتا رہا ـــ جانوروں سے محبّت بڑھتی گئی اور ان کی ربوبیّت کرنے کی ذمہ داری کا شعور پوری طرح بیدار ہو گیا، جس نے آگے چل کر آپؐ کی قومی زندگی (پبلک لائف[19]) میں اہم ترین کردار ادا کیا۔ اس پیشے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ آپؐ لہو و لعب اور ناپسندیدہ صحبتوں سے بھی دور و محفوظ رہے۔ عزلت نشینی و خلوت گزینی میں قدرت کی آیات پر مسلسل غور کرنے سے ایک تو آپؐ کا تزکیۂ نفس ہوتا رہا، یعنی آپؐ کی حسّی و قلبی قوتیں نشوو ارتقاء کرتی رہیں، دوسرے آپؐ کے دل میں اللہ تعالیٰ کا عرفان و اذعان بڑھتا چلا گیا۔ جیسا کہ ہم معلوم کر چکے ہیں، انسان کے دل میں قدرتؐ کی طرف سے اپنے حقیقی "الٰہ" کی آرزو استعداد کی صورت میں ودیعت ہوتی ہے، اس آرزو کو قوت سے فعل میں لانا مقصودِ حیاتِ انسانی ہے، جس کے حصول میں اس پیشے نے نمایاں کردار ادا کیا۔

اللہ تعالیٰ کے تخلیقی عمل کے شئون یا مظاہر کے لیے قرآن مجید میں "آیات" کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ آیاتِ الٰہی معروضی ہوں یا موضوعی، ان کے بامقصد مشاہدے سے معرفتِ الٰہی حاصل ہوتی ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ کا عرفان و ایقان ہو جائے تو اس کے حوالے

سوچنا اور عمل کرنا اس کا شیوۂ حیات بن جاتا ہے۔ آپؐ پر ابھی قرآنِ مجید نازل نہیں ہوا تھا، اور چونکہ آپؐ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، اس لیے آپؐ پر ابھی مطالعۂ آیات کے اسرار نہیں کھُلے تھے۔ لیکن آپؐ کا قلب زندہ و بیدار اور حسین و منوّر تھا، لہٰذا آپؐ از خود اپنے کانوں، آنکھوں اور عقل و فکر سے کام لیتے رہتے تھے۔ چونکہ آپؐ سلیم الفطرت تھے، اس لیے آپؐ کی زندگی دین، اسلام اور مشیّتِ ایزدی کے مُطابق تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ آپؐ تلاشِ حق میں سرگرداں رہتے تھے۔[۲۰]

تکمیلِ ذات کے لیے سننا، دیکھنا اور سوچنا ناگزیر ہے، اور یہ رازِ زندگی قرآن مجید سے مستنبط ہے۔ جس طرح بعض موزوں طبائع کو طبعاً حُسنِ آواز یا موسیقی سے لگاؤ ہوتا ہے جسے کن رس یا ذوقِ سمع کہتے ہیں، اسی طرح سلیم الفطرت انسانوں کو علم و حکمت اور حُسن و حق کی باتیں سننے کا فطری ذوق ہوتا ہے۔ آپؐ سلیم الفطرت تھے، اس لیے آپؐ کو ایسی باتیں سُننے کا ذوق بھی تھا اور شوق بھی۔ چنانچہ آپؐ کو اہلِ علم کی صحبت بھی عزیز تھی۔ اس عادت سے آپؐ کی قوتِ سامعہ کی احسن طریق سے تربیت ہوئی۔ گھرانہ بیت اللہ اور حجاج کی خدمت پر مامور تھا۔ لوگ اسے عزّت و تقدّس کی نظر سے دیکھتے تھے، لہٰذا گھر کے اندر اور باہر کا ماحول دینی یا رُوحانی تھا۔ اللہ اور خدمتِ خلق کے حوالے سے باتیں ہوتی تھیں۔ آپؐ ان باتوں میں دلچسپی لیتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ "نبی" ازل سے نبی ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کی نظر میں ہوتا ہے[۲۱]۔ اور اسے شرک و بت پرستی اور فسق و فجور سے دُور رکھا جاتا ہے۔ لیکن بحیثیت انسان کے آپؐ سلیم الفطرت تھے اس لیے شرک و بت پرستی اور فسق و فجور سے آپؐ کو طبعاً نفرت تھی۔ چنانچہ اس امر کے باوجود کہ آپؐ کو اپنے جدِّ امجد سیّدنا حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی طرح "آزادانہ" ماحول ملا، مگر آپؐ کو مُشرکانہ رسُوم و قیود سے سخت نفرت تھی۔ آپؐ کو لات و منات اور ہبل والعزّیٰ کا نام تک لینا گوارا نہ تھا۔[۲۲] آپؐ بھی حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی طرح مُوحّد تھے اور آپؐ کے دل میں بھی یہ آرزو تھی کہ کسی طرح لوگوں کو شرک و بُت پرستی کی قیود سے نجات دلائی جائے۔ جس طرح سُر آشنا طبعِ موزوں پر بے سُری آواز سنگِ گراں ہوتی ہے اسی طرح آپؐ کی فطرتِ صحیحہ کو شرک کی ہر بات سخت ناگوار تھی۔ اس ناپسندیدہ مُشرکانہ ماحول میں رہنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ ردِّ عمل کے طور پر ایک طرف تو توحید کا ذوق و شوق بڑھتا چلا گیا اور دوسری طرف شرک و بُت پرستی سے نفرت شدّت اختیار کرتی چلی گئی۔ توحید سے محبّت کی فراوانی اور شرک سے نفرت کی طغیانی نے انجام کار

معاشرے کے خلاف بغاوت کی صورت اختیار کرلی۔ یہ بغاوت نہ صرف شرک و بُت پرستی بلکہ پیشوائیت، سرداری، امارت، جاگیرداری، سودخواری وغیرہ کے خلاف بھی تھی، لیکن بنی نوعِ انسان کے حق میں وہ تحریکِ رحمۃ للعالمینی تھی، کیونکہ اس کا بنیادی مقصد انسان کو مشرکانہ رسُوم و قیود، معبودانِ باطل اور استحصالی قوتوں کے ظلم و استبداد سے آزاد کرانا، ان میں آرزوئے حق و حُسن اور شعُورِ توحید کو بیدار کرنا اور اخوّت و محبّت کے جذبات کی پرورش کرنا، نیز ان کے لیے ایک حسین و کامل انسانی معاشرے کی تشکیل و تعمیر کرنا تھا۔

آپؐ کی فطرت سلیم، جمالیاتی[۲۳] حس فعّال و حرکی[۲۴] اور ذوق لطیف و سلیم[۲۵] تھا، اس پر مستزاد یہ کہ آپؐ قرشی تھے اور بنو سعد میں آپ کا بچپن گزرا تھا، لہٰذا آپؐ میں ذوقِ فصاحت و بلاغت اور ملکۂ طلاقت و خطابت پیدا ہوگیا۔ کچھ تو افتادِ طبع کی بدولت اور کچھ حالات و ظروف کے سبب آپؐ کی حسّی[۲۶] قوتوں خصوصاً سامعہ کا نشو و ارتقاء بدرجۂ اتم ہوا۔ چونکہ آپؐ کو حسن و حق کا ذوق تھا، اس لیے بچپن ہی سے آپؐ کو اہل علم و حکمت اور دانا بینا لوگوں کی صحبت میں بیٹھنے کا شوق تھا۔[۲۷] ان اوصاف نے آگے چل کر آپؐ کی اجتماعی زندگی میں ازبس اہم کردار ادا کیا۔

جمالیاتی ذوق[۲۸] کی بدولت آپؐ کو قدرت کی حسین تخلیقات کے مشاہدے سے جمالیاتی حظ[۲۹] ملتا تھا۔ لہٰذا مشاہدہ آپؐ کی زندگی میں بڑی اہمیّت رکھتا ہے۔ قدرت آپؐ کی حسّی تربیت کررہی تھی کیونکہ اس نے آپؐ کو مقامِ شاہدیّت (مقامِ احسان[۳۰]) پر متمکّن کرنا تھا۔ ذوقِ دید سے ذوقِ تفکّر کا پیدا ہو جانا لازمی تھا۔ اور وہ ہوا، اور اس کا ایسا نشو و ارتقاء ہوا کہ حکیمانہ تفکّر[۳۱] آپؐ کی فطرتِ ثانیہ بن گئی۔ اُونٹ، گھوڑے، صحرائی جانور، بادل، نخل، چاند، تارے سب میں آپؐ کے لیے جمالیاتی حظ کا سامان تھا۔ ریگ زاروں کی لاتناہی وسعتوں میں کاروانوں کو دیکھتے دیکھتے آپؐ میں مظاہرِ زندگی کا ذوقِ مشاہدہ نشو و ارتقاء کرتا رہا۔ اس زمانے میں سورج کا طلوع و غرُوب حیاتِ انسانی میں ازبس اہمیت رکھتا تھا۔ طلوعِ آفتاب سے زندگی بیدار ہوتی اور اس کے غرُوب سے زندگی محوِ خواب ہو جاتی تھی۔ زمان و حیات کے ان نظاروں میں آپؐ کے لیے نہ صرف ذوقِ دید کا بلکہ تفکّر و تدبّر کا بھی سامان تھا۔ باصرہ کی تربیت اور ذوقِ دید کے نشو و ارتقا سے آپؐ "دیدہ ور" بن گئے۔ لیکن تربیّتِ باصرہ کی تکمیل کے لیے سیر و سیاحت ایک ناگزیر پیش شرط[۳۲] ہے۔ قدرت جو آپؐ کی مُربّی تھی، اس نے یہ مواقع بھی فراہم کر دیے۔

۴۰ قبل ہجرت / ۵۸۲ء : تجارتی سفر

حضرت ابو طالب بھی شرفائے مکّہ کی طرح تجارت پیشہ تھے اور سوداگری کے لیے بیرونِ ملک جایا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ ایک کارواں کے ساتھ شام کی طرف جانے لگے تو آپؐ کے معصوم دل میں، جو فراق کے کئی جانکاہ صدمات برداشت کر چکا تھا۔ اپنے اس معروضِ محبت[۳۳] کی جدائی کے خیال سے قوت برداشت نہ رہی۔ جو چھوڑ گیا، وہ پھر واپس نہ آیا۔ کیا چچا جان بھی ایسا ہی کریں گے؟ اس تصور سے دل میں غم انگیز جذبات کا ایک طوفان اٹھا اور صبر و شکیب کو بہا لے گیا۔ آپؐ کی سیاہ و حسین آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور ان گوہر ہائے اشک میں حسرت و بے بسی کو دیکھ کر حضرت ابو طالب کا دل پسیج گیا۔ ان کے دل میں بھی جذباتِ محبت کا طوفان اُٹھا۔ انھوں نے آپؐ کو پیار سے گلے لگایا اور اپنا ہمسفر بنا لیا۔ اس طرح آپؐ کو بیرونِ ملک جانے اور دنیا میں بامقصد سیر و سیاحت (سیروا فی الارض)[۳۴] کے فطری تقاضے کو پورا کرنے کا یہ ایک موقع مل گیا۔ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ قرآن مجید نے حسّی و قلبی قوتوں کی تربیت اور ان کے نشوو ارتقا کے لیے جس قسم کے مشاہدات کی ضرورت پر زور دیا ہے، قدرت نے آپؐ کو ایسے تمام مشاہدات کرنے کے کثرت سے مواقع فراہم کیے۔

اس سفر کا ایک واقعہ جسے عیسائی مصنفین نے اپنی اسلام دشمنی کی وجہ سے بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے، بحیرا راہب کا ہے اور یہ ایک ضعیف روایت پر مبنی ہے، اس لیے غیر معتبر ہے۔ قرائن سے واقعہ کی نوعیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اہلِ مکّہ کا کارواں شام جاتے ہوئے بصریٰ کے مقام پر اُترا۔ وہاں کی خانقاہ کا راہب جس کا نام بحیرا تھا، صاحبِ نظر بزرگ تھا۔ اس نے حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو دیکھا تو آپؐ کی پیغمبرانہ شخصیت سے بے حد متأثّر ہوا۔ حُسنِ نظر پر نبوّت کا نور آشکارا ہوا تو راہب کا دل آپؐ کی عظمت کا معترف ہو گیا اور اس کا اظہار اُس نے یقیناً آپؐ کے چچا اور اہلِ کارواں سے کیا ہو گا اور آپؐ سے بات چیت کرنے کا اسے تجسّس و اشتیاق بھی ہوا ہو گا اور اس نے اس کا اہتمام بھی کیا ہو گا۔ یہ سب کچھ راہب نے اپنے ذوقِ تجسّس و اشتیاق کی تشفّی کے لیے کیا تھا۔ آپؐ کی یہاں سے مراجعت کی روایت محدّثین کے نزدیک موضوع ہے۔ اصل یہ ہے کہ آپؐ اپنے چچا کے ہمراہ واپس مکّہ معظمہ آئے تھے۔[۳۵]

آپؐ کی حسّی قوتیں تربیت یافتہ تھیں۔ لہٰذا آپؐ نے اس سفر میں دیدہ آموز سے تاجروں

کو اپنے گاہکوں سے معاملات کرتے دیکھا اور گوش نیوش سے ان کی باتوں کو سُنا۔ یہ مشاہدہ تجارتی نقطۂ نظر سے آپؐ کے لیے آگے چل کر بہت کار آمد ثابت ہوا۔

بچپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے آپؐ نے عُنفوانِ شباب میں قدم رکھا، اور یہ سفرِ زندگی آپؐ نے اس طرح طے کیا کہ حیا سدا آپؐ پر سایہ فگن رہی اور لہو و لعب کی طرف آپؐ کا دل مائل نہ ہوا۔ سوچنا ایک تو آپؐ کی عادت تھی اور دوسرے ذہنی عمر[۳۶] کے لحاظ سے آپؐ بچپن ہی میں سن رسیدہ تھے۔ ابنِ سینا نے شفا میں لکھا ہے کہ نبی کامل و عبقری انسان ہوتا ہے لہٰذا آپؐ کے ذہنی قویٰ کا نشوو ارتقا، حیرت انگیز سرعت سے ہوا۔ چنانچہ اپنے اور بیگانے آپؐ کی غیر معمولی ذہانت سے متأثر ہوئے۔ آپؐ کے دادا حضرت عبد المطلب کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کوئی چیز گم ہو جاتی اور دوسرے لوگ اسے ڈھونڈنے میں ناکام ہو جاتے تو آپؐ سے کہتے اور آپؐ اسے ڈھونڈ لیتے۔[۳۷] اس سے آپؐ کی غیر معمولی فراست کا پتا چلتا ہے۔ لوگ آپؐ کی ذہانت کی طرح آپؐ کی شائستگی، حُسنِ خلق و عفّت و عصمت اور شرم و حیا کے بھی معترف تھے۔ آپؐ ہمیشہ سچ بولتے تھے اور بزرگوں کا ادب و احترام کرنا آپؐ کا شیوہ تھا۔ درد و غم سے آپؐ کا قلبِ مبارک معمور تھا، اس لیے آپؐ ہر کسی کے کام آتے تھے۔ آپؐ اتنے رقیق القلب تھے کہ دوسروں کا غم دیکھا نہ جاتا تھا۔ حلم و بُردباری، شیریں کلامی، عفو و درگزر اور صبر و قناعت بلکہ جملہ مکارمِ اخلاق سے آپؐ کی شخصیت مُزیّن تھی۔ علاوہ بریں آپؐ میں محنت و مشقّت اُٹھانے، مصائب جھیلنے اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کی ہمّت و جراتِ اقدام بھی تھی۔ آپؐ ملنسار بھی بہت تھے۔ ان تمام محاسنِ اخلاق کی بدولت آپؐ کو چھوٹے بڑے اور ہمجولی سب محبت و شفقت اور احترام سے دیکھتے تھے۔[۳۸]

۳۷ قبل ہجرت / ۵۸۶ء

جنگِ فُجّار (حربِ فُجّار) : بنی نوعِ انسان کو استحصالی قوتوں کی محکومی و غلامی، مشرکانہ عقاید و اوہام اور مناسک و رسومات سے نجات دلانے کے لیے آپؐ کو مستقبل میں جہاد کرنا تھا، لہٰذا قدرت آپؐ کو اس کٹھن، صبر آزما اور انقلاب آفریں جدّ و جُہد کے لیے تیار کر رہی تھی۔ چنانچہ ایسے تجربات سے گزرنے کے لیے اس نے آپؐ کو مواقع بھی فراہم کر دیے۔ آپؐ کی عمر تقریباً سولہ برس[۳۹] کی ہو گی کہ چوتھی جنگِ فجّار چھڑ گئی۔ اس جنگ میں ایک طرف قریش اور

بنو کنانہ اور دوسری طرف بنو قیس، عیلان اور بنو ہوازن تھے۔ آزادی و ناموس اور جان و مال کے تحفظ اور قبائلی روایات اور خاندانی ذمہ داریوں کے خاطر آپؐ نے اس جنگ میں شرکت کی۔

جنگِ فجار کا پس منظر یہ ہے کہ قریش تجارت پیشہ تھے اور بیت اللہ کی بدولت حجاج و زائرین کی آمد بھی ان کے لیے منفعت بخش تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے وسائلِ آمدن میں اضافہ کرنے کی خاطر مختلف مقامات پر تجارتی میلے منعقد کرنے کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ ان میلوں میں جو لوگ سامانِ تجارت لاتے، ان سے عُشر یعنی دسواں حصّہ بطور محصولِ درآمد وصول کیا جاتا، جو مقامی سردار کو ملتا تھا۔ ان تجارتی میلوں کے فروغ کی خاطر انھوں نے حرام مہینوں کا نظام رائج کیا تھا، یعنی ان میں ثار یعنی انتقام جوئی، قتل و غارت، رہزنی، ڈکیتی اور لوٹ کھسوٹ وغیرہ کو ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ ان حرام مہینوں کے نام یہ تھے : محرم، ذلقعدہ اور ذوالحجۃ (بعض نے رجب المرجب بھی لکھا ہے)۔ ان میں سے کسی مہینے کی بھی حرمت شکنی ہو جاتی تو اسے فُجّار یعنی ناجائز فعل سمجھا جاتا تھا اور جنگ چھڑ جاتی تھی، جسے حربِ فُجّار کہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کے زمانۂ بعثت سے پہلے چار بار فُجّار کے واقعات رونما ہوئے۔ ان میں سے دو لڑائیوں میں آپؐ کی موجودگی کا پتا چلتا ہے۔ ایسی ہی ایک لڑائی میں آپؐ نے حربی صلاحیت کا مظاہرہ کیا تھا اور عرب کے ایک مشہور نیزہ باز ابو براء ملاعب الاسنہ کو بڑی جرأت و شجاعت سے نیزہ مارا تھا اور تیر افگنی بھی کی تھی۔[۴۰]

۳۷ قبل ہجری / ۵۸۶ء

حِلفُ الفضول : اس معاہدے میں آپؐ کی شرکت اس دور کی زندگی کا ایک اہم ترین واقعہ ہے۔ ابنِ قتیبہ کی رُو سے قصیّ کے مکّے پر قبضہ کرنے سے پہلے جرہمی دَور میں اس شہر کے صاحبِ دل و دردمند لوگوں نے مظلومین کی امداد کے لیے ایک انجمن بنائی۔ اس میں شریک لوگ متحدہ اور رضاکارانہ طور سے اپنے شہر میں مظلوموں کی مدد کرتے، ظالموں سے ان کا حق دلاتے اور انھیں ظلم سے باز رکھتے تھے۔ یہ معاہدہ امتدادِ وقت کے ساتھ غیر مؤثر ہو کر رہ گیا۔ چوتھی جنگِ فُجّار میں خونریزی کچھ زیادہ ہی ہوئی، جس کے نتائج و عواقب سے اہلِ مکّہ کی معاشی و معاشرتی زندگی بری طرح متأثر ہوئی۔ چنانچہ اس جنگ کے چند ہفتے بعد ہی رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے چچا زبیر بن عبد المطلب، جو بنی ہاشم کے سردار اور دردمند انسان تھے، نے

عمائدینِ شہر کو حِلفُ الفضول کی ضرورت و اہمیّت کا احساس دلایا اور اس کی تجدید کی دعوت دی۔ عبد اللہ بن جدعان سن رسیدہ و جہاں دیدہ شخص اور بنو تیم کا مالدار سردار تھا، اس نے اس مقصد کی خاطر عمائدینِ مکّہ کو اپنے گھر ضیافت پر مدعو کیا، جنھوں نے ضیافت کے بعد حِلفُ الفضول میں شرکت کی اور مندرجۂ ذیل حلف اُٹھایا :

"اللہ کی قسم! ہم سب مل کر ایک ہاتھ (یا مُٹّھی) بن جائیں گے، اور یہ ہاتھ اس وقت تک ظالم کے خلاف اُٹھا ہوا رہے گا جب تک کہ وہ مظلوم کو حق ادا نہ کر دے۔ یہ عہد اس وقت تک رہے گا جب تک کہ سمندر گھونگوں کو بھگوتا رہے اور حرا و ثبیر کے پہاڑ اپنی جگہ پر قائم رہیں گے اور ہماری معیشت میں مساوات رہے گی۔"[۴۱]

اس معاہدے کی اہمیّت اس سے بہت زیادہ ہے جو آپؐ کے سِیرت نگار اور مؤرّخ اسے دیتے ہیں۔ اس پر بحث کرنے سے پہلے یہ جتا دینا ضروری ہے کہ پیغمبرِ اعظم آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم اسے بجا طور سے غیر معمولی اہم سمجھتے تھے۔ اس کی تحریک و تجویز بلاشبہ آپؐ کے چچا زبیر بن عبد المطلب کی تھی، لیکن یہ آپؐ کے دلِ درد آشنا کی آواز تھی۔ آپؐ اسے یعنی خدمتِ خلق ہی کو مقصدِ زندگی سمجھتے تھے۔ اس اعتبار سے حِلفُ الفضول میں شرکت آپؐ کی قومی زندگی (پبلک لائف) کا اوّلین سنگِ میل ہے۔ آپؐ کے سیرت نگاروں (مثلاً ابن ہشام اور حمیدی) نے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: "میں عبد اللہ بن جدعان کے گھر میں حلف لینے میں شریک تھا، اور سُرخ اونٹوں کے گلّے کے عوض بھی اس شرکت کے اعزاز سے دست بردار ہونا نہیں چاہتا اور اگر اب زمانۂ اسلام میں بھی مجھے کوئی اس کی دہائی دے کر پکارے تو اس کی مدد کو دوڑ کر جاؤں۔"[۴۲]

اس معاہدے کی وجۂ تسمیہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس کی تجویز و تحریک کرنے والے اشخاص کے نام مادہ "فضل" سے مشتق تھے۔ مثلاً فضیل بن حرث، فضیل بن وداعۃ اور مفضّل۔ ان کا تعلق جرہم اور قطورا قبائل سے تھا، لیکن امام سُہیلیؒ نے مُسند حارث بن اُسامہؓ سے ایک حدیث نقل کی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نام کی وجۂ تسمیہ یہ ہے کہ اس معاہدے میں یہ الفاظ تھے : تردّ الفضول علی اھلھا[۴۳]

آپؐ کی سیرت کے حوالے سے حِلفُ الفضول کی اہمیّت یہ ہے کہ اس مستند تاریخی ریکارڈ سے تین باتیں ثابت ہوتی ہیں : ایک یہ کہ آپؐ کا دل عنفوانِ شباب میں بھی غمِ انسانیت

سے معمور تھا اور آپؐ مظلوم انسانوں کی مدد اور ان کے حقوق کی خاطر ہر قسم کی قربانی کرنے اور ہر قسم کے امتحان سے گزرنے کے لیے تیار رہتے تھے، نیز ان میں اپنی زندگی کی غایت مضمر دیکھتے تھے۔ دوسرے یہ کہ آپؐ کے دل میں ظلم کا استیصال کرنے اور مظلوم انسانیت کو ظالم لوگوں اور استحصالی قوتوں کے پنجۂ استبداد سے رہائی دلانے کی تڑپ تھی۔ تیسرے یہ کہ آپؐ معاشی مساوات پر یقین رکھتے تھے۔

حواشی و تشریحات

(۱) عالمِ انسانی کی اس حالت کی طرف اللہ تعالیٰ نے مندرجۂ ذیل آیت قرآنی میں ایک بلیغ اشارہ کیا ہے : ظھر الفساد فی البرّ والبحر بما کسبت ایدی النّاس لیذیقھم بعض الذی عملوا لعلّھم یرجعون۔ (الرّوم ۳۰ : ۴۱) : خشکی اور سمندر (یعنی ہر گوشۂ حیات) میں لوگوں کے اعمال کے سبب فساد پیدا ہو گیا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ انھیں ان کے بعض اعمال کا مزہ چکھائے۔ عجب نہیں کہ وہ باز آجائیں۔

(۲) علّامہ اقبال

(۳) تاریخِ ولادت کے متعلّق قدرے اختلاف پایا جاتا ہے۔ طبری وابنِ خلدون کے نزدیک ۱۲ ربیع الاوّل اور ابوالفداء کی رائے میں ۱۰ ربیع الاوّل ہے، لیکن سب مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ روزِ ولادت دوشنبہ (سوموار) تھا، اور یہ دن ۹ ربیع الاوّل کو پڑتا ہے اس لیے یہی تاریخ صحیح ہے۔ اس بارے میں قاضی محمد سلیمان (رحمۃ للعالمین ۱ : ۴۰) کی تحقیق و تفتیش قابلِ قدر ہے اور انھوں نے ثابت کیا ہے کہ ولادت مبارک کی صحیح تاریخ ۹ ربیع الاوّل سلمہ عام الفیل / ۲۲ اپریل ۵۷۱ء ہے۔ واقعہ عام الفیل کے ۵۵ دن کے بعد۔

آپؐ نے ۶۳ برس کی عمر میں دوشنبہ کے دن، چاشت کے وقت ۱۲ ربیع الاوّل ۱۱ ہجری / ۸ جون ۶۳۲ء کو وصال پایا۔

(۴) آپؐ کے متعلّق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : وما ارسلنٰک الّا رحمۃً للعالمین۔ (الانبیآء ۲۱ : ۱۰۷) : اور (اے محمدؐ) ہم نے آپ کو تمام عالموں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے ــــــ عالم تو بے شمار ہیں لیکن ہماری دنیا کے مشہور عالم یہ ہیں :

عالمِ جمادات ، عالمِ نباتات ، عالمِ حیوانات اور عالمِ انسانی۔ آپؐ بلا واسطہ اور بالواسطہ تمام عالموں کے لیے رحمت تھے اور ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سارے عالم آپؐ کی ذاتِ بابرکات سے مستفید ہوئے، ہو رہے ہیں اور ہمیشہ ہوتے رہیں گے۔ آپؐ نے اپنے متعلق بھی فرمایا ہے کہ میں نبیِ رحمت ہوں۔

(مسلم بحوالہ مشکوٰۃ ، باب اسماء النبی ، ۳ : ۱۴۱ ، ح ۵۵۲۸)۔

(۵) آپؐ کے والدِ بزرگوار حضرت عبداللہ کا شجرۂ نسب یہ ہے : عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصیّ بن کلاب۔ حضرت عبداللہ کی والدہ کا نام فاطمہ بنت عمرو تھا۔ زبیر اور حضرت ابوطالب ان کے سگے بھائی تھے۔ روایت ہے کہ حضرت عبداللہ کے والد عبدالمطلب خانوادے کے سردار بنے اور سقایہ و رفادہ کی تولیّت انھیں سپرد ہوئی تو انھوں نے چاہ زمزم کھودنے کا فیصلہ کیا۔ قریش نے مخالفت کی اور ساتھ نہ دیا۔ اس کام میں فقط ان کے بڑے بیٹے حارث نے مدد کی۔ عبدالمطلب نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی اور منّت مانی کہ اگر وہ انھیں دس بیٹے عطا کرے جو جوان ہو کر ان کے دست و بازو بنیں تو وہ ایک بیٹا اللہ تعالیٰ کے نام پر قربان کر دیں گے۔ دُعا قبول ہوئی۔ چنانچہ ایک دن رویائے صادقہ کی بنا پر عبدالمطلب نے اپنی نذر پوری کرنے کا فیصلہ کیا اور بیٹوں کے نام پر قرعہ ڈالا تو حضرت عبداللہ کے نام نکلا جو انھیں سب بیٹوں سے زیادہ عزیز تھے۔ عبدالمطلب نے بیٹے کو قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن حضرت عبداللہ کی بہنوں اور بھائیوں نے مداخلت و مزاحمت کی۔ اکابرِ قریش کے مشورے سے اور یثرب میں خیبر کی ایک عرّافہ کے کہنے پر عبدالمطلب اونٹوں کا فدیہ دینے پر تیار ہو گئے۔ دس اونٹوں سے شروع کر کے سو اونٹوں کا قرعہ ڈالا تو وہ اونٹوں کے نام نکلا۔ اس طرح انھوں نے سو اونٹوں کی قربانی دے کر اپنی نذر پوری کی۔ اس واقعہ کے بعد حضرت عبداللہ ذبیح کے لقب سے موسوم ہوئے۔ ان کے متعلق لکھا ہے کہ وہ خُوب رُو، صاحبِ کردار اور نیک نفس جوان تھے۔ ان کا نکاح سیّدہ آمنہ سے ہوا اور رواج کے مطابق تین دن اپنی سُسرال میں گزارے۔ چند دنوں بعد تجارت کی غرض سے شام روانہ ہوئے۔ واپسی پر مدینہ میں کھجوروں کے کاروبار کی غرض سے ٹھہرے، بیمار پڑے اور رحلت کر گئے۔ انھیں نابغہ کے مکان میں دفن کیا گیا۔ کُتبِ

سیر و حدیث میں ہے کہ اہلِ مکّہ کو مدینے کی آب و ہوا راس نہ آتی تھی۔

(دیکھیے ابن ہشام : سیرۃ النبی ، (اردو ترجمہ) ، ۱ : ۱۴۰ تا ۱۵۲)۔

(۶) حضرت آمنہ کے والد بنو زہرہ کے سردار تھے، ان کا نام وہب بن عبدمناف بن زہرہ ہے۔ حضرت آمنہ کی والدہ کا نام بَرّۃ بنت عبدالعزّیٰ تھا۔ حضرت عبداللہ سے ان کا نکاح ہوا۔ چند دنوں کے وصال کے بعد حضرت عبداللہ انھیں امانت دارِ پیکرِ نبوّت بنا کر تجارت کی غرض سے رخصت ہوئے اور چند دنوں کی سہاگن ہمیشہ کے لیے بیوہ ہو گئیں۔

(۷) سیّد عبدالمطّلب قریش کے معزّز و مقتدر خاندان سے تعلّق رکھتے تھے۔ ان کے والد جناب ہاشم تھے، جن کا اصل نام عمرو تھا۔ جود و سخا کی وجہ سے لوگ انھیں ہاشم کہتے تھے۔ یہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کے پڑدادا تھے، جن کی اولاد ہاشمی کہلائی۔ ان کے بیٹے سیّد عبدالمطّلب بھی صاحبِ کردار، فیّاض، صاحبدل اور واجب الاحترام انسان تھے۔ انھوں نے دو برس تک نبیِ رحمت کی پرورش کرنے کی سعادت حاصل کی۔

(ابن ہشام ، ۱ : ۱۴۰ تا ۱۴۷ ، ببعد۔ (الروض الانف ، ۱ : ۱۰۹ ببعد) ، زاد المعاد)۔

(۸) ابوالفداء ، ص ۱۱ ،

(۹) وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ۭ فَلَمَّا جَاۗءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (الصّف ۶۱ : ۶) :

اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب مریم کے بیٹے عیسیٰؑ نے کہا : اے بنی اسرائیل ! میں تمھاری طرف اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں (اور) جو (کتابِ سماوی) مجھ سے پہلے نازل ہو چکی ہے، اس کی تصدیق کرتا ہوں اور ایک رسول کی تمھیں خوش خبری سناتا ہوں، جو میرے بعد آئے گا۔ اس کا نام "احمد" ہوگا۔ پھر جب وہ ان کے پاس صاف نشانیاں لے کر آئے تو کہنے لگے کہ یہ تو صریح جادو ہے۔ صحیحین میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا : انا محمّد وانا احمد : یعنی میرا نام محمّد ہے اور میرا نام احمد ہے۔ (دیکھیے مشکوٰۃ ، باب اسماء النبی ، ح ۵۵۲۷ ، نیز دیکھیے ح ۵۵۲۸)۔ حضرت عرباض بن ساریہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے

ہاں میں اس وقت خاتم النّبیینؐ لکھا ہوا تھا جب آدم ابھی گارے میں تھے۔ میں تمھیں بتاؤں کہ میرا پہلا امر حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی دعا تھی۔ (البقرہ ۲ : ۱۲۹)، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت (الصّف ۶۱ : ۶)، پھر میری ماں کا خواب، جو انھوں نے مجھے جننے کے وقت دیکھا تھا (شرح السنہ، بحوالہ مشکوٰۃ، باب فضائل سیّد المرسلین، ح ۵۵۱۱)۔

(۱۰) قبیلہ ہوازن یا بنی سعد کے باپ کا نام ابو ذوئیب السعدی تھا۔ حضرت حلیمہ کے ایک لڑکے کا نام عبداللہ بن الحارث تھا، جن کے ساتھ نبیِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے دُودھ پیا تھا۔ ان کی ایک لڑکی کا نام حذافہ اور لقب الشیمأ تھا۔ انھوں نے آپؐ کی خدمت کی تھی۔ غزوۂ حنین میں قبیلہ ہوازن کو شکستِ فاش ہوئی تو آپ نے الشیمأ کے لیے، جو اسیر ہو کر آئی تھیں، اپنی چادر مبارک بچھا دی تھی اور رضاعت کے تعلّق کی بنا پر مراعات دی تھیں۔ (دیکھیے شبلی نعمانی : سیرۃ النبی، ۱ : ۱۷۲ تا ۱۷۴، رحمۃ للعالمین، ۱ : ۴۱)۔

ہوازن یا بنی سعد کا قبیلہ طلاقت و بلاغت میں مشہور تھا۔ آپؐ نے اسی قبیلے میں پرورش پائی تھی چنانچہ آپؐ فصیح البیان اور جوامع الکلم تھے۔ آپؐ کا ارشاد ہے :

انا اعربکم انا من قریش ولسانی لسان بنی سعد بن بکر (ابن سعد، ۱ : ۷۱)۔ یعنی میں تم میں سب سے زیادہ فصیح البیان ہوں۔ (اس کی وجہ یہ ہے کہ) میں قریشی ہوں اور میری زبان بنو سعد کی زبان ہے۔

حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ولادت سعید کے بعد پہلے تین چار روز آپؐ کی والدۂ ماجدہ نے آپؐ کو دُودھ پلایا، پھر آپؐ کے چچا ابو لہب کی آزاد کردہ کنیز ثوبیہ نے، پھر حلیمہ سعدیہ نے۔ ثوبیہ کا دُودھ آپؐ کے چچا حضرت حمزہؓ نے بھی پیا تھا۔

(۱۱) حضرت حلیمہ سعدیہ قبیلہ بنو سعد یا ہوازن کی ایک حلیم الطبع خاتون تھیں، قناعت پسند، ملنسار اور صاحبدل، لیکن مفلوک الحال تھیں۔ ان کے باپ کا نام ابی ذوئیب السعدی اور شوہر کا نام حضرت حارث بن عبدالعزّیٰ تھا جو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کے بعد مکّہ تشریف لائے اور مشرف بہ اسلام ہوئے۔ حضرت حلیمہ کا اسلام لانا بھی ثابت ہے۔ آپؐ کے رضاعی بھائی حضرت عبداللہ بن الحارث (جنھوں نے آپؐ کے ساتھ دُودھ پیا تھا) کا اسلام لانا بھی ثابت ہے۔ حضرت حذافہ جن کا لقب شیمأ تھا، آپؐ کی رضاعی

بہن تھیں، ان کا اسلام لانا بھی ثابت ہے۔ غزوۂ حنین میں قبیلہ بنو ہوازن کو شکستِ فاش ہوئی تو اسیروں میں حضرت شیمأ بھی تھیں۔ آپؐ نے انھیں پہچان کر ان کے بیٹھنے کے لیے اپنی چادر مبارک بچھا دی اور بڑی قدر و مدارت کی۔ آپؐ کی دو اور رضاعی بہنیں تھیں : انیسہ اور حذیفہ۔ ان کا حال معلوم نہیں۔

(دیکھیے (۱) ابن ہشام، ۱ : ۱۵۴ ببعد، (۲) محمد حمید اللہ : رسول اکرم کی سیاسی زندگی، ص ۵۳، ۵۴، (۳) زرقانی، ص ۱۴۶، (۴) طبقات ابن سعد، ۱ : ۴۱، (۵) سیرۃ النبیؐ، ۱ : ۱۷۲ تا ۱۷۴، (۶) رحمۃ للعالمینؐ، ۱ : ۴۱، (۷) اصابۃ فی احوال الصحابہ، طبع مصر، ۱ : ۲۸۳)۔

(۱۲) شقّ الصدر کے واقعے سے متعلق ابن ہشام سے ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے۔

(حضرت حلیمہ نے فرمایا) : "اللہ کی قسم! آپؐ کو (دوبارہ) ساتھ لے کر آئی تو چند ماہ بعد ایک واقعہ رونما ہوا۔ آپؐ اپنے (رضاعی) بھائی کے ساتھ بکریوں کے بچّوں کے ریوڑ میں ہمارے گھر کے عقب میں تھے کہ آپؐ کا بھائی ہانپتا کانپتا ہمارے پاس آیا اور کہنے لگا : میرا جو قریشی بھائی ہے، اسے دو شخصوں نے، جو سفید کپڑے پہنے ہوئے ہیں، پکڑ لیا، لِٹا کر اس کا پیٹ چاک کر ڈالا اور اسے مار رہے ہیں۔ یہ سنتے ہی میں اور آپؐ کے (رضاعی) والد (حضرت حلیمہ کے شوہر) آپؐ کی طرف دوڑے اور دیکھا کہ آپؐ کے چہرے کا رنگ سخت مکدّر تھا۔ ہم نے آپؐ کو گلے لگایا اور پوچھا : ہمارے بیٹے! کیا ہوا تھا؟ آپؐ نے فرمایا : میرے پاس دو شخص آئے۔ وہ سفید کپڑوں میں ملبوس تھے۔ انھوں نے مجھے لِٹا کر میرا سینہ چاک کیا اور کوئی چیز نکالی جو میں نہیں جانتا کہ کیا تھی؟ پھر ہم آپؐ کو لے کر اپنے ڈیرے کو لوٹے۔ (ابن ہشام، ۱ : ۱۵۶ ببعد)۔ ابن اسحاق نے اس سلسلے میں مندرجۂ ذیل حدیث نقل کی ہے :

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا : میں اپنے باپ ابراہیم کی دُعا اور عیسیٰ کی بشارت ہوں۔ جب میں اپنی ماں کے بطن میں آیا تو انھوں نے دیکھا کہ ان کے اندر سے ایک نُور نکلا، جس سے بلادِ شام کے محل ان پر منکشف ہو گئے۔ بنی سعد بن بکر کے قبیلے میں دُودھ پی کر میں نے پرورش پائی۔ میں اپنے گھروں کے پیچھے

اپنے بھائی کے ساتھ تھا اور ہم بکریوں کے بچے چرا رہے تھے کہ سفید کپڑوں میں ملبوس دو شخص برف سے بھرا سونے کا ایک طشت لے کر میرے پاس آئے۔ انھوں نے مجھے پکڑا اور میرا البطن یا سینہ چاک کیا۔ میرا قلب نکالا اور اسے بھی چاک کیا۔ اس میں سے ایک کالے گوشت کا ٹکڑا نکال کر پھینک دیا۔ پھر انھوں نے میرا دل اور سینہ اس برف سے یہاں تک دھویا کہ اسے پاک وصاف کر دیا۔ فرمایا: پھر ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی سے کہا: انھیں ان کی امّت کے دس شخصوں کے مقابل تولو۔ جب مجھے ان کے مقابل تولا تو میں وزن میں ان سے بڑھ گیا — پھر اس نے کہا: ان کی امّت کے ہزار افراد کے مقابل تولو۔ اس نے مجھے ان کے مقابل وزن کیا تو میں پھر بڑھ گیا۔ (یہ دیکھ کر) اس نے کہا: انھیں چھوڑ دو۔ اللہ کی قسم! اگر تم انھیں ان کی ساری امّت کے مقابل بھی تولو گے تو یہ وزن میں بڑھ جائیں گے (ابن ہشام، ۱: ۱۵۷-۱۵۸)۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے مصنّف کو اس کا مشاہدہ ہوا ہے۔

(۱۳) ابنِ اسحاق نے وثوق سے لکھا ہے کہ آپؐ حضرت حلیمہ کے پاس چھ برس رہے۔ (دیکھیے سیرۃ النبی، ص ۱۷۳ تا ۱۷۴)۔

(۱۴) ابنِ سعد: طبقات، ۱: ۳، شبلی: سیرۃ النبی، ص ۱۷۵ بعد،

(۱۵) ابنِ سعد کے قول کے مطابق حضرت آمنہ نے مدینے میں نابغہ کے گھر مہینا بھر قیام کیا تھا۔ (یہ مکان اب مسجدِ نبویؐ کے قریب واقع ہے)۔ آپؐ چھ برس کے تھے اور اس عمر ہی میں آپؐ نے تیراکی سیکھ لی تھی۔ چنانچہ آپؐ بعد میں فرمایا کرتے تھے کہ مجھے وہ زمانہ یاد ہے جب ہم بنی النجّار کے اطم یعنی گڑھی کے سامنے کھیلا کرتے تھے۔ اطم پر کوئی چڑیا آکر بیٹھتی تو اسے اُڑانا ہمارا محبوب مشغلہ تھا۔ ڈاکٹر محمّد حمید اللہ لکھتے ہیں: اس وقت آپؐ کی عمر چھ سال کی بیان کی جاتی ہے۔ یہاں پر ایک چھوٹا سا گھریلو واقعہ بیان کرتے چلیں۔ بعد کی زندگی میں رسولِ اکرمؐ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو یاد تھا کہ آپؐ کی والدہ سوکھا گوشت (قدید) کھایا کرتی تھیں کہ ہر روز تازہ گوشت کہاں ملتا۔ (رسولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی، ص ۵۵)، نیز دیکھیے ابن ہشام، ۱: ۱۵۹ بعد۔ وہ لکھتا ہے کہ عبد المطّلب بن ہاشم کی والدہ سلمٰی بنت عمرو نجّاریہ تھیں۔ ابنِ اسحاق

نے بھی نجّار کے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ماموں ہونے کا جو رشتہ بتایا ہے، وہ یہی ہے۔ (محمد حمید اللہ: رسولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی، ص ۵۵ بعد، ابنِ سعد: طبقات، ۱: ۷۳، شبلی: سیرۃ النبی، ص ۱۷۵، ۱۷۶)۔

(۱۶) ابن ہشام نے لکھا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھویں سال میں قدم رکھا تو حضرت عبد المطّلب بیاسی برس کی عمر میں رحلت کر گئے اور حجون میں مدفون ہوئے۔ ان کی وفات واقعہ فیل سے آٹھ برس بعد ہوئی (۱: ۱۶۰)۔ حضرت عبد المطّلب کو جب اپنی موت کا یقین ہو گیا تو انھوں نے اپنی بیٹیوں کو جو چھ تھیں، جمع کیا اور فرمائش کی کہ تم سب مجھ پر نوحہ کرو، تاکہ میں مرنے سے پہلے سُن لوں کہ تم کیا کہو گی۔ ان کی صاحبزادیوں کے نام یہ دیے گئے ہیں: صفیہ، برہ، عاتکہ، امّ الحکیم البیضاء، امیمۃ اور اروی۔ ان کے اشعار ابن ہشام نے نقل کیے ہیں (۱: ۱۵۹ تا ۱۷۳)۔ علّامہ شبلی کہتے ہیں کہ عبد المطلب کی موت نے بنو ہاشم کے رتبۂ امتیاز کو دفعتہً گھٹا دیا اور یہ پہلا دن تھا کہ دُنیوی اقتدار کے لحاظ سے بنواُمیّہ کا خاندان بنو ہاشم پر غالب آ گیا۔ عبد المطّلب کی مسندِ ریاست پر اب حرب متمکّن ہوا، جو امیّہ کا نامور فرزند تھا۔ مناصبِ ریاست میں سے صرف سقایہ یعنی حجّاج کو پانی پلانا عباس کے ہاتھ میں رہا جو عبد المطلب کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے (سیرۃ النبی، ۱: ۱۷۶-۱۷۷)۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے لکھا ہے کہ حضرت عبد المطّلب کی عمر ایک سو آٹھ برس کی تھی، جب حضورِ اکرمؐ کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہوا تھا۔ (رسولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی، ص ۵۶)۔

(۱۷) (۱) طبقات، ابن سعد، ۱: ۸۰، (۲) بخاری، کتاب الاجارہ، (۳) ابن القیم، زاد المعاد، ص ۱۷۔

(۱۸) رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے: ما من نبیّ الّا وقد رعی الغنم۔ قیل: وأنت یا رسول اللّٰہ؟ .... قال: وانا: (بحوالہ ابن ہشام (ترجمہ) ۱: ۱۵۸): کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔ لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا آپ نے بھی بکریاں چرائی ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں۔

(۱۹) قومی زندگی public life

(۲۰) اللہ تعالیٰ نے مندرجۂ ذیل آیت میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (الضحٰی ۹۲ : ۷) : تجھے تلاشِ حق میں سرگرداں دیکھا تو اس کا راستہ دکھا دیا۔

(۲۱) آپؐ سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا۔ (الطّور ۵۲:۴۸) اور تم اپنے ربّ کے حکم کے انتظار میں صبر کیے رہو۔ تم تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہو۔

(۲۲) عرب میں دینِ ابراہیمیؑ کی وجہ سے لوگ توحید پرست تھے، لیکن بیرونی بُت پرست و مشرک اقوام کے میل جول کی وجہ سے ان میں بت پرستی کا رواج ہوگیا۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ قریشِ مکّہ کے سردار عمرو بن لحی نے شام جاتے ہوئے راستے میں عمالقہ کو بتوں کی پرستش کرتے دیکھا۔ لوگوں نے اسے بتایا کہ بت ان کے غوث، ان داتا، حامی و مددگار اور قاضی الحاجات ہیں۔ سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے اور بے سوچے سمجھے عمرو نے وہاں سے ایک بت لاکر بیت اللہ میں نصب کر دیا۔ اس کا نام ہبل تھا۔ اس طرح عرب میں بت پرستی کا آغاز ہوا۔ رفتہ رفتہ ایک بُت کے بجائے بیسیوں بلکہ سینکڑوں بتوں کی پرستش ہونے لگی۔ قریش اور اس کے ہم نسب قبائل کا معروض عبادات (ob jeet of worship) ہبل تھا، وہ دراصل ستارہ زحل کا خیالی مجسمہ تھا۔

لات کا ہیکل طائف میں تھا۔ عزّیٰ دیوی کا مندر نخلہ میں تھا، جو مکّے سے چند میل دور واقع تھا۔ سواع کا بُت دومۃ الجندل میں تھا اور اس کا پجاری قبیلہ ہذیل تھا۔ مجسمۂ سعد ساحل جدّہ پر نصب تھا اور یہ بنو ملکان بن خزیمہ بن مضر کا بُت تھا۔ اساف اور نائلہ کے بُت مکّے میں صفا اور مروہ پر نصب تھے۔ زائرین، مسافر اور حجّاج ان کو چومتے رہتے تھے۔ بنو ثقیف کا صنم طائف میں نصب تھا۔ جبار، مناف، اوال اور محرق کے بُت عکاظ میں تھے اور ہوازن، قریش، بکر و تغلب اور بکر و ربیعہ کے قبائل علی الترتیب ان کی پرستش کرتے تھے۔

مدینہ منوّرہ کے قبائل اوس، خزرج اور غسّان منات کی اور قبیلہ کلب جو دومۃ الجندل میں رہتا تھا، ودّ نامی بت کی پوجا کرتے تھے۔ عرب بھر میں بتوں کی تعداد کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ فتحِ مکّہ کے دن پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تو صرف اس میں تین سو ساٹھ مجسّمے اور مورتیاں تھیں۔

(۲۳) aesthetic sense ۔ جمالیاتی حسّ سے مفصّل بحث کے لیے دیکھیے مُصنّف کی کتاب

" جمالیات، قرآنِ حکیم کی روشنی میں"۔ طبع دوم، نیشنل بک فاؤنڈیشن لاہور، ۱۹۷۶ء

(۲۴) dynamic

(۲۵) taste

(۲۶) senses

(۲۷) ڈاکٹر محمد حمید اللہ لکھتے ہیں ..... درونِ خانہ کی بے تکلف زندگی ہی نہیں، سنجیدہ شہر دارانہ محفلوں میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ جب دادا قبیلے کے اہل رائے لوگوں کے ساتھ ہم بزم ہوتے اور سرداری اور حاکمِ عدالت یا پنچ کی حیثیت سے اس کے لیے مسند بچھائی جاتی تو اس وقت بھی لاڈلا پوتا ساتھ رہتا اور مسند ہی پر اپنے لیے بھی جگہ چاہتا۔ لوگ منع کرتے اور کسی کونے میں بیٹھنے کو کہتے، لیکن دادا فوراً دخل دے کر اپنے بازو میں لے لیتے اور بتاتے کہ بچّے میں خود شناسی کا نادر وصف ہے اور وہ اپنے آپ کو بزرگ سمجھتا ہے اور مجھے امّید ہے کہ وہ بڑے مرتبے والا ہوگا۔

(رسولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی، ص ۵۶)۔

(۲۸) aesthetic taste جمالیاتی حسّ اور جمالیاتی ذوق کے فرق کے لیے دیکھیے محوّلہ بالا " جمالیات قرآنِ حکیم کی روشنی میں"۔ ص ۱۷۲ تا ۱۷۶۔

(۲۹) aesthetic pleasure بحث کے لیے دیکھیے محوّلہ بالا کتاب "جمالیات" موضع مذکور

(۳۰) احسان : حضرت عُمرؓ بن خطاب کی روایت میں ہے کہ (حضرت جبریلؑ) نے آپؐ سے پوچھا : احسان کے متعلّق بتائیے؟ آپؐ نے فرمایا : احسان یہ ہے کہ ان تعبد اللہ کانّکَ تراہ فان لّم تکن تراہ فانّہ یراکَ ۔ یعنی تو اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرے کہ جیسے تو اسے دیکھ رہا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو (یعنی یہ مقامِ شاہدیت میسّر نہ ہو) تو پھر اس طرح ہو کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ (یعنی یہ مقامِ مشہودیّت ضروری ہے)۔ احسان دراصل مقامِ شہود سے عبارت ہے۔ اس کی پہلی منزل مقامِ مشہودیّت اور دوسری منزل مقامِ شاہدیت ہے۔ مقامِ شاہدیت کی منزلِ آخر کے لیے قرآنِ مجید نے " مقامِ محمود " کی تعبیر اختیار کی ہے : وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا۔ (الاسراء ۱۷ : ۷۹) : اس (یعنی قرآنِ حکیم) کے لیے رات کے

آخری حصّے میں بیدار ہوا کرو اور تہجّد کی نماز پڑھا کرو اور یہ تمھارے لیے مزید عبادت (additional worship) ہے۔ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھیں مقامِ محمُود پر متمکن کرے۔ اس آیت میں یہ لطیف نکتہ مضمر ہے کہ رات کے آخری حصّے میں قرآنِ مجید کی بامقصد تلاوت اور اس پر غور و فکر کرنے سے انسان کو مقامِ شاہدیّت و محمودیّت حاصل ہوتا ہے۔

(۳۱) حکیمانہ تفکّر سے مراد ادراکِ حقائق کی خاطر بامقصد اور سائینٹفک غور و فکر ہے۔ اس سے انسان میں فکر و عقل نشو و ارتقاء کرتی اور اسے حقیقت تک رسائی حاصل کرنے میں بہت مدد دیتی ہے۔ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اہلِ عقل و فکر سے تعبیر کیا ہے: اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۝ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۝ (آلِ عمران، ۳ : ۱۹۰، ۱۹۱) : بیشک آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور رات اور دن کے بدل بدل کر آنے جانے میں اہلِ عقل و دانش کے لیے (حق کی) نشانیاں ہیں، (اور یہ اہلِ عقل و دانش) وہ لوگ ہیں جو کھڑے بیٹھے اور لیٹے (ہر حال میں) اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں غور و فکر کرتے رہتے ہیں (اور حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے بعد کہتے ہیں) اے ہمارے ربّ! تو نے یہ کائنات بے مقصد پیدا نہیں کی۔ تو باطل امور سے پاک و منزّہ ہے۔ ہمیں آگ کے عذاب سے محفوظ رکھیو۔

(۳۲) pre-requisite

(۳۳) object of love.

(۳۴) قرآن مجید میں دنیا کی بامقصد سیر و سیاحت پر بہت زور دیا گیا ہے۔ دیکھیے یوسف ۱۲ : ۱۰۹، الحجّ ۲۲ : ۴۶ و مواضع کثیرہ۔

(۳۵) ابن ہشام : ۱ : ۱۷۴ تا ۱۷۷۔ علاّمہ شبلی نے اس واقعہ کے متعلق محقّقانہ بحث کی ہے۔ (سیرۃ النبی، ۱ : ۱۷۹ تا ۱۸۱)۔

(۳۶) mental age

(۳۷) (۱) طبقات ابن سعد، ۱ : ۴۷ ببعد، (۲) محمد حمید اللہ : رسولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی ص ۶۰۔

(۳۸) یہ تفصیلات کتب حدیث و سیرت میں متفرق مقامات پر ملتی ہیں۔

(۳۹) ابن ہشام (۱ : ۱۷۸ تا ۱۸۴) نے اس جنگ میں آپؐ کی عمر چودہ یا پندرہ برس لکھی ہے۔

(۴۰) ابن سعد : طبقات، ۱ : ۴۷ ببعد، محمد حمید اللہ : رسولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی، ص ۶۳، ۶۴

(۴۱) روض الانف، ۱ : ۱۲۰، ابن سعد : طبقات، ۱ : ۸۲، حاکم : مستدرک، ۲ : ۲۲۰، محمد حمید اللہ وہی کتاب ص ۶۷۔ روض الانف میں اس حلف کی عربی عبارت یہ ہے : باللہ لیکونن یداً واحدۃً مع المظلوم علی الظالم حتّی یودی الیہ حقہ مابلّ بحر صوفۃ و مارسیٰ حراء و ثبیر مکانہما و علی التأسی فی المعاش۔

(۴۲) حاکم : مستدرک، ۲ : ۲۲۰

(۴۳) علاّمہ شبلی : سیرۃ النبی، ۱ : ۱۸۳ و حواشی۔

باب : ۲

عُنفوانِ شباب وجوانی

۱ : معاشی زندگی اور غمِ انسانیّت

۲ : آپؐ کے تین اُصول : صداقت ، امانت اور محنت

۳ : حضرت خدیجہ طاہرہؓ کے کاروبار میں بحیثیت فعّال شریک کے شمولیّت

۴ : مُتأہّل زندگی کا آغاز : اُمّ المؤمنین حضرت خدیجۃُ الکبریٰؓ سے نِکاح

۵ : حضرت قاسمؑ کی ولادت و وفات

۶ : گھریلو اور سماجی زِندگی

۷ : کعبے کی تعمیرِ نَو میں آپؐ کا کردار

۸ : حواشی وتشریحات

باب ۲

عُنفوانِ شباب سے جوانی تک

بچپن میں آپؐ راعی بنے۔ بکریوں سے آپؐ کو بہت پیار تھا۔ جب بنو ہوازن میں تھے تو بکریوں کے بچوں سے کھیلا کرتے تھے[1] حیاتیاتی ارتقار[2] کی طرح آپؐ کی محبت بھی ارتقاء کر کے انسانیت کو محیط ہونے والی تھی اور آپؐ بنی نوع انسان کے راعی بننے والے تھے، لیکن بارانِ رحمت کے قطرے کو صدفِ حیات میں گُہر بننے تک ابھی کئی اور مرحلوں سے گزرنا تھا۔ اگرچہ آپؐ نو دس برس کے لڑکے تھے، لیکن عبقری یا نابغہ[3] ہونے کے باعث ذہنی اعتبار سے بلوغت کو پہنچ چکے ہوں گے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ آپؐ نے اپنے چچا کے ہمراہ فلسطین (شام) ایسے دور دراز ملک میں جانے پر اصرار کیا تھا تاکہ اُن کا ہاتھ بٹائیں۔ اس سفر کے بعد پچّیس برس کی عمر تک آپؐ نے معاشی زندگی کیسے گزاری؟ آپؐ نے پھر بیرونِ ملک سفر کیے یا نہیں؟ تاریخ سے ان سوالوں کا مفصّل و قطعی جواب نہیں ملتا۔ البتہ مختلف ذرائع سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپؐ نے اپنے چچا کے ساتھ ایک سے زائد بار تجارتی سفر کیے تھے[4] اور مکّے میں آپؐ اکیلے یا چچا کے ساتھ کاروبار کرتے تھے۔ علاوہ بریں، آپؐ اپنا مالِ تجارت دساور کو جانے والے کاروانِ تجارت کے سپُرد بھی کر دیا کرتے تھے۔ احادیث و آثار سے اس بات کا سراغ بھی ملتا ہے کہ آپؐ لوگوں کا تجارتی مال بھی دساور سے جایا کرتے تھے[5]

عالمِ شباب میں بھی آپؐ کی صداقت و دیانت مسلّمہ تھی اور ایفائے عہد آپؐ کا شعار تھا۔ ان صفات کی متعدد مثالیں کتبِ حدیث و سیرت میں ملتی ہیں۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن الحمساَ سے مروی ہے کہ میں نے نبیِ کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے کوئی کاروباری معاملہ کیا تھا (نبوّت سے پہلے)، لیکن وہ ابھی ادھورا تھا۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ پھر آؤں گا۔ اتفاق سے تین دن تک مجھے

اپنا وعدہ یاد نہ رہا۔ تیسرے دن جب میں وعدے کی جگہ پہنچا تو آپؐ کو وہاں منتظر پایا، لیکن اس وعدہ خلافی سے آپؐ کی پیشانی پر بل تک نہ آیا۔ صرف اتنا فرمایا کہ تو نے مجھے زحمت دی۔ میں تین روز سے یہاں انتظار کر رہا ہوں۔[۶]

کاروبار میں آپؐ کی عالی ظرفی، بلند حوصلگی اور استغنا کے بھی کئی واقعات مذکور ہیں: مثلاً سُننِ ابوداؤد میں ہے کہ حضرت قیس بن سائبؓ مسلمان ہو کر آپؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو لوگوں نے ان کی تعریف کی۔ آپؐ نے فرمایا: میں انھیں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ حضرت سائبؓ نے کہا: آپؐ پر میرے ماں باپ قربان ہوں۔ آپؐ تو میرے شریکِ تجارت تھے۔ کتنے اچھے شریک تھے۔ نہ حیل وحجت کرتے تھے، نہ تکرار ہی۔[۷] حضرت قیس بن السائبؓ بھی جو آپؐ کے شریکِ کاروبار تھے، بیان کرتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم سے بہتر مجھے شریک نہیں ملا۔ اگر ہم آپؐ کا سامانِ تجارت لے کر (دساور) جاتے تو واپسی پر آپؐ ہمارا استقبال کرتے اور خیریت پوچھ کر لوٹ جاتے (لیکن مال سے متعلق کوئی بات نہ کرتے)، اور بعد میں حساب کتاب کے وقت حجّت وتکرار نہ کرتے حالانکہ دوسرے لوگ سب سے پہلی بات اپنے مال کی کیا کرتے تھے۔ اس کے علی الرغم اگر آپؐ ہمارا سامانِ تجارت لے کر باہر جاتے تو واپسی پر جب تک کوڑی کوڑی کا حساب چکا نہ دیتے، گھر نہ جاتے تھے۔ اسی لیے آپؐ ہم میں "الامین" (دیانت دار و راست باز) کے لقب سے معروف تھے۔[۸]

بعثت سے پہلے جو آپؐ کا کردار تھا، وہی بعد میں بھی تھا، اور جن باتوں کی آپؐ بعثت کے بعد نصیحت فرمایا کرتے تھے، وہ آپؐ کے کردار کا ایک حصّہ بن چکی تھیں۔ چنانچہ کاروباری اخلاق سے متعلق آپؐ کے اصول نقل کیے جاتے ہیں: اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم کرتا ہے جو خرید، فروخت اور تقاضے کے موقعوں پر نرمی کرتا ہے۔[۹] آپؐ ہی کا ارشاد ہے کہ جو شخص خرید وفروخت کے معاملے میں لوگوں سے احسان کرتا، تقاضے کے وقت مقروض کو خوشحالی تک مہلت دیتا اور تنگ دست کو قرض معاف کر دیتا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس نیکی کی بدولت اسے جنّت میں داخل کر دیا۔[۱۰]

راستبازی آپؐ کی کاروباری حکمتِ عملی کی اساس تھی۔ آپؐ گاہک کو اپنے مال کے اوصاف کے ساتھ اگر کوئی عیب ہوتا، تو بھی بیان کرنے کے عادی تھے اور یہ آپؐ کا امتیازی وصف تھا۔ چنانچہ آپؐ لوگوں سے ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص عیب دار چیز بیچے اور اس کے عیب ظاہر نہ کرے، وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے غضب کا شکار رہتا ہے اور فرشتے ہمیشہ اس

پر لعنت کرتے رہتے ہیں۔[۱۱] تاجر عموماً قسمیں کھانے کے عادی تھے، لیکن آپؐ کو اس طرح قسمیں کھانے سے نفرت تھی۔ چنانچہ آپؐ لوگوں سے فرمایا کرتے تھے کہ زیادہ قسمیں نہ کھاؤ کہ اس سے قسمیں کھانے کا رواج ترقی کرتا ہے اور برکت کو زائل کرتا ہے۔[۱۲] لیکن جھوٹی قسمیں کھا کر مال بیچنا آپؐ کے نزدیک انتہائی بددیانتی اور گناہ کبیرہ تھا اور اس کی سزا بھی اتنی ہی بڑی ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ جھوٹی قسمیں کھا کر مال بیچنے والا ان تین اشخاص میں سے ہے جن سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بات نہیں کرے گا، نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ ان کا تزکیہ ہی کرے گا، پھر ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔[۱۳]

آپؐ کے نزدیک تجارتی کردار کی جو غیر معمولی اہمیّت تھی، اس کا اندازہ آپؐ کی اس حدیث سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے: سچّا اور دیانت دار تاجر نبیّوں، صدّیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔[۱۴]

مختصر یہ کہ نہ صرف تجارت میں بلکہ ہر شعبۂ زندگی میں آپؐ کے اصولوں یا حکمتِ عملی کو ان تین الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے: صداقت، امانت اور محنت۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ آپؐ کو "صادق" اور "امین" سمجھتے اور کہتے تھے۔ اس جگہ اس امر کی صراحت بھی کر دی جاتی ہے کہ آپؐ کا فلسفۂ اخلاق محض نظریاتی نہ تھا بلکہ عملی۔ تجربی تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ جو کرتے تھے، وہ کہتے تھے۔ اس موقع پر یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ آپؐ نے جن اخلاقِ حسنہ یا حسنِ کردار کا مظاہرہ کیا، بعثت کے بعد ان کی تبلیغ و وصیّت کی۔ آپؐ کی حکمتِ عملی سے اس اصول کا استقرار کیا جاسکتا ہے کہ مادّی تعمیر ہو یا معنوی اس کے لیے مضبوط و مستحکم اساس ایک ناگزیر پیش شرط ہے۔

عرب کے تمام معاشروں میں سُود کو ایک مسلّمہ وجائز ضرورت کے طور پر قبول کر لیا گیا تھا۔ عرب تجارت پیشہ تھے اور سُود ان کی تجارت کا جزوِ لاینفک بن چکا تھا۔ لیکن سُود چاہے کاروباری نوعیت کا ہو یا کسی اور نوعیّت کا، وہ بُرائی ہے اور بُرائی کبھی نیکی نہیں ہو سکتی، چاہے کسی معاشرے میں استحصالی قوتوں نے اسے ضروری کیوں نہ بنا دیا ہو، جیسا کہ آجکل کے سرمایہ دارانہ نظام میں سود کو غلط طور پر ناگزیر سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ آپؐ کے سینے میں ایک عظیم عبقری اور صاحبدل و رحمۃ للعالمین کا دل تھا، لہٰذا آپؐ کو شروع ہی سے سُود سے نفرت تھی، اور جیسا کہ ہم آگے چل کر معلوم کریں گے کہ آپؐ کے نزدیک سُودکاری انسانیّت سوز پیشہ

تھا۔ چنانچہ آپؐ نے نہ کبھی سُود لیا نہ دیا۔ چونکہ سودی کاروباری نظام میں بلاسُود قرض ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا تھا، لہٰذا آپؐ کو محدود سرمائے سے کاروبار کرنا اور محدود آمدن پر اکتفا کرنا پڑتا تھا۔ جیسا کہ آپؐ کی بعد کی زندگی بھی شاہد ہے، آپؐ کو دولت کی ہوس نہ تھی۔ آپؐ کو لہو و لعب سے نفرت تھی۔ قناعت آپؐ کا شعار تھا اور فقر سے آپؐ کو محبّت تھی۔ نیز آپؐ کا دل غمِ انسانیت سے معمور تھا اور دل کے ظرف کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا تھا کہ اس میں کُل بنی نوعِ انسان کی محبت نے سمانا تھا۔ پھر اس حقیقت سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا کہ بدقماش و استحصالی معاشرے میں آپؐ ایسے صادق و امین اور قانع و فقر پسند انسان کے پاس نہ تو دولت جمع ہوسکتی تھی اور نہ ہُوئی۔

آپؐ کو اپنا غم نہ تھا، کیونکہ اپنی گزراوقات کے لیے آپؐ کما سکتے بلکہ کما لیتے تھے۔ غم تھا تو آپؐ کو چچا کے خاندان اور ان کی کفالتی ذمّہ داریوں کا۔ لہٰذا آپؐ نے چچا کے ارشاد پر مکے کی معروف و متموّل تاجرہ، جس نے آگے چل کر اوّلین مومنہ و اُمّ المومنین بننا تھا کا فعّال شریکِ تجارت بننا منظور کرلیا۔ اس معزز قریشی خاتون کا نام خدیجہؓ[15] تھا، اور وہ ان صفاتِ حسنہ سے متّصف تھیں، جو عورت کو مثالی بناتی ہیں۔ ان کی عادات پاکیزہ، ذوق لطیف اور زندگی مُطہر تھی، اس لیے معاشرے میں "طاہرہ" کے لقب سے معروف تھیں۔ دولت کی فراوانی کے ساتھ اللہ تعالٰے نے انھیں کاروباری حسّ بھی عطا کی تھی اور یہ ان کی ایک امتیازی خوبی و خصوصیّت تھی۔ چنانچہ وہ اپنے سرمائے کو محجوب رکھنے کے حق میں نہ تھیں بلکہ ہمیشہ متحرّک رکھنے میں کوشاں رہتی تھیں۔ کہتے ہیں کہ اہلِ مکّہ کا کاروانِ تجارت بیرونِ ملک جاتا تو اکیلا ان کا مالِ تجارت باقی تمام تاجروں کے سامانِ تجارت کے برابر ہوتا تھا۔[16] ایک طرف حضرتِ خدیجہ طاہرہؓ کو بے سرمایہ فعّال شریکِ کاروبار[17] کی حاجت تھی تو دُوسری جانب آپؐ کو کاروبار کرنے کے لیے سرمایہ لگانے والے غیر فعّال شریک[18] کی ضرورت تھی۔ قدرت نے دو مثالی انسانوں کو ملانے کے لیے "مشترکہ احتیاج" کا بہانہ بنایا۔ اس "تزویج" نے آگے چل کر اسلام کی انقلاب انگیز تحریکِ رحمۃ للعالمینی کے لیے آپؐ کو غمِ معاش و روزگار سے بے نیاز کردینا تھا۔ کاروبار کرنے کی پیش کش پہلے آپؐ کے چچا کی طرف سے ہوئی یا خود حضرت خدیجہؓ کی جانب سے، جو آپؐ کی امانت و صداقت اور محنت و فراست کا شہرہ سُن چکی تھیں، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ شرائطِ کاروبار طے ہوئیں۔ ایک تجارتی قافلہ بُصریٰ

جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا، آپؐ حضرت خدیجہؓ کا سامان تجارت لے کر اس میں شریک ہوگئے۔ حضرت خدیجہؓ بڑی دُور اندیش تھیں اور کاروباری مقتضیات کو اچھی طرح سمجھتی تھیں، انھوں نے اپنا معتمد و زیرک غلام، جس کا نام میسرہ تھا، نیز اپنے ایک رشتے دار خزیمہ کو بھی آپؐ کے ساتھ کردیا۔[19] آپؐ کی تجارتی حکمتِ عملی، صداقت و دیانت اور امانت و محنت رنگ لائی اور نفع معمول سے زیادہ ہوا۔ قافلہ واپس وطن پہنچا تو میسرہ نے حضرت خدیجہؓ کے سامنے آپؐ کی اس حکمتِ عملی کی تصدیق کی، نیز دیگر اوصافِ حمیدہ کی بہت تعریف کی۔ اس سے وہ بے حد متاثّر ہوئیں اور آپؐ میں انھیں ایک مطلوبہ و مثالی فعّال شریکِ کاروبار کے اوصاف نظر آئے۔ چنانچہ انھوں نے آپؐ کو خصُوصی مراعات دیں اور کئی مرتبہ آپؐ کو اپنا سامانِ تجارت دے کر بیرونِ ملک بھیجا۔[20]

سفر و شرکت میں انسان کے محاسن و معائب کا پتا چلتا ہے۔ چنانچہ ہر سفر و شرکت کے بعد حضرت خدیجہؓ پر آپؐ کی شخصیت کے جوہر اور مکارمِ اخلاق کُھلتے چلے گئے اور ان کے اثرات بتدریج گہرے اور محکم ہوتے چلے گئے، حتّٰی کہ انھوں نے آپؐ کو شریکِ کاروبار کے ساتھ شریکِ حیات بنانے کا بھی فیصلہ کرلیا۔ حضرت خدیجہؓ کے حُسنِ صورت، حُسنِ خُلق، عصمت و عفت، طہارت و نفاست کے علاوہ تجارتی فراست کا بھی شہرہ تھا اور رؤسائے مکہ میں سے ہر ایک انھیں اپنا شریکِ حیات بنانے کا متمنّی و طلب گار تھا۔ وہ ایک حسین خواب تھیں اور یہ خواب شہرِ آرزو تھا، جس کی تعبیر کے لیے کئی روسائے مکّہ نے اپنا پیغامِ نکاح بھی بھیجا، لیکن ان کے حُسنِ نظر نے کسی کو اپنے لیے منتخب نہ کیا۔ حضرت خدیجہؓ دوبار ازدواجی زندگی کی بہار و خزاں دیکھ چکی تھیں۔ اب انھیں غالبًا ایسے شوہر کی آرزُو تھی جو حُسنِ خُلق اور حُسنِ خَلق دونوں لحاظ سے عظیم ہو اور جب ان کی نظرِ بینا نے آپؐ کی شخصیت میں دونوں اوصاف مجتمع پائے تو ان کی عقل و دل و نگاہ کا یہ فیصلہ ہوا کہ آپؐ ہی عظیم انسان ہیں اور آپؐ ہی مثالی شریکِ حیات ہوسکتے ہیں۔ تاریخ نے ثابت کردیا کہ ان کا فیصلہ سچّا اور درست تھا۔

دولت و امارت کے فقدان کے باوجود آپؐ مکّے کی ایک معزز شخصیّت تھے۔ اپنے اور بیگانے سبھی آپؐ کی انسان دوستی، صدق و شرافت، ہمدردی و غم گساری اور حسنِ کردار کے معترف و مدّاح تھے۔ لیکن جب انھیں حضرت خدیجہؓ کے اس فیصلے کی اطلاع ہوئی کہ انھوں نے حضرت محمدّ بن عبداللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو نکاح کے لیے منتخب کیا ہے تو وہ حیران رہ گئے

کیونکہ ہر استحصالی معاشرے کی طرح اس دَور کے مکّی معاشرے میں بھی دولت و امارت ہی کو عزت و شرف کا معیار سمجھا جاتا تھا۔ بہرکیف حضرت خدیجہؓ کے اس فیصلے سے صاف مترشّح ہوتا ہے کہ وہ سلیم الفطرت، اسلام پسند اور صاحب الرائے تھیں اور ان میں جرأتِ اقدام بھی تھی۔

متأہّل زندگی کا آغاز

۲۷ قبل ہجرت / ستمبر ۵۹۵ء : حضرت خدیجہؓ سے نکاح

قدرت نے آپؐ کو نوعِ انسانی کی نجات، فلاح و بہبود، رُشد و ہدایت اور خیر و برکت کے لیے منتخب کیا تھا اور اس کے لیے آپؐ کو یہ زرّیں موقع فراہم کیا تھا، جس سے آپؐ نے کماحقّہٗ فائدہ اٹھایا۔ آپؐ نے اپنے سرپرست چچا حضرت ابوطالب کے مشورے سے یہ رشتہ قبول کر لیا اور آپؐ کا یہ فیصلہ آپؐ کی دانائی و مستقبل بینی اور فراست و حکمت کا آئینہ دار ہے۔ نکاح کے وقت آپؐ پچیس برس کے عفّت مآب و صاحبِ جمال و جلال مرد تھے جبکہ حضرت خدیجہؓ چالیس برس کی بیوہ تھیں اور حُسنِ صورت و سیرت کے باوصف دو بار متاہّل زندگی گزار چکی تھیں۔ بہرکیف نکاح کی تقریبِ سعید حضرت خدیجہؓ کے مکان پر ادا ہوئی جس میں خاندان کے اکابر نے، جن میں حضرت ابوطالب اور حضرت حمزہؓ بھی تھے، شرکت کی۔ حضرت خدیجہؓ کے باپ خویلد حربِ فُجّار سے پہلے انتقال کر چکے تھے۔ چنانچہ ان کی جگہ ان کے بھائی عمرو بن اسد نے سرپرست کی حیثیت سے شرکت کی۔ چچا کے علاوہ حضرت خدیجہؓ کے چچیرے بھائی ورقہ بن نوفل بھی اس محفل میں شریک تھے۔ حضرت ابوطالب نے نکاح کا خطبہ پڑھا اور پانچ سو درہم مہر مقرر ہوا۔[۲۲] شبِ عروسی کے بعد آپؐ نے ضیافتِ ولیمہ بھی دی۔ حضرت خدیجہؓ کے اصرار پر آپؐ ان کے گھر چلے آئے جہاں پر محبت و مسرّت اور آرام و آسائش کی ہر چیز آپؐ کی منتظر تھی۔ (۲۷ قبل ہجرت / ۵۹۵ء)۔

شادی کے وقت آپؐ کی عمر پچّیس سال اور حضرت خدیجہؓ کی چالیس برس تھی۔ ایک روایت کی رو سے ان کی عمر ۲۸ برس تھی۔[۲۲] ان کا پہلا نکاح ابوہالہ ہند بن زرارۃ بن النبّاش بن عدی التمیمی سے ہوا تھا، جس سے تین اولادیں ہوئیں: دو لڑکے اور ایک لڑکی۔ لڑکوں کے نام ہند اور الحارث اور لڑکی کا نام زینت تھا۔ ابوہالہ کی وفات پر حضرت خدیجہؓ کا دوسرا نکاح عتیق بن عائذ بن عبداللہ

بن عمر بن مخزوم سے ہوا، جن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام بھی ہند تھا اور وہ اُمِّ محمد کی کنیت سے معروف ہوئیں۔

پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کی متاہل زندگی ہر اعتبار سے مثالی تھی۔ اگر آپؐ مثالی شوہر تھے تو حضرت خدیجہؓ مثالی بیوی تھیں جنھوں نے آپؐ کو محبّت، دولت اور اولاد دی اور گھر کو طمانیّت و مسرّت کی جنّت بنا دیا۔ چنانچہ اپنے، بیگانے، ہمسائے سب آپؐ کی ازدواجی زندگی کو مثالی سمجھتے، اس پر رشک کرتے اور ان کی تعریف میں رطب اللّسان رہتے۔ اس نکاح کا حاصل چھے اولادیں تھیں۔ دو صاحب زادے اور چار صاحب زادیاں۔ ترتیبِ زمانی یہ تھی: قاسمؓ، زینبؓ، رقیہؓ، اُمِّ کلثومؓ، فاطمہؓ، عبداللہؓ۔ (ان کا لقب طیّب اور طاہر تھا، کیونکہ نبوّت کے بعد پیدا ہوئے تھے)۔ دونوں صاحب زادے صغر سنی میں انتقال کر گئے۔ قاسم کے نام پر آپؐ کی کنیت ابوالقاسم تھی۔ حضرت ابراہیم کے علاوہ جو حضرت ماریہ کے بطن سے تھے، آپؐ کی تمام اولاد حضرت خدیجہؓ کے بطن سے تھی، جن کی دوسری فضیلت یہ ہے کہ ان کی زندگی میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے دوسری شادی نہیں کی۔[۲۳]

حضرت خدیجہؓ سے آپؐ کا نکاح اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کے حوالے سے، جو آپؐ نے بعثت یعنی پندرہ برس بعد شروع کرنا تھی، ازبس اہمیت رکھتا ہے۔ آپؐ کی ازدواجی زندگی طمانیت و مسرّت کے لحاظ سے مثالی تھی۔ حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کو محبّت بھی دی، اولاد بھی دی اور آپؐ کو معاشی احتیاجات سے مستغنی بھی کر دیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جب آپؐ مبعوث ہوئے اور آپؐ نے اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کا آغاز کیا تو سب سے پہلے انھوں نے اسلام قبول کیا اور آپؐ سے اس معاملے میں پورا پورا تعاون کیا۔ یہ عام مشاہدے و تجربے کی بات ہے کہ عورت جس کے دل میں شوہر کی محبت ہو اور والہانہ ہو، اور اس نے دیدہ و دل کے ساتھ مال و دولت بھی فرشِ راہ کیے ہوں، وہ کب برداشت کر سکتی ہے کہ اس کا معروضِ محبت اسلام کی انقلابی تحریک ایسے کارِ توجّہ طلب کاموں میں مشغول ہو جائے؟ لیکن حضرت خدیجہؓ نے اپنے معروضِ محبّت کے مشاغل سے کبھی تعرّض نہ کیا اور کبھی شکوہ نہ کیا اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ آپؐ دن کو رفاہی کاموں میں بھرپور حصّہ لیتے اور رات کو یادِ الٰہی اور مسائلِ زندگی پر غور و فکر کرتے رہتے۔ آپؐ کو مال و دولت، نام و نمود، آرام و راحت اور لہو و لعب وغیرہ سے قطعًا رغبت نہ تھی۔ آپؐ ان چیزوں سے اس قدر مستغنی تھے کہ حضرت خدیجہؓ کو اس پر حیرت ہوتی تھی اور آپؐ کے اس

رویّہ استغنا سے ان کے قلب پر جو اثرات مرتب ہوئے، ان کی وجہ سے محبّت رنگِ عقیدت سے مزیّن ہو گئی۔ آپؐ نے جو عظیم و بے مثال کارنامہ انجام دینا تھا، اس کی لگن بھی آپؐ کو ودیعت کی گئی تھی، گو اس کی نوعیت ابھی آپؐ پر منکشف نہیں ہوئی تھی۔ مندرجۂ ذیل آیت میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے : اور تمھیں حقیقت معلوم کرنے کی لگن میں سر گرداں دیکھا تو اسے منکشف کر دیا۔[24] امتدادِ وقت کے ساتھ یہ لگن اضطراری طور پر بڑھتی چلی گئی، اور اس نے آپؐ کی توجّہ کو دُنیوی مشاغل کی طرف نہ ہونے دیا۔ آپؐ کو اپنے نامعلوم مشن سے محبّت تھی، جس کی نوعیت ان دیکھے خدا کی طرح وہبی و اضطراری اور سچّی تھی، اس لیے آپؐ کے دل و دماغ پر اس کے اثرات شدید، گہرے اور انمٹ تھے۔ اس محبّت کا تیرِ نیمکش دل میں مستقلاً خلش پیدا کرتا رہتا اور آپؐ سوچتے رہتے، حتّٰی کہ جب آگے چل کر سوزِ محبّت اور سوزِ فکر ہم آہنگ ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے قلبِ مبارک میں نبوّت کی شمع روشن کر دی اور آپؐ پر اپنے مشن کی نوعیّت و حقیقت منکشف ہو گئی۔

۲۵ قبل ہجرت / ۵۹۸ء : حضرت قاسمؓ کی ولادت و وفات

شادی کے تین سال بعد یعنی ۲۵ قبل ہجرت/۵۹۸ء میں جب آپؐ نے عُمر کی اٹھائیسویں منزل میں قدم رکھا تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو حضرت خدیجۃؓ الکُبریٰ کے بطن سے فرزند عطا فرمایا جسے قاسم کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس عطائے ربّانی سے آپؐ کو بڑی مسرّت ہوئی۔ اسی نسبت سے آپؐ کی کُنیت ابو القاسم تھی جسے آپؐ پسند فرماتے تھے۔ حضرت قاسمؓ پاؤں چلنا سیکھ چکے تھے لیکن ابھی زندگی کی دوسری بہار ہی دیکھ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد آپؐ کے دوسرے فرزند حضرت ابراہیمؓ جو حضرت قاسمؓ کے بعد پیدا ہوئے تھے، کم سنی ہی میں وفات پا گئے۔[25] اس طرح لوگوں کی نظروں میں آپؐ اولادِ نرینہ سے محروم رہ گئے۔

اولادِ نرینہ اس عہد کے جنگجو قبائل میں بڑی اہمیت رکھتی تھی، کیونکہ بیٹے قوّت، عزّت اور مال و دولت کا وسیلہ ہوتے تھے اور لوگ بجا طور سے ان پر ناز و افتخار کرتے تھے۔ چنانچہ جب آپؐ نے آگے چل کر چالیس برس کی عمر میں اپنی بعثت کا اعلان اور تحریکِ اسلام کا آغاز کیا تو اہلِ کُفر و شر آپؐ کو اولادِ نرینہ سے محرومی کا طعنہ دیتے اور طنزاً "ابتر" کہتے تھے، یعنی ایسا شخص جو مقطوعُ النّسل ہو اور دنیا میں اس کا کوئی نام لیوا باقی نہ رہے۔ اصل حقیقت تو خدائے علیم و حکیم

ہی جانتا ہے کہ کیوں اللہ تعالیٰ نے آپؐ سے اولادِ نرینہ کی امانت جلد واپس لے لی، لیکن میرے نزدیک اس میں سہ گونہ حکمت مضمر تھی۔ اوّلاً، اسلام اس عہد کے انسان میں بالخصوص اور ہر عہد کے لوگوں میں بالعموم اس حقیقت کا اذعان و ایقان پیدا کرنا چاہتا تھا کہ عزت کا معیار دولت و اولادِ نرینہ نہیں بلکہ تقوٰی ہے، اور ثانیاً، اس کی قوّت کا سرچشمہ ایمان و حسن سے معمُور زندگی ہے، ثالثاً آپؐ خاتم النبیّین تھے، یعنی آپؐ کے ساتھ نبوّت کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہو جانا تھا اور قُدرت کو یہ گوارا نہ تھا کہ سیّد المرسلینؐ کے فرزند فیضانِ نبوّت سے محروم رہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے بیٹوں کو کم سنی ہی میں اپنے پاس بُلا لیا لیکن اس کے بدلے آپؐ کو الکوثر عطا کیا۔ مندرجۂ ذیل صورت میں اسی واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے :

(اے پیغمبرِ اعظم و آخرؐ) ہم نے تمھیں کوثر عطا کیا۔ پس تم اپنے ربّ کے لیے نماز پڑھتے رہو اور قربانی کرتے رہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تمھارا دُشمن ہی ابتر ہے۔[26]

کوثر عربی زبان کا ایسا لفظ ہے جس کے معنی و مفہوم کی وسعت و گہرائی پر کسی زبان کا کوئی لفظ بھی حاوی نہیں ہو سکتا۔ الکوثر میں ان موضوعی، معروضی اور اُخروی نعمتوں کی کثرت و بوقلمونی کا مفہُوم پایا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو عطا کی تھیں اور جن کی طرف مجمل اشارے کیے جاتے ہیں :

(الف) **موضوعی نعمتیں** : (ا) اِلٰہ، انسانیت اور کائنات کی محبتّ، جس کے لیے رحمۃ للّعالمینی کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ (ب) عظمتِ خُلق : آپؐ میں مکارمِ اخلاق بدرجۂ اتّم پائے جاتے تھے، جن کی وجہ سے آپؐ صاحبِ جمال و جلال تھے اور آپؐ کی شخصیّت میں بے پناہ جاذبیّت تھی۔

(ب) **رُوحانی نعمتیں** : (ا) اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو معراج کی نعمت سے نوازا، اور یہ ایسی نعمت ہے جس کا انسان تصوّر تک نہیں کر سکتا۔ اس سیرِ لامکانی و لازمانی کے دوران میں آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے زندگی کے بڑے بڑے حقائق (آیاتِ الکُبریٰ) کا مشاہدہ کرایا[27] جس کی روشنی میں آپؐ نے ہر زمان و مکان کے انسان کے لیے مثالی معاشرے کی تشکیل و تعمیر کرنی تھی۔ (ب) مقامِ محمُود : اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو عبدیّت کے بلند ترین مقام پر متمکّن فرمایا جو حمد و ستائش کا مقام ہے۔[28] (ج) چنانچہ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف اِنس و جان بلکہ خود اللہ تعالیٰ بھی آپؐ پر سلام و درود بھیجتے ہیں۔[29]

(د) رفعتِ ذکرِ جمیل : دُنیا میں جس عقیدت و کثرت کے ساتھ آپؐ کا ذکرِ جمیل ہوتا ہے اور آپؐ پر درود و سلام بھیجا جاتا ہے، نیز آپؐ کی تعلیمات کا چرچا ہوتا ہے اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔

(ج) موضوعی، معروضی نعمتیں : علم و حکمت : آپؐ کا اپنا ارشاد ہے کہ میں "مدینۃُ العلم" یعنی علم کا شہر ہوں۔[۳۰] علاوہ بریں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو عالمِ انسانی کا معلّم اور ادیب و مُربّی بھی بنایا۔ چنانچہ آپؐ کی نظری و عِلمی تعلیمات سے ہر دَور کا انسان چودہ صدیوں سے مُستفید ہو رہا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہے گا۔

(د) معروضی نعمتیں : (ا) ہمہ گیر فتوحات : اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو زندگی کے ہر شعبے میں عظیم کامیابیاں عطا کیں، مثلاً مذہب و سیاست، معاشیات و عمرانیات، ثقافت و اخلاقیات اور رُوحانیات و حربیات وغیرہ۔

(ر) حکومت و سیادت اور قوّت و صولت : اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو متّحدہ عرب کی حکومت عطا فرمائی، جس کی وسعت ایک لاکھ میل رقبے کو محیط تھی اور جس نے وسیع ہو کر دنیا کی عظیم ترین سلطنت بننا تھا۔

(س) اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اسلام کی تحریک رحمۃ للعالمینی اور ہر زمان و مکان کے انسان کے لیے مثالی معاشرے کا بانی بنایا۔

(ص) اُمّتیوں کی کثرت : کفار و مُشرکین، جن میں اہلِ کتاب بھی شامل تھے، آپؐ کو طعنہ دیتے تھے کہ آپؐ ابتر ہیں یعنی آپؐ کا کوئی وارث اور نام لیوا نہیں۔ لیکن تاریخ کا فیصلہ یہ ہوا کہ ابتر دراصل وہ تھے، جن کو زمانے نے ہمیشہ کے لیے فراموش کر دیا اور حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا اور جہاں تک آپؐ کا تعلق ہے، دنیا کے ہر خطّے میں ہر رنگ و نسل کے لوگ لاکھوں، کروڑوں کی تعداد میں آپؐ کے اُمّتی ہیں یعنی آپؐ کے وارث، نام لیوا اور متّبعین ہیں۔

حدیث و سیرت کی کتابوں میں آپؐ کی گھریلو زندگی سے متعلق جو معلومات ملتی ہیں، ان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آپؐ اپنے بیوی بچّوں سے بہت محبّت کرتے تھے۔ ان کے ساتھ کھاتے پیتے، بیٹھتے اُٹھتے اور گھُل مل کر باتیں کیا کرتے تھے۔ بچّوں کی تربیّت کی طرف خصوصی توجّہ فرماتے۔ انھیں آداب سکھاتے اور ان کا تزکیہ کرتے تاکہ انھیں سُننا، دیکھنا اور

سوچنا آ جائے۔ نیز آپؐ ان میں محاسنِ اخلاق کی اہمیّت کا شعور بیدار کرتے اور انھیں ہمیشہ سچ بولنے، پاک و صاف رہنے، محنت کرنے اور دوسروں کے ساتھ عدل و احسان کرنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ اگرچہ آپؐ کاروبار اور سماجی کاموں میں مشغول رہتے اور پھر تفکّر مسلسل بھی آپؐ کی عادت تھی، لیکن اس کے باوجود آپؐ اہل و عیال کو ان کا وقت ضرور دیتے تھے تاکہ انھیں کم التفاتی اور تنہائی کا احساس نہ ہو۔ آپؐ کے اور بیوی بچّوں کے طرزِ عمل سے گھر میں وہ سب کچھ تھا جو ایک مثالی گھرانے میں ہونا چاہیے۔ اس میں بیوی بچّوں کے لیے شوہر کی محبّت اور باپ کی شفقت کی فراوانی بھی اور شوہر کے لیے گھر حسن المآب تھا، جس میں بیوی کی والہانہ محبّت کے جمالیاتی مناظر بھی تھے اور بچّوں کے پیار کے معصوم نظارے بھی۔ حضرتِ خدیجہؓ پہلی خاتون تھیں جو شریکِ حیات اور معروضِ محبّت بن کر آپؐ کی زندگی میں داخل ہوئی تھیں۔ وہ آپؐ کی سلیقہ شعار بیوی بھی تھیں اور ہمدرد و غمگسار رفیق بھی، ہمدم و ہمراز بھی تھیں اور مشیر و معاون بھی۔ چنانچہ ان کی شخصیت و محبّت کے اثرات آپؐ کے دل و دماغ پر اس طرح مُرتسم ہوئے کہ زمانہ انھیں مٹا نہ سکا۔ کہنے کو تو حضرت خدیجہؓ پچیس برس آپؐ کی دنیا میں رہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ آپؐ کے دل کی دنیا میں ہمیشہ رہیں۔ چنانچہ آپؐ ان کی وفات کے بعد اپنی ازواجِ مطہّرات سے ان کا ایسے محبّت بھرے انداز میں ذکر فرمایا کرتے تھے کہ انھیں رشک آتا تھا اور وہ اپنے رشک کا اظہار بھی کر دیا کرتی تھیں چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بیویوں میں سے جتنا رشک مجھے حضرت خدیجہؓ پر آتا تھا اتنا کسی اور بیوی پر نہیں آتا تھا، حالانکہ میں نے ان کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ لیکن رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ان کو کثرت سے یاد کرتے اور ان کا ذکر فرمایا کرتے تھے، اور جب کبھی آپؐ کوئی بکری ذبح کرتے تو اس کے گوشت کے پارچے کر کے حضرت خدیجہؓ کی سہیلیوں کو بھیجا کرتے تھے۔ بعض اوقات (رشک سے) آپؐ سے کہہ دیا کرتی تھیں کہ گویا دنیا میں حضرت خدیجہؓ کے سوا اور کوئی عورت ہے ہی نہیں۔ آپؐ جواباً فرماتے : ہاں، خدیجہؓ ایسی ہی تھی۔ اس کے بطن سے میری اولاد ہوئی۔[۳۱]

اس میں شک نہیں کہ آپؐ نے جس عظیم کام کو آگے چل کر انجام دینا تھا، اس کے لیے بے احتیاجی اور غمِ روزگار سے فراغت لازمی تھی اور اس کی ضمانت حضرت خدیجہؓ کی مرفہ الحالی نے فراہم کر دی تھی، لیکن اس کے باوجود آپؐ کاروبار بھی کرتے تھے۔ چونکہ آپؐ کی توجہ اپنے ان دیکھے اللہ اور نامعلوم مشن پر مرتکز رہتی تھی، اس لیے آپؐ عموماً دوسروں سے مل کر کاروبار کرتے تھے۔[۳۲]

چونکہ آپؐ میں بُخل، طمع یا جذبۂ نمود و نمائش کا شائبہ تک نہ تھا اور نہ آپؐ کو عیش و عشرت اور امارت و وجاہت ہی کی طلب و آرزو تھی، لہٰذا کاروبار سے جو کچھ مِلتا، آپؐ اسی پر قناعت کرتے، لیکن دل کی فیاضی اور انفاق فی سبیل اللہ کی عادت بدستور قائم رہی۔ آپؐ کی کمائی سے عزیز و اقارب، اپنے بیگانے، سائل اور محروم سب متمتّع ہوتے رہے۔ سخاوت و کرم گستری، ہمدردی و غمخواری، مہر و وفا اور دوستی و خدمتِ خلق آپؐ کے سرچشمۂ رحمت کے اوّلین دھارے تھے۔[۳۳]

ایک بار مکّہ معظمہ میں قحط پڑا تو آپؐ اور حضرت خدیجہؓ دونوں نے رشتے داروں اور عوام کی مقدور بھر مالی اعانت کی۔ اس زمانے میں آپؐ کے چچا حضرت ابوطالب پر خاندان کی کفالتی ذمہ داریوں کا بوجھ بہت زیادہ تھا جسے ہلکا کرنے کی خاطر آپؐ ان کے صاحبزادے حضرت علیؓ کو اپنے گھر لے آئے۔ اس طرح ایک تو حضرت علیؓ کو آپؐ کی آغوشِ تربیت میں نشو و نما پانے کا، اور دوسرے آپؐ کو اپنے مربّی چچا کی جوابی خدمت کرنے کا موقع مِل گیا۔[۳۴]

۱۸ قبل ہجرت / ۶۰۵ء: کعبہ کی تعمیرِ نَو

کعبے کی تعمیرِ نَو کا مسئلہ قریشِ مکّہ کے لیے غیر معمولی اہمیّت رکھتا تھا۔ وہ تعمیرِ نَو کو تو سعادت سمجھتے تھے، لیکن اس کی تخریب سے خوف بداماں تھے، جو ناگزیر تھی، کیونکہ اس سے انھیں عذابِ الٰہی میں مبتلا ہوجانے کا اندیشہ تھا۔ بیت اللہ کی تعمیرِ نو ناگزیر بھی تھی کیونکہ آتش زدگی اور طغیانی کی وجہ سے اس کی عمارت بوسیدہ و شکستہ ہو چکی تھی۔ اُس زمانے میں اس کی چھت نہ تھی اور اس کا طول و عرض نو نو بالشت اور ارتفاع چھ فٹ سے زائد تھا۔ تعمیرِ نو کے لیے عمارتی سامان بھی میسّر آچکا تھا۔ لکڑی اہلِ روما کے ایک تجارتی سفینے سے دستیاب ہوئی تھی جو جدّہ (شعیبہ) کے قریب سے گزر رہا تھا کہ طوفان کی زد میں آکر اس کے ساحل پر چڑھ آیا اور ٹوٹ پھوٹ گیا۔ قریشِ مکّہ نے جہاز کی لکڑی خرید لی۔ بعض روایات کے مطابق اس جہاز میں جو مصر سے حبشہ کو جا رہا تھا، ایک گرجے کی تعمیر کے لیے عمارتی سامان (سنگِ مرمر، لوہا، لکڑی وغیرہ) لدا ہوا تھا، جسے اہلِ مکّہ نے بیت اللہ کی تعمیر کے لیے خرید لیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس جہاز میں باقوم نامی ایک قبطی (مصری) معمار بھی تھا جو اہلِ مکّہ کے کہنے پر یا ان کا حسنِ سلوک دیکھ کر مکّے میں بس گیا تھا۔

قریش نے بالآخر خانۂ کعبہ کی پُرانی عمارت کو ڈھانے اور نئی عمارت بنانے کا عزم کرلیا۔

کعبے کی چار دیواروں کی تعمیر ایک ایک کر کے قریش کے اہم خانوادوں (یعنی عبد مناف و بنی زہرہ، بنی مخزوم و بنی تمیم، بنی سہم و بنی جمح، بنی عبدالدار، بنی اسد، بنی عدی) نے اپنے ذمّے لے لی۔ لیکن اس کی عمارت کو منہدم کرنے سے سخت لرزاں و ترساں تھے۔ چنانچہ سب سے پہلے ولید بن مغیرہ نے جرأت کی اور ادب و احترام کے ساتھ اسے ڈھانے کی ابتدا کی۔ جب اس پر کوئی عذاب نہ آیا تو دوسروں کو بھی یہ کام کرنے کا حوصلہ ہوا۔ پھر تعمیر کا کام شروع ہوا جس میں مکّے کے عوام و خواص سب نے سعادت و ثواب کی خاطر حصّہ لیا۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم بھی اس کارِ خیر میں شریک تھے۔ آپؐ نے مزدوروں کی طرح کام کیا۔ اب عمارت کے طول و عرض کو دوگنا کر کے اسے کشادہ نیز اونچا اور مسقّف کر دیا گیا۔ کعبے کا کچھ حصّہ کُھلا چھوڑ دیا گیا، جسے حِجر یا حطیم کہتے تھے۔ یہ حصّہ عہد و پیمان کرنے اور حلف اُٹھانے وغیرہ کے کام آنے لگا، جو ہر شخص پر ہر وقت کُھلا رہتا تھا۔ لیکن اصل کعبے کے اندر لوگوں کو ہفتے میں دو دن یعنی پیر (دوشنبہ) اور جمعرات کو، نیز خاص خاص موقعوں پر جانے کی اجازت تھی۔ دیواریں قریب قریب چُنی گئیں اور حجرِ اسود کو اس کی جگہ رکھنے کا مرحلہ آیا تو قبائل میں زبردست نزاع پیدا ہوگیا، کیونکہ ہر قبیلہ یہ چاہتا تھا کہ اس مقدس پتھر کو نصب کرنے کا اعزاز اسے حاصل ہو۔ چنانچہ قبائل میں جتھا بندی ہوگئی اور وہ لڑنے مارنے پر تیار ہوگئے۔ صورتِ حال انتہائی سنگین ہوگئی، لیکن ان کے ایک معزّز و سالخوردہ سردار کے مشورے پر، جس کا نام ابوامیّہ بن المغیرہ تھا، سب قبائل اس بات پر متفق ہوگئے کہ جو شخص اس حرم کے دروازے سے سب سے پہلے داخل ہو اسے اس معاملے میں اپنا حَکَم یا ثالث بنا لیا جائے۔ لوگوں نے دیکھا کہ سب سے پہلے آنے والا شخص آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم ہیں تو ان کے مُنہ سے بیساختہ نکلا: یہ تو "امین" ہے۔ ہم جانتے ہیں یہ محمّدؐ ہے۔ ہم اس کے فیصلے پر راضی ہیں۔ چنانچہ آپؐ کو حَکَم کی حیثیت سے معاملے کی صورتِ حال سے آگاہ کیا گیا۔ جس اعزاز کی خاطر قریش کشت و خون پر آمادہ تھے، آپؐ کو وہ اعزاز آسانی سے مِل سکتا تھا۔ لیکن آپؐ عالی ظرف و صلح جُو اور عادل و مُحسن تھے، لہٰذا آپؐ کو یہ گوارا نہ ہو سکتا تھا اور نہ ہوا۔ قدرت نے آپؐ کو جرأتِ اقدام اور قوتِ فیصلہ بھی بدرجۂ اتم ودیعت کی تھی۔ آپؐ کو فوراً ایک تجویز سوجھی اور ایک چادر منگوائی۔ پھر جُملہ قبائل کے نمایندوں سے کہا کہ وہ چادر کو مضبوطی سے تھام لیں۔ آپؐ نے حجرِ اسود کو (جو لمبائی اور چوڑائی میں تقریباً چودہ پندرہ انچ تھا) اپنے دستِ مبارک سے چادر میں رکھا اور سرداروں سے

فرمایا کہ چادر کو اونچا کرتے جائیں، یہاں تک کہ جائے تنصیب تک بلند ہو گئی اور آپؐ نے حجرِ اسود کو اٹھا کر نصب کر دیا۔ اس طرزِ عمل سے اہلِ مکّہ مطمئن اور خوش ہو گئے اور خانہ جنگی کی ہلاکت آفرینیوں اور ان کے دُور رس نتائج و عواقب سے بچ گئے۔ یہ واقعہ آپؐ کی قبل از نبوّت زندگی سے متعلّق دو شہادتیں فراہم کرتا ہے: ایک یہ کہ آپؐ نہ صرف عادل بلکہ احسان پیشہ بھی تھے اور آپؐ میں خود غرضی کا شائبہ تک نہ تھا۔ دوسرے اہلِ مکّہ آپؐ کو متفقہ طور سے "امین" مانتے اور کہتے تھے اور انھیں آپؐ کی بصیرت و حکمت اور قوّتِ فیصلہ پر اعتماد تھا۔[۳۵]

تعمیرِ کعبہ سے متعلّق ایک اہم نکتے کی طرف اشارہ کر دینا بھی ضروری ہے۔ رؤسائے قریش نے جب بیت اللہ شریف کی تعمیرِ نو کا عزم کیا تو اس کے تقدس کے پیشِ نظر یہ فیصلہ بھی کیا کہ اس پر صرف حلال و جائز کمائی کا پیسہ صَرف کیا جائے گا اور اس میں حرام کمائی کو شامل نہیں کیا جائے گا، مثلاً کسبیوں کی کمائی، سُود اور ظُلم سے کمایا ہوا پیسہ۔ اس فیصلے سے باشعور اور صاحبدل لوگوں پر یقیناً یہ حقیقت منکشف ہو گئی ہو گی کہ کسبِ حرام بہرصورت ظلم و گناہ ناجائز و ناروا ہے اور یہ کمائی ناپاک و نجس ہوتی ہے اور رسم و رواج اور روایت و اجماع سے حرام، ناجائز اور ناپاک کمائی کسی صورت بھی حلال، جائز اور پاک نہیں ہو سکتی۔ بالفاظِ دیگر روحانی و اخلاقی اقدار حقیقی و مطلق اور عالمگیر و غیر مبدّل ہیں، لہٰذا کسی معاشرے میں روحانی و اخلاقی برائیاں عام بھی ہوں تو عمومیّت انھیں نیکیوں میں تبدیل نہیں کر سکتی اور اس سے یہ لازم آتا ہے کہ روحانی و اخلاقی اقدار اضافی یا قابلِ تغیّر و تبدل نہیں ہیں۔ اپنے اکابر کے اس فیصلے سے صالح طبائع میں یقیناً اخلاقی و روحانی اقدار کا شعور بیدار ہوا ہو گا اور انھیں اپنے بزرگوں کے ان افعال سے یقیناً ندامت محسوس ہوئی ہو گی جن کو انھوں نے خود ہی حرام، ظلم اور ناپاک قرار دیا تھا۔ حرام و حلال اور ناپاک و پاک کمائی میں تفریق پیدا کر کے رؤسائے قریش نے نوجوان طبقے کے دلوں میں بالخصوص اخلاقی، رُوحانی اور جمالیاتی قدروں سے محبّت اور ظلم و استحصال اور جرم و گناہ سے نفرت کا بیج بو دیا جس کی آبیاری عنقریب تحریکِ اسلام نے کرنی تھی۔

تعمیرِ کعبہ کے سلسلے میں آپؐ کی سیرت کا ایک اور واقعہ بھی اہمیّت میں اس سے بہت زیادہ ہے جتنا کہ عام طور سے سمجھا جاتا ہے۔ مکّے میں لوگ مفلسی، ضرورت اور رواج کی وجہ سے عمارتی سامان (مثلاً اینٹیں، پتھر وغیرہ) ڈھوتے وقت اپنے تہمد (جو ان کا قومی لباس تھا) اُتار کر کندھے پر رکھ لیتے تھے تاکہ اسے گزند نہ پہنچے۔ تعمیرِ کعبہ کے دَوران میں

دوسرے لوگ تو اپنے تہمد کندھے پر رکھ کر ننگے سامان ڈھوتے تھے لیکن آپؐ تہمد باندھے سامان ڈھوتے تھے۔ نتیجتہً پتھروں کی رگڑ سے آپؐ کے کندھوں پر خراشیں آ گئیں۔ یہ دیکھ کر آپؐ کے چچا حضرت عبّاسؓ نے آپ کو تہمد کندھے پر رکھنے کا مشورہ دیا۔ امتثالِ امر میں آپؐ نے ایسا کیا ہی تھا کہ احساسِ عریانی سے آپؐ کو اس قدر حیا آئی اور ندامت محسوس ہوئی کہ آپؐ تیورا کر گر پڑے اور فوراً تہمد باندھ لیا۔ یہ آپؐ کا آخری تجربہ تھا۔[۳۶] یہ واقعہ آپؐ کی فطری حیا و طہارت اور عفّت و معصومیّت پر دلالت کرتا ہے۔

حواشی و تشریحات

(۱) ابن ہشام ۱ : ۱۵۶ ببعد

(۲) Biological evolution

(۳) Genius

(۴) روض الانف ، ۱ : ۵۴۔

(۵) سُنن ابوداوٗد ، کتاب الادب ، باب فی کراھیة المراء ، الاصابة ، ۵ : ۳۵۳۔

(۶) سنن ابوداوٗد ، کتاب الادب ، باب الوعد ، ۴ : ۴۱۔

(۷) سنن ابوداوٗد . کتاب الادب ، باب فی کراھیة المراء ۔

(۸) الاصابہ ، ۵ : ۳۵۳۔

(۹) بخاری ، بحوالہ مشکوٰة ، باب المساھلة فی المعاملة ۲ : ۹ ، ح ۲۶۶۹۔ (اس کے راوی حضرت جابرؓ ہیں)۔

(۱۰) مسلم ، موضوع مذکور ، ح ۲۶۷۰ (راوی حضرت حذیفہؓ)۔

(۱۱) ابن ماجہ ، بحوالہ مشکوٰة ، باب المنھی عنہا من البیوع ، ۲ : ۲۵ ، ح ۲۷۴۹ (راوی حضرت واثلہ بن اسقعؓ)۔

(۱۲) مسلم ، بحوالہ مشکوٰة ، باب المساھلة فی المعاملة ، ۲ : ۲۶۷۱ ، ۲۶۷۲۔ راوی حضرت ابی قتادہؓ و حضرت ابوہریرہؓ)۔

(۱۳) مسلم ، موضوع مذکور ، ح ۲۶۷۳ (راوی حضرت ابوذرؓ)۔

(۱۴) ترمذی ، دارمی ، دارقطنی ، موضوع مذکور ، ح ۲۶۷۴۔

(۱۵) حضرت خدیجہؓ کا نسب یہ ہے : خدیجہؓ بنت خویلد (بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی) ان کی والدہ کا نام فاطمہ بنت زائد تھا ۔ ان کی کنیت اُمّ ہند اور لقب طاہرہ تھا ۔ وہ

قصی بن کلاب کی پڑپوتی تھیں اور قصی حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے جدِّ اعلیٰ تھے۔ پندرہ برس کی عمر میں حضرت خدیجہؓ کا نکاح ہند بن نبّاش سے ہوا جو ابوہالہ کے نام سے مشہور تھے۔ ان سے حضرت خدیجہؓ کے بطن سے تین لڑکے پیدا ہوئے : ہالہ ، طاہر اور ہند۔ یہ تینوں صحابی ہیں۔ ہند کی پرورش آپؐ نے کی تھی۔

حضرت خدیجہؓ کا ابھی عنفوانِ شباب ہی تھا کہ سہاگ کا چمن اجڑ گیا۔ اکیس برس کی عمر میں ابوہالہ کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد ان کا نکاح عتیق بن عاید مخزومی سے ہوا۔ ان سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام بھی ہند تھا۔ یہ بھی اسلام لائی تھیں۔ حضرت خدیجہؓ کو جلد ہی اپنے اس شوہر کی مفارقتِ ابدی کا بھی صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ عتیق نے بہت سا مال ترکے میں چھوڑا جو ان کے حصّے میں آیا۔ تیسری بار انھوں نے اپنے عم زادہ صیفی بن اُمیّہ سے نکاح کیا جو حربِ الفجار میں مارا گیا۔ اس کے بعد حضرت خدیجہؓ نے بیوہ ہی رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ زندگی کو مصروف رکھنے کا انھیں جلد ہی موقع مل گیا۔ ان کے والد خویلد سن رسیدگی کی وجہ سے ضعیف ہوگئے تو انھوں نے اپنا وسیع کاروبار حضرت خدیجہؓ کے سپرد کر دیا۔ (ابنِ ہشام ، ۱ : ۱۸۲ ببعد)۔

(۱۶) ابن سعد : طبقات ، ۱ : ۱۲۹۔

(۱۷) Active Partner

(۱۸) Sleeping Partner

(۱۹) ابنِ ہشام ، ۱ : ۱۸۰ - ۱۸۱ ببعد۔ موضوع مذکور ، محمد حمید اللہ : رسولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی ، ص ۷۰ ببعد۔

(۲۰) محمد حمید اللہ ، کتاب مذکور ، ص ۶۹ ببعد۔

(۲۱) محمد حمید اللہ ، کتاب مذکور ، ص ۷۷ ، لیکن ابنِ ہشام کی روایت میں ہے کہ جب حضرت خدیجہؓ نے نکاح کا پیام رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے پاس بھیجا تو آپؐ نے چچاؤں سے اس کا ذکر کیا۔ آپؐ کے چچا حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب آپؐ کے ساتھ گئے۔ خویلد بن اسد کے پاس جا کر حضرت خدیجہؓ سے آپؐ کی نسبت قرار دی اور آپؐ کا عقد ہوگیا۔ (ص ۱۸۲)۔ محمد حمید اللہ نے نکاح کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "مکّے کا قاعدہ معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی چاہے کنواری ہو یا دو بچوں کی ماں

اپنے بزرگانِ خاندان کی منظوری کی محتاج تھی۔ آنحضرتؐ تو اپنے چچاؤں کو لے کر لڑکی کے گھر پہنچے، لیکن لڑکی کو ابھی جرأت نہیں ہوئی تھی کہ اپنے بزرگوں سے کہتی۔ غالباً وہ ڈرتی بھی تھی کہ افلاس سے تعصّب برتا جائے گا۔ بی بی خدیجہؓ کے باپ خویلد کا حربِ فجار کے زمانے سے بھی کچھ پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ اب چچا عمرو بن اسد سے اجازت لینی تھی۔ بی بی نے راز کو آخر تک راز رکھا۔ صرف نکاح کے دن ایک ضیافت کر کے جس میں گائے ذبح کی گئی تھی، چچا کو بلوایا اور کھلانے کے بعد خوب پلایا بھی اور جب وہ نشے میں چُور ہو گیا تو بی بی نے چچا پر عبا و قبا بھی ڈال دی اور خلوق یعنی زعفران ملا ہوا عطر بھی مل دیا اور پھر آنحضرتؐ کو بلا بھیجا اور کہا کہ اب اپنے چچا ابوطالب سے کہہ کر ابھی یہاں آ کر منگنی کریں۔ ابوطالب نے حسبِ رواج لڑکے کی تعریف کی اور کہا (یعنی خطبہ پڑھا) ـــــ عمرو بن سعد نے نشے میں اور ایک روایت میں بی بی کے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل نے اس کی تائید کی ـــــ پھر ہر طرف مبارک سلامت کا غُل ہوا..... گھر لانے کے بعد آنحضرتؐ نے ولیمہ بھی کیا اور دو ایک اُونٹ ذبح کیے گئے۔ (رسولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی، ص ۷۶۔ ۷۷۔ نیز دیکھیے مولوی محمد عبداللہ: خطباتِ نبویؐ، لاہور ۱۹۲۴، ص ۵ تا ۲۷)۔

میری تحقیق ورائے میں محمد حمید اللہ کی روایت درست نہیں ہے۔ اس معاملے میں مولانا شبلی کی تحقیق معقول اور قرینِ صواب ہے۔ وہ لکھتے ہیں: حضرت خدیجہؓ نے ان اسباب کے لحاظ سے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے پاس پیغام بھیجا کہ آپؐ میرا مالِ تجارت لے کر شام کو جائیں۔ جو معاوضہ میں اوروں کو دیتی ہوں، آپؐ کو اس کا مضاعف دوں گی ـــــ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے قبول فرمایا اور مالِ تجارت لے کر بُصریٰ تشریف لے گئے۔ واپس آنے کے تقریباً تین ماہ بعد حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کے پاس شادی کا پیغام بھیجا۔ ان کے والد کا انتقال ہو چکا تھا، لیکن ان کے چچا عمرو بن اسد زندہ تھے۔ عرب میں عورتوں کو یہ آزادی حاصل تھی کہ شادی بیاہ کے متعلق خود گفتگو کر سکتی تھیں اور اس میں بالغہ نابالغہ کی قید نہ تھی۔ حضرت خدیجہؓ نے چچا کے ہوتے خود براہِ راست تمام مراتب طے کیے۔ تاریخ معین پر ابوطالب اور تمام رؤسائے خاندان، جن میں حضرت حمزہ بھی

تھے، حضرت خدیجہؓ کے مکان پر آئے۔ ابوطالب نے خطبۂ نکاح پڑھا اور پانچ سو درہم مہر قرار پایا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے والد زندہ تھے اور ان کی موجودگی میں نکاح ہوا، لیکن وہ شراب میں مخمور تھے۔ جب ہوش میں آئے تو نکاح کا حال سُن کر برہم ہوئے کہ یہ برابر کا جوڑ نہیں۔ لیکن یہ روایت صحیح نہیں۔ امام سُہیلی نے بہ تصریح اور بہ دلیل ثابت کیا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے والد جنگِ فجار سے قبل انتقال کر چکے تھے (سیرۃ النّبی، ۱ : ۱۸۸، ۱۸۹)۔

حضرت ابوطالب کے خطبے کا متن یہ ہے: الحمد الله الذی جعلنا من ذرّیہ ابراھیم و زرع اسمٰعیل وضئضئ معد و عنصر مضر وحضنة بیته وسواس حرمه وجعل لنا بیتاً محجوجاً وحرماً امناً وجعلنا الحکام علی الناس۔ ثم ان ابن اخی محمّد ابن عبدالله لایوزن به رجل الارجع به۔ وان کان فی المال قلّ فان المال ظل زائل وامرحائل۔ ومحمّد من قد عرفتم قرابة منی قد خطب خدیجة بنت خویلد و بذل لها من الصدّاق ما اٰجلّه من مالی عشرین بعیرا وھو والله بعد ھٰذا لهٗ بناء عظیم وخطرجلیل۔

ترجمہ: حمد وثنا اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے جس نے ہمیں (حضرت) ابراہیمؑ کے فرزند اور اسماعیلؑ کی اولاد سے بنایا اور معد و مضر کی اصل سے پیدا کیا۔ اپنے گھر کا پاسبان اور اپنے حرم کا پیشوا بنایا اور ہمارے لیے ایسا گھر بنایا کہ ہر طرف سے لوگ اس کی زیارت کی نیت سے آتے ہیں۔ ایسا حرم عنایت فرمایا کہ جو شخص وہاں آ جائے امان میں ہو جاتا ہے اور ہمیں لوگوں کا حاکم بنایا۔ امّا بعد۔ یہ میرے بھائی کا لڑکا محمدؐ بن عبداللہ ہے، جس کی ہمسری قریش کا کوئی شخص نہیں کر سکتا، مگر یہ کہ وہ افضل رہے گا۔ البتّہ مال و دولت اس کے پاس کم ہے، مگر مال و دولت ڈھلتی چھاؤں اور آنی جانی چیز ہے۔ محمدؐ وہ شخص ہے جس کی میرے ساتھ قرابت و یگانگت سے تم لوگ اچھی طرح واقف ہو۔ وہ خدیجہؓ بنتِ خویلد سے نکاح کرنا چاہتا ہے اور میرے مال میں سے بیس اونٹ مہر مقرر کرنا چاہتا ہے، اور اللہ کی قسم اس کی شان عظیم اور مرتبہ شاندار ہے۔

اس خطبے کے جواب میں رواج کے مطابق حضرت خدیجہؓ کے چچازاد بھائی نے خطبہ پڑھا : اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ! جس نے ہمیں ویسا ہی بنایا جیساکہ آپ نے ذکر کیا اور ہمیں وہ تمام فضیلتیں عطا فرمائیں، جنھیں آپ نے بیان کیا۔ لٰہذا ہم سب لوگ عرب کے سردار اور پیشوا ہیں اور آپ تمام فضائل کے اہل ہیں۔ کوئی گروہ آپ کے فضائل کا انکار نہیں کرسکتا اور کوئی شخص آپ کے افتخار و شرف کا انکار نہیں کرسکتا۔ بے شک ہم نے نہایت رغبت سے آپ کے ساتھ شامل ہونے اور ملنے کو پسند کیا ہے۔ پس اے قریش! گواہ رہو کہ میں نے خدیجہ بنت خویلد کو محمدؐ بن عبداللہ کی زوجیت میں دیا، چار سو مثقال (طلائی مہر یا دینار) مہر کے عوض۔

عمرو بن اسد نے بھی ورقہ بن نوفل کی طرح کہا کہ میں نے خدیجہ بنت خویلد کو محمدؐ بن عبداللہ کی زوجیت میں دیا۔

(۲۲) ابن حبیب : کتاب المحبر۔ یہ روایت اصح معلوم ہوتی ہے۔

(۲۳) البخاری : الصحیح ، کتاب بدأ الوحی ، ابن القیم : زادالمعاد ، ۱ : ۵۱ ، ابن سعد : الطبقات ، ۸ : ۳۵ ، شبلی : سیرۃ النبی ، ۱ : ۱۸۷ ، ابن حزم : جمہرۃ انساب العرب ، ص ۲۱۰ ، وہی مصنف : جوامع السیرۃ ، ص ۳۱ ببعد ، ابن حجر : الاصابۃ ، ۴ : ۲۷۳ ببعد اردو دائرہ معارف اسلامیہ ، ۸ : ۸۵۹ تا ۸۶۸ ، بذیل مادہ خدیجہ ، ابن ہشام : ۱ : ۱۸۱ ببعد ، ابنِ حبیب : المحبّر ، ص ۷ ببعد ، ابن کثیر : البدایہ والنہایہ ، ۵ : ۲۹۳ ببعد ، ابن الجوزی : صفۃ الصفوۃ ، ۲ : ۲ ببعد۔ شیعی نقطۂ نظر کے لیے دیکھیے تعلیقہ در اردو دائرہ معارف اسلامیہ ، بذیل مادہ خدیجہ ، الطبری : تاریخ الامم و الملوک ، الجزء الثانی ، طبع حسینیہ ، مصر ، احمد بن ابی یعقوب ، ابن واضع : تاریخ الیعقوبی ، طبع نجف ۱۳۵۸ھ ، محمد باقر المجلسی : حیات القلوب ، جلد ۲ ، طبع نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۱۶ء۔ الذہبی : سیر اعلام النبلاء ، الاستیعاب ، ۲ : ۶۱ ببعد ، اسدالغابۃ ، البلاذری : انساب الاشراف ، ۱ : ۴۰۶۔

(۲۴) وَوَجَدَکَ ضَالًّا فَهَدٰی (الضحٰی ۹۳ : ۷)۔

(۲۵) لڑکوں کے علاوہ ام المومنین حضرت خدیجہ طاہرہؓ کے بطن سے مندرجۂ ذیل اولادیں ہوئیں : (۱) ۲۳ ق ھ / ۶۰۰ء میں سیّدہ زینبؓ (۲) ۲۰ ق ھ / ۶۰۳ء میں

سیّدہ رقیہؓ (۳) تقریباً ۱۹ ق ھ / ۶۰۴ء میں سیّدہ اُمِّ کلثومؓ (۴) ۱۸ ق ھ / ۶۰۵ء میں حضرت فاطمۃ الزہراؓ۔

(ا) سیّدہ زینبؓ کا نکاح مکّہ معظمہ ہی میں حضرت ابوالعاصؓ بن ربیع سے ہوا تھا۔ سیّدہؓ تو سابقون میں سے تھیں، لیکن حضرت ابوالعاصؓ ہجرت کے بعد تحریکِ اسلام میں شامل ہوئے تھے۔ ۸ ہجری میں سیّدہ کا اور ۱۲ ہجری میں حضرت ابوالعاصؓ کا انتقال ہوا۔

(ب) سیّدہ رقیہؓ سابقون میں تھیں۔ ان کا نکاح ابولہب کے بیٹے عتبہ سے ہُوا تھا۔ مگر رخصتی نہ ہوئی تھی کہ آپؐ نے اپنی نبوّت کا اعلان کیا۔ اس پر مشتعل ہوکر بُت پرست قریشِ مکّہ نے لالچ اور معاشرتی دباؤ ڈال کر عتبہ کو مجبور کردیا کہ وہ سیّدہ کو رخصتی سے پہلے ہی طلاق دے دے۔ حضرت عثمانؓ تحریکِ اسلام میں شامل ہوئے تو سیّدہ کا نکاح ان سے ہوا۔ ۵ ق ھ میں انھوں نے حضرت عثمانؓ کے ہمراہ حبش کی طرف ہجرت کی۔ ۲ ہجری میں سیّدہ نے وفات پائی۔

(ج) سیّدہ اُمِ کلثومؓ بھی سابقون میں سے تھیں۔ ان کا نکاح آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت سے پہلے ابولہب کے بیٹے عتیبہ سے ہوا، لیکن اس نے بھی اپنے بھائی عتبہ کی طرح قریشِ مکہ کے معاشرتی دباؤ میں آکر سیدہ اُمِ کلثومؓ کو رخصتی سے پہلے ہی طلاق دے دی۔ حضرت رقیہؓ کے انتقال کے بعد آپؐ نے ۳ ہجری میں سیدہ اُمِّ کلثومؓ کا نکاح حضرت عثمانؓ سے کردیا۔ اسی بنا پر اُن کو "ذوالنّورین" کہتے ہیں سیدہ کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ انھوں نے شادی کے چھ برس بعد شعبان ۹ ہجری میں وفات پائی۔

(د) حضرت فاطمۃ الزہراؓ آپؐ کی سب سے چھوٹی اور عزیز ترین صاحبزادی ہیں۔ ان کے القاب زہراؑ ، طاہرہ ، ذاکیہ ، راضیہ ، مرضیہ اور بتُول ہیں۔ ان کی شادی حضرت علیؓ سے ہوئی۔ سیّدہؓ کے بطن سے حضرت امام حسنؓ ، حضرت امام حسینؓ ، سیّدہ اُمِّ کلثومؓ اور سیدہ زینبؓ پیدا ہوئیں۔ سیّدہؓ نے پیغمبر اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کے وصال کے چھ ماہ بعد انتیس یا تیس سال کی عمر میں ، ۳ رمضان المبارک ۱۱ ہجری میں وفات پائی۔

(۲۶) الکوثر ۱۰۸ : ۱ تا ۳۔
(۲۷) بنی اسرائیل ۱۷ : ۱۔
(۲۸) الاسرآ ۱۷ : ۷۹۔
(۲۹) الاحزاب ۳۳ : ۵۶۔
(۳۰) حدیثِ نبویؐ۔
(۳۱) ابنِ سعد' ۱ : ۱۳۲ ببعد' ابن ہشام ۱ : ۱۹۵ تا ۱۹۸ ببعد' مسلم 'کتاب الفضائل' فضائلِ خدیجہؓ' ۶ : ۹۰' بخاری' باب تزویج النبی، خدیجہؓ وفضلہا' ۲ : ۲۱۶۔
(۳۲) روض الانف ، ۱ : ۵۴ ببعد' ۱۱۷ ببعد' ابن سعد' طبقات ۱ : ۸۲ ببعد، زرقانی : شرح مواہب لدنیہ ۱ : ۱۹۷ تا ۱۹۹ ببعد، سیرۃ النبی' ۱ : ۱۸۹' محمد حمید اللہ : رسولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی' ص ۶۸ تا ۷۳ ببعد۔
(۳۳) محمد حمید اللہ : رسول اکرم کی سیاسی زندگی' ص ۸۰ ببعد۔
(۳۴) موضوع مذکور۔
(۳۵) محمد حمید اللہ : وہی کتاب 'ص ۸۰ تا ۸۵' حاکم : مستدرک ، ص ۴۵۸ ، رحمۃ للعالمین ، ص ۴۳ تا ۴۶ ، علامہ شبلی : سیرۃ النبی' ۱ : ۱۸۳ تا ۱۸۵۔
(۳۶) زرقانی ۱ : ۲۳۶ تا ۲۴۰ ' صحیح بخاری' ابن ہشام ' طبقات' طبری' محمد حمید اللہ وہی کتاب 'ص ۸۴ ببعد۔

باب : ۳

رہروِ عشق و رحمت منزلِ نبوّت کی سمت

(۱) محبتِ الٰہ و انسانیّت کا ارتقاء
اور
آپؐ کی قلبی یعنی دل و دماغ کی کیفیات
(۲) تفکّر و عبادت اور خلوت گزینی
(۳) تفکّر و عبادت کی نوعیّت

باب ۳

رہروِ عشق و رحمت منزلِ نبوّت کی سمت

آپ ﷺ پیکرِ عشق و رحمت تھے۔ جوں جوں آپ ﷺ کا رہروِ عُمر وادیِ شوق میں منزلیں طے کرتا آگے بڑھتا چلا جاتا تھا، عشق تحریکِ انقلاب اور رحمت آفاقی و ہمہ گیر بننے کے لیے بیتاب ہوتا جاتا تھا۔ اس نظارے سے انسان کی فطرت کے شناسا اور اس کے دشمنِ ازلی ابلیس کا خوف و غم بڑھتا چلا جاتا تھا۔ چنانچہ وہ آپ ﷺ کے رہروِ عشق و رحمت کو اس کی جہتِ صالحہ سے دُور لے جانے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا، لیکن آپ ﷺ کے حسین و معصوم دل پر اس کا کوئی جادو نہ چل سکا۔ آپ ﷺ کا دل اپنی اصلی فطری حالت پر تھا، یعنی وہ حسین و منوّر اور معصُوم تھا، اس لیے ابلیس کے جمالیاتی فریب میں نہ آ سکتا تھا اور نہ آیا۔ معصوم و حسین دل کا خاصّہ ہے کہ اسے گناہ اپنی اصلی قبیح و مکروہ شکل میں دکھائی دیتے ہیں، اس لیے وہ اس کا حریف نہیں ہو سکتا اور انسان ظلم و گناہ سے محفوظ رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح صاحبِ ذوق دیدہ دانستہ گندگی نہیں کھا سکتا، اسی طرح معصوم دل انسان دیدہ دانستہ جرم و گناہ کا ارتکاب نہیں کر سکتا۔ گناہ کا ارتکاب انسان عموماً اس وقت کرتا ہے جب وہ اسے ابلیس کے جمالیاتی فریب کی وجہ سے حسین سمجھ بیٹھتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ اس وقت معاشرہ بُرائیوں کی آماجگاہ تھا، آپ ﷺ اس میں رہتے سہتے بھی تھے، لیکن اس سے دُور بلکہ بہت دُور تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ عظیم انسان دوسروں کی دنیا میں نہیں، اپنی دنیا میں رہتے ہیں۔ وہ خود اپنی دنیا اپنے جمالیاتی ذوق کے مطابق تخلیق کرتے اور اسے حسین بناتے ہیں۔

دل میں محبّت و طہارت اور آرزوئے "اِلٰہ" ہو تو ابلیس کا انسان پر جادُو نہیں چل سکتا۔ آپ ﷺ مبعوث ہونے سے پہلے ہی صاحبِ حُسن و سُرُور تھے، اس لیے دنیا کی

کوئی چیز آپؐ کے دل کو لبھا نہ سکی۔ آپؐ کا دل حسین و منوّر تھا، جس پر ہر حسین و قبیح چیز اپنی اصل معنوی شکل وصورت میں ظاہر ہوجاتی تھی؛ لہٰذا اس کے فریب کھلنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ علاوہ بریں آپؐ کے زندہ و بینا دل پر جس طرح حیاتِ دُنیوی کی بے ثباتی اور لذّات کی فانیت آشکارا تھی، اسی طرح اس پر حیاتِ اُخروی کی ابدیّت اور جنّت کی لذّتوں اور مسرّتوں کی جاودانی عیاں تھی، لہٰذا آپؐ نہ تو حیاتِ دُنیوی کو حیاتِ اُخروی پر ترجیح دے سکتے تھے اور نہ آپؐ نے ایسا کیا ہی۔

آپؐ کو اس حقیقت کا حق الیقین تھا کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کائنات کا مالک اور وہی کُل بنی نوع انسان کا خالق و ربّ ہے اور سب انسان اس کے عیال ہیں۔ نیز اس نے زمین و آسمان اور ان کے اندر جو نعمتیں ودیعت کر رکھی ہیں، وہ کُل بنی نوع انسان کے لیے ہیں اور ان سے متمتّع ہونے کا سب کو حق ہے۔ لہٰذا کسی فرد، جماعت یا طبقے کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے محروم رکھنا اللہ تعالیٰ کے نظامِ ربوبیّت میں رخنہ ڈالنے کے مترادف ہے اور یہ اس کی نظر میں گناہِ کبیرہ ہے۔ آپؐ کے دلِ خود آگاہ و خود شناس کو اس حقیقت کا عرفان و اذعان تھا کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے کا بہترین طریقہ اس کی مخلوق خصوصاً انسان سے محبت کرنا ہے لہٰذا آپؐ کو اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات سے محبّت تھی اور سب ہی آپؐ کے حسنِ نظر کے لیے جمالیاتی حظ کا سامان تھیں لیکن دُکھی انسانیّت سے آپؐ کی محبّت کا کچھ اور ہی عالم تھا۔ انسان کے دُکھوں کی اقسامِ ثلاثہ سے آپؐ باخبر تھے۔ آپؐ جانتے تھے کہ انسان کے ایک دُکھ وہ ہیں جو معاشرتی ہیں، یعنی اس کے دکھوں کا ذمہ دار معاشرہ ہے۔ ایک دُکھ وہ ہیں جن کا ذمّہ دار خود فرد ہوتا ہے۔ ایسے دُکھ اسے اپنی غلط سوچ، ظلم و جہل، جرم و گناہ یا غفلت و تن آسانی کے بدلے میں ملتے ہیں۔ تیسری قسم کے دُکھ حادثاتی ہوتے ہیں جن پر انسان کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ دُکھوں کی نوعیت خواہ کچھ ہو، انھیں دور کرنا اور ان سے افرادِ نسلِ انسانی کو محفوظ رکھنا، محبّتِ الٰہی اور فطرتِ انسانی کا تقاضا اور مشیّت ایزدی ہے۔ آپؐ کی جوانی کے دن لوگوں کی خدمت کرنے میں اور راتیں انسان کے دُکھوں پر غور و فکر کرنے اور ان کا حقیقی مداوا دریافت کرنے کی کوشش میں بسر ہوتی تھیں۔

آپؐ کو دوسروں کا غم تھا، اس لیے ربّ جمیل نے آپؐ کو غمِ ذات سے آزاد کر دیا۔ اپنی ذات کا غم جانگسل اور غمِ انسانیت غم رُبا بلکہ طمانیّت آفریں و سرور انگیز ہوتا ہے۔ غمِ انسانیت

سے ظرفِ دل وُسعت میں آفاقی ہوجاتا ہے اور دل کو اس کے ظرف کے مطابق ہی وہ دو سوز ملتا ہے۔ یہ درد و سوز ہی ہے، جو دل میں سعادت اور جذبۂ ایثار و قربانی پیدا کرتا ہے۔ انسان جب اپنے لیے نہیں، دوسروں کے لیے زندہ رہتا ہے تو ربّ العالمین اسے "اپنا" بنا لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اپنا بنا لیا۔ محبّت کی آتشِ خاموش دونوں طرف لگی ہوئی تھی۔ ایک کو زمین پر اپنے ان دیکھے الٰہ کی طلب و جستجو تھی، اور دوسرا عرش پر اپنے "محبوب و دوست" کے محبت آشنا دل کی بیقراریاں دیکھ دیکھ کر اظہارِ محبت کے لیے وقتِ معیّن کا منتظر تھا۔ ان دیکھے محبوب کی محبت میں جو سرور و سوز ملتا ہے، وہ محبوبِ مشہود کی محبّت میں کہاں مل سکتا ہے؟ لیکن یہ راز وہ اہلِ حسن و محبت ہی جانتے ہیں جو اس تجربے سے گزرے ہوں۔

اہلِ حسن و محبّت ہی اسرارِ محبّت سے آگاہ ہوتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ محبّت میں دونوں پر کیا گزرتی ہے۔ "وہ" بلاشبہ غنیِ مطلق ہے، "وہ" بے نیاز و بے احتیاج ہے لیکن "وہ" دلِ محبت آشنا رکھتا ہے۔ اس کا دل محبت کا بحرِ بے کنار ہے۔ "وہ" نظروں سے غائب اور زمان و مکان سے ماوراء رہتے ہوئے بھی اپنے اہلِ حسن و محبت کے قریب رہتا ہے۔ "وہ" پہلے پہل اپنے حسن کی کوئی ایک بے معلوم سی جھلک دکھاتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی اپنے حُسن کو بے حرف و صوت نغمے کی صورت میں حُسن آشنا و محبت بداماں دل میں القا کرتا رہتا ہے۔ محبت کی اشارتوں کا یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ آخر کار جھلکیاں جلوؤں کی صورت میں بدل جاتی ہیں اور دوست کی آواز برقِ غنائیت بن کر دل کی وسعتوں میں لہرانے لگتی ہے۔ محبّت کی بے قراری اور بڑھتی ہے تو "دوست" خود محبوب کے درِ دل پر دستک دیتا ہے اور دروازۂ دل کھُلنے سے پہلے وہ چھُپ جاتا ہے۔ آخر وہ دن آجاتا ہے جب "دوست" دلِ محبوب میں آبستا ہے اور انسان کا دل دوست کا حسن المآب بن جاتا ہے۔ آپؐ کی جوانی محبّت الٰہی کی انھیں گھاتوں میں گزری۔ آپؐ کے دل پر اس محبت میں کیا گزری اور "دوست" نے بالآخر کس طرح اپنی محبّت کا اظہار کیا؟ اس کی داستان، عشقِ الٰہی اور محبّتِ انسانیت کی حسین ترین داستان ہے۔

آپؐ نے صحرا میں پرورش پائی تھی، اس لیے صحرائی زندگی کی صعوبتوں کا آپؐ کو احساس تھا۔ آپؐ نے ملک کے اندر اور باہر سفر کیے تو سفری زندگی کے اسرار آپؐ پر کھُلے۔ آپؐ نے ریگزاروں میں کارواں گزرتے دیکھے تھے، اس لیے آپؐ پر سفر و ہجرت کے حقائق آشکارا

ہوئے تھے۔ اس عالمِ زمان و مکان میں ہر چیز کی طرح انسان بھی مسافر و راہی ہے۔ اسے ایک دن وہ سفر بھی کرنا پڑتا ہے جو راہوارِ موت کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ موت انسان کو کدھر لے جاتی ہے؟ اسے کہاں چھوڑ دیتی ہے؟ انسان مرکر ہمیشہ کے لیے فنا ہو جاتا ہے یا پھر جی اُٹھتا ہے؟ وہ دنیا کہاں اور کیسی ہے، جہاں انسان مرکر چلا جاتا ہے؟ یہ اور اس قسم کے سوالات آپؐ کے درد و سوز سے معمور دل میں پیدا ہوتے رہتے اور آپؐ کے غمِ انسانیت کو روز افزوں کرتے رہتے تھے۔ آپؐ نے صحرا و شہر ہر جگہ انسان کی مظلومی و بے کسی کو دیکھا تھا۔ انھیں نانِ جویں کے لیے ترستے، چلچلاتی دھوپ میں ریوڑ چراتے، سفر کرتے اور کام کاج کرتے دیکھا تھا۔ آپؐ روز بیواؤں، یتیموں اور اپاہجوں کو فاقے کرتے، ظلم سہتے اور فریاد کرتے دیکھتے تھے۔ آپؐ سود خواروں کو مقروض انسانوں کا خون چوستے اور دولت مندوں، سرداروں اور پیشواؤں کو غریبوں اور کمزوروں کی عزّت و ناموس سے کھیلتے اور ان کا استحصال کرتے دیکھتے تھے۔ عورت کی غلامی و مظلومی کے عبرتناک نظّاروں پر بھی آپؐ کی نظر تھی۔ آپؐ کا دردمند دل جب غمِ انسانیت سے معمور ہو گیا تو اس میں استحصالی معاشرے کے خلاف بغاوت کے جذبات پرورش پانے لگے۔ حیاتِ انسانی کو دکھوں میں تڑپتا دیکھ دیکھ کر آپؐ کو انسان سے جو محبّت تھی وہ اتنی شدید ہو گئی کہ عشق میں بدل گئی۔

عشق ایک ناقابلِ تسخیر قوت ہے۔ عشق نوحؑ ہو تو وہ سیلِ بے پناہ بن کر ہر قوّت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔ اگر وہ عشق خلیلؑ بن جائے تو آتشِ نمرود میں کود کر شرک و بت پرستی کی ہر تصویر کو جلا کر راکھ بنا دیتا ہے۔ جب وہ عشق موسیٰؑ بنتا ہے تو دریا کا دل چیر کر فرعون و ہامان و قارون سب کو اس میں غرق کر دیتا ہے۔ عشق مسیحاؑ بنتا ہے تو اپنے حلم و رافت سے دلوں کو مسخّر کر لیتا ہے۔ یہی عشق جب عشقِ محمدؐ بنتا ہے تو تمام نوعِ انسانی کے لیے ہی نہیں بلکہ کُل عالموں کے لیے محبّت و احسان یعنی رحمت بن جاتا ہے۔ عشقِ محمدؐ کی ایک امتیازی خوبی یہ تھی کہ وہ رنگِ جمال و جلال سے مزیّن تھا۔ آپؐ کا جمال اہلِ حسن و سرور کے لیے اور جلال اہلِ کفر و شرک کے لیے تھا۔ یہ یاد رہے کہ آپؐ کا جلال بھی بنی نوعِ انسان کے لیے رحمت تھا، چاہے وہ کافر و مشرک ہی کیوں نہ تھے۔

آپؐ کا عشق، عشقِ الٰہی بھی تھا اور عشقِ انسانی بھی، جس سے صہبائے عشق دو آتشہ بن گئی تھی۔ عشق خلوت گزین و صحرا پسند ہوتا ہے۔ وہ آپؐ کو جنّتِ خانہ سے

نکال کر کوہستانِ صحرا کے غار میں لے گیا۔ غار تنگ و تاریک تھا جو آپؐ کے عشق کی تابانیوں سے منوّر ہو گیا۔ عشق زمان و مکان کا اسیر نہیں ہو سکتا، اگر اسیر ہو بھی جائے تو وہ زمانے کو "دہر" اور مکاں کو "لامکاں" میں بدل دیتا ہے۔ غارِ حرا کی تنگنا عشق کے اعجاز سے آپؐ کے لیے بہشت کی لامحدود پہنائی میں تبدیل ہو گئی۔ آپؐ وہاں کئی کئی دن متواتر رہتے، بظاہر تنہا ہوتے، لیکن عشق تنہا کہاں رہ سکتا تھا؟ وہاں آپؐ کا الٰہ آپؐ کے پاس ہوتا، لیکن حجاب میں رہتا۔ غارِ حرا حُسنِ الٰہ اور عشقِ پرستار کے نور و سرور سے "حسن المآب" بن گیا۔ حسن جلوہ نمائی کے لیے اور عشق نظّارۂ حسن کے لیے بیتاب تھا، لیکن عالمِ قرب میں فراق کا عالم رہا۔ یہ عالمِ دہر کے حساب سے بے قیاس قرنوں سے بھی زیادہ طویل تھا۔ گو زمانے کے حساب سے اس کی مدّت ڈیڑھ عشرے سے بھی کم تھی۔ "دوست" باتیں کرتا، آپؐ سُنتے، لیکن کچھ نہ سمجھتے۔ آپؐ دردِ دل کہتے تو "دوست" سُنتا۔ عشق کی بیتابی بڑھتی اور اسے پُختہ و محکم کرتی چلی گئی۔ یہ کون ہے جو مجھ سے انجانی زبان میں باتیں کرتا ہے؟ اس کی باتوں میں غنائیت اور شعریّت کا رس تو ہے، لیکن آواز ہے نہ الفاظ۔ وہ کون ہے جو میرے پاس ہو کر مجھ سے دُور رہتا ہے؟ اس کا حسن محجوب بھی ہے اور نظر نواز بھی۔ اس کا بے آواز و الفاظ آہنگ اگر فردوسِ گوش ہے تو اس کا حسنِ محجوب جنّتِ نگاہ ہے۔ "دوست" آپؐ کو اپنا ہمزبان و ہمنوا اور آشنا و شناسا بنانے کے لیے اظہار و بے حجابی میں توقّف کرتا گیا تاکہ عشق وارفتہ ہو کر وقت سے پہلے ہی عشقِ کلیمی کی طرح "ربِّ ارنی" نہ بول اُٹھے۔

"حُسنِ الٰہ" کو دیکھنے کے لیے انسان کو پہلے سوزِ عشق سے گداز ہو کر نظر اور پھر حُسنِ نظر بننا پڑتا ہے۔ آپؐ غارِ حرا کے حسن المآب میں سوزِ عشق میں گداز ہوتے رہے۔ نظر بنتے رہے[2] اور جب حُسنِ نظر بنے تو عشق کے امتحان اور حسن کی بے حجابی کا وقت آگیا۔ اس کی داستان میں اہلِ شوق کے لیے شعریت کی حلاوت، غنائیت کا طرب، محبّت کا سحر، صدق کا اثر، حُسن کی سرور انگیزی اور قصّے کی جاذبیّت ہے۔

"دوست" نے محبّت کا وہ قصّہ تو بیان کر دیا جو حُسنِ یوسفؑ اور عشقِ "زلیخا" کی حسین داستان ہے، جسے قرآن مجید نے "احسنُ القصص" کہا ہے[3] لیکن غارِ حرا کے قصّۂ حسن و محبّت کو بیان نہیں کیا، اس لیے کہ وہ اپنی داستان تھی۔ اگر محبت کی بات کی بھی تو اشارہ و کنایہ کی زبان میں۔

نبوّت فیضانِ ربّی تھا، اور اس کی مشیت یہ ہوئی کہ اسلام کے عالمگیر و ہمہ گیر اور دوامی و سرمدی، جمالیاتی انقلاب کے بعد فیضانِ نبوّت تو ہمیشہ باقی رہے، لیکن نبوّت کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے منقطع کر دیا جائے۔ اس بات سے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ آپؐ مبعوث ہونے سے پہلے بھی نبی تھے اور آپؐ کی بعثت کی جو غرض و غایت اور محرکات و عوامل تھے، وہ بھی اللہ تعالیٰ کے علم میں تھے۔ آپؐ کو چونکہ مثالی انسان بنا کر بھیجا گیا تھا اور آپؐ کی زندگی اور زندگی کا ہر چلن بنی نوع انسان کے لیے دائمی و ابدی مثالی نمونہ یا اصطلاحِ قرآنی میں اسوۂ حسنہ بننا تھا، اس لیے آپؐ کی ساری زندگی ایک عظیم و مثالی انسان کی زندگی ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان ہی انسان کا مثالی نمونہ یا ماڈل ہو سکتا تھا، اور ہوا۔

بعثت سے پہلے کی زندگی میں آپؐ کو دو چیزوں کی طلب و جستجو تھی: حق اور عالمگیر و ہمہ گیر جمالیاتی انقلاب۔ آپؐ کو تلاشِ حق تھی۔ ایک تو اس لیے کہ یہ فطرتِ صحیحہ کا تقاضا تھا، دوسرے یہ کہ حق کو باطل عقائد و اوہام کے نظر فریب پردوں میں چھپا دیا گیا تھا، اور تیسرے یہ کہ وقت کے مذہبی پیشوا حق بیان کرنے کے بجائے کتمانِ حق میں اپنی پیشوائیت کی بقا اور ترقی کو مضمر سمجھتے تھے۔ آپؐ کو بلا شبہ حق کی آرزو و تلاش تھی، لیکن آپؐ کا حسین و معصوم دل حق آشنا تھا۔ اصل یہ ہے کہ حسن و حق سے انسان فطرتاً آشنا ہوتا ہے۔ گو یہ اور بات ہے کہ "جانتا ہے پر مانتا نہیں۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قبیلے کی طرح قبیلۂ قریش میں بھی شرک و بُت پرستی موجود تھی اور پیشوائیت کا منصب بھی اسے حاصل تھا۔ کعبہ جو توحید کا نشان تھا، اب شرک و بُت پرستی کی علامت بن چکا تھا۔ اسے مختلف ناموں کے بتوں سے معمور کر دیا گیا تھا۔ پیشوائیت کا خاصّہ ہی یہ ہے کہ وہ اسمائے خیالی کی تخلیق و تجسیم کر کے انھیں "الٰہ" بنا دیتی ہے۔ اس طرح توحید، جو اصلِ دین ہے پیشوائیت کے علمبرداروں ہی کے ہاتھوں برباد ہوئی ہے اور ہو رہی ہے، لیکن انسان جانتا ہے پر مانتا نہیں۔ پیشوائیت کا طریقِ گمراہ کُنی یہ ہوتا ہے کہ وہ اسمائے خیالی کو اصنام کی صورت دیتی ہے اور لوگوں کے دلوں میں اس درجہ ان کی عقیدت و محبت پیدا کر دیتی ہے کہ وہ "بتوں" سے بے حد مرعوب و خائف ہو جاتے ہیں۔ اس سے پیشوائیت کا سکّہ بھی لوگوں کے دلوں میں جم جاتا ہے اور اس کا کاروبار بھی چلتا اور چمکتا رہتا ہے۔

کیا بُت سنتے اور دیکھتے ہیں؟ کیا وہ شخص، دیوتا یا "محض نام" جس کا بُت پُوجا جاتا ہے، زندگی میں یا مرنے کے بعد غیب کا علم رکھتا ہے؟ کیا اسے سینکڑوں اور ہزاروں لوگوں کی پکار بیک وقت سُننے کی قُدرت ہوتی ہے؟ کیا وہ لوگوں کی حاجات پوری کرنے پر قادر ہوتا ہے؟ کیا اس میں کسی شخص کو نفع یا نقصان پہنچانے کی قدرت ہوتی ہے؟ کیا انسان کا "الٰہ" اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی ہو سکتا ہے؟ کیا انسان کے سینے میں ایک سے زیادہ دل ہو سکتے ہیں؟ فطرتِ صحیحہ کا جواب ہمیشہ نفی میں ہوا ہے؟ دل کہتا ہے کہ انسان عبد ہے اور عبدیّت فطرۃً ایک ہی معبود کو چاہتی ہے۔ جس طرح انسان کے سینے میں دو دل نہیں ہو سکتے، اسی طرح اس کے اِلٰہ یا معبود بھی دو نہیں ہو سکتے۔

اس سے آپؐ کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا کہ جب انسان صرف اللہ تعالیٰ کا عبد ہے اور اس کا اِلٰہ فقط وہی ایک ہے تو پھر اللہ ہی حیاتِ انسانی کا معبود ہوا۔ جب یہ حقیقت ہے اور یقیناً ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کو حاصل کرنے کے لیے اس کے احکام کے مطابق زندگی گزارنا ناگزیر ہوا۔ لیکن احکامِ الٰہی کیا ہیں؟ وہ نہ تو یہود کے پاس محفوظ تھے، نہ نصاریٰ کے پاس، وہ نہ تو مجوس کے پاس تھے اور نہ کسی اور ملّت کے پاس۔ پیشوائیت ہر قوم و ملّت میں تھی اور جہاں پیشوائیت ہو، وہاں حق اپنی اصل صورت میں ظاہر و باہر نہیں رہ سکتا۔ وہاں احکامِ الٰہی تو ہوتے ہیں مگر ان میں پیشواؤں کے اپنے احکام بھی شامل ہوتے ہیں اور ان احکام کی تعبیر و تاویل اس طرح کر دی جاتی ہے کہ حق ملتبس و مشتبہ ہو جاتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ توحید کی سب سے بڑی دشمن پیشوائیت ہوتی ہے، کیونکہ پیشوائیت کے ہیولے ہی میں شرک کی صورت مضمر ہوتی ہے۔ آپؐ کے دلِ حق آشنا میں جوں جوں توحید کی محبّت شدت اختیار کرتی گئی، اس کے ردِ عمل کے طور پر شرک و بُت پرستی کے ساتھ پیشوائیت سے نفرت بھی زیادہ ہوتی گئی۔ توحید کا خاصّہ اخوّت و محبّت کے جذبات کی پرورش کرنا ہے۔ آپؐ کے دلِ درد آشنا میں ایک ایسے انسانی معاشرے کی تشکیل و تعمیر کرنے کی آرزو مچلنے لگی، جس کی اساس توحید ہو، کیونکہ ایسے معاشرے ہی میں انسان پیشوائیت کی غلامی سے آزاد صرف ایک "الٰہ" کی عبادت کر سکتا اور بھائیوں کی طرح عزّت و احترام اور خلوص و محبّت سے زندگی بسر کر سکتا ہے۔ ایسے معاشرے میں نہ تو انسان کے دشمن فرعون، ہامان اور قارون پیدا ہو سکتے ہیں اور نہ محکوم و مقہور لوگ ہی۔ تاریخ شاہد ہے کہ پیشوائیت کو جب بھی سیاسی اقتدار ملا، اس نے فرعونیت کی شکل اختیار

کرلی اور اپنے آپ کو الوہیت اور ربوبیت کے مقام پر متمکن کرلیا۔

یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ جب بھی کسی معاشرے میں فرعونیت ظہور پذیر ہوتی ہے تو ساتھ ہی ہامانیت اور قارونیت بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہامانیت افسر شاہی کی اور فرعونیت سرمایہ داری کی علامت ہے۔ یہ تینوں طبقے انسانیت، اللہ اور دینِ توحید کے دشمن ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ تینوں طبقے پیشوائیت ہی کی پیداوار ہیں اور اپنی بقا اور نشو و ارتقا کے لیے بھی اسی کے مرہونِ منت رہے ہیں۔ اس سے اس امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں اسلام میں پیشوائیت کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ پیشوائیت اور عقلیت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ پیشوائیت کسی معاشرے میں اس وقت جنم لیتی ہے جب لوگوں کی اکثریت میں معقولیت نہیں رہتی اور وہ عقل سے کام لینا چھوڑ دیتی ہے۔ ایسی قوم علم پر ظن و گمان کو ترجیح دیتی ہے اور اوہام پرست بن جاتی ہے۔ پیشوائیت چونکہ اس حقیقت سے آشنا ہوتی ہے، اس لیے وہ شیطنت کے جمالیاتی فریب کے ذریعے نامعقولیت اور جہل کو خوشنما بنا کر دکھاتی ہے اور لوگوں کو بہرا، گونگا اور اندھا بنانے میں مصروف رہتی ہے اور اسی میں اس کی بقا کا راز مضمر ہوتا ہے۔ آپؐ کو حق کی تلاش تھی، صرف اپنے لیے نہیں بلکہ تمام افرادِ نسلِ انسانی کے لیے بھی۔ حق کو معاشرے میں قائم کرنا آپؐ کا مقصود تھا تاکہ انسان پھر اپنے "اِلٰہ" اور مقصودِ زندگی کو حاصل کرلے۔ آپؐ اس مسئلے پر مسلسل سوچتے رہے۔ اہلِ علم ہی جانتے ہیں کہ مفکّر ہونا ہی وہ ہے جو مسائلِ حیات پر اُٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے ہر وقت حکیمانہ انداز میں سوچتا رہتا ہے، اور اس کی سوچ بامقصد ہوتی ہے۔ ایسے مفکّرین کی عقل سلیم ہوتی ہے اور وہ حقیقی معنوں میں عقل مند یا اصطلاحِ قرآنی میں "اولی الالباب" ہوتے ہیں[۵]۔ واقعہ یہ ہے کہ آپؐ بعثت سے پہلے بھی مفکّر، حکیم، عقلمند اور دانا و بینا تھے۔ علاوہ بریں آپؐ کا دل جذباتِ محبّت سے معمور بھی تھا۔ یہ محبّتِ الٰہی بھی تھی اور انسانی بھی۔ اصل یہ ہے کہ یہی دو چیزیں آپؐ کی رحمۃ للعالمینی کی دو بنیادی صفات ہیں۔ عقلِ سلیم و فکرِ رسا اور جذبۂ محبّت و ایثار ہی کی بدولت آپؐ نے آگے چل کر اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کو کامیابی سے چلایا اور ایک عظیم جمالیاتی انقلاب کے ذریعے انسان کی کایا پلٹ کر دی، اسے اس کے اِلٰہ اور اپنے ہم نفسوں سے بلکہ خود اپنی ذات سے ملا دیا۔

ملک کے اندر اور باہر ہر جگہ آپؐ نے غلامی کو زمانے کا دستور پایا۔ انسان، جسے

اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات اور صاحبِ ارادہ و اختیار پیدا کیا ہے، غلام کیسے بنایا جاسکتا ہے؟ یہ سوال عہدِ یتیمی ہی سے تیرِ نیمکش کی طرح دل میں پیوست رہا۔ آخر آپؐ نے غلامی کا راز معلوم کرلیا۔ غلامی ابلیسی تثلیث یعنی فرعونیت، ہامانیت، قارونیت کی ایجاد ہے۔ انسان کا آقا، مالک، اَن داتا بننا، فرعونیت نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ دعوائے خدائی نہیں تو اور کیا ہے؟ آپؐ کو بچپن ہی سے غلامی سے نفرت تھی اور اب آپؐ کی سوچ کی جہت یہ تھی کہ انسان کو کس طرح غلامی سے نجات دلائی جائے؟ غلامی آپؐ کے نزدیک انسانیت کا سرطان تھی، جو معاشرۂ انسانی کے رگ و پے میں سرایت کرچکا تھا اور اس کا علاج صرف یہ تھا کہ پُرانے معاشرۂ انسانی ہی کو بیخ و بن سے اُکھاڑ دیا جائے اور اس کی جگہ ایک ایسے معاشرے کی بنیاد رکھی جائے جس میں انسان کا صرف ایک اِلٰہ اور ربّ ہو، اور وہ اللہ تعالیٰ ہو۔ اس میں نہ تو فرعون، ہامان اور قارون ہوں اور نہ محکوم، غلام اور محتاج۔ اس معاشرے کی تین بنیادیں ہوں : اخوّت، حریّت اور مساوات۔ مختصر یہ کہ آپؐ کے ذہن میں ایک ایسے معاشرے کا نقشہ اُبھر رہا تھا، جس میں حاکمیتِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہو اور اس میں اسی کا نظامِ ربوبیّت جاری و ساری ہو اور وہ انسان کی آزادی و احترام کا ضامن ہو۔

شرک و بُت پرستی معاشرے میں پھیل جائے تو اس کا نتیجہ ظلم و جہل اور اوہام کی صورت میں نکلتا ہے۔ افراد ظلم و جہل کے شکار اور اوہام پرست ہو جائیں تو وہ اپنے آپ کو غیر انسانی رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑ لیتے ہیں۔ پھر ان معاشرتی زنجیروں سے چھٹکارا پانا ان کے بس کا روگ نہیں رہتا۔ آپؐ نے ہر جگہ انسان کو معاشرتی رسم و رواج کی قیود میں مقیّد اور تڑپتے دیکھا تھا۔ یہ مسئلہ بھی آپؐ کے لیے بڑی اہمیّت رکھتا تھا۔ اگر معاشرہ زندگی کی غلط سمتوں سے نکل جائے تو کیا اسے اس کے فطری دائرے میں واپس لایا جاسکتا ہے؟ آپؐ اس مسئلے پر غور و فکر کرتے رہے اور آپؐ کی عقلِ سلیم اس نتیجے پر پہنچی کہ حیاتِ انسانی کا قافلہ ضلالت میں اتنی دُور نکل چکا ہے کہ اسے اس کے فطری دائرے میں واپس لانے اور اسے معاشرتی قیود سے رہائی دلانے کا ایک ہی طریقہ تھا، اور وہ تھا ایک حسین و ہمہ گیر موضوعی و معروضی انقلاب۔ یہ انقلاب کیسے لایا جاسکتا ہے؟ اس کا منہاج کیا ہونا چاہیے؟ اس کا نعرہ کیا ہو؟ میں اکیلا ہوں اور مجھے تمام حریف معاشرتی قوتوں کا تن تنہا مقابلہ کرنا ہوگا۔ قوم اپنی سیاہ کاریوں، معاشرتی ظلم و استحصال اور جہل و غفلت کی وجہ سے بہری، گونگی اور اندھی ہو چکی ہے۔ اُمرا، روسا اور

پیشوا میری تحریک کو کیسے برداشت کر سکیں گے؟ وہ سب دین کے نام پر میری تحریک کی مخالفت کریں گے۔ وہ میری جان کے درپئے آزار ہو جائیں گے۔ کیا مجھے انسانیت کے لیے جان کی قربانی دینا ہوگی؟ مجھے دُکھ سہنا ہوں گے؟ مجھے جلاوطنی کے صدمے برداشت کرنا ہوں گے؟ آپؐ شب و روز یہ باتیں سوچتے رہتے تھے۔

عقل نتائج و عواقب سے ڈراتی، لیکن محبّت آپؐ کو میدانِ عمل میں نکلنے پر آمادہ کرتی اور آپؐ کے دل میں حوصلہ اور حوصلے میں توانائی پیدا کرتی رہتی۔ آپؐ کا جذبۂ محبت شدّت اختیار کرتا رہا اور آپؐ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے زیادہ وقت خلوت گزینی میں گزارنے لگے: کبھی صحرا کی پہنائی میں اور کبھی غارِ حرا کی تنگنائے میں، آپؐ ملک کے اندر اور باہر جہاں بھی گئے عورت کو اپنی محبوبیت و جاذبیت کے باوجود محکوم و غلام ہی دیکھا۔ وہ نہ صرف اپنے حقوق سے محروم تھی، بلکہ اسے تو اپنے بنیادی حقوق تک کا علم و شعور نہ تھا۔ وہ منڈیوں میں بکتی تھی اور بازاروں میں قابلِ فروخت جنسی معروض تھی۔ عورت کو ہر جگہ جمالیاتی و جنسی معروض و محکوم سمجھا جاتا تھا، جس کا وظیفہ مرد کے جنسی جذبات کی تسکین، نسل کشی اور اس کی خدمت کرنا تھا۔ آپؐ سے عورت کی مظلومی و محرومی دیکھی نہ جاتی تھی۔ وہ مظلوم و مقہور کیوں ہے؟ یہ سوال بھی آپؐ کے درد آشنا دل کے لیے بڑا اہم حل طلب مسئلہ تھا۔ آپؐ اس پر غور و فکر کرتے رہے اور آخر کار یہ حقیقت منکشف ہوگئی کہ عورت اور مرد کی حیثیت وہی ہے جو مزرع و مزارع کی ہے۔ زندگی کی بقا اور اس کے نشو و ارتقائے کے لیے عورت اتنی ہی ناگزیر ہے جتنا کہ مرد۔ عورت کے جمال اور مرد کے جلال ہی سے تو زندگی حسین و نظر افروز ہے۔ مرد کا جلال بلاشبہ عورت کے جمال کا محافظ و نگہبان ہے۔ وہ عورت کا قیّم بھی ہے مگر اس کا "اِلٰہ" تو نہیں کہ عورت اس کی بندگی کرے اور اس کی جائز و ناجائز خواہشات کی تکمیل کرنا، اس کا وظیفۂ زوجیت ہو۔

عورت بھی مرد کی طرح اللہ تعالیٰ کی مخلوق و مربوب ہے۔ آزادی اس کا بھی پیدائشی حق ہے۔ مرد کی طرح اس کا اِلٰہ اور ربّ بھی فقط ایک اللہ تعالیٰ ہے۔ مرد اسے اپنی کنیز نہیں بنا سکتا اور نہ اسے اس کے حقوق سے محروم ہی کر سکتا ہے۔ معاشرے نے عورت کو مقامِ انسانیت سے کیوں گرا دیا ہے؟ اس سوال نے بھی آپؐ کو مدّتوں بیقرار رکھا۔ یہ اور دیگر مسائلِ انسانی تھے جو آپؐ کو شہر سے صحرا اور صحرا سے بالآخر غارِ حرا میں لے گئے۔ مدّتوں کے غور و فکر کے بعد آپؐ نے اس حقیقت کا سراغ لگا لیا کہ جس معاشرے میں خالص توحید نہیں رہتی اس میں استحصالی قوتیں

پیدا ہو جاتی ہیں، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کا اِلٰہ انسان اور عورت کا اِلٰہ مرد بن جاتا ہے۔ اس سے آپؐ کا فکرِ رسا اس نتیجے پر پہنچا کہ معاشرۂ انسانی کو بدل دینے ہی سے عورت کا مقدّر بدل سکتا ہے اور اسے خالص توحیدی معاشرے ہی میں اپنا حقیقی مقام مل سکتا ہے۔

آپؐ نے بچیوں کو زندہ درگور ہوتے دیکھا تھا اور ایسے انسانیت سوز نظاروں پر آپؐ نے خون کے آنسو بھی بہائے تھے۔ ان بیگناہ معصوم بچیوں کی چیخ و پکار کی گُونج آپؐ کے کانوں میں آتی تو آپؐ کا دل تڑپ تڑپ اُٹھتا۔ یہ رُوح فرسا نظارے آپؐ کے چشمِ تصوّر کے سامنے رقص کرتے رہتے اور آپؐ کو معاشرے کے ظلم و جہل کے خلاف بغاوت پر اُکساتے رہتے تھے۔ یہ غمِ انسانی بڑھتا اور شدّتِ جذبات میں اضافہ کرتا گیا۔ رُوحِ انسانیت، روحِ رحمۃ للعالمینی اور رُوحِ ربّ العالمینی تینوں اس لمحے کی منتظر تھیں جسے حسین و منوّر اور عالمگیر و ہمہ گیر جمالیاتی انقلاب کا نقطۂ آغاز بننا تھا۔

آپؐ کی سیرتِ طیبہ سے اس حقیقت کا سراغ ملتا ہے کہ خدمتِ خلق میں عظمت و مخدومیّت کا راز مضمر ہے، اس سے وہ سچّی خوشی ملتی ہے جو حاصلِ زندگانی ہے اور اس سے روح اپنے اندر ارواحِ خلائق کو جذب کر کے بحرِ بیکراں بن جاتی ہے۔ ایسی ہی روح اپنی محدودیّت کے باوجود بیکراں بن کر رُوحِ الوہیّت کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ پھر بندے کا ہاتھ 'یدِ الٰہی' اس کی سوچ فکرِ کبریائی اور اس کا عمل فعلِ ربّی بن جاتا ہے۔ لہٰذا عوام کی خدمت سے سچّی خوشی حاصل کرنا اور ان روحوں کو اپنے اندر آباد دیکھنا عظمتِ خلق کی دلیل ہے۔ آپؐ یہ دیکھتے اور محسوس کرتے تھے، جس کا اعتراف خود ربّ الناس کو بھی کرنا پڑا: بلاشبہ آپؐ کا خُلق عظیم ہے۔[۶]

خُلقِ عظیم اور رحمۃ للعالمینی لازم و ملزوم ہیں۔ آپؐ چونکہ حاملِ خُلقِ عظیم تھے، اس لیے رحمۃ اللعالمین بھی تھے، بلکہ ہیں اور ہمیشہ رہیں گے اور اسی میں ختمِ نبوّت کا راز مضمر ہے۔ آپؐ عام انسان کی طرح محتاجوں اور بیواؤں کا سودا سلف لاتے اور ان کا کام کاج کرتے۔ جو شخص مدد کے لیے پکارتا آپؐ اس کی مدد کرتے، مدد کا وعدہ کرتے تو ہر قیمت پر اسے نبھاتے۔ شادی کے بعد آپؐ کی معاشی حالت بہتر ہوگئی تھی، لیکن آپؐ بدستور سادہ زندگی گزارتے رہے اور مال و دولت جو کچھ آپؐ کے پاس ہوتا، جب تک صدقہ و خیرات نہ کر دیتے، آپؐ کو قرار نہ آتا۔ سب کچھ دے دینے پر بھی آپؐ یوں محسوس کرتے جیسے آپؐ نے کچھ نہیں

دیا، کیونکہ آپؐ تو لوگوں کو معاشی احتیاج سے بے نیاز کر دینا چاہتے تھے۔ آپؐ دل و جان سے عوام کی خدمت کرتے لیکن محبت کی شدت کا یہ عالم تھا کہ یہ خدمت خود آپؐ کی نظروں میں جچتی نہ تھی۔ وجہ یہ تھی کہ آپؐ تو ان کی تقدیر ہی بدل دینا چاہتے تھے۔

لوگ آپؐ کو گلی کوچوں میں چلتے پھرتے، کام کاج کرتے اور عوام کی خدمت کرتے دیکھتے اور آپؐ کو اہلِ درد و غم خیال کرتے۔ ان کے دل آپؐ کے حُسنِ خلق کے معترف تو تھے، لیکن انھیں کیا خبر تھی کہ یہ خادمِ قوم ان کی دنیا میں ایک ایسا عظیم انقلاب لانے والا ہے، جو ان کی تقدیر ہی بدل ڈالے گا اور وہ مخدومِ خلائق بن جائے گا۔

جیسا کہ جاگیر داری اور سرمایہ داری نظاموں میں ہوتا ہے، عرب معاشرے میں بھی محنت کو عار سمجھا جاتا تھا۔ اہلِ زر غریبوں سے ملنے جلنے کو معیوب خیال کرتے تھے۔ اس معاشرے میں ایک عالی نسب خاندان کے کسی فرد کا اپنے ہاتھوں سے اپنا اور غریبوں کا کام کاج کرنا بڑی ہی اچنبھے بلکہ شرم کی بات تھی، لہٰذا امراء و شرفا اسے نہ تو پسند کر سکتے تھے اور نہ انھوں نے ایسا کیا۔ وہ اسے حقارت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ محبّتِ انسانی ان کی نظروں میں دیوانگی تھی، لیکن وہ محبتِ انسانی کی لذّت سے ناآشنا تھے۔ کبر و پندار میں مست انسان کا دل لذّتِ درد و سوز سے کہاں آشنا ہو سکتا ہے؟

دولت کا اکتناز سرمایہ داری و بخل کو جنم دیتا ہے اور دولت و بخل جمع ہو جاتے ہیں تو انسان کو قسیُ القلب بنا دیتے ہیں۔ یہ قساوتِ قلب ہے جس سے آتشِ ظلم و گناہ کے طوفان اُٹھتے اور مزرعِ زندگی کو جلاتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس قلبِ سعید سے خیر و احسان کے چشمے بہتے اور گلستانِ زندگی کو شاداب کرتے ہیں۔ آپؐ کا دل سعادت سے معمور تھا اور اس سے عنقریب ایک چشمۂ رحمت اُبلنے والا تھا، جس نے ہر عالم میں کشتِ زندگی کو سیراب کرنا تھا، لیکن اہلِ شقاوت اس راز سے ناآشنا تھے۔ سچ ہے، اہلِ شقاوت نورِ بصیرت سے محروم ہوتے ہیں۔ الملکُ لِلّٰہ الحکمُ لِلّٰہ کی پاکیزہ فطرتیں لے کر آپؐ کا ظہُور ہوا تھا۔ پھر عرب کی صحرائی وسعتوں میں آپؐ نے اپنی ابتدائی زندگی میں اس کا خوب منظر دیکھا، مگر اس دنیا میں آپؐ کو ابتدا سے اس بات کا ازحد احساس ہوا کہ انسان انسان کا ربّ کیوں بن بیٹھا ہے؟ انسان انسان کے ہاتھوں ذلیل کیوں ہے؟ معاشی استحصال کیوں ہے، جس کے سبب اکثریت کے لیے زندہ رہنا دوبھر ہو گیا ہے۔ ان سب باتوں کا احساس کر کے

آپؐ نے جو رحم اور ترحم کا انداز اختیار کیا، اس کا ذکر حضرت خدیجہ طاہرہؓ نے ان الفاظ میں کیا ہے: کلا واللّٰہ لا یخزیک اللّٰہ ابداً انک لتحصل الرحم وتحمل الکل وتکسب المعدوم و تعین علی نوائب الحق (بخاری: بدءُ الوحی): خدا کی قسم اللہ آپؐ کو کبھی رُسوا نہیں کرے گا۔ آپؐ صلۂ رحمی کرتے ہیں۔ معاشی طور پر درماندہ لوگوں کا بوجھ اُٹھاتے ہیں، ناداروں کی خبر گیری کرتے ہیں۔ جو لوگ حق پر ہوتے ہیں، ان مشکلات میں آپؐ ان کا ساتھ دیتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ غریبوں کی زبوں حالی دیکھ کر ایک طرف آپؐ کے دل میں ان سے ہمدردی و غم گساری کے اور دوسری طرف استحصالی قوتوں کے خلاف نفرت کے جذبات پرورش پاتے رہے۔ آپؐ اس مسئلے پر حکیمانہ انداز میں غور و فکر کرتے رہے اور آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ زمین اللہ تعالیٰ کی ہے اور اس سے وہی شخص متمتع ہو سکتا ہے جو اس پر کاشت کرتا ہے، لیکن جاگیر داروں، زمینداروں اور سرمایہ داروں کا محکوم و غلام معاشرہ کبھی یہ بات تسلیم نہیں کرے گا۔ وہ ہر ایسے اقدام بلکہ آواز کو بھی اپنے خلاف بغاوت خیال کر کے دبا دینے کی کوشش کرے گا، وہ انقلاب سے پہلے ہی داعیِ انقلاب کو ختم کرنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہو گا۔

استحصالی طبقے کے پروپیگنڈے سے متأثّر ہو کر بھولے بھالے عوام بھی ان کے ہمنوا و معاون بن جاتے ہیں۔ آپؐ کو اس حقیقت کا اذعان و عرفان تھا، لیکن عوام کو، بالخصوص محنت کشوں اور غلاموں کو استحصالی قوتوں کے خون آشام پنجوں سے نجات دلانا بھی آپؐ کا مقصدِ حیات تھا اور یہ کام صرف انقلاب ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ اکثر آپؐ سوچتے رہتے کہ اگر میرے ساتھ میرا اللہ ہو جائے جو تمام بنی نوعِ انسان کا ربّ ہے تو پھر میں ان استحصالی قوتوں سے ٹکرّ لے سکتا ہوں۔ اگر اس راہ میں مجھے جان بھی دینا پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ جان بھی تو "اس" کی دی ہوئی ہے۔ انسان تو وہ ہے جو دوسروں کے کام آئے۔ دوسرے بھی تو اپنے ہی بھائی ہیں۔ وہ اولادِ آدم ہی تو ہیں، اللہ تعالیٰ کے عیال ہی تو ہیں، ان سب کا ربّ ایک اللہ ہی تو ہے۔

جس معاشرے میں عدل نہ رہے، اس میں فساد برپا ہو جاتا ہے۔ آپؐ نے ہر جگہ اور ہر گوشۂ زندگی میں عدل کو عنقا اور فساد کو برپا دیکھا۔ آپؐ نے ہمسایہ ممالک کی سیاحت کی تھی۔ آپؐ نے برّی راستوں میں قزّاقی کی وارداتوں کو دیکھا اور بحری ڈاکوؤں کی وارداتوں کا حال سُنا تھا۔

روح، جسم اور مال و دولت کہیں محفوظ و مامون نہ تھے۔ اہلِ قوت و زر اپنے ظلم اور مزدور اور محنت کش، غلام و مزارع اور غریب و بے کس اپنی مظلومی کی وجہ سے خوف و حزن کی آتشِ خاموش میں جل رہے تھے۔ وہ بظاہر زندہ تھے، لیکن زندگی کی لذت و مسرت سے محروم تھے۔ قرآن مجید کی اصطلاح میں وہ نہ زندہ تھے، نہ مردہ۔[۸]

تجارت میں بد دیانتی معیوب و ضرر رساں نہیں سمجھی جاتی تھی، بلکہ تاجروں نے اسے اصولِ تجارت کے طور پر اپنا لیا تھا۔ بدعہدی و خیانت کا دَور دَورہ تھا۔ تجارتی فریب دہی اور بدکرداری زمانے کا دستور بن چکا تھا۔ لوٹ کھسوٹ، چور بازاری اور کم تولنے اور کم ناپنے، اجارہ داری و احتکار کا عام رواج تھا۔ باٹ لینے کے اور، دینے کے اور ہوتے تھے۔ غرضیکہ تجارت میں جھوٹ، فریب، بددیانتی اور بدعہدی کو بہترین حکمتِ عملی سمجھا جاتا تھا۔ آپؐ اہلِ نظر بھی تھے اور صاحبِ دل بھی، مفکر بھی تھے اور حکیم بھی، آپؐ اس فساد اور اس کی تباہ کاریوں کا مشاہدہ کرتے اور اس کے عوامل پر غور کرتے رہے، اور آگے چل کر وحیِ الٰہی نے رہنمائی کی کہ عالمگیر فساد کا ذمے دار سرمایہ داری نظام تھا، جاگیرداری و پیشوائیت جس کے دو بنیادی عناصر تھے۔

معاشرۂ انسانی ہر جگہ برائیوں کی آماجگاہ تھا، عدل و احسان کا فقدان تھا، انسانیت خوف و حزن کی آتشِ خاموش میں جل رہی تھی، انسان مضطرب و بے قرار تھا، زندگی جمود و تعطل کا شکار ہو چکی تھی۔ ظلم و جہل کی گرم بازاری تھی۔ معاشرۂ انسانی امن و سلامتی کو اور انسانیت، طمانیت و سکینت کو ترس رہی تھی۔ عالمِ انسانی کی اس صورتِ حال کو بلاغتِ قرآنی نے اس طرح بیان کیا ہے:

"لوگوں کے اعمال کے سبب خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے بعض اعمال کا مزہ چکھائے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ باز آ جائیں۔"[۹]

اس آیت کے آخری دو لفظوں لعلھم یرجعون (ہو سکتا ہے کہ وہ باز آ جائیں) میں اس اصل کی نشاندہی کی گئی ہے کہ انسان کی طبیعت یا فطرت کبھی بدل نہیں سکتی اور انسان طبعاً خیر و حسنہ پسند ہے۔ اس کا ضمیر کمزور و نحیف اور مضمحل و غیر مؤثر تو ہو سکتا ہے مگر مر نہیں سکتا۔ ایک جمالیاتی لمحہ[۱۰] اسے فعال و مؤثر بنا سکتا ہے، لہٰذا انسان کے صالح و محسن ہونے کا ہمیشہ امکان رہتا ہے، جسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا میں جہاں بھی انقلاب کے نقیب و داعی گزرے ہیں، انھیں ہمیشہ انسان کی نشاۃِ ثانیہ کے

امکان کا یقین و اذعان تھا۔ چنانچہ آپؐ کو بھی اس امکان کا ایقان و اذعان تھا اور آپؐ اس امکان کو واقعیت میں بدلنے کے لیے اپنے آپ میں جذبے کی فراوانی، حوصلے کی توانائی ہمت کی جوانی اور ارادے کی پختگی کو موجود بھی پاتے تھے۔ دل آمادہ و مستعد تھا لیکن وہ فطرت آشنا بھی تھا، اس لیے اسے "اُدھر" کے اشارے کا انتظار تھا۔ محبت میں ہر لحظہ لمحۂ جاودانی بن جاتا ہے، پھر آپؐ کی محبت تو عالمگیر تھی جسے "رحمۃ للعالمین" بھی بننا تھا، لہٰذا انتظار کی ہر گھڑی آپؐ کے لیے قیامت کی گھڑی تھی۔ قدرت آپؐ کی شخصیت کو سوزِ غمِ انسانیت سے اس قدر پختہ و محکم کر دینا چاہتی تھی کہ دنیا کی تمام حق دشمن قوتیں اس سے ٹکرا کر خود پاش پاش ہو جائیں لیکن اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ آپؐ کی شدتِ انتظار کی ہر گھڑی دہر کی آنِ جاودانی تھی، اس اعتبار سے قدرت نے آپؐ کی شخصیت کو غمِ انسانیت کی گلخن میں اتنا عرصہ سوزاں و پختہ کیا، جو مدتِ آفرینش کے برابر تھا۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ آپؐ کو قیامت تک کے لیے تمام جہانوں کے واسطے رحمت بننا تھا۔

قدرت نے آپؐ کو مجاہدِ اعظم اور داعیِ انقلاب بنانا تھا، اس لیے آپؐ کی تربیتِ نفسیاتی کے ساتھ تربیتِ جسمانی بھی ضروری تھی۔ آپؐ بچپن ہی سے مجاہدانہ مشاغل میں خاص دلچسپی لینے لگے تھے۔ ابھی آپؐ چھ برس ہی کے تھے کہ مدینہ منورہ میں آپؐ نے قیام کے دوران میں تیراکی سیکھ لی تھی، شمشیر زنی اور تیر افگنی میں بھی آپؐ نے مہارت حاصل کر لی تھی۔ آپؐ تیر اندازی کو بڑی اہمیت دیا کرتے تھے۔ ہجرت کے بعد جب اسلامی ثقافت کی پہلی اور بنیادی علامت، مسجد، تعمیر ہوئی تو آپؐ تیر کمان لے کر خطبہ دیا کرتے تھے اور مسلمانوں کو تیر اندازی کی مشق کرنے کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔ اس عہد میں دور مار ہتھیاروں کی اہمیت کو محسوس کرنا اور اس پر بہت زیادہ زور دینا آپؐ کی مجاہدانہ بصیرت پر دلالت کرتا ہے۔[۱۱] اس سے یہ نتیجہ بھی مستنبط ہوتا ہے کہ وقت کے دور مار ہتھیاروں کو استعمال کرنا آپؐ کی سنتِ حسنہ ہے۔

دوڑ، گھڑ سواری اور پہلوانی کا بھی آپؐ کو یقیناً شوق رہا ہو گا کیونکہ آپؐ بہت تیز دوڑنے والے اور اعلیٰ درجے کے گھڑ سوار تھے۔ عکاظ کے میلے میں آپؐ کا ایک نامور پہلوان کو گرانا آپؐ کے ذوقِ پہلوانی کی نشاندہی کرتا ہے۔ کتبِ سیر و تاریخ آپؐ کی سیرتِ طیبہ کے اس پہلو پر بہت کم روشنی ڈالتی ہیں، لیکن یہ حقیقت کہ آپؐ کی جسمانی صحت قابلِ رشک

تھی، اس بات کا ثبوت ہے کہ آپؐ یقیناً ورزش کیا کرتے تھے۔ آپؐ کی غذا سادہ، لباس سادہ اور عادات سادہ تھیں۔ آرام و راحت کی زندگی اور اشیا پہلے تو آپؐ کو میسّر نہ آئیں اور میسّر آئیں بھی تو آپؐ نے انھیں پسند نہ کیا۔ زندگی محنت و مشقت میں گزری، اس سے آپؐ کے اندر ان تمام مصائب و تکالیف کو برداشت کرنے کا حوصلہ و ہمّت اور صبر و شکیب پیدا ہوا۔

کسرت و صحّت لازم و ملزوم ہیں۔ آپؐ کے کسرتی و صحت مند جسم کے اندر ایک صحتمند قلب (دل و دماغ) تھا اور قلب کی صحت مندی کے دیگر اسباب کے علاوہ ایک بنیادی سبب اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق، خصوصاً انسان سے عشق تھا۔ عشق جو شدّت میں بے مثال اور وسعت میں عالمگیر تھا۔ اس عشق کی گرمی سے آپؐ کے قلب کا مسلسل تصفیہ و تزکیہ ہوتا رہا اور وہ زندہ بیدار اور فعّال و حرکی رہتا، نیز اس کی سوچ کی جہت صالح رہتی۔ ایسے ہی دل کے سامنے گناہ اپنی اصل صورت میں نمایاں ہوتا ہے جو اس کے لیے اتنی قبیح و نفرت انگیز اور ہولناک و سوہانِ روح ہوتی ہے کہ انسان گناہ کا ارتکاب کر ہی نہیں سکتا، جس طرح مہذب انسان بول و براز کو دیدہ دانستہ کھا ہی نہیں سکتا۔ سوزِ عشق سے قلب میں ایمان و خود اعتمادی کی قوت و توانائی پیدا ہوتی ہے، جس کی بدولت انسان زمانے کے ابوجہل و ابولہب، فرعون و ہامان و قارون اور نمرود و آزر کی قوتوں کا حریف ہو سکتا، بلکہ ان کو پاش پاش کر سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ سوزِ عشق سے آپؐ کا قلب اس قدر وسیع ہو گیا تھا کہ اس میں تمام آفاق کو اپنے اندر جذب کر لینے کی گنجائش پیدا ہو گئی اور یہ اس لیے ضروری تھا کہ آپؐ کو عملاً "رحمۃ للعالمین" بننا تھا۔

آپؐ کی شخصیّت غمِ انسانی کی گلخن میں آہن کی صورت چالیس برس تک ڈھلتی، پختہ ہوتی اور فولاد صفت بنتی رہی۔ آپؐ کے گلزارِ زندگی میں لڑکپن، شباب اور جوانی کی بہاریں آئیں، لیکن آپؐ کی نظریں حیاتِ انسانی کے خزاں دیدہ گلستان کی ویرانی و بربادی کے سوہانِ روح نظّاروں ہی پر مرتکز رہیں۔ فقط اپنے چمنِ زندگی کو فردوسِ نظر بنانا آپؐ کا مقصودِ زندگی نہ تھا، بلکہ آپؐ تو کُل معاشرۂ انسانی کو امن و سلامتی کی جنّت بنانے میں اپنی غایتِ زندگی کو مضمر سمجھتے تھے۔ جُوں جُوں "ساعتِ صفر"[۱۲] قریب آتی جاتی تھی، دل کی بیقراری بڑھتی جاتی تھی۔ جذبات کا سیلِ بیقرار اخراج و تصادم کے لیے مچل رہا تھا۔ آپؐ کے دل کی بے کلی کا راز اگر معلوم تھا تو "دوست" کو، جو خود "ساعتِ صفر" کا منتظر تھا۔ کارپردازانِ فطرت کو تیار رہنے کا اشارہ ہو چکا تھا۔ وحی و تنزیل کی تاب لانے کے لیے آپؐ کے زندہ و فعّال قلب کی تربیت شروع

ہو گئی اور آغاز رویائے صادقہ سے ہوا۔

خواب سچّا ہو تو آیتِ الٰہی اور عالمِ دیگر کا مظہر ہوتا ہے۔ "عالمِ دیگر" جو اس عالمِ زمان و مکان سے ماورا ہے، جو "الحیوان" ہے اور انسان کا اصل مقام ہے۔ آپؐ جو خواب دیکھتے، وہ سچا ثابت ہوتا۔ قدرت آپؐ کو سمجھاتی اور اس بات کا ایقان و اذعان پیدا کرتی رہی کہ آپؐ نے ثقافتِ انسانی کا جو حسین و منوّر اور عالمگیر و ہمہ گیر خواب دیکھا ہے، وہ اسی طرح سچّا ثابت ہو گا۔ آپؐ سچے ہیں، آپؐ کا دل سچّا ہے، آپؐ کا قول و قرار سچّا ہے، آپؐ کی فکر سچّی، آرزو سچّی اور "خواب" بھی سچّا ہے۔ آپؐ کے خواب سچّے بھی ہوتے تھے اور حسین بھی۔ خوابوں کی نوعیّت کیا تھی؟ اس کے متعلّق مآخذ ساکت ہیں، لیکن حسین خواب خود بہت بڑی نعمت ہوتے ہیں۔ حُسن کا مشاہدہ خواب میں ہو یا بیداری میں، بہر حال جمالیاتی حظ[۱۳] کا سامان ہوتا ہے۔ خواب حسین بھی ہوں اور سچّے بھی تو اللہ تعالیٰ کی نعمتِ عظمیٰ ہوتے ہیں۔ پھر وہ خواب جو نبوّت کا دیباچہ تھے، ان کے مظہرِ حقائق ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے؟[۱۴]

انسان نے جب بھی کوئی نیا اور عظیم کارنامہ سرانجام دیا، وہ دراصل اس کے خواب کی تعبیر تھا۔ سچا خواب روح کی سچّی آرزو ہوتا ہے۔ اس آرزو کو پورا کرنے ہی میں عظمتِ انسانی کا راز مضمر ہے۔ ان دیکھے "دوست" کی آواز آپؐ کے دل کی گہرائیوں میں بے صوت نغمہ بن کر گونجنے لگی۔ "دوست" کی آواز بتدریج فردوسِ گوش بنتی رہی۔ نظر جس نے "حقائق" کا حریف ہونا تھا، اس کی تربیت بھی مقصودِ فطرت تھی۔ "حُسنِ دوست" کے انوار کی پھوار غارِ حرا میں پڑنے لگی۔ نظر حُسن آشنا ہونے کے باوجود حیران ہوئی، لیکن اس حیرت میں معرفت و طمانیت کی لذّت تھی۔ حُسنِ گوش و نظر روز بروز آشکارا ہوتا چلا گیا اور حُسنِ دوست کے جلوؤں سے بالآخر غارِ حرا "حُسن مآب" بن گیا۔ لوگوں کے لیے غارِ حرا بڑا ہی تنگ و تاریک اور وحشت کدہ تھا اور یہ بات غلط بھی نہیں تھی، لیکن آپؐ کے لیے غارِ حرا وسعت میں بیکراں، حُسن و نور کی جلوہ گاہ اور کیف و سرور کی جنّت تھا۔ لوگوں کی نظر میں آپؐ اکیلے تھے، لیکن وہاں آپؐ کے ساتھ "دوست" بھی ہوتا تھا، گو وہ ابھی حجاب میں ہوتا تھا، لیکن آپؐ اس کے قُرب کی ٹھنڈک محسوس کرتے تھے۔ "دوست" حجاب میں بھی آپؐ کے لیے "قرۃ عین" یا آنکھ کی ٹھنڈک تھا۔ آپؐ زیادہ سے زیادہ وقت غارِ حرا کے حسن المآب میں گزارنے لگے۔

آپؐ وہاں ہفتے عشرے کے لیے ستّو، کھجوریں، پانی وغیرہ لے جاتے اور جب تک جسم کی بقا کا یہ سامان ختم نہ ہوتا، آپؐ حسن مآبِ حرا میں قیام کرتے اور یہ سلسلہ جاری رہتا۔ آپؐ کی عبادت

کی نوعیت کیا تھی؟ یہ سوال بعد میں آپؐ سے پوچھا گیا تو آپؐ نے جواب میں فرمایا: تفکر و اعتبار یعنی غور و فکر اور عبرت پذیری۔[۸] اس طرح آپؐ کا تزکیۂ قلب ہوتا رہا اور اس کے قویٰ نشو و ارتقاء کرتے رہے۔ علاوہ بریں آپؐ مقامِ شہود یا مقامِ احسان پر متمکن ہو کر مسلسل ترقی کرتے رہے، یہاں تک کہ ربِّ رحیم نے آپؐ کو عبدیت کے اس بلند ترین مقامِ محمود پر پہنچا دیا، جسے مقامِ نبوت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

حواشی و تشریحات

(۱) اہلِ نظر اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ ہر گناہ کی ایک صورت ہوتی ہے اور اس کی نوعیت کے مطابق وہ کم یا زیادہ مکروہ اور گھناؤنی ہوتی ہے۔ ابلیس یا شیطان کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے جمالیاتی فریب کے ذریعے گناہ کی قبیح شکل کو خوشنما بنا کر دکھاتا ہے اور انسان اس دھوکے میں آ کر اس کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور ارتکابِ گناہ کر بیٹھتا ہے لیکن اہلِ حُسن و نظر پر ابلیس کا فریب نہیں چلتا، کیونکہ وہ گناہ کو اس کی اصل شکل و صورت میں دیکھتے ہیں۔ جس طرح انسان دیکھتے اور جانتے بوجھتے ہوئے گندگی یا مکھی نہیں کھا سکتا، اسی طرح وہ گناہ کی مکروہ و قبیح صورت کو دیکھ کر اس کا ارتکاب نہیں کر سکتا، ایسے صاحبِ حُسن و نظر انسان کے لیے "معصوم" کی تعبیر اختیار کی جاتی ہے۔

(۲) مولانا رومی نے اس فلسفۂ دید و نظر کو شعری زبان میں اس طرح بیان کیا ہے:

آدمی دید است باقی پوست است ۔۔۔ دید آں باشد کہ دیدِ دوست است

جملہ تن را در گداز اندر بصر ۔۔۔ در نظر رو، در نظر رو، در نظر

اس سے مفصل بحث کے لیے دیکھیے مصنف کا مقالہ "اقبال کا فلسفۂ دید و نظر" در نذرِ رحمان، لاہور ۱۹۶۶ء ص ۷۵ تا ۱۰۴۔

(۳) یوسف ۱۲ : ۳

(۴) Modus Operandi

(۵) آلِ عمران ۳ : ۱۹

(۶) القلم ۶۸ : ۴

(۷) طٰہٰ ۲۰ : ۷۴ اور الاَعلیٰ ۸۷ : ۱۳

(۸) الروم ۳۰ : ۴۱

(۹) الرّوم ۳۰ : ۳۰

(۱۰) Aesthetic moment : اس سے مفصّل بحث کے لیے دیکھیے مصنّف کی کتاب جمالیات، قرآن حکیم کی روشنی میں، ص ۱۸۱ ببعد۔ (طبع دوم)

(۱۱) طبرانی : شرح جامع الصغیر، ۲ : ۳۸۹

(۱۲) Zero hour

(۱۳) Aesthetic Pleasure : مفصل بحث کے لیے دیکھیے مصنّف کی کتاب 'جمالیات قرآن حکیم کی روشنی میں' ص ۱۷۹ ببعد۔

(۱۴) بخاری' باب کیف کان بدءُ الوحی' ص ۳' طبقات ابن سعد' ۱ : ۲۲۴ ببعد، محمد حمیداللہ : رسولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی، ص ۸۷' ۸۸ ببعد' رحمۃ للعالمین' ص ۴۶ ، ۴۷' شبلی : سیرۃ النّبی' ص ۲۰۱ ' ابن ہشام' (اردو ترجمہ)' ص ۲۲۸ ببعد۔

(۱۵) عینی : شرح بخاری ، ۱: ۶۷' اس روایت کے الفاظ یہ ہیں : قیل ما کان صفۃ تعبّدہ اجیب بان ذٰلک کان بالتفکّر والاعتبار : یہ سوال پوچھا گیا کہ آپ کی عبادت کی نوعیت کیا تھی؟ جواب یہ تھا کہ غور و فکر اور عبرت پذیری۔

باب : ۴

فیضانِ نبوّت

(۱) حضرت جبرئیل علیہ السّلام کا پہلا مژدۂ نبوّت

(۲) وحی و تنزیل کا اوّلین تجربہ

(۳) تحریکِ اسلام شروع کرنے کا حکمِ الٰہی

(۴) اس حکمِ الٰہی کے اسرار و رموز

(۵) وحی کی ماہیّت و نوعیّت

باب ۴

فیضانِ نبوّت

۱۲ قبل ہجرت / ۶۶۱۰ : مُژدۂ نبوّت

نبوّت، اور وہ بھی عالمگیر و ابدی — اس کی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اتنا ہی گراں تھا۔ خود قرآنِ مجید شاہد ہے کہ اگر اسے کوہِ گراں پر نازل کیا جاتا تو وہ بھی اس کا متحمل نہ ہو سکتا۔[1] لیکن یہ آپؐ کا دل تھا جو تمام جہانوں کی ذمہ داریوں کا بوجھ اُٹھانے کے قابل تھا، غالباً اس لیے کہ اس میں تمام مخلوقات کا دردِ محبت تھا، یا قرآن مجید کی زبان میں وہ "رحمۃ للعالمین" تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ عظمت و رحمت لازم و ملزوم ہیں۔ عشقِ دیگرؑ کو اپنا ہوش کہاں ہوتا ہے؟ عشق کو اپنا ہوش ہوتا تو پروانہ بن کر شمع پر یوں جان نچھاور نہ کرتا اور نہ صورتِ خلیل بن کر آتشکدۂ نمرود میں یوں کود پڑتا۔

آپؐ پیکرِ حسن و عشق تھے، انسان کا عشق اپنا ہو تو دل کو آگ لگا دیتا ہے۔ اس آگ میں تاریکی، یاس اور اذیّت ہوتی ہے جس میں عقل سرگرداں اور رُوح بھٹکتی، جلتی اور تڑپتی رہتی ہے، لیکن عشقِ دیگر ہو تو اس دل کو آگ تو لگتی ہے، لیکن اس آگ میں حُسن، نور اور ٹھنڈک ہوتی ہے۔ اس سوزِ نورانی سے روح کو طمانیت و ٹھنڈک کی مسرّت ملتی ہے، عقل میں سلامتی، دِل میں رجائیت اور زندگی میں حرکیت پیدا ہوتی ہے۔ عشقِ رحمۃ للعالمینؐ کو حسین انسانی معاشرے کو دیکھنے اور اس کے لیے ہمہ گیر جمالیاتی انقلاب لانے کی آرزو تو تھی لیکن اسے اتنی خبر کہاں تھی کہ اسے سریر آرائے نبوّت کیا جائے گا اور اس کی تب و تاب کو جاودانی بنا دیا جائے گا۔ عشق کو تو واقعی اپنی خبر نہ تھی لیکن "دوست" کو تو اس کا عِلم تھا، رُوحِ حیات کو تو اس کا انتظار تھا اور کارپردازانِ قدرت تو اس ساعتِ انقلاب انگیز کے مُنتظر تھے۔ آخر وہ لمحۂ معیّن و مُنتظر آ ہی گیا۔

وادیِ عشق میں آپؐ کا رہوارِ زندگی عالمِ تب و تاب میں چالیس منزلیں طے کر چکا تھا۔ دوشنبہ (پیر) کا دن تھا اور تاریخ ۹، ربیع الاوّل، ۱۲ قبل ہجرت / ۱۲، فروری ۶۶۱۰ تھی۔ آپؐ

حسبِ معمول جبلِ حسراء کے غار میں جو اب جبلِ نور کے نام سے مشہور ہے[۴۴] اور جس کا ترجمہ بائیبل میں فاران آیا ہے، حکیمانہ تفکر و جذب کے عالم میں تھے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے روح الامین ؑ تعارف کی خاطر حسن مآبِ حراء میں ظہور پذیر ہوئے اور فرمایا: "محمد ﷺ! مژدہ قبول فرمائیے۔ آپ ﷺ اللہ تعالےٰ کے رسول اور میں جبریل ہوں[۴۵]۔"

یہ تجربہ جتنا عجیب، حیرت انگیز اور ہیبت ناک تھا اتنا ہی غیر متوقّع بھی تھا۔ اس پر گفتگو کرنے سے پہلے اس کلمۂ "تعارف" کے بعض لطائف و غوامض کی تصریح کی جاتی ہے۔ اس میں اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ سب سے پہلے آپ ﷺ کو آپ ﷺ کی ذات سے متعارف کرایا گیا ہے۔ اس میں اہم ترین اور بصیرت افروز نکتہ مضمر ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوقات کو پہچاننے، وحی و تنزیل کی روشنی میں حقائقِ زندگی کو سمجھنے کی ایک ناگریز پیش شرط معرفتِ نفس ہے۔ چنانچہ قرآنِ مجید کی رُو سے اس کا ایک بنیادی مقصد انسان کو اپنی ذات سے متعارف کرانا ہے[۴۶]۔ انسان کو جب اس حقیقت کی معرفت ہو جاتی ہے تو اس پر اپنے اور کائنات کے، نیز اپنے اور اللہ تعالیٰ کے رشتے کی نوعیت کے حقائق کھل جاتے ہیں، مثلاً اوّل یہ کہ انسان طبعاً عبد ہے اور اس کا معبود تنہا اللہ تعالیٰ ہے۔ دوسرے یہ کہ انسان خلقۃً اللہ تعالیٰ کا حاجت مند (فقیر[۴۷]) اور مربوب ہے اور اللہ تعالیٰ ہی فقط حاجت روا اور رب ہے۔ تیسرے یہ کہ یہ کائنات اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے، جس نے اسے بنیادی طور سے انسان کے لیے پیدا اور مسخّر کیا ہے۔ چوتھے، ان حقائق کی معرفت سے انسان پر اللہ تعالیٰ اور کائنات کے حوالے سے انسان اور انسان کے رشتے کی نوعیت کے اسرار بھی منکشف ہوتے ہیں۔

حضرت جبریل علیہ السلام کے تعارفی کلمے میں دوسرا اہم نکتہ یہ مضمر ہے کہ معرفتِ ذات کو معرفتِ الٰہی مستلزم ہے۔ معرفتِ الٰہی کے دو بنیادی حقائق یہ ہیں کہ تنہا اللہ تعالیٰ ہی تمام بنی نوعِ انسان کا الٰہ یعنی معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود، اور ربّ یعنی ان کی جسمانی و رُوحانی تربیت کرنے والا، ان کا مالک و آقا ہے۔ اس میں تیسری اہم بات یہ ہے کہ انسان کو عملی زندگی گزارنے کے لیے وحی و تنزیل کی روشنی ناگزیر ہے، جس سے مستفید ہونے کے لیے معرفتِ رسالت ناگزیر ہے، کیونکہ یہ اس کے دین کی اساس ہے۔

روح القدس کا آپ ﷺ سے بالمشافہ ملنا، تعارف کرانا اور مژدۂ نبوّت دینا، آپ ﷺ کے لیے ایک غیر معمولی تجربہ تھا۔ حضرت جبریل علیہ السلام ایک تو جہانِ دیگر کی نورانی مخلوق، دوسرے اللہ تعالےٰ کے جلیل القدر پیامبر تھے اور تیسرے انھوں نے مژدۂ نبوت دیا تھا، آپ ﷺ پر اس عجیب و غریب

اور غیر متوقع واقعہ کا انقلاب انگیز اثر ہونا چاہیے تھا، اور ہوا۔ اس مشاہدہ و تجربہ میں زندگی کا جاہ و جلال اور حق کی بے مثل جوہری توانائی تھی۔ اس سے آپ ﷺ اپنے اندر ایک عجیب، مگر مؤثّر و سرور انگیز تبدیلی محسوس کرنے لگے جو غالباً وحی و تنزیل کو برداشت کرنے اور اس انقلاب کی پیش شرط تھی، جو آپ ﷺ حیاتِ انسانی میں لانے والے تھے۔ آپ ﷺ کو پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ جس حسین اِنسانی معاشرے کا آپ ﷺ عمر بھر خواب دیکھتے اور اس کے قیام کے لیے عالمگیر و ہمہ گیر جمالیاتی انقلاب کا منصوبہ بناتے رہے ہیں، اس کی تعبیر کی پہلی نمود ہوئی ہے۔ اس احساس میں حسن و سرور بھی تھا اور خوفِ ذمّہ داری و رنگِ انتظار بھی۔ "نبوّت، اللہ اور جبریل" ان ناموں میں آپ ﷺ کو معنویت کا پرتو نظر آنے لگا۔ آپ ﷺ کا تجسّس و اشتیاق ہر دن شدید سے شدید تر، اور انتظار کا ایک ایک لمحہ ماہ و سال کی طرح طویل و شکیب رُبا ہوتا چلا گیا۔ گنتی میں تو واقعی چند مہینے ہی گزرے تھے، لیکن عالمِ شوق و انتظار میں آپ ﷺ کے دل پر صدیاں گزر گئیں۔

آخری وحی و تنزیل یا نزولِ قرآن کا آغاز، ۱۸ رمضان المبارک ۱۲ قبل ہجرت بمطابق ۱۴ اگست ۶۱۰ء

۹ ربیع الاوّل ۱۲ قبل ہجرت / ۱۲ فروری ۶۱۰ء کو حضرت جبریل علیہ السلام نے آپ ﷺ کو نبوّت کی بشارت دی تھی، لیکن آخری وحی و تنزیل یعنی قرآن مجید کے نزول کا آغاز نبوّت کے پہلے برس یعنی ۱۸ رمضان المبارک ۱۲ قبل ہجرت / ۱۴ اگست ۶۱۰ء کو ہوا[۴۸]۔ چھ ماہ کا یہ درمیانی عرصہ آپ ﷺ کی قلبی تربیت اور نشو و ارتقار کا زمانہ تھا تاکہ آپ ﷺ کا زندہ و بیدار اور حسین و مطہّر قلب مبارک سچّے خوابوں اور پیغمبرانہ مشاہدات و واردات[۴۹] کے ذریعے آخری وحی و تنزیل کے معنوی جلال و جمال اور ہیبت و جبروت کی تاب لانے کے قابل بن جائے، جس کے حریف کوہِ گراں بھی نہ ہو سکتے تھے:

"اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دبا جاتا اور پھٹا پڑتا ہے۔ یہ مثالیں ہم افرادِ نسلِ انسانی کے لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ ان پر غور و فکر کریں[۵۰]۔"

اس آخری وحی و تنزیل کا آغاز ایک تاریخ ساز و عہد آفرین واقعہ تھا، اور یہ واقعہ علم و حکمت، عقل و بصیرت اور امن و سلامتی کے حسین و منوّر دَور کا نقطۂ آغاز تھا۔ نیز یہ ایک مثبت و حسین انقلابِ حیات کا پیش خیمہ تھا جس کے ذریعے رحمۃ للعالمین ﷺ نے ہر زمان و مکان کے لیے ایک فطری اور حسین اسلامی معاشرے کی تشکیل و تعمیر کرنی تھی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ رات جس میں ربِّ ذوالجلال

کے کلامِ طیبہ کے سلسلے کا آغاز ہوا' اس کے لیے قرآنِ مجید نے لیلۃ المبارکہ (مبارک رات) اور لیلۃ القدر (شبِ قدر) کی تعبیریں اختیار کی ہیں :

حٰمٓ اس صاف صاف بیان کرنے والی کتاب کی قسم کہ ہم نے اسے مبارک رات (لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ) میں نازل فرمایا۔ ہم راستہ دکھانے والے ہیں۔[۱۰] ہم نے اس (قرآن) کو شبِ قدر (لیلۃ القدر) میں نازل کیا ہے[۱۱] اور یہ رمضان المبارک کی رات تھی۔

رمضان کا مہینا' روزوں کا مہینا ہے' جس میں قرآن نازل ہوا' جو بنی نوع انسان کا راہنما ہے اور جس میں ہدایت کی کھلی نشانیاں ہیں اور الفرقان ہے' یعنی حق و باطل' خیر و شر اور حسن و قبح کا معیار ہے[۱۲] تاریخ ۱۸۔ رمضان المبارک ۱۲ قبل ہجرت / ۱۴ر اگست ۶۱۰ء اور رات جمعۃ المبارک کی تھی۔ آپؐ حسبِ معمول حُسن مآبِ حرا میں حکیمانہ تفکّر و جذب کے عالم میں تھے کہ اس کا حسن و نور دفعتاً دوبالا ہوگیا اور آپؐ نے اپنے سامنے حضرت جبریل علیہ السلام کو کھڑے دیکھا۔ اُدھر' پاسِ ادب و احترام اور اِدھر ہیبت و اشتیاق تھا۔ دونوں کے منہ سے بات نہ نکلی' لیکن یہ خاموشی پُراسرار و رُوح پرور اور اشتیاق انگیز و سرور آفریں تھی۔ یہ لمحاتِ سکوت و سرور گنتی میں معدودے چند تھے لیکن اس قدر جاذبِ روح و زماں تھے کہ وقت منجمد ہوکر استعجاب و اشتیاق کا عالمِ جاودانی بن گیا۔ آخر" دوست "کے پیامبرِ جلیل و صدیق نے اس عالمِ سکوت کو اپنی سحر انگیز ملکوتی آواز سے عالمِ حُسنِ صورت و معنی میں تبدیل کر دیا اور آپؐ کو ربِّ رحیم کا یہ پیغام دیا[۱۳] :

(اے نبیؐ!) پڑھو اپنے ربّ کے نام کے ساتھ' جس نے (سب کچھ) پیدا کیا۔ (اور) انسان کی تخلیق جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے کی۔ پڑھو! اور تمھارا ربّ بڑا کریم ہے' جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔ انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔[۱۴]

کسی شخص کو دفعتاً اور غیر متوقع طور سے سریر آرائے سلطنت کر دیا جائے تو اس کے دل کی کیا کیفیّت ہوگی؟ کیا فرطِ حیرت و مسرّت سے اسے شادیٔ مرگ کا خطرہ نہ ہوگا؟ یقیناً ہوگا' لیکن دفعتاً اور غیر متوقع طور سے سریر آرائے نبوّت ہونا ایسا جانگسل اور شکیب رُبا تجربہ تھا کہ آپؐ کا دل اس کی تاب اس لیے لاسکا کہ وہ انسانیت کی محبت میں جہانِ بیکراں' سوزِ عشق سے نورِ مجسّم اور یقینِ محکم سے قوّت و توانائی کا بحرِ زخّار بن چکا تھا۔ دل بہر حال دل تھا۔ رُوح القدس ایسی جلیل اور نورانی مخلوق کے مشاہدہ و لقا اور وحی و تنزیل کے بارِ گراں سے ہیبت و جبروت اور اندیشہ ہائے گوناگوں سے معمور ہوگیا۔ آپؐ حسن مآبِ حرا سے نکل کر گھر تشریف لائے اور لیٹ گئے' اور

رفیقۂ حیات سے فرمایا : مجھے اوڑھاؤ! مجھے اوڑھاؤ! دل کو قرار آیا تو آپؐ نے ان سے اپنے اس حیرت انگیز واقعہ و تجربہ کا حال سُنایا' جو اس وقت آپؐ کے لیے واقعی جانگسل تھا۔ "کیا دل ہیبت و جبروتِ ملکوتی کا حریف اور نبوّت کی ذمّے داریوں کے بارِ گراں کا متحمّل ہوسکے گا؟ کیا اس امتحانِ نبوّت میں جان کا خطرہ تو نہیں؟" آپؐ نے فرمایا" نہیں!" اُمّ المومنین حضرت خدیجہ طاہرہؓ نے کہا : آپؐ ہرگز نہ ڈریں۔ اللہ کی قسم وہ آپؐ کو ہرگز رُسوا نہیں کرے گا۔ آپؐ صِلۂ رحمی (یعنی آپ رشتے داری کا پاس و احترام) کرتے ہیں' سچ بولتے ہیں' غریبوں اور یتیموں کی خبر گیری کرتے ہیں' مسکینوں کے لیے کماتے ہیں' مہمانوں کی خاطر مدارت کرتے ہیں' آفات و حوادث میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔[۱۵]

چونکہ واقعہ غیر معمولی نوعیّت کا تھا' اس لیے آپؐ پر اس کا ردِّ عمل بھی شدید ہوا۔ خود حضرت خدیجہ طاہرہؓ کا دل بھی اس سے بہت متاثّر ہوا' اور اس واقعے کی اصل نوعیّت معلُوم کرنے کا ان کو تجسّس ہوا اور وہ آپؐ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں' جو علم و فضل اور صدق و صفا میں معروف تھے' انھوں نے آپؐ کی زبان سے حُسن مآبِ حرا' کا واقعہ سُنا تو زبانِ صدق سے بے ساختہ نکلا : یہ تو وہی ناموس ہے جو حضرت موسٰی علیہ السّلام پر اُترا تھا۔[۱۶] کاش میں نوجوان ہوتا اور اس وقت تک زندہ رہتا جب قوم آپؐ کو ہجرت کرنے پر مجبور کر دے گی!

"کیا قوم مجھے جلاوطن کرے گی؟" آپؐ نے حیرت سے پوچھا۔ "ہاں" ورقہ بن نوفل نے جواب دیا" اس میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ ایسی تعلیم دینے والے سے قوم نے ہمیشہ دشمنی کی اور اسے جلاوطن کیا۔ کاش میں آپؐ کی ہجرت کے زمانے تک زندہ رہوں اور آپؐ کی خدمت کروں!"

اس واقعے کو یحیٰی بن بکیر نے لیث سے' انھوں نے عقیل سے' انھوں نے ابنِ شہاب سے' انھوں نے عروۃ بن زبیر اور انھوں نے (اپنی خالہ) امّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے اس طرح روایت کیا ہے : حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم پر وحی کی ابتدا سچّے (بعض روایات میں صالحہ یا اچھّے) خوابوں کی صورت میں ہوئی جو آپؐ نیند کی حالت میں دیکھتے تھے۔ چنانچہ آپؐ جو خواب بھی دیکھتے' اس کی تعبیر روزِ روشن کی طرح ظاہر ہوجاتی۔ پھر آپؐ (اور زیادہ) خلوت پسند ہوگئے اور غارِ حرا میں تنہا رہنے لگے اور کئی کئی شب و روز وہاں

تحنّث کرتے (اس سے مراد تفکّر و اعتبار ہے، یعنی آپؐ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے مسائلِ حیات پر غور و فکر کرتے اور معاشرۂ انسانی میں جو واقعات و حادثات ہوتے، ان سے عبرت حاصل کرتے تھے۔ (عینی : شرح بخاری : ۱ : ۶۷) : اس اثنا میں مطلقاً گھر نہ جاتے تھے۔ جب کھانے پینے کا سامان ختم ہو جاتا تو پھر اتنے ہی دنوں کا سامانِ خورد و نوش لے کر واپس چلے جاتے۔

ایک روز آپؐ غارِ حرا ہی میں تھے کہ دفعتاً آپؐ پر وحی کا نزول ہوا۔ ایک فرشتے نے آ کر آپؐ سے کہا : پڑھو! یہاں حضرت عائشہ خود رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا قول نقل کرتی ہیں کہ " میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔" اس پر فرشتے نے مجھے پکڑ کر اس زور سے بھینچا کہ میں نڈھال ہو گیا۔ پھر اس فرشتے نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا : پڑھو! میں نے کہا : میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس نے دوبارہ مجھے بھینچا اور میں نڈھال ہو گیا۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ کر کہا : پڑھو! میں نے کہا : میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ تیسری بار اس نے پھر مجھے اس قدر زور سے دبایا کہ میں بے بس ہو گیا اور بالآخر مجھے چھوڑ کر کہا : اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝ (العلق ۹۶ : ۱ تا ۵)۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپؐ نے اس کو دہرایا اور یہ آیت پڑھتے ہوئے واپس تشریف لائے۔ اس وقت آپؐ کا دل دھڑک رہا تھا۔ حضرت خدیجہؓ کے پاس پہنچ کر آپؐ نے فرمایا : مجھے کمبل اوڑھاؤ! مجھے کمبل اوڑھاؤ! چنانچہ آپؐ کو کپڑا اوڑھا دیا گیا۔ جب آپؐ سے خوف کی کیفیت دُور ہو گئی تو آپؐ نے فرمایا : اے خدیجہؓ! مجھے کیا ہو گیا ہے؟ پھر ان سے سارا ماجرا بیان فرمایا اور کہا : مجھے اپنی جان کا خوف ہے۔ حضرت خدیجہؓ نے کہا : ہرگز نہیں۔ اللہ کی قسم! آپؐ کو اللہ تعالیٰ کبھی رُسوا نہیں کرے گا۔ آپؐ صلۂ رحمی کرتے یعنی رشتے داروں سے حسنِ سلوک کرتے ہیں، نادار لوگوں کو کما کر دیتے ہیں، ناتوانوں کا بوجھ اُٹھاتے ہیں۔ مہمان نوازی کرتے ہیں اور جائز ضرورتوں میں لوگوں کے کام آتے ہیں۔ پھر حضرت خدیجہؓ آپؐ کو ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبد العزّیٰ کے پاس لے گئیں جو ان کے چچازاد بھائی تھے اور زمانۂ جاہلیّت میں عیسائی ہو گئے تھے اور انجیل کا (سریانی زبان سے) عبرانی میں ترجمہ کر کے لکھا کرتے تھے۔ بہت بوڑھے اور نابینا بھی ہو گئے تھے۔ حضرت خدیجہؓ نے ان سے کہا : بھائی جان! ذرا اپنے بھتیجے کا ماجرا تو سُنیے۔ ورقہ نے

آپؐ سے کہا : بھتیجے، تم کو کیا نظر آیا؟ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جو دیکھا تھا، بیان کر دیا۔ ورقہ نے کہا : یہ وہی ناموس (وحی لانے والا فرشتہ، روح القدس) ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ پر نازل کیا تھا۔ کاش میں آپؐ کے عہدِ نبوّت میں جوان ہوتا! کاش میں اس وقت تک زندہ رہوں جب آپؐ کی قوم آپ کو نکال دے گی یعنی جلاوطن کر دے گی۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا : کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟ ورقہ نے کہا : جی ہاں! کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی شخص وہ چیز لے کر آیا ہو جو آپ لائے ہیں اور اس سے دشمنی نہ کی گئی ہو۔ اگر میں نے آپ کا وہ زمانہ پایا تو میں آپ کی پُرزور مدد کروں گا۔ کچھ زیادہ مدّت نہ گزری تھی کہ ورقہ فوت ہو گیا اور وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔[17]

انسان کو اللہ تعالیٰ کی عظمت و شان، قوّت و عزّت اور جمال و جلال کا احساس ہو تو اسے اس امر کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نبی اور رسول بننے اور وحی جو "دوست" کا پیام ہے، اس کے اس اہتمام سے ملنے کے معنی کیا ہیں؟ آپؐ کے لیے وحی اپنے خواب کی تعبیر کا پیش خیمہ تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اپنے اِلٰہ یعنی معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود کے ساتھ سلسلۂ کلام کا ذریعہ تھا۔ اس کا منقطع ہو جانا آپؐ کے لیے کوئی معمولی واقعہ نہ تھا، بلکہ وہ فطری طور سے ایک رُوح فرسا، جانگسل اور شکیب رُبا حادثہ تھا۔

آپؐ کو اپنے حسین معاشرۂ انسانی کے خواب کی تعبیر کے امکان کی جو جھلک دفعتاً نظر آئی تھی، وہ اسی طرح پھر غائب ہو گئی تھی۔ محبّتِ انسانی اقدام کے لیے بے حد بیقرار تھی، اس لیے انقطاعِ وحی کا ایک ایک لمحہ دل پر قیامت ڈھاتا تھا۔ شاید یہ آپؐ کے انتظار و شکیب کا امتحان تھا یا شاید یہ محبت کی ایک گھات تھی۔ جو کچھ بھی تھا، صبر آزما و حُزن افزا بلکہ حوصلہ فرسا تھا۔ امام بخاری نے اس واقعے کو اس طرح روایت کیا ہے : جیسا کہ ہمیں حدیثوں سے معلوم ہوا ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سلسلۂ وحی کے منقطع ہو جانے سے بہت غمگین اور رنجیدہ خاطر ہوئے، اتنے غمگین و رنجیدہ خاطر کہ کئی مرتبہ آپؐ صبح کو اس ارادے سے پہاڑ پر چڑھے کہ اپنے آپؐ کو اس کی چوٹی سے گرا دیں۔ جب آپؐ اس ارادے سے کسی قُلّہ کوہ پر پہنچتے تو حضرت جبریلؑ ظاہر ہوتے اور فرماتے : "محمدؐ! بلاشبہ آپؐ اللہ کے رسُول ہیں۔" یہ الفاظ سُن کر آپؐ کا اضطراب و قلق رفع اور دل مطمئن ہو جاتا۔[18]

آخر کار انتظارِ وحی کا اضطراب انگیز دَور ختم ہوا۔ فترۃ الوحی (وحی کے بند رہنے کے

زمانے) کے تین برس بعد اسلام کی انقلاب انگیز تحریک رحمۃ للعالمینی کے شروع کرنے کی ساعتِ صفر آپہنچی۔[۱۹] اس کا اذن کیسے ملا اور اس کی نوعیّت کیا تھی، اسے حضور رسالت مآب صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس طرح بیان فرمایا ہے :

ایک بار میں جا رہا تھا کہ آسمان سے ایک آواز سُنی۔ نظر اُٹھائی تو دیکھا کہ وہی فرشتہ جو حرا میں میرے پاس آیا تھا، آسمان اور زمین کے درمیان کُرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھ پر رعب طاری ہوگیا اور گھر لوٹ آیا اور میں نے کہا: مجھ پر کمبل ڈال دو! مجھ پر کمبل ڈال دو۔ اس وقت اللہ تعالےٰ نے وحی نازل کی : " اے اوڑھ لپیٹ کر اوڑھنے والے ! اٹھو ! اور تنبیہہ کرو۔ اپنے ربّ کی بڑائی کا اعلان کرو اور اپنے کپڑے پاک وصاف رکھو اور گندگی سے دُور رہو۔" پھر وحی کا بازار گرم ہوگیا۔ یعنی لگاتار مجھ پر وحی کا نزول شروع ہوگیا۔[۲۰]

اسلام کی تحریکِ انقلاب کا آغاز کرنے کے یہ اوّلین پانچ احکام تھے جو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو دیے۔ اس اعتبار سے ان کی غیر معمولی اہمیّت میں مبالغہ نہیں ہوسکتا۔ ہوسکتا ہے کہ ظاہر بیں نگاہوں کو یہ احکام معمولی نظر آئیں لیکن اہلِ نظر جانتے ہیں کہ حسین و عالمگیر انقلاب کے داعی کے لیے ان میں معنویّت کا ایک جہاں مضمر تھا، جن پر مختصراً گفتگو کی جاتی ہے :

(۱) پہلا حکم "قُم" کا ہے، جس میں اقدامِ مُسلسل کا مفہوم مضمر ہے۔ اس حکمِ الٰہی کی تعمیل آپؐ پر اس وقت تک لازم تھی، جب تک آپؐ کا مشن پُورا اور اس کی جگہ دوسرا فرمانِ الٰہی نازل نہیں ہو جاتا۔ نبیؐ کا دل فطرت شناس ہو جاتا ہے۔ چنانچہ تاریخ، کُتبِ سیر و حدیث اور خود قرآنِ مجید شاہد ہے کہ آپؐ نے اس تحریک کو اس وقت تک جاری رکھا جب تک کہ "قُم" کی جگہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ[۲۱] کا حکم نہیں آگیا۔ اس تحریکِ انقلاب کو آخر تک جاری رکھنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یہ جان جوکھوں کا کام تھا۔ اس راہ میں آپؐ کو قدم قدم پر سخت نامساعد، رُوح فرسا اور مایوس کُن حالات سے دوچار ہونا اور پہاڑ ایسی رکاوٹوں کو عبور کرنا پڑا، لیکن آپؐ نے نہ تو ہمّت ہاری اور نہ تحریک سے کنارہ کشی ہی کی، اس لیے کہ آپؐ کو اذنِ "قُم" مِلا تھا۔ آپؐ نے اس "حکم" کے پیشِ نظر ہر صورتِ حال کا مقابلہ کیا، نہ تو کبھی دم لیا اور نہ ایک لحظے کے لیے غافل ہی ہوئے۔[۲۲]

(۲) **فَاَنْذِرْ** : قُم کی طرح فَاَنْذِر میں بھی معنویت کا ایک جہان پوشیدہ ہے۔ اس کے بنیادی معانی ہیں : لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے قانونِ مکافاتِ عمل سے ڈرانا۔ اس زمانے

میں بھی آج کی طرح لوگ قدرت کے اس قانون کے قائل نہ تھے۔ جو قائل تھے بھی، وہ عملاً منکر تھے۔ بُت پرست اس زعم میں مبتلا تھے کہ لات و منات اور ہبل و عزّیٰ وغیرہ بُت ان کے سفارشی اور معاون و مددگار اور تقربِ الٰہی کا ذریعہ ہیں، اس لیے وہ جو کچھ کریں روا ہے۔ نصاریٰ بھی اس قانون کے قائل نہیں تھے۔ ان کے نزدیک نجات حُسنِ عمل پر نہیں، اصطباغ یا بپتسمہ پر[۲۳] منحصر تھی۔ یہود بھی اس اعتبار سے اس کے منکر تھے کہ وہ اس وہم میں مبتلا تھے بلکہ ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی چہیتی قوم ہیں، لہٰذا ان کی ہر خطا قابلِ معافی ہے۔ لوگوں کے ان عقائد کے پیشِ نظر قانونِ مکافاتِ عمل کی تبلیغ کی غیر معمولی اہمیّت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

قُدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل کو تسلیم کرنے سے مندرجۂ ذیل تین حقائق کو ماننا لازم آتا ہے : اوّلاً، اللہ تعالیٰ ایک فعّال ہستی اور عادل ہے، لہٰذا کسی غیر اللہ کی مجال نہیں کہ اسے عدل کرنے سے باز رکھ سکے۔ اس سے ان تمام نظریات کی تردید لازم آتی ہے، جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ثانیاً، انسان مر کر فنا نہیں ہو جاتا بلکہ اس کا دوبارہ زندہ ہو کر اپنے اعمال کے مطابق جزا یا سزا کا مزہ چکھنا اس کا مقدّر ہے۔ ثالثاً، یہ دنیا دارالامتحان اور آخرت دارالجزا ہے۔

غور سے دیکھیں تو شرک و بُت پرستی کی ہر شکل میں قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل کا انکار پنہاں ہوتا ہے۔ چنانچہ فَاَنذِر کے حکم میں بنیادی طور سے لوگوں کو شرک و بُت پرستی کے انجام سے ڈرانا مقصود تھا۔

اِنسان میں دو قوتیں عموماً برسرِ پیکار رہتی ہیں : ایک قوتِ شہوانیہ اور دوسری قوتِ عقلیہ۔ ابلیس اپنے جمالیاتی فریب سے انسان کی قبیح سے قبیح خواہشات تک کو مزیّن یعنی خوشنما اور دلکش بنا کر اسے دِکھاتا ہے۔ اس کا نتیجہ عموماً یہ نکلتا ہے کہ عقل مغلوب النفس ہو جاتی ہے۔ اس عالم میں اِنسان جو جرم و گناہ بھی کرتا ہے، وہ اسے اچھا لگتا ہے اور اپنے جرم و گناہ پر پردہ ڈالنے اور اپنے آپ کو فریب میں مبتلا رکھنے کی خاطر وہ طرح طرح کے باطل دلائل و روایات کا سہارا لیتا ہے۔ لوگوں کو ابلیس کے جمالیاتی فریب کے بھیانک عواقب و نتائج سے متنبہ کرنا بھی فَاَنذِر کے حکم میں داخل تھا اور آپؐ نے اس حکم کی تعمیل اس جامع طریق سے کی کہ تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ مختصر یہ کہ فَاَنْذِر کے حکم میں بداعتقادی و بے ایمانی، شرک و بُت پرستی، ظلم و استحصال، جُرم و گناہ، بدنیتی و غفلت، تکذیب و دروغ گوئی اور منافقت و فجور کے فطری و لازمی عواقب و نتائج سے لوگوں کو ڈرانے کا مفہوم مضمر ہے تاکہ ان میں ایقان و اذعان

پیدا ہو۔

فَاَنْذِرْ کے مُثبت پہلو بھی ہیں۔ انسان میں جب مکافاتِ عمل کا شعور پیدا ہوتا ہے تو ایک طرف اسے ظلم و گناہ سے خوف آنے لگتا ہے تو دوسری جانب اس کے دل میں خیرِ حسنہ اور عدل و احسان کی خُفتہ محبّت بیدار ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جب انسان میں شرک و بُت پرستی کے بھیانک عواقب کا ایقان پیدا ہو جاتا ہے تو اس کے دو نتائج نکلتے ہیں : سلبی اور ایجابی۔ سلبی نتیجہ جھوٹے معبودوں سے نفرت کی صورت میں اور ایجابی حقیقی "اِلٰہ" سے محبّت کی شکل میں نکلتا ہے۔ چنانچہ آپؐ نے جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، ان دو پہلوؤں پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔

(۳) رَبَّكَ فَكَبِّرْ : اللہ تعالیٰ کو آپؐ سے جو محبّت اور اپنائیت تھی، اس کا اظہار وہ تیرا رب (ربّكَ) اور ہمارا بندہ (عبدنا)[۲۴] کے الفاظ سے کرتا ہے۔ یہ تو تھا جُملہ معترضہ۔ اس حکم کے بھی دو پہلو ہیں : مثبت و منفی۔ مثبت پہلو یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا ایقان و اذعان پیدا کیا جائے، اور منفی پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا لوگوں نے جو جھوٹے خدا اور ربّ بنا لیے تھے، ان کی تکذیب و تذلیل کی جائے۔ اس حکم کی اہمیت اس سے بہت زیادہ ہے جو عام طور سے سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ اسی حکم کی بنا پر آپؐ نے اسلام کا نعرہ "اللہ اکبر" مقرر کیا جو آج تک جاری و ساری ہے اور ہمیشہ کارزارِ ہستی میں گونجتا رہے گا۔ اصل یہ ہے کہ جب لوگوں میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا شعور پیدا ہو جاتا ہے تو پھر معاشرے میں فرعون یا قارون کا وجود باقی نہیں رہتا، اور نتیجۃً انسان انسان کا غلام نہیں رہتا، اور انسان انسان کا معبود و ربّ نہیں بن سکتا۔ فرعون، ہامان اور قارون نام اور بھیس بدل بدل کر ہر زمانے میں موجود رہتے ہیں۔ یہ بنی نوع انسان کے کُھلے دشمن ہیں، جس طرح ابلیس ہے۔ یہ اِنسانی معاشرہ کے سرطان ہیں جو اس کا خون چُوس چُوس کر پھیلتے چلے جاتے ہیں لیکن انسان کو اپنے ظلم و جہل کی وجہ سے اس حقیقت کا بہت کم شعور ہوتا ہے۔ فَاَنْذِرْ کا ایک معنی مظلوم و غریب لوگوں میں اس شعور کو بیدار کرنا بھی تھا۔

اللہ تعالیٰ کی "کبریائی" کا شعور عقیدۂ توحید کی رُوح ہے۔ انسان میں جب اِس حقیقت کا اذعان و ایقان پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قدرت، علم و حکمت وغیرہ تمام صفاتِ حسنہ میں سب سے بڑا ہے اور وہ میرا "خدا" ہے تو اسے نہ تو کسی فرعون یا ہامانِ وقت کا خوف رہتا

ہے اور نہ اپنی ذات کا غم اس کے لیے سُوہانِ روح ہی بنتا ہے۔ یہ عقیدہ اس کے قلب کی وُسعتوں کو آفاقی اور اس کے حوصلے کو ناقابلِ تسخیر بنا دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ عقیدہ انسان کو اس کے مقامِ عبدیّت سے آشنا ہی نہیں، اس پر متمکّن کرتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ مقامِ عبدیّت ہی اس کا حقیقی مقام ہے، جس کی عظمت و رفعت کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور اپنی عبدیّت کا شعور ہوتا ہے۔

"کبریائی" کے تمام مُدّعیانِ کاذب کے ظلم و استحصال سے بنی نوع انسان کو نجات دلانے کی خاطر آپؐ کو لوگوں میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا شعور بیدار کرنے پر مامور کیا گیا تھا، اور یہ بے حد کٹھن کام تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ نہ صرف عرب میں بلکہ تمام دُنیا میں شرک و بُت پرستی کا دَور دَورہ تھا۔ انسان جب اللہ تعالیٰ کے کاروبارِ ربوبیّت میں غیر اللہ کو شریک کرتا ہے تو اس سے اس میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا شعور کمزور پڑ جاتا ہے اور دوسرے اس کی اپنی شخصیّت پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔ لوگوں کی ایسی نفسیاتی صورتِ حال تھی جب آپؐ کو لوگوں میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا شعور بیدار کرنے کا فرمانِ الٰہی مِلا تھا۔

(۴) وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ : اس کا مفہوم تو یہ ہے کہ اپنے کپڑوں کو پاک و صاف رکھو، اور دوسرا یہ کہ اپنے دامنِ زندگی کو پاک و صاف رکھو۔ سب سے پہلے اس امر کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ صفائی اور پاکیزگی میں بہت فرق ہے۔ ایک کپڑا صاف ستھرا دکھائی دینے کے باوجود پاک نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح کپڑا پاک ہونے کے باوجود صاف ستھرا نہیں ہو سکتا۔ اسلام صفائی اور پاکیزگی دونوں پر زور دیتا ہے اور طہارت کا لفظ ان دونوں معانی پر حاوی ہے۔ اس سے یہ مستنبط ہوا کہ اسلام میں صفائی اور پاکیزگی دونوں کو غیر معمولی اہمیّت حاصل ہے۔

اہلِ ذوق و صفا جانتے ہیں کہ پاکیزگی و صفائی جسم اور رُوح دونوں کی صحّت اور نشو و ارتقا کی ایک لازمی شرط ہے۔ جس طرح انسان کا لباس اور جسم اس کرۂ ہوا میں ماحول کے غیر مَرئی گرد و غبار سے میلا ہوتا رہتا ہے۔ اسی طرح قلبِ انسانی پر بھی غیر مرئی طور سے معاشرتی بُرائیوں کے اثرات پڑتے اور اسے گدلا کرتے رہتے ہیں۔ جب اس پر بُرائیوں کے اثرات تہہ بہ تہہ جم جاتے ہیں تو قلب طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کے قویٰ کا نشو و ارتقا رُک جاتا ہے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر اسلام نے قلب کے تصفیہ و تزکیہ پر بجا طور پر بہت زور دیا ہے۔ تصفیۂ قلب کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ انسان طہارت پسند ہو اور اس کا

جسم ولباس مطہر ہو۔

اس بات کے متعلق دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ جو شخص خود پاکیزہ نہ ہو اور اُس میں ذوقِ طہارت نہ ہو تو وہ دوسروں میں ذوقِ طہارت پیدا نہیں کرسکتا۔ ذوقِ طہارت اس لحاظ سے ازبس اہم ہے کہ یہ تزکیۂ نفس کی ایک پیش شرط ہے اور تزکیۂ نفس کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ اس کے بغیر شخصیت اور مکارمِ اخلاق کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔

اس ارشادِ باری تعالیٰ پر تاریخ کے حوالے سے غور کرنے سے اس کی غیر معمولی اہمیّت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اقوامِ عالم میں اس وقت پاکیزگی کا وہ مفہوم نہیں تھا جو اسلام پیدا کرنا چاہتا تھا۔ عیسائیت، جو مغرب میں سب سے بڑا تبلیغی دین تھا، اس پر رہبانیت کا غلبہ تھا۔ اور رہبانیت میں جسم ولباس، حتیٰ کہ ماحول کی پاکیزگی خلافِ تقویٰ بات تھی چنانچہ جو شخص جتنا زیادہ غلیظ ہوتا تھا، اتنا ہی زیادہ اسے خدا رسیدہ سمجھا جاتا تھا۔ خاص و عام سبھی بول و براز کر کے طہارت نہیں کرتے تھے۔ ہاتھ تک دھونے کا رواج تک نہ تھا۔ غسلِ جنابت سے کوئی آشنا نہ تھا۔ کھانا کھانے سے پہلے ہاتھوں کو دھونے کو بدعت و ریاکاری خیال کیا جاتا تھا۔ میلے کچیلے لباس و ماحول میں رہنا زُہد کی ایک ناگزیر پیش شرط تھی۔ زاہد و عابد اس بات پر فخر کرتے تھے کہ انھوں نے برسوں پانی کو چھُوا تک نہیں۔ کپڑوں، سر بلکہ جسم کے بالوں تک میں جوئیں پڑ جانے کو زُہد کے ارفع مقام کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

قریب قریب یہی صورتِ حال مشرقی اقوام کی تھی۔ مشرق میں بُدھ مت سب سے بڑا تبلیغی مذہب تھا اور وہ بھی عیسائیت کی طرح رہبانیّت و خانقاہیّت کا علمبردار تھا۔ اس مذہب کے زیرِ اثر مغرب کی طرح مشرق میں بھی لوگ پاکیزگی کے مفہوم سے کم آشنا تھے۔ جہاں تک ہندو قوم کا تعلّق تھا، وہ بھی طہارت کور تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ہندو مت میں صُبح کے اشنان (غسل) کو ہمیشہ اہمیّت حاصل رہی ہے، لیکن تھی وہ بھی ناپاک۔ پیشاب کر کے طہارت کرنا، کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا، غسلِ جنابت وغیرہ کا رواج نہ تھا۔ گائے کے گوبر اور پیشاب کو پاکیزہ بلکہ پاک کرنے والا سمجھا جاتا تھا اور اس کا استعمال عام تھا۔ عرب کے کُفّار بھی پاکیزگی کو کوئی اہمیّت نہیں دیتے تھے۔ صحرا کے بدو تو پاکیزگی کے تصور تک سے ناآشنا تھے۔

یہود میں بلاشبہ لباس اور جسم کی طہارت کو ضروری سمجھا جاتا تھا، لیکن وہ اس معاملے میں حد سے زیادہ متشدّد تھے۔ ان کی شریعت میں لباس ناپاک ہوجائے تو وہ پانی، صابن وغیرہ

سے پاک نہیں ہوسکتا تھا، لہٰذا ناپاک حصّے کو کاٹ پھینکنا ضروری تھا۔ جسم کی ناپاکی سے متعلق بھی ان کا عقیدہ متشدّدانہ تھا، لیکن بہت کم لوگ شریعت پر عمل کرتے تھے۔ یہود قوم چونکہ کہیں بھی اپنی الگ سیاسی حیثیت یا حکومت نہیں رکھتی تھی، لہٰذا عوام مقامی باشندوں کی تہذیب سے متأثر ہوجاتے تھے۔ اس طرح عملاً وہ بھی گندے اور گندگی پسند تھے۔

مختصر یہ کہ اقوامِ عالم طہارت کور تھیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے انھیں ظاہری و باطنی لحاظ سے پاکیزہ اور پاکیزگی کے مفہوم سے آشنا کرنے اور اس کی اہمیّت کا ان میں احساس و شعور بیدار کرنے کے لیے اپنے پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کو مبعوث فرمایا اور ارشاد فرمایا وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ : اور اپنے کپڑے (یا دامنِ حیات کو) پاک وصاف رکھو!

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، عیسائیت اور بُدھ مت کے زیرِ اثر اقوامِ عالم جسم ولباس کی گندگی کو روح کی پاکیزگی کو ایک پیش شرط سمجھتی تھیں اور اسلام اس تصوّرِ باطل کو مٹانا چاہتا تھا، اور ان میں اس حقیقت کا اذعان پیدا کرنا چاہتا تھا کہ رُوح کی پاکیزگی اور جسم ولباس لازم و ملزوم ہیں۔

عربی محاورے میں ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ کا ایک معنی یہ بھی ہوسکتا ہے جو اُردو میں "اپنا دامن پاک رکھو" کا ہے۔ اس اعتبار سے آپؐ کو لباس اور جسم کی پاکیزگی کی طرح اخلاق کی پاکیزگی کا بھی ایک مثالی معیار قائم کرنے کی ہدایت ملی۔ چنانچہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ آپؐ نے اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کے ذریعے جو حسین انقلاب پیدا کیا اور پھر اسلامی معاشرے کی بنیاد رکھی، اس کے افراد کا معیارِ اخلاق نہایت بُلند تھا۔

(۵) وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ : اور گندگی سے دُور رہو۔ اس ارشادِ الٰہی میں تن اور من دونوں کی گندگی سے دُور رہنے کی ہدایت ہے۔ تن سے مراد جسم، لباس اور ماحول ہے اور ماحول دو طرح کا ہوتا ہے : مکانی اور زمانی۔ مکانی ماحول کا مطلب گھر بار، محلّہ، گاؤں، شہر وغیرہ اور ان کی فضا اور آب وہوا ہے۔ زمانی ماحول سے مراد زمانے کے اثرات ہیں، مثلاً تاریخی، ثقافتی، سیاسی، معاشرتی اثرات۔ یہ اثرات منفی یا سلبی نوعیّت کے ہوں تو ان سے انسان کی شخصیّت بُری طرح متأثّر ہوتی ہے۔

من کی گندگی سے مراد جُرم و گناہ اور ظلم و عدوان کے طبعی اثرات ہیں۔ اس کی بدترین شکل شرک ہے، اس کے بعد کُفر، قتلِ انسانی، بُخل، نفاق اور ظُلم و استحصال وغیرہ ہیں۔

اسلام نے تزکیہ پر جو بہت زیادہ زور دیا اور اسے ذریعۂ فلاح قرار دیا ہے، اس سے مقصود بھی یہ ہے کہ انسان تن اور من کو گندگی سے پاک و صاف رکھے تاکہ اس کی حسّی و قلبی قوتیں حدِکمال تک نشوونما پاسکیں۔ اصل یہ ہے کہ پاکیزگی انسانیت کا خاصّہ ہے، لیکن ظہورِ اسلام کے وقت اقوامِ عالم کو نہ تو طہارت سے محبّت تھی اور نہ گندگی سے نفرت۔ اس کی بُنیادی وجہ یہ تھی کہ ان کی جمالیاتی حِسّ مردہ ہوچکی تھی اور وہ کور ذوق ہوچکے تھے۔ اسلام کی انقلاب انگیز تحریکِ رحمۃ للعالمینی کا ایک بنیادی مقصد انسان کی جمالیاتی حِس کو زندہ و بیدار کرنا تھا تاکہ وہ حُسن سے محبّت اور قُبح سے نفرت کرے۔ یہ یاد رہے کہ پاکیزگی حُسن کا ایک ناگزیر عُنصر ہے۔[26]

تین برس تک آپؐ پر وحی نہیں آئی تھی، جس کے باعث آپؐ کو یہ اندیشہ مضطرب رکھتا تھا کہ کہیں اللہ تعالیٰ نے وحی و تنزیل کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے بند تو نہیں کردیا ہے۔ اب وحی کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا تو آپؐ کے دل سے یہ وسوسہ ہمیشہ کے لیے نکالنے اور آپؐ کو تسلّی دینے کی خاطر یہ وحی آئی :

قسم ہے روزِ روشن کی اور قسم ہے شبِ تاریک کی، جب وہ سکون کے ساتھ طاری ہوجائے۔ (اے نبیؐ) تمھارے ربّ نے تم کو ہرگز نہیں چھوڑا اور نہ وہ ناراض ہوا۔ اور یقیناً تمھارے لیے بعد کا دَور پہلے دَور سے بہتر ہے اور عنقریب تمھارا ربّ تمھیں وہ کچھ دے گا کہ تم خوش ہوجاؤ گے۔ کیا اس نے تمھیں یتیم نہیں پایا اور پھر ٹھکانا مہیا کیا؟ اور تمھیں تلاشِ حق میں سرگرداں پایا اور پھر ہدایت بخشی۔ اور تمھیں تنگ دست پایا اور پھر مال دار اور مستغنی کردیا، لہٰذا یتیم پر سختی نہ کرو اور سائل کو نہ جھڑکو اور اپنے ربّ کی نعمت سب سے بیان کرو۔[27]

حاصلِ کلام یہ کہ زیرِ نظر آیاتِ کریمہ میں آپؐ کو جو احکامِ الٰہی ملے ان کا مطلب یہ تھا کہ آپؐ وحی و تنزیل یا ہدایاتِ الٰہی کے مُطابق اسلام کی انقلاب انگیز تحریکِ رحمۃ للعالمینی کو شروع کریں۔ چنانچہ آپؐ اس عظیم کام کے لیے کمربستہ ہوگئے اور اس کا آغاز گھر سے کیا۔ کیوں اور کیسے کیا؟ اس کا جواب اگلے باب میں دیا جائے گا، لیکن اس سے پہلے وحی سے متعلّق مختصر سی گفتگو کرلی جاتی ہے۔

وحی کی نوعیّت کیا تھی اور وہ کیسے نازل ہوئی تھی؟ اس مسئلے کو واضح طور سے سمجھنا اور سمجھانا اس لیے محال ہے کہ فقط انبیاء علیہم السلام ہی اس تجربے سے گزرے ہیں۔ ان کے سوا کسی اور کے اس تجربے سے گزرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں ختمی مرتبت پیغمبر

اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ تو وحی و تنزیل کا سلسلہ تو ہمیشہ کے لیے منقطع ہوچکا ہے۔ بہرحال یہی سوال ایک صحابی نے آپؐ سے کیا تھا اور اس کا جواب جو آپؐ نے دیا تھا، وہ صحیحین میں محفوظ ہے۔

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ حارث بن ہشامؓ نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے عرض کیا : یارسول اللہؐ! آپؐ کے پاس وحی کیونکر آتی ہے؟ آپؐ نے فرمایا : کبھی تو اس کی آواز جرس ایسی ہوتی ہے اور یہ وحی مجھ پر سخت ترین ہوتی ہے۔ پھر وحی موقوف ہوجاتی ہے اور جو کچھ میں نے فرشتے سے سُنا ہوتا ہے، اسے یاد کرکے حفظ کرلیتا ہوں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ فرشتۂ وحی آدمی کی شکل میں میرے پاس آتا ہے اور مُجھ سے گفتگو کرتا ہے، اور جو کچھ اس سے سُنتا ہوں اس کو یاد کرلیتا ہوں۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے آپؐ پر وحی کو نازل ہوتے دیکھا ہے۔ سردی کے دنوں میں آپؐ پر وحی اُترتی اور جب فرشتہ وحی دے کر چلا جاتا تو میں دیکھتی کہ آپؐ کی پیشانی سے پسینہ جاری ہے۔[28]

صحابۂ کرامؓ کی موجودگی میں بھی آپؐ پر وحی نازل ہوتی، لیکن وہ چونکہ اس تجربے سے نہیں گزرے تھے، اس لیے وہ وحی سے متعلّق تو کچھ بیان نہیں کرتے، البتہ اس وقت آپؐ کی ظاہرہ کیفیت کا اظہار کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عبادہ بن صامتؓ کہتے ہیں کہ جس وقت نبیِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم پر وحی نازل ہوتی، تو کرب میں مبتلا ہوجاتے اور چہرے کا رنگ بدل جاتا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ جب نبیِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم پر وحی نازل ہوتی تو آپؐ اپنا سر جھکا لیتے اور اصحابؓ بھی اپنا سر جھکا لیتے اور جب وحی ختم ہوجاتی تو سر اُٹھا لیتے۔[29]

حواشی و تشریحات

(۱) الحشر ۵۹ : ۲۱۔

(۲) عشقِ دیگر سے مُراد عشقِ الٰہی و عشقِ انسانیّت ہے۔

(۳) حرکی : Dynamic

(۴) غارِ حرا میں قرآن مجید، جو نُور و ہدایت ہے، آپؐ پر نازل ہونا شروع ہوا تھا، اس لیے وہ جبلِ نُور کے نام سے مشہور ہے۔ بائبل میں اس کا ترجمہ فاران آیا ہے۔ جبلِ نُور مکّہ معظمہ کے شمال مشرق میں منا و عرفات کی شاہراہ کی بائیں جانب چند فرلانگ کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس سفید سے نورانی پہاڑ پر چکّر کاٹ کر اوپر چڑھیں تو یہاں ترکی کی حکومت کے تعمیر کردہ پانی کے حوض ہیں، جن میں بارش کا پانی جمع ہو کر طویل مدّت تک کام آتا رہتا ہے۔ قُلّہ کوہ پر ایک غار ہے جس کا فرش مسطّح ہے اور چند قدرتی سیڑھیاں سی بن گئی ہیں۔ غار کا طول تقریباً چار گز، عرض پونے دو گز اور ارتفاع اتنا ہے کہ ایک دراز قد آدمی کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتا ہے۔ اس کا رُخ کعبے کی طرف ہے اور دھوپ اور بارش سے بھی بہت حد تک محفوظ ہے۔ آپؐ اس غار میں تحنث یا عبادت کیا کرتے تھے۔

(محمد حمیدُ اللہ : رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی، ص ۸۸)۔

(۵) سفر السعادت، شرح، ص ۳۵، بحوالہ رحمۃ للعالمین، ص ۴۷۔

(۶) چنانچہ اللہ تعالیٰ انسان سے فرماتا ہے : لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (الانبیآء ۲۱ : ۱۰) ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب اُتاری ہے جس میں تمہارا ذکر ہے۔ کیا تم نہیں سمجھتے؟ نیز دیکھیے الرّوم ۳۰ : ۸، القیامہ ۷۵ : ۱۴، فصلت ۴۱ : ۵۳۔

(۷) فاطر ۳۵ : ۱۵

(۸) رحمۃ للعالمین، ۱ : ۴۷

(۹) الحشر ۵۹ : ۲۱

(۱۰) الدّخان ۴۴ : ۱ تا ۳۔

(۱۱) القدر ۹۷ : ۱

(۱۲) معیار Norm، دیکھیے البقرہ ۲ : ۱۸۵

(۱۳) صحیح بخاری، باب بدء الوحی و کتاب التعبیر۔

(۱۴) العلق ۹۶ : ۱ تا ۵۔

(۱۵) بخاری و مُسلم در مشکوٰۃ، باب المبعث و بدء الوحی، ح ۵۔

(۱۶) ناموس یونانی اور توریت عبرانی لفظ ہے، اور دونوں کے لغوی معنیٰ "قانون" کے ہیں۔

(۱۷) مشکوٰۃ، باب المبعث و بدء الوحی، ح ۵۔

(۱۸) موضوع مذکور۔

(۱۹) ساعتِ صفر Zero hour

(۲۰) يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝ (المدثّر ۷۴ : ۱ تا ۵)۔ دیکھیے۔ صحیح بخاری، کتاب الوحی، مشکوۃ، باب المبعث و بدأ الوحی، ح ۶۔

(۲۱) آیت کا پورا حصّہ یہ ہے : اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ (المائدۃ ۵ : ۳) : آج ہم نے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں اور تمہارے لیے اسلام کو بحیثیت دین کے پسند کیا۔

(۲۲) ایک لحظہ کی غفلت بعض اوقات فتح کو شکست اور کامیابی کو ناکامی میں بدل دیتی ہے قمی نے اس حقیقت کو شعری زبان اور تلمیحی انداز میں اس طرح بیان کیا ہے :

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

(۲۳) Baptism

(۲۴) عبدنا : دیکھیے البقرہ ۲ : ۲۳، الانفال ۸ : ۴۱ و بمواضع کثیرہ۔

(۲۵) طہارت کور Purity blind ۔ جس طرح انسان رنگ کور ہوتا ہے، یعنی وہ رنگوں

میں امتیاز نہیں کرسکتا، اسی طرح وہ طہارت کو بھی ہوتا ہے یعنی اسے پاکیزگی کی اقدار کا پورا علم وشعور نہیں ہوتا، اور بعض حالات میں وہ پاکیزگی و پلیدی میں تمیز نہیں کرسکتا۔

(۲۶) اس موضوع پر مفصل بحث کے لیے دیکھیے مصنف کی کتاب "جمالیات، قرآنِ حکیم کی روشنی میں" ص ۱۶۶ ببعد۔

(۲۷) والضحیٰ ۹۳ : ا تا ۱۱۔

(۲۸) بخاری ومسلم، درمشکوٰۃ، باب المبعث و بدء الوحی، ح ۵۔

(۲۹) مسلم موضوع مذکور، ح ۶۔

باب : ۵

اور تحریکِ اسلام چلتی رہی

۱ اسلام کی انقلاب انگیز تحریکِ رحمۃ للعالمینی کا آغاز
۲ اوّلین مسلمان مرد اور عورتیں
۳ علانیہ دعوتِ اسلام کا آغاز
۴ شہید اوّل : حضرت حارث بن ابی ہالہ رضؓ
۵ عوام سے رابطہ (Mass contact)
۶ انسان شرک کیوں کرتا ہے؟
۷ آپؐ کے احباب خاص رضؓ
۸ تحریک اسلام کا نعرہ (Slogan)
۹ تصادم
۱۰ اہلِ تسلیم و رضا پر کفار کا جور وستم
۱۱ تحریک اسلام بند کرانے کے لیے رؤسائے مکہ کی کوششیں : دھمکیاں اور لالچ
۱۲ ہجرتِ حبشہ
۱۳ حضرت حمزہ رضؓ تحریک اسلام میں
۱۴ معروض تمنائے رسالتؐ ـ حضرت عمر فاروق رضؓ تحریکِ اسلام میں

بابؔ ۵

اسلام کی انقلاب انگیز تحریک رحمۃ للعالمینؐ کا آغاز

اوّلین مسلمان مرد اور عورتیں (۱۲ قبل ہجرت/ ۶۱۶ء)

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرتِ طیبّہ کا مطالعہ کرتے وقت یہ بات ہمیشہ ہمارے پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ آپؐ عظیم انسان ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے پیغمبرِ اعظم و آخر بھی تھے اس حیثیت میں آپؐ کے قول و فعل کو چونکہ ہر زمان و مکان کے انسان کے لیے حسین و مثالی نمونہ (اسوۂ حسنہ) بننا تھا، اس لیے آپؐ جو کہتے، وہی کرتے تھے اور وہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد و منشا کے مطابق ہوتا تھا۔[۱] نبوّتِ آخر کی اوّلین ذمّے داری دعوتِ اسلام تھی۔ دعوتِ اسلام کا مقصد بنی نوعِ انسان کو داعی بن کر امن و سلامتی کی دنیا میں بُلانا، ہادی و رہنما بن کر انھیں وہاں لانا اور مجاہد یا اللہ تعالیٰ کا سچّا انقلابی بن کر ان کے آنے کی راہ ہموار کرنا اور انھیں استحصالی قوتوں سے نجات دلانا ہے، جو ان کی راہ میں حائل ہوں۔ دعوت کے لیے تحریک ایک لازمی پیش شرط ہے۔ چنانچہ آپؐ نے دعوتِ اسلام کے لیے تحریک چلانے کا منصوبہ بنایا۔

یہ تحریک جسے مستقبل میں عالمگیر و ہمہ گیر بننا تھا، اس کا آغاز آپؐ نے اپنے گھر میں کیا۔ اس میں تین حکیمانہ و بصیرت افروز نکات مضمر تھے۔ ایک یہ کہ گھر معاشرے کی بنیاد ہوتا ہے، لہٰذا سب سے پہلے اس بنیاد کو فراہم کرنا ضروری تھا۔ دوسرا یہ کہ رفیقۂ حیات مرد کی خوبیوں اور کمزوریوں کی سب سے زیادہ واقف اور اس کی محرمِ راز ہوتی ہے، اس لیے اس کا اپنے شوہر کو سچّا سمجھ کر اس پر ایمان لانا اور اس کی انقلاب انگیز تحریک میں بطور ایک فعّال و سرگرم کارکن کے شامل ہونا، عقل و فکر سے کام لینے اور حق و صداقت کی آرزو رکھنے والوں کے لیے حجّت و دلیل کا کام دے سکتا تھا۔ اسی طرح گھر والوں

کا ایمان لانا دوسروں کے لیے تحریک و تشویق کا سامان مہیا کر سکتا تھا۔

اس میں تیسرا نکتہ یہ مضمر ہے کہ اس قسم کی انقلابی تحریک کی کامیابی کا راز رابطۂ عوام یا عوامی رابطے[۳۷] میں پنہاں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس تحریک کو عوامی بنایا جائے اور اس کا بہترین منہاج یہ ہے کہ اسے پہلے گھر گھر پھیلایا جائے اور پھر اسے عوام کی قوّت کے ساتھ بستی بستی، قریہ قریہ، شہر شہر پھیلایا جائے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے اس تحریک کا آغاز اپنے گھر سے کیا اور سب سے پہلے اپنی زوجۂ مطہّرہ حضرت خدیجہؓ کو تحریکِ اسلام میں شامل ہونے کی دعوت دی، اور چونکہ وہ جانتی تھیں کہ آپؐ صادق و امین تھے، اس لیے انھوں نے بغیر کسی تردّد یا حیل و حجّت کے اس دعوت کو بسر و چشم قبول کر لیا۔[۳۹]

ہمیں یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ کلمہ پڑھنے یا ایمان لانے کا مطلب دعوتِ اسلام کو قبول کرنا، یعنی اس بات کا عہد کرنا ہوتا ہے کہ "میں اس تحریک میں احکامِ الٰہی کے مطابق خلوصِ نیّت سے عملاً حصّہ لوں گا، آپؐ کے اسوۂ حسنہ پر عمل کروں گا اور اس کے لیے کسی ممکن قربانی سے دریغ نہیں کروں گا۔" اس عہد کی رُو سے مسلمان تحریکِ اسلام کا داعی، سرگرم کارکن اور جاں فروش مجاہد ہوتا ہے، نیز اس تحریک کی خاطر اپنے مال و جان، جذبات و تعصّبات، امیال و عواطف اور معتقدات و نظریات کو قربان کر دینا اس کا شعارِ زندگی ہوتا ہے۔ قرونِ اُولیٰ کے مسلمان ایسے ہی تھے۔ چنانچہ اُمّ المومنین حضرت خدیجہؓ نے کلمۂ طیّبہ پڑھ کر دعوتِ اسلام قبول کی تو انھوں نے ایک آزاد و سرگرم کارکن کی حیثیت سے تحریکِ اسلام میں بھرپور حصّہ لیا اور آپؐ کے اس مشن میں آپؐ کی مقدور بھر معاونت کی۔ آپؐ اور امّ المومنین حضرت خدیجہؓ کے طرزِ عمل سے یہ ازبس اہم و اساسی بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں عورت صاحبِ رائے، فاعل اور آزاد فرد کی حیثیت رکھتی ہے اور دین میں جبر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔[۴۰]

تحریک کی ابتدا ہوئی اور خوب ہوئی۔ اگلا قدم گھر کے دیگر افراد کو دعوتِ اسلام دینا تھا یہ افراد بھی آپؐ کی صداقت، حسنِ خُلق اور حسنِ عمل کے معترف و مدّاح تھے، لہٰذا انھوں نے بھی آپؐ کی دعوت کو بلا توقف برضا و رغبت قبول کر لیا۔ اس طرح تحریکِ رحمۃ للعالمینی کو ایک حصار میسّر آگیا، جو آپؐ کا گھر تھا۔ اگرچہ وہ بہت چھوٹا تھا، لیکن محکم و ناقابلِ تسخیر تھا۔ اسلام کے اس اوّلین حصار کے اوّلین محافظوں کے اسمائے گرامی یہ ہیں: (۱) حضرت خدیجہ طاہرہؓ، جو امّ المومنین تھیں۔ (۲) حضرت علیؓ، جو آپؐ کے چچیرے بھائی اور آپؐ کے زیرِ تربیت تھے

اور (۳) حضرت زیدؓ، جو آپؐ کے آزاد کردہ غُلام اور خادمِ خاص تھے۔[۴۱]

اِسلام کی اس انقلاب انگیز تحریکِ رحمۃ للعالمینی کو کامیاب بنانے کے لیے اوّلین ضرورت اس بات کی تھی کہ آپؐ جو اس کے بانی و علمبردار تھے، معاشی ذمّہ داریوں سے بے نیاز ہو کر ہمہ وقت اور ہمہ تن اس میں مشغول ہو جائیں۔ اس ضرورت کو جس نے پورا کیا اور جس نے آپؐ کو گھریلو ذمّہ داریوں سے آزاد و بے نیاز کر دیا، وہ اُمّ المومنین تھیں۔ انھوں نے اس تحریک کی دل کھول کر مالی معاونت کی، اسے حرکت و توانائی بخشی اور اس کے لیے ایک محکم و ناقابلِ تسخیر حصار مہیّا کیا۔ یہ ایسی گراں قیمت خدمتِ اسلام ہے، جس کی عظمت و اہمیت میں مبالغہ نہیں ہو سکتا۔

اُمُّ المؤمنینؓ کا گھر آپؐ کی تحریکِ اسلام کا پہلا مورچہ تھا جس کو مضبوط و ناقابلِ تسخیر بنانے کے بعد آپؐ نے اس تحریک کو عوامی بنانے کی خاطر عوامی رابطے کا آغاز کیا۔ عوامی رابطے کی اہمیّت کا اندازہ اس ایک بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے قائد کو عوام میں اپنی زندہ رُوح پھونکنے کا براہِ راست موقع مِلتا ہے، اور یہ زندہ رُوح جب عوام کے دلوں میں گھر کر لیتی ہے تو ان کی کایا پلٹ کر دیتی ہے، نیز انھیں بھی زندگی، توانائی اور حوصلہ عطا کرتی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انھیں اپنا ہمنوا بنا لیتی ہے۔ اس رازِ انقلاب سے آپؐ کو ربّ العالمین نے آگاہ کیا تھا، جس نے آپؐ کو رحمۃ للعالمین بنا کر اس دنیا میں بھیجا تھا۔

آپؐ کی سیرت کی اہم ترین خصوصیّت یہ ہے کہ آپؐ رحمۃ للعالمین ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ آپؐ تمام عالموں کے لیے رحمت ہیں۔ عالم کئی ہیں، مثلاً عالمِ جمادی، عالمِ نباتی، عالمِ حیوانی اور عالمِ انسانی۔ زمانے کے لحاظ سے بھی کئی عالم ہیں جیسے ماضی، حال اور مستقبل۔ وجود کے لحاظ سے ایک عالمِ ظاہری ہے اور دوسرا باطنی۔ اور زندگی کے اعتبار سے دو عالم ہیں: دُنیوی و اُخروی۔ آپؐ ان عالموں کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے اور ہماری تحقیق اور جستجو کا ایک بنیادی مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ آپؐ کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی سے ان عالموں کو کیسے اور کیا فائدہ پہنچا، یا بالفاظِ دیگر آپؐ ان عالموں کے لیے کیسے رحمت ثابت ہوئے؟

بہرحال اس تحریک کا آغاز ہُوا تو آپؐ نے گھر سے باہر سب سے پہلے اس خوش نصیب شخص کو دعوت دی، جو آپؐ کا بچپن کا دوست، ہمدم و ندیم اور ہمشرب و ہمراز تھا۔ وہ بھی آپؐ کے عقائد و نظریات، جذبات و احساسات، امیال و عواطف اور اقوال و افعال سے خوب واقف

تھا، اسی لیے دوسرے لوگوں سے زیادہ آپ ﷺ کے صدق و حق گوئی، عدل و احسان اور محبتِ انسانی کا معترف و مدّاح تھا۔ اِدھر آپ ﷺ نے اسے دعوت دی، اُدھر بیساختہ اس کی زبان سے نکلا: اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰه۔ یہ تصدیقِ نبوّت اسقدر اضطراری و بیساختہ[۶] تھی کہ دلِ نبوّت مسرّتِ بے پایاں سے جگمگا اُٹھا اور بصیرتِ نبوّت پر اسی لمحے اس مُصدِّق کا جسے ابوبکرؓ کہتے تھے، صِدقِ دل منکشف ہو گیا۔ قدرت نے اِس تصدیقِ بیساختہ کا یہ انعام دیا کہ اس کو "صِدّیق" کے لقب سے ملقّب کر دیا اور تاریخ نے اس لقب اور نام (ابوبکر صدّیقؓ) کو اپنی لَوحِ محفوظ میں مرقوم کر کے زندۂ جاوید بنا دیا۔[۷]

حضرت ابوبکر صدّیقؓ کی شخصیت میں توازن اور وقار تھا۔ ان کی عظمتِ کردار کے سب مُعترف تھے۔ حُسنِ معاملت، حسنِ خُلق اور صِدق و تقویٰ کے باعث معاشرے میں انھیں عزّت و احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ استحصالی معاشروں میں چونکہ مال و دولت کے ذریعے حیثیت متعیّن ہوتی ہے، لہٰذا اس اعتبار سے بھی ان کا شمار معتبر و محترم اور صاحبِ رائے شخصیتوں میں ہوتا تھا اور وہ لوگ ان کے مشوروں سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ وہ اثر و رسُوخ رکھتے تھے، ان کے پاس مال و دولت بھی تھا اور اس تحریک کو کامیاب بنانے کا داعیہ بھی۔ چنانچہ ان کے مسلمان ہونے سے اس تحریک کو جو فائدہ پہنچا، اس میں مبالغہ نہیں ہو سکتا۔

"وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایمان ہے" کا مقولہ حضرت ابوبکر صدّیقؓ پر صادق آتا ہے۔ جس طرح وہ بزم میں آپ ﷺ کے دوست و رفیق اور ہمدم و ہمراز تھے، اسی طرح رزم اور اسلام کی انقلابی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کے بھی دوست و رفیق ثابت ہوئے۔ وہ اس میں شامل ہوتے ہی اس کے اوّلین سرگرم و جاں نثار کارکن و نقیب بن گئے اور انھوں نے اپنے مال و دولت سے تحریکِ اسلام کی اس قدر معاونت کی کہ خود زبانِ رسالت مآب ﷺ اس کی معترف ہے۔[۸]

حسن و حق کو چونکہ صدق سے اِعتبار ملتا ہے، اس لیے صدّیق اکبرؓ کی انقلابی و تبلیغی سرگرمیاں فوراً رنگ لائیں اور چند ایسی شخصیتیں جنھوں نے اکابر صحابہؓ کا مرتبہ حاصل کرنا تھا، تحریکِ اسلام میں شامل ہو گئیں۔ ان سابقینِ اوّلین میں حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ (فاتح ایران)، حضرت ابوذرؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت عمارؓ، حضرت حباب بن الارثؓ، حضرت ارقمؓ، حضرت سعید بن زیدؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عثمان بن مظعونؓ، حضرت عبیدہؓ، حضرت صہیب رومیؓ اور حضرت بلالؓ زیادہ مشہور ہیں۔[۹]

حق کو آرزوئے حق کے بغیر قبول نہیں کیا جا سکتا تھا، لہٰذا یہ سب جو ایمان لائے، مُتّقی اور متلاشیانِ حق تھے۔ انھوں نے حق پایا تو مقصودِ زندگی کو پا لیا۔ انھوں نے منزلِ مقصود کا جادۂ مستقیم دیکھا تو والہانہ شوق کے ساتھ اس پر گامزن ہو گئے، لیکن ایمان کے سوز سے ان کے دل زندہ و بیدار ہو گئے تھے اور اس کے نُور سے ان میں محبّت کی شمع روشن ہو چکی تھی، اس لیے انھیں تنہا اِس راہِ راست پر چلنا گوارا نہ ہوا تھا، ان میں اپنی قوم کو بھی اپنے ہمراہ لے جانے کی آرزو پیدا ہوئی، جو شرک و بت پرستی اور فسق و فجور کی تاریک و خوف انگیز وادیوں میں سرگرداں تھی۔ ان کے دل اپنے اِللہ اور ربّ کی محبّت کے ساتھ اس کی مخلوقات کی محبّت سے بھی معمور ہو چکے تھے۔ یہ حضرات مسلمان ہوتے ہی اس انقلابی۔ دینی تحریک کے سرگرم کارکن اور داعی بن گئے۔ اصل یہ ہے کہ مسلمان کی شان ہی یہ ہے کہ وہ اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کا سرگرم کارکن اور مبلّغ ہوتا ہے۔ بہرحال ان سب فعّال و پُرجوش شخصیتوں کی خفیہ سرگرمیوں کی بدولت کچھ اور لوگ جو اس تحریک میں شامل ہوئے، ان میں زیادہ ممتاز یہ ہیں: حضرت ابوعبیدہؓ (عامر بن عبداللہ) بن الجراحؓ، جن کا لقب بعد میں "امین الامتہ" ہوا، حضرت عبداللہ بن بلالؓ، حضرت عامر بن فہیرہ ازدیؓ، حضرت ابوحذیفہؓ بن عتبہ، حضرت سائب بن یزیدؓ، حضرت عثمان بن مظعونؓ، حضرت ارقمؓ، حضرت عمارؓ، حضرت حباب بن الارثؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت سعید بن زیدؓ۔[۱۰]

اسلام صحیح معنوں میں ایک عالمگیر انسانی تحریک ہے، لہٰذا اس میں عورتوں کو شامل کرنا ناگزیر تھا، کیونکہ ان کے بغیر اسلامی معاشرے کی تشکیل ممکن نہ تھی۔ دلیل یہ ہے کہ معاشرے کی تشکیل گھر کرتے ہیں اور گھر کی تشکیل عورت کرتی ہے۔ چنانچہ اس تحریک کو عورتوں میں بھی پھیلانے کی کوشش کی گئی جس کے نتیجے میں امّ الفضلؓ (آپ ﷺ کے چچا حضرت عباس کی بیوی)، اسماء بنت عمیسؓ، اسماءؓ بنت ابوبکر صدّیقؓ، اور فاطمہؓ (حضرت عُمرِ فاروقؓ کی ہمشیرہ) اسلام قبول کر کے اس کی تحریک میں شامل ہو گئیں۔[۱۱]

اسلام کی تحریکِ رحمۃ اللعالمینی کا مقصد چونکہ ایک ہمہ گیر و عالمگیر دینی انقلاب لانا تھا، اس لیے یہ مذہبی پیشواؤں، سرمایہ داروں، جاگیرداروں، سرداروں، حاکموں اور شہنشاہوں کے لیے ایک چیلنج تھی اور ان تمام استحصالی قوتوں کا اس کا مخالف و دشمن ہو جانا ایک فطری امر تھا۔ چونکہ اس مرحلے پر ان قوتوں کا مقابلہ ممکن نہ تھا، اس لیے آپ ﷺ کی بصیرت کا فیصلہ یہ ہوا کہ اسے رازدارانہ طریقے سے جاری رکھا جائے۔ چنانچہ یہ تحریک عوامی رابطے کے منہاج پر خفیہ طریقے

سے جاری رہی۔ ان مسلمانوں کا رابطہ دو طرفہ تھا۔ ایک طرف ان کا رابطہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تھا جسے وہ اپنا الٰہ (معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود) اور ربّ (پروردگار و آقا اور حاکم و بادشاہ) سمجھتے اور پورے یقین کے ساتھ سمجھتے تھے، اور دوسری جانب عوام کے ساتھ، جنھیں وہ اپنے ربّ کے حسین تخلیقی شاہکار و مربوب اور اپنے بھائی سمجھ کر محبت کرنے لگے تھے۔ ان کی والہانہ سرگرمیوں کی غایتِ حقیقی یہ تھی کہ وہ بنی نوعِ انسان کو مردہ و زندہ بتوں، فرعونوں، ہامانوں اور قارونوں کے چنگل سے رہائی دلا کر انھیں ان کے حقیقی الٰہ اور ربّ کے ساتھ ملا دیں، اور ان کے ساتھ مل کر ان کے لیے ایک ایسا معاشرہ قائم کریں جس میں فقط اللہ تعالیٰ ہی سب کا الٰہ اور ربّ ہو، اور تمام انسانوں کا تعلق براہِ راست اس سے ہو اور وہ اسی کے حکم کے مکلّف و پابند ہوں تاکہ وہ ایک پُرامن معاشرے میں مطمئن دل کے ساتھ زندگی گزاریں اور مقصودِ زندگی حاصل کر سکیں۔

تحریکِ رحمۃ للعالمینی کے بانی پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حسین و سحر کی شخصیت جو ایمان کی جوہری توانائی اور سوزِ محبّتِ انسانی سے معمور و منوّر تھی، اس کے اثر و نفوذ سے رفقائے تحریک (صحابہؓ) کے دل میں بے مثال جوش و ولولہ، ان کی شخصیت میں جاذبیت، عزم میں پختگی، ہمّت میں جوانی اور دعوت میں اثر انگیزی پیدا ہو گئی تھی۔ معاشرے میں رہتے ہوئے اس تحریکِ انقلاب کو راز دارانہ طریقے سے چلاتے چلاتے ان کی اپنی شخصیت لوگوں میں پُراسرار ہوتی چلی گئی۔ یہ سب صحابہؓ آپؐ سے مشاورت، ہدایات[12] حاصل کرنے اور باجماعت نماز ادا کرنے کے لیے اکثر مجلس کرتے رہتے تھے۔ نماز باجماعت بھی اس تحریک کا ایک جزوِ لاینفک تھی۔ یہ دوگانہ رابطے کا ذریعہ تھی، ایک تو اللہ تعالیٰ سے اور دوسرے رفقائے تحریک سے۔ نماز اگرچہ بظاہر ایک غیر سیاسی نوعیت کی عبادت تھی، لیکن یہ کفارِ مکّہ کے لیے مذہبی بدعت تھی اور اس سے بدک جانا لازمی تھا، اس لیے مسلمان اس فریضے کو بھی خفیہ طریقے سے سرانجام دیتے تھے، کبھی کسی گھر کی تنگنائے میں اور کبھی پہاڑ کی کسی سنسان گھاٹی میں۔[13]

صاحبِ حسن و سرور[14] صلّی اللہ علیہ وسلّم فرمایا کرتے تھے : نماز کو میری آنکھوں کی ٹھنڈک بنایا گیا ہے۔[15] بعثت سے پہلے بچپن، لڑکپن، جوانی، غرضیکہ ہر دور میں آپؐ نماز پڑھتے تھے، اگرچہ نماز کی صورت اور تھی۔ عمر کے ان ادوار میں آپؐ کی نماز کی صورت یہ ہوتی تھی کہ آپؐ اپنے الٰہ یا "دوست" کے حضور عجز و نیاز، آہ و فغاں، گریہ و زاری کرتے اور "اس" کے حوالے سے حیاتِ انسانی

کے آغاز و انجام پر غور و فکر کرتے رہتے تھے۔ اصل یہ ہے کہ آپؐ کی نماز تلاشِ حق اور آرزوئے "دوست" میں "تفکر و اعتبار" تھا۔[16] اس نماز سے دل کو قرار آتا تھا۔ پھر جب آپؐ مبعوث ہوئے تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آپؐ کو موجودہ نماز سکھائی، جو جذبۂ عبودیت کے اظہار کی احسن و اکمل صورت اور "دوست" کے قرب و دید کا بہترین ذریعہ ہے۔[17] بعثت کے بعد آپؐ نماز پڑھنے کی خاطر دشمنوں کی نظروں سے دُور کسی پہاڑ کی گھاٹی میں چلے جاتے۔ شروع میں حضرت علیؓ اور بعد میں دوسرے مسلمان بھی آپؐ کے ساتھ نماز پڑھتے تھے۔ ایک روز حضرت ابوطالب نے آپؐ اور حضرت علیؓ کو نماز پڑھتے دیکھ لیا۔ اس طریقۂ عبادت سے ان کو بڑی حیرت ہوئی اور آپؐ سے پوچھا : اے میرے بھتیجے! یہ کون سا دین ہے جو تم نے اختیار کیا ہے؟ آپؐ نے جواب میں فرمایا :

"چچا جان! یہ اللہ، اس کے فرشتوں، اس کے رسولوں اور ہمارے باپ ابراہیمؑ کا دین ہے۔ (یا جیسا کہ آپؐ نے فرمایا) اللہ نے مجھے اس دین کا رسول بنا کر لوگوں کی طرف بھیجا ہے چچا جان! جن لوگوں کو میں نے نصیحت کی اور ہدایت کی طرف بلایا ہے، ان سب سے زیادہ آپؐ اس کے مستحق ہیں۔ ان سب میں آپؐ اس دعوت کو قبول کرنے اور اس کے لیے میری امداد کرنے میں بھی آپؐ سب سے زیادہ سزاوار ہیں۔"

یہ سُن کر ابوطالبؓ نے جواب دیا : "اے میرے بھتیجے! میں آباؤ اجداد کے دین اور اس طریقے کو جن پر وہ تھے، چھوڑ نہیں سکتا۔ لیکن اللہ کی قسم! جب تک میں زندہ ہوں، تم پر کوئی ایسی بات نہیں آئے گی، جسے تم ناپسند کرو۔"

ایک اور روایت میں ہے کہ یہ سوال حضرت ابوطالب نے اپنے بیٹے حضرت علیؓ سے پوچھا تھا، جس کے جواب میں انھوں نے کہا تھا : ابّا جان! میں اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لایا ہوں اور جو باتیں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمائی ہیں، میں نے ان کی تصدیق کی ہے اور آپؐ کو ان میں سچّا پایا ہے۔ میں نے اللہ کے لیے آپؐ کے ساتھ نمازیں پڑھی ہیں اور آپؐ کی پیروی کی ہے۔

یہ سُن کر حضرت ابوطالب نے کہا : علیؓ! اس (یعنی رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے تمھیں خیر کی دعوت دی ہے۔ اس پر قائم رہو۔[18]

علانیہ دعوتِ اسلام کا آغاز (۹ قبل ہجرت/۶۱۴ء)

آپؐ تحریکِ اسلام تین برس تک خفیہ طور سے چلاتے رہے۔ اس عرصے میں اس تحریک کا مرکز حضرت ارقم کا گھر تھا، جو شہر سے دور کوہِ صفا پر واقع تھا، اور اس قسم کی زیرِ زمین سرگرمیوں کے لیے موزوں تھا۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی انقلاب پسند جماعت کے ارکان، جو تقریباً چالیس کے قریب تھے، جمع ہوتے،[19] اپنی اپنی سرگرمیوں کی روداد سناتے، دشمنوں کے منصوبوں اور پراپیگنڈے کو غیر مؤثر بنانے کے لیے مشورے ہوتے، لائحہ عمل بنتا اور قائدِ تحریکِ اسلام سے ہدایات لیتے۔ نماز کا وقت آتا تو یہیں نمازِ باجماعت بھی ادا ہوتی۔ پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم ان کے دلوں میں زندگی و نور اور حسن و سرور پیدا کرنے کی خاطر انھیں قرآن مجید سناتے اور ان کے معانی و رموز سے آشنا کرتے۔ باتوں باتوں میں انھیں حکمت سکھاتے، ان کے حسّی و قلبی قویٰ کی تربیت کرتے اور اپنے نفسِ پیغمبری سے ان کا تزکیہ کرتے اور ان کے دلوں میں حوصلہ اور حوصلے میں توانائی پیدا کرتے۔ دشمنانِ اسلام کے ستائے ہوئے یہ مجاہد آپؐ کی صحبت میں بیٹھتے تو ان کے زخم مندمل ہو جاتے۔ ان کے دلوں میں نیا ولولہ اور جوش پیدا ہو جاتا، مطلعِ دل سے مایوسی کے بادل چھٹ جاتے اور امید کا آفتاب طلوع ہوتا اور وہ ایک نئے عزم کے ساتھ اپنی انقلابی سرگرمیوں میں لگ جاتے۔

انقلاب کے سوتے شروع میں زیرِ زمین پھوٹتے ہیں اور معاشرے کی بنیادوں کو کھوکھلا کرتے رہتے ہیں، پھر دفعتاً ظاہر ہوتے ہیں اور معاشرے کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکتے ہیں۔ آپؐ کو اس حقیقت کا ایقان و عرفان تھا، اس لیے آپؐ اس تحریک کو اُس وقت تک زیرِ زمین چلاتے رہے جب تک وہ اپنا کام نہ کر چکی اور ربِّ رحیم سے اسے کھلّم کھلا چلانے کا حکم نہ آ گیا۔ بہرحال اسلام کی یہ انقلابی تحریک اس نہج پر جاری تھی کہ آپؐ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم Directive ملا: اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو (قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل سے) متنبّہ کر دو۔[20]

اس فرمانِ الٰہی کا مطلب یہ تھا کہ آپؐ اس خفیہ تحریک کو اپنے قریبی رشتہ داروں پر ظاہر کر دیں اور انھیں بطریقِ تنذیر اس تحریک میں شامل ہونے کی دعوت دیں۔ آپؐ نے اس پر اس طرح عمل کیا کہ اپنے خاندان بنو ہاشم کے افراد کو اپنے ہاں کھانے کی دعوت دی۔

چالیس کے قریب افراد جمع ہوئے۔ ضیافت کے بعد ابولہب کے طنز و تمسخر اور لن ترانیوں کے باعث محفل کا رنگ ایسا ہو گیا کہ حکمتِ نبویؐ نے انھیں دعوتِ اسلام دینا مصلحت کے خلاف سمجھا۔ دوسری شب پھر ان کے لیے ضیافت کا انتظام کیا گیا۔ جب وہ کھانا کھا چکے تو آپؐ ان سے مخاطب ہوئے: "حاضرین! میں آپ سب کے لیے وہ چیز لے کر آیا ہوں جو دین اور دنیا دونوں کی کفایت کرتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ سارے عرب میں کوئی شخص بھی اپنی قوم کے لیے اس سے احسن و افضل کوئی چیز لایا ہو۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ میں آپ سب کو اس کی دعوت دوں۔ بتاؤ، یہ بارِ گراں اٹھانے میں کون میرا ساتھ دے گا؟"

یہ سن کر محفل سکتے میں آ گئی۔ اس سکوت کو حضرت علیؓ نے توڑا، جو اس تحریک کے سب سے کمسن رکن تھے، لیکن جرأت و ہمّت میں کسی سے کم نہ تھے۔ وہ اُٹھے اور کہا "یا رسول اللہ اگرچہ مجھے آشوبِ چشم ہے، اگرچہ میری ٹانگیں پتلی ہیں اور میں سب سے کمسن ہوں، پھر بھی میں آپ کا ساتھ دوں گا۔"

دینِ نو کی دعوت دینے والا نہ تو کسی قبیلے کا سردار تھا، نہ اس کے پاس حکومت، قوت، دولت یا منصب و مرتبہ تھا۔ اس کی نہ تو نرینہ اولاد تھی اور نہ اس کے خیل و قبیلہ میں سے اس کے کوئی معاون و مددگار ہی تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے خانوادے کے اکابرین میں سے کسی نے اس کی تائید بھی نہیں کی تھی، لہٰذا جب انھوں نے ایک لڑکے کی تائید کے الفاظ سنے تو اکابرِ محفل کھل کھلا کر ہنس پڑے اور بھری محفل میں آپؐ پر طنز و استہزا کے تیروں کی وہ بارش ہوئی کہ الامان و الحفیظ۔[21] سچ تو یہ ہے کہ آپؐ کا دل مہبطِ وحی و تنزیل اور خود شناس و خدا آگاہ نہ ہوتا تو ان تیروں کی جراحت کا حریف نہ ہو سکتا۔

شاید عزیزوں کا یہ سلوک دیکھ دیکھ کر عربوں میں یہ مقولہ مشہور ہو گیا تھا کہ اَلْاَقَارِبُ کَالْعَقَارِبِ یعنی قریبی رشتے دار بچھو ہوتے ہیں۔

رابطۂ اقربا کی یہ کوشش بظاہر ناکام رہی، لیکن حقیقت میں یہ ناکام نہ تھی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ایک تو ایسی ناکامیاں اس قسم کی انقلابی تحریک کے لوازمات میں سے ہوتی ہیں۔ دوسرے وہ اس کے علمبرداروں کے رہوارِ شوق کے لیے مہمیز و تازیانہ کا کام دیتی ہیں اور اس "ناکامی" نے بھی یہی کام کیا۔

بہرحال جن دلوں میں چراغِ ایمان روشن ہو، ان میں یاس و قنوطیت کے چھلاوے راہ

نہیں پاسکتے۔ آپؐ اور آپؐ کے رفقائے تحریک (صحابہ کرامؓ) اپنی خفیہ انقلابی سرگرمیوں میں بدستور مشغول رہے۔ ایک روز ربِّ مدبّر الامور کی طرف سے آپؐ کو علی الاعلان دعوتِ اسلام دینے کا حکم ملا کہ تم کو جو حکم دیا گیا ہے، واشگاف کہہ دو اور مشرکوں کی کچھ پروا نہ کرو۔[۲۲]

امتثالِ امر میں آپؐ کوہِ صفا کے اوپر تشریف لے گئے اور قریش کے قبیلوں کو نام لے لے کر بلانے لگے۔ لوگ جمع ہوگئے تو آپؐ نے ان کو مخاطب کرکے فرمایا: اگر میں تم سے کہوں کہ وادی میں ایک لشکر اُترا ہے جو تم پر حملہ کرنے والا ہے، تو کیا تم میری بات سچ مانو گے؟ انھوں نے جواب دیا: نعم ماجربنا علیك الا صدقا (ہاں! تم ہمیشہ ہمارے تجربے میں سچے ثابت ہوئے ہو)۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی طرف سے میں نذیر یعنی تمھیں متنبّہ کرنے والا ہوں کہ تمھارے آگے سخت عذاب موجود ہے۔ یہ سن کر ابولہب نے کہا: تبّاً لك سائر الیوم الھٰذا جمعتنا (تیرے لیے سارے دن موجبِ ہلاکت و بربادی ہوں۔ کیا تُو نے ہمیں اسی لیے جمع کیا تھا؟[۲۳])۔ اس پر مجمع منتشر ہوگیا۔[۲۴]

اہلِ یقین ایسی ناکامیوں سے مایوس نہیں ہوتے۔ جن دلوں میں انقلاب کی سچی آرزو ہو، ان کے لیے ایسی ہر ناکامی ایک نئی کوشش کی تحریک کرتی ہے۔ آپؐ تو اہلِ رحمت بھی تھے۔ آپؐ کا عزم تو ناقابلِ شکست تھا۔ چنانچہ ایک روز آپؐ نے پھر اپنے کنبے کے لوگوں کو اکٹھا کیا اور فرمایا:

اے کعب بن لوی کی اولاد! اپنے آپ کو النّار (آگ) سے بچاؤ! اے مرّہ بن کعب کی اولاد! اپنے آپ کو النّار سے بچاؤ! اے عبدشمس کی اولاد! اپنے آپ کو النّار سے بچاؤ! اے عبدمناف کی اولاد! اپنے آپ کو النّار سے بچاؤ! اے ہاشم کی اولاد! اپنے آپ کو النّار سے بچاؤ! اے عبدالمطلب کی اولاد! اپنے آپ کو النّار سے بچاؤ! اے فاطمہ! اپنی جان کو النّار سے بچاؤ۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے تمھارے متعلق کوئی اختیار نہیں ہے (یعنی میں کسی کو عذابِ الٰہی سے نہیں بچا سکتا)۔ البتّہ مجھ پر تمھاری قرابت داری کا حق ہے اور میں قرابت داری کا حق ادا کرتا ہوں (مسلم)۔ بخاری و مسلم کی ایک اور روایت اس طرح ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

اے قریش کی جماعت! اپنی جانوں کو خرید لو۔ میں اللہ تعالیٰ کے ہاں تمھارے لیے کسی چیز کی کفایت نہیں کرسکتا (یعنی تمھیں عذاب سے نہیں بچا سکتا)۔ اے عبدمناف کی اولاد! میں اللہ تعالیٰ کے ہاں تمھارے لیے کسی چیز کی کفایت نہیں کرسکتا۔ اے عباس

بن عبدالمطلب! میں اللہ تعالیٰ کے ہاں تمھارے لیے کسی چیز کی کفایت نہیں کرسکتا۔ اے صفیّہ (آپؐ کی پھوپھی)! میں اللہ تعالیٰ کے ہاں تمھارے لیے کسی چیز کی کفایت نہیں کرسکتا اور اے محمدؐ کی بیٹی فاطمہ! میرے مال میں سے جو کچھ تُو چاہے مانگ کر لے لے، لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں میں تیرے لیے کسی چیز کی کفایت نہیں کرسکتا۔[۲۵]

آپؐ کی یہ دعوت جو تنذیری نوعیّت کی تھی، بڑی خیال انگیز و بصیرت افروز تھی۔ قریش میں شفاعت کا عقیدہ ان کے دین کی اساس بن چکا تھا، اور آپؐ نے اس دعوت میں اس بنیاد پر ضربِ کاری لگائی اور اس کی جگہ قدرت کے قانونِ مکافات کو پیش کیا اور ان پر یہ حقیقت واضح کردی کہ اس امر کے باوصف کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے سچے نبی ہیں، انھیں اس قانونِ قدرت سے نہیں بچا سکتے جو حیاتِ انسانی کے گوشے گوشے میں جاری و ساری ہے۔ اس قانونِ قدرت سے رسول اللہؐ کے عزیز و اقارب حتّیٰ کہ آپؐ کی اولاد کو بھی مفر نہیں۔ نیز اس قانون کو سفارش و شفاعت کے ذریعے یا صلۂ رحمی کے وسیلے سے غیر مؤثّر نہیں بنایا جاسکتا۔ ہر شخص اپنے اعمال کا ذمّے دار ہے اور اس کے نتائج سے اسے مفر نہیں۔

اس دعوت میں دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ شرک و بُت پرستی اور جرم و گناہ کی ہر شکل ظلم ہے، جس سے دل میں آگ لگتی ہے جو اسے خوف و حزن کی اذیتوں میں مبتلا کر دیتی ہے، چنانچہ یہی آتشِ دل آخرت میں معروضی شکل اختیار کرے گی، جیسے قرآنِ مجید نے النّار، جہنّم وغیرہ سے تعبیر کیا ہے۔

آپؐ کی باتیں مختصر ہوتیں لیکن ہر بات میں کوئی نہ کوئی عبرت آموز و حکیمانہ نکتہ ہوتا تھا۔ ایجاز بلاغت آپؐ کے کلام کا بنیادی وصف تھا۔ آپؐ جو کچھ فرماتے، دل کی گہرائیوں میں اُتر جاتا اور انسان کو سوچنے پر مجبور کر دیتا تھا، لیکن آپؐ کی دعوت کو تسلیم کرنے کا مطلب چونکہ اپنے معبودوں اور معتقدات و نظریات اور رسم و رواج، اور مناسکِ عبادت سے دستبردار ہوجانا تھا، اس لیے قریش اس کی حقانیّت و صداقت کو جانتے بوجھتے اسے قبول کرنے سے ڈرتے تھے۔

ہمیں یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم سراپا صدق تھے، لہٰذا سچ کے سوا آپؐ کی زبانِ مبارک سے کچھ اور نکل ہی نہیں سکتا تھا اور نہ کبھی نکلا۔ چنانچہ آپؐ نے متذکّرۂ بالا خطبے میں جو بات منکرینِ حق سے فرمائی تھی، وہی بات آپؐ نے تحریکِ اسلام کی کامیابی کے بعد اہلِ حق سے فرمائی:

"اللہ کی قسم! میں نہیں جانتا۔ اللہ کی قسم! میں نہیں جانتا، اگرچہ میں اللہ تعالیٰ کا رسُول ہوں

کہ میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا اور تمھارے ساتھ کیا؟[۲۶]

اسلام کی انقلابی تحریکِ رحمۃ للعالمینی گھر اور خانوادے سے نکل کر عوام میں آئی تو اسے آتے ہی جان کی قربانی دینا پڑی۔ اصل یہ ہے کہ انقلابی تحریکیں خون کی گرمی ہی سے زندہ رہتی اور زور و حرکت حاصل کرتی ہیں۔

شہیدِ اوّل :

آپؐ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے اور آپؐ کا مشن اس کے حکم کو اس کے بندوں تک پہنچانا تھا، لہٰذا آپؐ نے عام دعوت کا آغاز بیت اللہ ہی سے کرنے کا فیصلہ کیا۔ حرمِ کعبہ تھا تو خدا کا گھر، مگر وہ بُت خانہ بنا ہوا تھا۔ اس کے متولی یا مجاور قریشِ مکہ تھے جو آلِ اللہ کہلاتے تھے۔ ان کی معاشی خوشحالی سیاسی قوت و سیادت اور عزت و شرف سب کچھ بیت اللہ کا مرہون تھا اور بیت اللہ اس وقت تک ان کے لیے وسیلۂ دولت رہ سکتا تھا جب تک ان میں بُت رہتے اور بُتوں کے پجاری دُور دراز مقامات سے آکر منّتیں مانتے، چڑھاوے چڑھاتے اور نذرانے پیش کرتے۔ لہٰذا وہ بیت اللہ میں شرک و بُت پرستی کی بات کے سوا کوئی اور بات سُن ہی نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ جب آپؐ نے تنِ تنہا حرمِ کعبہ میں لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہ کا نعرہ بلند کیا تو کعبے کے مجاوروں اور پجاریوں میں تہلکہ مچ گیا۔ یہ نعرہ ان کے دلوں پر بجلی بن کر گرا۔ وہ نہ تو اس کے حریف ہو سکتے تھے اور نہ ہوئے۔ ہر طرف سے ایک غلغلہ بلند ہوا اور وہ زخم خوردہ درندوں کی طرح آپؐ پر ٹوٹ پڑے۔ اس کی خبر تحریکِ اسلام کے شہیدِ اوّل حضرت حارث بن ابی ہالہؓ کو ملی تو وہ دوڑتے ہوئے آئے اور آپؐ کو بچانے کے لیے آگے بڑھے ہی تھے کہ غصے میں بپھرے ہوئے پجاریوں کی تلواروں کے ہدف بن گئے اور ان کے خونِ پاک سے حرمِ پاک کی زمین رنگین و مزیّن ہوگئی۔[۲۷]

یہ خون جو بارش کے پہلے قطرے کی طرح حرمِ کعبہ میں گرا، شہیدِ اوّل کو زندۂ جاوید اور داستانِ تحریکِ اسلام کو ہمیشہ کے لیے رنگین کر گیا۔

اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کا یہ پہلا تصادُم تھا اور اس میں اسے ایک فدائی تحریک کی جان کی قربانی دینا پڑی۔ یہ خون ان لوگوں نے کیا جن کی دنیا اور آخرت سنوارنے کے لیے یہ تحریک چلائی گئی تھی اور اس تحریک کو ربّ العالمین کے حکم سے اس کے پیغمبر رحمۃ للعالمینؐ نے چلایا تھا۔ مشرک خوش تھے کہ انھوں نے آغاز ہی میں داعیِ انقلاب کی زبان بند کر دی اور اس کے رفیق و حمایتی کو حرمِ پاک ہی کے اندر شہید کر دیا۔ ان کا یہ خیالِ خام تھا کہ اب نہ تو آپؐ اور نہ کوئی اور مسلمان دعوتِ اسلام دینے یا کلمۂ توحید بلند کرنے کی جرأت کرے گا۔ کفر و شرک کے اندھیروں میں بھٹکنے والوں کو کیا

خبر تھی کہ جن اہلِ ایمان کے دلوں میں "آرزوئے دوست" زندہ و بیدار اور عشقِ انسانیت کا چراغ فروزاں ہو جائے، انھیں اپنی جانوں کا خوف نہیں ہوتا۔ پھر وہ مسلمان تو خونِ شہید کی بہائے بے حساب سے آشنا تھے۔ انھیں اس حقیقت کا حق الیقین تھا کہ شہید کو اس کے لہُو کے بدلے حسن تاب کی حیاتِ محض[۲۸] ملتی ہے جو ہر لحظہ ایک نئی شان اختیار کرتی رہتی ہے۔ حسن تاب کیا ہے؟ وہ جانتے تھے کہ یہ حسنِ زمان و مکان ہے، وہ کیف و سرور کا ایسا عالم ہے جو ہر آن ایک نیا رنگ، نیا انداز اور نیا منظر اختیار کرتا رہتا ہے۔ اس میں ہر وہ نعمت ہے اور بے حساب و لاتتناہی ہے جو انسان تصور کر سکتا ہے اور وہ نعمتیں بھی ہیں جو اس دنیا میں اس کے تصور سے ورا ہیں۔ وہاں اہلِ حسن و سرور کی رفاقت ہوگی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہاں حسنِ دوستؐ کے نظّارے جنّتِ نگاہ اور اس کا حسنِ تکلّم فردوسِ گوش بنتا رہے گا۔[۲۹] مسلمانوں کو چونکہ اس حقیقت پر ایمان تھا اور یہ ایمان ان کی زندگی میں جذب ہو چکا تھا، اس لیے شہادت کی تمنّا ان کے دلوں میں مچلتی رہتی تھی۔

تحریکِ انقلاب چونکہ اپنے پہلے مرحلے میں معاشرے کی بنیادوں کو منہدم کرتی ہے اور پھر نئی بنیادوں پر اس کی تعمیرِ نو کرتی ہے، اس لیے جمود و تعطّل کی شکار قوم ہر انقلابی تحریک کو اپنے لیے ہلاکت و بربادی کا پیام و پیش خیمہ سمجھ کر اس کی مخالفت کرتی ہے اور اس میں استحصالی طبقے بالخصوص متحد ہو کر اس تحریک کو کچلنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتے۔ آپؐ اس حقیقت سے آشنا تھے، لہٰذا آپؐ نے اپنے لیے تو خفیہ اور علانیہ دونوں طرح سے، لیکن رفقائے تحریک کے لیے بدستور خفیہ طریقے سے عوام سے رابطہ قائم کرنے اور انھیں اپنی تحریک میں شامل ہونے کی دعوت دینے کا فیصلہ کیا۔

آپؐ کے رفقائے تحریک بڑی دلکش اور پُراسرار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ چُھپکے چُھپکے لوگوں سے ملتے اور انھیں بالواسطہ اور بلاواسطہ طریقے سے اسلام کی انقلاب انگیز تحریکِ رحمۃ للعالمینی کے اغراض و مقاصد سے آگاہ کرتے اور اپنے حُسنِ اخلاق، حُسنِ نیّت اور اپنے جذبۂ محبتِ انسانیت سے انھیں متأثر کرتے اور انھیں اپنی تحریک سے مانوس کرنے اور اپنے قریب تر لانے کی کوششوں میں دن رات مصروف رہتے۔ اس تحریک کا ایک بنیادی مقصد چونکہ لوگوں کو ان کے معبودوں، بتوں اور ان کے مجاوروں نیز تمام استحصالی طبقوں سے نجات دلانا تھا، اس لیے مسلمانوں کی انقلابی سرگرمیوں کی جولانگاہ غریب و مظلوم طبقہ تھا۔ لیکن حضرت صدیقِ اکبرؓ کی مساعیِ جمیلہ سے کچھ مرفہ الحال شخصیتیں بھی تحریکِ اسلام میں شامل ہو گئی تھیں، اس لیے ان

سب کوششوں سے تحریکِ اسلام آہستہ آہستہ اور چپکے چپکے خوشحال گھرانوں میں بھی پہنچ رہی تھی۔

تحریکِ اسلام کے قائدِ اوّل جذبۂ رحمۃ للعالمینی سے سرشار مکّے کی ایک ایک گلی، کوچے اور بازار میں گھومتے پھرتے، لوگوں سے ملتے جلتے اور انھیں دعوتِ اسلام دیتے۔ آپؐ رابطۂ عوام کے کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ کوئی اجتماع یا میلہ ہوتا، آپؐ لوگوں سے انفرادی اور اجتماعی طور سے ملتے اور انھیں دعوتِ اسلام دیتے۔ ایک طرف آپؐ اور آپؐ کے رُفقائے تحریک کی انقلابی سرگرمیاں تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئیں اور دوسری طرف جاہلیت پسند عوام اور استحصالی طبقوں کی مخالفت زور پکڑتی چلی گئی۔ رحمۃ للعالمینؐ لوگوں کو ان کے حیّ و قیّوم اور سمیع و بصیر ربّ کی طرف بُلاتے تاکہ وہ اپنی رحمت سے ان کی زندگی کو حسین و منوّر بنا دے لیکن وہ حجر و گِل کے بے جان اصنام کی طرف لپکتے، جو نہ نفع پہنچا سکتے تھے نہ نقصان۔ آپؐ انھیں اہلِ حُسن و محبت کی دنیا میں آنے کی دعوت دیتے تاکہ وہ ان کے لیے ایک حسین معاشرہ تشکیل و تعمیر کر دیں جو ہر قسم کے استحصالی طبقوں سے پاک و منزّہ ہو، لیکن وہ اپنے کُھلے دشمنوں کی محکومی میں رہنے پر اصرار کرتے تھے۔ وہ ایسا کیوں کرتے تھے؟ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ مُشرک تھے اور شِرک ایک ایسی مہلک نفسیاتی بیماری ہے جو قلب کو ٹیڑھا کر دیتی ہے[30] نیز اس سے انسان کے حواس و قلب پر پردے پڑ جاتے ہیں[31] اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسے اپنے حقیقی سُود و زیاں اور دوست و دشمن میں امتیاز کرنے کا شعور نہیں رہتا۔[32]

شِرک سے متعلق ہمیں یہ ازبس اہم نکتہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس سے شخصیتِ انسانی کی وحدت میں ثنویت، تثلیث اور بعض اوقات کثرت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کا نتیجہ ظُلم و جہل کی صورت میں نکلتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مُشرک جب شِرک کر کے اپنی شخصیت کو پارہ پارہ کر لیتا ہے تو اس کا نشو و ارتقا رُک جاتا ہے اور اپنے جہل کے باعث اسے اس کا شعُور بھی نہیں رہتا۔ چنانچہ جب کوئی قوم ظالم و جاہل بن جاتی ہے تو وہ اُن مؤحّد انسانوں کی مخالف و دشمن ہو جاتی ہے، جو اسے جھُوٹے معبُودوں کی غُلامی سے رہائی دلانے، ظلم و جہل کے اندھیروں سے نکال کر علم و حکمت کی روشنی میں لانے اور اسے حقیقی کامیابی کے جادۂ مستقیم پر چلانے کی مُخلصانہ کوشش کرتے ہیں۔ قرآنِ مجید نے تاریخ کے حوالے سے اس حقیقت پر بار بار زور دیا ہے۔ مشرک چونکہ خود ظلم پیشہ ہوتا ہے، اس لیے وہ ظالموں کو پسند کرتا اور حق پرستوں، محسنوں اور اہلِ حسن و سرور سے نفرت کرتا ہے۔ شرک چونکہ صدق و تقویٰ کا دشمن ہوتا ہے، اس لیے مشرک میں نہ تو حق و صداقت کی آرزو ہوتی ہے اور نہ اس کا دِل اس کا حریف ہی ہو سکتا

ہے۔ جس طرح مجرم اندھیرے کو اپنی کام جوئیوں کا ذریعہ اور اپنا ملجا و ماویٰ سمجھتے اور اس سے مانوس ہوتے ہیں، اسی طرح ایمان چور، انسانیت چور، آزادی و ضمیر چور اور حقوق چور سبھی حق کی روشنی سے خوف کھاتے اور شمع بردارانِ حق کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ تاریخ کہتی ہے کہ ایسا ہر زمان و مکان میں ہوتا رہا ہے اور ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جب تک شرک اس دنیا میں ہوتا رہے گا، ایسا ہوتا رہے گا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان شرک کیوں کرتا ہے؟ قرآن مجید کی روشنی میں ثقافتِ انسانی (اپنے وسیع ترین مفہوم میں) کا تحقیقی نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنے سے اس کے بُنیادی سبب کا سراغ ملتا ہے کہ انسان جبلّی طور سے تعجیل پسند ہے[33]، اس لیے وہ غیب پر شہود کو اور نقد کو اُدھار پر ترجیح دیتا ہے۔ چنانچہ وہ ان دیکھے خدا کے بجائے اصنامِ مشہود کو اپنا اِلٰہ بنا لیتا ہے۔ یہ اصنام عموماً چار قسم کے ہوتے ہیں:

(۱) **مظاہرِ فطرت**: اجرامِ فلکی مثلاً سُورج وغیرہ، شجر و حجر وغیرہ۔ صنم پرستی کی یہ قسم انسان کی کائنات سے مرعوبیت پر دلالت کرتی ہے۔ اسلام سے پہلے بہت سی مُشرک اقوام تھیں جو اس کائنات کے مظاہر کو دیوتا سمجھتی تھیں، جو ان کے نزدیک انسان پر حکومت کرتے تھے اور اس کو نفع و نقصان پہنچانے کی قدرت رکھتے تھے۔ یہ عقیدہ ابھی تک بعض مشرک اقوام میں پایا جاتا ہے۔ اسلام کی تحریکِ انقلاب کا ایک مقصد بندگانِ خدا کو اس انسانیت سوز عقیدے اور کائنات کی غلامی و محکومی سے نجات دلانا اور ان میں اس حقیقت کا ایقان و اِذعان (ایمان) پیدا کرنا تھا کہ انسان کائنات کا ساجد نہیں، مسجود ہے، محکوم نہیں، حاکم ہے۔ نیز کائنات کو انسان کے استفادہ و تمتّع کے لیے بنایا ہی نہیں، مسخّر بھی کر دیا گیا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اسلام کی انقلابی تحریکِ رحمۃ للعالمینی اپنی اس کوشش میں ناکام نہیں رہی۔ چودہ سو برس پہلے اِسلام نے جب یہ کہا تھا کہ کائنات اِنسان کے لیے مسخّر کر دی گئی ہے اور وہ اپنے علم و حکمت (یعنی سائنس اور ٹیکنالوجی) کے ذریعے اس کو اپنا محکوم و ماتحت بنا کر اس پر حکومت کرے گا اور اس سے کام لے گا تو یہ بات چونکہ اس عہد کے کم علم اہلِ عرب کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی، اس لیے منکرینِ اسلام نے اسے محال سمجھا۔

عقلِ انسانی کی ایک کمزوری یہ ہے کہ جب وہ کسی حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتی تو اسے خفّت محسوس ہوتی ہے، لہٰذا جب وہ اپنے اس عجز کا اقرار کرنے کا حوصلہ نہیں پاتی تو اس کا انکار کر دیتی ہے۔ فلسفے میں اس کی ایک زندہ و عبرت آموز مثال "بے وحی عقلیت" ہے۔[34] یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ عقل، علم اور حکمت فطرۃً ارتقائی ہیں، اس لیے انسان پر حیات و کائنات

کے اسرار و حقائق (غیوب) بتدریج منکشف ہوتے رہتے ہیں اور یہ سلسلۂ انکشاف ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ جو چیزیں ماضی میں غیب تھیں، آج مشہود و مرئی ہیں اور جو چیزیں آج غیب ہیں وہ کل شہود میں آ سکتی ہیں اور انسان ہمیشہ سے اس تجربے سے گزر رہا ہے، پھر غیب کو محض اس بنا پر تسلیم نہ کرنا کہ وہ انسان کے علم و عقل و تجربے میں نہیں آتا، علم، عقل اور حکمت کے نشو و ارتقاء کے انکار کے مترادف ہے۔ اس سے اس امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں قرآن مجید نے ایمان بالغیب کو تلاشِ حق و صداقت کی ایک ناگزیر پیش شرط قرار دیا ہے[۳۵]۔

(۲) فرعون، ہامان اور قارون : فرعونیت، حاکمیتِ مطلقہ اور پیشوائیت پر، ہامانیت نوکرشاہی پر اور قارونیت جاگیرداری و زمینداری اور سرمایہ داری و سودخواری کی ہر شکل پر دلالت کرتی ہے۔ صنم پرستی کی یہ قسم جتنی زیادہ انسانیت سوز و فساد انگیز ہے، اتنی ہی عالمگیر بھی ہے۔ فرعون ہر زمان و مکان میں مختلف قسم کے نام رکھ کر اور بھیس بدل کر لوگوں پر مسلط ہو جاتے ہیں اور اپنی سیاسی و عسکری قوت اور مذہبی پیشوائیت کی حمایت کی بنا پر لوگوں کی دینی، سیاسی اور معاشی آزادی سلب کر کے ان کے اِلٰہ و ربّ بن بیٹھتے ہیں۔ اللہ کے بندوں پر احکامِ الٰہی کے ذریعے حکومت کرنے کے بجائے وہ اپنے احکام و قوانین بلکہ مرضی سے حکومت کرتے ہیں، اس طرح انھیں معاشی لحاظ سے بالخصوص اپنا محتاج بنا کر ان کے ارباب بن بیٹھتے ہیں۔ مزید براں، فرعون لوگوں کے ارباب بن کر ان کو تحریص و ترغیب اور ترہیب کے ذریعے اپنی مدح سرائی، قصیدہ خوانی اور اپنی شان میں نعرے لگوانے پر مجبور کر دیتے ہیں اور اس طرح ان کے اِلٰہ بھی بن بیٹھتے ہیں۔ اسلام اسی کو تو دعوائے خدائی کہتا ہے۔

ہامان : نوکرشاہی کی علامت ہے۔ جس معاشرے میں فرعون ہوگا، وہاں ہامان بھی ہوں گے، کیونکہ وہ اس کے دست و بازو ہوتے ہیں۔ ہامان کا کردار دُہرا ہوتا ہے۔ وہ خود تو فرعون کی پرستش کرتا ہے، لیکن لوگوں کو اپنی پرستش کرنے پر بھی مجبور کرتا ہے۔ ہامان منافق ہوتا ہے، کیونکہ ہامانیت بغیر منافقت کے زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ ہامانیّت کا انحصار چونکہ فرعونیّت پر ہوتا ہے، اس لیے وہ اسے قائم رکھنے کے لیے لوگوں پر ہر قسم کا ظلم و تشدّد روا رکھتا ہے اور ان کے حقوق کو پامال اور غصب کرنے میں فرعون سے کہیں بڑھ کر ابلیسی کردار ادا کرتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہامانیت و شیطنت ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔

قارون : ہر قسم کی استحصالی قوت کی علامت ہے۔ قارون معاشرۂ انسانی کے شجر کے

وہ کیڑے ہوتے ہیں جو اس کا خون چوستے اور اسے کھوکھلا بناتے اور اس خون سے فرعون و ہامان کی پیاس بجھاتے رہتے ہیں۔ اس اعتبار سے قارون بلاشبہ فرعون و ہامان سے زیادہ انسان کا دشمن ہے۔ اصل یہ ہے کہ فرعون، ہامان اور قارون شیطنت کے اقانیمِ ثلاثہ[۳۶] ہیں اور شیطان انسان کا کھلا دُشمن ہے۔

(۳) نفسِ امّارہ : نفسِ امّارہ[۳۷] کا وظیفہ پے در پے خواہشات پیدا کرنا اور ان کو ہر جائز و ناجائز طریقے سے پورا کرنے پر انسان کو اُکساتے رہنا ہے۔ اس کا طریقۂ کار یہ ہے کہ وہ انسان کو جو طبعاً حسن پسند ہے اور قبح سے نفرت کرتا ہے، اس کی بُری سے بُری خواہش کو بھی اپنے جمالیاتی فریب کے ذریعے مزیّن و خوشنما بنا کر دکھاتا ہے اور اسے اس جمالیاتی مغالطے میں مُبتلا کر کے ہر قبیح سے قبیح کام کروا لیتا ہے۔ چنانچہ جب نفسِ امّارہ اپنے اس جمالیاتی فریب کی بدولت نفسِ لوّامہ[۳۸] کو مغلوب کر لیتا ہے تو انسان کو اپنا پرستار بنا کر خود اس کا اِلٰہ بن جاتا ہے۔ اسے خود پرستی یا نفس پرستی بھی کہتے ہیں۔

انسان کے سینے میں چونکہ دو نہیں، ایک دل ہوتا ہے، اس لیے جو شخص اپنے نفس کو اپنا اِلٰہ بنا لیتا ہے، وہ گویا اپنے آپ کو بھی اللہ تعالیٰ کی الوہیت میں شریک کر لیتا ہے، اسی کو شرک کہتے ہیں۔

(۴) نظریات و معتقدات : انسان جب عقیدۂ توحید کے منافی عقاید و نظریات سے متاثّر و مرعوب ہو کر انھیں اپنی زندگی میں جذب کر لیتا ہے تو وہ اس کے اِلٰہ بن جاتے ہیں۔

احبابِ خاص : یہ مقولہ مشہور بھی ہے اور سچّا بھی کہ "آدمی اپنی صحبت سے پہچانا جاتا ہے"۔ تاریخ شاہد ہے کہ نبوّت سے پہلے بھی اگرچہ آپؐ ایک عظیم انسان کی طرح اپنی دنیا میں رہتے تھے، لیکن ایک مثالی شہری کی طرح عوام میں بھی زندگی بسر کرتے تھے مگر آپؐ ان لوگوں کو دوست رکھتے تھے جو صاحبدل و صالح ہوتے تھے۔ آپؐ کے احبابِ خاص میں تین نام خاص طور سے لیے جاتے ہیں :

(۱) حضرت ابوبکر صدیقؓ جن کا نام عبداللہ تھا۔ ان سے آپؐ کی برسوں پُرانی دوستی تھی۔ یہ اپنی راستبازی، سچّائی اور امانت و دیانت کے لیے معروف تھے۔ مَردوں میں سب سے پہلے ایمان لائے اور تحریکِ اسلام میں شامل ہو گئے[۳۹]۔

(۲) حضرت حکیم بن حزامؓ جو قریش کے معزز رئیس تھے، حرم کا منصب رفادہ انھیں کے پاس تھا اور دار الندوہ کے مالک تھے۔ یہ حضرت خدیجہؓ کے چچیرے بھائی تھے۔ ان کو آپؐ سے بڑی محبت تھی۔ صاحبِ کردار انسان تھے۔ ہجرت کے تقریباً آٹھ برس بعد ایمان لائے، لیکن کفر کی حالت میں بھی آپؐ کے دوست رہے۔[۴۰]

(۳) حضرت ضماد بن ثعلبہؓ، تحریکِ اسلام میں داخل ہونے سے پہلے ان کا پیشہ طبابت و جرّاحی تھا۔ لوگ انھیں احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ کفّار کا یہ پراپیگنڈہ سن کر کہ آپؐ کو جنون ہو گیا ہے' علاج کرنے کی غرض سے آپؐ کے پاس آئے لیکن آپؐ کے جنونِ عشق کو عقل و دانش کے بلند ترین مقام پر دیکھ کر حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔[۴۱]

تاریخ شاہد ہے کہ آپؐ کو اہلِ علم و حکمت کی صحبت مرغوب و محبوب تھی، اس لیے آپؐ کو علم و حکمت کی سچّی طلب و جستجو تھی اور طلبِ علم و تلاشِ حق لازم و ملزوم ہیں۔

عوام کے احساسات و جذبات، خیالات و تصوّرات اور افکار و نظریات کو پُوری طرح سمجھنے کے لیے سائنسی رویّہ اختیار کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عوام کے ساتھ گھُل مل کر باتیں کرنی اور تبادلۂ خیال کرنا چاہیے۔ ان کے ساتھ رہنا سہنا چاہیے اور ان کے رسم و رواج، معمُولاتِ زندگی، مشاغل اور اخلاق و کردار کا بامقصد مشاہدہ کرنا چاہیے اور پھر ان کا تجزیہ کرنا چاہیے۔ آپؐ تحریکِ اسلام سے پہلے اور بعد میں عمر بھر عوام میں رہے، عوام کی طرح آپؐ نے زندگی گزاری اور آپؐ کا معیارِ زندگی بھی عوام کے معیارِ زندگی سے کسی طرح بلند نہیں بلکہ پست تھا۔

اس مشاہدہ و تجربہ سے آپؐ کو بے حد فائدہ پہنچا اور اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کو کامیاب بنانے میں اس کے کردار کی اہمیت کو کم نہیں کیا جا سکتا۔

ہر انقلابی تحریک کا ایک نعرہ[۴۲] ہوتا ہے جو اس کے بنیادی مقصد یا غایتِ حقیقی کا مظہر ہوتا ہے۔ اسلام کی تحریکِ انقلاب کا بھی نعرہ تھا اور وہ تھا: لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰه : کوئی اِلٰہ (معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود) نہیں مگر اللہ۔ یہ نعرہ بظاہر معمولی سا نظر آتا ہے لیکن اس کا مفہوم اس سے بہت زیادہ وسیع ہے جو بالخصوص زوالِ امّت کے بعد عام مسلمان سمجھنے لگے ہیں۔ اگر اس کا وہی مفہوم ہوتا جو آجکل کے مسلمان عموماً سمجھتے ہیں تو قریشِ مکّہ اس سے اتنے زیادہ خوفزدہ نہ ہوتے جتنے کہ وہ ہوئے۔ یہ مبالغہ نہیں' حقیقت ہے کہ قریشِ مکّہ نے اس نعرے

کو اس کے صحیح تناظر میں دیکھا اور اس کے حقیقی مفہوم کو سمجھا۔ چنانچہ وہ آپؐ یا صحابہ کرامؓ کی زبان سے یہ کلمہ یا نعرہ سُنتے تو ان کا دل اس کے معنی و مفہوم کا حریف نہ ہو سکتا' وہ کانپ اُٹھتے اور مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے۔ کیوں؟ اصل یہ ہے کہ اس سوال کے جواب میں اُمّتِ مسلمہ کے عروج و زوال کی داستان مضمر ہے۔

یہ نعرہ یا کلمہ منفی و اثباتی' دو اجزاء کا مرکب ہے : لَا اور اِلَّا۔

لَا ہر قسم کے مخلوق و غیر فطری اِلٰہ کی نفی کی علامت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اِنسان کا کوئی اِلٰہ نہیں۔ نہ لات و منات، نہ فرعون و ہامان اور نہ قارون و نفسِ امّارہ۔

اِلَّا اثباتی علامت ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کا ایک اِلٰہ ہے اور وہ تنہا اللہ تعالٰی ہے جو تمام جہانوں کا رازق و پروردگار اور حاکم و آقا ہے۔

قریش جب یہ نعرہ سنتے تو اس تصوّر سے لرز اُٹھتے کہ انھیں اپنے اصنام' پیشوائیت' علُوئے نسب و مرتبت' سیادت و امارت' عزّت و شرف اور وسائلِ دولت وغیرہ سے دستبردار ہونا، نیز اپنے نفس کی خواہشات اور بڑوں کے احکام سے مُنہ موڑ کر ایک اَن دیکھے خدا کے احکام کو ماننا اور ان کے مطابق زندگی گزارنا پڑے گی۔ قریش نے تحریکِ اسلام کے اس نعرے کو انقلابی سمجھا اور درست سمجھا۔ شرک ظلم و جہل ہے اور ظالم و جاہل انقلاب سے لرزاں و گریزاں اور قدامت و رجعت کے پرستار ہوتے ہیں۔ چنانچہ قریش نے اس نعرے کی بنا پر اسلام کو ایک خطرناک اور بہت دُور رس نتائج کی حامل تحریکِ انقلاب سمجھا اور بالکل صحیح سمجھا۔ لہٰذا یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس تحریک کی پوری قوت سے مخالفت کی، اور اسے دبانے کچلنے اور مٹانے کی ہر ممکن کوشش کی، ظلم و تشدّد کیا' سازشیں اور جنگیں کیں، غرض کہ جو بن آیا' انھوں نے کیا اور اس وقت تک کیا جب تک وہ خود اس تحریک سے موضوعی و معروضی طور سے مغلوب نہیں ہو گئے۔

تحریک جب تک کامیاب نہیں ہوتی اس کی قوّت و حرکیّت[۴۳] اس کے نعرے کی مرہونِ منت ہوتی ہے لیکن کامیابی کے بعد اس کی قوّت و توانائی اور حرکیّت و ارتقاء کا سرچشمہ اس کے عقایدِ جلیلہ و محرّکہ ہوتے ہیں۔ تحریکِ اسلام کے عقایدِ جلیلہ و محرّکہ کیا ہیں؟ ان سے بحث اس وقت کی جائے گی جب یہ تحریک اپنی جلاوطنی کے بعد دوبارہ اس پہلے وطن میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہو گی یعنی فتح مکّہ کے بعد۔

تصادُم تحریکِ انقلاب کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔ اس سے ایک تو انقلابی تحریک کا عام چرچا ہو جاتا ہے، دوسرے اس کو ایسا دھکا لگتا ہے، جس سے اس کی رفتار تیز ہو جاتی ہے اور اسے زورِ حرکت ملتا ہے۔ تیسرے، لوگوں کو اس کے اغراض و مقاصد کا خود بخود علم ہو جاتا ہے اور چوتھے، معاشرے میں انقلاب پسندوں کی حیثیت رجعت پسندوں کے مقابلے میں ایک مدِمقابل فریق کے طور پر متعین و مسلّم ہو جاتی ہے۔ علاوہ بریں اگر تحریک، تحریکِ رحمت ہو تو تصادُم سے استحصالی قوتوں کو نقصان اور اسے فائدہ پہنچتا ہے۔ تصادم کی اس اہمیت کے پیشِ نظر پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو تصادم پر اُکسانے کے لیے ان کی آئیڈیالوجی پر بھرپور حملہ کیا اور دلائل و براہین سے ان کی اس طرح تکذیب و تردید کی کہ قریش لاجواب ہو کر بلبلا اُٹھے۔ ان کی مذہبی عصبیّت و غیرت نہ تو یہ سب کچھ برداشت کر سکتی تھی اور نہ اس نے کیا۔ چنانچہ وہ آپؐ کو بالخصوص اور آپؐ کے رُفقائے تحریک کو بالعموم طرح طرح کی ذہنی و جسمانی اذیتیں پہنچانے لگے۔ مسلمان جدھر سے گزرتے، ان پر اُنگلیاں اُٹھتیں، آوازے کسے جاتے، ان سے استہزا کیا جاتا تاکہ آپؐ کا جی چھوٹ جائے اور ہمت جواب دے جائے اور آپؐ تحریک سے دست بردار ہو جائیں۔ قریش جو کچھ کر سکتے تھے، وہ کرتے تھے، لیکن آپؐ پر تلوار نہ اُٹھاتے۔ اس کی بہت سی وجوہات میں سے ایک بنیادی وجہ یہ تھی کہ اگر آپؐ کو شہید کر دیا جاتا تو بنو ہاشم کی قبائلی عصبیت و غیرت ہر قیمت پر انتقام لیتی اور اس سے قریش میں خانہ جنگی کا سلسلہ شروع ہو جاتا اور اس کے لیے وہ تیار نہ تھے۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ جنگِ فُجّار کی ہولناک تباہ کاریوں سے بے حد متاثر، نادم اور پشیمان تھے اور اس کے عبرتناک عواقب و نتائج کا ابھی تک خمیازہ بھگت رہے تھے، لہٰذا وہ کسی قیمت پر خانہ جنگی کا خطرہ مول لینے کے لیے اپنے اندر آمادگی و ہمت نہ پاتے تھے۔[۴۵]

مسلمانوں کی تعداد پچاس کے لگ بھگ ہو چکی تھی اور ان میں قریش کے مختلف گھرانوں کے افراد بھی تھے، اس لیے ان سے مسلح تصادم کا مطلب بھی خانہ جنگی تھا، لہٰذا ان سے تصادم تو ہوا اور بڑے زور کا ہوا، مگر اس میں اسلحہ کا استعمال نہ ہوا۔

بہرحال اس تصادم کا نتیجہ یہ نکلا کہ قریش جنھیں اپنی قوت و سیادت، مال و دولت، فراست و حکمت اور کثرت پر ناز تھا، اپنی زبردست حریفانہ چالوں کے باوجود سیاست کی بساط پر آپؐ کو مات نہ دے سکے بلکہ خود "شہ" کھا گئے اور انھیں مجبوراً وفد کی صورت میں حضرت ابوطالب کے پاس جانا پڑا کہ وہ آپؐ کو تحریکِ اسلام بند کرنے پر مجبور کریں۔ حضرت ابوطالب کو آپؐ کے صدق و خلوص، غمِ انسانیت اور عزم و ہمت میں کوئی شبہ نہ تھا، لہٰذا انھوں نے وفد کو دم دلاسا دے کر رخصت کر دیا اور آپؐ سے کوئی تعرض نہ کیا۔[۴۶]

اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اسلام کی تحریکِ انقلاب کی اور مسلمانوں کی ایک فریق کے طور سے حیثیت مسلّم ہو گئی اور یہ ان کی پہلی نمایاں کامیابی تھی۔

مہر و وفا کو امتحانوں سے گزرنا ہی پڑتا ہے کیونکہ جور و جفا ہی سے وہ معتبر بنتی ہے۔ چنانچہ جو شخص بھی مسلمان ہو کر وادیِ عشق میں قدم رکھتا تھا، اسے اس کی پُرخار راہوں سے برہنہ پا گزرنا پڑتا تھا۔ لیکن وہ اہلِ مہر و وفا جو غلام و بے کس تھے، ان پر قریش بڑی بیدردی سے تشدّد کرتے تھے تاکہ وہ مرتد ہو جائیں۔ اسلام کا نشہ ایسا نہ تھا کہ جسے قریش کے مظالم کی تُرشی اُتار سکتی۔ اُدھر اہلِ جفا کا ظلم بڑھتا جاتا اور اِدھر اہلِ وفا کا عزم اور پُختہ ہوتا جاتا۔ مسلمانوں نے اِس راہِ مہر و وفا میں ظلم کی چکّی میں پسنا اور جان سے جانا قبول کیا لیکن اسے چھوڑنا انھیں گوارا نہ ہوا۔ اہلِ وفا کی قربانیوں اور اہلِ جفا کے مظالم کی خونچکاں داستانوں سے تاریخِ اسلام کے اوراق مزیّن ہیں اور ان لوگوں کے لیے تازیانۂ عبرت ہیں جو عداوت و جہالت سے یہ کہتے ہیں کہ اِسلام تلوار سے پھیلا ہے۔ بہرحال ان اہلِ وفا کے خون سے نہ صرف داستانِ مہر و وفا رنگین ہوئی بلکہ عالمگیر جمالیاتی۔ دینی انقلاب کی راہ ہموار بھی ہوئی۔ یہ موقع چونکہ تفصیل و اطناب کا نہیں بلکہ ایجاز و اختصار کا ہے، لہٰذا ان اہلِ وفا کی داستان کی طرف جو خونچکاں و عبرت انگیز ہے مجمل اشاروں ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔[۴۷]

(۱) حضرت خباب بن الارت تمیمیؓ، زمانۂ جاہلیت میں غلام بنا کر فروخت کر دیے گئے تھے۔ یہ سابقون میں سے ہیں اور ساتویں یا آٹھویں مسلمان ہیں۔ ان پر بڑے بڑے مظالم توڑے گئے، لیکن ان کے پائے استقامت میں لغزش نہ آئی۔ ایک روز ان کو دہکتے ہوئے کوئلوں پر چت لِٹا کر ان کے سینے پر ایک شخص کو کھڑا کر دیا گیا تاکہ وہ کروٹ نہ بدل سکیں، یہاں تک کہ کوئلے بجھ کر ٹھنڈے پڑ گئے۔

(۲) حضرت بلال حبشیؓ جو مؤذنِ اوّل ہیں، اُمیّہ بن خلف کے غلام تھے۔ ظالم ان کی مُشکیں کس کر گرم ریت پر لِٹا دیتا اور سینے پر بھاری چٹان رکھ دیتا اور اسلام چھوڑنے کو کہتا، لیکن اہلِ وفا کی زبان سے "احد، احد" ہی نکلتا۔ ایک دن تنگ آ کر اُمیّہ بن خلف نے

ان کے گلے میں رسّی باندھی اور لونڈوں کے حوالے کر دیا جو انھیں شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک گھسیٹتے پھر رہے تھے۔ سفّاک کفّار دیکھ دیکھ کر ہنستے پھبتیاں کستے اور یہ وفا کیش احد احد کہتے رہے۔

(۳) حضرت عمارؓ سے پہلے صرف تین چار شخص تحریکِ اسلام میں شامل ہوئے تھے۔ یہ انجب تھے۔ ان کے باپ کا نام یاسرؓ اور ماں کا سمیّہؓ تھا، جو ابو حذیفہ مخزومی کی کنیز تھیں۔ قریش ان تینوں کو تپتی زمین پر لِٹا کر اس قدر مارتے کہ وہ بے ہوش ہو جاتے۔

(۴) حضرت سمیّہؓ (والدۂ حضرت عمارؓ) اسلام کے اوّلین شہیدوں میں سے ہیں۔ ابوجہل نے انھیں برچھی مار کر شہید کیا تھا۔

(۵) حضرت یاسرؓ (حضرت عمارؓ کے والد) نے بھی اسی راہِ عشق و وفا میں شہادت پائی تھی۔

(۶) حضرت صہیبؓ دراصل موصلی تھے، رومی نہ تھے۔ ان کے باپ کا نام سنان تھا اور وہ کسریٰ یعنی ایران کے بادشاہ کی طرف سے اُبلّہ کے حاکم تھے۔ ایک دفعہ رومیوں نے اس علاقے کو تاخت و تاراج کیا اور لوگوں کو غلام بنا کر روم لے گئے جن میں حضرت صہیبؓ بھی تھے۔ ایک عرب ان کو خرید کر مکّے لے آیا۔ یہاں عبداللہ بن جدعان نے انھیں خرید کر آزاد کر دیا۔ حضرت صہیبؓ اور حضرت عمارؓ دونوں اکٹھے ہی آنحضرتؐ کی دعوت پر ایمان لا کر تحریکِ اسلام میں شامل ہوئے۔ قریش اس جُرمِ ایمان و وفا کی پاداش میں انھیں اس قدر اذیّتیں دیتے کہ وہ حواس باختہ ہو جاتے۔

(۷) حضرت ابو فکیہہؓ صفوان بن اُمیّہ کے غلام تھے۔ ان کو بھی تپتی ریت پر لٹایا گیا۔ رسّی باندھ کر گھسیٹا گیا، گلا گھونٹا گیا اور طرح طرح سے ان پر تشدّد کیا گیا، لیکن وہ اپنے عہدِ وفا پر قائم رہے۔ وہ حضرت بلالؓ کے ساتھ ایمان لائے تھے۔

(۸) حضرت لُبینہؓ کنیز تھیں۔ حضرت عمرؓ ان پر بہت تشدّد کرتے تھے۔ جب ظلم کا ہاتھ کھینچتے تو کہتے: میں نے تجھے رحم کی بنا پر نہیں بلکہ اس وجہ سے چھوڑ دیا ہے کہ تھک گیا ہوں۔ اس کے جواب میں اس مظلوم و بیکس کا جواب یہ ہوتا کہ اگر تم اسلام نہ لاؤ گے تو اللہ تعالیٰ اس کا انتقام لے گا — اہلِ جور کی جفائیں اور دھمکیاں اہلِ وفا کے دل کو مرعوب و متاثّر تو نہ کر سکیں، البتّہ ان کی وعید حضرت عمرؓ کے دل میں اُتر گئی۔

(۹) حضرت زنیرہؓ حضرت عمرؓ کے گھرانے کی کنیز تھیں۔ یہ بھی اُن کے مظالم کا تختۂ مشق

بنتی رہتی تھیں۔ آخر کار ابوجہل نے ان پر اتنا تشدد کیا کہ ان کی بینائی جاتی رہی۔

(۱۰، ۱۱) حضرت نہدیہؓ اور اُمِّ عبیسؓ بھی کنیزیں تھیں۔ ان پر بھی اہلِ جفا تشدد کرتے اور ظلم ڈھاتے رہے لیکن ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ اہلِ صدق و صفا بھی تھے اور صاحبدل و اہلِ درد بھی، اور پھر صاحبِ استطاعت بھی۔ انھوں نے ان مظلوم و وفا کیش مسلمانوں میں سے مندرجۂ ذیل کو بھاری قیمتیں ادا کر کے اہلِ جور و جفا کی غلامی سے چھڑایا اور آزاد کر دیا: حضرت بلالؓ، عامر بن فہیرہؓ، لبینہؓ، زنیرہؓ، نہدیہؓ، اُمِّ عبیسؓ۔[۴۸]

صرف یہ غلام و بیکس مسلمان ہی ستم زدہ نہیں تھے بلکہ دوسرے مسلمان بھی قریش کے مظالم کے تختۂ مشق بنتے تھے۔ حضرت عثمانؓ کو ان کے چچا رسّی باندھ کر مارتے تھے حالانکہ وہ صاحبِ حیثیت بھی تھے اور بڑی عمر کے بھی۔ اسی طرح حضرت زبیر بن العوامؓ جو پانچویں مسلمان تھے، اپنے چچا کے مظالم کا شکار ہوئے، جو انھیں چٹائی میں لپیٹ کر ان کی ناک میں دُھواں دیتے تھے۔ حضرت سعید بن زیدؓ تحریکِ اسلام میں شامل ہوئے تو ان کے چچا زاد بھائی حضرت عمرؓ نے ان کی مشکیں باندھ کر خوب پیٹا، لیکن ہر ضربتِ جسم اور ہر جراحتِ دل سے اہلِ وفا کا نشۂ ایمان اور بڑھتا تھا۔ ایک عیسائی مؤرّخ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں اور پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کے صحابۂ کرامؓ کے کردار کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"عیسائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمدؐ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی تعلیمات نے آپؐ کے متبّعین میں جس قدر دین کا نشہ پیدا کیا، اسے (حضرت) عیسیٰ (علیہ السّلام) کے اوّلین پیرؤوں (یعنی حواریوں) میں تلاش کرنا بے سُود ہے۔ ...... جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر لے گئے تو ان کے پیرو بھاگ گئے۔ ان کا نشّۂ دینی ہرن ہو گیا، اور وہ اپنے مقتدا کو موت کے پنجے میں گرفتار چھوڑ کر چل دیے ...... اس کے برعکس حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کے پیرو اپنے مظلوم پیغمبرؐ کے گرد آئے اور آپؐ کے بچاؤ میں اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر کُل دشمنوں پر آپؐ کو غالب کیا۔"[۴۹]

انقلاب کی راہیں پُرخار ہوتی ہیں، جن میں برہنہ پا و آبلہ پا گزرنا انقلابی مجاہدوں کا مقدر ہوتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اللہ کے یہ انقلابی مجاہد اس تجربے سے گزرے اور کامیابی سے گزرے۔ اس کی دو بنیادی وجوہ تھیں: ایمان اور اعتماد۔ اوّلاً ان کو اسلام کی حقّانیت کا

اذعان و ایقان تھا اور اس کے عقایدِ جلیلہ و محرکہ ان کی زندگی میں رچ بس گئے تھے۔ ثانیاً ان کو اپنے قائد و ہادی پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کی قیادت پر کامل اعتماد تھا۔ اس اعتماد کی بنیاد یہ تھی کہ آپؐ ان میں سے تھے اور وہ آپؐ کے ماضی سے باخبر تھے اور آپؐ کے صاحب کردار اور امین و صادق ہونے کے معترف تھے، نیز دُکھ سُکھ اور خوف و خطر میں آپؐ ان کے ساتھ رہتے تھے۔ انقلابی سرگرمیوں میں آپؐ سب سے زیادہ حصّہ لیتے تھے اور رفقائے کار کے ساتھ آپؐ کا سلوک حسین و مثالی تھا۔ خود قرآن مجید اس حقیقت کا شاہد ہے۔ چنانچہ اللہ تعالٰے آپؐ سے فرماتا ہے :

(اے محمدؐ!) اللہ تعالٰی کی رحمت سے تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ اگر کہیں تم تُند خُو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب تمھارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔ ان کے قصور معاف کر دو۔ ان کے حق میں دُعائے مغفرت کرو اور اپنے کاموں میں ان سے مشورہ لیا کرو۔ پھر جب تمھارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو۔ اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اسی کے بھروسے پر کام کرتے ہیں[۵۰]۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ دشمنانِ اسلام کے مظالم کا اصل ہدف آپؐ ہی تھے، اس لیے ان کے جور و جفا، طعن و تشنیع اور دشنام و استہزا کے گھاؤ سب سے زیادہ آپؐ ہی کو لگتے تھے۔ زبان کے گھاؤ تیغ و تفنگ کی جراحتوں سے زیادہ اذیت ناک ہوتے ہیں اور آپؐ کا دل عظمت میں بے مثال اور وسعت میں بیکراں ہونے کے باوجود آخر بشر کا دل تھا، درد سے تڑپ بھی اُٹھتا تھا۔ "دوست" سے یہ دیکھا نہیں جاتا تھا، لیکن قانونِ قدرت یہی ہے کہ نصب العین جتنا عظیم ہو، قربانی بھی اتنی ہی عظیم دینا پڑتی ہے، لہٰذا اللہ تعالٰی آپؐ کو ان تجربات میں سے گزرنے اور دعوتِ اسلام دینے کی تلقین بھی کرتا اور ساتھ ساتھ آپؐ کو وحی و تنزیل کے ذریعے تسلّی بھی دیتا جاتا :

"اگر تیرے ربّ کی طرف سے پہلے ایک بات طے نہ کر دی گئی ہوتی اور مہلت کی ایک مُدّت مقرّر نہ کی جا چکی ہوتی تو ضرور ان کا بھی فیصلہ چکا دیا جاتا۔ پس (اے محمدؐ) جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں، ان پر صبر کرو اور اپنے ربّ کی حمد و ثنا کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔ سُورج نکلنے سے پہلے اور غروب ہونے سے پہلے اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کرو اور ان کے کناروں پر بھی، تاکہ تم مطمئن و خوش ہو جاؤ۔[۵۱]"

اللہ تعالٰی نے آپؐ کو تسلّی دی ہے کہ حالات و نتائج سے آپؐ مطمئن و خُوش ہو جائیں

اور ساتھ ہی آپؐ کو یہ ہدایت بھی دے دی کہ دُنیا کے مال و دولت اور شان و شوکت کو خاطر میں نہ لانا :

"اور حیاتِ دُنیوی کی آسائشوں اور شان و شوکت کو نگاہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھو، جو ہم نے ان میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہیں۔ یہ تو ہم نے انھیں آزمائش میں ڈالنے کے لیے دے رکھی ہیں اور تیرے ربّ کا دیا ہوا رزقِ حلال ہی بہتر اور پائندہ تر ہے۔ اپنے اہل و عیال کو نماز کی تلقین کرو اور خود بھی اس پر قائم و دائم رہو۔ ہم تم سے کوئی رزق نہیں چاہتے، رزق تو ہم ہی تمھیں دے رہے ہیں اور انجام کی بھلائی تو تقویٰ ہی کے لیے ہے۔[۵۲]"

آپؐ کو اشارۃً یہ جتایا گیا کہ عنقریب آپؐ کو مال و دولت اور اقتدار و حکومت کا لالچ دیا جائے گا، لیکن اسے خاطر میں نہ لایئے گا۔ سورۃ الکہف میں اس مخفی پیش گوئی کے ساتھ آپؐ کو اہلِ مکّہ کی چکنی چپڑی باتوں پر کان دھرنے سے متنبہ کیا گیا ہے۔[۵۳] ہم عنقریب دیکھیں گے کہ قریش نے واقعی آپؐ کو مال و دولت اور حکومت و اقتدار اور حسین و معزّز خواتین کی پیشکش کی، لیکن آپؐ نے اسے ٹھکرا دیا۔ کیوں؟ عقلِ سلیم کہتی ہے کہ اگر آپؐ اللہ تعالٰی کے سچّے نبی نہ ہوتے بلکہ طالع آزما ہوتے اور تحریکِ اسلام سے مقصود محض حصُولِ حکومت و اقتدار ہوتا تو آپؐ اپنی جان اور مستقبل کو خطرے میں ڈالنے کے بجائے ایسی پیش کش کو فوراً قبول کر لیتے لیکن آپؐ نے ایسا نہ کیا، کیونکہ آپؐ اللہ کے سچّے نبی تھے اور رحمۃ للعالمین بن کر مبعوث ہوئے تھے۔

مسلمانوں کی انقلابی سرگرمیاں بدستور جاری رہیں اور ان کی تعداد میں آہستہ آہستہ اضافہ بھی ہوتا رہا۔ قریش کے پاس تحریکِ اسلام کے نعرے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا کوئی جواب تھا نہ توڑ، اس لیے ان کی مخالفانہ چالیں نہ تو کامیاب ہو سکتی تھیں اور نہ ہوئیں۔ وہ زچ ہو گئے۔ انھوں نے اکابرِ قریش کا ایک وفد تیار کیا جس میں عتبہ بن ربیعہ، شیبہ، ابوسفیان، عاص بن ہشام، ابوجہل، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل وغیرہ شامل تھے۔ اس وفد نے اب کے دھمکیوں سے کام نکالنا چاہا اور حضرت ابوطالب سے کہا : "تمھارا بھتیجا ہمارے معبودوں کی توہین کرتا ہے، ہمارے آبا و اجداد کو گمراہ اور ہمیں بے وقوف کہتا ہے، لہٰذا یا تو تم ہمارے اور اپنے بھتیجے کے درمیان میں سے ہٹ جاؤ یا تم بھی میدان میں آجاؤ کہ ہم دونوں میں سے ایک کا فیصلہ ہو جائے۔" حضرت ابوطالب کا دل روسائے قریش کے اس چیلنج کا حریف نہ ہو سکا

کیونکہ انھوں نے محسوس کیا کہ وہ اکیلے قریش کا مقابلہ نہیں کر سکتے، لہٰذا انھوں نے آپؐ سے کہا: "اے جانِ عم! میرے اُوپر اتنا بوجھ نہ ڈال کہ میں اٹھا بھی نہ سکوں۔" یہ مشفق چچاؓ آپؐ کے معاون و مددگار اور پُشت پناہ تھے۔ جب آپؐ نے دیکھا کہ وہ قریش کی دھمکیوں سے مرعوب ہو کر ساتھ چھوڑ دینا چاہتے ہیں، تو آپؐ پر رقت طاری ہو گئی اور آنکھیں پُرنم ہو گئیں، لیکن آپؐ کے پائے عزم و ہمت میں جُنبش نہ ہوئی۔ آپؐ نے بے مثال عزم کے ساتھ فرمایا: "قسم ہے رب العزّت کی، اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سُورج اور دوسرے پر چاند لا کر رکھ دیں، تب بھی میں اپنے اس فریضے سے باز نہیں آؤں گا۔ اگر آپ میری حمایت نہیں کر سکتے تو بھی پروا نہیں۔ میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہ کام سرانجام دے رہا ہوں، اسی کی حفاظت میرے لیے کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ یا تو اس کام کو پورا کرے گا یا میں اس کے لیے اپنی جان قربان کر دوں گا۔" یہ بات آپؐ کے دل سے نکلی تھی، اس لیے اثر میں ڈوبی ہوئی تھی۔ حضرت ابوطالب اس سے اس قدر متأثر ہوئے کہ ان کے دل سے قریش کا رعب جاتا رہا اور اُس کی جگہ حوصلے نے لے لی اور ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا:

حا اکوئی شخص تیرا بال بیکا نہیں کر سکے گا۔[۵۴]

آپؐ کی یہ دُوسری فتح تھی۔ قریش کی یہ دوسری چال بھی ناکام ہو گئی۔ مسلمان ایک حریف فریق کی حیثیت سے اپنی انقلابی سرگرمیوں میں پہلے کی بہ نسبت زیادہ حوصلے اور جوش سے مشغول ہو گئے۔ قریش اس ناکامی کے بعد اوچھے ہتھیاروں پر اُتر آئے اور تصادم شدّت اختیار کر گیا۔

یہ تصادم تحریک اور جمُود کے درمیان تھا۔ حق تحریک کے ساتھ تھا کیونکہ وہ تحریکِ رحمۃ للعالمینی تھی، اس لیے اس میں زندگی اور قوّتِ تسخیر تھی۔ جمود چونکہ حیاتِ اِنسانی کے نشوو ارتقاَ کا دُشمن تھا اس لیے باطل اور بودا تھا۔ تحریک چونکہ انقلابی تھی، اِس لیے انقلاب پسندوں میں جرأتِ اقدام، جذبۂ ایثار اور قوّتِ برداشت تھی۔ جمُود چونکہ رجعت پسند تھا، اس لیے مُشرک اپنی حالت میں انقلاب کے تصوّر سے لرزاں اور ترساں تھے، اس طرح ان کا انقلاب پسند مومنوں سے مرعوب ہو جانا ایک فطری امر تھا۔

تحریکِ اِسلام کے اس دور میں دعوت و تبلیغ کا طریقہ یہ تھا کہ لوگوں کو قرآن مجید سُنایا جاتا تھا اور اس کے ساتھ ہی ان کے سامنے تحریک کا نصبُ العین یا نعرہ لَاَالٰہَ اِلَّا اللہ

پیش کیا جاتا تھا۔ عرب شعر و سخن کے معاملے میں اہلِ ذوق تھے اور اس لحاظ سے وہ اقوامِ عالم میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے تھے، اور انھیں بجا طور سے اس پر فخر و ناز تھا۔ چنانچہ جب وہ آپؐ کی زبانِ مبارک یا کسی اور اہلِ ایمان سے آیاتِ قرآنی سنتے تو پھڑک اُٹھتے۔ ان کے لیے کلامِ الٰہی کا ہر بول شعریت و غنائیت اور معنویت کا ایک نغمۂ سحر انگیز تھا۔ وہ قرآن سُنتے تو مسحور ہو جاتے لیکن وہ چونکہ کلامِ الٰہی کے اندازِ بیان، مجازاتِ بلاغت اور صورتِ معنی سے واقف نہ تھے، اس لیے یہ فیصلہ نہیں کر پاتے تھے کہ وہ کیا ہے؟ ان کا لسانی و جمالیاتی ذوق یہ تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا کہ قرآن مجید شعر و نغمہ کی کوئی صورت ہے یا سحر و کہانت کی۔ ان کا دل اسے کلامِ انسانی ماننے کو بھی تیار نہ تھا کیونکہ انھوں نے ایسا کلام کبھی سُنا نہ پڑھا تھا۔ اگر وہ یہ سب کچھ نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟ اس کا جواب ان کے پاس نہیں تھا۔ ان کے پاس صرف ایک ہی متبادل راستہ رہ جاتا تھا کہ اسے کلامِ الٰہی تسلیم کر لیا جائے، لیکن اس صورت میں انھیں اپنے مذہب و ثقافت، عزیز و اقارب، قبیلے کی حمایت و پناہ، وراثت اور دیگر دُنیوی مفادات سے دست بردار ہونا پڑتا تھا۔ یہ سوچ کر وہ خاموش ہو جاتے۔

قریشِ مکّہ چونکہ اہلِ ذوق تھے، اس لیے اپنے ذوق کی تشفّی کی خاطر وہ قرآن مجید کو سُننے اور سننے کا اشتیاق بھی رکھتے تھے لیکن وہ دوسروں کی نظروں سے بچ کر اسے سُنتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ قرآنِ مجید کا سُننا اسلام کی طرف رغبت و میلان پر دلالت کرتا تھا اور اس سے سامعین معاشرے میں مشتبہ نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا گھر بالخصوص قرآن خوانی کا مرکز تھا۔ اس کے صحن میں مسجد تھی، جہاں مسلمان باجماعت نماز ادا کرتے اور جب قرآن مجید کی قرأت ہوتی تو لوگ چھُپ چھُپ کر سنتے، ان پر ایک عجیب قسم کی کیفیت طاری ہو جاتی، جو خشیّت انگیز بھی ہوتی اور طمانیّت آفرین بھی۔[۵۵]

اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کے پاس قرآن مجید ایک ایسا معجزہ نما ہتھیار تھا، جس کی کاٹ کا قریش کے پاس کوئی مداوا یا توڑ نہ تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ خدائے حیّ و قیّوم کا زندہ، سچا، حسین اور بلیغ کلام ہے۔ جس طرح آواز کا سُر، الفاظ کی شعریت، پھُول کی خوشبُو اور فطرت کا حُسن خود بخود دل میں اُتر جاتا ہے، اسی طرح قرآنِ مجید کے حسین بول اپنے سحرِ حُسن و صداقت اور اعجازِ بلاغت سے خود بخود دلوں میں اتر جاتے ہیں۔ قریش اس راز سے آشنا تھے۔ وہ چونکہ قرآنِ مجید کو اس کی تاثیر و اعجاز سے محروم نہیں کر سکتے تھے، اس لیے ایک منصوبے کے تحت وہ لوگوں کو کلامِ الٰہی

سننے نہیں دیتے تھے۔ آپؐ جب بھی کسی میلے یا حج کے موقع پر یا کسی اجتماع، محفل وغیرہ میں تلاوتِ قرآن فرماتے تو مشرکین ہنگامہ برپا کر دیتے اور لوگوں سے کہتے: (نعوذ باللہ) یہ اللہ کا رسول نہیں، ساحر و دیوانہ ہے۔ مجذوب و مجنوں ہے۔ اس کی ہر بات مجذوب کی بڑ ہے۔ سُنو گے تو اپنے دین سے منحرف ہو جاؤ گے۔[56] لوگ کچھ تو ان کی باتوں سے بدک جاتے اور کچھ عوام کی رائے سے مرعوب ہو جاتے۔

قریش پیغمبرِ اعظم و آخرؐ، دانائے روزگار، حکیمِ عالم کو مجنوں[57] اور آپؐ کے رفقائے تحریک کو، جو اہلِ حُسن و محبت تھے، بے وقوف کہتے تھے[58] حالانکہ وہ خود بے وقوف اور ظالم و جاہل بھی تھے، لیکن انھیں اس کا علم نہ تھا۔ قریش آپؐ کو اس لیے مجنوں سمجھتے کہ آپؐ کو اپنے دُنیوی نفع و نقصان کی کوئی پروا نہ تھی۔ آپؐ کو امارت و حکومت اور مال و دولت کی پیش کش کی گئی جسے آپؐ نے پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ آپؐ کو قتل اور معاشرتی مقاطعہ (سوشل بائیکاٹ) کی دھمکیاں دی گئیں لیکن آپؐ پر ان کا کوئی اثر نہ ہوا۔ جب معاشرتی مقاطعہ ہوا بھی تو آپؐ کے عزم و ہمت میں جنبش تک نہ ہوئی۔ آپؐ نے تن تنہا قریش کی دینی حمیت اور قومی غیرت کو للکارا تھا اور یہ صریحاً اپنی ہلاکت و بربادی کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ قریش کے لیے یہ سب غیر دانشمندانہ بلکہ مجنونانہ حرکات تھیں، وہ چونکہ عشقِ الٰہی اور محبتِ انسانیت کی قوت سے بے خبر تھے، اس لیے عشق کو جنون پر محمول کرتے تھے۔ اسی طرح مسلمانوں کو تحریکِ اسلام کی خاطر ناگفتہ بہ مصائب جھیلتے اور ایثار و قربانی کرتے دیکھتے تو انھیں بے وقوف سمجھتے۔ اصل یہ ہے کہ جو دل اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کی محبت سے خالی ہوتے ہیں وہ زندگی کی غایت و حقیقت اور حقیقی لذتِ زیست سے بھی ناآشنا ہوتے ہیں۔ حقیقت میں یہی لوگ بے وقوف اور ظالم و جاہل ہوتے ہیں۔

قرآنِ حکیم کے بعد جو چیز قریش کے لیے وجہِ پریشانی اور موجبِ انتشارِ ذہنی تھی، وہ آپؐ کی ذاتِ اقدس تھی۔ بعثت سے پہلے آپؐ نے اپنی چالیس سالہ زندگی قریش کے ساتھ گزاری تھی اور وہ زُہد و تقویٰ، حسن و صدق، امانت و دیانت، عدل و احسان اور محبتِ انسانی کا مثالی نمونہ تھی اور آپؐ اسے قریش کے سامنے دلیل کے طور پر پیش کرتے تھے: اور کہو! اگر اللہ کی مشیت یہی ہوتی تو میں یہ قرآن تمھیں کبھی نہ سناتا اور اللہ تمھیں اس کی خبر تک نہ دیتا۔ آخر اس سے پہلے میں ایک عمر تمھارے درمیان گزار چکا ہوں، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟[59]

اہلِ مکہ اس حقیقت سے بھی واقف تھے کہ آپؐ لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے اور آپؐ نے

کبھی کوئی شعر بھی نہ کہا تھا، حالانکہ قریش میں شعر گوئی عام تھی۔ پھر آپؐ قرآن مجید ایسی معجز نما کتاب کیسے تصنیف کر سکتے تھے جو علم و حکمت اور رُشد و ہدایت کا بے مثال سرچشمہ ہے۔ نیز جس شخص نے چالیس برس تک کبھی جھوٹ نہ بولا ہو، وہ اللہ تعالیٰ کے نام پر کیسے جھوٹ بول سکتا تھا؟ یہ وہ سوال تھے جس کا جواب ان کے پاس نہ تھا۔

تیسری چیز جو ان کے لیے دردِ بے درماں تھی، وہ تھی مسلمانوں کی تحریکِ اسلام اور اس کے بانی سے والہانہ محبت۔ ان پر تشدد کیا جاتا، مظالم توڑے جاتے اور لالچ بھی دیا جاتا، مگر انھوں نے اسلام کی جو رسّی پکڑی تھی، اسے کوئی بھی کسی قیمت پر چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھا — قریش جب ظلم و تشدد سے کسی جاں نثار کو بھی اپنے دینِ اسلام سے برگشتہ نہ کر سکے اور نہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کو تحریکِ اسلام سے دست بردار ہونے پر آمادہ نہ کر سکے تو خود تنگ آ گئے اور زچ ہو گئے۔

چنانچہ انھوں نے اسلام کی تحریکِ انقلاب کو بند کرانے کا ایسا منصوبہ بنایا جس میں ایک طرف ان کا اعترافِ شکست و عجز مضمر تھا اور دوسری جانب لالچ کا ایسا سامان مہیا کیا گیا تھا کہ قریش سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اسے کوئی بشر رد کر سکتا ہے۔ انھوں نے نجانے کس طرح اپنے سینوں پر پتھر رکھ کر یہ فیصلہ کیا کہ داعیِ انقلاب کو حکومت و امارت، مال و دولت اور حسین ازدواج و اعلیٰ صہر سب کچھ مہیا کر دیا جائے اور اس کے عوض ان کے معاشرے کو اس انقلاب کے طوفان سے بچا لیا جائے۔ اس دفعہ انھوں نے صرف ایک شخص کو اپنا سفیر بنا کر براہِ راست آپؐ کی خدمت میں بھیجا۔ اس کا نام عتبہ بن ربیعہ تھا اور وہ بڑے ٹھنڈے دل و دماغ کا مالک، خوش گفتار اور معتبر تھا۔ اس نے بڑے اعتماد اور محبت کے انداز میں آپؐ سے پوچھا: محمدؐ! بتاؤ! کیا چاہتے ہو؟ مکے کی ریاست؟ مال و دولت کی کثرت؟ خوبصورت و عالی نسب بیویاں؟ تمھیں سب چیزیں مہیا کی جا سکتی ہیں بشرطیکہ تم ہمارے معبودوں کی مذمت کرنے سے باز آجاؤ، اور ان کی پوجا کرنے والوں کو، جن میں ہمارے واجب الاحترام آباؤ اجداد بھی شامل ہیں، جہنمی کہنا چھوڑ دو۔ آپؐ نے اس پیش کش کے جواب میں قرآن مجید کی تلاوت کرنا شروع کر دی۔ کلام ربِ جلیل کا اور نُطق رسالت مآبؐ کا تھا۔ عتبہ سنتے ہی مسحور ہو گیا۔ آپؐ نے ابھی چند آیات ہی تلاوت فرمائی تھیں کہ عتبہ کا دل جلالِ قرآنی کا حریف نہ ہو سکا۔ قریب تھا کہ اس کا کُفر ایمان میں بدل جاتا کہ اس نے قسمیں دے کر آپؐ کو خاموش کرایا اور بغیر کچھ کہے سُنے لوٹ گیا۔ لیکن اس کا

دل حق کی چوٹ کھا چکا تھا اور اس کی حالت میں نمایاں تبدیلی آگئی تھی۔ چنانچہ اس نے قریش سے جاکر کہا: "حقیقت یہ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کلام پیش کرتا ہے، وہ فی الواقع نہ تو شعر ہے، نہ سحر اور نہ کہانت ہی ہے۔ وہ کوئی اور ہی شے ہے۔ اس سے احسن کلام آج تک میرے کانوں نے نہیں سُنا۔ میری رائے تو یہ ہے کہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ وہ کامیاب ہوا اور عرب پر غالب آگیا تو یہ تمھاری عزت ہوگی، ورنہ عرب خود اس کو ہلاک کردیں گے۔" یہ تجویز نہ تو قریش کے لیے قابلِ قبول ہوسکتی تھی اور نہ ہوئی۔[61]

قریش کی اس پیش کش کو جو ان کے نزدیک عظیم ترین پیش کش تھی، آپ ﷺ کا اس طرح ٹھکرانا اس بات کا ناقابلِ تردید ثبوت تھا کہ آپ سچے نبی ہیں اور آپ ﷺ کا نصب العین (یا مشن) اسلام کی انقلابی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کو کامیاب بنانا تھا۔ عتبہ بن ربیعہ کی تجویز اور قریش کے انکار سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام ان کی نظر میں ایک انقلاب انگیز دینی و سیاسی تحریک تھا۔ دین اصل میں تحریک ہی ہوتا ہے۔ جب تک وہ تحریک رہتا ہے، اس میں زندگی، حُسن اور دوسرے ادیان پر غالب آنے کی قوتِ تسخیر ہوتی ہے، لیکن جب وہ تحریک نہیں رہتا تو وہ حرکی و فعّال بھی نہیں رہتا اور پھر وہ آہستہ آہستہ جمود و تعطّل کا شکار ہوتا جاتا ہے۔

پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم چونکہ افرادِ نسلِ انسانی کے لیے مثالی انسان بن کر مبعوث ہوئے تھے، اس لیے آپ ﷺ کی سیرت ایک انسان کی سیرت ہے، لیکن بہ حیثیتِ پیغمبر آپ ﷺ کا رابطہ براہِ راست اللہ تعالیٰ سے تھا جو علیم و حکیم اور قادرِ مطلق ہے، اس لیے اس کی قدرت سے آپ ﷺ سے کبھی کبھی ایسے ایسے غیر معمولی واقعات بھی ظہور پذیر ہوجاتے تھے جن کے لیے معجزہ کی تعبیر اختیار کی جاتی ہے۔ ایسا ہی ایک غیر معمولی واقعہ عکاظ کے میلے میں ہوا لیکن اس کی تاریخ کا تعین نہ ہوسکا۔ ایک دفعہ تکانہ نامی ایک شہ زور پہلوان وہاں آیا، جس کے نزدیک نبوّت کا معیار شہ زوری تھا۔ اس کی جسمانی قوت کا یہ عالم تھا کہ وہ چمڑے کی کھال پر تن کر کھڑا ہوجاتا اور لوگ کھال کو اس کے پاؤں تلے سے نکالنے کے لیے اتنا زور لگاتے کہ کھال پھٹ جاتی، لیکن اس کے قدموں کے نیچے سے اسے نہ نکال سکتے۔ نبیِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے میں مصروف تھے کہ اس پہلوان نے بھرے مجمع میں آپ ﷺ کو للکارا کہ اللہ تعالیٰ کے نبی ہو تو مجھ سے کشتی لڑو اور پچھاڑ کر دکھاؤ، میں انعام میں اپنی ایک تہائی بکریاں دوں گا۔ بات تو اس کی مضحکہ خیز تھی لیکن جہلاء کے اتمامِ حجّت کی خاطر اور قدرت کا اشارہ پاکر آپ ﷺ

نے اس سے کشتی لڑنا منظور کرلیا۔ آپ ﷺ نے اسے پچھاڑ دیا اور ایک تہائی بکریاں جیت لیں۔ تکانہ پہلوان نے اسے اتفاق پر محمول کرکے پھر للکارا۔ پھر شکست کھائی۔ تیسری بار پھر لڑا اور آپ ﷺ نے اس بار بھی اسے چت کردیا اور اس طرح اس کی تمام بکریاں جیت لیں۔ تکانہ پہلوان کو شکست کی خفت بھی ہوئی اور اسے اپنے کُل مال سے ہاتھ بھی دھونے پڑے۔ وہ جی ہار گیا اور اپنا مال واپس لینے کے لیے گڑگڑانے لگا۔ آپ ﷺ کو تو اس کا دل جیتنا تھا نہ کہ مال! آپ ﷺ تو اپنی نبوّت کا اس کی مرضی کے مطابق ثبوت دینے کے لیے لڑے تھے، لہٰذا آپ ﷺ نے اس کا مال واپس کردیا۔ پہلوان آپ ﷺ کی اس غیر معمولی قوّت و سخاوت سے اتنا مرعوب و متاثر ہوا کہ وہیں کلمہ پڑھا اور تحریکِ اسلام میں شامل ہوگیا۔ اس غیر معمولی واقعہ کا مجمع پر بھی گہرا اثر ہوا اور اس کا چرچا بھی خوب ہوا۔[62]

معجزات کے بارے میں میری رائے تو یہ ہے کہ جس طرح آپ ﷺ کی نبوّت و تحریکِ رحمۃ للعالمینی عالمگیر اور ہر زمان و مکان کے لیے ہے، اسی طرح آپ ﷺ کے معجزے بھی عالمگیر اور ہر زمان و مکان کے انسان کے لیے رحمت ہیں اور وہ اصل میں دو ہیں: قرآن مجید اور آپ ﷺ کی سیرتِ طیبہ، جنھیں عام طور پر کتاب و سُنّت کہا جاتا ہے۔

ہجرتِ حبشہ (رجب ۷ قبل ہجرت / اپریل ۶۱۵ء):

تحریکِ اسلام اپنی عمر کی پانچویں منزل میں پہنچی تو مُشرکینِ مکّہ کی مخالفت اپنے عروج کو پہنچ گئی، لیکن ایمان کا نشہ کچھ ایسا ہوتا ہے کہ ترشیِ جور و جفا سے اور بڑھتا ہے۔ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقائے تحریک لوگوں سے برابر رابطہ قائم کیے ہوئے تھے اور عدم تشدّد کی حکمتِ عملی پر کاربند رہتے ہوئے اسلام کی تحریکِ انقلاب کو کامیابی سے چلا رہے تھے۔ دینی پیشوا، سردار اور مرفہ الحال لوگوں کو اس تحریکِ انقلاب سے جتنی وحشت و نفرت تھی، غلاموں اور مفلوکُ الحال لوگوں کے لیے اتنی ہی اس میں کشش و جاذبیت تھی اور وہ اس میں بتدریج شامل ہوتے جاتے تھے۔ تحریک کی یہ کامیابی بظاہر بہت معمولی اور اس کی رفتار بہت سُست دکھائی دیتی ہے، لیکن حقیقت میں اس کا سیلاب چُپکے چُپکے قریش کے معاشرے کی بنیادوں میں پانی بھرتا اور انھیں کمزور کرتا جارہا تھا۔ قریش کی سیاسی بصیرت اس صورتِ حال کو نہ تو برداشت کرسکتی تھی اور نہ انھوں نے کیا۔ وہ طرح طرح کے حیلے بہانوں، اخلاقی و معاشرتی دباؤ اور تشدّد سے مُسلمانوں

کے حوصلے پست اور انھیں اس تحریک کو بند کرنے پر مجبور کرتے رہے۔

قریش کے استحصالی طبقے مسلمانوں کو نیست و نابود کر دینا تو چاہتے تھے مگر اپنی قبائلی روایات کی مجبوریوں کے سبب ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ مثال کے طور پر خیل یا قبیلے کا سردار اگر کسی شخص کو اپنی جماعت یا پناہ میں لیتا تھا تو چاہے وہ دشمن ہی کیوں نہ ہو' اس پر ہاتھ ڈالنا' اس خیل یا قبیلے کی غیرت و حمیّت کو للکارنے اور دعوتِ مبارزت دینے کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ یہ داعیِ انقلاب پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کا سیاسی تدبّر اور عدمِ تشدّد کی حکمتِ عملی تھی کہ مسلمانوں کو اپنی انقلابی سرگرمیوں کے باوجود مختلف خانوادوں، خیلوں اور قبیلوں کی حمایت و پناہ حاصل ہو جاتی تھی اور اس طرح وہ دشمنوں کے مسلح حملوں سے محفوظ رہتے تھے' لیکن وہ مسلمان جو غلام و محکوم اور کمزور و بے کس تھے اور انھیں کسی کی حمایت و پناہ حاصل نہ تھی' ان پر قریش کی چیرہ دستیاں نقطۂ عروج کو پہنچ گئیں۔ ان مظالم اور مسلمانوں کے بےمثال صبر و استقلال کی داستانیں تاریخ اور کتبِ سیر میں محفوظ ہیں۔

کفّار گوناگوں مصلحتوں اور مجبوریوں کی بنا پر مسلمانوں پر تلوار تو نہ اٹھاتے تھے لیکن ان پر عرصۂ حیات تنگ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت بھی نہیں کرتے تھے۔ ظلم جب حد سے بڑھ گیا تو مشیّت ایزدی کے ایما پر بصیرتِ نبوّت کا فیصلہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کو مکّے سے ہجرت کر جانے کی اجازت دی جائے۔ ابن ہشام ۱: ۳۲۳ میں آپ ﷺ کے الفاظ یہ ہیں :

اگر تم سرزمینِ حبشہ کو نکل جاؤ تو بہتر ہے کہ وہاں کے بادشاہ کے ہاں کسی پر ظلم نہیں کیا جاتا ، اور وہ سرزمینِ صدق ہے' یہاں تک کہ جس تنگیٔ حیات میں تم ہو اس میں اللہ تعالےٰ تمھارے لیے فراخی پیدا کر دے۔[۶۳]

تحریکِ انقلاب میں حصّہ لینے کی وجہ سے مسلمانوں کی زندگی پُر اسرار تھی۔ انھوں نے بڑی رازداری سے ہجرت کی تیاری کی اور شعیبہ (موجودہ جدّہ) پہنچ کر دو تجارتی جہازوں کے ذریعے حبشہ روانہ ہو گئے۔ قریش کو خبر ہوئی تو وہ تعاقب میں نکلے لیکن بندرگاہ پر پہنچنے سے پہلے ہی جہاز کھلے سمندر میں جا چکے تھے۔

مہاجرین کی یہ پہلی جماعت تھی جس میں مفصلۂ ذیل گیارہ مرد اور چار عورتیں تھیں :

(۱) حضرت عثمان بن عفّان رض (ذوالنّورین)' (۲) ان کی زوجہ محترمہ حضرت رقیہ رض بنت رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم (۳) حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رض (۴) حضرت مصعب بن عمیر رض (۵) حضرت

ابو حذیفہ بن عتبہ رض (۶) ان کی زوجہ حضرت سہلہ بنت سہیل رض (۷) حضرت زبیر بن العوام رض (۸) حضرت عثمان بن مظعون جمحی رض (۹) حضرت ابو سلمہ بن عبدالاسد مخزومی رض (۱۰) ان کی زوجہ حضرت امّ سلمہ بنت ابی امیہ رض (۱۱) حضرت عامر بن ربیعہ رض (۱۲) ان کی زوجہ حضرت لیلیٰ بنت ابی حثمہ رض (۱۳) حضرت ابو سبرۃ بن ابی اہم رض یا حضرت (ابو) حاطب بن عمرو رض (۱۴) حضرت سہیل بن بیضا رض اور (۱۵) حضرت عبداللہ بن مسعود رض۔[۶۴]

قریش کی سیاسی بصیرت تحریکِ اسلام میں وسعت پذیری کے امکان کو واضح طور سے دیکھتی تھی، نیز وہ مسلمانوں کو خطرناک قسم کے انقلابی سمجھتے اور ان کی انقلابی تبلیغی سرگرمیوں سے خائف تھے' اس لیے وہ تحریکِ اسلام کو مکّے ہی میں محصور و مقیّد کر کے ختم کر دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ مسلمان مہاجرین کے حبش چلے جانے کا انھیں سخت غم و غصہ تھا۔ ابھی وہ انتقامی کارروائی کرنے کی سوچ ہی رہے تھے کہ مسلمانوں کی ایک اور جماعت جو ۸۳ مردوں اور ۱۸ عورتوں پر مشتمل تھی' قریش کی نظروں سے بچ کر کشتیوں کے ذریعے حبش پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس جماعت میں پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کے چچیرے بھائی حضرت جعفر طیّار رض بھی تھے۔

مسلمانوں کی دو مرتبہ ہجرت اور قریش کی دوہری ناکامی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ ﷺ کی تربیت سے مسلمان سچّے انقلابی اور زیرِ زمین سرگرمیوں میں ماہر بن چکے تھے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قریش معاشرتی ، معاشی اور سیاسی دباؤ ، معاشرتی مقاطعہ ، ظلم و تشدّد اور سیاسی چالوں کے باوجود تحریکِ اسلام کو ناکام نہ بنا سکے اور نہ ان میں جمود و تعطّل ہی پیدا کر سکے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کی تعداد بڑھتی رہی اور تحریکِ اسلام بتدریج نشو و ارتقا کرتی رہی۔ بہر حال اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قریش سیاسی بصیرت رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ کسی حال میں بھی اسلام کی انقلابی تحریک کو اپنے حلقۂ اثر سے باہر جانے کی اجازت دینے پر تیار نہ ہو سکتے تھے اور نہ ہوئے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ جانتے تھے کہ اس کا مطلب تحریکِ اسلام کو آزاد فضا میں پھلنے پھولنے اور مضبوط و توانا ہونے کا موقع دینا ہے۔ یہ ان کے سیاسی تدبّر کا فیصلہ تھا اور تاریخ نے بعد میں ثابت کر دیا کہ ان کا فیصلہ درست تھا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جونہی تحریکِ اسلام مدینے پہنچی اور اسے آزاد ماحول میسّر آیا' اس نے دیکھتے ہی دیکھتے اس قدر قوّت و توانائی حاصل کر لی کہ مسلمانوں نے قریش کی فوج اور وسائلِ حرب کی کثرت کے باوجود ان کو بدر میں شکست دی اور اپنی قوّت کا لوہا منوا لیا۔

بہر حال اس صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے قریش کی مجلسِ شوریٰ کا اجلاس ہوا اور

یہ فیصلہ ہوا کہ مسلمانوں کو واپس لانے کے لیے حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے پاس ایک سفارت بھیجی جائے۔ چنانچہ عبداللہ بن ربیعہ اور عمرو بن العاص (فاتح مصر) نجاشی اور اس کے درباریوں کے لیے بیش بہا تحائف لے کر حبشہ پہنچے۔ انھوں نے پہلے درباریوں اور پھر ان کی وساطت سے نجاشی کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ مسلمانوں نے ایک ایسا دین ایجاد کیا ہے جو نصرانیت اور ان کے آبائی دین (بُت پرستی) دونوں کے خلاف ہے۔ وہ چونکہ ان کے ہم قوم اور مرتد ہیں، اس لیے انھیں ان کے حوالے کر دیا جائے کہ وہ انھیں اسیر بنا کر واپس مکے لے جائیں۔

نجاشی ایک صاحبدل و عدل پسند عیسائی حکمران تھا۔ اس نے قریش کے الزامات کا جواب دینے کے لیے مسلمانوں کو دربار میں بُلوایا اور انھیں اپنے دین و موقف کی وضاحت کا موقع دیا۔ مسلمانوں کی نمایندگی حضرت جعفر طیارؓ (حضرت علیؓ کے بھائی) نے کی۔ انھوں نے کہا:

"اے بادشاہ! ہماری قوم کی یہ حالت تھی کہ ہم سب جاہل تھے۔ بتوں کی پرستش کرتے، مُردار کھاتے، بُرے کام کرتے، رشتے ناتے توڑ دیتے، پڑوسیوں سے بُرا سلوک کرتے اور ہم میں سے طاقتور کمزور کو کھا جاتا تھا۔ ہماری یہ حالت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ہم میں سے ایک شخص کو ہماری جانب رحم دل بنا کر بھیجا، جس کے نسب، صداقت، امانت داری اور پاکدامنی سے ہم واقف تھے۔ اس نے ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف آنے کی دعوت دی کہ ہم اسے احد مانیں اور فقط اسی کی عبادت کریں۔ ہم اور ہمارے بزرگوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر پتھروں اور بتوں کی جو پرستش اختیار کر رکھی تھی، اسے ترک کر دیں۔ اس رسول نے ہمیں سچ بولنے، امانت ادا کرنے، صلۂ رحمی کرنے، ہمسایوں سے حُسنِ سلوک کرنے کا حکم دیا اور حرام کاری اور قتل و خون ریزی کرنے، نیز بدی کرنے، جھُوٹ بولنے، یتیم کا مال کھانے اور پاک دامن عورتوں پر تُہمت لگانے سے منع فرمایا۔ اس نے ہمیں حکم دیا کہ فقط ایک اللہ کی عبادت کریں اور اس میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اس نے ہمیں صلوٰۃ و زکوٰۃ و صوم کا حکم دیا۔" غرض انھوں نے نجاشی کے سامنے اسلام کے جُملہ احکام بیان کر دیے اور کہا: ہم نے اس رسولؐ کی تصدیق کی اور اس پر ایمان لائے..... اس پر ہماری قوم نے ہم پر ظلم و تشدّد کیا۔ اس نے ہمیں اذیتیں دیں اور ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم پھر بُت پرستی کی طرف لَوٹ جائیں۔ اس نے جب ہم پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تو ہم نے آپ کے ملک میں پناہ لی۔ امید ہے آپ ہم پر ظلم نہیں ہونے دیں گے۔

حضرت جعفرؓ کی یہ گفتگو سُن کر نجاشی نے کہا: تمھارے رسُول پر جو کلام نازل ہُوا ہے

اس میں سے کچھ سُناؤ۔ انھوں نے سُورۂ مریم کی ابتدائی آیات تلاوت کیں۔ نجاشی پر رقّت طاری ہو گئی اور آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ اس نے کہا: بیشک یہ چیز (یعنی قرآن مجید) اور وہ چیز جو عیسیٰؑ لائے ہیں (یعنی انجیل)، دونوں ایک ہی چراغ کی روشنیاں ہیں۔ پھر اس نے قریش کے سفیروں سے کہا: میں یہ مظلوم تمھارے حوالے نہیں کروں گا۔

دوسرے دن عمرو بن العاص نے دربار میں پھر رسائی حاصل کر لی اور نجاشی اور درباریوں کو مشتعل کرنے کی خاطر بادشاہ سے عرض کیا کہ حضرت عیسیٰؑ سے متعلّق مسلمانوں کا عقیدہ معلوم کیجیے، پھر فیصلہ دیجیے۔ نجاشی نے مسلمانوں سے یہ دریافت کیا تو حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے جواب دیا: قرآن مجید میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ بن مریم اللہ تعالیٰ کے بندے، اس کے رسُول اور اس کی رُوح ہیں... نجاشی نے ایک تنکا اُٹھا کر کہا: واللہ، جو کچھ تم نے کہا، حضرت عیسیٰؑ اس سے سرِ مُو زیادہ نہیں ہیں۔ پھر اس نے قریش کے دونوں سفیروں کو ان کے تحائف واپس دے کر لوٹا دیا۔[۶۶]

سیاست کے خارجی محاذ پر قریش کی یہ پہلی ذلّت آمیز شکست اور تحریکِ اسلام کی پہلی اہم کامیابی تھی۔ اس سے اسے بیرونی دُنیا میں ایک آزاد ماحول میسّر آیا، مسلمانوں کو قومی تشخّص حاصل ہوا اور ان کی قریش و عرب سے علیٰحدہ و منفرد قومیت تسلیم کر لی گئی۔

اس سے اسلام کے فلسفۂ قومیت کا یہ اصل الاصول واضح ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کی قومیت کی اساس وطن، خیل یا قبیلہ وغیرہ نہیں بلکہ دینِ اسلام ہے اور اسلام کی اساس نبوتِ آخرؐ پر استوار ہے۔

افواہ کتنی ہی ساقط الاعتبار کیوں نہ ہو، پھیلتی ہے تو معتبر بنتی چلی جاتی ہے اور اس کے اکثر بُرے نتائج نکلتے ہیں۔ مسلمانوں کو حبشہ میں چین سے رہتے کچھ دن ہی گزرے تھے کہ یہ افواہ پھیل گئی کہ کفارِ مکّہ نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اس سے زیادہ مسلمانوں کو اور کیا خوشی ہو سکتی تھی، چنانچہ انھیں دفورِ مسرت میں اس کی تصدیق بھی گوارا نہ ہوئی اور ان میں سے بیشتر مکے واپس ہوئے۔ لیکن اس کے نواح میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ افواہ غلط تھی۔ کچھ مسلمان تو حبشہ لوٹ گئے اور باقی چھُپتے چھپاتے شہر میں داخل ہوئے اور اپنے اعزّہ و اقارب کی حمایت و پناہ میں آ گئے۔

تحریکِ اسلام کے حبشہ جانے اور وہاں اپنی سفارت کے ناکام ہو جانے کا قریش کو سخت رنج اور غصّہ تھا۔ انھوں نے مسلمانوں پر پہلے سے بھی زیادہ ستم توڑنے شروع کیے اور

ان کی زندگی اجیرن کر دی، لہٰذا ان میں سے ایک سو بارہ افراد' جن میں اٹھارہ عورتیں بھی شامل تھیں' حبشہ کوچ کر گئے۔[۶۷] پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچے تو وہ حبشہ سے وہاں پہنچ گئے۔ کچھ مسلمان بعض وجوہ کی بنا پر پیچھے رہ گئے تو آپؐ نے انھیں، ہجری میں اپنے پاس بلا لیا۔[۶۸]

قریش نے اپنی اس ذلت آمیز ناکامی کے بعد اسلام کی تحریکِ انقلاب کو ظلم و تشدد بلکہ ہر ممکن حربے سے کچل دینے کا عزم بالجزم کر لیا۔ آپؐ اور آپؐ کے رفقائے تحریک پر ان کا ظلم و تشدد کیفیت و کمیت دونوں میں بڑھتا چلا گیا' خصوصاً ان مسلمانوں پر جو ان کے غلام' زیر دست یا محکوم تھے۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ انسان کو غلامی سے نجات دلانا اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کا ایک بنیادی مقصد تھا اور ہے، کیونکہ وہ زندۂ جاوید دین ہے۔ وہ تحریک مرفہ الحال اور استحصالی طبقوں کے لیے اس لیے رحمت تھی کہ وہ انھیں کِبر و تجبر اور پیشوائیت کے، اور باطل عقاید و رسوم کے، نیز نفسانی خواہشات کے بتوں کی غلامی سے نجات دلانا چاہتی تھی۔ غلاموں، غریبوں، محنت کشوں، کمزوروں، بیکسوں اور عورتوں کے لیے اس لیے رحمت تھی کہ انھیں ہر قسم کے استحصالی طبقوں اور قوتوں کی، نیز ہر قسم کے اصنام کی غلامی سے رہا کرانا اس کی غایتِ حقیقی تھی' اور ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ دین کی جس زمان و مکان میں بھی تحریک اُٹھی' اس کا بُنیادی مقصد بنی نوعِ انسان کو جھوٹے معبودوں اور استحصالی طبقوں کی محکومی و غلامی سے نجات دلانا اور انھیں معاشرے میں عبدیت کے بلند ترین مقام پر متمکن کرنا تھا۔ اصل یہ ہے کہ عبدیت کے مقام پر پہنچنا ہی اِنسانیت کی معراج ہے۔

یہ تو تھا جملۂ معترضہ' بہرحال مسلمانوں پر قریش کا ایک طرف جور و ستم بڑھتا گیا' دوسری طرف تحریک اسلام ان کے اندر کامیابی سے سرایت کرتی چلی گئی۔ حق متحرک ہو جائے تو باطل اس کی راہوں کو مسدود نہیں کر سکتا۔ چنانچہ وہ اسلام کی تحریک کی راہ بھی مسدود نہ کر سکا۔

تحریکِ اسلام کو چلتے چلتے چھ برس گزر گئے۔ اسے ہر راہِ پُرخار سے گزرنا اور ہر سدِّ سکندری کو عبور کرنا پڑا۔ مسلمان جو آزادی و رحمت کے علمبردار تھے' ان پر مسلسل مظالم توڑے جا رہے تھے، لیکن بانیِ تحریکِ اسلام نے جواب میں کوئی انتقامی کارروائی نہ کی بلکہ ہر تشدد اور جور و جفا کو صبر و تحمل سے برداشت کیا۔ دشمنوں نے اشتعال دلانے کا کوئی موقع ہاتھ سے

جانے نہ دیا، لیکن آپؐ نے بھی حلم و بُردباری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ آپؐ پر حملہ ہوا اور آپؐ ہی کی خاطر آپؐ کے ایک جاں نثار رفیقِ تحریک کو حرم کعبہ میں شہید کر دیا گیا لیکن آپؐ نے کوئی انتقامی کارروائی نہ کی، حتیٰ کہ احتجاج تک نہ کیا۔ یہ نہیں کہ آپؐ کے جاں نثاروں میں انتقام لینے کی ہمت و جرأت نہ تھی، یا خفیہ طریقے سے انتقامی کارروائی کرنے کا ان میں حوصلہ نہ تھا۔ وہ تو آپؐ کے ایک اشارے پر جان و مال سب کچھ قربان کر دینے کو تیار تھے بلکہ وہ تو اس کو سب سے بڑی سعادت سمجھتے اور اس کے منتظر رہتے تھے۔ شہادت تو ان کی مطلوب و مقصود تھی۔ بات دراصل یہ تھی کہ آپؐ کا سیاسی تدبر اس مرحلے پر اسلام کی تحریکِ اِنقلاب کے لیے اصول "ستیز" کو ناموزوں اور اصول "ساز" کو موزوں سمجھتا تھا اور تاریخ آپؐ کے اس مدبرانہ فیصلے کی موزونیت یا حکمتِ عملی کی کامیابی کا ایک زندہ ثبوت ہے۔ ان اصولوں کو اُردو اور انگریزی میں علی الترتیب تشدد (Violence) اور عدمِ تشدد (Non-violence) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آپؐ کی تحریک جب تک "لا" کی راہ و منزل میں رہی' عدمِ تشدد کے اصول پر کاربند رہی، لیکن جب وہ یہ منزل عبور کر کے "اِلّا" کی راہ و منزل میں پہنچی اور اس میں مسلح تصادم کی قوت پیدا ہوئی تو اسے لامحالہ اصولِ تشدد کو اپنانا پڑا۔[۶۹]

ہمیں اس ضمن میں یہ اہم نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام کی تحریک چونکہ رحمۃ للعالمینی تھی اس لیے اس کا اصولِ تشدد اور اصولِ عدمِ تشدد دونوں ذریعۂ رحمت تھے۔ جور و جفا کے مقابلے میں آپؐ کی عدمِ تشدد کی حکمتِ عملی کے ساتھ ساتھ بعض اچھے اور غیر متوقع نتائج بھی نکلتے رہے۔

حضرت حمزہؓ کا تحریکِ اسلام میں شامل ہونا (۷ قبل ہجرت / ۶۱۶ ء)

دشمنانِ اسلام میں ابوجہل آپؐ کی مخالفت و دشنام طرازی میں آگے آگے رہتا تھا۔ ایک روز اس نے آپؐ کے سامنے آپؐ کی تضحیک و دشنام طرازی کی اور سخت اذیت پہنچائی۔ اتفاق سے اس کی خبر حضرت حمزہؓ کو ہوئی، جو آپؐ کے چچا اور رضاعی بھائی بھی تھے۔ دونوں نے ثوبیہ کا دُودھ پیا تھا۔ حضرت حمزہؓ کو آپؐ سے بہت محبت تھی۔ ابوجہل کے تشدد اور آپؐ کے حلم و مظلومیت یعنی عدم تشدد کا ان پر اتنا شدید اثر ہوا کہ وہ سیدھے ابوجہل کے پاس گئے جو اس وقت حرمِ کعبہ میں تھا۔ حضرت حمزہؓ نے دیکھتے ہی اس کے سر پر اتنے زور سے کمان ماری کہ اسے زخمی کر دیا اور ساتھ ہی اسے للکارا کہ میں مسلمان ہوتا ہوں۔ کسی میں ہمت ہے

تو ہاتھ ڈالے۔ پھر وہ آپؐ کے پاس گئے اور کہا : "بھتیجے ! میں نے ابوجہل سے تمھارا بدلہ لے لیا ہے۔" بڑے انسان کی باتیں بھی بڑی ہوتی ہیں۔ یہ سُن کر آپؐ نے جو دورِ "لا" یا دَورِ عدم تشدد میں سے گزر رہے تھے، فرمایا : "مجھے بدلے سے کیا خوشی ہو سکتی ہے ؟ خوشی تو تب ہو گی کہ مسلمان ہو جاؤ !" دلِ حمزہؓ تو پہلے ہی متاثر تھا، آپؐ کے اس جواب نے اس میں جمالیاتی لمحہ پیدا کر دیا اور وہ مسلمان ہو کر تحریکِ اسلام میں شامل ہو گئے۔[۱] حضرت حمزہؓ بڑے جواں مرد اور بارُعب شخصیت کے مالک تھے۔ تحریکِ اسلام کو ان کی شمولیت سے بڑی تقویت ملی۔ تین ہی دن بعد تحریکِ اسلام کے ساتھ اس قسم کا ایک اور اہم واقعہ پیش آیا۔

معروض تمنائے رسالتؐ، حضرت عُمرِ فارُوقؓ تحریکِ اِسلام میں :

(۷ قبل ہجری / ۶۱۶ء)

حضرت عمر بن الخطابؓ اور ابوجہل مکّے کی دو ایسی نامور شخصیتیں تھیں جن کے متعلق دانائے راز و ختمِ رُسل صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بصیرت کا فیصلہ یہ تھا کہ ان میں سے جو بھی مُسلمان ہو جائے اس سے تحریکِ اسلام کو غیر معمولی فائدہ پہنچے گا۔ چنانچہ آپؐ اکثر دُعا فرمایا کرتے تھے : اَللّٰھُمَّ اعز الاسلام باحد العمرین (یااللہ ! عمر بن الخطاب یا عمر بن ہشام سے اِسلام کو تقویت پہنچا)۔ چنانچہ آپؐ کی آرزو دُعا بنی تو ربّ علیم و حکیم کی مشیّت یہ ہوئی کہ حضرت عُمرِ فاروقؓ کو اسلام کی خدمت کی توفیق دی جائے اور آپؐ کا حلقہ بگوش بنا دیا جائے۔ حضرت عُمرِ فاروقؓ زعمائے قریش میں سے تھے اور مکّے کی معدودے چند پڑھی لکھی، معزّز اور اہلِ اثر و رسُوخ شخصیتوں میں سے تھے۔ قریشِ مکّہ کی شہری مملکت کی طرف سے بیرونی ممالک کے ساتھ سفارتی تعلقات اُستوار کرنے کا منصب انھیں حاصل تھا، اور یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ علاوہ ازیں، وہ بڑی بارُعب شخصیت کے مالک تھے اور اپنی طاقت و شجاعت کے لیے مشہور تھے۔ تحریکِ اسلام کا چرچا ہوا تو ان کے بہنوئی حضرت سعیدؓ بن زید اور ان کی زوجہ حضرت فاطمہؓ بنت الخطّاب، نیز ان کے قبیلے کا ایک اور شخص، جس کا نام نعیم عبداللہ تھا، ایمان لائے اور تحریکِ اسلام میں شامل ہو گئے، لیکن قریش، خصوصًا حضرت عمرؓ کے ڈر سے انھوں نے یہ بات ظاہر نہ کی۔ ان تازہ واردانِ اسلام کو قرآن مجید کی تعلیم دینے کے لیے حضرت خبابؓ بن الارتّ مقرر تھے جو حضرت سعید بن زیدؓ کے گھر جایا کرتے تھے۔

قریش پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کی انقلابی سرگرمیوں سے سخت تنگ آ چکے تھے، لیکن ان کے پاس اس کا کوئی مداوا نہ تھا اور نہ ان کے پاس اسلام کے عقایدِ جلیلہ و محرّکہ کا کوئی توڑ ہی تھا۔ اسلام نے ان کے باطل دین کو جو چیلنج دیا تھا، اس کا وہ حریف نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہوا۔ بساطِ مذہب و سیاست پر آپؐ نے قریش کو ایسی شہ دے رکھی تھی کہ اس سے بچنے کی انھیں کوئی مؤثّر تدبیر نہیں سُوجھتی تھی۔ وہ اس طرح زچ ہو گئے تھے کہ ان کے پاس چلنے کی ایک ہی چال رہ گئی تھی اور وہ یہ تھی کہ آپؐ کے وجودِ مبارک ہی کو ختم کر دیا جائے۔ لیکن یہ چال چلنے کی ان میں جرأت و ہمّت نہ تھی، کیونکہ اس سے انھیں بنو ہاشم ایسے معزّز اور صاحبِ اثر و رسُوخ قبیلے کے انتقام (ثار) اور خانہ جنگی کا خطرہ مول لینا پڑتا تھا، لیکن اس کے باوصف ان کی خواہش یہی تھی کہ کوئی شخص یہ مہم سر کر ہی ڈالے۔ چنانچہ ایک مجلس میں زعمائے قریش میں کسی نے یہ طعنہ بھی دیا کہ کوئی شخص ایسا نہیں ملتا جو آپؐ کا کام تمام کر دے اور اس کے لیے انعام بھی مقرر کیا۔ نجانے حضرت عمرؓ نے انعام کے لالچ میں آ کر یا اس طعنے کو اپنی عزّت و شجاعت کے لیے چیلنج سمجھ کر آپؐ کو شہید کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس ارادے سے مسلّح ہو کر گھر سے نکلے اور بیت الارقم کا رُخ کیا جہاں آپؐ تشریف فرما تھے۔ انھیں کیا خبر تھی کہ وہ جس عظیم ہستی کو شہید کرنے نکلے ہیں، اسی کے دامِ محبت کے اسیر ہو کر رہ جائیں گے اور انجامِ کار خود ہی شہیدِ محبت ہو کر زندۂ جاوید ہو جائیں گے۔ حضرت عمرؓ خون کی نیّت سے نکلے تھے، اس لیے ان کی آنکھوں میں خُون اتر آیا تھا اور تیور بدل چکے تھے۔ حسنِ اتفاق سے راستے میں اُن کی مڈبھیڑ حضرت نعیم بن عبداللہؓ سے ہوئی، جنھوں نے حضرت عمرؓ کا عندیہ معلوم کر کے طنزًا کہا : بیت الارقم جانے سے پہلے اپنے گھر کی خبر لو کہ تمھاری بہن اور بہنوئی دونوں مسلمان ہو چکے ہیں۔ یہ طعنہ کارگر ثابت ہوا۔ انھیں بڑی غیرت آئی اور غیظ و غضب کے عالم میں اسی وقت اپنی بہن کے گھر آئے۔ اندر حضرت خبابؓ بن الارتّ تلاوتِ قرآن کر رہے تھے۔ اس آواز میں کلامِ الٰہی کی رُوح تھی، جو حضرت عمرؓ کے دل کی دنیا میں برق کی طرح لہرائی۔ وہ باذوق تھے، تاڑ گئے کہ یہ انسان کا کلام نہیں ہو سکتا، یقینًا یہ وہ کلام ہے جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کلامِ الٰہی کہتے ہیں۔ حضرت عُمرؓ نے دستک دی۔ اہلِ خانہ پہچان گئے کہ حضرت عمرؓ ہیں اور ڈر گئے۔ حضرت خبابؓ اندر کوٹھڑی میں چھُپ گئے۔ بہن نے جلدی سے اوراقِ قرآن ران کے نیچے چھُپا لیے اور بہنوئی نے دم سادھ لیا۔ حضرت عمرؓ نے ان کے تیوروں سے پہچان لیا کہ وہ مسلمان ہو چکے

ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے بہنوئی حضرت سعید بن زیدؓ پر پل پڑے۔ حضرت فاطمہؓ جلدی سے شوہر کے آڑے آئیں تو حضرت عمرؓ نے طیش میں آکر انھیں بھی زخمی کر دیا۔ بہن بھی آخر حضرت عمرؓ کی تھی، بولی:
قد اسلمنا وتابعنا محمداً فافعل ما بدالك : (ہم مسلمان ہو چکے ہیں اور محمد (رسول اللہ) کی پیروی کرتے ہیں) اب جو جی میں آئے کر گزر۔

مظلوم کے الفاظ میں عزمِ حق کا ایسا جلال تھا کہ حضرت عمرؓ کا دل اس کا حریف نہ ہو سکا۔ پھر بہن کا خون دیکھ کر دل پر ایسی ضرب لگی کہ شفقت کا سوتا پھوٹ پڑا اور رقت طاری ہو گئی۔ فرمایا: اچھا، جو تم پڑھ رہے تھے، مجھے بھی دکھاؤ۔ بہن بولی: کلامِ الٰہی مطہر و طیب ہے، پہلے غسل کر کے پاک ہو جاؤ، پھر ملے گا۔ حضرت عمرؓ کی قساوت چونکہ سعادت میں بدل چکی تھی، لہٰذا اُنھوں نے غسل کیا اور قرآن مجید پڑھنا شروع کیا۔ ہر آیت ان کے لیے اعجازِ بلاغت اور اثر میں ڈوبی ہوئی تھی اور دل کی گہرائیوں میں اُتری جاتی تھی۔ خشیتِ الٰہی سے دل کانپنے لگا اور بدن پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اس سے ان کی صدفِ دل وا ہو گئی اور ساتھ ہی کلامِ الٰہی کے بارانِ نور سے گوہر دار بن گئی۔ ان کی زندگی میں یہ جمالیاتی لمحہ کیا آیا کہ ان کی کایا پلٹ گئی۔ حضرت عمرؓ مسلمان ہونے کے لیے تیار ہو گئے، اور حضرت خبابؓ ان کو لے کر بیت الارقم کو چلے۔

وہ دل جو پہلے قساوت میں سنگِ خارا تھا، اب سعادت سے معمور تھا۔ وہ عقل جو ذرا پہلے تک قتل کے منصوبے بنا رہی تھی، اب اسیرِ محبت بننے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ وہ آنکھ جو کفر و شرک کی وجہ سے اندھی تھی، اب نورِ ایمان سے روشن ہو چکی تھی۔ وہ قدم جس ہستی کا خون بہانے کے لیے اُٹھے تھے، اب اسی کو نذرانۂ دل و جان پیش کرنے کے لیے اُٹھ رہے تھے۔ وہ جو کشت و خون کی راہ تھی، اب عشق و وفا کی راہ تھی۔ منزل اب بھی وہی تھی لیکن اب وہ قتل گاہ نہیں، حسن مآب تھی۔ حضرت عمرؓ کا اب دل اور، نگاہ اور، اِلٰہ اور، نیز مطمحِ نظر اور تھا۔ فرطِ اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ راستہ مختصر ہونے کے باوجود ختم ہونے ہی کو نہ آتا تھا۔ شوق کا ایک ایک لمحہ ماہ و سال کی طرح طولانی تھا۔ محبّت میں فراق کی ہر آن آنِ جاودانی بن چکی تھی۔ مسافت کے مختصر لمحات دل کی دنیا میں صدیوں کی صورت گزر رہے، دل کا تزکیہ کر گئے اور بدیوں کو نیکیوں میں تبدیل کر گئے۔ منزلِ شوق آئی تو حضرت عمرؓ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ دروازے پر دستک دی۔ اندر اہلِ حسن و سرور کی محفل ذکرِ الٰہی اور فکرِ اسلام سے گرم تھی۔ انھوں نے جھانک کر دیکھا تو دروازے پر حضرت عمرؓ کھڑے تھے۔ محفل پر خوف سا طاری ہو گیا، لیکن بصیرتِ نبویؐ نے دیکھ لیا تھا کہ شکاری خود ہی

شکارِ محبت بن کر آیا ہے، لہٰذا حکم ہوا کہ دروازہ کھول دو۔ حضرت عمرؓ اگرچہ شمشیر بداماں تھے لیکن رحمۃ للعالمینؐ بے خوف و خطر اُٹھے اور آگے بڑھ کر ان کے دامن کو تھام لیا اور پھر زور سے جھٹک کر فرمایا: ابن الخطّاب! کس ارادے سے آئے ہو؟ حضرت عمرؓ کی زبان سے بیساختہ نکلا: ایمان لانے۔ یہ جواب آپؐ کے قلبِ مطہر پر برقِ مسرت بن کر لہرایا اور جوشِ مسرت سے آپؐ کی زبانِ مبارک سے بیساختہ نعرۂ تکبیر نکلا، اور ساتھ ہی اہلِ حسن و سرور نے اس زور سے اللہ اکبر کا نعرہ مارا کہ مکے کی فضا گونج اُٹھی۔ اہلِ مکہ کے دل نامعلوم خوف سے کانپ اُٹھے لیکن رُوحِ انسانیت فرطِ طرب سے جھوم اُٹھی، کیونکہ اس "نو نیازِ عشق" کو خلیفہ بن کر مشرقِ وسطیٰ کے مظلوم اور دُکھی انسانوں کو وقت کے فرعونوں، ہامانوں اور قارونوں کی غلامی و محکومی سے نجات دلانی تھی۔

حضرت عمرؓ کے ایمان لا کر تحریکِ اسلام میں شامل ہونے سے مسلمانوں کے حوصلے میں اس قدر توانائی پیدا ہو گئی کہ وہ ان کی معیت میں حرمِ کعبہ میں گئے اور مجاوروں اور پجاریوں کی مزاحمت کے باوجود وہاں باجماعت نماز پڑھی۔[۲۱]

تاریخی بصیرت رکھنے والے اہلِ علم و تحقیق جانتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے ایمان لانے سے تحریکِ اسلام کو جو تقویت پہنچی اس کی اہمیت اس سے بہت زیادہ ہے جو عام طور سے سمجھی اور بیان کی جاتی ہے۔ چنانچہ پروفیسر آرنلڈ لکھتے ہیں:

"حضرت عمرؓ کا ایمان لانا ایک ایسا واقعہ ہے جس سے تاریخِ اسلام کا رُخ ہی بدل گیا۔ مسلمان اب اس قابل ہو گئے کہ وہ زیادہ جرأت سے کام لے سکیں"۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ارقم کا گھر چھوڑ دیا اور مسلمانوں نے کعبے کے سامنے علانیہ نماز باجماعت شروع کر دی۔ یہ صورتِ حال ایسی تھی کہ رؤسائے مکہ کو اس سے خوف پیدا ہونا ایک فطری امر تھا کیونکہ اب ان کا مقابلہ ایک مظلوم اور حقیر گروہ کے ساتھ نہیں تھا جو عاجزی اور بے کسی کی زندگی بسر کر رہے تھے، بلکہ ایک طاقتور جماعت کے ساتھ تھا، جس میں روز بروز بااثر اور بارسوخ شہریوں کا اضافہ ہو رہا تھا۔"[۲۲]

حواشی و تشریحات

(۱) النجم ۵۳ : ۳-

(۲) عوامی رابطہ : Mass contact

(۳) ابن ہشام : سیرۃ، ا تا ۲۵۷ تا ۲۶۶ ببعد۔

(۴) البقرہ ۲ : ۲۵۶-

(۵) ابن ہشام، موضوع مذکور۔

(۶) Spontaneous

(۷) ابن ہشام، ا : ۲۶۷۔ بخاری، در مشکوٰۃ، باب مناقب ہٰؤلاء الثلٰثۃ، ح ا۔

(۸) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : جس کسی شخص نے ہم کو کچھ دیا ہے، ہم نے اسے اس کا بدلہ دے دیا ہے، سوائے ابوبکرؓ کے کہ اس نے ہمارے ساتھ اس قدر احسان و کرم کیا ہے کہ اس کا بدلہ قیامت کے دن اللہ ہی دے گا۔ کسی شخص کے مال و دولت نے مجھے اتنا زیادہ فائدہ نہیں پہنچایا جتنا ابوبکرؓ کے مال و دولت نے پہنچایا ہے۔ (ترمذی در مشکوٰۃ، باب مناقب ابی بکرؓ ح ۸)۔

(۹) محب الطبری : ریاض النضرۃ، مطبوعہ مصر، ص ۵۷، شبلی، ا : ۲۰۶-

(۱۰) ابن ہشام : سیرۃ، ا : ۲۲۷-

(۱۱) محمد حمید اللہ : رسولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی، ص ۹۸، موضوع مذکور۔

(۱۲) Directions

(۱۳) ابن ہشام، ا : ۲۸۱-

(۱۴) محسن اور نفسِ مطمئنہ کی قرآنی اصطلاحات کی رعایت سے "اہلِ حسن و سرور" کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

(۱۵) اصل میں ہے : وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِىْ فِى الصَّلٰوة : (احمد، نسائی در مشکوٰۃ، کتاب الرقاق، باب فضل الفقراء.....، ح ۵۰)۔

(۱۶) آپؐ سے سوال کیا گیا کہ ما کان صفۃ تعبدہٗ؟ (آپؐ کی عبادت کی نوعیت کیا تھی؟) آپؐ کا جواب یہ ہے : بالتفکّرِ والاعتبار : (غور و فکر اور عبرت پذیری) (عینی : شرحِ بخاری، ا : ۶۷)۔

(۱۷) رحمۃ للعالمین، ا : ۴۹

(۱۸) ابن ہشام، ا : ۳۸۱، شبلی، ا : ۲۰۶ ببعد-

(۱۹) حضرت الارقمؓ صحابی کا مکان (بیت الارقم) کعبے کے بالکل قریب کوہِ صفا پر تھا۔ اس میں کافی گنجائش تھی۔ ترکی دورِ حکومت میں، نیز موجودہ سعودی دور میں، اس کی مرمت و تزئین بھی کی گئی ہے۔ دیکھیے محمد حمید اللہ، وہی کتاب، ص ۱۰۰ ببعد۔

(۲۰) اصل میں ہے : وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ٥ (الشعرآء ۲۶ : ۲۱۴)-

(۲۱) طبری، ۳ : ۱۱۷۱-

(۲۲) الحجر ۱۵ : ۹۴-

(۲۳) بخاری و مسلم، در مشکوٰۃ، کتاب الرقاق، باب الانذار، ح ۲-

(۲۴) ابنِ سعد : طبقات، ا : ۲۰۰-

(۲۵) مشکوٰۃ، کتاب الرقاق، باب الانذار، ح ۳-

(۲۶) اصل میں ہے : واللہ لا ادری واللہ لا ادری وانا رسول اللہ ما یفعل بی ولا بکم (بخاری، در مشکوٰۃ، باب الرقاق، باب البکاء والخوف، ح ۲، روایت حضرت ام العلاءؓ)۔

(۲۷) غالباً یہ شہیدِ اوّل حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے پہلے شوہر کے کسی اور بیوی کے بطن سے پیدا شدہ فرزند تھے۔ (محمد حمید اللہ، وہی کتاب ح ۱۰۰-۱۰۱)۔

(۲۸) حیاتِ محض سے مراد خوف و حزن، دکھوں، بیماریوں سے منزّہ اور موت سے ماوراء ایسی زندگی ہے، جو مطمئن و مسرور اور رنگِ ثبات و دوام سے مزیّن ہو۔

(۲۹) القیامۃ ۷۵ : ۲۳، نیز دیکھیے الانبیاء ۲۱ : ۱۰۲-

(۳۰) الصّف ۶۱ : ۵، آل عمران ۳ : ۷، الاحزاب ۳۳ : ۱۰-

(۳۱) البقرہ ۲: ۷، الجاثیہ ۴۵ : ۲۳۔

(۳۲) البقرہ ۲: ۹، ۱۲، آل عمران ۳ : ۶۹ وبمواضع کثیرہ۔

(۳۳) وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُوْلًا (الاسراء ۱۷ : ۱۱)، نیز دیکھیے الانبیآء ۲۱ : ۳۷۔

(۳۴) بے وحی عقلیّت Secular Rationalism

(۳۵) البقرہ ۲ : ۳۔

(۳۶) Trinity

(۳۷) نفسِ امّارہ : یوسف ۱۲ : ۵۳۔

(۳۸) نفسِ لوّامہ : القیامۃ ۷۵ : ۲۔

(۳۹) اصابہ، ۲ : ۳۴۱، مصنّف نے عبداللہ کے نام کے تحت حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ذکر کیا ہے۔ نیز دیکھیے شبلی، ۱ : ۱۹۷۔

(۴۰) اُصابہ، ۱ : ۳۴۹، امام حنبل : مسند، ۳ : ۴۰۳۔

(۴۱) امام حنبل : مسند، ۱ : ۳۰۲۔ مسلم اور نسائی نے بھی اس واقعے کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

(۴۲) نعرہ Slogan

(۴۳) حرکیّت Dynamicism

(۴۴) تاریخ ابن خلدون' (اردو ترجمہ) ۱ : ۱۴۶؛ ابن ہشام (اردو ترجمہ)، ۱ : ۲۷۹ بعد۔

(۴۵) شبلی، ۱ : ۲۱۹ بعد۔

(۴۶) ابن ہشام، ۱ : ۲۸۴، شبلی، ۱ : ۲۲۰۔

(۴۷) ابن ہشام، ۱ : ۳۳۹، مدارج النبوۃ، ۲ : ۵۰، اعجاز التنزیل، ص ۵۳، زاد المعاد، ۱ : ۲۹۷ بعد، رحمۃ للعالمین، ص ۵۶، ۵۷ بعد۔

(۴۸) بخاری، باب اسلام ابی ذرؓ، شبلی، ۱ : ۲۳۲، ابن ہشام، ۱ : ۲۳۹ تا ۲۴۱ بعد، ابن سعد : طبقات، جلد ۳، تذکرۂ صحابۂ بدر۔

(۴۹) اپالوجی گاڈفری، میگنس (اردو ترجمہ)، بریلی ۱۸۷۳ء، ص ۶۶، ۶۷، بحوالہ شبلی، ۱ : ۲۳۲ بعد۔

(۵۰) آل عمران ۳ : ۱۵۹۔

(۵۱) طٰہٰ ۲۰ : ۱۳۰۔

(۵۲) طٰہٰ ۲۰ : ۱۳۱۔

(۵۳) الکہف ۱۸ : ۲۸۔

(۵۴) ابن ہشام، ۱ : ۲۸۴، امام بخاری نے "تاریخ" میں اس واقعہ کا مختصراً ذکر کیا ہے۔

(۵۵) محمد حمیداللہ، رسول اکرم کی سیاسی زندگی، ص ۱۰۰۔

(۵۶) حاکم : مستدرک، ۱ : ۱۵، شبلی، ۱ : ۲۵۲، ابن سعد : طبقات، ۱ : ۲۱۱ بعد۔

(۵۷) کفّار آپؐ کو مجنون کہتے تھے، القلم ۶۸ : ۵۱، لیکن اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ آپؐ ایسے نہ تھے : التکویر ۸۱ : ۲۲۔

(۵۸) کفّار مسلمانوں کو بے وقوف کہتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ کفّار کو بے وقوف قرار دیتا ہے : البقرہ ۲ : ۱۳۔

(۵۹) یونس ۱۰ : ۱۶۔

(۶۰) آپؐ نے حٰمٓ السجدہ کی ابتدائی آیات تلاوت فرمائی تھیں، جن کا ترجمہ یہ ہے :

حٰمٓ یہ خدائے رحمٰن ورحیم کی طرف سے نازل کردہ چیز (وحی وتنزیل) ہے۔ ایک ایسی کتاب جس کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں۔ عربی زبان کا قرآن، ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں، بشارت دینے والا اور متنبّہ کرنے والا، مگر ان لوگوں میں سے اکثر نے اس سے منہ موڑ لیا اور وہ سنتے ہی نہیں۔ کہتے ہیں جس چیز کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو، اس کے لیے ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں اور ہمارے کانوں میں بوجھ ہے، یعنی بہرے ہوگئے ہیں اور ہمارے اور تمھارے درمیان اوٹ ہے۔ تم اپنا کام کرو، ہم اپنا کام کیے جائیں گے۔

اے نبیؐ! ان سے کہو! میں تو ایک بشر ہوں، تم جیسا۔ مجھے وحی کے ذریعے بتایا جاتا ہے کہ تمھارا الٰہ (معبود ومحبوب اور مطلوب ومقصود) ایک ہے۔ لہٰذا تم سیدھے اس کی طرف متوجّہ رہو اور اس سے معافی چاہو۔ اور تباہی ہے ان مشرکوں کے لیے جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور آخرت کے منکر ہیں ....."

پھر جب آپؐ اس آیت پر پہنچے : "اب اگر یہ لوگ روگردانی کرتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ میں تم کو ایک اسی طرح کے اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈراتا

ہوں' جیسا عاد اور ثمود پر نازل ہوا تھا (۴۱ : ۱ تا ۱۳) تو عتبہ نے بے اختیار ہو کر آپؐ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا : اللہ کے واسطے اپنی قوم پر رحم کرو۔ قریش نے جب عتبہ سے اس حرکت کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا : تم جانتے ہو کہ محمدؐ کی زبان سے جو بات نکلتی ہے' پوری ہو کر رہتی ہے ، لہٰذا میں ڈر گیا کہ کہیں ہم پر عذاب نہ آ جائے۔
(تفسیر ابن کثیر' ۴ : ۹۰- ۹۱ ، البدایہ والنہایہ ، ۳ : ۶۲ ' تفہیم القرآن' ۴ : ۴۳۴' ۴۳۵)۔

(۶۱) محوّلہ بالا کتب اور ابن ہشام ' ۱ : ۳۱۳- ۳۱۴-

(۶۲) محمد حمید اللہ : رسول اکرم کی سیاسی زندگی' ص ۱۰۲-

(۶۳) اصل میں ہے : لو خرجتم الی ارض الحبشة فانّ بها ملكا لا يظلم عندهٗ أحد وهي إرض صدق حتى يجعل الله فرجًا ممّا انتم فيه۔
(ابن ہشام ' ۱ : ۳۴۴)-

(۶۴) ابن ہشام ، موضوع مذکور۔

(۶۵) ابن ہشام' ۱ : ۳۴۵ تا ۳۵۵ ببعد۔

(۶۶) ابن ہشام' ۱ : ۳۵۶ تا ۳۶۲' احمد بن حنبل' 'مسند' ۱ : ۲۰۲ ببعد' ابن سعد : طبقات' ۱ : ۲۰۶ تا ۲۰۸ ببعد' مستدرک حاکم ' ۲ : ۳۱۰ ، کتاب التفسیر۔

(۶۷) ابن سعد : طبقات ، ۱ : ۲۰۷ ببعد۔

(۶۸) ابن سعد : طبقات ، ۱ : ۲۰۸ ببعد-

(۶۹) عہدِ حاضر میں آپؐ کے ان انقلابی اصولوں پر عمل کرنے کی مثالیں ہندوستان اور چین کی آزادی کی تحریکوں میں ملتی ہیں۔

(۷۰) جمالیاتی لمحہ Aesthetic moment اس سے ایسا حسین لمحہ مراد ہے' جس میں قلب میں حق و صداقت قبول کرنے کی اُمنگ اور استعداد پیدا ہوتی ہے۔ یہ قلب کے حسین تغیّر کی ساعت ہوتی ہے۔ مفصّل بحث کے لیے دیکھیے مصنف کی کتاب جمالیات ' قرآنِ حکیم کی روشنی میں۔ ص ۱۸۱-

(۷۱) عُمرین سے آپؐ کی مراد حضرتِ عمر بن الخطابؓ اور عمر بن ہشام یعنی ابوجہل تھے۔

(۷۲) ابن ہشام' ۱ : ۳۶۶ ، بخاری ، کتاب الفضائل' باب اسلام عمر : تاریخ ابن خلدونؒ (اردو ترجمہ)' ۱ : ۴۸ تا ۵۰' ابن الحاق' ص ۲۲۵- ۲۲۶' نیز دیکھیے

بلاذری : انساب ، ابن سعد : طبقات کامل ابن الاثیر۔

(۷۳) پروفیسر ٹی۔ ڈبلیو آرنلڈ: Preaching of Islam ۔ اردو ترجمہ دعوت اسلام، از ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ ، محکمہ اوقاف ، پنجاب لاہور' ۱۹۷۲ء ص ۲۲-

باب : ٦

معاشرتی مقاطعہ سے ہجرت تک

باب ۶

معاشرتی مقاطعہ (محرّم، قبل ہجرت/ستمبر ۶۱۵ء)

مسلمانوں کی ہجرت ثانی کے بعد قریش اور تململائے، سٹپٹائے اور اپنی چیرہ دستیوں میں بہت دور نکل گئے۔ لیکن وہ نہ تو انقلاب پسند مسلمانوں کو اسلام سے منحرف کر سکے اور نہ ان کی تحریکِ انقلاب کو دبا ہی سکے۔ تحریک جب تک حرکی رہتی ہے یعنی جمود و تعطّل کا شکار نہیں ہوتی، وہ زندہ و توانا رہتی اور آگے بڑھتی رہتی ہے، اگرچہ اس کی رفتار سُست ہی کیوں نہ ہو۔ تحریکِ اسلام کے رُوح و رواں اور قائد چونکہ آپؐ تھے، اس لیے قریش نے آپؐ کی آواز کو دبانے اور خاندانِ بنی ہاشم کی حمایت سے محروم کرنے کے لیے ایک سفّاکانہ منصُوبہ بنایا۔ اس منصوبے کا مقصد آپؐ اور آپؐ کے خانوادے بنو ہاشم کو شہر بدر اور محصُور کر کے ان کا معاشرتی مقاطعہ (Social Boycott) کرنا تھا۔ چنانچہ ایک معاہدہ طے پایا جسے منصور بن عکرمہ نے لکھا اور اسے کعبے کے دروازے پر لٹکا دیا گیا۔ اس معاہدے میں بنو ہاشم میں سے صرف ابو لہب عبدالعزٰی بن عبدالمطلب شریک تھا۔ اس کی بڑی بڑی شقیں یہ تھیں :

(۱) اگر بنو ہاشم (حضرت) محمّد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو قتل کے لیے ہمارے حوالے نہ کریں تو ان کا مکمل معاشرتی مقاطعہ کیا جائے۔

(۲) ان کے ساتھ رشتے ناتے اور شادی بیاہ کے تعلقات منقطع کر لیے جائیں۔

(۳) ان سے خرید و فروخت اور لین دین ہرگز نہ کیا جائے۔

(۴) انھیں کھانے پینے کی چیزیں مہیا نہ ہونے دی جائیں،

(۵) ان سے نہ تو میل جول اور نہ روابط و ضوابط ہی رکھے جائیں۔

(۶) انھیں گلی بازاروں میں گھُومنے پھرنے نہ دیا جائے۔

داعیِ انقلابؐ کے ساتھ آپؐ کا خانوادہ بھی: بجز ابولہب بن عبدالمطّلب کے،

ایک کٹھن، صبر آزما بلکہ شکیب رُبا آزمائش زندگی میں مبتلا ہوگیا۔ تحریکِ اسلام کے لیے یہ ایک انتہائی نازک وقت تھا۔ بنو ہاشم شہر چھوڑنے اور پہاڑ کی گھاٹی میں، جسے شعبِ ابی طالب کہتے ہیں، سکونت پذیر ہونے پر مجبور ہوگئے۔ اگرچہ ابھی تک انھوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا لیکن وہ اس اعتبار سے تحریکِ اسلام کے معاونین و مددگار ضرور تھے۔ انھوں نے محض بانیِ تحریکِ اسلام کی خاطر تین برس تک، جن کا ایک ایک دن ان کے لیے قیامت کا دن تھا، اس شہر بدری، محصوری اور معاشرتی مقاطعہ کے صدمات اٹھائے اور مصائب جھیلے لیکن ان کے پائے عزم و ثبات میں کسی لمحے بھی لغزش نہ آئی۔

وہ شہر جس کی بنو ہاشم زینت تھے، جس میں ان کی عظمت کے جھنڈے گڑے تھے، جس کے معاملات میں ان کی آواز وزن رکھتی تھی، اس میں ان کو قدم رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ لوگ، جن کے وہ سادات تھے، جو ان کے مشوروں کے متمنی رہتے تھے اور ان کی دوستی کو سرمایۂ افتخار سمجھتے تھے، بیگانہ ہی نہیں، دشمن بن چکے تھے۔ بنو ہاشم کا جرم یہ تھا کہ وہ محسنِ اعظم رحمۃ للعالمینؐ اور بانیِ تحریکِ اسلام کی حمایت سے دست بردار نہیں ہوتے تھے، اور اس جرم کی پاداش میں ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا تھا۔ انھیں بھوکا بھی رہنا پڑتا تھا اور درختوں کے پتے بھی کھانے پڑتے تھے۔ انھیں بچوں کو بھوک سے بلبلاتے اور اپنی حالتِ زار پر دشمنوں کو قہقہے لگاتے اور آوازے کستے بھی دیکھنا پڑتا تھا۔ انھوں نے مسلسل تین برس تک سب کچھ دیکھا، سُنا اور سہا لیکن داعیِ انقلاب کو قریش کے حوالے نہیں کیا۔ بنو ہاشم اس شکیب رُبا تجربے سے گزرے اور کامیاب گزرے۔

انقلاب کی راہیں بڑی کٹھن، دشوار گزار اور ہمت شکن ہوتی ہیں۔ ان میں سے عزم و ایمان، صبر و استقلال اور تدبّر و حکمت سے گزرنا پڑتا ہے اور آپؐ بھی اسی طرح گزرے۔ معاشرتی مقاطعے کے شکیب رُبا تجربے میں بھی آپؐ کا رویّہ بطریقِ سایۂ خداوندی و رحمت تھا۔ اس کے برعکس قریش کا طرزِ عمل ظالمانہ تھا۔ اس کا فطری ردِ عمل مظلوموں کے حق میں ہوا۔ اصل یہ ہے کہ انسان کتنا ہی ظالم و سفاک ہو جائے، اس کی فطرت یا انسانیت بدل نہیں سکتی۔ چنانچہ وہ دن بھی آ گیا جب قریش کے افراد ہی نے ابوجہل وغیرہ کی مخالفت کے باوجود اپنے ہاتھوں سے معاشرتی مقاطعے کا عہد نامہ چاک کر دیا۔

ہوا یوں کہ ہشام عامری جو خانوادۂ بنو ہاشم کا قریبی رشتے دار اور اپنے خاندان کے سربرآوردہ

اشخاص میں سے تھا، بنو ہاشم کو چوری چھپے غلّہ وغیرہ بھجواتا رہتا تھا۔ اس کی تحریک پر زہیر (جو عبد المطلب کے نواسے تھے) مطعم بن عدی، ابو البختری، ابن ہشام، زمعۃ بن الاسود اس ظالمانہ معاہدے کو چاک کرنے پر آمادہ ہوگئے اور ابوجہل کی مخالفت کے باوجود مطعم بن عدی نے معاہدے کی دستاویز پھاڑ ڈالی اور پھر یہ لوگ مسلّح ہو کر بنو ہاشم کے پاس گئے اور انھیں درے سے نکال لائے۔[1]

یہ اسلام کی تحریکِ انقلاب کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ اس سے قدرتی طور پر اس کی رفتار میں تیزی بھی آئی اور مسلمانوں کے دلوں میں تحریکِ اسلام کی کامیابی کی جو شمع فروزاں تھی، اس کی لَو اور تیز ہوگئی۔

تین سالہ معاشرتی مقاطعہ کے دوران میں پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم چونکہ حدودِ مکّہ کے اندر داخل نہیں ہوسکتے تھے، اس لیے آپؐ اطراف و جوانب کی بستیوں میں نکل جاتے اور وہاں صحرا نشینوں، خانہ بدوشوں اور کارروانوں کو دعوتِ اسلام دیتے۔ آپؐ کا رابطہ تحریکِ انقلاب کے رفقا کے ساتھ بھی برابر قائم رہا اور آپؐ ان کو باقاعدہ ہدایات[2] (Instructions) دیتے رہتے تھے اور وہ ان کے مطابق خفیہ طور پر دعوتِ اسلام دینے میں شب و روز منہمک رہتے تھے۔ علاوہ بریں قرآن مجید کی جو سورتیں اور آیتیں آپؐ پر نازل ہوتی تھیں، وہ مسلمانوں کو سکھا دی جاتی تھیں تاکہ وہ ان کے مطابق عمل کریں۔

اسلام کی تحریکِ انقلاب کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا تعلّق براہِ راست پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ اور آپؐ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تھا، جسے وہ تمام افرادِ نسلِ انسانی بلکہ کُل جہانوں کا اِلٰہ و ربّ سمجھتے تھے۔ اس تحریک کا مقصد چونکہ خالصۃً اسلامی یا انسانی معاشرہ قائم کرنا تھا، اس لیے یہ اصلاً تحریکِ رحمۃ للعالمینی تھی اور اس کا منشور بھی الہامی تھا، جسے اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے اپنے پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم پر نازل کرتا تھا۔ مختصر یہ کہ تحریکِ اسلام چونکہ ہر زمان و مکان کے جملہ بندگانِ خدا کے لیے تھی، لہٰذا اس کو چلانے اور کامیاب بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے "ہدایت نامہ" بھی خود ہی دیا تھا، جسے قرآن مجید کہتے ہیں۔

چونکہ معاشرے کی تشکیل افراد کرتے ہیں، لہٰذا افراد اگر صالح ہوں گے تو معاشرہ بھی صالح ہوگا۔ اس کے برعکس اگر افراد طالح ہوں گے تو معاشرہ بھی طالح ہوگا۔ اس اصل کے پیشِ نظر

آپ ﷺ ارشادِ الٰہی کے مطابق مسلمانوں کو قرآن مجید سُناتے اور اس کے معانی و مطالب سے انھیں آگاہ کرتے، ان کے حواس و قلب کی تربیت و تہذیب کرتے، انھیں علم و حکمت سکھاتے اور اس طرح ان کی حسّی و قلبی قوّتوں کا نشو و ارتقا کرتے رہتے۔ حاصلِ کلام یہ کہ ایک طرف آپ ﷺ لوگوں کو دعوتِ اسلام دیتے اور دوسری جانب مسلمانوں کو تحریکِ انقلاب میں عملاً حصّہ لینے اور اس کے لیے انھیں ایثار و قربانی کرنے پر آمادہ کرتے۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ علم و حکمت اور تزکیۂ نفس کے ذریعے ان کی شخصیت کی اصلاح و تکمیل کرتے تاکہ وہ آیندہ چل کر صحیح معنوں میں ایک حسین و صالح مثالی معاشرے کی تشکیل و تعمیر کرسکیں۔

تحریکِ اسلام کے دو پشتیبانوں کی رحلت (۳ قبل ہجرت / ۶۱۹ء):

اِسلام کی تحریکِ انقلاب اب عُمر کی دسویں منزل میں پہنچی تھی۔ اس برس یعنی ۳ قبل ہجرت / ۶۱۹ء میں آپ ﷺ کو ایک طرف معاشرتی مقاطعے کی اذیّتوں سے رہائی ملی اور آپ ﷺ کو پھر اہلِ مکّہ اور اس میں آنے والے کعبے کے یاتریوں اور دوسرے لوگوں سے رابطہ قائم کرنے اور انھیں دعوتِ اسلام دینے کا موقع ملا تو دوسری جانب آپ ﷺ دو ہستیوں کی شفقت و محبّت، ہمدردی و غمگساری اور رفاقت و حمایت سے محروم ہوگئے جو تحریکِ اسلام کی پشتیبان تھیں۔ ان میں سے جس ہستی نے پہلے داغِ مفارقت دیا، وہ آپ ﷺ کے چچّا حضرت ابوطالب تھے۔ حضرت ابُوطالب کو آپ ﷺ سے بہت محبّت تھی۔ آپ ﷺ کی خاطر انھوں نے قریش کی مخالفت مول لی تھی اور معاشرتی مقاطعے کے مصائب برداشت کیے تھے۔ جب ان کے انتقال کا وقت قریب آیا تو قریش کے چند سربرآوردہ اشخاص ان کے پاس گئے۔ ان میں عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ابوجہل بن ہشام، امیّہ بن خلف، ابوسفیان بن حرب بھی تھے۔ انھوں نے حضرت ابوطالب سے کہا کہ آپ اپنے بھتیجے (حضرت محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم) سے یہ معاہدہ کرادیں کہ وہ نہ ہم سے تعرّض کرے اور نہ ہم اس سے تعرّض کریں گے۔ چچا نے آپ ﷺ سے ایسا معاہدہ کرنے کے لیے کہا تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا :

"اچھا، تم مجھے ایک بات کا قول دو، جس کے عوض تم عرب کے مالک بن جاؤ گے اور اس کی بدولت عجم بھی تمھاری اطاعت کرنے لگیں گے۔"

ابوجہل بولا : بہت اچھا! تمھارے باپ کی قسم! ایک نہیں، دس باتوں کا قول لو۔

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا : (اقرار کرو کہ) تم اللہ کے سوا کسی کو "اِلٰہ" (معبود) نہیں کہو گے، اور اس کے سوا جس کی بھی تم پرستش کرتے ہو، اسے چھوڑ دو گے۔

یہ سُن کر اکابرِ قریش تالیاں بجانے لگے اور پھر کہنے لگے : اے محمّد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کیا تم چاہتے ہو کہ سب معبودوں کو ایک معبود بنادو؟ تمھاری بات تو عجیب ہے۔

جس طرح خُفّاش روشنی کی تاب نہیں لاسکتے اسی طرح ان اکابر مشرکوں کے دل نورِ توحید کے حریف نہ ہوسکے اور انھوں نے اپنے آبائی مذہب پر قائم رہنے ہی میں اپنی عظمت و سیادت کو مضمر دیکھا۔ آپ ﷺ جانتے تھے کہ چچّا کی وفات اور اس طرح ان کی حمایت سے محرومی کے بعد قریش بیباک ہوکر آپ ﷺ کے درپئے جان ہوجائیں گے لیکن آپ ﷺ کا دل پیغمبرِ اعظم و آخر کا دل تھا، نہ مرعوب ہوسکتا تھا اور نہ ہوا۔ نہ تو قریش نے توحید و حق سے اور نہ آپ ﷺ نے شرک و باطل سے مفاہمت کی۔ محفل کے اٹھتے ہی حضرت ابوطالب کی رُوح بھی پرواز کرگئی ؎ اور اس کے ساتھ ہی آپ ﷺ اپنے خاندان کی حمایت سے بھی محروم ہوگئے، کیونکہ اب بنو ہاشم کا سردار ابولہب تھا۔

یہ جراحتِ دل کاری بھی تھی اور ہری بھی کہ آپ ﷺ کی غمگسار و وفاشعار شریکِ حیات اُمّ المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا داغِ مفارقت دے گئیں (رمضان ۳ قبل ہجرت / ۶۱۹ء)۔ گھاؤ پر گھاؤ لگا اور کاری لگا۔ گھر کا چمن ویران ہوا اور اپنے ہی شہر میں کوئی "حمایتی" نہ رہا۔ ایک دل کے ساتھ یہ سب کچھ ہوا، لیکن دل جو محبّتِ اِلٰہ و انسان سے بحرِ ناپیدا کنار کی طرح وسیع و بیکراں اور کوہِ گراں کی طرح عظیم و محکم تھا، سب کچھ برداشت کرگیا۔ وفات کے وقت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر ۶۵ برس تھی۔ حجون کے مقام پر دفن کی گئیں۔ انھیں مرنے کے بعد بھی یہ سعادت حاصل ہوئی کہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم خود ان کی قبر میں اُترے اور اپنے ہاتھوں سے انھیں سپردِ خدا کیا۔

حضرت سَودہ رضی اللہ عنہا سے نِکاح : (رمضان المبارک، ۳ قبل ہجرت / فروری ۶۱۹ء)

عورت نہ رہے تو گھر ویران اور بچے پریشان ہوجاتے ہیں اور مرد کی زندگی میں ایسا خلا پیدا ہوجاتا ہے جسے عورت ہی پُر کرسکتی ہے۔ انسان کے لیے گھر راحت و آرام اور طمانیت و مسرّت کی جنّت اور معاشرے کی اساس ہوتا ہے، اس لیے اسلام میں اسے ازبس اہمیت حاصل ہے۔ گھر معاشرے کی بڑی ہی مقدّس معاشرتی اکائی (Social Unit) ہے، جس کے تقدّس کی ضامن ازدواجی زندگی ہے اور ازدواجی زندگی کے تقدّس کی ضمانت نِکاح فراہم کرتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ گھر عورت کے لیے بنا اور عورت ہی نے بنایا ہے اور یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ عورت ہی گھر کی دنیا کی معمار ہوتی ہے۔ نیز اس دنیا کی رونق و زینت اور اس کی راحتیں اور مسرتیں بھی اسی کی ذات کی مرہونِ منت ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے عورت سے متعلق بڑا ہی بصیرت افروز، جامع اور حکیمانہ نکتہ بیان کیا ہے کہ وہ مرد کا لباس ہے۔[۵۹] یوں تو ہر شخص ہی کو گھر اور اس کی نعمتوں کی حاجت ہوتی ہے لیکن غیر معمولی نوعیت کے تخلیقی و تعمیری کام کرنے والے عظیم انسانوں کو سب سے زیادہ ان نعمتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپؐ کو تو گھر کی ویرانی کے ساتھ بچّوں کی اداسی و پریشان حالی کا مسئلہ بھی درپیش تھا چنانچہ آپؐ نے اپنا گھر آباد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

رمضان المبارک ۳ قبل ہجرت / فروری ۶۱۹ء میں آپؐ نے حضرت سُودہؓ سے نکاح کیا، جو بیوہ تھیں اور ان کی عمر اس وقت پچاس برس کے لگ بھگ تھی۔[۶۰]

حضرت عائشہ صدّیقہؓ سے نکاح : آپؐ کی شخصیت آفاقی، ہمہ گیر اور انقلابی تھی اور عالمگیر نوعیت کا ہمہ گیر و حسین انقلاب لانے کے لیے افراد و قبائل کی حمایت و معاونت کا حاصل کرنا آپؐ کے لیے ناگزیر تھا۔ اس عہد کے عرب کی روایات کے مطابق قبائل اور خانوادوں کی معاونت و حمایت حاصل کرنے کا ایک ذریعہ رشتۂ صِہر تھا۔ چنانچہ آپؐ نے اپنے مخلص اور سچے دوست اور تحریکِ اسلام کے زبردست معاون اور سرگرم کارکن حضرت صدیقِ اکبرؓ کے خانوادے سے رشتۂ صِہر قائم کرنے کا فیصلہ کیا، جو تحریکِ اسلام کے حوالے سے وقت کا ایک اہم تقاضا تھا۔ چنانچہ شوّال ۳ قبل ہجرت / مارچ ۶۱۹ میں آپؐ نے پانچسو درہم کے عوض ان کی صاحبزادی امّ المؤمنین حضرت عائشہ صدّیقہؓ سے نکاح کر لیا، لیکن رخصتی چار برس بعد شوّال ۱ ہجری / اپریل ۶۲۳ء میں ہوئی۔ آپؐ کی یہ پہلی اور آخری ناکتخدا دوشیزہ زوجہ تھیں۔[۶۱]

آپؐ کے تعدّدِ ازدواج کے سلسلے میں سیاسی و معاشرتی عوامل کے علاوہ یہ اصل بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ آپؐ کی شخصیت جتنی عظیم و آفاقی تھی، اتنے ہی آپؐ عبقری (Genius) بھی تھے اور عبقریت کی کمیّت و کیفیت کی نسبت ہی سے انسان میں جنسی قوّت پائی جاتی ہے، اور اس کی تشفی کا جائز و بہترین طریقہ نکاح ہے۔ اس سے اس امر کی بھی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں اسلام نے تعدّدِ ازدواج کی مشروط اجازت دی ہے۔[۶۲]

سفرِ طائف — اہلِ کفر و زر کی قساوت و شقاوت اور داعیِ حق کے صبر و استقلال کی ایک علامت : (۲۷ شوّال ۳ قبل ہجری / فروری، مارچ ۶۱۹ء)

حضرت ابوطالب کے بعد ابولہب خانوادۂ بنو ہاشم کا رئیس بنا تو اس نے آپؐ کو کُنبہ بدر کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس طرح آپؐ اپنے خانوادے کی حمایت سے محروم ہو گئے۔ ایک چچّا یعنی حضرت ابوطالبؓ نے جو کام قریش کی دھمکیوں، مخالفتوں اور معاشرتی مقاطعے کے باوجود نہیں کیا تھا، وہ کام دوسرے چچّا ابولہب نے برضا و رغبت کر دیا۔ کنبہ بدری کی اہمیّت کا اندازہ اس دَور کے اِنسان کے لیے لگانا ازبس دشوار ہے۔ عرب کے قبائلی نظام میں "بے حمایت" ہو جانے کا مطلب شہری، قبائلی، ملکی اور انسانی حقوق سے محروم ہو جانا تھا۔ ایسے شخص کی عزّت و آزادی اور جان و مال کا چونکہ قصاص نہ ہوتا تھا، اس لیے جو شخص چاہتا اسے غلام بنا سکتا، اس کی عزّت و دولت وغیرہ لوٹ سکتا، حتیٰ کہ اسے قتل بھی کر سکتا تھا، اور کوئی قانون، دستور، رواج اس کی بازپرس نہیں کر سکتا تھا۔ قریش تو پہلے ہی آپؐ کے خون کے پیاسے تھے، اس لیے آپؐ نے مکّے سے دُور طائف کو اپنی تحریکِ انقلاب کا مستقر بنانے کا ارادہ کیا۔

طائف مکّہ معظمہ سے چالیس پینتالیس میل دور، دامنِ کوہ میں اپنی زرعی پیداوار کی وجہ سے خوشحال علاقہ تھا۔ جاگیردارانہ نظام کی وجہ سے وہاں بڑے بڑے زمیندار اور اُمراء رہتے تھے۔ مال و دولت کی فراوانی اور شرک و بت پرستی نے انھیں متکبر و سنگدل بنا دیا تھا۔ آپؐ زید بن حارثہؓ کے ساتھ طائف گئے۔ اس وقت عمرو بن عوف کے بیٹے عبد یالیل، مسعود اور حبیب وہاں کے سردار تھے۔ آپؐ ان کے پاس تشریف لے گئے اور انھیں دعوتِ اسلام دی۔ انھوں نے ابلیسی منطق و استہزاء کے ساتھ دعوت کو ٹھکرا دیا اور اپنی حمایت میں لینے سے بھی انکار کر دیا۔ ان سے مایوس ہو کر آپؐ نے عوام اور دوسرے امیروں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ مگر عمیری سرداروں نے اوباش لونڈوں کو آپؐ کے پیچھے لگا دیا جو انسانیت، صداقت اور خدا کی محبّت میں سرمست دنیا کے عظیم ترین انسان پر آوازے کستے، ہنستے، دُشنام طرازی کرتے اور آپؐ کے پاؤں پر سنگریزے اور روڑے وغیرہ مارتے۔ آپؐ کے پاؤں لہولہان ہو گئے۔ آپؐ دَرد و جراحت سے مجبور ہو کر بیٹھتے تو ظالم زبردستی آپؐ کو کھڑا کرتے اور سنگباری شروع کر دیتے۔ ظالموں کے دست و زبان کی ضربتوں سے جسمِ اطہر کے ساتھ آپؐ کا قلبِ مبارک

بھی اس قدر مجروح ہوا کہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ آپؐ کے ہمراہ صرف زید بن حارثہؓ تھے۔ آپؐ کو بڑی مشکل سے اُس وقت ان جاہل و ظالم لوگوں سے نجات ملی، جب آپؐ نے ایک تاکستان کی ٹٹیوں میں پناہ لی۔ اس باغ کے مالک کا نام عتبہ بن ربیعہ تھا۔ اسے آپؐ کی حالتِ زار پر ترس آیا اور اس نے آپؐ کو انگور بھجوا دیے۔

جسمِ اطہر سنگریزوں سے اور قلبِ مبارک زبان کے تیروں سے گھائل تھا۔ بیچارگی و درماندگی کا عالم تھا۔ راہِ انقلاب کے ساتھ راہِ زیست بھی مسدود ہو چکی تھی لیکن آپؐ راضی برضائے "دوست" تھے، جس نے آپؐ کو اس کام کے لیے مبعوث فرمایا تھا۔ عجز و درماندگی، زہرہ گداز مصائب اور شکیب رُبا حالات میں بھی آپؐ کو اپنے مشن کی کامیابی کا یقین اور اپنے اِلٰہ و ربّ کی ذات پر توکّل تھا۔ محبّت میں گلہ شکوہ تو بہرحال ہوتا ہی ہے۔ آپؐ نے اس عالم میں دوست سے شکوہ تو کیا، مگر زبانِ محبّت و بندگی میں، اور جسے رنگِ عبدیّت کی شوخی نے حد درجہ اثر انگیز بنا دیا۔ آپؐ کی دُعا تھی:

اے اللہ! میں اپنی ناتوانی و بے سرو سامانی، نیز اس بات کی فریاد کرتا ہوں کہ لوگ میری تحقیر کرتے ہیں۔ تو سب رحم کرنے والوں سے بڑا رحم کرنے والا ہے۔ تو درماندہ اور ناتوانوں کا ربّ ہے اور میرا ربّ بھی تو ہی ہے۔ تو مجھے کن کے حوالے کرتا ہے؟ اکھڑ لوگوں کے یا اس دشمن کے جو میرے کام پر حاوی ہے (یعنی مجھے میرا کام کرنے نہیں دیتا)۔

اگر تُو مجھ سے ناراض نہیں تو مجھے اس کی پروا نہیں۔ تیری عنایت و مہربانی میرے لیے مقابلتہً زیادہ وسیع ہے۔ میں تیری ذات کے نور کی پناہ میں آنا چاہتا ہوں جس سے تاریکیاں روشنی میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور دنیا و آخرت کے کام سنور جاتے ہیں۔ میں اس سے پناہ مانگتا ہوں کہ تیرا غضب مجھ پر پڑے یا تیری ناراضی مجھ پر نازل ہو۔ مجھے تیری خوشنودی و رضا مطلوب ہے۔ نیکی کرنے یا بدی سے بچنے کی طاقت مجھے تیری طرف ہی سے ملتی ہے۔[9]

آپؐ نے طائف سے مراجعت کے وقت یہ بھی فرمایا تھا: میں ان لوگوں کی تباہی کی دُعا کیوں مانگوں؟ اگر یہ اللہ پر ایمان نہیں لاتے تو نہ لائیں، ان کی اولاد تو ایمان لائے گی۔[10]

پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کو طائف کے سیاسی، معاشی اور مذہبی احوال اور قریشِ مکّہ کے ساتھ ان کے روابط کا علم تھا، نیز آپؐ کو اس حقیقت کا بھی شعور تھا کہ آپؐ کی دعوت وہاں کے سرداروں یعنی استحصالی قوتوں کے لیے بالخصوص اور مشرک و بت پرست لوگوں کے لیے بالعموم پیامِ رستاخیز ثابت ہو گی، اور ان کا ردِّ عمل بھی شدید ہو گا، لیکن جملہ بنی نوعِ انسان کے پیغمبر

اور رحمۃ للعالمین کی حیثیّت سے ان کو ہر قیمت پر دعوتِ اسلام دینا آپؐ کا فرضِ منصبی تھا۔

ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ آپؐ کا جان جوکھوں میں ڈال کر تنہا دیارِ غیر میں جانا اور وہاں کے مشرک و بت پرست لوگوں، خاص کر سرداروں کو دینی عقاید، معاشرتی حیثیت اور معاشی مراعات و فوائد سے دست بردار ہونے کی دعوت دینا آپؐ کے عزم کی پختگی، غیر معمولی خود اعتمادی، حوصلے، جُرأتِ اقدام اور دعوت کی سچّائی پر دلالت کرتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ فوری نتائج کے لحاظ سے آپؐ کو اس مہم میں کامیابی نہ ہوئی، اور اس قسم کی انقلابی مہموں کو ایسی ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے، لیکن تحریکِ اسلام کی غایت کے اعتبار سے اس مہم کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس مہم سے تحریکِ اسلام کو عرب کے ایک ایسے شہر سے اپنے آپ کو روشناس کرانے کا موقع ملا جو اپنی سیاسی و معاشی حیثیّت کی وجہ سے ازبس اہم تھا۔ اس مہم نے طائف کی سرزمین میں اسلام کا بیج بو دیا، جو کفر و شرک کے دبیز پردوں کے نیچے بھی نشوونما پاتا رہا اور آخرِ کار ایک دن ان پردوں کو پھاڑ کر شجرِ تناور و بار آور کی صورت میں نمودار ہو گیا۔

طائف تو تھا ہی دیارِ غیر، لیکن مکّہ معظمہ بھی آپؐ کے لیے دیارِ غیر ہی نہیں، مقتل بن چکا تھا۔ آپؐ پر نہ صرف عرصۂ حیات بلکہ عرصۂ زمان و مکان بھی تنگ ہو گیا۔ اگرچہ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کی صورتِ حال تھی، لیکن آپؐ نہ تو مایوس ہوئے، نہ ہمّت ہاری اور نہ دامنِ صبر و شکیب ہی ہاتھ سے چھوڑا۔ طائف سے مراجعت فرمائی۔ چند روز نخلہ میں قیام فرمایا، پھر غارِ حرا میں تشریف لے گئے۔ ابولہب چونکہ آپؐ کو خاندان کی حمایت سے محروم کر چکا تھا، اس لیے مکّے میں جانے کا مطلب اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا تھا۔ لیکن تحریکِ اسلام کو جمود و تعطّل سے بچانے اور کامیاب بنانے کی خاطر مکّے میں جانا اور رہنا ضروری تھا۔ یہ مسئلہ اگرچہ عام انسان کے لیے ازبس دشوار اور شکیب رُبا تھا، لیکن آپؐ کی فکر و بصیرت نے اس طرح حل کر دیا، جیسے یہ کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔ آپؐ نے حمایت حاصل کرنے کے لیے عدی بن مطعم کو منتخب کیا، اور یہ انتخاب درست تھا۔ شرفائے عرب میں اس قسم کی درخواست کو رد کرنے کا دستور نہ تھا، کیونکہ ایسا کرنا خاندانی شرافت و امارت اور شجاعت و مردانگی کے منافی سمجھا جاتا تھا۔ عدی نے آپؐ کو اپنی حمایت میں لے لیا اور آپؐ کو ساتھ لے کر حرمِ کعبہ گیا اور وہاں اپنی حمایت کا اعلان کیا۔ تاریخِ اسلام بلکہ تاریخِ انسانی کے نقطۂ نظر سے عدی کا اعلانِ حمایت اپنے دور رس نتائج کے لحاظ سے اس سے کہیں زیادہ اہم ہے جتنا کہ عام طور سے سمجھا جاتا ہے۔ اس حمایت ہی نے آپؐ کو مکّے میں رہ کر تحریکِ اسلام کو

منظم طریق سے چلانے اور اسے گرد و نواح کے قبائل میں لے جانے کے اس وقت مواقع فراہم کیے جب ان کی اشد ضرورت تھی۔[۱۱]

تحریکِ اسلام قبائل میں (۳ قبل ہجرت/۶۱۹ء) :

اللہ تعالیٰ نے ایک بار پھر آپؐ کو مکّے میں تحریکِ انقلاب کا کام کرنے کا موقع فراہم کر دیا، جہاں مسلمان زیرِ زمین انقلابی سرگرمیوں میں مصروف تھے، اور انھیں آپؐ کے مشوروں، ہدایات اور قیادت کی احتیاج تھی۔ عدی بن مطعم کی حمایت میں آپؐ کے مکّے میں رہنے کی اہمیّت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ فوج کو سپہ سالار کے بغیر اور تحریکِ انقلاب کو قائد کے بغیر اپنی جہت کھو دینے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔[۱۲]

انقلاب آفریں و تاریخ ساز شخصیتیں مصیبتوں اور ناکامیوں سے حوصلہ یا ہمت نہیں ہارتیں، اس کے برعکس مصائب سے اگر ان میں قوّتِ مزاحمت بڑھتی اور ان کے حوصلوں میں توانائی پیدا ہوتی ہے تو ناکامیوں سے ان میں جوش و ولولہ پیدا ہوتا اور ان کی ہمت جوان ہوتی ہے۔ چنانچہ طائف کے مصائب و ناکامی کا ردِّ عمل یہ ہوا کہ آپؐ میں خود اعتمادی نقطۂ عروج کو پہنچ گئی اور آپؐ نے ایک نئے ولولے اور جوش کے ساتھ اپنی انقلابی سرگرمیوں کو تیز سے تیز کرنے کا عزم کیا۔ آپؐ نے مسلمانوں کو بدستور زیرِ زمین تحریک چلانے کی ہدایات دیں اور قبائلِ عرب میں جا کر انھیں دعوتِ اسلام دینے کی ذمہ داری خود اُٹھائی۔ چنانچہ اس فیصلے کے بعد آپؐ نے جن قبائل کو بالمشافہ دعوتِ اسلام دی، ان میں سے مندرجۂ ذیل نام تاریخ میں محفوظ ہیں : بنو عامر، محارب، فزارہ، غسان، مرۃ، حنیفہ، سلیم، بنو نضر، کندۃ، کلب، حارث بن کعب، عذرۃ اور حضارمۃ۔[۱۳]

دشمنِ اسلام ابولہب سائے کی طرح آپؐ کے پیچھے لگا رہتا تھا۔ آپؐ جہاں تشریف لے جاتے، وہ بھی وہاں پہنچ جاتا۔ آپؐ تلاوتِ قرآن فرماتے تو وہ رخنے ڈالتا اور لوگوں کو سُننے نہ دیتا۔ آپؐ کچھ کہنے لگتے تو اپنے ساتھیوں کے ساتھ شور مچاتا اور آپؐ کی ذاتِ اقدس کے متعلق ہرزہ سرائی کرتا۔ کبھی (نعوذ باللہ) آپؐ کو مجنون اور کبھی ملحد کہتا۔ الغرض جو اس کے جی میں آتا، کہتا اور کرتا تاکہ کہیں لوگ آپؐ کے حُسنِ خطابت اور کلامِ الٰہی کی بلاغت و صداقت سے متأثّر نہ ہو جائیں۔[۱۴] آپؐ کا مشن مثبت و تعمیری تھا تو ابولہب کا کام منفی و تخریبی تھا۔ آپؐ کا مشن افرادِ نسلِ انسانی کو ان کے حقیقی الٰہ و ربّ سے ملانا تھا، جبکہ ابولہب کا کام جُدا کرنا تھا۔ اصل یہ ہے کہ نبوّت کا وظیفہ "وصل" ہے، یعنی انسان کو خدا سے ملانا۔ اس کے علی الرغم شیطنت کی سرگرمیوں

کا مقصد "فصل" یعنی انسان و خدا میں جدائی ڈالنا ہوتا ہے۔ لہٰذا رحمٰن کے بندوں کی پہچان یہ ہے کہ وہ نبوّت کے سچے اور فعّال پیروکار ہوتے ہیں اور لوگوں کو ان کے اللہ یا خدا سے ملانے کی جدّ و جہد میں لگے رہتے ہیں، جبکہ شیطان کے دوست لوگوں کو خدا سے بدظن کرتے اور انھیں اس سے دُور لے جانے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ یہ انسان اور شیطان میں تمیز کرنے کا ایک عالمگیر معیار ہے۔ انسان کی پہچان یہ ہے کہ وہ انسان کا دوست ہوتا ہے اور شیطان کی پہچان یہ ہے کہ وہ انسان کا دشمن ہوتا ہے۔ جس طرح دن کے اُجالے کے ساتھ رات کا اندھیرا لگا رہتا ہے، اسی طرح انسان کے ساتھ شیطان لگا رہتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ انسان جتنا عظیم ہوتا ہے، اس کا شیطان بھی اتنا ہی بڑا ہوتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ شیطان کی مزاحمت ہی سے انسان کی طبیعی صلاحیتوں میں قوّت و توانائی بدرجۂ اتم پیدا ہوتی اور اسے عظیم بناتی ہے۔ چنانچہ ابولہب بھی ایک مقتدر و با اثر شیطان تھا، اور شیطنت میں بہت بڑا تھا۔ وہ آپؐ کی انسان دوست کوششوں کو اپنے زعم میں ناکام بنا بنا کر خوش ہوتا، اتراتا اور اپنے آپ کو کامیاب انسان سمجھتا تھا، لیکن تاریخ نے ثابت کر دیا کہ ابولہب، جو دشمنِ انسانیت و صداقت تھا، ناکام و نامراد مرا،[۱۵] اور آپؐ جو رحمۃ للعالمین تھے اور ہیں، عظیم و کامیاب انسان تھے اور ہیں۔

اصل یہ ہے کہ عظمتِ انسانی کا راز دوسروں کے لیے رحمت بن جانے میں مضمر ہے، لہٰذا انسان کی رحمت کا دائرہ جتنا وسیع ہوگا، اس کی شخصیت اتنی ہی آفاقی اور عظیم ہوگی۔ تاریخ ایسے ہی انسانوں کو زندۂ جاوید بنایا کرتی ہے۔

بظاہر ناساعد حالات پیش آتے رہے مگر آپؐ اپنا کام کرتے رہے۔ آپؐ میلوں اور موسمی بازاروں مثلاً سُوقِ عُکاظ اور سُوقِ ذوالمجاز و مجنّۃ میں جاتے اور لوگوں کو تحریکِ اسلام میں شمولیت کی دعوت دیتے۔ حج کے موقع پر آپؐ مکّہ کے باہر یا منٰی میں زائرین سے رابطہ قائم کرتے اور انھیں قرآن مجید سُناتے اور دعوتِ اسلام دیتے اور ساتھ ہی انھیں امن و سلامتی کی آزاد و خوشحال زندگی، قوت و صولت اور عظیم الشان سلطنت اور قیادتِ اقوام کا مژدہ دیتے۔ انھیں قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل سے ڈراتے اور جنّت کی ابدی زندگی کی خوشخبری سناتے۔[۱۶] وہ سُنتے، متأثّر بھی ہوتے لیکن شرک و بُت پرستی کی دیرینہ روایات کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوتے۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ تھی کہ عرب بڑے متشدّد قسم کے روایت و بزرگ پرست تھے۔ ان کے قبائلی نظام میں رئیسِ قبیلہ کی بات قولِ فیصل اور اس کا حکم حرفِ آخر ہوتا تھا اور اس سے

انحراف کا کوئی فرد تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بزم ہو یا رزم، اطاعتِ امیر ان کی زندگی کا شعار تھا، اور اسی میں ان کی تنظیم، اتحاد اور قوت کا راز مضمر تھا اور اس دور کی سیاسی زندگی میں یہ اطاعت شعاری ہی ان کی بقا کی ضامن بھی تھی۔ اس روایت سے ان میں "بزرگ ہستی" کا جذبہ پیدا ہوا جو ایک مقدّس دینی عقیدے کی شکل اختیار کر کے ان کی زندگی کا جُزوِ لاینفک بن گیا۔

پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم قبائل کو تحریکِ اسلام میں شامل کرنے کی خاطر توحید کی دعوت دیتے تھے، جو اصلِ دین ہے۔ توحید انسان کو جہالت، توہّمات، شرک اور غیر اللہ کی غلامی سے نجات دلاتی، اسے اس کے اِلٰہ سے ملاتی اور انسانیت کے آزاد و محترم مقام پر متمکن کرتی ہے۔ عقیدۂ توحید جب انسان کی فکری و عملی زندگی کا جُزوِ لاینفک بن جاتا ہے تو اس کا قول و فعل اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کے احکام کے مطابق ہوتا ہے اور اللہ ہی اس کی طلب و آرزو اور پرستش و محبت کا معروض بن جاتا ہے اور انسان عبدیّت کے مقامِ احسن و ارفع پر فائز ہو جاتا ہے، جسے اصطلاح میں "قُرب و وِصال" یا تقرّبِ الٰہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تقرّبِ الٰہی سے انسان میں ایمان کی ناقابلِ تسخیر قوّت پیدا ہو جاتی ہے، جس کی بدولت وہ بینا اور صاحبِ حسن و سرور بن جاتا ہے۔ اسلام کے نزدیک یہی مقصودِ حیاتِ انسانی، یہی مشیّتِ الٰہی ہے، یہی فطرتِ انسانی کی آرزو اور یہی آپؐ کی دعوت کی غایتِ حقیقی تھی۔ چنانچہ قبائل کو آپؐ جو دعوت دیتے تھے اس کا متن حواشی میں اور ترجمہ حسبِ ذیل ہے:

اے فُلاں قبیلے والو! میں تمھاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا (رسول) ہوں، جو تمھیں حُکم دیتا ہے کہ ایک اللہ ہی کی عبادت کرو اور کسی چیز کو اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ، اور اللہ کے سوا جن چیزوں کی تم پرستش کرتے ہو اور ان کو اس کا مقابل بنا رکھا ہے، انھیں چھوڑ دو۔ مجھ پر ایمان لاؤ، میری تصدیق کرو اور میری حفاظت کرو۔ یہاں تک کہ میں ان چیزوں کو صاف صاف بیان کر ڈالوں جن کے ساتھ اللہ نے مجھے مبعوث کیا ہے۔[۱۷]

لوگ آپؐ کے مواعظِ حسنہ کو سُنتے، متأثّر بھی ہوتے، لیکن اپنے معتقدات و روایات کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ پھر قبائلی وفاداریاں، نیز سیاسی و معاشی اور معاشرتی مصلحتیں بھی دعوتِ اسلام کو قبول کرنے میں مانع آتی تھیں۔ پھر بھی اکّا دکّا شخص تحریکِ اسلام میں شامل ہوتا رہتا تھا۔

تحریکِ اسلام کا آغاز مکّہ معظمہ میں ہوا، لیکن اس کے ملجا و مستقر بننے کا شرف چونکہ مدینہ منوّرہ

نے حاصل کرنا تھا، اس لیے آپؐ کی توجہ زیادہ سے زیادہ یثرب کی طرف ہونے لگی۔ قریش کی مخالفت و شقاوت اور ایذا رسانی کے باوجود آپؐ ان سے مایوس تو نہ ہوئے کہ مایوسی آپؐ کے دین میں حرام تھی، البتہ آپؐ کی فکرِ رسا اور بصیرت اس نتیجے پر پہنچ گئی تھی کہ اہلِ مکّہ اور اس کے گرد و نواح کے قبائل کو رام کرنے کے لیے ابھی مزید وقت درکار ہے۔ لٰہذا یثرب کے مُشرک قبائل میں تبلیغی سرگرمیاں تیز کر دینی چاہئیں اور مدینے کو اسلام کا ملجا و مستقر بنانے کے لیے کام کرنا چاہیے۔ تاریخ نے بعد میں ثابت کر دیا کہ آپؐ کی فکر و نظر کا ہدف ٹھیک اور فیصلہ درست تھا۔ چنانچہ آپؐ ان لوگوں کی طرف زیادہ توجہ دینے لگے جو یثرب سے حج، عمرہ وغیرہ کرنے کی غرض سے آتے تھے۔

حضرت سوید بن الصامتؓ کے اسلام لانے کو اس سلسلے کی پہلی کامیابی کہہ سکتے ہیں (۳ قبل ہجرت بمطابق ۶۱۹ء)۔ وہ اس بات کے مدّعی تھے کہ ان کے پاس حضرت لُقمان کا صحیفۂ حکمت ہے، جسے مجلّۂ لقمان کہتے تھے اور انھیں حکیمانہ اقوال بھی یاد تھے۔ حکمت کے علاوہ انھیں شاعری و شجاعت میں بھی کمال حاصل تھا، اس بنا پر لوگوں میں کامل کے لقب سے معروف تھے۔ انھیں اپنی حکمت پر ناز تھا۔ چنانچہ انھوں نے قرآنِ مجید کی حکمت و بلاغت کا شہرہ سُنا تو مقابلہ و مناظرہ کے لیے رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے پاس آئے۔ بعض نے لکھا ہے کہ آپؐ دعوتِ اسلام دینے ان کے پاس تشریف لے گئے تھے۔ حضرت سویدؓ نے مجلّہ لقمان پیش کیا۔ آپؐ نے اسے سراہا اور پھر انھیں قرآنِ حکیم سنایا تو وہ اس قدر متاثّر ہوئے کہ اسی وقت ایمان لے آئے۔ ذوقِ حکمت نے اگر انھیں کلامِ الٰہی پہچاننے کے قابل بنایا تو مشیّتِ ایزدی یہ ہوئی کہ حضرت سُویدؓ کو ایمان کی دولت کے ساتھ حیاتِ جاوید بھی عطا کی جائے۔ چنانچہ جب وہ واپس مدینے پہنچے تو ایک سچّے مسلمان کی طرح تحریکِ اسلام کے لیے کام کرنے لگے۔ لیکن انھیں یہ کام کرنے کی زیادہ مہلت نہ ملی کیونکہ جنگِ بعاث میں وہ جان پر کھیل گئے،[۱۸] لیکن پھر بھی تحریکِ اسلام کو اہلِ مدینہ سے روشناس کرانے میں ان کی خدمات سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔

ساحر کی مسحُوری:

کہتے ہیں، تاریخ اپنے آپ کو دُہراتی رہتی ہے، اگرچہ اس کے انداز بدلتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو جن اہم واقعات سے دوچار ہونا پڑا تھا، اس نوعیت کے واقعات باندازِ دیگر آپؐ کو بھی پیش آئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سب سے بڑا معجزہ

عصا تھا، جس نے اژدہے کا روپ دھار کر فرعون کے ساحروں کی سانپ نما رسیوں کو ہڑپ کر کے معجزے اور سحر کے فرق کو واضح کر دیا تھا اور جسے دیکھ کر فرعون کے جادوگر بلیساختہ پکار اُٹھے تھے:

ہم تمام جہانوں کے پروردگار پر ایمان لائے (یعنی) موسیٰ اور ہارون کے رب پر۔[۱۹]

اسی نوعیت کا واقعہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پیش آیا۔ یمن کے ضماد بن ثعلبہؓ ازدی[۲۰] عرب کے مشہور ساحر تھے اور علاج معالجہ اور جھاڑ پھونک کا کام کرتے تھے۔ علم و حکمت سے انھیں خاص شغف تھا۔ غالباً اسی لیے آپؐ سے محبت کرتے تھے۔ وہ کسی کام کی غرض سے مکہ معظمہ آئے ہوئے تھے کہ انھوں نے یہ چرچا سُنا کہ آپؐ پر جنات کا اثر ہے۔ اعدائے اسلام کا یہ غلط اور گمراہ کن پروپیگنڈا سُن کر ضماد ازدیؓ آپؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور علاج کرنے کی غرض سے اپنے منتر سُنانے کی پیش کش کی۔ آپؐ نے فرمایا : پہلے مجھ سے کچھ سُن لو اور اس کے ساتھ ہی کلماتِ حق نبوت کی زبانِ اعجاز سے نکلے اور اس کے دل کی گہرائیوں میں اُترنے لگے۔ اس نے عالمِ حیرت و استعجاب میں سُنا کہ آپؐ فرما رہے تھے :

حمد و ستائش اللہ ہی کے لیے ہے۔ ہم اس کی نعمتوں کا شکر کرتے ہیں اور اسی کی مدد کی طلب و آرزو رکھتے ہیں۔ جس کو اللہ تعالیٰ راہ دکھاتا ہے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا۔ اور جسے اللہ تعالیٰ ہی راستہ نہ دکھائے، اس کی رہنمائی کوئی نہیں کر سکتا۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اِلٰہ (یعنی معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود) نہیں۔ وہ یکتا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ میں اس بات کی بھی شہادت دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ تعالیٰ کا رسول اور اس کا بندہ ہے۔[۲۱]

صداقت و بلاغت نے آپؐ کے کلام کو معجزہ بنا دیا تھا جسے سن کر حضرت ضمادؓ مسحور ہو کر رہ گئے۔ انھوں نے جو کچھ سُنا تھا، ان کی دل کی دنیا میں حسین و منوّر انقلاب لانے کے لیے کافی تھا، لہٰذا ان کے دل کی آرزو یہی ہوئی کہ اسے ہی بار بار سنا جائے تاکہ وہ کلمات بار بار فردوسِ گوش بنتے رہیں۔ چنانچہ ان کی استدعا پر آپؐ نے یہ کلمات جن کی قسمت میں وعظ و خطابت کی زینت اور زندۂ جاوید ہونا لکھا تھا، تین بار دُہرائے۔ حضرت ضمادؓ کی دنیائے دل میں جمالیاتی لمحہ تو پہلے ہی آ چکا تھا اور اس کی کایا پلٹ چکی تھی۔ انھوں نے فرطِ شوق و طرب سے آپؐ کے دستِ مبارک کو تھاما، بیعت کی اور تحریکِ اسلام میں شامل ہو گئے۔[۲۲]

کمالِ سیر و شہود یا معراج[۲۳] (۲ قبل ہجرت / ۶۲۰ء) :

آپؐ لوگوں کے لیے رحمت تھے اور آپؐ کی تحریکِ انقلاب، تحریکِ رحمۃ للعالمینی تھی، کیونکہ اس کی غایت انسان کو اس کے اِلٰہ و ربّ سے ملانا تھا، نیز اس کی گردن سے سیاسی، معاشی، ثقافتی اور معاشرتی غلامی و محکومی کے طوق اُتارنا، اس کی زندگی کے جمود و تعطّل کو توڑنا اور اس کی دُنیا میں فتنہ و فساد کو ختم کر کے اُسے امن و سلامتی کی جنّت بنانا اس کے مقاصد میں شامل تھا۔ مختصر یہ کہ آپؐ کا مشن علم و حکمت اور تزکیۂ نفس کے ذریعے انسان کو اس کے حقیقی مقامِ عبدیت پر متمکن کرنا تھا، جو اس کی معراجِ کمال ہے۔ لیکن انسان کے ظلم و جہل کو کیا کہیے کہ وہ اپنے ہی محسن و مربّی اور ہادی و مُرشد کا دشمن ہو جاتا ہے۔ لوگ آپؐ کی تحریک اور اس وجہ سے آپؐ کے دُشمن تھے، مگر آپؐ اس سے بے نیاز ان کو راہ راست پر لانے میں برابر کوشاں رہتے تھے۔ یہ کام بلاشبہ ازبس مشکل اور دیر طلب تھا، لیکن آپؐ کے پاس بھی جفاکش دل، حوصلہ، صبر، حکمت اور وقت سب کچھ تھا۔ علاوہ بریں آپؐ میں خود اعتمادی بھی بدرجۂ اتمّ موجود تھی۔ مختصر یہ کہ آپؐ کے پاس وہ سب کچھ تھا، جو اسلام کی انقلاب انگیز تحریکِ رحمۃ للعالمینی کو کامیاب بنانے کے لیے ضروری تھا لہٰذا شدائد و مصائب، موانع، ناکامیاں آپؐ کو رہینِ یاس و حرماں نہ کر سکیں۔ اسلام کی راہ پُرخار، دُشوار گزار اور پیچ در پیچ تھی اور رہ نوردِ شوق آبلہ پا تھا، لیکن عشق چونکہ سچّا، آفاقی اور الوہی۔ انسانی تھا، اس لیے اس راہ سے گزر کر منزل پر پہنچ جانے کی اس میں صلاحیت تھی اور اس سے رُوحِ زمانہ واقف تھی۔

معاملہ دراصل دُہری محبت کا تھا۔ ایک طرف آپؐ اپنے "اِلٰہ" کے بحرِ عشق کے شناور تھے تو دوسری جانب اس کی حسین و محبوب مخلوق، انسان کی محبت میں سرشار تھے۔ آپؐ کے دن محبتِ انسانی میں گزرتے تھے تو راتیں عشقِ الٰہی میں کٹتی تھیں۔ "دوست" کبھی آپؐ کو عشقِ انسانی میں شہر کی گلیوں اور بازاروں میں تو کبھی شہر سے باہر مضافاتی بستیوں، کاروانوں، خانہ بدوشوں اور میلوں میں لوگوں سے ملتے جُلتے اور انھیں دعوتِ اسلام دیتے دیکھتا۔ آپؐ انھیں کبھی قرآن مجید سُناتے، کبھی دُنیوی و اُخروی کامیابیوں کا مژدہ دیتے اور کبھی اپنے زورِ خطابت سے انھیں قائل کرتے۔ "دوست" یہ بھی نظارہ کرتا اور آپؐ کو ابولہب اور دوسرے شریروں کی زبان درازیوں اور ایذا رسانیوں کی اذیتیں برداشت کرتے بھی دیکھتا۔ لیکن جب آدھی رات ہوتی اور آپؐ نیند سے بیدار ہو کر اپنے اِلٰہ یا "دوست" کی بارگاہِ حُسن میں پہنچتے تو ہر زخمِ دل گُلِ مسرّت بن جاتا، حجاب اُٹھ جاتے اور ایک عالمِ حُسن و سرور پیدا

ہو جاتا اور شاہد و مشہود میں راز و نیاز کی باتیں شروع ہو جاتیں۔ آپؐ جسماً کبھی قیام کی اور کبھی سجود کی حالت میں ہوتے مگر حقیقت میں آپؐ "دوست" کے حضور ہوتے۔ اس عالمِ حضوری کا ہر لمحہ، لمحۂ دہر کی طرح طولانی اور شہد کی طرح سرور انگیز تھا۔ دن کے آنی و فانی لمحات کے رنج و الم کے بدلے آپؐ کو عالمِ حضوری کے لمحاتِ جاودانی کی مسرتیں ملتیں۔ اہلِ حسن و سرور کے سوا کسے معلوم کہ حُسنِ دوست" کی دید سے دل کو کیف و سرور کی جو ٹھنڈک پہنچتی ہے، اس کی کیفیت و کمیت کیا ہوتی ہے؟

انسان چاہے کتنا ہی عظیم و بزرگ کیوں نہ ہو، دوسرے انسانوں کی طرح رہینِ نوامیسِ فطرت ہوتا ہے، تکان اور نیند سے اسے مفر نہیں ہوتا اور طبعی تقاضوں کی تشفی کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ آپؐ چونکہ سارا سارا دن تحریک کے کاموں میں مشغول رہتے تھے، اس لیے آپؐ کے جسمِ اطہر کو رات کے وقت نیند و راحت کی حاجت ہوتی تھی۔ "دوست" یہ جانتا تھا لیکن محبت کو قرار کہاں تھا؟ "الٰہ" اپنے پرستار کے اور شاہد اپنے مشہود کے بغیر نہ تو رہ سکتا تھا اور نہ رہتا تھا۔

آپؐ کا اُسوۂ حسنہ یہ تھا کہ نمازِ عشا کے بعد آپؐ آرام فرماتے اور سو جاتے، لیکن اس عالمِ خواب میں بھی آپؐ کا قلبِ مبارک بیدار رہتا تھا[۲۴]۔ پھر آدھی رات کو "دوست" سے ملنے کے لیے اُٹھ بیٹھتے، وضو کرتے اور نماز قائم کرتے اور اس عالم میں "دوست" کی بارگاہِ حسن و سرور میں پہنچ جاتے۔ جسم بہرحال جسمِ انسانی تھا، تھک جاتا اور اسے اپنی تکان دور کرنے اور کھوئی ہوئی توانائی کو بحال کرنے کا بہت کم وقت ملتا تھا۔ "دوست" سے نہ تو یہ بات دیکھی جاتی تھی اور نہ محبت کو یہ گوارا تھا کہ لقاو حضوری کا وقت کم ہو جائے۔ اس نے اپنی اس کیفیتِ محبت کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ "چھپائے نہ بنے" کی صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے۔ دیکھیے "دوست" کس پیار سے کہتا ہے:

اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے! رات کو (ہماری بارگاہ میں) قیام کیا کرو، مگر تھوڑا۔ آدھی رات یا اس سے کچھ کم، یا کچھ زیادہ۔ اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔ ہم عنقریب تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ رات کا اُٹھنا نفس پر قابو پانے کے لیے بہت کارگر اور قرآن ٹھیک پڑھنے کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ دن میں تو تمھارے لیے بہت مصروفیات ہیں۔ اپنے ربّ کا ذکر کیا کرو اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہو۔ وہ مشرق و مغرب کا ربّ ہے۔ اس کے سوا کوئی اِلٰہ (معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود) نہیں۔ لہٰذا اسی کو اپنا وکیل بنا لو اور جو باتیں لوگ بنا رہے ہیں، ان پر صبر کرو اور خوب صورت انداز سے ان سے علیحدہ ہو جاؤ۔ ان جھٹلانے والے خوشحال لوگوں سے نمٹنے کا کام تم مجھ پر چھوڑ دو اور انھیں ذرا کچھ دیر اسی حالت

پر رہنے دو۔ تم لوگوں کے پاس ہم نے اسی طرح ایک رسول تم پر شاہد بنا کر بھیجا ہے جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا تھا[۲۵]۔

"دوست" اپنے دوست سے مخاطب ہے، اندازِ تخاطُب اور خطاب کا ایک ایک لفظ محبت کا غمّاز ہے۔ محبت کو قرب و وصال کے زیادہ سے زیادہ لمحات کی تمنا بھی ہے اور محبوب کی شب بیداری اور تکلیفِ جسمانی کا خیال بھی ہے۔ فراق منظور بھی نہیں اور محبوب کو مشقت میں ڈالنا گوارا بھی نہیں۔ طغیانِ محبت میں احساسِ محبوب کی شدت نے گومگو کی نہایت دلکش صورتِ حال پیدا کر دی ہے۔

حُسنِ دوست کے نظّارے کی طرح جلوۂ حُسنِ آواز بھی کیف و سرور کا سامان ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی لیے ارشاد ہوا کہ قرآن کو پڑھو مگر حُسنِ آواز کے ساتھ، تاکہ حسنِ کلام حسن آواز کے ساتھ مل کر سحرِ سرور بن جائے۔ یہ تو محبت کا نجی معاملہ تھا۔ آپؐ مقامِ محبوبیت کے علاوہ مقامِ نبوت پر بھی تو متمکن تھے، اور اس حیثیت سے آپؐ اسلام کی انقلاب انگیز تحریکِ رحمۃ للعالمینی چلا رہے تھے، جس میں آپؐ صبر آزما آزمائشوں میں سے گزر رہے تھے۔ چنانچہ دفعتاً کلام کا رُخ مڑتا ہے اور ارشادِ الٰہی ہوتا ہے:

"تمھارے لیے عشق کا ایک امتحان اور بھی ہے جو بہت بھاری ہے"۔

یہ امتحان ہجرت کا تھا، جس میں "دوست" کے گھر (خانہ کعبہ) سے مہجوری و دُوری کے تجربے سے گزرنا تھا۔ یہ تجربہ بے شک شکیب رُبا تھا، لیکن تحریکِ انقلاب کی کامیابی کے لیے ناگزیر بھی تھا۔ یہ پیغام دراصل آپؐ کو ہجرت کے لیے تیار رہنے کے لیے تھا۔

کلام میں پھر گریز ہوتا ہے۔ آپؐ کو اپنے حضور زیادہ سے زیادہ رکھنے کے لیے شب بیداری اور سجود و قیام کی پھر فرمائش ہوتی ہے، مگر بانداز دیگر۔ اور یہ فرمائش بالواسطہ بھی ہے اور حکیمانہ و مشفقانہ بھی، اور اس میں حُسنِ آواز سے کلامِ دوست پڑھنے کی آرزو بھی مضمر ہے۔ "دوست" کا دل تو یہی چاہتا تھا کہ محبوب ہر دم پاس رہے، لیکن آپؐ پر رسالت و نبوت کا بارِ گراں بھی تو تھا، اس لیے دن "دوست" ہی کے بندوں کی خدمت میں گزر جاتا تھا۔ "دوست" کو آپؐ کے گوناگوں مشاغل و مصروفیات کا احساس تھا۔ چنانچہ وہ کس ارمان بھرے انداز سے اپنے محبوب سے کہتا ہے "دن کو تمھاری مصروفیات طویل ہوتی ہیں"، مگر رات تو ہے۔ ساتھ ہی اسے احساس ہوتا ہے کہ رات تو اس نے خود انسان کے آرام و راحت کے لیے بنائی ہے۔ لیکن محبت اس احساس پر غالب آجاتی ہے

اور محبوب کو رات کی خاموشی اور تنہائی و تاریکی میں اپنے حضور بُلانے کے لیے مُشفقانہ اندازِ اختیار کرلیتی ہے اور ارشاد ہوتا ہے :

"رات کا اُٹھنا نفس پر قابو پانے کے لیے بڑا مؤثر ذریعہ ہے اور قرآنِ مجید کا حسنِ آواز سے پڑھنے کا موزوں وقت بھی۔"

یہ تو فرمائش و ترغیب کا ایک رنگ ڈھنگ تھا۔ محبوب بہر حال بشر تھا اور بشر کو نیند و آرام سے مفر کہاں ؟ ہوسکتا تھا کہ محبوب نیند یا کسی اور صورتِ حال سے مجبور ہوکر رات کو قیام تو کرے مگر کم، اور محبّت کو یہ گوارا نہ تھا۔ "دوست" تو محبوب کے دنوں کی طرح راتوں کو بھی اپنے لیے مختص کرلینا چاہتا تھا۔ آپؐ تو فقط "دوست" کے تھے۔ آپؐ کی زندگی کے شب و روز تو کیا، ایک ایک لمحہ اس کے لیے وقف تھا۔ یہ تصورِ محبّت کے رنگِ اضطرار کو اور شوخ کردیتا ہے اور وہ صاف صاف "محبوب" سے کہہ دیتی ہے :

"تمھاری زبان پر نام ہو تو تمھارے اِلٰہ و ربّ کا۔ تمھارے فکر کا معروض ہو تو تمھارا دوست ——— یہی نہیں، بلکہ سب سے مُنہ موڑ کر فقط اسی کے ہو رہو اور پھر دونوں کا یہ عالم ہو کہ

من تو شدم تو من شدی، من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری!

پھر محبوب سے نبیؐ کی طرف گریزِ کلام ہوتا ہے۔ آپؐ کو اس حقیقت سے باندازِ رمز و کنایہ آگاہ کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مشرق و مغرب کی تمام اقوام بلکہ مخلوقات کا رازق و مالک اور ان کا نشوو ارتقا کرنے والا آقا (ربّ) اور معبُود و محبُوب اور مطلُوب و مقصُود (اِلٰہ) ہے، لہٰذا اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کو مشرق و مغرب میں پہنچنا اور لوگوں نے اس سے مستفیض و مستفید ہونا ہے۔ آپؐ اس عالمگیر تحریک کے چلانے کے لیے صرف اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا وکیل یعنی مُشیر و کارساز اور مختار بنائیں۔ اہلِ مکّہ اور دوسرے لوگ جو کچھ کہتے ہیں، اسے برداشت کرتے جائیں اور ان سے احسن طریق سے کنارہ کشی کرلیں۔ یہ جو آپؐ کی تکذیب کرنے والا مرفّہ الحال طبقہ ہے، اس سے میں نمٹوں گا اور ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ یاد کریں گے۔

آپؐ کے اطمینانِ قلب کی خاطر آپؐ کو یہ خوشخبری دینے کے ساتھ کہ اسلام کی تحریک کامیابی کے ساتھ مشرق و مغرب میں پھیلے گی اور خوشحال طبقہ، جس نے آپؐ کی تکذیب و مخالفت کی ہے، ناکام و نامراد اور مقہور و مغضوب ہوگا، آپؐ پر یہ حقیقت آشکارا کردی گئی کہ آپؐ کے مشن

کی نوعیت وہی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مشن کی تھی۔ ان کا مشن بنی اسرائیل کو فرعون، ہامان اور قارون کے پنجۂ استبداد اور طوقِ غلامی سے نجات دلانا، ان کو ایک خود مُختار و آزاد قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے کے آداب سکھانا، انھیں وارثِ زمین بنانا اور ان کے لیے ایک ایسے معاشرے کا قیام عمل میں لانا تھا، جس میں اخوّت و مساوات اور حُرّیت ہو، نیز حاکمیتِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہو، مگر اس میں فرعونیّت، ہامانیّت اور قارونیّت کا فُقدان ہو۔

یہ خوش خبری جس قدر ہمّت میں جوانی اور حوصلے میں توانائی پیدا کرنے والی تھی، اسی قدر اس مثالی انسانی معاشرے کی تشکیل کا کام صبر آزما و خطرناک تھا، کیونکہ حالات ناسازگار و شکیب رُبا تھے۔ دل آخر دل ہوتا ہے اور یہ بات فاطرِ ہستی جانتا تھا، اس نے آپؐ کو بعض اہم حقائقِ زندگی اور خاص کر اسلامی معاشرے کا مشاہدہ کرانے کا فیصلہ کیا۔ اسلامی معاشرے سے مُراد ایسا مثالی انسانی معاشرہ ہے جس کا اِلٰہ اور ربّ فقط اللہ تعالیٰ ہو اور اسی کے ہاتھ میں اقتدارِ اعلیٰ اور حاکمیت ہو اور حکم بھی صرف اسی کا چلتا ہو، نیز اس میں اخوّت و مساوات اور حُرّیت پائی جاتی ہو۔

"دوست" نے آپؐ کو اس عالم کی سیر کرائی تھی جس کے زمان و مکان کی نوعیت کچھ اور تھی۔ وہ عالمِ دہر و الحیوان تھا۔ دہر سے مراد زمانِ محض ہے جو وقت، عصر اور زمان سے ورا ہے۔ اسے زمانِ رحمٰن بھی کہتے ہیں۔ اسے "الحیوان" اس لیے کہتے ہیں کہ وہ موت ناآشنا عالمِ حیات ہے۔ ظاہر ہے اس عالمِ محض کے مشاہدے کے لیے حواس و قلب بھی اور طرح کے چاہییں تھے، یعنی محض حُسن و نور۔ چنانچہ ۲۷ رجب ۲ قبل ہجرت / ۸ مارچ ۶۲۰ء کو اس غرض کے لیے اللہ تعالیٰ نے دو فرشتے بھیجے۔ انھوں نے آپؐ کا سینہ چاک کیا اور قلب کو "الحیوان" کے آبِ مطہّر سے دھویا، اور پھر اسے اپنی جگہ رکھ کر چاک بند کردیا۔ بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو پہلے بیت اللہ سے بیت المقدّس کی سیر کرائی اور پھر عالمِ دہر و الحیوان کی، جہاں ماضی و مستقبل ایک لمحۂ جاودانی کی طرح اور ان کے واقعات ایک متحرک تصویر کی طرح موجود ہیں۔ یہ واقعہ "معراج" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔[۲۶] قرآن مجید میں اس کی طرف اس طرح اشارہ کیا گیا ہے :

وہ منزّہ و پاک ذات ہے، جو اپنے بندے کو رات میں مسجد الحرام (خانۂ کعبہ) سے مسجدِ اقصیٰ (بیت المقدس) تک، جس کے ماحول کو ہم نے بابرکت بنایا ہے لے گیا، تاکہ اسے اپنی آیات یا نشانیاں دکھائیں۔ بیشک وہ سمیع و بصیر ہے۔[۲۷]

یہ آیات کیا تھیں ؟ اس کا علم تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ مقبول صلّی اللہ علیہ وسلّم کو

ہے، لیکن جب انسان اس حقیقت پر غور کرتا ہے کہ آپؐ کی انقلابی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کی غایت ایک حسین انقلاب کے ذریعے صحیح معنوں میں ایک انسانی و مثالی (اسلامی) معاشرہ قائم کرنا تھا تو قیاس اس امر پر اصرار کرتا ہے کہ مشاہدۂ آیات سے مراد یہ ہے کہ آپؐ کو بعض معاشروں کے احوال و حقائق کا مشاہدہ کرایا گیا، جن میں انبیاءؑ علیہم السلام مبعوث ہوئے، خصوصاً فرعون کا معاشرہ۔ اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ اسراء یا معراج کا ذکر جس سورت میں ہوا ہے، اس کا نام اس لیے بنی اسرآئیل رکھا گیا ہے کہ اس میں تفصیل سے حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے عہد کے فرعونی معاشرے کا ذکر ہے، جس میں بنی اسرآئیل محکوم و غُلام تھے اور فرعون، ہامان اور قارون ان کا استحصال کرتے تھے۔ یہ فرعونی معاشرہ اپنے عہد میں جس قدر تہذیب یافتہ اور ترقّی یافتہ سمجھا جاتا تھا، اسی قدر وہ استحصالی بھی تھا، کیونکہ اس کا نظام سرمایہ دارانہ و جاگیر دارانہ تھا۔

اس مشاہدے سے آپؐ میں اس حقیقت کا عین الیقین پیدا کرنا مقصود تھا کہ جس معاشرے میں فرعون، ہامان اور قارون ہوں، وہ غیر فطری و غیر انسانی یعنی غیر اسلامی ہوتا ہے اس لیے وہ ہر اعتبار سے استحصالی ہوتا ہے۔ یاددہانی کے طور پر یہ جتا یا جاتا ہے کہ قرآن مجید نے فرعون، ہامان اور قارون کو ابلیسی علامتوں کے طور سے استعمال کیا ہے اور ابلیس انسان کا بدترین دشمن ہے۔

اللہ تعالےٰ نے آپؐ کو جو مشاہدہ کرایا، اس کی روشنی میں آپؐ نے ہجرت کے بعد جس مثالی انسانی معاشرے کی تشکیل و تعمیر کی، اس میں فرعون، ہامان اور قارون کی قطعاً گنجائش نہیں تھی اور نہ ہے۔ اس اعتبار سے اسراء کا واقعہ آپؐ کے حوالے سے معراجِ انسانیت ہے۔

آپؐ نے لوگوں سے معراج کا ذکر فرمایا تو اہلِ مکہ چونکہ اس کو ایک امرِ محال خیال کرتے تھے، اس لیے انھیں آپؐ کے خلاف پراپیگنڈے کرنے کا ایک موقع ہاتھ آگیا اور اس سے فائدہ اٹھانے کی انھوں نے پوری پوری کوشش کی اور مسلمانوں میں بالخصوص اور دُوسرے لوگوں میں بالعموم شکوک و شبہات پیدا کرنے کی خاطر واقعۂ اسراء کا سلبی انداز میں خوب چرچا کیا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کو جس طرح مردوں میں سب سے پہلے ایمان لانے اور تحریکِ اسلام میں شامل ہونے کی سعادت حاصل ہوئی، اسی طرح انھوں نے سب سے پہلے واقعہ معراج کی ایسے یقین و وثوق سے بے تأمّل تصدیق کی کہ جو صدق ہی کا خاصّہ ہوتا ہے۔ لہٰذا آپؐ نے

انھیں صدّیقؓ کا لقب عطا کیا اور الحق نے حضرت ابوبکرؓ کو صدّیق کے لقب کے ساتھ زندۂ جاوید کر دیا۔

احادیثِ طیّبہ سے ثابت ہے کہ معراج سے واپسی پر آپؐ اللہ تعالےٰ سے انسان کے لیے ایک ارمغانِ "احسان و سرور" لائے، جسے الصّلوٰۃ یا نماز کہتے ہیں۔ نماز دراصل انسان کو مقامِ احسان عطا کرتی ہے۔ نماز کے دوران میں انسان جب اپنے آپؐ کو اپنے اِلٰہ کے حضور سمجھتا ہے تو اس احساس یا شعور سے اس پر ایسی وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے یا آجکل کی زبان میں وہ ایسے تجربے سے گزرتا ہے کہ اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ اپنے اِلٰہ کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ مشہود اور وہ شاہد ہوتا ہے۔ اگر عابد کو ابھی یہ مقام حاصل نہ ہو تو وہ یوں محسوس کرتا ہے کہ جیسے اس کا اِلٰہ اسے دیکھ رہا ہے۔ اس مقام پر اللہ تعالےٰ شاہد اور وہ مشہود ہوتا ہے۔ حسنِ حقیقی کے شہود کے ان دونوں تجربوں سے عابد کو خالص جمالیاتی حظ یا سچّا سرور حاصل ہوتا ہے۔ اور اگر یہ مسلسل حاصل ہوتا رہے تو وہ صاحبِ حسن و سرور بن جاتا ہے۔

نماز چونکہ فواحش و منکرات سے بچنے، نیز تزکیۂ نفس اور قُرب و حضوری کا بہترین ذریعہ ہے، لہٰذا اسے شب و روز کے پانچ موزوں ترین اوقات میں قائم کرنے کا تعین بھی کر دیا گیا۔ اسلام کی دیگر عبادات کی طرح نماز بھی بنیادی طور پر اجتماعی عبادت ہے۔ آپؐ اپنے صحابہ کرامؓ کے ساتھ مقررہ اوقات میں نماز پڑھتے تھے۔ اُمّتِ مُسلمہ آج تک اِنھیں اوقات میں نماز پڑھتی چلی آئی ہے۔ یہ عبادت کی بہترین شکل ہے اور اسی لیے آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ "نماز میں میرے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔"[۳۱]

حضرت طفیل بن عمرو دوسیؓ اور حضرت ابوذر غفّاریؓ کا قبولِ اسلام :

تبلیغی و انقلابی جدّ و جہد کے اس دَور میں دو اہم شخصیّتوں کے تحریکِ اسلام میں شامل ہونے کے واقعات کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے۔ ان میں ایک یمن کے طفیل بن عمرو دوسیؓ اور دوسرے بنو غفّار قبیلے کے ابوذر غفّاریؓ تھے۔ یہ دونوں اصحاب بھی دیگر مُسلمانوں کی طرح اِسلام کی حقانیت اور کلامِ الٰہی کی تاثیر سے ایمان لائے تھے اور ان سب مسلمانوں کا دُنیوی و اُخروی کامیابی کی خاطر برضا و رغبت ایمان لانا اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ اسلام کی اشاعت دل کی راہ سے ہوئی ہے، جبر و اکراہ کی راہ سے نہیں، جیسا کہ صیہونی و صلیبی مستشرقین کا پروپیگنڈا ہے۔

حضرت طفیل بن عمرو دوسیؓ یمن کے قبیلہ دوس کے سردار تھے اور اس کے نواح میں ان کے خاندان کی امارت تھی۔ شاعر و دانش ور ہونے کے ساتھ وہ شاہانہ وجاہت بھی رکھتے تھے۔ ان کے مکّہ معظّمہ میں آنے کا چرچا ہوا تو عوام و خواص سب نے بستی سے نکل کر ان کا شاہانہ استقبال کیا۔ عمائدینِ قریش نے ان کی خاطر و مدارت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا، لیکن ساتھ ہی انھیں پیغمبرِ اسلام صلّی اللہ علیہ وسلّم سے راہ و رسم پیدا کرنے یا آپؐ کی بات سُننے سے بڑے زور سے منع کیا۔ حضرت طفیل کے بقول قریش نے ان سے کہا:

"یہ شخص (یعنی حضرت محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم) جو ہمارے دین سے نکلا ہے، اس سے بچ کر رہنا۔ وہ ساحر ہے اور جادو سے باپ بیٹے، زن و شوہر اور بھائی بھائی میں جدائی ڈال دیتا ہے۔ اس نے ہماری یکجہتی و اتحاد کو پارہ پارہ اور ہمارے کاموں کا ستیاناس کر دیا ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ تمھاری قوم پر بھی ایسا ہی کوئی وبال پڑے، اس لیے ہماری نصیحت ہے کہ اس کے قریب نہ جانا، نہ اس کی کوئی بات سننا اور نہ خود بات چیت کرنا۔

"کچھ دن تو میں نے ان کی نصیحت پر عمل کیا، لیکن ایک روز حُسنِ اتفاق سے حرمِ کعبہ میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے قرآن پڑھنے کی آواز میرے کانوں میں پڑی اور اثر کر گئی۔ میں آپؐ کے پیچھے پیچھے آستانۂ نبوّت پر حاضر ہوا اور آپؐ سے قرآن مجید سُننے کی درخواست کی، جسے شرفِ قبولیت حاصل ہوا۔ واللہ! میں نے ایسا پاکیزہ کلام، جو اس قدر نیکی اور عدل کی تعلیم دیتا ہو، کبھی نہیں سُنا تھا۔ میں اسی وقت مسلمان ہو گیا۔"[29]

اس واقعے کا بڑا چرچا ہوا، جو جتنا اسلام کے حق میں تھا، اتنا ہی اس کے دُشمنوں کے خلاف بھی تھا اور اس سے قریش کے دلوں پر جو گزری، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

جہاں تک حضرت سلمان فارسیؓ یا ابوذر غفاری کا تعلّق ہے، انھیں حق کی طلب و جستجو مکّے لائی تھی۔ انھوں نے جب یہ سُنا کہ مکّے میں ایک قریشی نے نبوّت کا دعویٰ کیا ہے تو دریافتِ حال کے لیے اپنے بھائی کو وہاں بھیجا، لیکن اس کے بیان سے مطمئن نہ ہوئے اور خود مکّے پہنچے۔ آپؐ کی پیغمبرانہ شخصیت کا جمال و جلال دیکھ کر اور زبانِ رسالت مآبؐ سے اسلام کے سچّے عقایدِ جلیلہ و محکمہ سُن کر حضرت ابوذرؓ اس قدر متاثر و مسحور ہوئے کہ فوراً ایمان لا کر تحریکِ اسلام میں شامل ہو گئے۔[30]

حواشی و تشریحات

(۱) ابنِ ہشام، ۲: ۱۴، ۱۵؛ ابن سعد: "طبقات"، ۱: ۲۰۷۔ "تاریخ ابن خلدون"، ۱: ۵۱ بعد (اردو ترجمہ)، سہیلی: "روض الانف"، شبلی: "سیرۃ النبیؐ"، ۱: ۲۴۴ تا ۲۴۶

(۲) instructions

(۳) ابن سعد: "طبقات"، ۱: ۲۱۱، "تاریخ ابن خلدون"، ۱: ۵۲، ۵۳ (اردو ترجمہ)، ابن ہشام، ۱: ۴۲۸ تا ۴۳۱ (اردو ترجمہ)۔

(۴) ابن سعد، موضوع مذکور، شبلی، "سیرۃ النبیؐ"، ۱: ۲۴۹۔

(۵) البقرہ ۲: ۱۸۷۔ اللہ تعالٰے نے اس آیت میں ساتھ ہی یہ حقیقت بھی بیان کر دی ہے: مرد بھی عورت کا لباس ہے۔

(۶) ام المؤمنین حضرت سَودہ بنت زمعہؓ ابتدائی زمانے میں اسلام لائی تھیں۔ ان کے پہلے شوہر کا نام سکران بن عمر تھا۔ ان کا انتقال شوال ۵۴ھ/ ۶۷۴ء میں ہوا۔ ("مشکوٰۃ"، اکمال فی السماء الرجال۔ اردو ترجمہ، ۳: ۳۶۷)۔

(۷) اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ خلیفہ اوّل اور یارِ غار حضرت ابوبکر صدیقؓ کی صاحبزادی والدۂ محترمہ کا نام اُمّ رومان بنتِ عویمر۔ حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ان کے علاوہ کسی کنواری عورت سے شادی نہیں کی۔ اُمّ المؤمنین بڑی فقیہہ، عالم اور دانا تھیں۔ قرآنِ مجید اور سیرتِ رسولؐ پر ان کی گہری نظر تھی۔ بہت سے صحابہؓ اور تابعینؒ نے ان سے احادیث روایت کی ہیں۔ امیر معاویہؓ کے دورِ حکومت میں بروز منگل ۱۷ رمضان ۵۷ھ یا ۵۸ھ کو انتقال فرمایا۔ حضرت ابوہریرہؓ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ وصیّت کے مطابق رات ہی کو جنّت البقیع میں دفن کی گئیں (مشکوٰۃ، اکمال فی اسماء الرجال۔ اردو ترجمہ ۳: ۴۰۷)۔

(۸) تعدّدِ ازدواج کی رخصت عدل سے مشروط ہے (النسآء ۴ : ۳)۔

(۹) ابن سعد : "طبقات"، ۱ : ۲۱۲، "مواہب لدنیہ"، طبری، آرنلڈ : "دعوت اسلام" (اردو ترجمہ)، ص ۲۳، ۲۴، "تاریخ ابن خلدون" (اردو ترجمہ)، ۱ : ۵۳، ۵۴، ابن ہشام (اردو ترجمہ) ۱ : ۴۳۱ تا ۴۳۴۔

(۱۰) طبری، ابن ہشام، مسلم، رحمۃ للعالمین، ص ۶۷ ببعد۔

(۱۱) عدی بن مطعم کا انتقال کُفر کی حالت میں غزوۂ بدر سے پہلے ہوا تھا۔ حضرت حسان بن ثابتؓ نے جو دربارِ رسالت کے شاعر تھے، مرثیہ لکھا۔ زرقانی نے یہ مرثیہ نقل کیا ہے۔ طبقات ابن سعد، ۱ : ۲۱۲ ببعد، شبلی، ۱ : ۲۵۱ ببعد، زرقانی، ۱ : ۵۱۶۔

(۱۲) جہت = DIRECTION

(۱۳) ابنِ سعد (طبقات) نے ان تمام قبائل کا ذکر کیا ہے۔ شبلی، ۱ : ۲۵۲۔

(۱۴) مستدرک "حاکم"، (حیدرآباد، ۱ : ۱۵)۔

(۱۵) قرآن مجید نے ابُولہب کی ناکامی و نامرادی کو اس طرح ریکارڈ کیا ہے : ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ گئے (یعنی وہ اپنے مقصد میں ناکام ہوگیا) اور وہ نامراد ہوگیا۔ اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا وہ اس کے کسی کام نہ آیا۔ ضرور وہ شعلہ زن آگ میں ڈالا جائے گا اور اس کے ساتھ اس کی جورُو بھی، لگائی بجھائی کرنے والی، اس کی گردن میں مُونج کی رسّی ہوگی۔ (اللھب ۱۱۱ : ۱ تا ۵)

یہ سُورت ابولہب کی زندگی میں اس کی موت سے تقریباً آٹھ برس پہلے نازل ہوئی تھی، اور اس کا ایک ایک لفظ درست ثابت ہوا۔ جنگِ بدر میں ابولہب کے ساتھی جو سردارانِ قریش میں سے تھے، مارے گئے اور وہ ایک ہفتے کے اندر اندر عبرتناک موت مرا۔ اسے عدسہ (سُرخ پھنسی) کی بیماری ہوگئی۔ چھُوت کی بیماری کی وجہ سے کوئی شخص اس کے قریب نہ جاتا تھا، حتّٰی کہ وہ کس مپرسی کی حالت میں مرگیا اور تین دن تک اس کی لاش گلتی سڑتی رہی اور آخر حبشیوں کو اُجرت دے کر لاش اُٹھوائی اور گڑھے میں دفن کی گئی۔ ابولہب کا نام ابوالعُزّیٰ بن عبد المطلب تھا۔ رشتے میں آپؐ کا چچا تھا۔ اس کی بیوی کا نام اروی اور کُنیّت اُمِّ جمیل تھی۔ یہ ابُوسفیان کی بہن تھی اور اسے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم سے شوہر کی طرح سخت عداوت تھی (تفہیم القرآن، ۶ : ۵۲۵ تا ۵۲۷)۔

(۱۶) ابن سعد "طبقات"، ۱ : ۲۱۷ ببعد، "تاریخ ابنِ خلدون"، ۱ : ۵۵ ببعد، ابن ہشام ۱ : ۴۳۵ تا ۴۴۱ (اردو ترجمہ)۔

(۱۷) یابنی فلان انی رسول اللہ الیکم یأمرکم أن تعبدوا اللہ ولا تشرکوبہٖ شیئًا و ان تخلعو ماتعبدون من دون اللہ من ھذہ الانداد و ان تومنوا بی وتصدّقوا بی وتمنعونی حتّی أبیّن عن اللہ ما بعثنی بہ (ابن ہشام، ۱ : ۴۳۵، ببعد، اردو ترجمہ)۔

(۱۸) ابن ہشام، ۱ : ۴۳۸ تا ۴۴۰ ببعد (اردو)، شبلی، ۱ : ۲۶۱، ابن کثیر: "البدایہ والنہایہ"، ۳ : ۱۴۷۔

(۱۹) اصل میں ہے : اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ٥ رَبِّ مُوْسٰی وَ ھٰرُوْنَ٥ (الاعراف ۷ : ۱۲۱، ۱۲۲)۔

(۲۰) حضرت ابن عباسؓ نے حضرت ضمادؓ سے روایت کی ہے کہ ضماد کو ضاد کے زیر سے پڑھنا چاہیے۔ (مشکوٰۃ (اردو) ۳ : ۳۷۲)۔

(۲۱) اَلحَمْدُ لِلّٰہ نحمدہٗ ونستعینہٗ من یھدہ اللہ فلا مضلّ لہٗ ومن یضللہٗ فلا ھادی لہٗ واشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریکَ لہٗ واشھد ان محمّداً عبدہٗ ورسولہ امّا بعد (صحیح مسلم بحوالہ رحمۃ للعالمین، ص ۶۹، ۷۰)۔

(۲۲) متذکرۂ بالا (۲۰، ۲۱) حوالے۔

(۲۳) سیرو شہود یا معراج : یہ واقعہ اسراء اور معراج کے نام سے مشہور ہے اور سُورۃ بنی اسرآئیل کی پہلی ہی آیت میں اس طرح مذکور ہے : پاک و منزّہ ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجدِ حرام سے دُور کی اس مسجد تک، جس کے ماحول کو اس نے برکت دی، تاکہ اسے اپنی کچھ نشانیوں (آیات) کا مشاہدہ کرائے۔ حقیقت میں وہی ہے سب کچھ سُننے اور دیکھنے والا۔ (۱۷ : ۱)۔

یہ نشانیاں کیا تھیں؟ قرآنِ مجید میں اس کا واضح و بلاواسطہ جواب نہیں ملتا، البتہ اس نے اس واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہی فرعونی، ہامانی، قارونی معاشرے میں بنی اسرآئیل کی قید و بند کا اور ان کی رہائی کے لیے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہم السلام کی کوششوں اور فرعون کی حکومت کے ساتھ ان کی سرد انقلابی جنگ اور کامیابی کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس سے یہ استنباط کیا جاسکتا ہے کہ ایک تو آپؐ کو دوزخ آسا فرعونی معاشرے کا مشاہدہ

کرایا گیا، دوسرے آپؐ کو جنت بداماں معاشرے کی سیر کرائی گئی تاکہ آپؐ عرب کے فرعونی معاشرے کا استیصال کر کے لوگوں کو رہائی دلائیں اور ان کے لیے جنت بداماں معاشرے کی تشکیل و تعمیر کریں، جس کا موقع انھیں عنقریب ہجرت کے بعد ملنے والا تھا۔

(۲۴) قلب بیدار : رسُول اللہؐ کے قلبِ بیدار کی نوعیت ایک عام انسان کے قلب بیدار کی نوعیت سے یقیناً مختلف ہونی چاہیے، لہٰذا اس سے گفتگو نہیں ہوسکتی۔ البتہ عام انسان کے قلب سے بیدار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ نیند کے عالم میں بھی اللہ تعالےٰ کے حوالے سے حکیمانہ و بامقصد تفکر و تذکر میں فعال و مشغول رہتا اور اس کے حاصلات کو حافظے میں محفوظ کرتا رہتا ہے، جو عموماً درُست ہوتے ہیں۔ نیز قلب کی فعلیت اتنی پکی ہوتی ہے کہ انسان یہی محسُوس کرتا ہے جیسے وہ خواب میں نہیں، بیدار ہے۔

(۲۵) المزمّل ۷۳ : ۱ تا ۱۵

(۲۶) بخاری و مسلم میں معراج کا واقعہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ دیکھیے مشکوٰۃ 'باب فی المعراج۔ ج ۱

(۲۷) الاسراء ۱۷ : ۱۔

(۲۸) اصل میں ہے : وجعلت قرّۃ عینی فی الصّلوٰۃ (احمد، نسائی، بحوالہ مشکوٰۃ، کتاب الرقاق باب فضل الفقرا ..... ج ۳۔

(۲۹) "زاد المعاد"، ۱ : ۴۹۳، اکمال فی اسمآء الرجال در مشکوٰۃ (اردو ایڈیشن)، ۳ : ۳۷۳ ببعد۔

(۳۰) صحیح بخاری، کتاب المناقب مدارج النّبوۃ، اکمال فی اسمآء الرجال۔ در مشکوٰۃ (اردو)، ۳ : ۳۶۰ (الف) ببعد۔

باب : ۷

تحریکِ اسلام مدینۂ منوّرہ میں

۱ :— اہلِ یثرب سے رابطے کا آغاز : حضرت ایاس بن معاذؓ تحریکِ اسلام میں

۲ :— جنگِ بُعاث اور تحریکِ اسلام

۳ :— یثرب کے چھ خزرجیوں کا قبولِ اسلام

۴ :— بیعتِ عُقبۂ اُولیٰ

۵ :— مدینے میں حضرت مصعب بن عمیرؓ کی تبلیغی و انقلابی سرگرمیاں

۶ :— حضرت اُسید بن حُضیرؓ اور حضرت سعد بن معاذؓ تحریکِ اسلام میں

۷ :— بیعت عقبۂ ثانیہ

۸ :— حواشی و تشریحات

باب ۷

تحریکِ اسلام مدینہ منوّرہ میں

اہلِ یثرب سے رابطے کا آغاز : (ذی الحجہ ۲ قبل ہجرت / جولائی ۶۲۰ء)

جن ایّام میں پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے مدینے کو تحریکِ اسلام کا ملجا و مستقر بنانے کا ارادہ کیا، وہ زمانہ سیاسی، معاشی بلکہ ہر لحاظ سے تحریکِ اسلام کے لیے سازگار تھا اور آپؐ کی بصیرت اس صورتِ حال کو بھانپ چکی تھی۔

یثرب میں دو قومیں آباد تھیں : یہود اور مُشرک و بُت پرست۔ صنعت و تجارت اور مذہب و معیشت، ہر اعتبار سے یہود اپنی حریف قوم پر تفوق رکھتے تھے، جو اوس اور خزرج دو قبیلوں میں منقسم تھی۔ یہ دونوں قبیلے جنگجو تھے اور ان کی متحدہ قوت چونکہ یہود کے لیے مستقل خطرہ بن سکتی تھی، اس لیے دونوں میں تشتت و افتراق اور مخاصمت پیدا کرتے رہنا اور انھیں برسرِ پیکار رکھنا، یہود کی کامیاب حکمتِ عملی تھی۔ علاوہ بریں یہودیوں نے ان دونوں قبائل کو پس ماندہ اور اپنا دست نگر رکھنے کی خاطر ایک تو صنعت و حرفت اور تجارت پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی تھی اور دوسرے سُود کاری کے ذریعے ان کی معیشت کو مفلوج کر رکھا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جہالت و پس ماندگی ان کا مقدّر بن چکی تھی۔ اوس و خزرج دونوں کو یہود کے استحصال، ان کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کا شعور تھا، لیکن اپنی قبائلی عصبیت و جہالت اور یہود کی شاطرانہ چالوں کے سبب متحد نہ ہو سکتے تھے اور نہ ہوئے۔ خانہ جنگی معمول بن چکی تھی، جس میں فریقین کا جانی و مالی نقصان ہوتا رہتا تھا۔ ان ایّام میں یہود کی سازشوں کی وجہ سے ان دونوں قبائل پر ایک بڑی اور خونریز جنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ چنانچہ اوس جو خزرج کے مقابلے میں کمزور ثابت ہو چکے تھے، اور خونریز جھڑپوں میں بھی شکست کھا چکے تھے، طاقت کا توازن قائم کرنے کی خاطر قریشِ مکّہ کو اپنا حلیف بنانا چاہتے تھے۔ اس غرض کے لیے انھوں نے انس بن رافع کی سرکردگی میں ایک وفد قریش کے پاس مکّہ معظّمہ بھیجا۔

تحریکِ اسلام کے مبلغِ اعظمؐ جو اُن دنوں مدینے کے لوگوں کے منتظر رہتے تھے، یہ خبر سُنتے ہی ان کے پاس تشریف لے گئے۔ انھیں تحریکِ اسلام کی غرض وغایت سے آگاہ کیا، اس میں شمولیت کی دعوت دی اور پھر چند آیاتِ قرآنی تلاوت فرمائیں۔ ایک دل جس میں قبولیتِ حق کی استعداد تھی، کلامِ الٰہی سے بے حد متاثر ہُوا۔ یہ صاحبِ دل انسان حضرت ایاس بن معاذؓ تھے جو اس وفد کے ایک رُکن تھے۔ وہ بے اختیار اپنے لوگوں سے کہنے لگے: "اللہ کی قسم! تم جس غرض سے یہاں آئے ہو، یہ دعوت اس سے بدرجہا بہتر ہے"۔ لیکن قائدِ وفد ابو الجیسر انس بن رافع نے ان کی بات نہ مانی۔ وفد یثرب لوٹا تو تہی دامن تھا، سوائے حضرت ایاس بن معاذؓ کے، جن کا دامنِ حیات دولتِ ایمان سے معمور تھا۔[۱] اس کے بعد جنگِ بُعاث چھڑ گئی، جس میں طرفین کا بھاری جانی و مالی نقصان ہوا لیکن شکست سے اوس کو دوچار ہونا پڑا۔

جنگِ بُعاث اور تحریکِ اسلام: (۲ قبل ہجرت / ۶۲۰ء)

تحریکِ اسلام کے نقطۂ نظر سے جنگِ بُعاث کی اہمیت اس سے بہت زیادہ ہے، جو عام طور سے اسے دی جاتی ہے۔ یہ جنگ اوس وخزرج کے درمیان ہوئی تھی جس میں ان کے حلیف یہودی قبائل نے بھی شرکت کی تھی، لیکن ہلاکت وبربادی میں یہود کا حصہ بہت کم تھا۔ یہ جنگ اس قدر خوں ریز اور تباہ کُن تھی کہ اوس وخزرج دونوں کے کس بل نکل گئے اور وہ فوجی، سیاسی اور معاشی ہر لحاظ سے اس قدر کمزور ہو گئے کہ یہود کی جارحیت کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ رہے۔ یہود کے منافقانہ کردار سے انھیں اس حقیقت کا احساس ہو چکا تھا کہ وہ ان دونوں قبائل کے مشترکہ دُشمن اور ان کے لیے مستقل خطرہ ہیں۔ یہ صورتِ حال ان کے لیے بہت خطرناک تھی، لیکن اس سے عہدہ برآ ہونا ان کے لیے ایسا مسئلہ تھا جس کا کوئی تسلی بخش حل ان کے پاس نہ تھا۔ سیاسی کمزوری اور معاشی پس ماندگی نے ان کے دلوں میں یہود کے دین کی افضلیت کا احساس بھی پیدا کر دیا تھا۔ یہُود نے اپنی الہامی کُتب کی طرح دین کی صورت بھی بگاڑ دی تھی اور جس توحید کے وہ مُدعی تھے، وہ بھی خالص نہ رہی تھی۔ لیکن شرک وکفر کے مقابلے میں توحید بہرحال حق وصداقت کی قوت رکھتی تھی، اس لیے اوس وخزرج دونوں قبائل میں احساسِ کمتری پایا جاتا تھا، نیز ان کے دل توحید کی طرف مائل ہو رہے تھے۔ علاوہ بریں نصاریٰ کی طرح یہود بھی اپنی الہامی کتابوں کی اس پیشگوئی کی وجہ سے کہ عنقریب "وہ نبیؐ آنے والا ہے"، اس نبیؐ کے ظہور کے متمنی ومنتظر تھے۔ چنانچہ وہ اپنے ہمسایہ

بُت پرست قبائل اوس وخزرج سے کہا کرتے تھے: "عنقریب ایک نبیؐ آنے والا ہے اور اس کے ظہور کا وقت قریب ہے۔ ہم اس کی پیروی کریں گے اور اس کے ساتھ مل کر تمھیں ہلاک کر دیں گے، جس طرح عاد و ارم ہلاک ہوئے تھے"۔[۲] ان خارجی و داخلی عوامل ومؤثرات نے، جو جنگِ بُعاث سے بالخصوص پیدا ہوئے تھے، تحریکِ اسلام کی مدینے میں ہجرت وکامیابی کی راہ ہموار کر دی تھی، لیکن اس سے اسے بعد میں نقصان بھی پہنچا، جس کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے۔

جنگِ بُعاث طویل، ہمت شکن اور شکیب رُبا ہوئی، لہٰذا اوس اور خزرج دونوں قبیلوں نے تھک کر صُلح کر لی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ دونوں قبیلوں کو متّحد رکھنے کی خاطر کسی شخص کو اپنا بادشاہ بنا لیں۔ چنانچہ فریقین عبداللہ بن اُبیّ بن سلول کے انتخاب پر رضامند ہو گئے۔ ابھی اس کی رسمِ تاجپوشی کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ تحریکِ اسلام مدینے میں شروع ہو گئی اور ساتھ ہی ہجرت کا آغاز ہوا اور پھر پیغمبرِ اعظم وآخر صلی اللہ علیہ وسلم مدینے میں تشریف لے آئے اور دونوں قبائل میں ایک ہمہ گیر دینی (رُوحانی، سیاسی، مذہبی، معاشی اور معاشرتی) انقلاب آ گیا اور ساتھ ہی مدینے میں اسلامی ریاست کی داغ بیل پڑ گئی اور اس سے عبداللہ بن اُبیّ کے بادشاہ بننے کا امکان ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ یہ ایسا حسرتناک اور اذیت ناک صدمہ تھا کہ عبداللہ بن اُبیّ مرتے دم تک اسے بھُلا نہ سکا۔ اس حسرتِ بادشاہت نے نفاق کی صورت اختیار کر لی اور نتیجۃً وہ رئیس المنافقین بن گیا۔[۳]

ابولہب کی وجہ سے اپنے ہی خاندان کی حمایت سے محرومی اور اہلِ مکہ کی ایذارسانی میں شدّت کے باوجود آپؐ کی انقلابی سرگرمیاں اور بڑھ گئیں۔ میلوں، اجتماعات اور حج کے موسم میں آپؐ شب وروز تبلیغِ حق میں سرگرمِ عمل رہتے۔ آپؐ کو نہ تو اپنے آرام کا خیال تھا، نہ کھانے پینے کا دھیان۔ آپؐ کا عشقِ الوہی۔ انسانی نقطۂ عروج کو پہنچا ہوا تھا۔ ایک طرف کُفّار کے ہاتھوں آپؐ کی ایذارسانیوں کا اور دوسری جانب آپؐ کی شریکِ زندگی سے محرومی کا صحابۂ کرامؓ کو بڑا رنج وملال تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح آپؐ نکاح پر آمادہ ہو جائیں اور آپؐ کو گھر کی راحتیں میسّر آ جائیں، لیکن آپؐ کو بس ایک ہی لگن تھی کہ کسی طرح اسلام کی تحریکِ انقلاب کامیاب ہو جائے اور انسانیت کو آزادی اور اخوّت ومساوات کی نعمتیں حاصل ہو جائیں۔

چونکہ مقصد ارفع وصالح، عقلِ سلیم فعّال، عشق سرگرمِ عمل، قرآن مُرشد ورہنما اور جہتِ عمل صالحہ تھی، اس لیے آپؐ کی تحریکِ انقلاب کی کامیابی یقینی تھی، کیونکہ یہی چیزیں انقلاب کی پیش شرائط ہیں۔ مسلمان اگرچہ کھُلّم کھُلّا تحریکِ انقلاب چلانے سے معذور تھے، لیکن ان کی زیرِ زمین[۴] انقلابی

سرگرمیاں بدستور جاری تھیں۔ انھیں بھی آپؐ کی طرح ایک ہی دُھن تھی کہ کسی طرح حیاتِ انسانی میں اسلامی انقلاب آجائے، بُت پرستی و شرک کا استحصالی نظام ختم ہو جائے اور اس کی جگہ اسلام کا رحمت بداماں نظام قائم ہو جائے، تاکہ بنی نوع انسان کو امن و سلامتی کے معروضی و موضوعی ماحول میں زندگی گزارنے کا موقع ملے۔ ان کی کوششوں کو بادی النظر میں نمایاں کامیابی تو نہ ہوئی، لیکن ان کی زمین دوز انقلابی سرگرمیوں نے زیرِ زمین سیلاب کی طرح قریش کے استحصالی نظام کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے میں اہم کردار ادا کیا، جس کی اہمیت اس سے بہت زیادہ ہے جو عام طور سے سمجھی جاتی ہے۔ صحابۂ کرامؓ تحریک انقلاب کے سچے، مخلص اور پُرجوش کارکن تھے۔ ان کے حسنِ اخلاق، عشقِ مقصدیت اور صبر و شکیب سے لوگ متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے تھے اور نہ رہے۔ قریش کو اپنے مُشرکانہ عقاید کی صحت و صداقت میں شک ہونے لگا اور شک ہی عقاید کو مُضمحل و کمزور کر کے انھیں ان کی قوت و توانائی سے محروم کیا کرتا ہے۔

اسلام کی اس تحریکِ انقلاب کو اس طرح چلتے چلتے دس برس گزر گئے۔ آخر عشق کی قوت و ہمت اور صبر و استقامت رنگ لائی اور تحریک کی کامیابی کے آثار پیدا ہو ہی گئے۔ حج کا موسم تھا (ذی الحجہ ۲ قبل ہجرت / جولائی ۶۲۰ء)۔ اطراف و جوانب سے لوگ حج کے لیے آئے ہوئے تھے۔ آپؐ حسبِ معمول اللہ کی مہم یعنی اپنے مشن پر نکلے ہوئے تھے۔ دن بھر مکّے کی گھاٹیوں میں مختلف قبائل کے ڈیروں میں جاتے، انھیں قرآن مجید سُناتے اور دعوت اسلام دیتے رہے، لیکن بظاہر کہیں کامیابی نہ ہوئی۔ اسی دُھن میں شام ہوگئی۔ آپؐ صحرا کے تاریک ویرانوں میں راہِ عشق میں رواں دواں تھے کہ مکّے سے چند میل دُور عقبہ کے مقام پر آپؐ کے کانوں میں لوگوں کے باتیں کرنے کی آواز نویدِ جانفزا بن کر آئی اور فردوسِ گوش بن گئی۔ آپؐ ان کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے دریافت کیا: تم کس قبیلے سے ہو؟ انھوں نے جواب دیا: قبیلۂ خزرج سے۔ آپؐ نے فرمایا: کیا تم یہود کے حلیفوں میں سے ہو؟ ان کا جواب اثبات میں تھا۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: کیا تم تھوڑی دیر کے لیے بیٹھو گے نہیں تاکہ میں تم سے بات کروں؟ خزرجی بولے: ضرور۔ سب بیٹھ گئے تو آپؐ نے انھیں توحید اور تحریکِ اسلام سے آگاہ کیا اور پھر قرآن مجید سُنایا۔ کلامِ الٰہی کا ہر بول بیک وقت رعدِ جلال بن کر ان کے دلوں کو ڈراتا اور ان کی قساوت کو سعادت میں بدلتا اور برقِ جمال بن کر ان کو منوّر کرتا رہا۔ حسن و حق کی تاثیر سے ان کے قلب زندہ و بیدار ہو گئے۔ ان کے دلوں میں آرزوئے الٰہ زندہ اور عقل فعّال و سلیم ہو گئی۔ وجدان و عقل دونوں نے کہا: یہ کلام، کلامِ انسانی نہیں، کلامِ الٰہی ہے، اور داعیِ اسلام واقعی اللہ تعالیٰ کا رسول

ہے۔ چنانچہ انھوں نے آپس میں کہا: "واللہ! یہ وہی نبی ہیں جس کا تذکرہ یہود کیا کرتے ہیں۔ آؤ، اس پر ایمان لائیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہود ہم سے سبقت لے جائیں۔" ملک میں مستقل نراج کی حالت، غیر یقینی سیاسی حالات اور خانہ جنگیوں کے باعث عربوں کی سیاسی حِس بڑی تیز تھی۔ بنو خزرج کے یہ لوگ جہاں آپؐ کی شخصیتِ نورانی، بلاغتِ قرآنی اور عقیدۂ توحید سے بے حد متأثر ہوئے، وہاں ان کی سیاسی بصیرت نے اسلام میں اپنی دنیا اور آخرت دونوں کو محفوظ و درخشاں دیکھا۔ چنانچہ وہ فوراً کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئے، یعنی تحریکِ اسلام میں شریک ہو گئے۔ پھر انھوں نے آپؐ سے عرض کیا: "ہمارے ہم وطن مدّتِ مدید سے ایک شدید اور ہلاکت آفریں خانہ جنگی میں مبتلا ہیں۔ شاید اب اللہ تعالیٰ آپؐ کے طفیل اور آپؐ کی تعلیم کی برکت سے ان کے درمیان اتفاق و اتحاد پیدا کر دے، لہٰذا ہم ان کو اسلام کی دعوت دیں گے اور اس دین سے انھیں آگاہ کریں گے جو ہم نے آپ سے سیکھا ہے۔" یثرب کے ان خوش نصیب مسلمانوں کے نام یہ ہیں:

(۱) حضرت ابو امامہ اسعد بن زرارہ بن عدس (۲) حضرت عوف بن الحرث بن رفاعہ (۳) حضرت رافع بن مالکؓ (۴) حضرت قطبہ بن عامرؓ (۵) حضرت عقبہ بن عامرؓ (۶) حضرت جابر بن عبداللہؓ۔

یہ کامیابی دیکھنے میں معمولی سی تھی، لیکن حقیقت میں از بس اہم تھی۔ اس نے تحریکِ اسلام کو مدینے میں سرایت کر جانے کا موقع فراہم کر دیا جس سے آپؐ نے پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔ اصل یہ ہے کہ موقع سے فائدہ اُٹھانا عظیم انسان کا شیوہ ہوتا ہے۔ چنانچہ آپؐ کی سیرت کی ایک خاص بات یہ ہے کہ آپؐ نے کبھی کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا، بلکہ ہر موقع سے فائدہ اُٹھایا۔ آپؐ کی اس سنّتِ حسنہ میں آپؐ کی کثیر و عظیم اور بےمثال کامیابیوں کا ایک راز مضمر ہے۔

سچا مسلمان اپنے عقایدِ جلیلہ و محرکہ کی بدولت اپنی ذات میں ایک جماعت اور تحریک ہوتا ہے۔ یہ تازہ واردانِ تحریکِ اسلام تعداد میں تو صرف چھ تھے، لیکن ایمان کی بدولت جوش و ہمت اور کارکردگی میں چھ فعّال انقلابی جماعتوں کے برابر تھے۔ چنانچہ ان کی تبلیغی سرگرمیوں کے باعث یثرب میں اسلام کا گھر گھر چرچا ہونے لگا اور تحریکِ اسلام کے یثرب میں آنے کی راہ تیزی سے ہموار ہونے لگی۔

بیعتِ عقبۂ اُولیٰ (ذوالحجہ ۱ قبل ہجرت / ۶۲۱ء)

مدینے میں اسلام کے عقایدِ جلیلہ و محرّکہ کا چرچا ہوا تو ان لوگوں کے دلوں میں، جنھوں نے

"انصار" بن کر کامیاب و زندۂ جاوید ہوجانا تھا، رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی زیارت کرنے اور آپؐ سے بیعت ہونے کی آرزو پیدا ہوئی اور روزافزوں ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ اگلے برس جب حج کا موسم آیا تو ان میں سے بارہ اہلِ شوق کو مکّے آنے کا موقع ملا۔ وہ فرطِ اشتیاق سے بارگاہِ نبوّت میں حاضر ہوئے، اور آپؐ کے فیضانِ نظر سے ان کے قلب و نگاہ کی تطہیر ہوگئی۔ ان کے دلوں میں کُفر و شرک کے اندھیروں کی جگہ حسن و نور نے لے لی اور سوزِ ایمانی سے دل زندہ و بیدار ہوگئے۔ ان اہلِ شوق کے نام یہ ہیں (ان میں پانچ نام ان حضرات کے ہیں جو گزشتہ برس مکّے میں ایک ساتھ ایمان لائے تھے):

(۱) حضرت ابوامامہ اسعد بن زرارہؓ (۲) حضرت عوف بن الحارثؓ (۳) حضرت رافع بن مالکؓ (۴) حضرت ابوالہیثم مالک بن تیہانؓ (۵) حضرت عویم بن ساعدہؓ (۶) حضرت قطبیہ بن عامر بن حدیدہؓ (۷) حضرت عقبہ بن عامرؓ (۸) حضرت معاذ بن حرثؓ (۹) حضرت زکوان بن قیسؓ (۱۰) حضرت خالد بن مخلدؓ (۱۱) حضرت عبادۃ بن صامتؓ (۱۲) حضرت عباس بن عبادہؓ۔

انھوں نے مندرجۂ ذیل باتوں پر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے بیعت کی[۸]:

۱ : ہم ایک اللہ کی عبادت کریں گے اور کسی کو اس کا شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔
۲ : ہم نہ تو چوری اور زنا کریں گے اور نہ اولاد (لڑکیوں) کو قتل کریں گے۔
۳ : ہم کسی پر جھوٹی تہمت نہیں لگائیں گے اور نہ کسی کی چغلی کھائیں گے اور
۴ : ہم ہر اچھی (معروف) بات میں رسول اللہ کی اطاعت کریں گے۔

اس بیعت کو بیعت النساء کہتے ہیں، کیونکہ اس میں جہاد کی شق نہیں ہے اور وہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ جہاد ابھی فرض نہیں ہوا تھا[۸]۔ اسے بیعۃ العقبۃ اُولیٰ یعنی عقبہ کی پہلی بیعت اس لیے کہتے ہیں کہ یہ بیعت عقبہ کے مقام پر ہوئی تھی۔

کُفر و شرک کے اندھیروں سے نکل کر جب یثرب کے یہ خوش نصیب لوگ ایمان و حق کی روشنی میں آئے تو ان کی کایا پلٹ گئی۔ وہ آئے تھے تو خوف و حزن کی آتشِ خاموش میں جل رہے تھے اور جب وہ لوٹے تو ان کے دل منوّر تھے اور امن و سلامتی کی جنّت بن چکے تھے۔ وہ مُشرک تھے تو ان کی شخصیت پارہ پارہ تھی، لیکن مومن ہوئے تو توحید کے جلیل و حرکی عقیدے کی بدولت ان کی شخصیت میں وحدت و انفرادیت پیدا ہوگئی۔

ایمان سے الوہی و انسانی محبّت کے سوتے پھُوٹ پڑتے ہیں جو مزرعِ ہستی کو شاداب کرتے ہیں۔ محبّت سے شخصیت آفاقی ہوجاتی ہے اور یہ مومن کی پہچان ہے۔ آپؐ کا یہ ارشاد کہ

مومن جو کچھ اپنے لیے چاہتا ہے، وہی دوسروں کے لیے چاہتا ہے[۹]۔ اسی اصل پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ ایمان کی بدولت یثرب کے ان نومسلموں میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ ان کی طرح ان کے ہموطنوں کا دامنِ زندگی بھی دولتِ ایمان اور رحمتِ اسلام سے معمور ہوجائے۔ لہٰذا انھوں نے یثرب میں تبلیغ و تعلیم کے لیے مبلّغ و معلّم بھیجنے کی درخواست کی، جو منظور ہوئی۔ آپؐ نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو ان کے ہمراہ کر دیا۔ ابنِ خلدون نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت ابنِ امّ کلثومؓ کو بھی ان کے ہمراہ کر دیا تھا[۱۰]۔

حضرت اسعد بن زرارہؓ عمائدینِ یثرب میں سے تھے۔ حضرت مصعب بن عُمیرؓ کی میزبانی کی سعادت انھیں نصیب ہوئی۔ حضرت مصعب بن عمیرؓ مومنینِ اوّلین اور مہاجرینِ حبشہ میں تھے اور ابھی ابھی حبشہ سے واپس آئے تھے۔ وہ ایک امیر و کبیر گھر کے چشم و چراغ تھے اور تحریکِ اسلام میں شامل ہونے سے پہلے شاہزادوں کی طرح ٹھاٹھ سے زندگی گزارتے تھے۔ انھیں بیش بہا پوشاک پہننے کا شوق تھا۔ ان کی سواری نکلتی تو آگے پیچھے خدّام و غلام ہوتے تھے۔ تحریکِ اسلام میں شامل ہوئے تو آپؐ کے فیضانِ نظر سے سچّے انقلابی مسلمان بن گئے۔ پھر آپؐ کی صحبت میں رہ کر انھوں نے بھی سادہ و جفاکش طرزِ زندگی اختیار کرلی اور پیکرِ فقر و غنا بن گئے۔ ایک تو آپؐ کی تعلیم و تربیت کا اثر تھا، دوسرے دشمنانِ اسلام کی چیرہ دستیاں جھیلنے اور ہجرتِ حبشہ کے صبر آزما تجربات سے گزرنے کے بعد ان میں حِلم و بردباری، صبر و استقامت اور مردم شناسی کے اوصاف پیدا ہوگئے تھے۔ علاوہ بریں ان کی گفتگو حسین و شیریں اور برمحل ہوتی تھی۔ ان اوصاف کی بدولت وہ اعلیٰ پایہ کے خطیب و مبلّغ و معلّم تھے اور اسی بنا پر بصیرتِ نبویؐ نے انھیں مدینے میں تبلیغ و تعلیم ایسے اہم کام کے لیے منتخب کیا تھا، اور یہ انتخاب بڑا ہی موزوں ثابت ہوا۔

عہدِ جاہلیت کا یہ شہزادہ، جو مدینے میں تحریکِ اسلام کا علمبردار تھا، دعوتِ اسلام کے لیے گھر سے نکلتا تو پھٹے پرانے کپڑے پہنے اور کندھوں پر بوسیدہ کمبل ڈالے ہوتا۔ حضرت مصعبؓ گلیوں اور بازاروں میں پھرتے، گھر گھر جاتے، ایک ایک شخص سے ملتے اور دعوتِ اسلام دیتے۔ وہ لوگوں کو قرآن مجید سُناتے، وعظ و نصیحت کرتے، انھیں دنیا میں شاندار سیاسی و معاشی مُستقبل کی اور آخرت میں جنّت کی حیاتِ محض کی خوشخبری سُناتے۔ ان کے دل میں ایمان و صدق اور زبان پر کلامِ حق تھا، اس لیے ان کی باتیں اثر میں ڈوبی ہوئی ہوتیں اور دلوں میں اُتر جاتیں۔ حضرت

مصعبؓ مسلمانوں کو نماز سکھانے اور پڑھانے، نیز قرآنِ مجید کی تعلیم دینے کے لیے کبھی حضرت اسعد انصاریؓ اور کبھی بنو ظفر (کعب بن الحرث) کے گھر میں اکٹھا کرتے۔ بنو ظفر کا گھر ایسے محلّے میں تھا جس میں ظفر اور عبدالاشہل کے خاندان اکھٹے رہتے تھے۔[۱۱]

مکّے کی طرح مدینے میں بھی تحریکِ اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سرداری نظام تھا۔ امیر و سردار نشّۂ غرور میں سرشار رہتے تھے۔ وہ جو موقف اختیار کر لیتے، وہ درست ہوتا یا غلط، اس پر اڑ جاتے اور اس سے ہٹنا اپنی توہین سمجھتے اور توہین پر موت کو ترجیح دیتے۔ ان سرداروں کو رام کرنا اور ان سے ان کے آبائی دین کو چھڑانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ لیکن اس کام کے لیے جن اوصاف اور اخلاقِ حسنہ کی ضرورت تھی، وہ ان میں موجود تھے، لہٰذا حضرت مصعبؓ کو اپنے مشن میں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کی ایک دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن سے اسلام کی تحریک و دعوت کے منہاج کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور ساتھ ہی اس صلیبی و صیہونی پراپیگنڈے کی قلعی بھی کھل جاتی ہے کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے۔

عبدالاشہل کا قبیلہ مدینے میں صاحبِ اثر و رسوخ اور طاقتور تھا۔ حضرت سعد بن معاذؓ اور اسید بن حضیرؓ اس کے سردار تھے۔ انھیں کفّار تحریکِ اسلام کے خلاف بدظن کرتے رہتے تھے۔ ایک دن کسی نے اطّلاع دی کہ حضرت مصعبؓ بنو ظفر کے گھر میں تبلیغ کے کام میں مصروف ہیں اور وہاں نومسلموں کے علاوہ حضرت اسعدؓ بھی موجود ہیں۔ حضرت سعد بن معاذ طیش میں آ گئے اور انھوں نے اسید بن حضیرؓ سے کہا: ان لوگوں کو اپنے ہاں سے نکال دو جو ہمارے گھروں میں آ گھسے ہیں اور سادہ لوح لوگوں کو بے دین (یعنی مسلمان) بنا رہے ہیں۔ میں تمھیں اس امر کی زحمت نہ دیتا، مگر میرے اور اسعد کے درمیان قرابت داری ہے۔ وہ میری خالہ کا بیٹا ہے، اس لیے میں اس کے خلاف قدم نہیں اُٹھا سکتا۔ یہ سُن کر اُسید بن حضیرؓ نے نیزہ اٹھایا اور حضرت مصعبؓ اور حضرت اسعد بن زرارہؓ کے پاس پہنچا اور چلّایا: تم کیا کر رہے ہو! کیا تم لوگ ہمارے یہاں اس غرض سے آئے ہو کہ کمزور عقیدے والوں کو بہکاؤ؟ اگر تمھیں اپنی جانیں عزیز ہیں تو فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ حضرت مصعبؓ نے بڑی نرمی سے کہا: کیا آپ بیٹھ کر ہماری بات سُنیں گے؟ اگر کوئی بات پسند آئے تو قبول کیجیے اور اگر ناپسند ہو تو چھوڑ دیجیے۔ اسید بن حضیرؓ نے یہ کہہ کر کہ "یہ بات تم نے انصاف کی کہی" نیزہ زمین میں گاڑ دیا اور بیٹھ گیا۔ حضرت مصعبؓ نے اسلام کے بنیادی عقاید اور فضائل بیان کیے اور پھر قرآن مجید سُنانے لگے۔ اسید کی زبان سے بے ساختہ نکلتا جاتا تھا "ما احسن ھذا الکلام"

یعنی کتنا اعلیٰ یہ کلام ہے! کلامِ الٰہی اپنا اثر کر گیا، جمالیاتی لمحہ پیدا ہوا اور اسیدؓ کا دل نورِ ایمان سے منوّر ہو گیا۔ اس نے بیتابانہ کہا: مجھے اس دین میں داخل ہونے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ حضرت مصعبؓ نے جواب دیا: غسل (وضو) کر کے اپنے جسم کو پاک کیجیے اور پھر کلمۂ شہادت پڑھیے۔ حضرت اسیدؓ نے فوراً وضو کیا اور کلمۂ شہادت پڑھا اور کہا: میرے علاوہ ایک اور شخص بھی ہے، جسے تمھیں راہِ ہدایت پر لانا ہوگا۔ (ان کا اشارہ حضرت سعد بن معاذؓ کی طرف تھا) اگر وہ ایمان لے آئے تو اس کی ساری قوم اس کی پیروی کرے گی۔ میں ابھی اسے تمھارے پاس بھیجتا ہوں۔

حضرت سعد بن معاذؓ تحریکِ اسلام میں:

حضرت اسیدؓ واپس پہنچے تو ان کے چہرے کی بدلی ہوئی حالت دیکھ کر حضرت سعد بن معاذ تاڑ گئے کہ معاملہ کچھ اور ہے اور پوچھا: ما فعلت؟ یعنی تُو نے کیا کیا؟ حضرت اسیدؓ نے جواب دیا: میں نے ان دونوں سے باتیں کیں۔ وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ وہ کہتے ہیں: جو ہمارے نزدیک بہتر ہے، ہم کرتے ہیں اور کریں گے۔ یہ سن کر حضرت سعد بن معاذؓ نے تلوار لی اور اسی وقت حضرت اسعد بن زرارہؓ کے پاس پہنچے۔ انھیں یہ غصّہ تھا کہ حضرت اسعدؓ نے اسلام کے مبلغوں کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی تھی۔ چنانچہ بڑے طیش میں ان سے کہا: واللہ! میرے اور تیرے میں قرابت نہ ہوتی تو میں اسی تلوار سے تیرا سر قلم کر دیتا۔ تم لوگ ہمارے ہی علاقوں میں ہماری قوم کو بہکاتے ہو۔ حضرت اسعد بن زرارہؓ تو خاموش رہے، البتّہ حضرت مصعبؓ نے بڑی ملائمت سے انھیں بیٹھ کر بات سُننے پر رضامند کر لیا۔ وہ بھی کلامِ الٰہی سے مسحور ہو گئے۔ انھوں نے کلمہ پڑھا اور ان کا سینہ نورِ ایمان سے منوّر ہو گیا۔ وہ جوشِ اسلام سے معمور واپس اپنے قبیلے میں پہنچے اور ان سے کہا: اے بنی عبدالاشہل! بتاؤ، تمھارے ہاں میرا کیا مرتبہ ہے؟ انھوں نے کہا: تو ہمارا سردار ہے اور ہم سب سے زیادہ عقلمند اور عالی نسب ہے۔ حضرت سعدؓ نے کہا: میرے لیے اس وقت تک تمھارے ساتھ بات چیت کرنا حرام ہے، جب تک تم اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان نہ لاؤ گے۔ چنانچہ اس دن اس قوم کے مرد اور عورتیں سب ایمان لا کر تحریکِ اسلام میں شامل ہو گئے۔[۱۲] اس سے مدینے کی فضا جو کفر و شرک اور ظلم و گناہ کے اندھیروں میں ڈوبی ہوئی تھی، نورِ توحید سے جگمگا اُٹھی اور تحریکِ اسلام کو اس قدر زورِ حرکت ملا کہ وہ مدینے سے قبا تک گھر گھر میں سرایت کر گئی، بجز حمطہ، وائل اور واقف کے چند گھرانوں کے۔ ان کے ایمان نہ لانے

کا باعث ابو قیس صیفی بن الاسلت تھا، جو شاعر تھا اور لوگ اسے اپنا مطاع و قائد مانتے تھے۔ لیکن غزوۂ خندق کے موقع پر یہ لوگ بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے[۱۳]۔

بیعتِ عقبۂ ثانیہ : (تقریباً ۳ ماہ قبل ہجرت / جون ۶۲۲ء)

مدینے میں حضرت مصعبؓ کی انقلابی سرگرمیوں کا پہلا سال غیر معمولی کامیابی سے گزرا۔ اسلام کے حسین انقلاب کے لیے فضا تیزی سے سازگار ہونے لگی۔

بعثت کا تیرھواں سال اپنے جلو میں مزید کامیابیاں لے کر آیا۔ ایامِ حج آئے تو مدینے سے بنو اوس اور بنو خزرج کے قبائل کے ۳، مرد اور دو عورتیں قافلۂ یثرب کے ساتھ مکّے پہنچے۔ یہ مسلمان اپنے قبائل کے مشورے سے آپؐ سے بیعت ہونے اور آپؐ کو مدینے میں آنے کی دعوت دینے آئے تھے۔ ملاقات کا مقام منیٰ (عقبہ) اور وقت رات قرار پایا۔ چونکہ یہ بیعت و معاہدہ تاریخی اہمیت کا حامل تھا، اس لیے مسلمان اسے مکّہ و مدینہ کے کفّار سے پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ وقتِ مقرّرہ پر اہلِ مدینہ اور آپؐ اپنے چچا حضرت عباسؓ کے ہمراہ ملاقات کی جگہ پہنچ گئے۔

گفتگو شروع ہوئی اور یثرب کے مسلمان بیعت ہونے لگے تو حضرت عباسؓ نے، جو اس وقت تک اگرچہ مسلمان نہیں ہوئے تھے، ایک ایسی بات کہی جو ان کی سیاسی بصیرت اور تحریکِ اسلام کی حقیقی انقلابی نوعیت کی مظہر ہے۔ انھوں نے بنو خزرج سے (جو تعداد میں بہت زیادہ تھے) مخاطب ہو کر کہا : تمھیں معلوم ہے کہ قریش مکّہ (حضرت) محمّد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے جانی دشمن ہیں۔ اگر تم (حضرت) محمّد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) سے کوئی عہد و پیمان کرنے لگے ہو تو یہ سمجھ کر کرنا کہ یہ بڑا نازک اور مشکل کام ہے۔ ان سے عہد و اقرار کرنا سُرخ و سیاہ لڑائیوں کو دعوت دینا ہے۔ وہ تمھارے پاس جانا چاہتے ہیں، ہم ان کے لیے ہمیشہ سینہ سپر رہے ہیں۔ اگر تم بھی مرتے دم تک ان کا ساتھ دے سکو تو بہتر، ورنہ ابھی جواب دے دو۔ لہٰذا جو اقدام بھی کرو، سوچ سمجھ کر کرو، ورنہ بہتر ہے کہ کچھ نہ کرو۔

ابو الہیثمؓ نے اس موقع پر آپؐ سے مخاطب ہو کر عرض کیا : یا رسول اللہؐ! ہم یہود کے حلیف ہیں۔ اس بیعت کے بعد ان سے تعلقات منقطع ہو جائیں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپؐ کو قوت و اقتدار حاصل ہو جائے تو آپؐ ہمیں چھوڑ کر اپنے وطن لوٹ جائیں۔

آپؐ نے مسکرا کر فرمایا : نہیں۔ تمھارا خون میرا خون ہے۔ تم میرے اور میں تمھارا ہوں۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عباسؓ کے خطاب کے بعد ان طالبانِ حق نے آپؐ سے کچھ فرمانے کی درخواست کی۔ آپؐ نے ان کو قرآن مجید سُنایا۔ ایک ایک لفظ ان کے دلوں کی گہرائیوں میں اُترتا اور انھیں مسحور و منوّر کرتا چلا گیا۔ ان پر رقّت طاری ہو گئی۔ انھوں نے یک زبان ہو کر آپؐ سے مدینے چلنے کی درخواست کی۔ اس پر آپؐ نے ان سے فرمایا :

(ا) کیا تم دینِ حق کی اشاعت میں میرے ساتھ پورا پورا تعاون کرو گے ؟

(ب) اور جب میں تمھارے شہر میں اقامت اختیار کر لوں تو کیا تم میری اور میرے ساتھیوں کی حمایت اپنے اہل و عیال کی طرح کرو گے ؟

"لیکن اس کا معاوضہ ہمیں کیا ملے گا؟" اہلِ قافلۂ شوق نے پوچھا۔

"جنّت۔" آپؐ نے جواب دیا۔

یہ جواب سب کے لیے وجۂ مسرّت تھا۔ لیکن وفورِ مسرّت و محبّت میں رشک و خدشہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ انھیں یہ گوارا نہ تھا کہ آپؐ کسی وقت انھیں چھوڑ کر اپنے آبائی شہر مکّے میں جا بسیں۔ چنانچہ انھوں نے عرض کیا : کہیں آپؐ حصولِ قوت و اقتدار کے بعد ہمیں چھوڑ کر تو نہیں چلے جائیں گے ؟ آپؐ نے فرمایا : نہیں۔ میرا جینا اور مرنا تمھارے ساتھ ہو گا۔

آپؐ کا یہ ارشاد اہلِ شوق کے دلوں میں برقِ مسرّت کی طرح لہرایا اور وہ فرطِ شوق سے آپؐ سے بیعت کرنے لگے۔ اُس رات سب سے پہلے جسے بیعت کرنے کی سعادت نصیب ہوئی، وہ حضرت براء بن معرورؓ تھے۔ بیعت یا عہد و اقرار یہ تھا کہ وہ شرک، چوری، زنا، قتلِ اولاد اور افترا کا ارتکاب نہیں کریں گے اور آپؐ ان سے جو معروف یعنی اچھی بات کہیں گے، اس سے سرتابی نہیں کریں گے۔

بیعت کا سلسلہ جاری تھا کہ حضرت سعد بن زرارہؓ کھڑے ہوئے اور انصار سے مخاطب ہو کر کہا : بھائیو! یہ بھی خبر ہے کہ کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟ یہ عرب و عجم اور جنّ و انس سے اعلانِ جنگ ہے۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا : ہاں، ہم اسی پر بیعت کر رہے ہیں۔

حضرت سعدؓ کے یہ الفاظ اس حقیقت پر دلالت کرتے ہیں کہ اسلام کی انقلابی رُوح کو کسی نے جامع طور پر سمجھا اور اس کے وسیع ترین تناظر میں دیکھا تو وہ قدیم عرب کی سیاسی فراست و بصیرت تھی۔ اسلام کی تحریکِ انقلاب واقعۃً مُشرکوں، بُت پرستوں اور استحصالی قوتوں کو چیلنج یا ان کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب تک اس میں جمود و تعطّل پیدا نہ ہوا

وقت کے فرعون، ہامان اور قارون اس سے لرزہ براندام رہتے تھے۔ آج بھی جب کہ اُمّتِ مسلمہ اسلام کے عقایدِ جلیلہ و محرّکہ سے اپنا رشتہ برائے نام رکھنے کی وجہ سے کمزور و پس ماندہ ہے اور اسلام زندۂ تحریک نہیں رہا ہے، بڑی بڑی اقوامِ عالم پھر بھی اس سے خائف ہیں اور اس کے خلاف پراپیگنڈے کرنے میں مصروف ہیں۔ نیز تعلیم یافتہ طبقے کو مرعوب اور تشکیک میں مبتلا کرنے کی خاطر اس باطل پراپیگنڈے کو سائنٹفک اور تاریخی منہاجِ تحقیق سے تعبیر کرتی ہیں۔

یہ سوال کہ یہود و نصاریٰ ہوں یا ہنود و لادین اقوام، کیوں سب کی سب اسلام کی دشمن ہیں، اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ یہ سب اقوام اسلام کے عقایدِ جلیلہ و محرّکہ اور عملی پہلوؤں کو اپنی اپنی آئیڈیالوجی کے لیے بجا طور سے خطرہ یا چیلنج سمجھتی ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ مستنبط ہوتا ہے کہ غیر مُسلم اقوام کا یہ پراپیگنڈا غلط اور گمراہ کُن ہے کہ اسلام صرف شدہ قوّت Spent up power ہے، لہٰذا اس کے احیا کا کوئی امکان نہیں رہا۔ اصل یہ ہے کہ اسلام اپنی فطرت میں توحید ہے، اور توحید ہر حال میں شرک و بُت پرستی کی اسی طرح دُشمن ہے جس طرح خیر شر کی، نور ظُلمت کا اور حُسن قبح کا حریف ہے۔ سرداری و جاگیر داری نظام ہو یا نظامِ سرمایہ داری، فرعونی و ہامانی طرزِ حکومت ہو یا لادینی، ان کی بنیادیں شرک و بت پرستی میں مضمر ہوتی ہیں، لہٰذا یہ سب نظام اور حکومتیں اسلام کی انقلابی رُوحِ توحید سے خائف ہیں، اس لیے اس کی مخالف و دُشمن ہیں، تھیں اور ہمیشہ مخالف و دشمن رہیں گی۔ وجہ یہ ہے کہ توحید و شرک ایک دوسرے کی ضد ہیں اور اجتماعِ ضدّین محال ہے۔ یہاں اس اہم نکتے کی صراحت بھی کر دی جاتی ہے کہ شرک و بُت پرستی ہر دَور میں نئی نئی شکلیں، رُوپ اور انداز بدلتے رہتے ہیں۔ اس دور میں مُورتی پُوجا کے ساتھ ساتھ ہیرو پرستی اور نظریہ پرستی کا عام رواج ہے اور یہ تمام پُجاری اسلام کے دُشمن ہیں اور ہونے بھی چاہییں کہ وہ مُشرک و بُت پرست ہیں اور اسلام توحید ہے۔

بہرحال، بیعت ہو چکی اور اسلام کی تحریکِ انقلاب کے مدینے میں منتقل ہو جانے کا معاہدہ طے پایا تو آپؐ نے نقیبِ انقلاب مقرر کرنے کا فیصلہ کیا اور انصار کے مشورے سے بارہ اشخاص کا انتخاب کیا، جن میں نو قبیلۂ خزرج کے اور تین قبیلۂ اوس کے تھے۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

قبیلۂ خزرج : (۱) اسعد بن زرارہؓ (۲) سعد بن الربیعؓ (۳) عبداللہ بن رواحہؓ (۴) سعد بن عبادہؓ (۵) منذر بن عمروؓ (۶) براء بن معرورؓ (۷) عبداللہ بن عمروؓ (۸) عبادہ بن الصامتؓ (۹) رافع بن مالکؓ۔

قبیلۂ اوس : (۱) اُسید بن حُضیرؓ (۲) ابوالہیثم بن تیہانؓ (۳) سعد بن خیثمہؓ۔

قریش کو اس بیعت و معاہدے کی اُڑتی سی خبر ہوئی تو وہ متجسّس ہوئے، لیکن بروقت اس کی تحقیق نہ کر سکے۔ پھر بھی ان سے رہا نہ گیا اور انھوں نے انصار سے رابطہ پیدا کرنا چاہا، مگر ان کا قافلہ دُور نکل چکا تھا، البتہ ان میں سے حضرت سعد بن عبادہؓ اور منذر بن عمروؓ پیچھے رہ گئے تھے۔ قریش غصّے میں ان پر جھپٹے۔ حضرت منذرؓ بھاگ اُٹھے اور ہاتھ نہ آئے، مگر حضرت سعدؓ پکڑے گئے۔ قریش انھیں قیدی بنا کر مکّے لے آئے اور زدوکوب کرنے لگے، لیکن جبیر بن مطعم اور حارث بن امیّہ کی مداخلت سے انھیں رہائی ملی اور وہ مدینے لوَٹ گئے۔[۱۴]

انصار کے عہد و پیمان اور بیعتِ عقبۂ ثانیہ کے بعد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے مدینے کو اسلام کی تحریکِ انقلاب کا مستقل مستقر بنانے کا فیصلہ کر لیا اور اس کے پیروکاروں کو وہاں ہجرت کر جانے کی عام اجازت دے دی۔ قریش کی سیاسی بصیرت اس ہجرت کی اہمیّت اور اس کے دُور رس نتایج سے آشنا تھی، لہٰذا انھیں یہ گوارا نہ تھا کہ تحریکِ اسلام کو ایک آزاد اور پُرامن ماحول میں نشو و ارتقا کرنے کا موقع مل جائے اور نتیجۃً انقلاب پسند مسلمان قوّت حاصل کر کے ان کے حریف بن جائیں۔ چنانچہ انھوں نے ہجرت کی راہ میں ہر ممکن رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن عزم و ہمّت کے سامنے ان کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ مسلمان رازدارانہ طریق سے آہستہ آہستہ ہجرت کرتے اور قبا اور یثرب میں جمع ہوتے گئے۔ صحابہؓ میں سے آپؐ نے حضرت ابوبکر صدّیق اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو ہجرت کی اجازت نہیں دی تھی۔ ان کے علاوہ وہ مسلمان بھی مکّے میں رہ گئے تھے، جو وسائل کے فقدان کے سبب ہجرت کرنے سے معذور تھے۔ ان کے شوقِ ہجرت اور مجبوری و معذوری کا احساس مسلمانوں کو بھی تھا اور رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو بھی، حتّٰی کہ خود ان کے اِلٰہ و ربّ کو بھی تھا۔ چنانچہ جب آپؐ ہجرت کر کے مدینے میں تشریف لے گئے اور مسلمانوں نے قوّت حاصل کر لی تو اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنے ان کمزور و مجبور بھائیوں کو قریش کے پنجۂ استبداد سے رہا کرانے کے لیے جہاد کا حکم دیا :

اور (مسلمانو) آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ اے ہمارے ربّ! ہمیں اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے۔[۱۵]

حواشی و تشریحات

(۱) ابنِ کثیر: "البدایہ والنہایہ"، ۳: ۱۴۸، ابنِ ہشام (اردو)، ص ۴۴۰ - ۴۴۱۔

(۲) ابن اسحاق، ص ۲۸۶ بعد، آرنلڈ: "دعوتِ اسلام"، ص ۲۴ بعد، "زاد المعاد"، ۱: ۳۰۳، "رحمۃ للعالمین" بالخصوص صفحہ ۷۶، کا حاشیہ۔

(۳) ابن ہشام (اردو)، ۱: ۶۳۲ - ۶۳۳۔

(۴) UNDER-GROUND

(۵) ابن سعد: "طبقات"، ۱: ۲۱۷ بعد، ابن اسحاق، ص ۲۸۶ بعد، آرنلڈ: "دعوتِ اسلام"، ص ۲۴ بعد، "تاریخ ابن خلدون"، ۱: ۵۶ - ۵۷، ابن کثیر، "البدایہ والنہایہ" ۳: ۱۴۸ بعد، زرقانی علی المواہب ۱: ۳۶۲ - ۳۶۳ بعد۔

(۶) علامہ شبلی نے حضرت عقبہ بن عامرؓ کی بجائے حضرت ابو الہیثم بن تیہانؓ کا نام لکھا ہے۔ دیکھیے "سیرۃ النبی"، ص ۶۲ - ۶۳ نیز حواشی۔

(۷) ابن سعد: "طبقات"، ۱: ۲۱۹ بعد، ابن ہشام، ۱: ۴۴۴، ۴۴۵ (اُردُو طبع)۔

(۸) ابن خلدون: "تاریخ" (اردو طبع)، ۱: ۵۶، ۵۷ بعد۔

(۹) بخاری و مسلم در "مشکوٰۃ"، کتاب الآداب، باب الشفعہ، ۱۵۴۔

(۱۰) "تاریخ ابن خلدون" (اردو)، ۱: ۵۷، "طبقات" ابنِ سعد، ۱: ۲۱۸، ۲۱۹ بعد۔

(۱۱) "تاریخ ابن خلدون" (اردو)، ۱: ۵۸، ۵۹، "طبقات" ابن سعد، موضوع مذکور۔

(۱۲) ابن اسحاق، ص ۲۹۱، "ابن خلدون" (اردو)، ۱: ۵۷، ۵۸ مع حواشی، "طبقات" ابن سعد، ۱: ۲۱۹۔

(۱۳) ابن خلدون (اردو)، ۱: ۵۹، آرنلڈ، "دعوتِ اسلام"، ص ۲۸۔

(۱۴) "طبقات" ابن سعد، ۱ تا ۲۲۲، ۲۲۳، آرنلڈ، "دعوتِ اسلام"، ص ۲۹، ۳۰، ابن خلدون، ۵۹ تا ۶۱، طبری، ص ۲۴۴، زاد المعاد، ۱: ۳۰۴، ابن ہشام (اردو) ص ۴۵۱ تا ۴۷۵۔

باب : ۸

ہِجرت

ایک تاریخ ساز و عہد آفریں واقعہ

(۱ ھ / ۶۲۲ء)

۱ : پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم سے چھٹکارا پانے کے لیے عمائدینِ قریش کا خفیہ اجلاس، ابوجہل کی رائے پر اتفاق اور آپؐ کے قتل کا منصوبہ۔

۲ : اللہ تعالیٰ کا اذنِ ہجرت اور آپؐ کا اس راز سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو آگاہ کرنا، انھیں اعتماد میں لینا اور تیاری کی ہدایات دینا۔

۳ : کاشانۂ نبوت کا محاصرہ، آپؐ کا بچ نکلنا اور قریش کا ردِ عمل۔

۴ : نبی رحمۃ للعالمینؐ اور صدیقِ اکبرؓ کا سفرِ ہجرت۔

۵ : غارِ ثور ـ سراقہ بن جُعشم، بریدہ بن الحصیب اسلمی اور حضرت زبیر بن العوامؓ کے واقعات۔

۶ : آپؐ کی قُبا میں تشریف آوری اور انصار و مہاجرین کا والہانہ استقبال۔

۷ : مسجدِ قُبا کی تعمیر اور اس میں آپؐ کا عملاً حصہ لینا۔

۸ : پہلی نمازِ جُمعہ اور آپؐ کا پہلا خطبۂ جمعہ۔

۹ : مدینے میں آپؐ کا ورودِ مبارک، بے مثال اِستقبال اور قیام۔

۱۰ : حواشی و تشریحات۔

باب ۸

ہجرت : ایک تاریخ ساز و عہد آفریں واقعہ

(۱ھ / ۶۲۲ء)

ہجرت تاریخِ انسانی کا اہم ترین واقعہ ہے۔ دلیل یہ ہے کہ وہ ایک ایسا تاریخ ساز و عہد آفریں واقعہ ہے جس نے اسلام کی انقلاب انگیز تحریکِ رحمۃ للعالمینی کو قریش کے زندان سے نکلنے اور ایک آزاد و سازگار دنیا میں اپنے پاؤں مضبوطی سے جمانے، نشوو ارتقا کرنے اور اپنے آپ کو ناقابلِ تسخیر بنانے، نیز عرب کے وسیع و عریض رقبے کو حیرت انگیز سرعت کے ساتھ سیاسی و روحانی ہر طرح سے مسخّر کرنے اور اپنے آپ کو عالمگیر بنانے کے قابل بنایا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ امتِ مسلمہ نے اپنے تاریخی دَور کا آغاز اور سنوات کا شمار سنہ ہجرت سے کیا ہے۔

اصل یہ ہے کہ ہجرت نہ ہوتی تو تحریک اسلام کو قریش کی قید سے کبھی رہائی نہ ملتی اور وہ گُھٹ کر مر جاتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ مزرعِ انسانیت اس کے سرچشمۂ فیض و رحمت سے سیراب نہ ہو سکتی اور انسان کُفر و شِرک اور ظلم و جہل کے اندھیروں، ذلّت و غلامی کی اذیّتوں اور استحصالی قوتوں کی زنجیروں سے کبھی نجات حاصل نہ کر سکتا۔ علاوہ ازیں وہ حسن و نور کے مشاہدوں اور محبت و رحمت کی نعمتوں سے محروم رہتا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ہجرت انقلابی تحریکوں کا مقدر ہے۔ چنانچہ تحریکِ اسلام کو بھی اس تجربے سے گزرنا تھا اور وہ گزری۔ چونکہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بصیرت افروز و ولولہ انگیز قیادت میسّر تھی، اس لیے کامیاب گزری۔

جو مسلمان ہجرت کر سکتے تھے، وہ ہجرت کر گئے تو آپؐ کو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہجرت کر جانے کا اذن ہوا۔ قریشِ مکّہ کو ہر وقت اس بات کا اندیشہ رہتا تھا کہ کہیں آپؐ بھی ہجرت نہ کر جائیں، اس لیے وہ آپؐ کی نگرانی سے غافل نہیں رہتے تھے۔ یہ صورتِ حال بھی ان کے لیے خطرے

سے خالی نہیں تھی، لہٰذا اس سے عُہدہ برآ ہونے کے لیے انھوں نے دارالندوہ (دارالشوریٰ) میں ایک اجلاس بلایا، جس میں قریش کے قریب قریب تمام ممتاز قبائل کے سرداروں نے شرکت کی، جن کے نام یہ ہیں:

۱ بنوامیہ سے : عتبہ، شیبہ فرزندانِ ربیعہ اور ابوسفیان بن حرب۔
۲ بنوجمح سے : امیّہ بن خلف
۳ بنومخزوم سے : ابوجہل بن ہشام
۴ بنونوفل سے : طعیمہ بن عدی، جبیر بن مطعم، حارث بن عامر۔
۵ بنواسد بن عبدالعزیٰ سے : ابوالبختری بن ہشام، زمعہ بن اسود اور حکیم بن حزام۔
۶ بنوعبدالدار سے : نضر بن حارث بن کلدہ۔
۷ بنوسہیم سے : نبیّہ ومنبّہ فرزندان حجاج۔

آپؐ سے جان چھڑانے کے لیے سرداروں کی طرف سے تین تجویزیں پیش ہوئیں:
(۱) رسول اللہؐ کو پابجولاں کر کے کسی تنگ وتاریک جگہ میں مقیّد کر دیا جائے (۲) جلاوطن کر دیا جائے اور (۳) قتل کر دیا جائے۔

آخری تجویز پر اتفاقِ رائے ہوگیا۔ یہ تجویز ابوجہل کی تھی۔ اس کا طریقِ کار یہ تھا کہ قریش کے ممتاز قبیلوں میں سے ایک ایک جوان لیا جائے اور وہ سب مل کر رات کو آپؐ کے مکان کا محاصرہ کرلیں اور صبح کے وقت جب آپؐ نماز پڑھنے باہر نکلیں تو سب مل کر بیک وقت آپؐ پر تلواریں چلا کر کام تمام کر دیں۔ اس طرح بنومناف کے سوا تمام قریش اس خون میں شریک ہو جائیں گے اور سب کا مقابلہ وہ نہ کر سکیں گے، اور سب مل کر خون بہا ادا کر دیں گے۔[۱]

قرآن مجید نے مندرجہ ذیل آیت میں قریش کے اسی ابلیسی منصوبے کی طرف اشارہ کیا ہے:
(اے نبیؐ! وہ وقت یاد کرو!) جب (مکّے میں) کافر تمھارے خلاف مخفی تدبیریں کر رہے تھے کہ تمھیں قید کر دیں یا قتل کر ڈالیں یا جلاوطن کر دیں اور وہ بھی مخفی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ بھی مخفی تدبیریں کر رہا تھا۔ وہ تو سب سے بہتر تدبیریں کرنے والا ہے۔[۲]

اللہ تعالیٰ نے آپؐ سے جتنا عظیم کام لینا تھا، اتنی ہی زیادہ آپؐ کو سیاسی بصیرت بھی عطا کی تھی۔ آپؐ کو یقین تھا کہ قریش زچ ہو کر ایک نہ ایک دن انتہائی قسم کا اقدام کرنے پر مجبور ہو جائیں گے، لہٰذا آپؐ نے ہجرت کر جانے کا ایک جامع منصوبہ بنا لیا تھا اور اپنے معتمد و ہمراز حضرت

ابوبکر صدیقؓ کو رازدارانہ طریق سے منصوبے کے مُطابق تیاری کرنے کا حکم دیا ہوا تھا۔ آپؐ کو جب قریش کے اس منصوبے کی اطلاع ملی تو آپؐ گرمیوں کی دوپہر کے وقت جب مکّے کی زندگی معطل ہو چکی تھی، چپکے سے اپنے معتمد و ہمراز حضرت ابوبکر صدیقؓ کے گھر تشریف لے گئے اور ان سے فرمایا: اِن اللہ قَدْ اُذن لی فی الخروج والھجرۃ : اللہ تعالیٰ نے مجھے نکل جانے اور ہجرت کر جانے کی اجازت دے دی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا : الصّحبۃ یارسول اللہ؟ اللہ کے پیغمبرؐ! کیا مجھے آپؐ کی رفاقت ہوگی؟ آپؐ نے فرمایا: الصّحبۃ : ہاں! رفاقت ہوگی۔ یہ سُننا تھا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا دل جذباتِ مسرت سے موجزن ہوگیا اور خوشی کے آنسو بہہ نکلے۔

آپؐ نے انھیں منصوبے سے آگاہ کیا اور تیاری کا حکم دے کر چپکے سے گھر تشریف لے گئے۔ وہاں حضرت علیؓ کو ہمراز بنایا اور لوگوں کی امانتیں ان کے سپرد کر دیں کہ وہ بعد میں ان کے مالکوں کو لوٹا دیں اور مدینے چلے آئیں۔ یہاں یہ بات سوچنے کی ہے کہ اگرچہ اہلِ مکّہ تحریکِ اسلام کے باعث آپؐ کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے، لیکن چونکہ آپؐ کو امین، دیانت دار اور سچا سمجھتے تھے، لہٰذا حسبِ معمول اپنا مال و متاع آپؐ کے پاس بطورِ امانت رکھتے تھے۔ اگر یہ حقیقت ہے اور یقیناً ہے تو کیا پھر یہ حقیقت آپؐ کے دعوائے نبوت کی صداقت پر دلالت نہیں کرتی؟ بہرحال صورتِ حال اگرچہ انتہائی سنگین تھی، لیکن آپؐ غمگین ہوئے نہ خوفزدہ، اور نہ آپؐ کے معمولاتِ زندگی ہی میں کوئی فرق آیا۔ شام ہوئی تو آپؐ نے حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر رات بسر کرنے کی ہدایت کی اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے انھیں کوئی گزند نہ پہنچے گا۔ اس جگہ آپؐ کی سیرتِ پاک کے ایک از بس اہم وصف کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خطرناک سے خطرناک صُورتِ حال میں بھی آپؐ نہ تو گھبراتے اور نہ مُضطرب و بے قرار ہی ہوتے، بلکہ پُرسکون رہتے اور اپنے ہوش و حواس کو قائم رکھتے۔ کردار کا یہ ایسا وصف ہے جس کے بغیر انسان نہ تو خطرناک صورتِ حال سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے اور نہ نامساعد حالات پر قابو ہی پا سکتا ہے۔ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ جہاد و انقلاب کی راہ میں آپؐ کو قدم قدم پر زہرہ گداز و شکیب رُبا حالات سے دوچار ہونا پڑا، لیکن آپؐ اپنے اس وصف کی بدولت ان سے عہدہ برآ ہوتے چلے گئے۔

رات ہوئی۔ وادیِ مکّہ خاموشی و تاریکی میں ڈوب گئی۔ کاروبارِ زندگی معطل ہو گیا۔ لوگ شبستانوں میں جاگزیں ہوئے، لیکن وہ جو پیغمبرِ رحمۃ للعالمینؐ کو ابدی نیند سُلانے پر مامور تھے، جاگ رہے تھے۔ وہ ساعتِ صِفر کے منتظر تھے۔ جرم و گناہ چونکہ مکروہ و بھیانک ہوتے ہیں، اس لیے تاریکی و تنہائی

ہی انھیں سازگار ہوتی ہے۔ رات ذرا بھیگی تو وہ شقی القلب اپنی کمین گاہ سے نکلے اور انھوں نے کاشانۂ نبوّت کا محاصرہ کر لیا۔ رات کا پہلا پہر تھا۔ محاصرین کو یہ سان گمان بھی نہ تھا کہ ان کی موجودگی میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم گھر سے باہر نکلنے کی جرأت کر سکتے ہیں، لہٰذا وہ غافل و بے پروا ہو گئے۔ رات کی تاریکی و خاموشی کا عالم، کوہستانی و صحرائی ماحول میں خنک ہوا کا خرام اور نیند کی نشیلی تھپکیاں۔ وہ اونگھ کی سرمستیوں میں نشاطِ غفلت کے مزے لینے لگے۔ آپؐ، جو اس موقع کی تاک میں تھے، سورہ یٰسین کی ابتدائی آیات کی تلاوت فرماتے ہوئے چپکے سے باہر نکلے اور ان کو غافل پا کر بڑی چابکدستی سے صاف بچ کر نکل گئے۔ آپؐ محاصرین سے دُور جا چکے تھے کہ کسی شخص نے آپؐ کو جاتے دیکھ لیا۔ اس نے جا کر محاصرین کو اطلاع دی۔ انھوں نے دیوار پر چڑھ کر اندر جھانکا۔ وہاں حضرت علیؓ آپؐ کے بستر پر آپؐ کی سبز حضرمی چادر، جو آپؐ اوڑھا کرتے تھے، تان کر سوئے ہوئے تھے۔ وہ یہ سمجھے کہ آپؐ سو رہے ہیں، مطمئن ہو گئے اور ساعتِ صفر کا انتظار کرنے لگے۔ ابن سعد نے ان کے نام یہ لکھے ہیں :

(۱) ابوجہل (۲) عقبہ بن ابی معیط (۳) نضر بن الحارث (۴) امیہ بن خلف (۵) ابی بن خلف (۶) زمعہ بن الاسود (۷) نبیہ بن الحجاج (۸) منبہ بن الحجاج (۹) طعیمہ بن عدی (۱۰) حکم بن ابی العاص (۱۱) ابولہب اور (۱۲) ابن الغیطلہ [۳]

منصوبے کے مطابق آپؐ سیدھے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے گھر پہنچے اور چلنے کا اشارہ کیا۔ صدیقِ اکبرؓ جن کی قسمت میں اس یادگار و تاریخ ساز سفر میں پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کا رفیق و یارِ غار بن کر زندۂ جاوید ہو جانا لکھا تھا، شام ہی سے دیدہ و دل فرشِ راہ کیے ہوئے تھے۔ حکمِ سفر ملتے ہی انھوں نے تین تھیلے اُٹھائے اور آپؐ کے پیچھے چل دیے۔ ایک تھیلے میں چھ یا سات ہزار درہم تھے، جو عمر بھر کی جمع کی ہوئی کمائی تھی۔ دوسرے میں زادِ راہ کے لیے کھانا اور تیسرا پانی کا مشکیزہ تھا۔ صدیقِ اکبرؓ کی صاحب زادی حضرت اسماءؓ نے تھیلے کا منہ بند کرنا چاہا مگر رسی وغیرہ نہ ملی تو انھوں نے جلدی میں اپنے نطاق یا کمر بند سے ایک ٹکڑا کاٹ کر اس کا منہ بند کر دیا، اور اس وجہ سے "ذات النطاقین" (یعنی دو کمر بندوں والی) کے لقب سے مشہور ہوئیں۔[۴] ایک روایت میں ہے کہ کمر بند کے دو ٹکڑے کر کے ایک سے کھانے کے تھیلے کا اور دوسرے سے پانی کے مشکیزے کا مُنہ باندھا تھا۔ گھر کے باہر دو مضبوط و توانا اور سبک رفتار سانڈنیاں کھڑی تھیں، جن کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس طویل اور کٹھن سفر کے لیے خوب کھلا پلا کر تیار کیا ہوا تھا۔

یہاں اس دلچسپ نکتے کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے کہ ترکِ وطن اور سفرِ طویل کے لیے، جو انقلابی تحریکوں کے لوازمات میں سے ہے، اشتمالی چین نے "لانگ مارچ" کی تعبیر اختیار کی ہے۔

ایک اُونٹنی پر پیغمبرِ اعظم و آخرؐ اور دوسری پر صدیقِ اکبرؓ سوار ہوئے اور سفرِ ہجرت پر روانہ ہو گئے۔ منصوبے کے مطابق غارِ ثور پہلی منزل تھی۔ طلوعِ سحر سے پہلے حبیبِ خدا اور حبیبِ رسولؐ کوہِ ثور پر پہنچ گئے، جو مکے سے قریباً پانچ میل دُور جنوب میں واقع ہے۔ اس پہاڑ کی ایک جانب ایک مہیب غار ہے جس تک پہنچنے کی راہ سنگلاخ و دشوار ہے۔ دنیا کے عظیم و حسین ترین انقلاب کے یہ دو علمبردار و نقیب ان لوگوں کی خون آشام نظروں سے چُھپنا چاہتے تھے، جن کی رشد و ہدایت کے لیے وہ مصائب جھیل رہے اور اپنی جان کو جوکھوں میں ڈال رہے تھے۔ اس قسم کے مہیب و ویران غار چونکہ عموماً درندوں اور زہریلے حشرات الارض کے مسکن ہوتے ہیں، لہٰذا جائزہ لینے کی خاطر جاں نثارِ پیغمبر بے خطر غارِ ثور کے اندر داخل ہو گئے، اسے صاف کیا اور جہاں جہاں سُوراخ نظر آئے، انھیں بند کیا اور پھر باہر آئے اور اس عظیم انسان کو لے کر غار میں مقید ہو گئے جو ہر زمان و مکان کے انسان کے لیے پیغمبرِ رحمت بن کر مبعوث ہوا تھا۔ اس طرح وہ جو اپنے صدق کے باعث "صدیقِ اکبر" تھا، اسے رفاقتِ غار کی بدولت "یارِ غار" بن کر زندۂ جاوید ہو جانے کی سعادت حاصل ہوئی۔[۵]

اُدھر محاصرین آپؐ کی گھات میں لگے ہوئے تھے کہ صبح ہو گئی۔ وہ گھبرائے اور گھر کے اندر گھس گئے اور آپؐ کے بستر پر حضرت علیؓ کو دیکھا تو مایوس و پریشان ہو گئے۔ حضرت علیؓ سے پوچھا : محمد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کہاں ہیں؟ انھوں نے جواب دیا : مجھے کیا خبر؟ پہرا تو تمھارا تھا۔ تم لوگوں نے انھیں نکل جانے دیا اور وہ نکل گئے۔ قریش کے ان سورماؤں کو اپنی غفلت اور چُوک پر سخت ندامت ہوئی اور تاؤ بھی آیا۔ جب کچھ بن نہ پڑا تو حضرت علیؓ پر پل پڑے اور پکڑ کر خانۂ کعبہ میں لے گئے۔ انھوں نے بہت جتن کیے، لیکن آپؐ کی پراسرار گمشدگی کا راز ان سے اُگلوا نہ سکے۔ قریش حضرت علیؓ کو چھوڑ کر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے گھر پہنچے۔ ٹھیک پہنچے لیکن تاخیر سے پہنچے۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ حضرت اسماءؓ بنت ابوبکر صدیقؓ باہر نکلیں تو ابوجہل نے پوچھا : ابوبکر کہاں ہیں؟ انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو ابوجہل نے انھیں ڈرایا دھمکایا، لیکن راز اُگلوا نہ سکا تو اس زور سے ان کو طمانچہ مارا کہ ان کی کان کی بالی گر گئی اور وہ اندر چلی گئیں۔[۶] قریش یہاں سے بھی بے نیلِ مرام لوٹے، لیکن وہ خاموش کب بیٹھنے والے تھے۔ انھوں نے آپؐ کی گرفتاری کے لیے سو اونٹوں کے انعام

کا اعلان کیا اور مسلح جوانوں کو کھوجیوں کے ہمراہ آپؐ کے تعاقب میں روانہ کیا۔ وہ کھوج لگاتے لگاتے غارِ ثور کے قریب پہنچ گئے۔ ان کے گھوڑوں کی ٹاپ صاف سنائی دینے لگی۔ ہر لحظہ خطرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کا دل ایمان و صدق سے معمور ہونے کے باوجود آخر بشر کا دل تھا، خطرہ محسوس کر کے ڈر گیا۔ لیکن آپؐ کا دل جو نورِ نبوت سے منور تھا، خوف و خطر سے ماورا تھا۔ آپؐ نے اپنے رفیقِ غارؓ سے فرمایا: غم نہ کر۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔[۸] آپؐ کے ان الفاظ میں ایسا اثر تھا کہ دلِ صدیقؓ سے خوف و غم جاتا رہا اور ان کی جگہ سکینت و طمانیت نے لے لی۔

دشمنوں نے پہاڑ کے ایک ایک گوشے کو دیکھا، لیکن انھوں نے غار کے اندر جانے کی زحمت گوارا نہ کی، کیونکہ اس کے اندر کسی انسان کے چھپنے کے امکان کو وہ نظر انداز کر چکے تھے۔ سوچ کا یہ انداز حزم و احتیاط کے منافی تھا۔ چنانچہ اس غفلت نے ان کو ناکام بنا دیا، اور مایوس و نامراد لوٹ گئے۔

منصوبہ بندی آپؐ کی سُنّتِ حسنہ تھی۔ چنانچہ آپؐ نے ہجرت کا منصوبہ بڑے غور و فکر اور حزم و احتیاط سے بنایا تھا۔ راستے کا تعین، راہ دان اور قیام و طعام کا انتظام کر لیا گیا تھا۔ یہ سب کچھ بڑی رازداری سے کیا گیا تھا کہ صدیقِ اکبرؓ کے گھرانے کے دو تین افراد کے سوا کسی کو علم نہ تھا۔ ایک غلام کو ضرورت کے تحت عین وقت پر اس راز سے آگاہ کیا گیا۔ ان اشخاص نے اپنے فرائض ایسے رازدارانہ اور احسن طریقے سے سرانجام دیے کہ قریش کے کانوں میں اس کی بھنک تک نہ پڑی۔

دشمن کے ارادے اور کارروائیوں سے باخبر رہنا، بہترین حکمتِ عملی اور ناگزیر حربی ضرورت ہے۔ آپؐ مکے کی سرد جنگ اور مدینے کی مسلح جنگوں میں برابر اس حکمتِ عملی پر کاربند رہے۔ چنانچہ قریش کے ارادوں اور چالوں سے باخبر رہنے کے لیے آپؐ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے جواں سال صاحب زادے عبداللہ کو سُراغ رسانی کے کام پر مامور کیا جو دن بھر قریش کے پاس رہتا اور رات کو کھانا لے کر بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوتا اور تمام حالات سے آپؐ کو مطلع کرتا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا غلام رات کی تاریکی میں وہاں ریوڑ لے جاتا اور یارانِ غار کو تازہ دودھ پلاتا۔ حضرت اسمأ روزانہ شام کو گھر سے کھانا پکا کر غار میں پہنچا آتی تھیں۔[۹]

پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیقِ اکبرؓ غار کی تاریک تنگنائے میں تین دن خلوت گزیں رہے۔ وہ اہلِ دُنیا کی نظروں سے اوجھل تھے لیکن اپنے الٰہ و ربّ کی نظر میں تھے، جو اس عالمِ تنہائی

میں بھی ان کا مونس و رفیق تھا۔ منصوبے کے مطابق چوتھی رات یعنی یکم ربیع الاوّل ۱ ہجری/ ۱۶ ستمبر ۶۲۲ء کو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے گھر سے پھر وہی دو اونٹنیاں آ گئیں جن کو اس سفر کی خاطر کھلا پلا کر خوب تیار کیا گیا تھا۔ ایک اُونٹنی پر آپؐ اور آپؐ کے یارِ غارؓ اور دوسری پر عامر بن فہیرہ (حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ملازم) اور عبداللہ بن اریقط (جسے بطورِ دلیلِ راہ ملازم رکھ لیا تھا) سوار ہوئے اور مدینے کی طرف کوچ کیا۔ دلیلِ راہ نے آپؐ کی ہدایت کے مطابق عام شاہراہ کو چھوڑ کر ایک غیر مانوس راستہ اختیار کیا جو ساحلِ سمندر کے ساتھ ساتھ جاتا تھا۔ آپؐ رابغ کے موجودہ قلعے کے پاس سے گزر رہے تھے کہ سراقہ بن جعشم نے جو انعام کے لالچ میں آپؐ کی تلاش میں نکلا تھا، آپؐ کو دیکھ لیا۔ سراقہ اپنی قوت و شجاعت اور مبارزت طلبی کے لیے معروف تھا۔ سو اونٹوں کے لالچ نے اسے اور بھی جری بنا دیا تھا۔ اس نے فرطِ طرب میں اپنی عوز نامی برق رفتار گھوڑی کو مہمیز لگائی۔ وہ سرپٹ دوڑی، لیکن دفعتاً ٹھوکر کھائی اور گر پڑی۔ سراقہ گر کر اُٹھا اور پھر سوار ہوا۔ گھوڑی کو پھر دوڑایا لیکن آپؐ کے قریب پہنچ کر دفعتاً اس کے پاؤں ریتلی زمین میں اس طرح دھنس گئے کہ سراقہ ششدر رہ گیا۔ اس کے دل پر ایک نامعلوم خوف طاری ہو گیا اور وہ اس قدر ہیبت زدہ اور مرعوب ہوا کہ پیکرِ عجز و نیاز بن گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ کوئی غیبی قوت آپؐ کی حامی و ناصر ہے اور آپؐ عرب پر غلبہ پا لیں گے۔ چنانچہ اس نے آپؐ سے خطِ امان کی درخواست کی جو منظور ہوئی۔ امتثالِ امر میں عامر بن فہیرہ نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر فرمانِ امان لکھ کر دیا۔ آپؐ کے ارشاد پر سراقہ نے وعدہ کیا کہ وہ اہلِ مکہ وغیرہ کو آپؐ کے بارے میں کچھ نہیں بتائے گا۔ یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ آپؐ محاصرین کی تلواروں کے سائے سے بچ کر نکلے تھے۔ ہر طرف سے دشمن آپؐ کے تعاقب میں تھے۔ ایسی بے سر و سامانی، خوف اور پریشانی کی حالت میں بھی آپؐ کے پاس قلم دوات کا ہونا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ آپؐ ان چیزوں کو ازبس اہمیت دیتے تھے۔[۱۰]

ہجرت کا سفر جاری تھا کہ ایک اور تعاقب کرنے والے سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ اس کا نام بریدہ بن الحصیب اسلمی تھا۔ وہ اپنی قوم کا سردار تھا اور اپنے آدمیوں کے ساتھ انعام کی لالچ میں آپؐ کی تلاش میں نکلا تھا۔ لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ مال کے بدلے اسے دولتِ دل ملے گی۔ آپؐ کے جلالِ شخصیت اور حسنِ کلام سے وہ اس قدر متأثّر و مرعوب ہوا کہ اپنے ستّر افراد سمیت اسی وقت ایمان لے آیا اور تحریکِ اسلام میں شامل ہو گیا۔ اس عالمِ ہجرت و غربت میں یہ غیر متوقع کامیابی بڑی ہی خوش آیند، مبارک اور حوصلہ افزا تھی۔ دورانِ سفر میں ایک حسنِ اتفاق اور ہوا۔ زبیر بن العوامؓ

نے جو مسلمان تاجروں کی ایک جماعت کے ساتھ شام سے واپس آرہے تھے، آپؐ کو دیکھ کر حاضری دی اور آپؐ کے اور صدیق اکبرؓ کے لیے دو سفید ملبوسات پیش کیے۔[۱۱]

اِدھر آپؐ یثرب کی آزاد فضا کی طرف ایک نئے ولولۂ شوق سے گامزن تھے، اُدھر یثرب کے مسلمان فرطِ اشتیاق سے آپؐ کے لیے چشم براہ تھے۔ بچے خوشی سے آپؐ کی شان میں گیت گاتے اور پیر و جوان صبح سویرے شہر سے باہر نکلتے اور دوپہر تک آپؐ کی راہ دیکھتے اور پھر یوں مایوس ہو کر واپس ہوتے جیسے عشاق اشتیاقِ دید کی حسرت لیے لوٹتے ہیں۔ آخر آپؐ کی سفر کی راہیں اور انصار کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ ۸ ربیع الاول ۱ ہجری/۲۳ ستمبر ۶۶۲ء کو شنبہ کے روز آپؐ قبا میں وارد ہوئے جو مدینہ منورہ سے ۳ میل دور ہے۔ یہاں انصار کے چند گھرانے آباد تھے اور ان کے پاس مہاجرین بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ دوپہر ڈھل چکی تھی اور اہلِ شوق صبح سے آپؐ کا انتظار کرتے کرتے حسرت بھرے دلوں کے ساتھ گھروں کو لوٹنے ہی تھے کہ اچانک شور ہوا کہ آپؐ کی سواری آگئی۔ لوگ دیوانہ وار گھروں سے نکل نکل کر بھاگے۔ اشتیاقِ دید کا یہ عالم تھا کہ ایک نظر دیکھنے کے لیے آپؐ پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ ان کی خوشیوں کی انتہا نہ تھی۔ فضا اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اُٹھی۔ شوقِ دید اور سرورِ دل کا یہ نظارہ چشم فلک نے شاید ہی پھر کبھی دیکھا ہو۔[۱۲]

قُبا میں شرفِ میزبانی حضرت کلثوم بن الہدمؓ کو حاصل ہوا، جہاں آپؐ نے چودہ دن قیام فرمایا۔ تین دن بعد حضرت علیؓ بھی وہاں پہنچ گئے۔ اس نہایت مختصر عرصے میں آپؐ نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ مسجد تعمیر کی۔ اس سے اسلام کی نظر میں مسجد کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ مسجد اسلامی ثقافت (اپنے وسیع ترین مفہوم میں) کی علامت اور اس کا سرچشمہ ہے۔ آپؐ نے مسجد کی محض بنیاد ہی نہیں رکھی جو "بڑے" لوگوں کا شیوہ ہے بلکہ اس کی تعمیر میں خود بھی مزدوروں کی طرح کام کیا۔ بھاری بھرکم پتھروں کو اُٹھاتے اُٹھاتے آپؐ کا جسمِ مبارک خم ہو ہو جاتا، جاں نثاروں سے یہ عالم دیکھا نہ جاتا۔ وہ آپؐ سے التجا کرتے کہ آپؐ یہ کام نہ کریں، لیکن اخوت و مساوات کی تحریک کے علمبردار سے یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ خود اس کی مثال قائم نہ کرتا۔ آپؐ مسجد کی تکمیل تک برابر مزدوروں کی طرح کام کرتے رہے۔ اس طرزِ عمل سے مسلمانوں میں بالخصوص اور دوسرے لوگوں میں بالعموم اس حقیقت کا عرفان و ایقان پیدا کرنا مقصود تھا کہ اسلام کی نظر میں سب انسان برابر ہیں اور محنت و مشقت سب کا مقدر

ہے اور محنت باعثِ ننگ نہیں، وجۂ عزت و افتخار ہے۔[۱۳]

سُر اور شعر میں سرور و سحر ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے انسان اکتاہٹ، تھکن اور دباؤ دُور کرنے کی خاطر شعر گنگنانے یا گیت گانے لگتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن رواحہؓ شاعر تھے۔ وہ بھی مسجد کی تعمیر میں مزدوروں کی طرح کام کرتے تھے اور ساتھ ساتھ یہ شعر بھی ترنم سے پڑھتے جاتے تھے:

افلح من یُعالج المساجدا

دیقرء القرآن قائماً وّقاعدا

ولایبیت اللیل عنه إقدَا

(وہ بامراد و کامیاب ہوا جو مسجدیں تعمیر کرتا ہے: اور اُٹھتے بیٹھتے قرآن پڑھتا ہے: اور رات کو جاگتا رہتا ہے)۔ آپؐ بھی اس کی ہمنوائی کرتے تھے۔[۱۴]

یوں تو ہر مسجد اللہ تعالیٰ کا گھر ہے اور اس کی اہمیت و فضیلت مسلّمہ ہے، لیکن مسجدِ قُبا کی فضیلت و اہمیت اس لیے بڑھ جاتی ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے اس کی، اس کے مؤسّس اور اس کے نمازیوں کی تعریف کی ہے: وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے ہی دن تقویٰ پر رکھی گئی ہے، وہ اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ تم اس میں قیام (نماز) کرو۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک ہو جانے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ پاکیزہ زندگی بسر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔[۱۵]

اہلِ قُبا کے لیے مسجد کی تعمیر کر چکنے کے بعد آپؐ نے جمعے کے دن ۱۲ ربیع الاول ۱ ہجری کو قبا سے شہر (مدینہ) منتقل ہو جانے کا فیصلہ کیا۔ آپ کی سواری ابھی بنو سالم بن عوف کے محلّے میں پہنچی تھی کہ جمعہ کا وقت ہو گیا۔ تقریباً سو مسلمانوں کے ساتھ آپؐ نے نماز ادا کی اور خطبہ ارشاد فرمایا۔ اسلام میں یہ پہلی نمازِ جمعہ اور خطبۂ جمعہ تھا اور مدینے میں آپؐ کا یہ پہلا خطبہ تھا۔[۱۶]

آپؐ نے فرمایا:

حمد و ستائش اللہ ہی کے لیے ہے۔ میں اس کی حمد و ستائش کرتا اور اسی سے مدد مانگتا اور اسی سے بخشش و ہدایت کی طلب و آرزو رکھتا ہوں۔ اسی پر میرا ایمان ہے۔ میں اس کی نافرمانی نہیں کرتا اور جو اس کی نافرمانی کرے میں اس کا دشمن ہوں۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ کوئی اِلٰہ (معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود) نہیں اللہ تعالیٰ کے سوا، جو یکتا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور محمدؐ اس کا بندہ اور رسول ہے۔ اسی نے محمدؐ کو ہدایت، نور اور موعظت و نصیحت دے

کر بھیجا (اور اس زمانے میں بھیجا) جب کسی رسول کو آئے ایک زمانہ ہو چکا تھا۔ علم کم ہو گیا تھا اور لوگ گمراہ ہو گئے تھے۔ اسے آخری زمانے میں، قیامت کے نزدیک اور زندگی کے اختتام کے قریب بھیجا گیا۔ جو کوئی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا حکم مانتا ہے، وہی ہدایت پاتا ہے، اور جو کوئی اس کی نافرمانی کرتا ہے، وہ بھٹک گیا اور مقام (انسانیّت) سے گر گیا اور وہ ضلالتُ گمراہی میں بھٹک کر بہت دور نکل گیا۔

مسلمانو! میں تمھیں اللہ سے تقویٰ کی وصیّت کرتا ہوں۔ بہترین وصیّت جو مسلمان مسلمان کو کر سکتا ہے، یہ ہے کہ اسے آخرت کی رغبت دلائے اور آمادہ کرے۔ اللہ نے جن باتوں سے تمھیں دور رہنے اور بچنے کو کہا ہے، ان سے بچتے رہو۔ اس سے بڑھ کر نہ کوئی نصیحت ہے اور نہ اس سے بڑھ کر کوئی ذکر ہے۔ یاد رکھو! جو شخص خشیتِ الٰہی کے ساتھ عمل کرتا ہے اس کا تقویٰ امورِ آخرت کے بارے میں بہترین مددگار ثابت ہوتا ہے، نیز جو کوئی شخص اپنے اور اللہ کے درمیان معاملہ صدقِ دل سے باطنی اور ظاہرہ طور پر درُست کرتا ہے تو اس کے لیے دنیا میں ذکر باقی رہے گا اور آخرت میں نیکیوں کا ذخیرہ بن جائے گا۔ لیکن اگر کوئی شخص ایسا نہیں کرتا تو وہ اپنی بدیوں کے سبب چاہے گا کہ اس میں اور بدیوں میں ایک بڑا دُور دراز فاصلہ ہو۔

اللہ تعالیٰ تمھیں اپنے احکام کی مخالفت سے ڈراتا ہے (کیونکہ اس کا انجام انسان کے حق میں بھیانک ہوتا ہے اور) اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑا ہی مہربان ہے۔ اس نے اپنی بات سچ کر دکھائی، اور اپنا وعدہ پورا کیا۔ اس کے وعدے میں کوئی خلاف نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ہماری بات نہیں بدلا کرتی، اور ہم اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتے۔

مسلمانو! اپنے حال اور مستقبل کے کاموں میں ظاہری اور باطنی طور پر اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ جو کوئی اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے، وہ اس کی بُرائیوں کو دور اور اس کے اجر کو بہت زیادہ کر دیتا ہے۔ جو شخص اللہ سے ڈرا اسے یقیناً عظیم کامیابی نصیب ہوئی۔ تقویٰ اللہ تعالیٰ کے غضب، عذاب اور غصّے سے بچا لیتا ہے۔ تقویٰ چہرے کو روشن (یعنی انسان کو سُرخرو) اور پروردگار کو خوش اور (انسان کے) درجے (یا مقام) کو بلند کرتا ہے۔

لوگو! اپنا حِصّہ لو مگر حقوقِ الٰہی میں کمی بیشی نہ کرو۔ اللہ تعالےٰ نے تمھیں اپنی کتاب سکھا دی اور اپنی راہ دکھا دی ہے، تاکہ سچّوں اور جھُوٹوں میں تمیز ہو۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے

تمھارے ساتھ احسان کیا ہے، تم بھی دوسروں کے ساتھ اسی طرح احسان کرو (یعنی ان کی زندگیوں کو حسین و خوشحال بناؤ) نیز اس کے دشمنوں سے دُشمنی کرو، اور اس کی راہ (یعنی انسانیّت کی فلاح و بہبود اور خوشحالی و ترقی کے کاموں) میں ایسی کوشش کرو جو کوشش کرنے کا حق ہے۔ اس نے تم کو برگزیدہ کیا اور تمھارا نام مسلمان رکھا۔ وہ ہلاک ہوا جو بیّنہ یعنی قرآن مجید کے مطابق ہلاکت میں پڑا، اور وہ زندہ ہوا جس نے قرآن کے مطابق زندگی بسر کی۔ کسی کو نیکی کی طاقت اس کی مدد کے بغیر نہیں ہے۔ اللہ کا ذکر کثرت سے کرو اور کل (یعنی آخرت) کے لیے عمل کرو۔ جو شخص اپنے اور اللہ کے درمیان معاملہ درست کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے اور لوگوں کے مابین معاملے کو درُست کر دینے کا کفیل بن جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کا حاکم ہے اور اس کا کوئی حاکم نہیں۔ اللہ لوگوں کا مالک ہے، اس کا کوئی مالک نہیں۔ اللہ ہی بڑا ہے۔ عظیم و برتر اللہ کی توفیق کے بغیر کسی کو نیکی کرنے کی طاقت نہیں۔[۱]

نمازِ جمعہ سے فارغ ہو کر آپؐ جنوب کی طرف سے یثرب کے شہر میں داخل ہوئے، اور اس دن سے اس کا نام مدینۃ النّبی (نبی کا شہر) ہو گیا، جسے آپؐ کی ذاتِ پُرنور کی برکت سے مدینۂ منوّرہ کہتے ہیں۔ ہر عالِمِ زمان و مکان کا وہ عظیم انسان، جس کے مقدر میں عظیم و بیمثال انقلاب لانا اور مثالی معاشرے کی تعمیر کرنا لکھا تھا، اہلِ مکّہ کے نزدیک مفرور تھا، لیکن ربِّ اعلیٰ کی نظر میں وہ مہاجر اور انصار کی نگاہ میں وہ پیکرِ رحمت تھا۔ آپؐ کی سواری درویشانہ تھی لیکن اہلِ مہر و وفا ہر طرف دیدہ و دل فرشِ راہ کیے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں خوشیاں رقص کر رہی تھیں اور چہرے فرطِ مسرّت سے تمتما رہے تھے۔ حمد و ثنا کے زمزموں سے فضا گونج رہی تھی اور اس گُونج میں ایک روح افزا سحر تھا، جس سے دل مسحور ہوئے جاتے تھے۔ انوار و سرور کی اس طرح بارش ہو رہی تھی کہ اہلِ مہر و وفا کے دل وجد کر رہے تھے۔ انھیں اب صرف شوقِ دید و لقا ہی نہیں تھا بلکہ ہر ایک کو یہ آرزُو بھی تھی کہ وہ "پیکرِ رحمت" اس کے گھر اُترے، اس کا مہمان بنے اور اسے شرفِ میزبانی بخشے۔ ہر دل میں جان و مال نذر کرنے کی تمنا تھی۔ ہر اہلِ مہر و وفا پیکرِ شوق و دُعا بنا ہوا تھا کہ قرعۂ میزبانی اس کے نام نکلے اور دولتِ کونین اسے نصیب ہو۔ فضا میں ایسا نور و سرور تھا کہ عورتیں اور بچّے بھی خوشی سے پھُولے نہیں سماتے تھے۔ اس عالم میں خواتین سے بھی رہا نہ گیا، اور وہ حبیبِ خدا کے چہرۂ پُرنور کی زیارت کے لیے چھتوں پر چڑھ گئیں اور عالمِ کیف و سرور میں یہ اشعار گانے لگیں:

(۱) طلع البدر علینا	من ثنیّات الوداع
(۲) وجب الشُکر علینا	مادعیٰ للّٰہِ داع
(۳) ایّھا المبعوث فینا	جئت بالامر المطاع
(۱) ہم پر چودھویں رات کا چاند طلُوع ہوا	کوہ وداع کی گھاٹیوں سے
(۲) ہم پر اللہ تعالیٰ کا شکر واجب ہوا	جب تک دعا مانگنے والے دُعا مانگیں
(۳) اے جو ہم میں نبیؐ بن کر مبعوث ہوا	تیرے حکم کی اطاعت ہم پر فرض ہے

گھروں سے باہر معصوم بچیاں دف بجا بجا کر یہ ترانہ گاتی تھیں :

نحن جوار من بنی النجّار
یا حبّذا محمّداً من جار

ہم بنو نجّار کی لڑکیاں ہیں   محمّد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کیا اچھا ہمسایہ ہے۔

اہلِ مہر و وفا کے لیے جنھیں انصار کہتے ہیں، یہ لمحات عیدِ مسرت بھی تھے اور عیدِ تمنا بھی۔ آپؐ کی سواری شہر میں گزرتی گئی اور اہلِ شوق و وفا منّتیں اور التجائیں کرتے رہے کہ آپؐ یہاں ٹھہریں، وہاں ٹھہریں۔ آپؐ کو سب کا پاس خاطر تھا، لیکن "دوست" کا اشارہ کچھ اور تھا۔ آپؐ سب کو دُعائیں دیتے، مرحبا کہتے، تبسّمِ امتنان فرماتے، گزرتے گئے۔ یہاں تک کہ آپؐ اس جگہ پہنچ گئے جو دوست نے آپؐ کے لیے مخصوص کر دی تھی۔ آپؐ کی اونٹنی بیٹھ گئی اور حضرت ابو ایوب انصاریؓ فرطِ شوق و بے تابی سے لپکے اور آپؐ کا سامان اُٹھا کر اپنے گھر لے گئے جو آپؐ کی برکت سے حسن المآب بن گیا۔[۱۰] اہلِ شوق و وفا کو حضرت ابو ایوب انصاریؓ پر رشک تو آیا مگر یہ سوچ کر مطمئن ہو گئے ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

اس وقت سے سنہ ہجری کا آغاز ہوا۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ کو سات ماہ تک آپؐ کی میزبانی کی سعادت حاصل رہی۔

حواشی و تشریحات

(۱) ابن ہشام، ۱: ۲۶۴، ۲۶۵ ببعد، "طبقات" ابن سعد، ۱: ۲۲۷، ۲۲۸ ببعد۔

(۲) الانفال ۸: ۳۰۔

(۳) "طبقات" ابن سعد، موضوع مذکور۔

(۴) صحیح بخاری، باب الہجرۃ۔

(۵) Long March

(۶) اس واقعہ کو امام بخاری نے تفصیل سے لکھا ہے۔ دیکھیے "صحیح بخاری" باب الہجرۃ و باب مناقب المہاجرین۔

(۷) "تاریخ طبری" ۳: ۱۲۳۴ ببعد۔

(۸) لَاتَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (التوبۃ ۹: ۴۰)۔

(۹) ابن ہشام، ۱: ۱۶۹ تا ۱۷۳، طبری ۲۴۷، ۲۴۸، صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب الہجرۃ۔

(۱۰) متذکرہ بالا موضوعات۔ صحیح بخاری میں ہے کہ سراقہ کا اصل نام سراقہ بن مالک بن جعشم کنانیؓ ہے۔ علاقہ رابغ پر اسی قبیلے کا قبضہ تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ جب سراقہؓ خطِ امان لے کر لوٹنے لگا تو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: سراقہ! اس وقت تیری کیا شان ہوگی جب تیرے ہاتھوں میں کسریٰ کے طلائی کنگن پہنائے جائیں گے۔ سراقہ نے غزوہ احد کے بعد اسلام قبول کیا تھا۔ عہدِ فاروقی میں جب مدائن (ایران) فتح ہوا اور کسریٰ کا تاج اور زیورات خلیفہ حضرت عمر فاروقؓ کے سامنے پیش ہوئے تو اُنھوں نے سراقہؓ کو بلایا اور ان کے ہاتھوں میں وہ کنگن پہنائے۔ زمانے نے دیکھا کہ سچے نبیؐ کی پیش گوئی تھی، سچی ثابت ہوئی۔ ("استیعاب")۔

(۱۱) بخاری، باب الہجرۃ، ۵ : ۷۷ بعد۔
(۱۲) موضوع مذکور۔ نیز دیکھیے "تاریخ ابن خلدون"۔ ص ۶۶ بعد، ابن ہشام، ۲ : ۱۳۸ بعد۔
(۱۳) طبرانی کبیر" ۱ : ۱۸۰، بحوالہ شبلی، "سیرۃ النبی" ۱ : ۲۷۶۔
(۱۴) وفاالوفا، بحوالہ ابن شیبہ، (مصر)، ۱ : ۱۸ دیکھیے شبلی، ۱ : ۲۷۷۔
(۱۵) التوبہ ۹ : ۱۰۸۔
(۱۶) بخاری، باب الہجرۃ، رحمۃ للعالمین، ص ۹۱ تا ۹۵ بعد۔
(۱۷) "تاریخ طبری" ۲ : ۲۵۵۔
(۱۸) صحیح بخاری ومسلم، باب الہجرۃ، "سیرۃ النبی" ۲۷۸، ۲۷۹ بعد۔ ابن ہشام (اردو) ۱ : ۵۰۸، ۵۰۹۔

دوسرا حصّہ

مدنی زندگی

اسلامی معاشرے کی تشکیل وتعمیر

تحریکِ اسلام جارحیّت کی زد میں

فتح مُبین اور تکمیلِ دین

باب : ۹

اسلامی معاشرے کی تشکیل و تعمیر

(۱) مدینے کا نیا معاشی، مذہبی اور سیاسی ماحول :
یہود، مشرک و بُت پرست، منافق اور نصاریٰ

(۲) اسلامی معاشرے کا خاکہ

(ا) رُوحانی زندگی کے اُصول

(ب) عمرانی زندگی کے اُصول

(ج) معاشی زندگی کے اُصول

(د) سیاسی زندگی کے اُصول

(ر) ثقافتی زندگی کے اُصول

(س) عسکری زندگی کے اُصول

(۳) حواشی و تشریحات

باب ۹

اِسلامی مُعاشرے کی تشکیل وتعمیر

ہجرت، جس نے تاریخ کی جہت کو صالحہ بنانا اور ایک نئے حسین ومنوّر دَور کا آغاز کرنا تھا، اس کا بنیادی مقصد مدینے کو تحریکِ اسلام کا مستقل مستقر بنانا اور اس کے ذریعے وہاں ایک مثالی معاشرہ تعمیر کرنا تھا۔ اس مثالی معاشرے کا خاکہ یقیناً آپؐ کے ذہن میں ہوگا۔ وجہ یہ ہے کہ آپؐ کی بعثت کا بنیادی مقصد بھی تو یہی تھا۔ دوسرے آپؐ کی نظر نورِ وحی وتنزیل سے روشن، تیز، دُور رس اور مستقبل بیں تھی، اور قلب زندہ وبیدار اور حسین وفعّال تھا، جس کے باعث آپؐ کی عقل سلیم اور فکر رسا تھی۔ علاوہ بریں آپؐ میں تخلیقی قوّت بدرجۂ اتمّ پائی جاتی تھی اور طبیعت ندرت پسند تھی۔

بہرحال مدینے میں آپؐ نے اپنے آپ کو ایک نئے ماحول میں پایا جو سیاسی، معاشی اور معاشرتی بلکہ ثقافتی لحاظ سے بھی مکّے کے ماحول سے مختلف تھا۔ مکّے میں صرف قریش ہی کے پاس حکومت وقوّت تھی، اور اہلِ مکّہ قریب قریب سبھی مشرک وبُت پرست تھے، لیکن مدینے میں بُت پرستوں کے علاوہ یہود ونصاریٰ بھی تھے۔ وسائل پیداوار پر زیادہ تر یہود کا قبضہ تھا اس لیے معاشی، ثقافتی، سیاسی اور عسکری لحاظ سے ان کی حیثیت بڑی مضبوط ومستحکم تھی۔ ان کے پاس مضبوط قلعے، سرسبز وشاداب باغات اور کھیتیاں تھیں اور علم وہنر میں بھی ان کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ وہ سُود خوار تھے اور انھوں نے یثرب کے غیر یہود باشندوں کو سود کے جال میں اس طرح پھنسا رکھا تھا کہ ان کے لیے چھٹکارا پانا ازبس دُشوار بلکہ محال ہو چکا تھا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ معاشی وثقافتی لحاظ سے غیر یہود ان کے دست نگر اور محکوم تھے۔

اگرچہ یہود اپنے آپ کو توحید پرست کہتے تھے، لیکن ایک تو ان کا عقیدۂ توحید خالص نہیں رہا تھا اور دوسرے ان کی فکری وعملی زندگی سے اس عقیدے کا تعلق برائے نام رہ گیا تھا۔

علاوہ بریں یہودیت تبلیغی دین نہیں تھا' اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اپنی سنگدلی، منافقت' بدعہدی اور بدکرداری کی وجہ سے بہت بدنام تھے' اس لیے ان کے دین میں دوسروں کے لیے کشش و جاذبیت نہیں تھی، لہٰذا وہ اہلِ یثرب کو اپنے دین میں داخل نہ کر سکے۔ یہود اسلام کے عقاید خصوصًا عقیدۂ توحید سے متاثّر تو ہوئے لیکن ان کی نسلی و دینی عصبیّت کو یہ گوارا نہ تھا کہ کوئی دین مسیحیت کو سچا تسلیم کرے' جس کی تکذیب ان کے آباؤ اجداد کرتے چلے آئے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اسلام ایک انقلابی تحریک تھی جس میں فرعونیت' ہامانیت اور قارونیت کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی اور یہ یہودی معاشرے کے اجزائے لاینفک بن چکے تھے۔ حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا مقصد ہی ان استحصالی قوتوں کا استیصال کرنا اور بنی اسرائیل کو ان کی محکومی و غلامی سے نجات دلانا اور ان سے پاک معاشرہ تعمیر کرنا تھا۔ بہرحال سرمایہ دارانہ ذہنیت کی وجہ سے یہود اسلام کے عقایدِ جلیلہ و محرّکہ سے خوف زدہ و مرعوب تھے' اس لیے اسے اپنے دین اور قومی تشخص کے لیے زبردست خطرہ سمجھتے تھے۔ علاوہ بریں وہ حد درجہ متعصب و سرکش اور احساسِ برتری کا شکار تھے۔ ان وجوہات کی بنا پر وہ اسلام اور مسلمانوں کے بدترین دشمن بن گئے۔ شرک و سرداری نظام کی وجہ سے بُت پرست قبائل بھی اسلام کے مخالف و دشمن تھے۔ نصاریٰ مدعیِ توحید ہونے کے باوجود حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا اور اس کا شریک مانتے تھے۔ چنانچہ جب اسلام نے ان کے باطل و خود ساختہ عقاید مثلاً ابنیّت، تثلیث، کفارہ، کلیسائیت وغیرہ پر کاری ضرب لگائی تو وہ بھی تحریکِ اسلام کے مخالف ہو گئے۔[۵]

کفار اور اہلِ کتاب کے علاوہ اسلام کی تحریک کی ایک دوست نما دشمن جماعت بھی تھی' جو اپنی دورُخی حکمتِ عملی کے سبب "منافق" کہلاتی ہے' جسے آجکل کی زبان میں موقع پرست کہتے ہیں۔ اس جماعت کا قائد عبداللہؓ بن ابی بن سلول تھا۔ وہ ایک بہادر، طاقتور اور زیرک امیر تھا۔ اس کی سیاسی بصیرت' حکمتِ عملی' شاعرانہ صلاحیت اور قوت و صولت کی وجہ سے یثرب کے اوس و خزرج کے قبائل بالخصوص اس کی شخصیت سے بہت زیادہ متاثّر و مرعوب تھے۔ عبداللہ بن ابی اس دھن میں لگا ہوا تھا کہ کسی طرح ان قبائل کی تائید و معاونت حاصل کر کے اپنے لیے حکومت کی داغ بیل ڈالے۔ وہ قریب قریب اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو چکا تھا کہ اسلام نے یثرب میں قدم جما لیے۔ چنانچہ جب اس نے دیکھا کہ اوس و خزرج کے قبائل اسلام کی تحریکِ انقلاب میں جوق در جوق داخل ہو رہے ہیں تو اس نے بھی اپنی جماعت سمیت موقع پرستی اور سیاسی مصلحت

کی بنا پر کلمہ پڑھ لیا' لیکن اندر سے ایمان نہ لایا۔ اس منافقِ اعظم کا رویّہ یہ تھا کہ وہ زبان سے اپنے آپ کو مسلمان کہتا تھا' لیکن دشمنانِ اسلام کے پاس جاتا تو اسلام سے اپنی بیزاری و نفرت کا اظہار کرتا اور اسے پامال کرنے کے منصوبے بناتا۔ اگرچہ اس منافقِ اعظم نے مسلمانوں کو زک پہنچانے اور ان کی قوت ختم کر کے اپنی عملداری قائم کرنے کے لیے سازشیں کیں اور چالیں چلیں' لیکن وہ بے نیلِ مرام ہی مرا۔[۶]

یثرب کے ان نامساعد و خطرناک سیاسی حالات میں آپؐ نے اسلام کی تحریکِ انقلاب کو کامیاب بنانے کے لیے ایک نئے معاشرے کی بنیاد رکھنی اور اسلام کے اصولوں کے مطابق اس کی تشکیل و تعمیر کرنی تھی۔ آپؐ اہلِ عرب کی سیاسی بصیرت سے غافل نہ تھے اور جانتے تھے کہ اہلِ یثرب اپنے اندر ایک انقلابی معاشرے اور حکومت کے وجود کو برداشت نہیں کریں گے۔ لہٰذا آپؐ اپنے بے مثال تدبّر کے ذریعے ان کے ساتھ سیاسی معاہدات کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اصل یہ ہے کہ اس کامیابی ہی نے آپؐ کو مدینے میں اسلامی معاشرے اور مملکت کی طرح ڈالنے اور اہلِ مکہ کی سیاسی چالوں، دباؤ اور جارحانہ حملوں کا مقابلہ کرنے' نیز ان کی تجارتی شاہراہ کو مسدود کرنے اور اس طرح ان کی معیشت کو کمزور کر کے ان کی جارحانہ قوت کو مضمحل کرنے کے قابل بنایا۔ جس کی داستان خیال آفریں اور حکمت آموز و بصیرت افروز ہے۔ یہ داستان جو ہر زمان و مکان کے پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم اور عظیم و مثالی انسان کی رُودادِ حیات ہے۔ اس میں ہر انسان کے لیے عظیم و کامیاب بننے کے اصول و طریقے موجود ہیں۔ قرآنِ مجید کی زبان میں اس میں ہر دَور کے انسان کے لیے بہترین نمونۂ زندگی (اُسوۂ حسنہ) موجود ہے۔

آپؐ کی تخلیقی فکر و قوّت نے وحی و تنزیل کی روشنی میں جو معاشرہ قائم کیا' اسے اس کے کُلّی تناظر میں صحیح طور سے دیکھنے کے بعد انسان اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اس کا نقشہ جُزئیات سمیت آپؐ کے ذہن میں واضح طور سے موجود تھا' نیز ان معاشرتی اصولوں کے مطابق ہی آپؐ نے ان گنت مسائل کو حل کیا جو مدینے کے نئے ماحول میں آتے ہی تحریکِ اسلام کو درپیش آئے۔ یہ مسائل کیا تھے اور آپؐ نے انھیں کیسے حل کیا' اس کو موضوعِ بحث بنانے سے پہلے اسلامی معاشرے کا خاکہ پیش کیا جاتا ہے' جسے فکر و نظر کے سامنے رکھنے سے آپؐ کی تعمیری' مجاہدانہ کوششوں کی قدر و قیمت کی تعیین کرنے میں یقیناً مدد ملے گی۔

اسلامی معاشرے کا خاکہ :

ہمیں یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ آپؐ نے اسلامی یا مثالی معاشرے کی اساس محبت پر رکھی تھی جو انسان کی فطری آرزوئے اِلٰہ کی تسکین کرتی ہے۔ اس محبت کا خمیر تین چیزوں سے اُٹھتا ہے : آرزوئے اِلٰہ، آرزوئے حُسن اور رحمۃ للعالمینی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلامی معاشرے کے افراد کو اپنے اِلٰہ یعنی معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود کی فطرۃً طلب و جستجو ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ احسین ہے اور اس نے ہر چیز حسین بنائی ہے اور انسان کو جمالیاتی حس ودیعت کی ہے، لہٰذا وہ طبعاً حُسن سے محبت اور قُبح سے نفرت کرتا ہے۔ انسان چونکہ اس کائنات کی حسین ترین مخلوق ہے، لہٰذا اس میں اپنی ہم جنس مخلوق سے سب سے زیادہ محبت کرنے کی استعداد پائی جاتی ہے۔ محبت چونکہ عدل و احسان سے معتبر بنتی ہے، اس لیے مسلمان نہ صرف اسلامی معاشرے بلکہ سب مخلوقات اور جہانوں کے لیے رحمت ہوتا ہے۔

اسلامی معاشرے کی دوسری نظریاتی بنیاد عقیدۂ مکافاتِ عمل ہے، اسے مختصراً اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ ہر عمل کا ردِّ عمل یا نتیجہ ہوتا ہے، اور فاعل اپنے فعل کے نتائج کا ذمے دار اور مرہون ہوتا ہے۔ وہ مزرعِ حیات میں جو بوتا ہے، اسے اس دُنیا اور آخرت دونوں میں کاٹنا پڑتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے صاحبِ ارادہ و اختیار بنایا ہے۔ چونکہ اس دنیا کی ہر تخلیق میں خرابی کی صورت مضمر ہے، اس لیے نفسِ انسانی کا مقدر موت تو ہے لیکن عدمیت یا فانیت نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ موت فانی اور زندگی لافانی ہے۔ موت کا وظیفہ وجودِ انسانی کو مار کر روح کو آزاد کر دینا اور پھر خود ہمیشہ کے لیے فنا ہو جانا ہے۔ رُوح آزاد ہو کر اپنے اصل جہان کو لوٹ جاتی ہے، جسے دارالآخرت یا الحیوان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دنیا انسان کے لیے دارالامتحان اور الحیوان دارالجزا ہے، جہاں اہلِ حسن و سرور ہمیشہ حسن المآب میں ارتقائی زندگی بسر کرتے رہیں گے اور شریر و آتش بدل لوگوں کو شر المآب میں رہنا ہوگا، جہاں وہ نہ مریں گے نہ جئیں گے۔[۳]

حیاتِ انسانی ایک واحد یہ ہے[۴]، لیکن انسان نے اپنے ارادہ و اختیار اور فکر و عمل کی آزادی سے اسے گوناگوں، مگر علیحدہ علیحدہ شعبوں میں تقسیم کر دیا ہے جس کی وجہ سے وہ بہت زیادہ پیچیدہ اور دشوار بن گئی ہے۔ اسلام حیاتِ انسانی کی وحدت اور کثرت دونوں کو تسلیم کرتا ہے لیکن وہ حیاتِ انسانی کو ایک نامیاتی کُل اور اس کے تمام شعبوں کو مربوط اور غیر منفک سمجھتا ہے، جنھیں ایک دُوسرے سے جُدا کر کے نہیں دیکھا جاسکتا، کیونکہ اس سے فکر و عمل کی گمراہی لازم آتی ہے، لہٰذا اس نے انسان کو جو معاشرتی بشر ہے[۵] اور خاندانی و عمرانی زندگی بسر کرنے پر طبعاً اور حاجۃً مجبور ہے، جینے کے جو اصول بتائے ہیں، وہ فطری ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ انسان کے بنائے ہوئے نہیں، اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے ہیں جو فاطرِ ہستی ہے، اور فطرتِ انسانی کے تقاضوں کے عین مطابق ہیں اور ان کی اصل "محبت" ہے۔ اب حیاتِ انسانی کے مختلف شعبوں کے اُصولوں کی نشاندہی کی جاتی ہے جو اسلام کے معاشرتی خاکے کی تشکیل کرتے ہیں :

(الف) رُوحانی زندگی کے اُصول :

تقوٰی اسلام کا اصل الاصول اور انسان کی فطرتِ صحیحہ کا خاصّہ ہے۔ اس اصل سے خشیتِ الٰہی، محبتِ انسانی، محبتِ کائنات، طلب و جستجوئے صداقت اور آرزوئے حسن و احسان کی شاخیں پھُوٹتی ہیں۔ علاوہ بریں، وہ علم و حکمت، رُشد و ہدایت، عظمت و کامیابی اور قُربِ الٰہی حاصل کرنے کی ایک ناگزیر پیش شرط ہے۔ نیز وہ خودی کے نشو و ارتقا اور اس کی طمانیت کا ذریعہ بھی ہے۔

حیاتِ اجتماعی کے نشو و ارتقا کا انحصار اس امر پر ہوتا ہے کہ افراد قومی نقطۂ نظر سے سوچیں اور عمل کریں، اور یہ تقوٰی ہے جو انسان میں اللہ تعالیٰ کے حوالے سے سوچنے اور عمل کرنے کا داعیہ پیدا کرتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کُل مخلوقات کا اِلٰہ اور ربّ ہے لہٰذا تقوے کی وجہ سے انسان کے فکر و عمل کا دائرہ وسیع ہو کر نہ صرف قومی و ملّی بلکہ کُل حیاتِ انسانی، پھر کُل کائنات پر حاوی ہو جاتا ہے، جسے "رحمۃ للعالمینی" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی معاشرے کی بنیاد تقوے پر رکھی ہے۔

انسان فطرتاً عبد ہے اور عبودیّت فطرتِ انسانی کا خاصّہ ہے اور عبودیت اِلٰہ کو چاہتی ہے جو تنہا اللہ تعالیٰ ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ انسان میں فطرتاً اپنے اِلٰہ یا اللہ تعالیٰ کی آرزو و جستجو پائی جاتی ہے، جس کی تشفی ہی سے اسے طمانیت و سعادت حاصل ہوتی ہے اور یہ سعادت ہی ہے جو عدل و احسان اور حق و صداقت کا سرچشمہ ہے۔ دل میں سعادت نہ ہو تو اس کی جگہ قساوت لے لیتی ہے جو انسان کو ظالم و جاہل اور مُجرم و گناہگار بناتی ہے۔

تقوے سے آرزوئے اِلٰہ میں زندگی اور حرکیت[۶] پیدا ہوتی ہے اور وہ عشق میں بدل

جاتی ہے اور عشق انسان کو مومن و مجاہد اور صاحبِ حسن و سرور بنا دیتا ہے۔ انسان اسلام کی نظر میں بندۂ رحمٰن، اس کا دوست (ولی اللہ) اور عظیم و کامیاب ہوتا ہے۔ ایسے ہی انسان پیدا کرنا آپؐ کی تحریکِ اسلام کی غایتِ حقیقی تھی۔ تقویٰ مکارمِ اخلاق کا سرچشمہ ہے اور انسان میں صفاتِ الٰہی پیدا کرتا اور خودی کو اللہ کے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔[۴۷] اس اعتبار سے تقویٰ اور حُسنِ خُلق لازم و ملزوم ہیں۔ اس سے اس امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں تقویٰ اسلامی معاشرے کا اصل الاصول ہے۔

تقویٰ اور ایمان لازم و ملزوم ہیں۔ ایمان بالحق ہونا چاہیے، اور ایمان عبارت ہے اسلام کے معتقدات کو اپنی فکری و عملی زندگی کے اجزائے لاینفک بنا لینے سے۔ ایمان علم و حکمت، بامقصد تفکرِ مسلسل یا آپؐ کے الفاظ میں تفکّر و اعتبار[۴۸]، نیز محبت و رحمت، عدل و احسان اور اعمالِ صالحہ سے نشو و ارتقا کرتا ہے۔

جسم کی طرح قلب کو بھی گوناگوں بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں، لہٰذا نماز، تلاوتِ قرآن، حکیمانہ ذکر و فکر (تفکّر و اعتبار)، روزے اور اگر توفیق ہو تو حج، عمرے، نیز زکوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعے ان کا مسلسل علاج کرتے رہنا چاہیے۔ شرک و ظلم اور غفلت ، اللہ تعالیٰ اور اپنی فطرتِ صحیحہ کے تقاضوں سے تغافل و اعراض، نفاق، بُخل، کسبِ حرام، فتنہ و فساد، اکتناز و احتکار، سودکاری و استحصال، کاروباری بددیانتی، خیانت، دروغ گوئی، بہتان، غیبت، بدنیتی، منکرات، نیز اپنی خواہش کو اپنا الٰہ بنانے سے قلب کو بیماریاں لاحق ہوتی ہیں۔ جس طرح جسم کو بیماریوں سے محفوظ اور اسے صحت مند و توانا رکھنے کے لیے صفائی کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح قلب کو بھی بیماریوں سے محفوظ اور صحت مند و توانا رکھنے کے لیے پاکیزگی ناگزیر ہے۔ پاکیزگی سے مراد قلب کے معروضی و موضوعی ماحول کی صفائی و طہارت ہے۔ معروضی ماحول سے بدن، لباس اور مکان یعنی رہنے سہنے، کام کاج کرنے اور چلنے پھرنے کی جگہیں اور فضائیں مُراد ہیں۔ موضوعی ماحول سے مُراد فکر و خیال، جذبات و خواہشات اور حواس (مثلاً سامعہ و باصرہ) ہیں۔ حجاب و حیا جو تقوے کے ثمرات ہیں، قلب کے محافظ اور نظر کی بیماریوں کے لیے سدّباب ہیں۔

مسکرات رہزنِ تمکین و ہوش ہوتی ہیں، ان سے فکر و نظر غیر صالحہ ہو جاتی ہیں، ضمیر کی آواز کمزور اور جمالیاتی حس مفلوج ہو جاتی ہے، لہٰذا وہ مکروہ، قبیح اور حرام ہیں۔

(ب) عمرانی زندگی کے اُصول :

(۱) حُسنِ عمل یا عملِ صالح عمرانی زندگی کا اصل الاصول ہے۔

(۲) فرد معاشرے کا بنیادی واحدیہ ہے، اس لیے وہ اس کا اہم، محترم اور ذمے دار عنصر ہے، لہٰذا احترامِ انسانی ہر شخص پر لازم ہے۔

(۳) جملہ بنی نوعِ انسان نسلاً ایک ہیں، لہٰذا ان میں الوانی، لسانی، علاقائی، قبائلی یا قومی وغیرہ امتیازات غیر فطری اور اللہ تعالیٰ کی نظر میں سخت ناپسندیدہ اور گُمراہ کن ہیں۔

(۴) خاندان معاشرے کی بنیاد ہے اور خاندان کی اساس نکاح ہے، لہٰذا نکاح کے بغیر ازدواجی زندگی بے بنیاد، باطل اور لایعنی ہے۔

(۵) تمام بنی نوعِ انسان اللہ تعالیٰ کے عباد اور مربوب ہیں، لہٰذا ان کے حقوق کا پاس اور احترام لازمی ہے۔

(۶) ایک انسان کا قتل کُل نوعِ انسانی کے قتل کے مترادف ہے۔ اسی طرح کسی ایک فرد کی جان بچانا کُل بنی نوعِ انسان کی جانیں بچانے کے برابر ہے۔

(۷) معاشرتی امن و سلامتی کو برباد کرنا گناہِ کبیرہ ہے۔

(۸) معاشرتی امن و سلامتی اسلام کے مقاصدِ جلیلہ میں سے ہے، لہٰذا فتنہ قتلِ انسانی سے بھی زیادہ گھناؤنا جُرم ہے۔

(۹) اسلامی معاشرے کے افراد یعنی مومن و مسلمان بھائی بھائی ہیں، لہٰذا ان کا سُود و زیاں ایک ہے اور ان پر ایک دوسرے کی جان و مال اور عزّت و آبرو حرام ہے۔

(۱۰) فرد و جماعت دونوں پر شخصی آزادی و حقوق کا احترام لازم ہے۔

(۱۱) مسلمانوں پر گواہی دینا لازم ہے، لیکن گواہی ہر حال میں سچّی ہونی چاہیے، چاہے وہ اپنی ذات، خاندان یا قوم ہی کے خلاف کیوں نہ دینی پڑے۔ اس میں کتمانِ حق یا شہادت دینے سے گریز ناجائز ہے۔

(۱۲) مسلمان دوسروں کی جان و آبرو اور عزّت و ناموس کے محافظ ہوتے ہیں، لہٰذا فتنہ و فساد، دُشنام طرازی، بُہتان، غیبت، چُغلی اور طعن و تشنیع گناہ کبیرہ ہیں، حتّٰی کہ دوسروں سے متعلق بدگمانی بھی مکروہ و گناہ ہے۔

(۱۳) اتّحاد و اتّفاق کو ہر حال میں روا رکھنا اور تضادات اور تشتّت و افتراق سے بچنا۔

(۱۴) ادب و لحاظ، سمع و طاعت، صلۂ رحمی، عدل و احسان (والدین، قریبی اور دُور کے رشتے داروں، قریبی اور دُور کے ہمسایوں، ہمسفروں، رفیقوں، دوستوں وغیرہ سے) ہر حال میں روا رکھنا چاہیے۔

(۱۵) خدمتِ خلق، ملّت سے وابستگی، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، تواصی بالحق اور تواصی بالصّبر کو اپنا شعار بنانا۔

(۱۶) رحمتِ تمام بن جانا، یعنی انسان سمیت تمام مخلوقات سے محبّت کرنا، ان کے کام آنا اور ان سے عدل و انصاف اور حسنِ سلوک کرنا، عفو و درگزر سے کام لینا، حلم و بُردباری اور رحم و کرم کو اپنا شعار بنا لینا۔

(۱۷) مواخات، مساوات اور حرّیتِ فکر و نظر کو معاشرتی زندگی کے اجزائے لاینفک بنانا۔

(۱۸) ہمسایوں کے حقوق کا بالخصوص احترام کرنا۔[۹]

(ج) معاشی زندگی کے اُصول:

(۱) زمین و آسمانوں کے اندر اور درمیان جو کچھ بھی ہے، اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع انسان کے تمتّع و استفادہ کے لیے پیدا کیا ہے۔

(۲) محنت و مشقّت انسان کا مقدّر ہے، اس لیے اس پر کسب یا محنت کے ذریعے روزی حاصل کرنا لازم ہے، لیکن کسب کا جائز اور روزی کا حلال ہونا ضروری ہے۔

(۳) کسب کی آزادی انسان کا حق ہے۔

(۴) پیدائشِ دولت اور تقسیمِ دولت عدل و احسان کے اصول پر ہونی چاہیے۔

(۵) بُخل، اِکتناز، احتکار وغیرہ کے ذریعے گردشِ دولت میں رکاوٹ پیدا کرنا سنگین جُرم یا گُناہ کبیرہ ہے۔

(۶) فرد کے بُنیادی معاشی حقوق کا احترام افراد اور معاشرے دونوں پر واجب ہے۔

(۷) زکوٰۃ، خیرات و صدقات اور احسان کے ذریعے انسانی فلاح و بہبود کے کاموں میں حصّہ لینا فرض ہے۔

(۸) بھُوک، ننگ، بیماری، بیکاری وغیرہ کو دُور کرنا معاشرے کی ذمّہ داری ہے۔

(۹) معاشی زندگی کے ہر گوشے میں دیانت و امانت اور عدل و احسان کو روا رکھنا لازمی ہے۔

(۱۰) استحصال، جبر، ظلم اور سُود حرام ہیں۔

(۱۱) چونکہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے حُکم "اِنفاق بالعفو" پر عمل کیا، لہٰذا ایسا کرنا سُنّتِ مؤکدہ ہوا۔ چونکہ یہ حُکمِ قرآنی ہے، اس لیے فرض ہوا۔

(۱۲) اسلامی معاشرے کا کوئی فرد بھُوکا نہیں رہ سکتا، لہٰذا مفلوک الحال انسانوں کی روزی کا معقول بند و بست کرنا حکومت کی اہم ترین ذمہ داریوں میں سے ہے۔ انفرادی معاملے میں ہر فرد کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ کسی شخص کو اپنے پڑوس میں بھُوکا نہ سونے دے۔

(۱۳) معدنیاتی، نباتاتی اور حیوانی دولت اللہ تعالیٰ کی امانت ہے، اس کو ضائع کرنا، اسے نقصان پہنچانا یا اس امانت میں خیانت کرنا جُرم ہے۔

(۱۴) معاشی زندگی میں توازُن برقرار رکھنا حکومت کی ذمہ داری ہے اور کاروباری بد دیانتی، خیانت وغیرہ سے اس توازن کو بگاڑنا قرآن حکیم کی اصطلاح میں "فساد" ہے، اور ایسا کرنے والا فرد ہو یا حکومت، مجرم و گناہگار ہے۔

(۱۵) افرادِ معاشرہ کی کفالت کا معقول اِنتظام کرنا حکومت کی اوّلین ذمہ داریوں میں سے ہے۔

(۱۶) نجی ملکیت کی رُخصت ہے، لیکن وہ اِنفاقِ بالعفو کے اصول سے مشروط ہے۔

(۱۷) احتیاج کے وقت دوسروں کی چیزیں استعمال کرنے کی اجازت ہے اور مالک انھیں منع کرنے کے مجاز نہیں۔[۱۰]

(د) سیاسی زندگی کے اُصول:

(۱) سیاست کا اصل الاصول یہ ہے: اِنِ الحکمُ اِلّا للہ، یعنی فرماں روائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے، کیونکہ وہ تمام بنی نوع انسان کا خالق و ربّ اور حاکم و بادشاہ ہے۔ لہٰذا ان پر فقط اسی کا حکم چل سکتا ہے، کسی اور کا نہیں۔ چنانچہ کوئی فرد یا جماعت اپنی مرضی کا آئین یا قانون بنانے کی یا اس کے ذریعے حکومت کرنے کی مجاز نہیں۔

(۲) آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔

(۳) اسلامی معاشرے میں فرعون، ہامان اور قارون کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔

(۴) ہر شخص پر دوسروں کی آزادی اور دیگر سیاسی حقوق کا احترام لازم ہے۔

(۵) تمام افراد کو ایک جیسے سیاسی حقوق حاصل ہیں۔

(۶) حکومت شورائی نوعیت کی ہوگی۔

(۷) رعایا پر اپنے اُولی الامر کی اطاعت لازمی ہے، بشرطیکہ یہ حکم احکامِ خداوندی سے متصادم نہ ہو۔ (لاطاعة لمخلوق فی معصية الخالق) بخاری و مسلم۔

(۸) جہاد ہر مسلمان پر فرض ہے۔

(۹) معاشرے میں امن و سلامتی برقرار رکھنا افراد اور حکومت کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔

(۱۰) ناحق قتلِ انسانی گناہِ کبیرہ ہے۔

(۱۱) فتنہ و فساد قتلِ انسانی سے بھی زیادہ سنگین جُرم ہے اور اسے دُور کرنا فرد و معاشرہ کی مشترکہ ذمّے داری ہے۔

(۱۲) افراد کی تعلیم و تربیّت (جس میں اسلامی، اخلاقی، فنّی، صنعتی و حرفتی اور عسکری تربیّت بھی شامل ہے) کا وقت کے تقاضوں کے مطابق بندوبست کرنا حکومت کی ذمّہ داری ہے۔

(۱۳) صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے نظاموں کو قائم کرنا اور انھیں چلانا حکومت کا اوّلین فریضہ ہے۔

(۱۴) حکمران اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہوتا ہے اور وہ اس کی طرف سے اس کے نام پر حکومت کرتا ہے، لہٰذا لوگوں کی ربوبیّت (اپنے وسیع ترین مفہوم میں) کا موزوں انتظام کرنا اس کی ذاتی ذمّہ داری ہے۔

(۱۵) اسلام کوئی جامد نظریاتی نظام نہیں بلکہ دینی تحریک ہے، اور اسے کامیابی کے ساتھ جاری و ساری رکھنا، نیز اسے دیگر مذاہب و ادیان پر غالب کرنے کی مسلسل کوشش کرتے رہنا فرد و حکومت کی ذمّہ داری ہے۔

(۱۶) سب افراد خواہ اُولی الامر ہوں یا رعایا، قانون کے سامنے جواب دہ ہیں اور انصاف کا حق سب کو حاصل ہے۔

(۱۷) رعایا کے جان و مال، عزّت و آبرو اور بنیادی و شہری حقوق کی حفاظت حکومت کی ذمّہ داری ہے۔

(۱۸) قانون کا تحفظ ہر شہری کو حاصل ہونا چاہیے اور انصاف فوری، مفت اور بغیرِ دقّت کے ملنا چاہیے۔[۱۲]

(۵) ثقافتی زِندگی کے اُصُول :

(۱) ثقافتی زندگی سے مُراد جمالیاتی زندگی ہے اور جمالیاتی زندگی اسے کہتے ہیں جو صوری و معنوی ہر اعتبار سے سچّے جمالیاتی ذوق کے مطابق ہو۔ اس تعریف کی رُو سے وہ تمام چیزیں جمالیاتی یا ثقافتی زندگی میں شامل ہیں جو زندگی کی تحسین کرتی ہیں، مثلاً تعلیم و تربیت، تحسینِ اخلاق و کردار، اور تہذیبِ قول و فعل وغیرہ۔ حسن، صداقت، طہارت اور حیا ثقافت کے چار عناصر ہیں، اور ان کو فکری و عملی زندگی کے اجزائے لاینفک بنانا ثقافتی زندگی کا اصل الاصول ہے۔

(۲) نیّت ہر حال میں حسین ہونی چاہیے۔

(۳) آرزو و خواہش، فکر و نظر اور قول و فعل میں حُسن ہونا چاہیے۔

(۴) حُسن سے محبت اور خُوب تر کی طلب و جستجو ہونی چاہیے۔

(۵) آرزوئے حُسن کو زندہ و بیدار رکھنا لازمی ہے۔

(۶) جمالیاتی حِسّ کو زندہ و حرکی اور ذوق کو لطیف، پاکیزہ اور ابعادی بنانا چاہیے۔

(۷) اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے جمالیاتی حظّ اُٹھانا، ان کی قدر کرنا ہے اور ایسا نہ کرنا کُفرانِ نعمت ہے اور ایسا کرنے کے لیے اپنی حِسّی قوتوں (مثلاً سامعہ و باصرہ) اور قلبی قویٰ کی تربیت کرنا ناگزیر ہے۔ جو لوگ اپنی حسّی اور قلبی قویٰ کی تربیت نہیں کرتے، انھیں قرآن مجید بہرے، اندھے اور گونگے کہتا ہے۔

(۸) اخلاق کی تہذیب و تحسین کرنا فرض ہے اور خُلق کو عظیم بنانا سُنّتِ حسنہ ہے۔

(۹) بدخُلقی گناہِ کبیرہ ہے اور حُسنِ خُلق سب سے بڑی نیکی ہے۔

(۱۰) منکرات قبیح ہیں اور ہر قبیح چیز سے نفرت کرنا فرض ہے۔

(۱۱) زنا حرام ہے۔ چنانچہ مرد و زن کا ایسا قُرب یا اختلاط جو جنسی اختلاط کا محرّک و سبب بن سکے، ممنوع ہے۔

(۱۲) ازدواجی زندگی کی پاکیزگی فرض ہے۔

(۱۳) بے حیائی، فحاشی اور عریانی، نیز ہر وہ چیز جو حسنِ نیّت و جذبات کے منافی ہو اور گناہ کی تحریک کرے اور ترغیب دے، ممنوع و حرام ہے۔

(۱۴) علم و حکمت کا سیکھنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے اور انسان کو مہد سے لحد تک طالبِ علم و حکمت رہنا چاہیے۔

(۱۵) بامقصد سیاحت اور سیر و تفریح سے ثقافتی زندگی میں رنگینی و بوقلمونی پیدا ہوتی ہے۔

(۱۶) سلام کہنا، مصافحہ و معانقہ کرنا، دعوت کو قبول کرنا، خوشی و غمی میں شریک ہونا، تحفے تحائف بھیجنا ثقافتی زندگی کے لوازمات ہیں۔

(۱۷) شراب، جُوا، بُت پرستی اور ہر قسم کے مُشرکانہ افعال قبیح ہونے کے سبب ممنوع اور حرام ہیں۔

(۱۸) جھُوٹ، فریب، نفاق، دغا، وعدہ خلافی، ناانصافی وغیرہ ثقافتی زندگی کے مہلک امراض ہیں، لہٰذا ان سے بچنا لازمی ہے۔

(۱۹) حُسن کوری، بے ذوقی، بے بصری، ناخواندگی، جہالت ثقافتی زندگی کے عیوب ہیں جن کا تزکیہ فرض ہے۔

(۲۰) مسجد ثقافت کا مولد و منشا ہے، لہٰذا ثقافتی زندگی اور مسجد کے رشتے کو قائم و دائم رکھنا فرد و قوم کی مُشترکہ ذمّے داری ہے۔

(۲۱) تقویٰ ثقافتی زِندگی کا رُوح و رواں ہے اور اسے ایسا ہی بنائے رکھنا چاہیے۔ ان میں تفریق سے ثقافتی زندگی جمود و تعطّل کا شکار ہو جاتی ہے۔ پھر اسے ابلیسی آراستگی و تزئین کے ذریعے کتنا ہی رنگین و خوشنما بنا کر دکھایا جائے، مگر حقیقت میں وہ بے جان ہی ہوتی ہے۔ لہٰذا ثقافتی زندگی کو تقویٰ و تزکیہ کے ذریعے زندہ و حرکی رکھنا چاہیے تاکہ وہ مسلسل نشوو ارتقاء کرتی جائے۔

(س) عسکری زِندگی کے اُصول :

(۱) جہاد عسکری زندگی کا اصلُ الاُصول ہے اور جہاد کا اصل الاصول فتنہ و فساد کا استیصال اور امن و سلامتی کا قیام ہے۔

(۲) ایمان اور جہاد سِلسلۂ اسلام کی دو مربوط و لاینفک کڑیاں ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ایمان و جہاد یا اسلام و جہاد لازم و ملزوم ہیں۔

(۳) جہاد فی سبیل اللہ ہونا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاد اللہ تعالیٰ کے حوالے سے

اور اس کے احکام کے مطابق اس کے مظلوم بندوں کی مدد و دادرسی، نیز مُلک و ملت اور دین و حق کے تحفظ و دفاع کی خاطر کرنا چاہیے، اس میں ذاتی مفاد یا غرض نہیں ہونی چاہیے۔ جہاد کی چار قسمیں ہیں : (۱) جہاد بالسّیف یا مسلّح جنگ (۲) جہاد باللّسان (۳) جہاد بالقلم (۴) جہاد بالمال۔

(۴) ظالم و جابر حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہنا جہادِ اکبر ہے۔

(۵) متحارب قوم یا فریق جنگ بندی یا صلح و آشتی کی درخواست کرے تو اسے قبول کر لینا چاہیے۔

(۶) جب تک دنیا میں ظلم و استحصال، شرک و بُت پرستی، فتنہ و فساد کا امکان موجُود ہے، جہاد ناگزیر ہے، لہٰذا جہاد کی تیاری حکومت اور رعایا کا اہم ترین فریضہ ہے۔

(۷) جنگ میں صرف دُشمن قوم یا فریق کے مسلّح و متحارب سپاہیوں کے قتل کی اجازت ہے، شہری آبادی کا قتل جائز نہیں۔

(۸) جنگی، عسکری اور سیاسی معاہدوں کی پابندی لازمی ہے، لیکن دوسرا فریق معاہدے کی خلاف ورزی کرے تو اس کی تنسیخ ہو جاتی ہے۔

(۹) اطاعتِ امیر ہر حال میں مجاہد پر فرض ہے۔

(۱۰) جہاد میں حصّہ لینے کے قابل ہونے کے باوجود حصّہ لینے سے گریز کرنا، یا جان کے خوف سے میدانِ جنگ سے فرار ہو جانا ایک سنگین نوعیت کا فوجی جُرم یا گناہِ کبیرہ ہے۔

(۱۱) باہمی نزاع اور خانہ جنگی سے ہوا اُکھڑ جاتی ہے، لہٰذا مسلمانوں کے متحارب گروہوں میں صلح و آشتی کرانا، ملّتِ اسلامیہ کی ذمہ داری ہے۔

(۱۲) جنگی قیدیوں سے حُسنِ سلوک کرنا چاہیے اور جنگ کے بعد جب امن قائم ہو جائے، تو انھیں رہا کر دینا ضروری ہے۔

(۱۳) ملک و ملّت، دین اور اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کو خارجی اور داخلی دشمنوں سے محفُوظ رکھنا حکوُمت کی اوّلین ذمّہ داری ہے۔

(۱۴) چونکہ جہاد مسلمان پر فرض ہے، لہٰذا عسکری تربیت حاصل کرنا واجب ہوا۔

پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم نے محوّلۂ بالا اصولوں کے مطابق اپنے معاشرے کی تشکیل و تعمیر کی، اور ان تمام مسائل کو حل کیا جو آپؐ کو مدنی زندگی میں پیش آتے رہے۔ ان میں سے تین بنیادی اور فوری نوعیت کے تھے۔ اب ہم دیکھیں گے کہ یہ مہماتِ مسائل کیا تھے اور آپؐ نے انھیں کیسے حل کیا؟

حواشی و تشریحات

(۱) ابوداؤد، ۲ : ۹ بعد، شبلی، سیرۃ النبیؐ، ۱ : ۲۹۵ تا ۳۰۰ بعد، صحیح مسلم، ص ۴۹، ذکر رجم الیہود، صحیح بخاری، ۲ : ۱۰۱۶ بعد، رحمۃ للعالمین، ص ۹۶ تا ۹۸ بعد، ابن ہشام ۱ : ۵۳۵ تا ۶۰۵ بعد، صحیح بخاری، محمد حمیداللہ! رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی، ص ۳۲۵ تا ۳۲۸، وہی مصنف : عہدِ نبویؐ کا نظامِ حکمرانی، جلد اول۔

(۲) شبلی، سیرۃ النبیؐ، ۱ : ۳۰۵ تا ۳۰۷ بعد، رحمۃ للعالمین، ۱ : ۹۸، ۹۹۔ ابن ہشام (اردو)، ۱ : ۵۴۰ تا ۵۵۰ بعد۔

(۳) ان دعاوی کی اسناد مقدمے میں گزر چکی ہیں۔

(۴) Unit -اکائی۔

(۵) ارسطو نے انسان کو معاشرتی حیوان (Social animal) کہا ہے، لیکن حیوان و انسان میں زندگی تو بلاشبہ قدرِ مشترک ہے، لیکن شکل و صورت، راست قامتی اور حسی و قلبی قوتوں اور ارادہ و اختیار کے سبب دونوں میں بُعد المشرقین ہے، لہٰذا انسان کے لیے "معاشرتی بشر" کی تعبیر اختیار کی ہے۔

(۶) Dynamic

(۷) صبغۃ اللہ (البقرہ ۲ : ۱۳۸)۔

(۸) عینی : شرح بخاری، ۱ : ۶۷۔

(۹) یہ اصول قرآن مجید اور احادیثِ طیبہ سے مستنبط ہیں اور ان کے حوالے گزر چکے ہیں۔

(۱۰) ایضاً

(۱۱) یوسف ۱۲ : ۴۰۔

(۱۲) دیکھیے حوالہ عدد ۹۔

باب : ۱۰

اھم ترین مسائلِ ثلاثہ

(۱) معاشی یا مہاجرین کی بحالی کا مسئلہ

(۲) سیاسی، عسکری مسئلہ

(الف) تاریخ ساز معاہدہ یا میثاقِ مدینہ : دنیا کا پہلا تحریری دستور

(ب) اس کے فوائد اور نمایاں پہلو

(۳) ثقافتی مسئلہ یا مسلمانوں کی تعلیم و تربیت اور ان کے جذبۂ عبودیت کی تشفی کے اہتمام کا مسئلہ

(الف) صُفّہ یونیورسٹی اور اس کا نصابِ تعلیم و تربیت

(ب) قرأتِ قرآن

(ج) تزکیہ : مفہوم، علاج اور نسخہ : یادِ الٰہی، شکرِ نعمت، مشاہدہ، تفکّر، عبرت پذیری اور جہاد۔

(د) عسکری تربیت۔

(الف) اسلام کے عقایدِ جلیلہ و محرکہ

(ب) مشق و مزاولت : (۱) تیر افگنی یا دُور مار ہتھیاروں کی اہمیّت (۲) ریاضتِ شاقّہ (۳) صف بندی (۴) طلایہ (۵) قراولی (۶) عسکری جاسوسی (۷) رازداری (۸) شاطریت (۹) تعاقبیّت (۱۰) مکرّر صف بندی (۱۱) ترہیب و ترغیب (۱۲) حسنِ سلوک و ترغیب (۱۳) قائدگری (۱۴) جنگی سکت (۱۵) سپاہیانہ ترت پھرت یا حرکت پذیری۔

(۴) حواشی و تشریحات

باب ۱۰

اہم ترین مسائلِ ثلاثہ

پیغمبرِ اعظم و آخر صلیّ اللہ علیہ وسلّم کی ہجرت کے ساتھ مدینۂ منوّرہ تحریکِ اسلام کا مستقر بنا تو نئے احوال و ظروف کے باعث اس کے لیے بعض مسائل کا پیدا ہونا ایک تاریخی عمل تھا۔ ان میں سے تین اہم ترین اور فوری نوعیّت کے تھے۔ اگرچہ دوسرے مسائل کی نوعیت بھی ایسی نہ تھی کہ آپؐ ان سے صرفِ نظر فرماتے۔ بہرحال پہلے ان مسائل سے گفتگو کی جاتی ہے جنھیں آپؐ نے اولیّت دی اور حیرت انگیز کامیابی سے حل کیا اور وہ مفصّلہٗ ذیل ہیں :

(۱) معاشی یا مہاجرین کی بحالیات کا مسئلہ۔

(۲) سیاسی عسکری مسئلہ : یعنی مسلمانوں اور تحریکِ اسلام کے لیے مدنی و مکّی دشمنوں کی جارحیت سے تحفّظ کی ضمانت کی فراہمی کا مسئلہ۔

(۳) ثقافتی مسئلہ : یعنی مسلمانوں کی تعلیم و تربیت اور ان کے جذبۂ عبُودیّت کی تشفّی کے اہتمام کا مسئلہ۔

(۱) معاشی یا مہاجرین کی بحالیات کا مسئلہ[۱] :

مکّہ لق و دق صحرائی علاقہ تھا' اس لیے وہاں کے لوگ تجارت پیشہ تھے' جبکہ مدینہ ایک سرسبز و شاداب علاقہ تھا' اس لیے وہاں کے باشندوں کا پیشہ زراعت تھا۔ تجارت آزاد پیشہ تھا اور پھر اس کے ذریعے اہلِ مکّہ کے بیرونی ممالک سے تجارتی تعلقات قائم تھے' اور ان کی رسائی مشرقِ وسطیٰ کے حکمرانوں کے درباروں تک بھی تھی' لہٰذا وہ تجارت کو معزّز پیشہ سمجھتے تھے' لیکن زراعت کو بنظرِ حقارت دیکھتے تھے۔ اس کے کئی اسباب تھے :

اس کا ایک بنیادی سبب یہ تھا کہ یثرب کے زراعت پیشہ قبائل میں صدیوں سے جاگیرداری نظام

قائم تھا جس میں مزارعوں کو خادم و محکوم اور محنت کش سمجھا جاتا تھا اور محنت کشی باعث ننگ و عار تھی۔ دوسرے جاگیردار و زمیندار اپنے مزارعوں کا استحصال کرتے تھے اور مزارع اپنے بنیادی حقوق سے بہت حد تک محروم ہو چکے تھے۔ مہاجرین کے معاشی زندگی کے متعلق یہ نظریات تھے جب وہ ہجرت کر کے بے سروسامانی کے عالم میں انصار کے پاس مدینے پہنچے۔ ایک تو وہ زراعت سے نابلد تھے اور دوسرے اس سے نفرت انھیں ورثے میں ملی تھی، لہٰذا انھیں زمینوں پر آباد نہیں کیا جا سکتا تھا، اور مدینہ زرعی علاقہ تھا۔ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم اس صورت کے موضوعی و معروضی پہلوؤں سے پوری طرح واقف تھے۔ چنانچہ آپؐ نے مہاجرین کی فوری بحالی کا جو معاشی منصوبہ بنایا، اصولی طور پر وہ اسلام کے نظامِ زکوٰۃ ہی کا ایک حصّہ تھا۔ اس کے بعض اہم خصائص یہ تھے :

(۱) معیشت کی بنیاد "مواخاۃ" پر رکھی گئی تھی۔ مواخاۃ کا مطلب یہ ہے کہ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں، لہٰذا انھیں معاشی زندگی اس طرح گزارنی چاہیے جس طرح ایک صالح کنبے کے افراد کو اخوّت و مساوات کے اصول پر گزارنی چاہیے۔ دسترخوان سب کے لیے ایک ہو، نفع و نقصان سب کا ایک ہو اور کوئی دوسرے کا محتاج نہ ہو اور نہ سمجھا جائے۔ رزقِ کریم سب کے لیے ہو اور سب اس سے متمتّع ہوں۔

(۲) اس معاشی منصوبے میں زراعت و تجارت دونوں کو معیشت کا پشتیبان بنایا گیا تھا۔

(۳) مہاجرین کے دلوں سے زراعت و محنت کے خلاف جو قدیم و موروثی تعصّبات پائے جاتے تھے، انھیں دُور کرنے کا اہتمام کیا گیا تھا۔

(۴) اس میں محنت کو باعثِ عار نہیں بلکہ وجہِ افتخار قرار دیا گیا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں سرمایہ داری، جاگیرداری اور سرداری نظاموں کے لیے کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی تھی۔

آپؐ کے نفسِ مسیحائی سے انصار زندہ و بیدار ہو چکے تھے، ان پر دین کی حقیقت منکشف ہو گئی تھی اور انھوں نے اسلام کے عقایدِ جلیلہ و محرّکہ کو اپنی زندگی میں اِس طرح جذب کر لیا تھا جس طرح جسم میں خون جذب ہو کر رواں دواں رہتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اسلام کے اصولِ مواخاۃ کو ایسے ذوق و شوق سے اپنایا کہ حیرت ہوتی ہے۔ آپؐ کی ہدایت کے مطابق ہر انصاری نے ایک ایک مہاجر کو اپنا بھائی بنا لیا اور اسے اپنی منقولہ و غیر منقولہ جائیداد

میں برابر کا شریک کر لیا۔ وہ بھائیوں کی طرح ایک ہی گھر میں رہنے سہنے لگے اور ان کا سُود و زیاں ایک ہو گیا۔ مہاجر چونکہ زراعت سے نابلد تھے، لہٰذا انھوں نے زراعت پر تجارت کو ترجیح دی، لیکن زراعت اور زراعت پیشہ لوگوں کے خلاف ان کے موروثی تعصبات بتدریج کم ہونے لگے اور ان کے نقطۂ نظر میں واضح فرق آ گیا۔

انصار کی معیشت کا انحصار زراعت پر تھا اور تجارت پر یہود کی اجارہ داری تھی، لہٰذا انھیں اپنی زرعی پیداوار لامحالہ یہود کے پاس بیچنا پڑتی تھی اور جلد سے جلد بیچنا پڑتی تھی، اس کے دو اہم وجوہ تھے۔ اوّلاً انصار کی معاشی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ پیداوار کو روک کر بیچ سکتے، ثانیاً یہودی ساہوکار اور اجارہ دار انصار کو فصل کی کٹائی پر اسے فروخت کرنے کا پابند کر لیتے تھے۔ اس طرح یہود ان کا حدِّ امکان تک استحصال کرتے تھے اور انھوں نے انصار کو اپنے قرض اور سُود کے جال میں اس طرح جکڑ رکھا تھا کہ اس سے نجات حاصل کرنا ان کے بس کا روگ نہ رہا تھا۔ یہود فصل کے موقع پر جان بوجھ کر قیمتیں کم کر دیتے تھے اور اس طرح اسے انصار سے سستے داموں خرید لیتے تھے پھر بعد میں اسے انصار کے پاس مہنگے داموں فروخت کرتے تھے، اور عموماً اسے بھاری شرح سُود در سُود پر قرض دیتے تھے۔

پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کی معاشی حکمتِ عملی سے یہ صورتِ حال اس طرح بدل گئی کہ یہود ایسی عیّار قوم دنگ اور بے بس ہو کے رہ گئی۔ مہاجرین جو تجارتی سوجھ بوجھ اور تجربے میں یہود کے ہم پلّہ تھے، انھوں نے انصار کے تعاون سے یہود کی اجارہ داری ختم کر دی۔ علاوہ بریں چونکہ اسلام میں سود (ربا) اور ذخیرہ اندوزی (احتکار) حرام ہیں، لہٰذا انصار ایک تو یہودی ساہوکاروں کے استحصال و چنگل سے آزاد ہو گئے، دوسرے چور بازاری کے فقدان کے سبب لوگوں کو اشیائے خوردنی سارا سال قریب قریب یکساں داموں پر ملنے لگیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معاشرے میں سُود کاری، اجارہ داری، احتکار اور چور بازاری سے جو فساد برپا تھا، وہ دُور ہو گیا۔ اس طرح انصار کے لیے بالخصوص اور یثرب کے دُوسرے لوگوں کے لیے بالعموم تحریکِ اسلام رحمت ثابت ہوئی۔ تحریکِ اسلام کو اس سے ایک فائدہ یہ پہنچا کہ غیر مسلم بھی جو اسلامی معاشرے کی اقتصادی برکات سے مستفید ہوتے تھے اور یہود کی بہ نسبت مسلمانوں سے لین دین کرنے کو ترجیح دینے لگے تھے، ان کے لاشعور میں اسلام کی حقانیت و افادیت کے نقوش مرتسم ہوتے جاتے تھے۔ عرب قبائل میں تحریکِ اسلام کی کامیابی کا

ایک بنیادی سبب یہ معاشی افادیت تھی اور یہ سبب نہ جانے کیوں مؤرخین اور آپؐ کے سیرت نگاروں کی نظر سے اوجھل رہا۔

(۲) سیاسی۔عسکری مسئلہ : یعنی مُسلمانوں اور تحریکِ اسلام کے لیے مدنی و مکّی دُشمنوں کی جارحیّت سے تحفّظ کی ضمانت فراہم کرنا۔

مکّے میں تحریکِ اسلام زیرِ زمین اور قریش کے زندان میں تھی، لیکن اسے قریش سے علاوہ کسی اور سے خطرہ نہ تھا۔ اس کے برعکس مدینے میں تحریکِ اسلام آزاد تھی، اور اس امر کے باوجود کہ اسے یثرب کے دو قبائل (اوس و خزرج) یعنی انصار کی حمایت حاصل تھی، اسے کسی وقت بھی چار دشمنوں کی طرف سے زبردست خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ ان میں سے ایک تو یہوُد، دوسرے یثرب کے مشرک، وبت پرست قبائل اور تیسرے مکّے کے قریش اور ان کے حلیف قبائل تھے اور چوتھے وہ موقع پرست لوگ تھے جو ذاتی و گروہی مفادات و مصلحتوں کی بنا پر کلمہ پڑھ کر مسلمان ہونے کے مدّعی تھے، لیکن اندر سے اسلام اور مسلمانوں کے دشمن تھے۔ ان ابن الوقت لوگوں کے لیے قرآن مجید نے "منافقین" کی تعبیر اختیار کی ہے۔ ان کے علاوہ دُور کے اور مُستقبل کے دُشمن بھی تھے۔ ان سے مُراد قیصر و کسریٰ کی وہ باجگزار ریاستیں تھیں جو عرب کی سرحدوں پر واقع تھیں جو مُستقبل قریب میں اسلامی ریاست کے قیام، توسیع اور ترقی کی صورت میں اس کے وجود کو اپنے لیے خطرہ سمجھ کر اس کی دُشمن ہو سکتی تھیں۔ اِن تمام دشمنوں سے تحریکِ اسلام اور مسلمانوں کو مؤثّر تحفّظ دینے کی خاطر پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم نے عدل و مساوات کی بنیادوں پر سیاسی و عسکری نوعیّت کا ایک ایسا جامع منصوبہ تیار کیا، اور ایسی حکمتِ عملی سے اسے عملی جامہ پہنایا کہ یثرب کی بساطِ سیاست پر محوّلہ بالا تمام حریف قوتیں مات کھا گئیں اور اسلامی ریاست وجود میں آ گئی۔ اس منصوبے کے مطابق آپؐ یہوُد اور دیگر یثربی قبائل سے بقائے باہمی اور مشترکہ دفاع کے اُصُولوں پر ایک معاہدہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ معاہدہ جو اپنے منصفانہ اُصُولوں اور نتائج کے لحاظ سے تاریخ کی اہمّ ترین دستاویزات میں سے ہے، آپؐ کے بے مثال تدبّر، دُور اندیشی اور عسکری بصیرت کا زندہ جاوید ثبوت ہے۔ یہ تاریخ ساز معاہدہ جس نے صحیفے کے نام سے شہرت پائی، اس کے متن کا ترجمہ درج ذیل ہے۔[۳۲]

تاریخ ساز معاہدہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔ یہ نوشتہ یا معاہدہ محمّدؐ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی طرف سے جو نبیؐ ہیں، قریش اور اہلِ یثرب میں سے مومنوں اور اطاعت گزاروں (مسلمانوں) نیز ان لوگوں کے مابین ہے جو ان کے تابع ہوں، ان کے ساتھ شامل ہو جائیں، اور ان کے ہمراہ جنگ میں حِصّہ لیں :

(۱) یہ سب مسلمان دوسرے لوگوں کے مقابل میں ایک امّت (یعنی سیاسی وحدت) ہیں۔

(۲) قریش کے مہاجر قبلِ اسلام کے دستور کے مطابق خون بہا ادا کیا کریں گے، اور اپنے اسیروں کا فدیہ ادا کیا کریں گے تاکہ ایمان داروں کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

(۳) بنی عوف کے لوگ اپنے دستور کے مطابق خون بہا ادا کیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے قیدی خود فدیہ ادا کر کے چھڑائے گا تاکہ ایمان داروں کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

(۴) بنی حارث اپنے دستور کے مطابق خون بہا ادا کیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے اسیروں کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمانداروں کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

(۵) بنو ساعدہ اپنے دستور کے مطابق خون بہا ادا کریں گے اور ہر گروہ اپنے قیدی خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمانداروں کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

(۶) بنو جشم اپنے دستور کے مطابق خون بہا ادا کیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے قیدی خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمانداری کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

(۷ تا ۱۰) بنو نجّار، (۸) بنو عمرو بن عوف، (۹) بنو نبیت (اوس) اور بنو اوس اپنے دستور کے مطابق خون بہا خود ادا کریں گے اور ہر گروہ اپنے قیدی خود فدیہ دے کر چھڑائے گا تاکہ ایمان داروں کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

(۲ سے ۱۰ تک تمام شقوں کی عبارت ایک ہے، البتّہ گروہوں کے نام بدلتے گئے ہیں)

(اہل ایمان کی ذمہ داریاں)

(۱۱) اہل ایمان اپنے میں سے کسی ایسے شخص کو جو مفلس ہو یا قرض کے بوجھ تلے دبا ہو، امداد دیے بغیر نہیں رہیں گے تاکہ اس کا فدیہ یا خون بہا بخوبی ادا ہو سکے۔

(۱۲) کوئی مومن کسی دوسرے مومن کی اجازت کے بغیر اس کے مولیٰ (معاہداتی بھائی) سے

معاہدہ نہیں کرے گا۔

(۱۳) مُتقی مومن ہر اس شخص کی مخالفت پر تیار اور متحد رہیں گے، جو سرکشی اختیار کرے، ظُلم، گناہ یا زیادتی کا مرتکب ہو یا ایماندار لوگوں میں فساد پھیلائے۔ ایسے شخص کی مخالفت میں اہلِ ایمان کے ہاتھ ایک ساتھ اُٹھیں گے، اگرچہ وہ ان میں سے کسی کا بیٹا ہی ہو۔

(۱۴) کوئی ایماندار کسی ایماندار کو کافر کے بدلے میں قتل نہیں کرے گا اور نہ کسی ایمان والے کے خلاف کسی کافر کو امداد ہی دے گا۔

(۱۵) اللہ تعالیٰ کا عہد و ذمہ ایک ہی ہے۔ اہلِ ایمان میں سے کوئی معمولی سا فرد بھی کسی شخص کو پناہ دے کر سب پر پابندی عائد کر سکے گا۔ ایمان والے دوسروں کے مقابلے میں باہم بھائی بھائی ہیں۔

(۱۶) یہودیوں میں سے جو ہمارا اِتباع کرے گا، اسے امداد و مساوات حاصل ہوگی۔ نہ ایسے لوگوں پر ظلم ہوگا اور نہ ان کے خلاف کسی کو مدد دی جائے گی۔

(۱۷) اہلِ ایمان کی صلح ایک ہی ہوگی۔ اللہ کی راہ میں جنگ میں ہو تو کوئی ایمان والا دوسرے ایمان والے کو چھوڑ کر دشمن سے صلح نہیں کرے گا۔ یہ صلح سب ایمان والوں کے لیے برابر اور یکساں ہونی چاہیے۔

(۱۸) ان تمام گروہوں کو جو ہمارے ساتھ ہو کر جنگ کریں گے، نوبت بہ نوبت آرام کا موقع دیا جائے گا۔

(۱۹) ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جو نقصانِ جان اُٹھانا پڑے، اس کا بدلہ وہ مِل کر لیں گے۔

(۲۰) بلاشبہ متقی مومن سب سے اچھے اور سب سے سیدھے راستے پر ہیں۔

(۲۱) کوئی مُشرک (جو اس معاہدے میں شریک ہے) قریش کے مال و جان کو پناہ نہ دے گا اور نہ اس سلسلے میں کسی ایمان والے کے مانع آئے گا۔

(۲۲) جو شخص کسی ایمان والے کو قتل کرے گا اور اس کا ثبوت بھی مل جائے گا تو اس سے قصاص لیا جائے گا، بجز اس صورت کے کہ مقتول کا والی خون بہا لینے پر رضامند ہو۔ تمام ایمان داروں پر لازم ہوگا کہ وہ اس کی تعمیل پر اُٹھیں۔ اس کے سوا ان کے لیے کوئی

صورت جائز نہیں ہوگی۔

(۲۳) کسی ایماندار کے لیے، جو اس نوشتے (صحیفے یا عہد نامے) کے مندرجات کا اقرار کر چکا ہے، نیز اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لا چکا ہے، جائز نہیں ہوگا کہ وہ کوئی نئی بات نکالنے والے (بدعتی یا مُحدِث) فتنہ انگیز کی مدد کرے یا پناہ دے۔ جو اس کی حمایت کرے گا یا پناہ دے گا، وہ قیامت کے دن اللہ کی لعنت اور غضب کا مستوجب ہوگا جہاں کوئی فدیہ یا بدلا قبول نہیں کیا جائے گا۔

(۲۴) جب کبھی تم (یعنی اس عہد نامے کے پابند لوگوں) میں کسی معاملے میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اللہ اور محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

(یہودیوں کے حقوق)

(۲۵) یہودی جب تک مومنوں کے ساتھ مل کر جنگ کرتے رہیں گے، اپنے مصارف بھی خود ہی برداشت کرتے رہیں گے۔

(۲۶) بنی عوف کے یہودی مومنوں کے ساتھ ایک اُمّت (سیاسی وحدت) متصوّر ہوں گے۔ یہودی اپنے دین پر رہنے کے مجاز ہیں اور مسلمان اپنے دین پر، خواہ موالی ہوں یا اصل، البتہ جو لوگ ظلم یا جُرم کے مرتکب ہوں گے، وہ اپنی ذات اور گھرانے کے سوا کسی کو مصیبت میں نہیں ڈالیں گے۔

(۲۷) بنی نجّار کے یہودیوں کے بھی وہی حقوق ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کے ہیں۔

(۲۸) یہودِ بنی حارث کے وہی حقوق ہوں گے، جو یہودِ بنی عوف کے ہیں۔

(۲۹) یہودِ بنی ساعدہ کے بھی وہی حقوق ہوں گے جو یہودِ بنی عوف کے ہیں۔

(۳۰) یہودِ بنی جُشَم کے بھی وہی حقوق ہوں گے جو یہودِ بنی عوف کے ہیں۔

(۳۱) یہودِ بنی اوس کے بھی وہی حقوق ہوں گے جو یہودِ بنی عوف کے ہیں۔

(۳۲) یہودِ بنی ثعلبہ کے بھی وہی حقوق ہوں گے جو یہودِ بنی عوف کے ہیں، البتہ جو ظلم یا جُرم کا ارتکاب کرے گا، وہ اپنی ذات یا گھرانے کے سوا کسی کو مصیبت میں نہیں ڈالے گا۔

(۳۳) جفنہ بنی ثعلبہ کی شاخ ہیں، لہٰذا یہودِ بنی جفنہ کے بھی وہی حقوق ہوں گے جو یہودِ بنی ثعلبہ کے ہیں۔

(۳۴) بنی شُطیبہ کے حقوق بھی وہی ہوں گے جو یہودِ بنی عوف کے ہیں، وفا شعاری ہو، نہ کہ

عہد شکنی۔

(۳۵) بنی ثعلبہ کے موالی کے حقوق بھی وہی ہوں گے جو اصل کے ہیں۔

(۳۶) یہود کی تمام شاخوں کے حقوق بھی وہی ہوں گے جو اصل کے ہیں۔

(امن و دفاع کی مشترکہ ذمّہ داریاں)

(۳۷) کوئی بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر جنگ کے لیے نہ نکلے (یعنی معاہدے کا کوئی فریق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے بغیر کسی سے لڑائی کرنے یا لڑائی کے ارادے سے نکلنے کا مجاز نہیں)۔

(۳۸) زخم کا بدلہ لینے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی، جو شخص خونریزی کرے گا تو اس کی ذمہ داری اس پر اور اس کے گھرانے پر ہوگی، بجز اس کے جس پر ظلم کیا گیا ہو اور اللہ اس کے ساتھ ہے۔

(۳۹) یہود اپنے خرچ کے ذمے دار ہوں گے اور مسلمان اپنے خرچ کے ذمّے دار ہوں گے۔

(۴۰) اس معاہدے کے شرکائے کے خلاف جو بھی جنگ کرے گا تو وہ (یعنی یہود و مسلمان) ایک دوسرے کی مدد کریں گے اور ایک، دوسرے کی خیر خواہی پر کاربند رہیں گے اور باہم مشورہ کریں گے۔ ان کا شیوہ وفاداری ہوگا نہ کہ عہد شکنی۔

(۴۱) کسی شخص کو حلیف کی بدعملی کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جائے گا اور مظلوم کو ہر حال میں مدد دی جائے گی۔

(۴۲) یہود جب تک ایمان والوں کے ساتھ ہو کر جنگ کرتے رہیں گے، اپنے مصارفِ جنگ خود ادا کریں گے۔

(۴۳) یثرب کا میدان اس عہد نامے کے شرکاء کے لیے مقدس و محترم ہوگا۔

(۴۴) پناہ گزین کے ساتھ وہی برتاؤ ہوگا جو پناہ دہندہ کے ساتھ ہو رہا ہو۔ نہ اسے نقصان پہنچایا جائے گا اور نہ وہ خود عہد شکنی کرے گا۔

(۴۵) کسی عورت کو اس کے کنبے والوں کی اجازت کے بغیر پناہ نہیں دی جائے گی۔

(۴۶) اس معاہدے کے شرکائے کے درمیان کوئی نئی بات، معاملہ یا جھگڑا پیدا ہو جائے، جس سے فساد کا اندیشہ ہو تو اسے اللہ تعالیٰ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹایا جائے

گا۔ اس صحیفے یا عہد نامے میں جو کچھ درج ہے، اللہ تعالیٰ کو پسند ہے کہ اس کی پابندی زیادہ سے زیادہ احتیاط اور وفا شعاری سے کی جائے۔

(۴۷) نہ قریش کو پناہ دی جائے گی اور نہ اس شخص کو جو ان کا معاون ہو۔

(۴۸) اگر کوئی یثرب پر حملہ آور ہو تو ان معاہد فریقوں، یعنی یہودیوں اور مسلمانوں، پر ایک دوسرے کی امداد کرنا لازم ہوگا۔

(۴۹) اگر یہودیوں کو صلح کر لینے اور اس میں شریک ہونے کی دعوت دی جائے گی تو وہ اسے قبول کر لیں گے۔ اگر یہودی کسی سے صلح کریں گے اور مسلمانوں کو شرکت کی دعوت دیں گے تو ان کے لیے بھی اسے قبول کر لینا لازم ہوگا، بجز اس صورت کے کہ جنگ دین کے لیے ہو (یعنی دین کے لیے جنگ ہو تو تعاون کسی فریق پر لازم نہ ہوگا)۔

(۵۰) ہر شخص یا گروہ کے حصے میں اسی رُخ کی مدافعت آئے گی جو اس کے بالمقابل ہو۔

(۵۱) اوس کے یہودیوں کو خواہ وہ موالی ہوں یا اصل، وہی حقوق حاصل ہوں گے جو یہ معاہدہ قبول کرنے والوں کو حاصل ہیں۔

(۵۲) اس عہد نامے کے حکم میں ظالم و خطاکار داخل نہیں۔ جو جنگ کے لیے نکلے وہ بھی اور جو گھر میں بیٹھا رہے وہ بھی، اس کا حقدار ہوگا۔ صرف وہ لوگ مستثنیٰ ہوں گے جو ظلم و جُرم کے مرتکب ہوں گے۔

(۵۳) اللہ اس کا حامی و نگہبان ہے جو عہد و قرار میں وفا شعار اور پرہیزگار ہو، اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کے حامی ہیں۔

اس میثاقِ مدینہ سے مسلمانوں کو سیاسی، عسکری نوعیت کے سات اہم فوائد حاصل ہوئے جو یہ ہیں:

(۱) اسلامی مملکت کو ایک مضبوط اساس فراہم ہوگئی جسے داخلی اور خارجی دشمنوں کی سازشیں اور کوششیں متزلزل نہ کر سکیں، اور

(۲) اسے یہود و مشرک قبائل نے تسلیم ہی نہیں کیا بلکہ اس کے حلیف بن گئے اور اس کے دفاع کی مشترکہ ذمہ داری بھی قبول کر لی۔

(۳) مسلمانوں کو دینی، قومی اور سیاسی تشخص حاصل ہوگیا اور اسے تسلیم بھی کر لیا گیا اور اس

نے تحریکِ اسلام کی کامیابی کی راہ ہموار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

(۴) مسلمانوں کو مدینے میں سیاسی اعتبار سے بالخصوص مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی، جس کی بنا پر وہ پہلے یثرب میں اور پھر سارے عرب میں دینی یعنی مذہبی، سیاسی، معاشی اور ثقافتی انقلاب لانے میں کامیاب ہوئے۔

(۵) یثاقِ مدینہ قریش کی کوششوں میں اس طرح حائل ہوا کہ ابتدائی دَور میں جو از حد خطرناک تھا، وہ مدینے میں کسی کو اپنا حلیف بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ نیز جب اُنھوں نے مدینے پر بھرپور حملہ کیا تو اپنے سیاسی و مذہبی اثر و رسوخ کے باوجود کسی یہودی یا اپنے ہم مذہب قبیلے کو پیچھے سے مدینے پر حملہ کرنے پر آمادہ نہ کر سکے۔ جنگِ بدر میں مسلمانوں کی تاریخ ساز فتح کا یہ بھی ایک بنیادی سبب تھا۔ علاوہ بریں جنگِ اُحد میں قریش کی ناکامی کا بھی یہ ایک اہم سبب تھا۔

(۶) یثاقِ مدینہ اصل میں ایک دفاعی معاہدہ تھا۔ چنانچہ مسلمانوں نے جب قریش کو مرعوب کرنے اور بساطِ اقتصادیات پر ان کو زچ کرنے کی خاطر عسکری مہموں کا آغاز کیا تو مدینے کے کسی قبیلے نے نہ تو اعتراض کیا اور نہ مداخلت ہی کی۔

(۷) اس دفاعی معاہدے نے اسلامی مملکت کے لیے حصار کا کام دیا، نیز اس سے مسلمانوں کو حلیف قبیلوں میں تحریکِ اسلام کا کام کرنے اور انھیں اسلام کے عقاید و تعلیمات سے روشناس کرانے اور شرک و بت پرستی کے نقصانات سے متنبہ کرنے کے سنہرے مواقع حاصل ہو گئے۔

کیا یہ عہد آفریں معاہدہ جسے صحیفہ کہا گیا ہے، اپنی نوعیت کا دُنیا بھر میں پہلا تحریری دستور ہے؟ یہ سوال مؤرخین و محققین کے لیے ازبس اہم ہے اور وہ ابھی تک اس کا مثیل دریافت نہیں کر سکے۔ لہٰذا کیا یہ بے نظیر عہد نامہ ان لوگوں کے لیے عبرت انگیز و بصیرت افروز نہیں جو آپؐ کی نبوّت کے قائل نہیں؟ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے سچے نبی نہیں تھے تو پھر ناخواندہ مردِ صحرائی ہوتے ہوئے ایسا تاریخ ساز و مثالی عہد نامہ کیسے مرتب کر سکے تھے، جس کے ذریعے آپؐ مدینے میں اسلامی مملکت قائم کرنے اور ساتھ ہی اسے یثرب کے اہم قبائل سے تسلیم کرانے میں کامیاب ہو گئے؟ نیز جس نے آگے چل کر مشرق و مغرب میں اپنی قوت و صولت اور شان و شوکت کے جھنڈے گاڑنے تھے۔ یہ سوال آج کے انسان کے

لیے لمحۂ فکریہ ہے اور خاص طور پر ان لوگوں کے لیے جو سیرتِ طیبہ کو تاریخی۔ سائنٹفک انداز میں دیکھنے کے مدّعی ہیں، یہ سوال چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس عہد نامے کے بعض ممتاز پہلوؤں کی نشاندہی بھی کر دی جاتی ہے۔ اس تاریخی واقعیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہود اپنے علم و فن اور ذہانت و فراست کے لیے بجا طور سے شہرت رکھتے تھے، لیکن صدیوں کی منافقت و سرکشی نے انھیں حد درجہ مکّار و عیّار بنا دیا تھا۔ شاطر ایسے تھے کہ بساطِ سیاست پر سارے عرب میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ کیا یہ آپؐ کا اعجاز نہیں کہ یہود نے اپنے خصائص کے باوصف اس معاہدے کو اپنی مرضی سے قبول کر لیا اور اس وقت قبول کیا جب مسلمان انتہائی کسمپرسی کی حالت میں تھے اور اس معاہدے میں آپؐ کی حیثیت اللہ تعالیٰ کے سچے نبی، حکمران اور حَکَم کی تھی اور مسلمانوں کے مقابلے میں ان کی سیاسی حیثیت ثانوی تھی؟ علاوہ بریں، اس عہد نامے کی رُو سے نہ صرف یہ کہ مدینے میں اسلامی ریاست معرضِ وجود میں آگئی بلکہ یہود اور دیگر معاہد اقوام نے اسے تسلیم بھی کر لیا اور اس کے دفاع اور امن و سلامتی کی ذمہ داری بھی مشترکہ طور سے قبول کر لی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انھوں نے مہاجر مسلمانوں کو یثرب کی ایک قوم تسلیم کر لیا۔ یہ بلاشبہ آپؐ کی عظیم کامیابی تھی۔ مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہود اور مشرک قبائل نے اس معاہدے پر دستخط کر کے مسلمانوں کو مومن اور بُت پرست قبائل نے اپنے آپ کو مشرک تسلیم کر لیا۔

جہاں تک شہری حقوق کا تعلّق ہے، اس عہد نامے میں سب معاہد قوموں کے لیے ان کے تحفّظ کی ضمانت فراہم کر دی گئی ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلّق ہے، ان کی معاشرتی زندگی میں اخوّت و حرّیت، مساوات اور معاشی عدل و احسان کے اصولوں کو اس چابکدستی سے سمو دیا گیا ہے کہ عقل اسے آپؐ کا اعجاز سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

اس عہد نامے کو یثرب کے کُلّی تناظر میں دیکھا جائے تو اس کی یہ اہم خصوصیت اُبھر کر سامنے آتی ہے کہ اس کی رُو سے یثرب کی حکومت ناآشنا سرزمین میں غالباً پہلی مرتبہ عدل و مساوات کے اصولوں پر منظّم اور منضبط مملکت معرضِ وجود میں آئی اور لوگوں کو شہری اور معاشرتی امن و سلامتی کی نعمتِ غیر مترقبہ میسّر آگئی۔ اس موقع پر یہ جتا دینا ضروری ہے کہ مکّے کے برعکس یثرب (یا بعد کے مدینۂ منوّرہ) میں اس وقت کوئی مرکزی حکومت نہ تھی اور نراج کی حالت تھی۔ مکّہ مدّت سے ایک شہری ریاست تھا، جس میں قریش کی حکومت تھی اور اس کی

کے پچیس کے قریب شعبے تھے، لیکن یثرب میں عرب (اوس و خزرج) اور یہود دونوں بالترتیب بارہ اور دس قبیلوں میں منقسم تھے اور ہر قبیلہ اپنے رسم ورواج کے مطابق اپنے اُمور و مقدمات کا فیصلہ کرتا تھا۔ ان تاریخی حقائق کے پیشِ نظر دیکھا جائے تو تضادات و انتشار کی اس سرزمین میں ایک منظم و منضبط مرکزی حکومت کا قیام یقیناً ایک عظیم و عہد آفریں کارنامہ ہے۔ اِس مملکت کی اساس چونکہ اسلامی اصولوں پر استوار تھی، لہٰذا یہ امن و سلامتی کا گہوارہ تھی اور اِس میں غیر مسلموں کے لیے بڑی کشش پائی جاتی تھی۔

(۴) ثقافتی مسئلہ : یا مسلمانوں کی تعلیم و تربیت اور ان کے جذبۂ عبودیت کی تشفّی کے اہتمام کا مسئلہ :

آخری وحی و تنزیل اور احادیثِ طیّبہ سے ثابت ہے کہ آپؐ کا بنیادی وظیفۂ نبوّت لوگوں کی تعلیم و تربیت اور ان کے جذبۂ عبودیت کی تشفی کا مستقل بنیادوں پر بندوبست کرنا تھا۔ چنانچہ مدینۂ منورہ میں تحریکِ اسلام کو آزاد ماحول میسّر آیا تو آپؐ نے سب سے پہلے تعلیم و تربیت کے مسئلے کو مستقل و پائیدار بنیادوں پر حل کرنے کی طرف توجّہ فرمائی۔ آپؐ کی پیغمبرانہ حکمت و بصیرت کا فیصلہ یہ ہوا کہ تعلیم و تربیت کا مرکز ایسا ہونا چاہیے، جہاں ہر روز مقررہ اوقات پر مسلمانوں کا اجتماع ہوا کرے اور اس اجتماع کی حیثیت فرض و وجوب کی ہو۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے آپؐ نے "مسجد" کو منتخب کیا۔ اس اعتبار سے مسجدِ نبویؐ اسلام کا پہلا مرکزِ تعلیم و تربیت ہے، جس کے لیے آج کی زبان میں جامعہ یا یونیورسٹی کی تعبیر اختیار کی جا سکتی ہے۔[۴] اس یونیورسٹی کا نصاب تعلیم و تربیت کیا تھا، اور اس کے ذریعے آپؐ نے ثقافتی مسئلے کو کیسے مستقل بنیادوں پر حل کیا؟ اس کا جواب قرآنِ مجید نے ہر زمان و مکان کے انسان کی رُشد و ہدایت کے لیے اپنے اندر محفوظ کر لیا ہے اور وہ یہ ہے :

جس طرح (منجملہ اور نعمتوں کے) ہم نے تم میں تمھیں میں سے ایک رسول بھیجا ہے جو تمھیں ہماری آیات پڑھ پڑھ کر سُناتا، تمھارا تزکیہ کرتا، تمھیں الکتاب (قرآن مجید) اور حکمت سکھاتا اور تمھیں ان باتوں کی تعلیم دیتا ہے، جن کا تمھیں علم نہ تھا۔[۵]

اس سے معلوم ہوا کہ اس اسلامی یونیورسٹی کا نصاب اصولی طور پر یہ تھا :

(۱) قرأتِ قرآن (۲) تزکیہ (۳) تعلیمِ کتاب (۴) تعلیمِ حکمت اور (۵) علومِ نو کی تعلیم۔

چنانچہ اس مقصد کے حصول کی خاطر آپؐ نے مسجد نبویؐ کے ایک کنارے پر ایک جگہ مخصوص کر لی جسے اس کے سائبان کی وجہ سے صُفّہ کہتے تھے۔ یہ دراصل ایک کھُلی اقامتی (Residential) درسگاہ تھی جس میں ہر چھوٹا بڑا شخص تعلیم و تربیت حاصل کر سکتا تھا، چاہے وہ اس میں اقامت گزیں ہو یا نہ ہو۔ مسلمانوں کی ایک جماعت جنھوں نے اپنی کُل زندگی تحریکِ اسلام کے لیے وقف کر دی تھی، تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے لیے اس میں اقامت گزیں ہو گئی، انھیں اصحابِ صُفّہ کہتے تھے۔ اس اعتبار سے اگر مسجدِ نبویؐ کی اس درسگاہ کو عصرِ حاضر کی اقامتی اور کھُلی درسگاہوں کا پیش خیمہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس درسگاہ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں بچے اور پیر و جواں، نیز عورتوں کی تعلیم و تربیت کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔[۶] یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ تعلیمِ نسواں کا علیحدہ بندوبست کیا گیا تھا۔ اس درسگاہ کا نصاب بنیادی طور پر محوّلہ بالا پانچ مضامین پر مشتمل تھا، جن سے علیحدہ علیحدہ گفتگو کی جاتی ہے :

(۱) قرأتِ قرآن :

چونکہ اس نصابِ تعلیم میں اوّلیت قرآن کو حاصل ہے، لہٰذا طلبا کو سب سے پہلے قرأتِ قرآن سکھائی جاتی تھی۔ اس سے مقصود مندرجۂ ذیل فوائد حاصل کرنا تھے : طلبا کا قرآنی تلفّظ درست ہو جائے۔ وہ قاری اور حفّاظ بن جائیں، نیز ان میں ذوقِ قرآن پیدا ہو جائے۔ قرآن مجید کی زبان چونکہ الہامی ہونے کی وجہ سے فطری اور بلیغ ہے، اس لیے ذوقِ قرآن پیدا ہو جانے کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کو ادب و فن کا صحیح ذوق پیدا ہو جاتا ہے اور یہ ذوق ادب و فن کا حقیقی معیار ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ قرأتِ قرآنی کے تحفظ اور حفظِ قرآنی کی وجہ سے قرآن مجید لفظی و معنوی تحریف سے محفوظ رہا ہے تو یہ مبالغہ نہیں، اعترافِ حقیقت ہوگا۔

زبان اظہارِ ذات کا وسیلہ ہے۔ مسلمانوں کو چونکہ اسلام کی تحریکِ انقلاب کا فصیح البیان مبلّغ بنانا مقصود تھا، اس لیے انھیں قرآن مجید کی بلیغ زبان اور حسین اندازِ بیان کی تعلیم دی جاتی تھی چونکہ آپؐ ہی نے معلّم کی حیثیت سے یہ فرض انجام دینا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو سب اہلِ عرب سے زیادہ فصیح البیان بنایا تھا۔ احادیثِ طیبہ اِس بات کا زندہ ثبوت ہیں۔

علم و ادب کے ارتقا میں ذوقِ لسانی کے کردار کی اہمیّت سے انکار نہیں ہو سکتا، لہٰذا اسلام کی اس پہلی یونیورسٹی میں ذوقِ لسانی پیدا کرنے کو اوّلین اہمیّت دی جاتی تھی۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ اس یونیورسٹی نے ایسے بے عدیل قاری اور خطیب پیدا کیے جنھوں نے دُنیا میں خطابت

کا معیار قائم کیا۔

(۲) تزکیہ : بحیثیت معلمِ انسانی آپؐ کا دوسرا فریضہ لوگوں کا تزکیہ کرنا تھا۔ انسان کے اندر ایک نفسیاتی نظام ہے، جس کا اس کے طبیعی نظام سے چولی دامن کا رشتہ ہے۔ نفسیاتی نظام کا مرکز قلب ہے، جو جسم کی طرح بیماریوں کا مستوجب ہے۔ قلب ایک نامیاتی وجود ہے جو اگر اپنی صحیح و فطری حالت پر یعنی صحت مند و توانا رہتا ہے تو اپنے وظائف صحیح طور پر سرانجام دیتا ہے لیکن جب وہ خارجی اور داخلی عوامل کی وجہ سے کسی بیماری یا بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے تو وہ سقیم و کمزور ہونے کے باعث اپنے وظائف صحیح طور سے سرانجام دینے کے قابل نہیں رہتا۔ اس کا ایک طبیعی نتیجہ اس کے انتشارِ ذہنی کی صورت میں نکلتا ہے اور اس سے اس کی شخصیت کا توازن برقرار نہیں رہتا اور زندگی پر پریشانیوں اور خوف و حزن کا دباؤ پڑنے لگتا ہے، جو بڑھ جائے تو زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ زندگی کی جہتِ صالحہ سے فرار، اعصابی امراض، خودکشی وغیرہ ایسے دباؤ (Pressure) اس کے طبیعی نتائج ہیں۔

اس دباؤ سے قلب کی فطری استعدادیں جو اسے قوّت کی صورت میں ودیعت ہوتی ہیں، نشو و ارتقائ کے قابل نہیں رہتیں اور انسان اپنی قوّت و توانائی کے اس ذخیرے سے پوری طرح استفادہ نہیں کر سکتا، جو قدرت نے اس کی شخصیت کی تکمیل اور زندگی کی کامیابی کے لیے اسے ودیعت کر رکھا ہے۔ جس طرح جسم بیماری کا اور مشین خرابی کی مستوجب ہے، اسی طرح قلب کو بھی بیماری لاحق ہو جاتی ہے۔ قلب کو بیماری یا بیماریوں سے نجات دلا کر صحت مند و توانا بنانا، اور اس کی فطری استعدادوں کو قوّت سے فعل میں لانا اور ان کی تربیّت کرنا تاکہ ان کے نشو و ارتقاء کا سلسلہ شروع ہو جائے یا جاری رہے "تزکیہ" سے عبارت ہے، اس کے لیے تزکیۂ نفس اور تزکیۂ قلب کی تعبیرات بھی اختیار کی جاتی ہیں۔ اس اعتبار سے تزکیۂ نفس سے قلب کے تصفیہ و اصلاح کا وہ طریقِ عمل مراد ہے جس کے ذریعے ذہنی انتشار، شخصیت کے عدم تعاون اور زندگی پر دباؤ کو دُور کر کے اس کی فطری صلاحیتوں کو فطری انداز میں نشو و ارتقاء کرنے کے قابل بنایا جاتا ہے، نیز اس کے مفہوم میں اخلاق کی تہذیب و تحسین اور مکارمِ اخلاق کی تکمیل بھی شامل ہے۔

تزکیہ دراصل قرآن مجید کی ایک پہلو دار اور جامع اصطلاح ہے جسے دو مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے :

اوّلاً قلب کی مثال کیمرے کے عدسہ کی سی ہے۔ انسان کی پیدائش کے وقت وہ مصفّا، فعّال اور درست حالت پر ہوتا ہے۔ حواس باہر کی دنیا کی جو اطلاعات اسے بھیجتے ہیں، وہ اس پر نقوش کی طرح مرتسم ہو جاتی ہیں اور عقل فوراً ان کے حسن و قبح، حق و باطل اور افادیت و مضرت پر حکم لگاتی ہے، نیز انھیں قبول و رد کرنے یا ان کے مطابق عمل کرنے یا نہ کرنے کے لیے انسان پر اپنا دباؤ ڈالتی ہے۔ قلب اپنی اصل حالت پر ہو تو عقل بھی سلیم ہوتی ہے۔ عقلِ سلیم کا محاکمہ درست، اس کا دباؤ شدید اور اس کی آواز میں وزن ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر قلب اپنی اصل حالت پر نہ ہو تو اس کے حواس کی کارکردگی میں فرق پڑ جاتا ہے اور اس کی اطلاعات بعض اوقات غلط ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں ایسے قلب کی عقل بھی سلیم نہیں رہتی۔ چنانچہ اس کے فیصلے غیر معتبر اور دباؤ کم ہو جاتا ہے، نیز اس کی آواز میں پہلا سا وزن نہیں رہتا۔ قلب کے بگڑنے سے عقل کی جہت بھی ٹیڑھی ہو جاتی ہے اور اس کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ وہ غلط حکم لگانے اور غلط فیصلے دینے لگتی ہے۔ قلب کو پاک و صاف کر کے اس کی اصل حالت پر لانا اور اس کی کارکردگی کو درست و مؤثّر بنانا تزکیۂ نفس سے عبارت ہے۔ ثانیاً قلب ایک نامیاتی وجود ہے اور اس کی مثال "شجرۃً طیبۃً" کی سی ہے، یعنی ایک نشو و ارتقا کرنے اور برگ و بار لانے والے سرسبز و شاداب درخت کی ہے۔ درختوں کی طرح قلب کو بھی بیماری لگ جاتی ہے۔ درخت کو بیماری لگ جائے تو اس کی نشو و نما رُک جاتی ہے اور وہ پھل دینا بند کر دیتا ہے۔ باغبان دانا و بینا ہو تو وہ اس کی بیماری کا علاج کرتا ہے اور اس غرض کے لیے اسے کیڑوں، طفیلی بیلوں سے پاک و صاف کرتا اور مناسب کھاد، پانی اور دوائی دیتا ہے، یہاں تک کہ درخت پھر ہرا بھرا اور ثمرور ہو جاتا ہے۔ اس سلسلۂ عمل کو تزکیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جہاں تک قلب کا تعلق ہے اس کے تزکیہ اور علاج کا مجرّب و بہترین نسخہ جو سات اجزا پر مشتمل ہے، مفصلۂ ذیل ہے :

(۱) تقویٰ (۲) یادِ الٰہی (۳) شکرِ نعمت (۴) مشاہدہ (۵) تفکّر (۶) عبرت پذیری اور (۷) جہاد۔

۱ : **تقویٰ** عبارت ہے اللہ تعالیٰ کی محبّت اور خشیّت سے۔ مفصّل بحث گزر چکی ہے۔

۲ : **یادِ الٰہی** : اس کا مطلب ہے انسان کی سوچ اور قول و فعل اللہ تعالیٰ کے حوالے سے ہونا چاہیے۔ اس کی بہترین تفسیر صوفیہ کا یہ قول ہے : جو دم غافل، سو دم کافر۔

۳ : **شکرِ نعمت** : اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ادراک و شعور اور اس کی قدر شناسی ہے۔ دوسرے لفظوں میں شکرِ نعمت کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر و حفاظت کرنا اور ان سے کماحقہٗ استفادہ و تمتع کرنا، نیز اس کی بخشش و عطا کے لیے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور اس کا دل و جان سے شکر بجا لانا۔

۴ : **مشاھدے** کا مطلب حسّی مشاہدہ ہے۔ تزکیہ کے سلسلے میں حواس میں سے سامعہ و باصرہ ہی اہم و مؤثر کردار ادا کرتے ہیں، لہٰذا مشاہدے سے مراد سمعی و بصری مشاہدہ ہے۔

۵ : **تفکّر** : اللہ تعالیٰ کے حوالے سے کائنات، حوادثِ روزگار، مظاہرِ فطرت و حیات، تاریخ کی روش اور خود اپنی زندگی کے آغاز و انجام پر خلوصِ نیت سے بامقصد غور و فکر کرتے رہنا۔

۶ : **عبرت پذیری** : حوادثِ روزگار، حیاتِ انسانی کے المیوں اور تاریخ کی روش سے عبرت حاصل کرنا۔

۷ : **جھاد** بھی تزکیۂ نفس کا ایک مؤثّر و اہم ذریعہ ہے۔ چنانچہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جہاد کی تربیت پر خصوصی توجہ فرمائی اور مسلمانوں کو اپنے عہد کا مثالی "مجاہد" بنا دیا۔ میں نے فوجی سپاہی نہیں "مجاہد" لکھا ہے کیونکہ ان دونوں میں اصلاً فرق ہے۔ مجاہد اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مجاہد "بندۂ رحمٰن" ہوتا ہے، لہٰذا وہ اس کے بندوں کے حقوق، ان کے مادّی و رُوحانی یا دُنیوی و اُخروی مفادات اور فلاح و بہبود کی خاطر ان کے دشمنوں کے خلاف جان و مال کے ساتھ زبان و قلم اور تلوار کے ذریعے جدوجہد اور جنگ و قتال کرتا ہے۔ جہاد کا محرّکِ حقیقی محبّتِ الٰہی اور محبّتِ انسانی ہے۔ اسلام چونکہ تحریکِ رحمۃ للعالمینی ہے، اس لیے اس کی حفاظت اور نشر و اشاعت کا مقصد اصل میں بنی نوعِ انسان سے محبت و احسان کرنا ہے۔ جہاں تک عام فوجی سپاہی کا تعلّق ہے، وہ محض دُنیوی مفادات کی خاطر چاہے ذاتی ہوں یا قومی، جنگ و قتال کرتا ہے۔

عرب ایک تو صدیوں سے قبائلی و صحرائی زندگی گزار رہے تھے، دوسرے ان میں ہمیشہ سے نراج کی حالت پائی جاتی تھی۔ اس کے تین نتائج برآمد ہوئے : ایک تو خانہ جنگی برنگِ دوام، دوسرے وہ طبعاً و حاجۃً جنگجُو تھے، اور تیسرے ان کے مفادات صرف اپنی ذات اور قبیلے

ہی تک محدود تھے۔ مرکزی حکومت کے فقدان، نراج اور خانہ جنگی کے سبب ان میں قومیت پیدا نہ ہو سکی، لہٰذا وہ ملکی و قومی نقطۂ نظر سے سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔ معلّمِ انسانیت نے، جو رحمۃ للعالمینؐ بھی تھے، ان کے نقطۂ نظر کو بدلنا اور فکر و نظر میں آفاقیت پیدا کرنا تھی، تاکہ وہ سچے مجاہد بن جائیں۔ صدیوں کی عادات و عصبیّات اور فکر و نظر کے زاویوں کو بدلنا ازبس دُشوار و شکیب رُبا بلکہ ایک طرح سے محال کام تھا، لیکن آپؐ نے یہ کارنامہ سرانجام دیا اور اتنی قلیل مدّت میں سرانجام دیا کہ دنیا حیران رہ گئی اور آج بھی عقلِ سلیم اسے اعجاز ہی سمجھتی ہے۔ یہ اعجاز آپؐ کی تعلیم اور عسکری تربیت کا مرہونِ منت تھا جو آپؐ اپنے متّبعین کو دیتے تھے۔ عسکری تربیت کی غیر معمولی اہمیّت کے پیشِ نظر اس سے تفصیل سے گفتگو کی جاتی ہے۔

عسکری تربیت :

پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اس بات کا حقُّ الیقین تھا کہ اسلام کی انقلابی تحریک کو عرب کی استحصالی قوتیں زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکیں گی اور اسے ان کی جارحیّت کا مقابلہ کرنا ہوگا، لہٰذا آپؐ نے مسجد ہی کو فوج کا صدر مقام (ہیڈ کوارٹر) بنا کر مہاجرین اور انصار کی عسکری تربیت کا آغاز کر دیا۔ آپؐ ان پر اسلام کے نقطۂ نظر سے جہاد کی اہمیت و فضیلت واضح کرتے، انھیں جنگ و جہاد اور موت و شہادت کے فرق سے آگاہ کرتے اور تعلیماتِ قرآنی اور وعظ و نصیحت کے ذریعے ان میں جذبۂ جہاد پیدا کرتے تاکہ ان کا عسکری عزم و کردار بنیانِ مرصوص، ہمّت ناقابلِ اضمحلال، حوصلہ ناقابلِ شکست اور وہ بحیثیت سپاہ کے ناقابلِ تسخیر بن جائیں۔ اب ہم ذرا تفصیل سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ آپؐ نے مجاہدین کی عسکری تربیت کن اصولوں کے ذریعے کی، یا بالفاظِ دیگر ان میں ایک مثالی سپاہی اور سپاہ کے اوصاف کیسے پیدا کیے؟

یہ امر مسلّمات میں سے ہے کہ عسکری تربیت میں جو چیز اوّلین اہمیّت کی حامل ہے وہ سپاہ کے عقایدِ جلیلہ و محرّکہ ہیں۔ آگے بڑھنے سے پہلے یہاں اس امر کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ عقاید اور نظریات میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ نظریات کی جولانگاہ دماغ ہے، دل نہیں، لہٰذا ان کا تعلّق نظری زندگی سے ہوتا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ عملی زندگی سے بھی ان کا رشتہ ہو۔ جہاں تک عقاید کا تعلّق ہے، وہ حیاتِ انسانی میں اس طرح جذب اور جاری و ساری

ہوتے ہیں جس طرح حیاتیاتی وجود میں خون گردش کرتا ہے۔ ہمیں یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح صالح خون کی متوازن گردش پر ہر جسم کی بقاء صحت، قوت و توانائی اور نشو و ارتقاء کا انحصار ہوتا ہے، اسی طرح سچے اور صالح عقاید کی کُل حیاتِ انسانی میں متوازن گردش سے اس میں قوت و توانائی، ہیبت و جبروت اور رعب و جلال پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے سچے، صالح اور جلیل و محرّک عقاید جو کُل زندگی پر حاوی ہوں، مومن کو اپنے مال و جان، اہل و عیال اور ہر قسم کے مفادات سے عزیز ہوتے ہیں اور وہ ان کی خاطر کسی قربانی سے دریغ نہیں کرتا۔ یہ حقیقتِ اسلام، پیغمبرِ اسلامؐ اور مسلمانوں کے حوالے سے قرآن مجید میں اس طرح بیان ہوئی ہے :

(اے میرے پیغمبرؐ!) لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم واقعی اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتّباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا، اور تمھاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا۔ وہ گناہوں سے محفوظ رکھنے اور ان سے درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔[۵]

ہمیں یہ اصل فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ عقاید عمل سے معتبر بنتے ہیں۔ جہاں تک اسلام کے عقاید کا تعلّق ہے، ان کا اعتبار بھی عمل سے ہے، بشرطیکہ آپؐ کے اُسوۂ حسنہ کے مطابق ہو۔ دُوسرے لفظوں میں مسلمانوں کے عقاید آپؐ کی سنّتِ حسنہ کے اِتباع سے معتبر بنتے ہیں اور یہ اِتّباع کامیابی و کامرانی اور فتح و نصرت کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی تعلیمات اور مواعظۂ حسنہ کے ذریعے مسلمانوں میں عقایدِ جلیلہ و محرّکہ کو زندہ و توانا رکھنا آپؐ کے اہم ترین معمولات میں سے تھا۔ عسکری تربیت کے حوالے سے اسلام کے عقایدِ جلیلہ و محرّکہ مفصلۂ ذیل ہیں :

(۱) **اللہ اکبر و اعظم ہے**، یعنی عظمت و کبریائی، قدرت و جبروت اور جلال و رحمت میں اس کا کوئی ثانی یا شریک نہیں۔ اس کی طاعت سے انسان میں اس کے ظرف کے مطابق صفاتِ الٰہیہ پیدا ہوتی ہیں جو اسے ناقابلِ تسخیر بنا دیتی ہیں۔ علاوہ بریں اللہ تعالیٰ کی عظمت و رحمت کا یہ خاصّہ ہے کہ وہ اپنے طاعت گزار بندوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان کی دُعائیں سُنتا اور ان کی ظاہری و مخفی طور سے مدد کرتا ہے۔ یہ عقیدہ خودی کے لیے قوت و توانائی اور بشارت و رجائیت کا سرچشمہ ہے، جو اسے عظیم و ناقابلِ تسخیر بنانے کا بہترین ذریعہ ہے۔

(۲) **طاعت** : مُسلمانوں پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسُولؐ کی طاعت کے علاوہ ان

اہلِ امر کی طاعت بھی فرض ہے، جو ان میں سے ہوں۔ اصل یہ ہے کہ طاعت و ایمان لازم و ملزوم ہیں۔ طاعت کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس سے سپاہیوں میں نظم و ضبط، اتحاد و یک جہتی اور یگانگت و ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے، جو ان میں عسکریّت پیدا کرکے انھیں صحیح معنوں میں فوج بناتی ہے اور یہ عسکریّت ہی ہے، جس میں فوج کی قوّت و ہیبت کا راز مضمر ہے، اور جو فوج اور ہجوم میں مابہ الامتیاز ہے۔

(۳) **جہاد و ایمان لازم و ملزوم ہیں** اور ایمان جہاد ہی سے معتبر بنتا ہے۔ جہاد مومن کے اہم فرائض میں سے ہے، جس میں حصّہ لینے کی جزا دنیا میں خیرِ کثیر اور آخرت میں جنّت کی حیاتِ جاوید ہے، اور حصّہ نہ لینے کی سزا دُنیوی و اُخروی زیاں ہے، یعنی دنیا میں ذلّت و مسکنت اور آخرت میں دوزخ کا عذاب۔ دنیا میں حق و باطل میں جنگ اس وقت سے جاری ہے جب انسان میں شعورِ حق و باطل بیدار ہوا، اور حق کو باطل سے اور اہلِ حق کو اہلِ باطل سے بچانے اور محفوظ رکھنے کے لیے جہاد ایک ناگزیر پیش شرط ہے۔

(۴) **موت کا وقت مقرّر ہے**، لہٰذا رزم ہو یا بزم، انسان کو وقتِ معیّنہ سے پہلے یا بعد میں موت نہیں آسکتی۔ اسلام کے اس عقیدے نے مجاہدوں کو موت سے نڈر، ناقابلِ تسخیر اور بڑے بڑے صبر آزما تجربوں اور شکیب رُبا امتحانوں میں سے گزر جانے کے قابل بنا دیا تھا۔

(۵) **شہادت مقصُودِ حیات ہے** : مجاہد کی زندگی کی غایت اللہ کی راہ میں جہاد کرنا اور شہادت پانا ہے۔ بقول علاّمہ اقبال :

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی

اور شہادت کا اجر جنّت کی حیاتِ محض ہے۔ حیاتِ محض سے مراد لذّت و طمانیت اور حُسن و سرور کی حیاتِ جاودانی ہے۔

(۱) مشق و مزاولت :

علم و ہنر کا کوئی گوشہ ہو، اس میں کمال حاصل کرنے کی ایک پیش شرط مشق و مزاولت ہے۔ اس کے متعدّد فوائد میں سے ایک یہ ہے کہ اس سے جسم کے اعضاء و جوارح، متعلقہ حواس

اور قلب میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور وہ سب ایک واحدیہ کی صورت میں خودکار مشین کی طرح کام کرنے لگتے ہیں، جو حد درجہ حسّاس اور باشعور ہو۔ مشق و مزاولت مسلسل و متواتر اور اس کی جہت درست و صالحہ ہو تو اس سے مطلوبہ نتائج برآمد ہوتے ہیں، لہٰذا عسکری تربیت میں اس کی اہمیت میں مبالغہ نہیں ہوسکتا۔ ایک عظیم ماہرِ حربیّات اور مثالی سپہ سالار کی طرح آپؐ نے مجاہدین کے لیے مشق و مزاولت کا ایک ایسا نظام قائم کیا، جس کے قوانین اور اصول و ضوابط غیر مکتوبی یا ملفوظی تھے۔ وہ جدید و قدیم عسکری نظاموں کی طرح نہ تھا، بلکہ مجاہدین کی طرح رضاکارانہ بھی تھا اور منظّم بھی اور اپنی امتیازی خصوصیت کے باعث وہ انتہائی کم خرچ اور مؤثّر ثابت ہوا۔ آپؐ مجاہدین کو جو انقلابی رُوح کے حامل تھے، مسلسل و متواتر عسکری مشق و مزاولت کرتے رہنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ چونکہ آپؐ کی ہر ترغیب و تلقین مومنوں کے لیے حکم کی حیثیت رکھتی تھی، اس لیے آپؐ کی ہدایات کے مطابق مروجہ ہتھیاروں مثلاً تیر اندازی، نیزہ زنی، تیر افگنی، شمشیر زنی وغیرہ، نیز گھڑ سواری کی مشق کرنا ان کا معمول بن گیا۔ اس ضمن میں یہ بات بظاہر معمولی نظر آتی ہے، لیکن وہ حد درجہ اہم اور بصیرت افروز ہے کہ آپؐ مروجہ ہتھیاروں میں سے تیر اندازی کی اہمیت پر بہت زور دیا کرتے تھے اور مجاہدین کو اس فن میں مہارت حاصل کرنے کی ترغیب دیتے اور تلقین فرمایا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں آپؐ کے دو ارشادات نقل کیے جاتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ ایک تیر کے ذریعے تین شخصوں کو جنت میں داخل کرے گا: ایک تیر ساز جسے اپنے اس عمل میں خیر کی اُمید ہو، دوسرا تیر انداز اور تیسرا وہ شخص جو اس کی معاونت کرنے والا ہو۔ لہٰذا تم تیر اندازی اور گھڑ سواری کی مشق کرو۔ ہاں، تمھاری گھڑ سواری سے زیادہ مجھے تمھاری تیر اندازی عزیز ہے۔"[۹]

"جس شخص نے تیر اندازی سیکھی اور پھر اسے چھوڑ دیا تو اس نے نعمت پانے کے بعد اسے ٹھکرا دیا۔"[۱۰]

آپؐ کے ان ارشاداتِ حکیمانہ میں ایک ایسا نکتہ مضمر ہے جو جتنا زیادہ اہم اور بصیرت افروز ہے، اتنا ہی کم مؤرخین اور اصحابِ سیرت کی نظروں میں رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ آپؐ کو دُور مار ہتھیاروں کی اہمیت کا پُورا شعور تھا۔ چونکہ تیر ہی اس عہد کا دُور مار ہتھیار تھا، لہٰذا آپؐ اس کو سب ہتھیاروں پر فوقیت دیتے اور مجاہدین کو خصوصیت سے تیر اندازی کی مشق و مزاولت کرنے اور اس میں مہارت حاصل کرنے کی تلقین فرماتے تھے۔ اس سے ثابت ہوا کہ دُور مار ہتھیاروں کے استعمال پر خصوصی

توجہ دینا اور اس میں مہارتِ تامّہ حاصل کرنا سُنّتِ حسنہ ہے۔

(۲) ریاضتِ شاقّہ:

آپؐ کی عسکری تربیت کا ایک لازمی جزو تھا۔ اس سے سپاہ میں قوّتِ برداشت پیدا ہوتی ہے جو صبر آزما صورتِ حال اور انتہائی سنگین و خطرناک حالات میں بھی ان کے ہوش و حواس قائم رکھتی اور انھیں ان سے عہدہ برآ ہونے کے قابل بناتی ہے۔ آپؐ مجاہدین میں قوتِ برداشت بدرجۂ اتم پیدا کرنے کی خاطر انھیں اپنی طرح سخت سے سخت محنت و مشقّت کا خوگر بناتے، انھیں رمضان المبارک کے علاوہ ہر موسم میں نفلی روزے رکھواتے، انھیں تہجّد کی نماز با جماعت پڑھواتے اور فقر و فاقہ کی زندگی کا عادی بناتے۔ رزم ہو یا بزم، آرام و راحت کی چیزوں سے پرہیز کرنا، انتہائی سادہ اور محنت طلب زندگی گزارنا آپؐ کا معمول تھا اور اس سنّت کا اتّباع مجاہدین کا شعارِ زندگی۔ "ہر کام خود کرنا" آپؐ کا شعار تھا، جس پر سب مومن عمل کرتے اور فخر محسُوس کرتے تھے۔ اس سے اسلامی معاشرے میں محنت وجۂ افتخار بن گئی۔ یہ بات بڑی انقلاب انگیز اور استحصالی معاشروں کے لیے ایک زبردست چیلنج تھی۔ یہ سبق اشتمالی معاشروں نے اسلام سے سیکھا ہے۔ بہرحال ان باتوں سے مجاہدین سخت جان اور جفاکش بن گئے۔ اس ریاضتِ شاقّہ کی بدولت مجاہدوں میں غیر معمولی قوّتِ برداشت پیدا ہو گئی اور وہ شدائد و مصائب کی تاب لانے، نامساعد حالات میں ثابت قدم رہنے اور خطرناک سے خطرناک تجربوں اور آزمائشوں سے کامیاب گزر جانے کے قابل ہوئے۔

(۳) صف بندی:

ماہرینِ حربیّات کے نزدیک صحیح اور برمحل صف بندی سے قلیل فوج دشمن کی کثیر فوج کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ صف بندی کو آپؐ بہت زیادہ اہمیت دیتے، اس میں یدِطولیٰ رکھتے تھے اور مجاہدین کو اس کی نظری و عملی تعلیم دیتے تھے۔ ہم جیسا کہ آگے چل کر دیکھیں گے، آپؐ سپہ سالار کی حیثیت سے اپنی فوج کی اس طرح صف بندی کرتے تھے کہ ساز و سامان اور تعداد کے لحاظ سے اپنے سے کئی گنا طاقتور دشمن کو اس برتری کا فائدہ اٹھانے کا موقع نہ دیتے تھے۔

(۴) طلایہ[۱۱]:

فوجی دستوں کے ذریعے دشمن کے علاقوں کی جغرافیائی، سیاسی اور عسکری معلومات حاصل کرنا ہمیشہ سے کلیدِ کامیابی سمجھا جاتا رہا ہے۔ آپؐ کو اس کی غیر معمولی اہمیت کا پورا شعور تھا۔ چنانچہ آپؐ مجاہدین کو اس کی مسلسل تربیت دیتے تھے۔

(۵) قراولی[۱۲] :

یعنی دشمن کی نقل و حرکت اور دیگر عسکری معلومات حاصل کرنا۔ اسے بھی آپؐ کے تربیتی نظام میں غیر معمولی اہمیت حاصل تھی۔

(۶) عسکری جاسوسی[۱۳] :

دشمن کی قوت، تعداد، اس کے منصوبوں اور چالوں، حلیفوں اور ان کے جاسوسوں کا بروقت پتا چلانا اور قائد کو اطلاعات بھجوانا۔ آپؐ کا یہ جاسوسی نظام، اگرچہ بے نام و غیر مرئی تھا، مگر اس کی اعلیٰ کارکردگی کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اس نے مجاہدین کی مہموں کو کامیاب بنانے میں جو کردار ادا کیا، اس کی بنا پر اس کی غیر معمولی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

(۷) رازداری :

اپنے فوجی رازوں کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دینا، نہ اپنوں پر نہ بیگانوں پر۔ اس کی تربیت پر بھی آپؐ خصوصی توجہ فرماتے تھے۔

(۸) شاطریّت :

اپنے طرزِ عمل، پراپیگنڈے، بالواسطہ پبلسٹی، خاموشی وغیرہ کے ذریعے دُشمن کو غافل رکھنا اور اس کی غفلت سے فائدہ اُٹھانا، دشمن کو جُل دینے کی خاطر دکھانا کچھ اور کرنا کچھ۔ خود دشمن سے کبھی غافل نہ ہونا، اس کے متوقّع یا اچانک حملے کے لیے ہر وقت چوکس، چاق و چوبند اور تیّار رہنا۔ فتح مکہ اس کی بہترین مثال ہے۔

(۹) تعاقبیّت :

دُشمن کے تعاقب کا فن۔ دشمن کی افواج کا اس طرح پیچھا کرنا کہ انھیں دوبارہ مجتمع و منظّم ہونے اور صف بندی کرنے کا موقع نہ مل سکے اور نہ وہ پلٹ کر حملہ ہی کر سکیں۔ جنگِ اُحد اس کی بصیرت افروز مثال ہے۔

(۱۰) مکرّر صف بندی :

ہزیمت و انتشار کی حالت میں دوبارہ اکٹھا ہونے، سنبھالا لینے، ہوش و حواس اور صفیں درست کرنے کی قابلیت۔ اس تربیت کا کرشمہ تھا کہ جنگِ اُحد اور جنگِ ہوازن میں مجاہدین نے انتہائی نامساعد حالات میں بھی میدانِ جنگ کو نہ چھوڑا اور منتشر ہونے کے بعد وہ دوبارہ اپنی صف بندی کرنے کے قابل ہو گئے۔

(۱۱) ترہیب و ترعیب :

دشمن کو ہلاک و برباد کرنے کے بجائے اسے خوفزدہ، مایوس اور مرعوب کر کے ہتھیار ڈالنے یا بھاگ جانے یا محصور ہو جانے پر مجبور کرنا، نیز اس کے جنگی کردار کو مضمحل کرنا اور اس کی ہوا اُکھاڑنا، آپؐ کی یہ کامیاب فوجی حکمتِ عملی تھی۔ آپؐ کی تربیت سے مجاہدین اس فن میں طاق ہو گئے تھے۔

(۱۲) حُسنِ سلوک و ترغیب :

دشمن کے قیدیوں سے حُسنِ سلوک کرنا اور ان کی تالیفِ قلب کرنا تاکہ دُشمن نامساعد حالات میں جان پہ کھیل جانے پر قیدی بن جانے کو ترجیح دیں۔ آپؐ نے جنگِ بدر میں اس کی جو مثال قائم کی، وہ آپؐ کی تربیت کا ایک حصہ تھی اور مجاہدین کو ہمیشہ اس پر عمل کرنے کی تلقین فرمائی۔

(۱۳) قائد گری :

مجاہدین میں اوصافِ قیادت پیدا کرنا۔ یہ آپؐ کی تربیت کا ایک امتیازی وصف تھا۔ چنانچہ مجاہدین کی اکثریت میں قیادت کی صلاحیت پائی جاتی تھی۔

(۱۴) جنگی سکت[۱۴] :

فوج میں اعلیٰ درجے کی عسکری صلاحیت ہونے کے باوجود اگر اس میں جنگی سکت یا قوتِ برداشت نہ ہو تو اس کی فتح کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ مجاہدوں میں سرد و گرم اور جارحانہ و مدافعانہ اور طویل و مختصر جنگوں کی سکت پیدا کرنا آپؐ کی عسکری تربیت کا لازمہ تھا۔

(۱۵) سپاہیانہ ترُت پھرت یا حرکت پذیری[۱۵] :

اس کا مطلب ہے جنگ سے پہلے یا اس کے دوران میں فوج میں پینترے بدلنے، پسپائی اختیار کرنے یا دشمن کا تعاقب کرنے اور رسد و کمک پہنچانے میں اس تیزی، ہوش مندی اور چابک دستی سے نقل و حرکت کرنا کہ دشمن ششدر رہ جائے۔ آپؐ نے اپنی فوج کی تربیت و تنظیم حرکت پذیری کے اصول ہی پر کی تھی، جس نے اسے ناقابلِ تسخیر بنانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

حاصلِ کلام یہ کہ عسکری تربیت قرآن مجید کے نصابِ تعلیم و تربیت کا ایک لازمی حصّہ اور آپؐ کی سُنّتِ حسنہ ہے جس کی بدولت مجاہدین ناقابلِ تسخیر بن گئے اور ان کے کارناموں کو دیکھ کر تاریخ نے انھیں مثالی سپاہی تسلیم کر لیا۔

(۳) صُفّہ یونیورسٹی کے نصاب کا تیسرا مضمون تعلیمِ قرآن تھا۔ علمِ قرآن کا مبدأ، جیسا کہ اس کا اپنا ارشاد ہے علمِ الٰہی ہے جو علمِ انسانی کا سرچشمہ ہے، لہٰذا الکتاب یا قرآنِ حکیم کی تعلیم دینے کا مقصد انسان کو حقیقی علم سکھانا تھا۔ قرآن مجید کی مثال ایک ایسے شجرِ طیّبہ کی ہے جو زمانے کے تقاضوں کے مطابق مسلسل برگ و بار لاتا رہتا ہے اور ہمیشہ لاتا رہے گا اور یہ انسان کا فرض ہے کہ وہ تعلیم و تربیت اور غور و فکر کے ذریعے اس کے بوقلموں و نوبنو ثمرات سے ہمیشہ استفادہ کرتا رہے۔ قرآن مجید کو اس بحرِ ذخار سے بھی تشبیہہ دی جا سکتی ہے جو طرح طرح کے لعل و گوہر سے معمور ہے اور ان سے وہی شخص اپنا دامنِ مراد بھر سکتا ہے، غوّاصی جس کا پیشہ ہو۔

آپؐ اپنے طلبا کو زمانے کے تقاضے اور ان کی استعداد کے مطابق قرآنی علوم اور حکمت کی تعلیم دیتے تھے۔ معلّمِ انسانیت کی حیثیت سے آپؐ کی عظمت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ صحرا کے بدوی اور ان پڑھ شہری دیکھتے دیکھتے عالم و فاضل اور مفکّر و حکیم بن گئے۔ آپؐ نے مسجدِ نبویؐ میں جو شمعِ علم روشن کی تھی، اس کی روشنی آپؐ کے شاگردوں کے ذریعے اقصائے عالم میں پھیل گئی۔

(۴) **حکمت** اس نصاب کا چوتھا مضمون تھا۔ علم کی مثال برقی رَو کی ہے جس سے روشنی اور توانائی حاصل کرنا حکمت ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ بجلی پیدا کرنے والی مشین برقی رَو پیدا کرتی ہے لیکن اس سے فائدہ اسی صورت میں اٹھایا جا سکتا ہے کہ برقی قمقموں کے ذریعے اس سے روشنی اور متحرّک آلات کے ذریعے اس سے توانائی حاصل کی جائے اور ایسا کرنا حکمت ہے۔ اس اعتبار سے علم و حکمت لازم و ملزوم ہیں اور اسی لیے قرآن مجید نے علم کے ساتھ حکمت کی تعلیم کو لازمی قرار دیا ہے۔

(۵) **علوم و فنونِ نو** : اسلامی نظامِ تعلیم کے پانچویں مضمون سے متعلّق قرآن مجید نے بڑی فکر انگیز و حکیمانہ بات کہی ہے کہ آپؐ اپنے طلبا کو ان باتوں کی تعلیم دیتے تھے جو وہ نہیں جانتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے نصابِ تعلیم میں زمانے کے لحاظ سے جدید و نو علوم و فنون، بشمول ٹیکنالوجی وغیرہ داخل ہیں۔ اس ارشادِ الٰہی میں علم کے ارتقائے مسلسل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور ہدایت کی گئی ہے کہ اسلامی درسگاہوں میں تحقیق و تجربات کا جدید انتظام ہونا چاہیے اور ان کا سلسلہ احسن طریق سے جاری رہنا چاہیے نیز طلبا کو دوسری اقوام کی تحقیقات و تجربات سے آگاہ رکھنے اور ان سے پورا پورا استفادہ کرنے کا معقول بندوبست

ہونا چاہیے۔

آپؐ نے اس حکمِ الٰہی پر عمل کرتے ہوئے عصری تقاضوں اور طالب علموں کی قابلیت کے مطابق یقیناً ایسے علوم و فنون بھی سکھائے کہ انھوں نے بڑی سرعت سے زندگی کے ہر گوشے میں اتنی غیر معمولی ترقی کر لی کہ دنیا دنگ رہ گئی، اور زمانے نے قیادتِ اقوامِ عالم کی ذمہ داری انھیں تفویض کر دی۔

ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ نصابِ تعلیم و تربیت کسی انسان کا نہیں، اللہ تعالیٰ کا تجویز کردہ ہے، اس لیے ہر زمان و مکان کے لیے ہے۔ اس کا دوسرا وصف یہ ہے کہ اس کی بدولت مسلمان انتہائی مختصر عرصے میں زندگی کے ہر شعبے میں حیرت انگیز ترقی کر کے اقوامِ عالم کو پیچھے چھوڑ گئے اور زمانے نے انھیں قیادتِ عالم تفویض کر دی۔ کیا یہ آپؐ کا اعجاز نہیں؟ یقیناً یہ آپؐ کا تاریخی اعجاز ہے اور ان لوگوں کے لیے آئینۂ عبرت ہے جو علم رکھنے کے باوجود اپنے تعصّبات یا ظلم و جہل کے سبب آپؐ کی نبوت کے منکر ہیں۔ کیا ایک ان پڑھ (امّی) بندۂ صحرائی، جس نے ان پڑھ لوگوں میں نشو و نما پائی اور زندگی گزاری، ایسا معجز نما کارنامہ انجام دے سکتا تھا، اگر وہ نبوّت و رسالت کے مقامِ محمود پر متمکّن نہ ہوتا اور اسے تائیدِ الٰہی حاصل نہ ہوتی؟ یہ سوال جو فکر انگیز و بصیرت افروز ہے، یقیناً ان لوگوں کے لیے چیلنج ہے جو آپؐ کی نبوّت کو تسلیم نہیں کرتے، نیز ان لوگوں کے لیے بھی چیلنج ہے جو مسلمان کہلانے کے باوجود اسلام کے اس تعلیمی و تربیتی نصاب کو اپنی درسگاہوں میں (دینی مدرسے ہوں یا سکول، کالج اور یونیورسٹیاں) رائج نہیں کرتے۔

حواشی و تشریحات

(۱) Problem of Rehabilitation

(۲) محمد حمید اللہ : "رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی"، ص ۳۲۵ ' ۳۲۶ ببعد' صحیح بخاری۔

(۳) تاریخ سازمیثاقِ مدینہ کے لیے دیکھیے : محمد حمید اللہ : "عہدِ نبوی کا نظامِ حکمرانی" جلد اوّل، "تاریخ ابن خلدون" (اردو)' ۱ : ۶۷ تا ۷۰ ببعد' "سیرۃ ابن ہشام" ۱ : ۲۷۸ تا ۲۷۹۔

(۴) "طبقات ابن سعد" ۲ : ۱۶۱ ببعد۔

(۵) اصل یں ہے : كَمَآ اَرۡسَلۡنَا فِيۡكُمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡكُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡكُمۡ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيۡكُمۡ وَيُعَلِّمُكُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَيُعَلِّمُكُمۡ مَّا لَمۡ تَكُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ ۝ (البقرہ ۲ : ۱۵۱)۔

(۶) حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے کہ عورتوں نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے عرض کیا کہ مردوں نے آپؐ سے (علم و حکمت میں) ہم سے زیادہ حصّہ لیا ہے، آپؐ ہمارے لیے کوئی دن (تعلیم و تربیت کے لیے) مخصوص و معیّن فرما دیں۔ آپؐ نے ایک دن کا وعدہ فرمایا۔ اس میں آپؐ ان سے ملتے، انھیں وعظ یعنی تعلیم و تربیت فرماتے اور صدقہ یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم فرماتے (صحیح بخاری کتاب العلم ھل یجوز للنّسآء' ۱ : ۲۳)۔ اس حدیثِ طیبہ سے مسلم خواتین میں علم و حکمت سیکھنے اور اخلاقی تربیت حاصل کرنے کی طلب و جستجو کا پتا چلتا ہے۔ اس استنباط کی تائید حضرت عائشہ صدیقہؓ کی ایک روایت سے ہوتی ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ انصار خواتین بہت اچھی ہیں کہ انھیں دینی بصیرت حاصل کرنے میں حیا مانع نہیں آتی۔ (فتح الباری' ۱ : ۲۳۹)۔

(۷) اس موضوع سے قرآن مجید اور احادیثِ طیبہ کے علاوہ متعدد کُتبِ حربیات و سیرت سے استفادہ کیا گیا ہے مثلاً (۱) محمود شیث خطاب : الرّسول القائد (۲) ڈاکٹر حمید اللہ Battlefields of the Prophet Mohammad

The Sword of Allah; Major-General A.I. Akram کراچی' ڈھاکہ ۱۹۷۰ (نیز دیکھیے اردو ایڈیشن طبع پاکستان بک فاؤنڈیشن، کراچی)۔

The Art of War ; Sun Tzu ترجمہ از گرفتھ Samuel B. Griffith' آکسفورڈ ۱۹۶۳ء؛ منتخبات ماوزے تنگ (اُردو ایڈیشن)' پیکنگ، چین۔

(۸) آلِ عمران ۳ : ۳۱۔

(۹) ابن ماجہ، کتاب الجہاد، باب الرّمی فی سبیل اللہ' ۲ : ۹۴۰۔

(۱۰) طبرانی : شرح جامع الصغیر' ۲ : ۳۸۹۔

(۱۱) طلایہ : Patrol ۔

(۱۲) قراولی : Reconnaissance ۔

(۱۳) عسکری جاسوسی : Espionage ۔

(۱۴) جنگی سکت : Fighting Stamina ۔

(۱۵) سپاہیانہ ترت پھرت یا حرکت پذیری : Mobility ۔

باب : ١١

آپ ؐ کی تعمیری و انقلابی سرگرمیاں

(مسجدِ نبویؐ کی تعمیر سے غزوۂ بدر تک)

(١) مسجدِ نبویؐ کی تعمیر۔

(٢) اذان۔

(٣) آپؐ کی تعمیری و انقلابی سرگرمیاں۔

(۴) قریش کا رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کو تہدید آمیز خط، ارتداد و بغاوت کی تیاریاں اور آپؐ کا اس فتنے کو دبا دینا۔

(۵) دفاعی کارروائیوں کا آغاز :

(الف) مہم حضرت حمزہؓ یا سریہ سیف البحر

(ب) مہم حضرت عبیدہ بن حارثؓ یا سریۂ رابغ

(ج) مہم حضرت سعد بن وقاصؓ یا سریۂ خرّار۔

(٦) امّ المومنین حضرت عائشہ صدّیقہؓ کی رخصتی۔

(٧) مسلح جہاد یا قتال کی اجازت۔

(٨) مدینے کے دفاعی حصار میں توسیع اور قریش کی ناکہ بندی کی کوششیں :

(الف) آپؐ کی پہلی مہم یا غزوۂ الوا یا غزوۂ ودّان۔

(ب) آپؐ کی دوسری مہم یا غزوۂ بواط۔

بابؔ ۱۱

آپؐ کی تعمیری و انقلابی سرگرمیاں

(مسجدِ نبویؐ کی تعمیر سے غزوۂ بدر تک)

مسجدِ نبویؐ کی تعمیر (ربیع الاوّل ۱ھ / اکتوبر ۶۲۲ء) :

پیغمبرِ رحمۃ للعالمینؐ مدینے میں تشریف لائے تو آپؐ نے فوراً ہی اپنے منصوبے کے مطابق تعمیری و انقلابی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا اور اس مقصد کی خاطر سب سے پہلے مسجدِ نبویؐ کی تعمیر کی۔ آپؐ نے جس زمین پر مسجد تعمیر کی، وہ بنو نجار کے دو انصار کی ملکیت تھی جن کے نام سہل اور سہیل تھے۔ یہ دو بھائی تھے۔ انھوں نے یہ زمین "خدا کے گھر" کے لیے بلا معاوضہ آپؐ کی نذر کرنا چاہی، لیکن آپؐ نے باصرار قیمت دے کر خریدا۔ کیوں؟ آپؐ کے اس رویّے کے متعلّق مورّخ و سیرت نگار خاموش ہیں، حالانکہ اس میں ایک ازبس اہم نکتہ مضمر ہے اور وہ یہ ہے کہ آپؐ چونکہ عنقریب اسلامی مملکت کے پہلے سربراہ یعنی حکمران بننے والے تھے لہٰذا آپؐ نے مفت زمین لینے سے انکار کر دیا، کیونکہ اس سے آیندہ حکمرانوں کو لوگوں سے جبراً، بلاقیمت زمین لینے کا (چاہے مسجد ہی کے لیے ہو) جواز مل جاتا اور لوگ اسے سُنّتِ حسنہ سمجھ بیٹھتے اور اس طرح دنیا میں ظُلم کی رسم پڑ جاتی۔

مسجد انتہائی سادہ اور مختصر تھی۔ اس کی دیواریں پتھر کے ٹکڑوں اور کچی اینٹوں سے چُنی گئیں، کھجور کے تنوں سے ستونوں کا کام لیا گیا اور چھت کھجور کی لکڑی اور پتوں سے پاٹ دی گئی۔ فرش مٹّی ہی کا رہنے دیا، البتّہ بعد میں اسے سنگریزوں کا بنا دیا گیا۔ مسجد کے ایک کونے میں ایک مسقّف چبوترہ (صُفّہ) بنایا گیا، جس نے کُھلی، اقامتی درسگاہ کا کام دینا تھا۔ اس درسگاہ کے ہمہ وقتی طالب علموں کو اصحابِ صُفّہ کہتے ہیں۔ آپؐ نے مسجدِ نبویؐ کی تعمیر میں بھی مسجدِ قُبا کی تعمیر

کی طرح صحابہ کرامؓ کے ساتھ مزدوروں کی طرح کام کیا۔ آپؐ سیّد المرسلین، امیر و مطاع تھے اور صحابہ کرامؓ اولیاء اللہؒ، مطیع اور جاں نثار، لیکن سب ہی اللہ کے مزدور تھے۔ کتنی عالی مرتبت ہے یہ مسجد! اخوّت و مساوات اور عظمت محنت کا ایسا حسین و ایمان افروز نظارہ تھا کہ چشم فلک نے شاید و باید دیکھا ہوگا۔ سب مسلمان، مہاجر و انصار، والہانہ ذوق و شوق سے مزدوری و معماری کا کام کرتے اور ساتھ یہ شعر بھی پڑھتے جاتے ہیں:

اَللّٰھُمَّ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشَ الْاٰخِرَۃ

فَاغْفِرْ لِلْاَنْصَارَ وَالْمُھَاجِرَۃ

(اے اللہ زندگی صرف آخرت کی زندگی ہے۔ بس انصار اور مہاجرین کو بخش دے)۔

سرداری نظام میں رہنے والے اہلِ یثرب کے لیے یہ کوئی معمولی بات نہ تھی، بلکہ انوکھی اور حیران کُن بات تھی۔ آقا و غلام، امیر و غریب، سردار و رعایا، حاکم و محکوم، آجر و اجیر اور خواص و عوام میں کوئی فرق نہ ہو، یہ ان کے لیے انقلاب انگیز واقعہ تھا۔ اہلِ قوّت و ثروت کے لیے یہ بات سوہانِ رُوح اور غریبوں اور کمزوروں کے لیے ناقابلِ یقین تھی۔ لہٰذا کفّار و مشرکین یہود و نصاریٰ، سب کو اس نظارے سے متأثر ہونا تھا، اور وہ ہوئے۔ آپؐ کی اس قسم کی حسین باتوں کو دیکھ دیکھ کر انھیں یقین ہو جاتا کہ آپؐ ہی نبیِ موعود ہیں، لیکن نسلی و دینی عصبیت قبولیّتِ حق میں مانع آجاتی۔

اسلام کی تحریکِ انقلاب کے مہاجر ارکان مدینے میں غریبُ الدّیار بھی تھے اور بے سر و سامان بھی۔ وہ زندگی کی بنیادی ضروریات روٹی، کپڑا اور مکان تک سے محروم تھے۔ لیکن انصار، جو مہاجرین کی طرح اسلام کی تحریکِ انقلاب کے سرگرم و سرفروش رکن تھے، ان کے لیے سراپا مہر و احسان یعنی رحمت بن گئے۔ ان کا ایمان زندہ و توانا تھا، اس لیے کہ اسلام کا عقیدۂ توحید ان کی زندگی کا جزوِ لاینفک بن چکا تھا۔ اہلِ توحید چونکہ بھائی بھائی ہوتے ہیں، اس لیے انصار نے مہاجرین کو واقعتہً اپنا بھائی بنالیا اور ان کی بنیادی ضرورت کو پورا ہی نہیں کیا بلکہ اپنی کُل متاع کو بھائیوں کی طرح تقسیم کرلیا۔ عقیدۂ توحید کے اعجاز سے قبائلی عصبیت کی جگہ اخوّت و مساوات نے لے لی اور تمام اہلِ توحید رنگِ الٰہی (صبغۃ اللہ) میں رنگے گئے۔ اصل یہ ہے کہ عقایدِ جلیلہ و محرّکہ زندگی کے اجزائے لاینفک بن جائیں تو اہلِ ایمان کی شخصیت رنگِ الٰہی سے مزیّن ہو جاتی ہے۔

آپؐ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ اکیلے ہی ہجرت کی تھی۔ چنانچہ مدینے پہنچ کر آپؐ نے اہل و عیال کو اپنے پاس بُلالیا اور ان کے لیے مسجدِ نبویؐ سے ملحق حجرے تعمیر کرائے جو انتہائی مختصر اور سادہ تھے۔ ان حجروں میں آرام دہ چیزوں کا تو ذکر کیا، بنیادی ضروریات کی چیزیں تک بھی نہیں ہوتی تھیں[۳]۔ ان تنگ و تاریک اور عُریاں و بے رنگ حجروں میں، جو آج کے عام انسان کے لیے بالخصوص زنداں سے بھی زیادہ مہیب و تکلیف دہ تھے، آپؐ نے عُمر بھر اپنے اہل و عیال کے ساتھ انتہائی عُسرت میں زندگی گزاری، حالانکہ آپؐ لادینی اصطلاح میں بادشاہ و حکمران اور فاتح و حاکم بھی تھے اور آپؐ کے پاس کثرت سے مالِ غنیمت بھی آتا تھا۔ آپؐ نے کیوں عیش و آرام کی زندگی پر زُہد و فقر کی زندگی کو ترجیح دی؟ یہ سوال آپؐ کے ان معترضین کے لیے زبردست چیلنج ہے، جو آپؐ کے تعدّدِ ازدواج پر معترض ہیں اور تعیّش پسندی کو اس کا محرّک قرار دیتے ہیں۔ کیا زنداں سے زیادہ تاریک و تنگ حجروں اور بے سر و سامانی کے عالم میں فقر و فاقہ اور محنت و مشقّت کی زندگی بسر کرنا تعیش پسندی ہے؟ کیا ایسی زندگی پر عیش و آرام کی زندگی کا گمان تک بھی ہو سکتا ہے؟ یہ سوال حق کور[۴] معترضین کے لیے مسکت جواب ہے۔ لیکن آنکھوں پر تعصب کے پردے پڑ جائیں اور دل پر کفر کی مُہر لگ جائے تو انسان کتمانِ حق، بہتان تراشی اور دروغ گوئی میں اتنی دور نکل جاتا ہے کہ حق کی طرف لوٹنا اس کے لیے ازبس دشوار ہو جاتا ہے۔ بعینہٖ یہ صورتِ حال صلیبی و صیہونی اور ان کے ہمنوا اسلام دشمن مستشرقین و مصنّفین کی ہے۔ وہ ہر زمان و مکان کے عظیم ترین و مثالی انسان پر، جو سیّد المرسلین اور خاتم النبیّینؐ ہیں، اس لیے معترض ہیں کہ آپؐ نے کیوں معاشرے کے دستور کے مطابق تحریکِ اسلام کے بہترین مفاد میں اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک سے زائد نکاح کیے؟

فَاعْتَبِرُوْا یَا اُوْلِی الْاَبْصَار۔

اذان (ربیع الاوّل ۱ھ / اکتوبر ۶۲۲ء):

مسلمانوں کے لیے مسجدِ نبویؐ کی اہمیت سہ گونہ تھی۔ ایک یہ کہ اس میں نماز باجماعت پڑھنے اور تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا بندوبست ہوگیا۔ دوسرے یہ کہ اس کی تعمیر کے ساتھ ہی اسلامی مملکت معرضِ وجود میں آگئی اور اسلامی معاشرے اور ثقافت کی داغ بیل پڑ گئی۔ تیسرے یہ کہ اس میں انھیں سیاسی و عسکری اور اخلاقی و ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز فراہم ہوگیا۔ مختصر یہ کہ مسجدِ نبویؐ

کی تعمیر کے ساتھ نظامِ صلوٰۃ کے قیام کی پہلی ضرورت تو پوری ہوگئی، لیکن وقتِ مقرّرہ پر باجماعت نماز ادا کرنے کا بندوبست کرنا ابھی باقی تھا۔ صحابۂ کرامؓ نے اس سلسلے میں متعدد تجاویز پیش کیں، مثلاً ناقوس، دف، منادی وغیرہ کے ذریعے لوگوں کو مطلع کیا جائے۔ لیکن آپؐ نے کسی تجویز کو پسند نہ فرمایا۔ آپؐ یقیناً وحی کے منتظر ہوں گے اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو وحی کے ذریعے اذان کے مروّجہ طریقے اور الفاظ سے مطلع کیا۔ حُسنِ توارد دیکھیے کہ بعض صحابۂ کرام حضرت عبداللہ بن زیدؓ اور حضرت عمر فاروقؓ نے بھی خواب میں مروّجہ اذان سنی اور آپؐ کی خدمتِ اقدس میں اس کا اظہار کیا تو آپؐ نے فرمایا: قَدْ سَبَقَكَ بِذٰلِكَ وَحْيٌ ؛ اس میں وحی تم سے سبقت لے گئی۔ پھر آپؐ نے حضرت بلالؓ کو اذان کا حکم دیا اور اس طرح حضرت بلالؓ کو اسلام کا پہلا مؤذن بننے کا قابلِ رشک شرف حاصل ہوا۔ اس شرف کی اہمیّت کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ خلیفۃ المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ تک ان کو یاسیّدی کہہ کر خطاب کرتے تھے۔

مدینے میں اسلامی معاشرہ و مملکت قائم کرتے ہی آپؐ کی ذمہ داریوں میں بے پناہ اضافہ ہوگیا۔ سربراہِ مملکت کی حیثیت سے آپؐ کی اہم ذمہ داری صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے نظاموں کو فطری اصولوں پر قائم کرنا اور ان کے مطابق انھیں کامیابی کے ساتھ چلانا تھا، تاکہ وہ دوسری ہمعصر اقوام اور آیندہ نسلوں کے لیے اسلامی معاشرے کا مثالی نمونہ بن سکے۔ نظامِ صلوٰۃ کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے آپؐ امام و قائد، معلّم و ادیب اور مبلغ و خطیب بھی تھے۔ نظامِ زکوٰۃ کے ناظمِ اعلیٰ کی حیثیت سے آپؐ کی اوّلین ذمّہ داری شہریوں کی بنیادی معاشی ضروریات کو پورا کرنا تھا، اور پھر اس نظام کو انفاق بالعفو اور آزادی و مواخاۃ کے فطری اصولوں کے مطابق چلانا تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ آپؐ نے ان دونوں نظاموں کو جو دراصل ایک ہی نظام کے دو اجزائے لاینفک ہیں، حیرت انگیز کامیابی سے چلایا اور اس طرح اسلامی معاشرے کو ہر زمان و مکان کے انسان کے لیے حسین نمونہ بنا دیا۔

علاوہ بریں آپؐ انتظامیہ اور عدلیہ کے بھی سربراہ تھے۔ آپؐ کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ آپؐ بذاتِ خود امورِ مملکت کو سرانجام دیتے اور دیوانی و فوجداری مقدمات کا فیصلہ کرتے تھے۔ بیرونی ممالک کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنا اور خارجہ امور کی نگرانی کرنا بھی آپؐ کے فرائض میں شامل تھا۔ چونکہ آپؐ بحیثیتِ رسول اللہؐ اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کے بانی و علمبردار بھی تھے، اس لیے دوسری اقوام کو سفارتی سطح پر اس تحریک میں شمولیت کی دعوت دینا بھی آپؐ

کی ایک بنیادی ذمہ داری تھی۔ عسکری نظام کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے مجاہدین کو فوجی تعلیم و تربیت دینا، ان کے جذبۂ جہاد کو زندہ و توانا رکھنا، ان کی دفاعی و جارحانہ استعداد کے نشوو ارتقا کا اہتمام کرنا اور ان کی قیادت میں صلاحیت پیدا کرنا آپؐ کے فرائض میں شامل تھا۔ اس سلسلے میں آپؐ کی ازبس اہم ذمہ داری یہ تھی کہ نزدیک و دُور کے اسلام دشمن قبائل کو جارحانہ اقدام کا موقع نہ دیا جائے۔ چنانچہ آپؐ ان میں سے اکثر کے ساتھ دفاعی معاہدات کرنے اور اپنا حلیف بنانے میں کامیاب ہوگئے۔

معلّمِ انسانیت کی حیثیت سے قرآنی نصابِ تعلیم کے مطابق ایک مثالی یونیورسٹی کو قائم کرنا اور اسے کامیابی سے چلانا بھی آپؐ کی ذمہ داری تھی۔ چنانچہ آپؐ نے مسجدِ نبویؐ میں ایک کھلی، اقامتی یونیورسٹی قائم کی، جس کی حیرت انگیز کامیابی اس کے مثالی ہونے کا زندۂ جاوید ثبوت ہے۔

اسلام کی انقلاب انگیز تحریکِ رحمۃ للعالمینی کے داعی و علمبردار کی حیثیت سے اس کو کامیاب بنانا آپؐ کی ایک بنیادی ذمہ داری تھی۔ چنانچہ آپؐ اسلامی مملکت کی بُنیاد ڈالتے ہی اس فریضے کی طرف متوجّہ ہوگئے۔ آپؐ نے پوری تندہی و انہماک کے ساتھ عوامی و قبائلی رابطے کا سلسلہ شروع کردیا۔ آپؐ بہ نفسِ نفیس دُور و نزدیک کے قبائل کے پاس تشریف لے جاتے، انھیں اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کے اغراض و مقاصد سے آگاہ کرتے، قرآن مجید سناتے، خطبہ ارشاد فرماتے اور اس تحریک میں شمولیت کی دعوت دیتے۔ یہ کام آپؐ اپنے صحابہؓ سے بھی لیتے تھے۔ اصل یہ ہے کہ اسلام کی تحریکِ انقلاب کا ہر رکن انقلابی جذبے سے سرشار اور مجاہد و مبلّغ تھا۔ اپنے اس جذبے کی بدولت ہر مجاہد اپنی ذات میں ایک جماعت تھا، اس لیے وہ تنہا کئی مشرکوں اور منکروں پر بھاری تھا۔ یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ مسلمانوں کی تمام جدّوجہد اور مجاہدانہ اقدامات اپنے الٰہ کے لیے تھے۔

اگرچہ نوزائیدہ اسلامی مملکت کو دشمنوں سے محفوظ رکھنے کی خاطر آپؐ یثرب کے یہودیوں اور بت پرستوں کے قبائل سے مشترکہ دفاع کے معاہدے کرنے میں کامیاب ہوگئے، لیکن آپؐ کو قریشِ مکّہ کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا سدّباب اور متوقع جارحیّت کا مقابلہ کرنا تھا، لہٰذا آپؐ اس کے لیے خفیہ طور سے تیاریاں کرتے رہے۔

دشمن کی دفاعی اور جارحانہ قوت اور اس کے منصوبوں اور چالوں سے خبردار رہنا، مدافعانہ

اور جارحانہ جنگوں میں کامیابی کی ایک ضروری پیش شرط ہے اور اس کا ذریعہ جاسوسی ہے۔ ایک عظیم و تجربہ کار سپہ سالار کی طرح آپؐ نے تمام یثرب اور مکّے میں جاسوسی کا جال پھیلا رکھا تھا، جس کے ذریعے آپؐ اندرونی و بیرونی دشمنوں کے منصوبوں اور چالوں سے باخبر رہتے تھے۔

قریش بھی سیاسی و عسکری فراست رکھتے تھے۔ وہ بھی آپؐ کی دینی، سیاسی اور ثقافتی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے اور انھیں بھی مختلف ذرائع سے برابر خبریں پہنچتی رہتی تھیں۔ مسلمانوں کی اُبھرتی ہوئی قوت سے انھیں طرح طرح کے خدشات لاحق ہو گئے تھے اور یہ خدشات بے بنیاد بھی نہ تھے۔ انھیں سب سے بڑا اور فوری خدشہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو مدینے میں پاؤں جمانے کی مہلت مل گئی تو اہلِ مکّہ کی سب سے اہم تجارتی شاہراہ، جو مدینے سے کچھ فاصلے یعنی بدر کے قریب سے گزرتی ہے، غیر محفوظ ہو جائے گی۔ یہ تجارتی شاہراہ ان کی معاشی زندگی کے لیے شہ رگ کی حیثیت رکھتی تھی، لہٰذا انھوں نے اس خطرے کا سدِّباب کرنے کی خاطر فوری طور سے یہ منصوبہ بنایا کہ یثرب کے یہُود اور بالخصوص منافقین کو جو ان کی طرح بُت پرست تھے، اکسایا جائے کہ وہ مسلمانوں کو سیاسی دباؤ یا تلوار کے ذریعے یثرب سے نکال دیں یا انھیں تہ تیغ کر دیں۔

قریش کو عرب میں خانۂ کعبہ کی تولیت کی وجہ سے مرکزی حیثیت اور دینی قیادت حاصل تھی، اس لیے عرب قبائل میں ان کا احترام اور اثر و رسُوخ خاصا تھا۔ اس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے انھوں نے یثرب کی اسلام دشمن قوتوں کو مسلمانوں کے خلاف جنگ پر اُکسایا، لیکن آپؐ کی سیاسی بصیرت اور حکمتِ عملی کے سامنے ان کی ایسی کوئی کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ آخرِکار انھوں نے مجبور ہو کر عبداللہ بن اُبی کو جو ہجرت سے پہلے رئیس الانصار تھا اور انصار نے اس کی تاجپوشی کی شاہانہ رسم ادا کرنے کی تیاری بھی کر لی تھی،[۸] ایک تہدید آمیز خط لکھا، جس کے عربی متن کا اُردو ترجمہ یہ ہے :

"تم نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی ہے۔ ہم اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ یا تو تم لوگ انھیں قتل کر ڈالو یا انھیں (یثرب سے) نکال دو، ورنہ ہم سب مِل کر بلا تاخیر تم پر ہلّہ بول دیں گے اور تم کو برباد کر کے تمھاری عورتوں کو اپنے قبضے میں کر لیں گے۔[۹]"

قریش کے اس چیلنج سے عبداللہ بن اُبی اور اس کے لوگ ایک تو مرعوب ہوئے اور دُوسرے ان میں مدینے میں اپنی حکومت قائم کرنے کی آرزو بھی پیدا ہو گئی، نیز انھیں یہود اور قریش کی حمایت کا یقین بھی تھا، لہٰذا وہ مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے کا منصُوبہ بنانے لگے۔

یہ صورتِ حال مسلمانوں کے لیے انتہائی خطرناک تھی۔ آپؐ نے موقع کی نزاکت پہچان کر فوری طور سے جوابی کارروائی کی، عبداللہ بن اُبی اور اس کے ساتھیوں سے رابطہ قائم کیا اور اپنے حُسنِ تدبّر، جرأت اور خود اعتمادی کی بدولت انھیں لڑائی یا جارحانہ اقدام سے باز رکھنے میں کامیاب ہو گئے۔[۱۰]

سیاسی اور دفاعی نقطۂ نظر سے یہ کامیابی مسلمانوں کے لیے بڑی حوصلہ افزا اور اہم تھی اور اس نے غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی کامیابی کی راہ ہموار کر دی۔

دفاعی کارروائیوں کا آغاز (رمضان المبارک ۱ھ / مارچ ۶۲۳ء) :

میثاقِ مدینہ جو آپؐ کے بے مثال تدبّر کا زندہ ثبوت ہے، اس کے ذریعے نہ صرف اسلامی مملکت معرضِ وجود میں آ گئی، بلکہ اسے مدینے کے یہود اور دیگر قبائل نے تسلیم بھی کر لیا اور وہ مسلمانوں کے حلیف بھی بن گئے، لیکن اس نوزائیدہ مملکت کو فوری اور زبردست خطرہ اپنے اصل و دیرینہ دشمن قریشِ مکّہ سے تھا۔ آپؐ قریش کی نفسیات کو اچھی طرح جانتے تھے، لہٰذا آپؐ کو اس بات کا حق الیقین تھا کہ وہ کسی قیمت پر بھی مدینے میں مسلمانوں کے وجود اور ان کی مملکت کو برداشت نہیں کریں گے۔ مسلمان ابھی اس جارحیت کے مقابلے کے لیے تیار نہ تھے۔ انھیں اپنے پاؤں جمانے اور دفاعی قوّت مضبوط کرنے کے لیے مہلت درکار تھی۔ چنانچہ آپؐ نے قریش کو مدینے پر فوری حملہ کرنے سے باز رکھنے کی خاطر ایک جامع منصوبہ بنایا اور اسے اس خوبی سے عملی جامہ پہنایا کہ عقلِ سلیم کو ماننا پڑتا ہے کہ آپؐ کی عسکری بصیرت اور سیاسی تدبر بے مثال تھا۔ اس منصوبے کی تین شقیں تھیں : اوّلاً، مسلمانوں کو عسکری تربیت دینا۔ ثانیاً، قریش کی ترہیب و ترغیب اور ثالثاً، اپنے دفاعی حصار کی توسیع۔ (الف) عسکری تربیت سے متعلّق تو گفتگو ہو چکی ہے، اب دوسری دو شقوں سے مختصراً بحث کی جاتی ہے : (ب) پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم نے قریش کو بساطِ سیاست پر شہ دینے کی خاطر (تاکہ وہ فوری طور سے کوئی جارحانہ کارروائی نہ کر سکیں) بروقت یہ چال چلی کہ ان کی تجارتی شاہراہ کے علاقوں میں فوجی گشتی دستے بھیجنے شروع کر دیے۔ اس کارروائی سے تین فوائد حاصل کرنا مقصُود تھے : اوّل، اپنی طاقت کے مظاہرے سے قریش کو خوفزدہ اور مرعوب کرنا اور انھیں یہ جتانا کہ مسلمانوں میں نہ صرف دفاعی بلکہ جارحانہ قوّت بھی ہے جس کے ذریعے وہ ان کی تجارتی شاہراہ کی ناکہ بندی کر کے ان کی معیشت پر کاری ضرب لگا سکتے ہیں۔ دوم، ان علاقوں کے جغرافیائی و سیاسی حالات اور عسکری نوعیت کی دیگر معلومات حاصل

کرنا۔ سوم، ان علاقوں کے باشندوں کی ترہیب و ترغیب بھی مقصود تھی تاکہ وہ مسلمانوں کے مفادات کے خلاف اغیار کی سازشوں میں شریک ہونے کی جرأت نہ کرسکیں۔

تاریخ میں ایسی تین مہموں کا ذکر ملتا ہے، جنھیں سرایا کا نام دیا گیا ہے، ان سے مختصراً گفتگو کی جاتی ہے :

(۱) مہم حضرت حمزہؓ (رمضان المبارک ۱ھ / مارچ ۶۶۲۳) :

اسے سریۂ حمزہؓ، سریۂ عیص یا سریۂ سیف البحر بھی کہتے ہیں۔ یہ مہم تیس مجاہدین پر مشتمل تھی۔ آپؐ نے اس مہم کے لیے اپنا فوجی نشان تیار کرایا، جس کا رنگ سفید تھا، اور حضرت حمزہؓ کو اس مہم کا قائد بناکر، رمضان المبارک ۱ھ / مارچ ۶۲۳ء میں، عیص کی طرف بھیجا، جہاں سے قریش کا تجارتی قافلہ گزرنے والا تھا، یہ قافلہ تین سو اونٹوں پر مشتمل تھا اور امیرِ کارواں ابوجہل تھا۔ مسلمان ایک تو تعداد میں صرف تیس تھے، دوسرے وہ جارحانہ کارروائی کرنے کے مجاز نہ تھے۔ انھیں تو فقط اپنی قوت و جرأت کا مظاہرہ کرنا تھا، اور انھوں نے بڑی کامیابی سے ایسا کیا۔ وہ کارواں کو روکنے میں کامیاب ہوگئے۔ ابوجہل بھی تجارتی سامان (جس پر ان کی معیشت منحصر تھی) کے نقصان کے اندیشے سے تصادم سے بچنا چاہتا تھا، لہٰذا اس نے اس علاقے کے سردار اور قریش کے حلیف مجدی بن عمرو کو بیچ میں ڈالا۔ معاملہ رفع دفع ہونا تھا، اور ہوگیا۔

(۲) مہم حضرت عبیدہؓ بن حارث (شوال ۱ھ / اپریل ۶۶۲۳) :

اسے سریۂ عبیدہ بن حارثؓ اور سریۂ رابغ بھی کہتے ہیں۔ حضرت عبیدہ بن حارثؓ کے گشتی دستے میں زیادہ سے زیادہ اسّی مہاجر مجاہدین تھے۔ آپؐ نے ان کو شوال ۱ھ / اپریل ۶۲۳ء میں رابغ روانہ کیا، لیکن راستے میں ہی ثنیۃ المرۃ کے مقام پر اس کا آمنا سامنا قریش کے کارواں سے ہوا۔ یہ کارواں دو سو افراد پر مشتمل تھا اور اس کے قائد ابوسفیان بن حرب اور عکرمہ بن ابوجہل تھے۔ چونکہ مسلمانوں کا ارادہ حملے کا نہ تھا، لہٰذا وہ دور ہی سے اپنی قوت و جرأت کا مظاہرہ کرکے لوٹ آئے۔

(۳) مہم حضرت سعد بن ابی وقاصؓ (ذلقعد ۱ھ / مئی ۶۶۲۳)

اس تیسری مہم کو سریہ سعد بن وقاصؓ، نیز سریۂ خرّار بھی کہتے ہیں۔ یہ گشتی دستہ صرف

بیس سواروں پر مشتمل تھا۔ اسے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ذلقعدہ ۱ھ / مئی ۶۶۲۳ میں حضرت سعد بن وقاصؓ کی قیادت میں خرّار بھیجا جہاں سے قریش کا کارواں گزرنے والا تھا لیکن وہ اتفاق سے ایک دن پہلے گزر گیا۔ یہ دستہ مطلوبہ معلومات حاصل کرنے کے بعد لوٹ آیا۔[۱]

ان مہموں کی اہمیّت کا اندازہ لگانے کے لیے ہمیں یہ تین باتیں پیشِ نظر رکھنی چاہئیں: ایک یہ کہ عیص، رابغ اور خرّار کے علاقے قریب تھے اور تجارتی، سیاسی اور عسکری لحاظ سے ازبس اہم۔ یہ تینوں مقام مدینے کے جنوب مغرب میں، ساحل سمندر کے قریب اس شاہراہ پر واقع ہیں جو قریش کے تجارتی قافلوں کی گزرگاہ تھی اور جس پر اہلِ مکّہ کی معیشت کا انحصار تھا۔ ان مہموں کی وجہ سے یہ شاہراہ قریش کے لیے غیر محفوظ ہوگئی۔ دوسرے ان علاقوں پر مدینے کی اسلامی مملکت کا سیاسی اثر و رسوخ بڑھ گیا، جس کے باعث اس علاقے کے لوگوں کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے اور قریش کی مؤثّر تجارتی ناکہ بندی کرنے کی راہیں ہموار ہوگئیں۔ تیسرے مدینے پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنانے کے بجائے قریش کو اپنی تجارتی ناکہ بندی کی فکر لاحق ہوگئی اور وہ اس ناکہ بندی کو توڑنے میں مصروف ہوگئے۔ اس طرح ان کی فوری جارحیت کا خطرہ ٹل گیا اور پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اپنی دفاعی قوت مضبوط و مستحکم کرنے اور مدینے کے دفاعی حصار میں خاطر خواہ توسیع کرنے کی مہلت مل گئی۔

امّ المؤمنین حضرت عائشہ صدّیقہؓ کی رخصتی (شوّال ۱ھ / اپریل ۶۶۲۳) :

زندگی اللہ تعالیٰ کی ایک انمول نعمت ہے اور اس سے فطری طریق سے زیادہ سے زیادہ لذّت و حظ، طمانیت و مسرّت اور کیف و سرور حاصل کرنا فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے۔ لہٰذا زندگی بسر کرنا بھی ایک فن ہوا اور یہ فن سیکھنا ہو تو آپؐ کی سیرتِ طیبہ کا بھرپور مطالعہ کرنا چاہیے۔

ہم آپؐ کو یثرب کے دیارِ غیر میں دشمنوں میں گھرا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ لیکن آپؐ اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی چلانے کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرے کی تشکیل و تعمیر میں مصروف ہیں۔ سرد و گرم جنگ کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ یہود و منافق سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں لگے ہوئے ہیں، لیکن آپؐ مسلمانوں کو علم و حکمت سکھاتے، معارف القرآن سے آگاہ کرتے، قرآنِ حکیم کے حوالے سے انھیں حقائقِ زندگی سے آشنا کرتے اور آدابِ زندگی سکھاتے، نیز انھیں عسکری تربیت دیتے نظر آتے ہیں۔ ان امور سے فراغت ملتی ہے تو آپؐ اِسلام کی دعوت اور

سفارتی تعلقات قائم کرنے کے سلسلے میں سفر کی صعوبتیں سہتے اور خطرات سے گزرتے دکھائی دیتے ہیں۔ رات دنیا کے لیے نیند کا پیام لے کر آتی ہے تو آپؐ بھی نیند کا لطف اُٹھاتے ہیں، لیکن اس طرح کہ آپؐ کے حواس تو سو جاتے ہیں مگر قلب جاگتا رہتا ہے۔ قلب کو نیند کیوں آئے اسے تو اپنے اِلٰہ کی حضوری کا انتظار و اشتیاق ہوتا ہے۔ اس عالم میں ڈیڑھ یا دو پہر رات گزرتی ہے تو آپؐ اُٹھ بیٹھتے ہیں اور وضو کر کے "دوست" کی بارگاہ میں پہنچ جاتے ہیں۔ اسی عالمِ حضور و سرور میں سحر ہو جاتی ہے۔

آپؐ کا کمال یہ ہے کہ شب و روز کی ان گوناگوں مصروفیتوں میں آپؐ اپنے دوستوں، اعزّہ و اقارب اور اہل و عیال میں بھی اُٹھتے بیٹھتے، بات چیت کرتے، ان کی صحبت کے مزے لیتے، بچّوں سے کھیلتے، گھر کا کام کاج کرتے، مریضوں کی تیمار داری میں حِصّہ لیتے، سماجی کاموں میں حصّہ لیتے اور احبابِ خاص کی محفلوں کو سجاتے نظر آتے ہیں۔ پھر ہم آپؐ کو گھر میں دیکھتے ہیں جہاں آپؐ ایک مثالی شوہر اور مثالی باپ کی طرح گھر کی خوشیوں کو دوبالا کرتے ہیں اور ازدواجی زندگی سے پوری طرح لطف اندوز ہوتے ہیں۔ آپؐ کی اجتماعی زندگی پر مصائب و خطرات کی گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں اور ان میں جنگ برقِ تپاں کی طرح لہرا رہی اور رعد کی طرح کڑک رہی ہے، لیکن اس عالم میں بھی آپؐ مطمئن و پُرسکون اور ہشاش بشاش نظر آتے ہیں۔ غمِ انسانیت کے کوہِ گراں کو اس خوشی سے اُٹھائے پھرتے ہیں، جیسے یہ کوئی بوجھ ہی نہ ہو۔ زندگی کی انمول نعمت سے اس طرح لطف اندوز ہوتے ہیں جس طرح انسان کو اپنی فطرت اور مشیّتِ ایزدی کے مطابق لطف اندوز ہونا چاہیے۔ ہمیں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ آپؐ بے مثال عبقریﷺ اور مردِ کامل ہیں، لہٰذا آپؐ میں تخلیقی توانائی کی بہتات ہے اور جمالیاتی حِس حد درجہ فعّال ہے۔ علاوہ بریں تحریکِ اسلام کی سیاسی مصلحتیں بھی ہیں اور ان وجوہ کی بنا پر تعددِ ازدواج کی رخصت اور "دوست" کا اشارہ بھی ہے، لہٰذا آپؐ نے اپنی منکوحہ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی رخصتی چاہی جو شوال ۱ھ / اپریل ۶۲۳ء میں عمل میں آئی۔

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ مکارمِ اخلاق اور جمالیاتی محاسن کی پیکر تھیں۔ ان کا ذوق لطیف و پاکیزہ، عقل سلیم و رسا اور فکر ارفع و اعلیٰ تھا۔ ان کی زندگی عفّت و حیا اور فراست و فقاہت کے محاسن سے مزیّن تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ مزاج دانِ رسولؐ تھیں۔ انھیں آپؐ سے والہانہ محبّت تھی۔ غرض ان میں وہ سب خوبیاں تھیں جو ایک مثالی شوہر کی مثالی

بیوی میں ہونی چاہییں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ عمر بھر آپؐ کی معروضِ محبّت رہیں۔ تحریکِ اسلام کے حوالے سے حضرت اُمّ المؤمنین کا یہ وصف وکردار یقیناً گراں قدر اور قابلِ ستائش ہے کہ بحیثیت چہیتی بیوی کے انھوں نے تحریکِ اسلام کے کاموں میں آپؐ کی دلچسپی و مشغولیت سے کبھی بُرا نہ مانا، بلکہ آپؐ سے ہر معاملے میں پورا پورا تعاون کیا، حتّٰی کہ فراقِ ابدی کے بعد بھی اس نابغۂ روزگار اُمّ المؤمنین نے تحریکِ اسلام میں بڑے ذوق و شوق سے آخر دم تک حِصّہ لیا۔

گھریلو زندگی مطمئن و مسرور ہو تو انسان کی تخلیقی قوّتیں پوری طرح نشو و ارتقاء کرتی ہیں اور تخلیقی عمل کی رفتار تیز اور جہت صالحہ رہتی ہے۔ آپؐ پر اللہ تعالیٰ کا فضل فراواں تھا کہ مکّے کی سرد جنگ، شدائد و مصائب کے دَور میں جس طرح آپؐ کی گھریلو زندگی مطمئن و مسرور تھی، اسی طرح مدینے کے پُر آشوب، جنگ و جدال، سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے عہد میں بھی تھی۔ ازدواجی زندگی کی خوشیاں مال و دولت سے نہیں، خلوص و محبّت سے ملتی ہیں۔ آپؐ تو تھے ہی پیکرِ محبّت و رحمت۔ آپؐ کی ازواجِ مطہراتؓ بھی اس رازِ مسرّت سے آشنا ہو گئی تھیں، لہٰذا اس امر کے باوجود کہ گھریلو زندگی آسائشوں ہی سے نہیں، بنیادی ضرورتوں سے بھی محروم تھی، گھر طمانیت و مسرّت کا بہشت تھا اور آپؐ پوری دلجمعی اور انہماک کے ساتھ اپنے مشن کی تکمیل میں سرگرمِ عمل رہتے تھے۔

مسلّح جہاد کی اجازت : (۱۲/ صفر ۲ھ / ۱۵/ اگست ۶۲۳ء)

مکّہ معظمہ میں قریش مسلمانوں کو اپنا دشمن نہیں سمجھتے تھے، وہ ان پر آبائی دین سے اعتزال کی بنا پر ظلم کرتے تھے۔ پھر جب ہجرتِ حبشہ ہوئی تو اس اندیشے سے کہ کہیں تحریکِ اسلام آزاد فضا میسّر آنے پر نشو و نما نہ پا جائے، انھوں نے مسلمانوں پر ہجرت کرنے کی پابندی لگادی۔ مکّے میں مسلمانوں کی سیاسی یا دینی کوئی حیثیت نہ تھی۔ انھیں ابھی قومی تشخّص حاصل نہیں ہوا تھا، پھر وہ تعداد میں انتہائی قلیل اور بے سر و سامان تھے۔ لہٰذا اہلِ مکّہ انھیں سیاسی طور سے اپنے لیے خطرناک نہ سمجھتے تھے، لیکن مدینے میں آنے کے بعد مسلمانوں کی حیثیت بالکل بدل چکی تھی۔ انھوں نے اب دینی، سیاسی، ملّی اور ملکی تشخّص حاصل کر لیا تھا اور قریش سے الگ ایک آزاد اور خود مختار حکمران قوم بن گئے تھے۔ علاوہ بریں، دیگر قبائل کے ساتھ سیاسی تعلّقات اور دفاعی معاہدات کی وجہ سے وہ اب ایسی قوّت کے طور پر اُبھرے تھے، جو نہ صرف قریش بلکہ یہود و نصاریٰ

سمیت عرب کے تمام غیر مُسلم قبائل کے لیے خطرہ بن سکتی تھی۔ چنانچہ اس بنا پر ان تمام اسلام دشمن جنگجو قوتوں کا دشمن بن جانا ایک فطری امر تھا' اور مسلمانوں کو ان کی جارحیت سے محفوظ رکھنے کا اہتمام کرنا اور جارحیت کی صورت میں ان سے نبرد آزما ہونا ناگزیر تھا' جسے اصطلاح میں "جہاد" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تحفظِ ملّت و اسلام کی خاطر جب مسلّح جہاد ناگزیر ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مشروط جہاد کی اجازت دے دی۔ مشروط جہاد سے مراد دفاعی جنگ ہے' یعنی مسلمانوں کو ان لوگوں سے اسلامی اصولوں کے مطابق' جنگ کرنے کی اجازت دی گئی جو ان سے لڑتے تھے، جیساکہ آیات قرآنی سے ثابت ہے مثلاً " اور جو لوگ تم سے لڑتے ہیں' تم بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں ان سے لڑو، مگر زیادتی نہ کرنا کہ اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔[۱۳]"

یہ حکم جہاد دو باتوں سے مشروط ہے : ایک یہ کہ مسلّح جہاد دفاعی ہونا چاہیے اور دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہونا چاہیے' جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کے احکام کے مطابق ظالموں کے خلاف حق و صداقت، دین و ملّت اور ملک کے دفاع کی خاطر ہو۔ سُورۃ الحج میں حکم جہاد کے ساتھ اس کے جواز کی توجیہہ بھی کر دی گئی ہے:

"جن (مومنوں) کے خلاف (ظالموں نے) جنگ کر رکھی ہے' اب انھیں بھی (اس کے جواب میں جنگ کی) اجازت دی جاتی ہے' کیونکہ ان پر سراسر ظلم ہو رہا ہے' اور اللہ ان کی مدد کرنے پر ضرور قادر ہے۔ (یہ وہ مظلوم ہیں) جو ناحق اپنے گھروں سے نکال دیے گئے۔ (ان کا کوئی جرم نہ تھا۔ اگر تھا تو صرف یہ کہ) وہ کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار و آقا' اللہ ہے۔ اور (دیکھو!) اگر اللہ بعض لوگوں کے ہاتھوں بعض لوگوں کی مدافعت نہ کرتا' اور ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر ظلم و تشدّد کرنے کے لیے بے روک چھوڑ دیتا تو (کسی قوم کی عبادت گاہ زمین پر محفوظ نہ رہتی)' خانقاہیں، گرجے، عبادت گاہیں اور مسجدیں' جن میں کثرت سے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے، ڈھا دیے جاتے۔ (یاد رکھو!) جو کوئی اللہ کی حمایت کرے گا' اللہ اس کی حمایت کرے گا۔ بلاشبہ اللہ قوت رکھنے والا اور سب پر غالب ہے۔"[۱۴]

بالاتّفاق یہ پہلی آیت ہے جو اذنِ قتال یا جہاد کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کے نزول کی تاریخ ۱۲ صفر ۲ھ / اگست ۶۲۳ء بتائی جاتی ہے۔[۱۵]

محوّلہ بالا آیات دراصل فلسفۂ جہاد کی آئینہ دار ہیں، جس کی مجملاً صراحت کی جاتی ہے :

جہاد قدرت کا تاریخی عمل ہے' جو دنیا میں انسان کی دینی و مذہبی آزادی' مختلف اقوام و ملل کی عبادت گاہوں کی حفاظت اور امن و سلامتی کی خاطر شریر و استحصالی قوتوں کے خلاف جاری و ساری رہتا ہے۔ یہ دراصل ظلم و استحصال اور باطل کے خلاف فطرتِ انسانی کا ردِّعمل ہے' جو معاشرۂ انسانی کے امن اور طمانیتِ قلب کی ایک ناگزیر پیش شرط ہے۔

قرآن مجید کی رو سے خلافتِ اسلامیہ کا درجہ اس دنیا میں اقوامِ متحدہ ایسا ہے جس پر دُنیا میں امن و سلامتی برقرار رکھنے کی ذمّے داری ہے' اور جو قوم بھی اس ذمّے داری کو پورا کرنے کی راہ میں حائل ہو' اسے ترغیب و ترہیب یا طاقت سے ہٹانا' انسانیت کے بہترین مفاد میں ہوتا ہے۔ اس سے اس امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کیوں مسلمانوں پر جہاد فرض کیا ہے۔

مدینے کے دفاعی حصار میں توسیع اور قریش کی اقتصادی ناکہ بندی کرنے کی کوششیں :

آپؐ عبقری و مثالی حکمران' مدبّر اور ماہرِ حربیّات تھے۔ چنانچہ آپؐ کی نظر عرب کے سیاسی و عسکری احوال و ظروف پر رہتی تھی' نیز آپؐ تاریخ کی روش اور تیور بھی پہچانتے تھے اور ان کے مطابق کارروائی کرنا آپؐ کا شیوہ تھا۔ اب وقت کے دو تقاضے تھے : ایک یہ کہ مدینے کے نواحی علاقوں کے قبائل سے دفاعی معاہدے کر کے مدینے کے دفاعی حصار کو مضبوط و محکم اور وسیع بنایا جائے۔ دوسرے یہ کہ قریش کی اقتصادی ناکہ بندی کر کے ان پر معاشی دباؤ ڈالا جائے۔

آپؐ کی پہلی مُہم یا غـزوۂ ابوا :

چنانچہ آپؐ نے اس دُہرے مقصد کے حصُول کی خاطر مہمات کا آغاز کیا' اور سب سے پہلی مہم کی قیادت خود فرمائی۔ صفر ۲ ہجری / اگست ۶۲۳ء میں آپؐ نے مدینے میں حضرت سعد بن عبادہؓ کو اپنا قائم مقام مقرر فرمایا اور خود ستّر صحابۂ کرامؓ کے ہمراہ پہلے ودّان اور پھر ابوا تشریف لے گئے، جو قریش کی تجارتی شاہراہ پر ایک اہم کاروانی منزل تھی۔ یہ دونوں مقام ضلع فرع میں واقع ہیں اور ان کے درمیان تقریباً سات آٹھ میل کا فاصلہ ہے۔ اس مہم کو اسی لیے غزوۂ ابوا بھی کہتے ہیں اور غزوۂ ودّان بھی۔ ابوا ہی وہ مقام ہے جہاں آپؐ کی والدۂ ماجدہ حضرت آمنہ نے وفات پائی تھی اور وہیں دفن ہوئی تھیں۔ یہاں آپؐ نے قیام

فرمایا اور اردگرد کے قبائل سے رابطہ قائم کیا، انھیں دعوتِ اسلام دی، نیز سفارتی تعلقات قائم کرنے اور دفاعی معاہدات کرنے کی کوششیں کیں۔ چنانچہ آپؐ بنی ضمرہ بن عبد مناف سے دفاعی یا حلیفی معاہدہ کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس معاہدے پر بنی ضمرہ کے رئیس مخشی بن عمرو نے دستخط کیے تھے۔ معاہدہ یہ تھا :

(۱) بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ (۲) یہ ایک تحریر ہے رسول اللہؐ کی طرف سے بنی ضمرہ کے لیے (۳) اس بات پر کہ انھیں ان کے مال و جان پر امن ہے (یعنی ان کا جان و مال محفوظ رہے گا) (۴) اور جو کوئی ان پر ظلم سے اچانک دھاوا بولے گا، اس کے مقابلے میں ان (بنی ضمرہ) کی مدد کی جائے گی (۵) نیز ان پر ضروری ہے کہ وہ نبیؐ کی مدد اس وقت تک کریں جب تک سمندر صدف کو گیلا کرتا رہے گا، بجز اس کے کہ اللہ کے دین کے بارے میں لڑیں (یا ان سے جنگ کی جائے) (۶) اس بارے میں ان پر اللہ اور اس کے رسولؐ کا ذمہ ہے۔ (۷) انھیں مدد اس شرط پر دی جائے گی کہ وہ وعدہ وفا کرتے رہیں اور (عہد شکنی و بے وفائی وغیرہ سے) بچتے رہیں۔[16]

محدثین نے آپؐ کی اس اوّلین مہم کو اوّل الغزوات قرار دیا ہے۔[17] یہ معاہدہ آپؐ کے حسنِ تدبّر اور عدل گستری کا آئینہ دار ہے۔ اس سے مدینے کے دفاعی حصار کو مضبوط و محکم بنانے اور وسیع کرنے، نیز قریش کی اقتصادی ناکہ بندی کرنے میں بڑی مدد ملی۔ اس جگہ ایک لطیف نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے۔ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم نے قبائل کے ساتھ جو معاہدات کیے اور قیصر و کسریٰ نیز دیگر حکمرانوں کو جو مکتوبات ارسال فرمائے، ان میں آپؐ اپنا اسمِ مبارک (محمدؐ) یا رسالتی منصب (رسول اللہؐ یا نبیؐ) پہلے لکھواتے تھے اور بعد میں فریقِ ثانی یا مکتوب الیہ کا نام و منصب۔ زمانے کا دستور یہ تھا کہ جو شخص بڑے رتبے اور منصب پر فائز ہوتا، وہ اپنا نام و منصب پہلے لکھواتا تھا۔ آپؐ چونکہ اللہ تعالیٰ کے سچے نبی اور سرورِ کونین تھے، لہٰذا زمانے کے دستور اور حق کا تقاضا یہی تھا کہ آپؐ اپنا اسمِ مبارک یا منصب دونوں پہلے لکھواتے۔ اگرچہ متکبر و سرکش بادشاہوں اور حکمرانوں پر یہ بات شاق گزری، لیکن تاریخ نے بہت جلد فیصلہ دے دیا کہ آپؐ ایسا لکھوانے میں حق بجانب تھے، کیونکہ بحیثیتِ پیغمبر آپؐ سید المرسلین، باعتبارِ حکومت و قوت افضل الملوک اور بحیثیتِ انسان آپؐ خیر البشر اور مثالی انسان تھے۔

بواط کی مہم یا غزوۂ بواط : (ربیع الآخر ۲ھ / اکتوبر ۶۲۳ء):

یہ غالباً قریش کی تجارت کا موسم تھا۔ آپؐ مذکورہ مہمیں روانہ کر کے فارغ ہی ہوئے تھے کہ قریش کے ایک اور تجارتی قافلے کی آمد کی اطلاع ملی۔ اس قافلے میں تجارتی سامان سے لدے ہوئے ڈھائی ہزار اُونٹ تھے اور حفاظت کے لیے ایک سو قریش تھے جن کی قیادت اُمیہ بن خلف الجمحی کر رہا تھا۔ آپؐ نے فوراً حضرت سائب بن عثمان بن مظعونؓ کو مدینے میں اپنا قائم مقام مقرر کیا اور خود دو سو مجاہدین کو لے کر بواط پہنچے، لیکن کارواں ہاتھ نہ آیا۔[18] غالباً قریش کو آپؐ کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔

کرز بن جابر الفہری کا حملہ یا سفوان کی مہم یا غزوۂ بدرِ اُولیٰ : (ربیع الآخر ۲ھ / اکتوبر ۶۲۳ء):

مسلمانوں کی ان مہموں سے قریش کی تجارتی شاہراہ خطرے میں پڑ چکی تھی اور انھیں اپنے تجارتی قافلوں کے لُٹ جانے کا اندیشہ بھی لاحق ہوگیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کو مرعوب کرنے اور سرد جنگ میں مبتلا کرنے کی غرض سے جوابی کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا اور کرز بن جابر الفہری کو، جو رؤسائے مکہ میں سے تھا، ایک فوجی دستے کے ساتھ مدینے بھیجا۔ اس نے منصوبے کے مطابق مدینے کے مضافات میں مسلمانوں کی سرکاری چراگاہ پر حملہ کیا اور مویشیوں کو بھگا کر لے گیا۔ اطلاع ملتے ہی آپؐ نے زید بن حارثہؓ کو مدینے میں اپنا قائم مقام مقرر کیا اور ستر مجاہدوں کے ساتھ قریش کے تعاقب میں نکلے۔ آپؐ نے بدر کے قریب وادی سفوان تک ان کا تعاقب کیا مگر وہ ہاتھ نہ آئے۔[19]

عُشیرہ کی مہم یا غزوۂ عُشیرہ : (جمادی الاول ۲ھ / نومبر ۶۲۳ء)

تصادم کے بعد انقلابی تحریک مسلسل اقدامات چاہتی ہے۔ چنانچہ ایک طرف آپؐ یثرب کے قبائل کے ساتھ دفاعی معاہدے کرتے نظر آتے ہیں تو دوسری جانب قریش کے مدینے پر متوقع حملے کی تیاریوں میں فوجی مشقیں کرتے دکھائی دیتے ہیں جن کا ایک مقصد قریش کو معاشی محاذ پر شکست دینا تھا۔ آپؐ ایک مہم سے فارغ نہ ہو پاتے تھے کہ دوسری مہم کی تیاری شروع ہو جاتی تھی۔ چنانچہ جمادی الاولیٰ یا جمادی الآخر میں آپؐ کو پھر قریش کے ایک تجارتی کارواں کی

آمد کی اطلاع ملی، جو مکے سے شام جارہا تھا۔ آپؐ نے حسبِ معمول مدینے میں اپنا قائم مقام مقرر کیا (اس دفعہ یہ سعادت حضرت ابوسلمہ بن عبد الاسد المخزومیؓ کے حصے میں آئی) اور خود ڈیڑھ سو مہاجرین پر مشتمل فوجی دستہ لے کر تیزی کے ساتھ عُشیرہ پہنچے، جہاں قریش کے تجارتی کارواں نے پڑاؤ کرنا تھا۔ قریش کو مسلمانوں کے متوقع حملے کا خطرہ تھا اور شاید انھیں آپؐ کی آمد کی اطلاع بھی مل گئی ہو، لہٰذا وہ برق رفتاری سے وہاں سے کوچ کر گئے۔ آپؐ نے نواحی قبائل کو دعوتِ اسلام دینے اور ان سے دفاعی معاہدہ کرنے کی خاطر عُشیرہ میں چند روز قیام کیا۔ عُشیرہ جو قریش کی تجارتی شاہراہ پر ایک کاروانی پڑاؤ تھا، مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کے درمیان بندرگاہ ینبوع کے قریب واقع ہے۔ آپؐ وہاں کے باشندوں، بنومدلج سے دفاعی معاہدہ کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ چونکہ یہ قبیلہ مسلمانوں کے حلیف بنوضمرہ کا حلیف تھا، اس لیے معاہدہ انہی شرائط پر ہوا جو بنوضمرہ سے طے پائی تھیں۔[۲۰]

حضرت عبداللہ بن جحشؓ کی مہم یا سریۂ نخلہ (رجب ۲ھ / جنوری ۶۲۴ء) یا غزوۂ بدر کا فوری سبب :

قریش کو کاروانی تجارت کرتے اور خطرناک راستوں اور رہزنی و غارت گری کے تجربات سے گزرتے صدیاں بیت گئی تھیں، لہٰذا وہ بے حد محتاط، دُور اندیش اور عیار و تجربہ کار ہو چکے تھے، نیز حالات کے تیور پہچاننے اور خطرناک سے خطرناک صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کی ان میں قابلیت پیدا ہوگئی تھی۔ چنانچہ جب شام سے ان کا بہت بڑا تجارتی قافلہ روانہ ہوا تو قافلہ سالار ابوسفیان نے شاہراہ کی صورتِ حال کا اندازہ لگانے کی خاطر اپنے آگے یقیناً جاسوس بھیجے ہوں گے۔ بہرحال قریش کا بڑا قافلہ عرب کی حدود میں داخل ہوا تو آپؐ کو بھی براہِ راست اس کی اطلاع مل گئی۔ یہی وہ قافلہ تھا جس کا آپؐ کو انتظار تھا، اور جس کے سامانِ تجارت کو مالِ غنیمت بنا لینے سے قریش کی معیشت اور اس کے باعث ان کی جارحانہ قوت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا جا سکتا تھا۔ آپؐ کو براہِ راست اطلاعات پہنچانا آپؐ کے جاسوسی نظام کا دستور تھا اور انھیں اپنے ہی تک محدود اور صیغۂ راز میں رکھنا آپؐ کا اصول و معمول تھا۔ یہ اطلاع جس قدر اہم تھی، اسی قدر آپؐ نے راز داری سے کام لیا۔ چنانچہ آپؐ نے جو جماعت اس قافلے کی نقل و حرکت کے متعلق ضروری معلومات حاصل کرنے کی

غرض سے منتخب کی، اسے بھی اس راز سے آگاہ نہ کیا۔ یہ جماعت آٹھ یا بارہ مجاہدین پر مشتمل تھی جن کے سالار حضرت عبداللہ بن جحشؓ تھے۔ آپؐ نے انھیں رخصت کرتے وقت سفر کی سمت تو بتادی لیکن مہم کی غرض و غایت نہ بتائی، البتہ ایک بند لفافہ دیا کہ اسے دو دن کی مسافت کے بعد کھول کر پڑھنا اور اس میں مندرجہ ہدایات پر عمل کرنا۔ دو دن کے بعد حضرت عبداللہؓ نے لفافہ پڑھا تو اس میں لکھا تھا : نخلہ جاؤ اور وہاں قریش کی کارروائیوں یا ان کے قافلے کی نقل و حرکت کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کرو اور بلا تاخیر مجھے پہنچاؤ اور ساتھیوں میں سے کسی کو اس کی مرضی کے خلاف عمل کرنے پر مجبور نہ کرنا۔

ہدایت کے مطابق حضرت عبداللہ بن جحشؓ نے مجاہدین کو اس خطرناک مہم پر چلنے یا نہ چلنے کا اختیار دے دیا، لیکن سب نے شوقِ شہادت کا اظہار کیا اور یہ جماعت نخلہ روانہ ہوگئی جو مدینے اور طائف کے درمیان ہے۔ اثنائے راہ میں حضرت سعد بن وقاصؓ اور حضرت عتبہ بن غزوانؓ کا اونٹ گم ہوگیا اور وہ اس کی تلاش میں پیچھے رہ گئے اور جب اونٹ ملا تو وہ خود نخلہ کا راستہ بھول گئے اور ساتھیوں سے مِل نہ سکے۔

مجاہدین کی یہ جماعت نخلہ پہنچی تو شام کے وقت ان کی قریش کے ایک چھوٹے سے قافلے سے مٹھ بھیڑ ہوگئی۔ اس میں چار اشخاص تھے : عمرو بن الحضرمی، نوفل بن عبداللہ، عثمان بن عبداللہ (جو عبداللہ بن المغیرہ کے بیٹے تھے) اور الحکم بن کیسان (بنی مغیرہ کا مولیٰ)۔ حضرت عبداللہ بن جحشؓ کے نزدیک قریش سے ان کے ظلم و ستم کا بدلہ لینے اور زک پہنچانے کا یہ نادر موقع تھا، پھر مالِ غنیمت کا لالچ بھی تھا۔ لالچ اور جذبۂ انتقام سے مغلوب ہو کر مجاہدین اپنا مشن بھول گئے اور انھیں ماہ الحرام کا بھی دھیان نہ رہا۔ انھوں نے قافلے پر حملہ کر دیا۔ حضرت واقد بن عبداللہ تمیمی نے تیر مار کر عمرو بن الحضرمی کو ہلاک کر دیا، باقی تین اشخاص بھاگ اُٹھے لیکن نوفل بن عبداللہ کے سوا باقی دونوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ مسلمانوں نے ان کے سامان تجارت پر قبضہ کر لیا۔ حضرت عبداللہ بن جحشؓ نے غالباً رواج کے مطابق مالِ غنیمت میں سے آپؐ کے لیے خُمس نکال کر باقی آپس میں تقسیم کر لیا اور اپنے مشن کی پروا کیے بغیر مدینے لوٹ گئے۔ یہاں آ کر آپؐ سے یہ واقعہ بیان کیا اور خُمس بھی آپؐ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپؐ نے ان کے اس اقدام کو سخت ناپسند فرمایا اور خُمس لینے سے بھی انکار کر دیا۔ اس کی چار بڑی وجوہ تھیں : ایک یہ کہ آپؐ نے یہ مہم اس غرض کے لیے نہیں بلکہ قریش کے بڑے تجارتی قافلے کی نقل و حرکت کے

بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے بھیجی تھی، لہٰذا حضرت عبداللہ بن جحشؓ کا یہ اقدام عسکری اصولِ انضباط یا ڈسپلن کے خلاف تھا۔ دُوسرے قتل و غارت کا یہ واقعہ حُرمت کے مہینے میں ہوا تھا۔ علاوہ بریں اس نے قریش کو مسلمانوں کے خلاف معاندانہ پراپیگنڈا کرنے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ تیسرے اس اقدام سے اس مہم کا مقصد فوت ہو گیا اور قریش کے بڑے قافلے کو بچ نکلنے کا موقع مل گیا، اور چوتھے یہ کہ آپؐ جانتے تھے کہ عمرو بن الحضرمی کے قتل کی وجہ سے قریش کے جذبات کو سخت ٹھیس لگے گی اور "ثار" یا انتقامِ خون کے نام پر ان کے لیے مسلمانوں پر حملہ کرنا ناگزیر ہو جائے گا۔

حرمت کے مہینے میں قتل و غارت کے اس واقعے کو قریش نے مکّہ میں اور یہود و منافقین نے مدینے میں خوب اُچھالا اور مسلمانوں کو بدنام کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ وہ ہر جگہ یہ کہتے پھرتے تھے کہ مسلمان اپنے آپ کو متقی و صالح کہتے ہیں اور حال یہ ہے کہ حُرمت کے مہینے میں قتل و غارت گری سے نہیں چُوکتے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم بھی اس واقعہ سے سخت رنجیدہ و کبیدہ خاطر رہتے تھے اور آپؐ نے مالِ غنیمت کی تقسیم اور قیدیوں کا معاملہ معرضِ التوا میں ڈال رکھا تھا۔ آپؐ کو اس معاملے میں وحی کا انتظار تھا اور وحی آئی، جس میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ سے فرمایا:

"اے پیغمبرؐ! لوگ ماہِ حرام کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ اس میں لڑائی کرنا کیسا ہے؟ کہہ دو کہ اس میں لڑنا بڑی بُری بات ہے، مگر (یہ بھی یاد رہے کہ) لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکنا اور اللہ کا انکار کرنا اور مسجد حرام میں جانے نہ دینا، نیز وہاں کے باشندوں کو وہاں سے نکال دینا اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ بُرا ہے اور فتنہ قتل سے بھی بڑھ کر ہے۔"[۲۱]

اس وحی و تنزیل کے بعد آپؐ نے بیت المال کے لیے خُمس قبول کر لیا اور باقی مالِ غنیمت تقسیم کر دیا۔ پھر جب حضرت سعدؓ اور حضرت عتبہؓ جو جماعت سے بچھڑ گئے تھے، مدینے پہنچے تو آپؐ نے فدیہ لے کر دونوں قیدیوں کو رہا کر دیا۔ ان میں سے عثمان بن عبداللہ مکّے چلا گیا اور حالتِ کفر میں مرا، لیکن حکم بن کیسانؓ اسلام لا کر تحریکِ اسلام میں شامل ہو گئے اور مدینے ہی میں رہے اور بیر معونہ کے واقعے میں شہادت پائی۔[۲۲]

تحریکِ اسلام انتہائی مخدوش حالات سے گزر رہی تھی، اور اسے ابھی انقلاب کے بہت سے صبر آزما امتحانوں میں سے گزرنا تھا۔ ایک طرف معاشرے کی تعمیر کا اور دوسری جانب دفاعی تیاریوں کا کام جاری تھا، کیونکہ آپؐ کو قریش کے مدینے پر حملے کے منصوبے کی اطلاع مل چکی تھی۔ مدینے کے اندر یہود و منافقین ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے اور آپؐ ان پر کڑی نظر

رکھے ہوئے تھے۔ یہ حالات تھے کہ تحویلِ کعبہ کا واقعہ پیش آیا، جس نے یہود کو مایوس و برافروختہ کر دیا۔ ان کی مایوسی و برافروختگی کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کو اپنے اندر جذب کر لینے کی آس لگائے بیٹھے تھے۔ ان کی اس آس کی بنیاد یہ تھی کہ مسلمان یہود کے انبیاؑ و رُسلؑ اور کتب و صحائف پر ایمان رکھتے تھے، ان کا ذبیحہ کھاتے، ان کی عورتوں سے نکاح کرتے اور ان سے معاشرتی تعلقات قائم رکھنے کو جائز سمجھتے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کا قبلہ بھی یہود ہی کا قبلہ تھا۔ اصل یہ ہے کہ تحویلِ قبلہ کا واقعہ تاریخِ اسلام کے اہم واقعات میں سے ہے اور اس کی اہمیت اس سے بہت زیادہ ہے جو عام طور پر اسے دی جاتی ہے، لہٰذا اس سے قدرے تفصیل سے گفتگو کی جاتی ہے۔

تحویلِ قبلہ (شعبان ۲ھ/جنوری، فروری ۶۲۴ء):

ملّتِ اسلامیہ اور اسلامی معاشرے کی تشکیل کے حوالے سے تحویلِ قبلہ ایک تاریخ ساز واقعہ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس واقعے نے مسلمانوں کو اہلِ کتاب سے متمائز کرنے اور پھر ان میں مرکزیت نیز ثقافتی انفرادیت اور ملّی تشخص پیدا کرنے میں ازبس اہم کردار ادا کیا ہے۔

ہجرت سے پہلے مکّے میں مسلمانوں کی حیثیت ایک کمزور سے انقلابی گروہ کی تھی جو قریش کی نظروں میں دینی و سیاسی لحاظ سے باغی تھے، اس لیے ان پر مظالم توڑے جاتے تھے۔ انھیں دعوتِ اسلام دینے اور آزادانہ طور سے رسومِ عبادت ادا کرنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ نقلِ مکانی کرنے کے بھی مجاز نہ تھے، لہٰذا وہ اپنی سرگرمیاں زیرِ زمین جاری رکھنے پر مجبور تھے۔ ان حالات میں مسلمانوں کو اپنی ملّی و معاشرتی زندگی کی تشکیل کرنے کا قطعاً موقع نہ ملا تھا۔ پھر بھی اُنھوں نے اپنی دینی و ملّی حیثیت کو مکّے کی مشرک و بُت پرست قوم سے جس کا قبلہ کعبہ تھا، متمائز کرنے کی خاطر اپنا قبلہ بیت المقدس بنایا تھا اور یہ قومی و سیاسی لحاظ سے ازبس اہم فیصلہ تھا۔

کسی جماعت، گروہ یا معاشرے کے افراد میں قومیت اور اتحاد و ائتلاف تین چیزوں سے پیدا ہوتے ہیں: مرکزیت، قومی تشخّص اور شعورِ تشخّص۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ انتہائی نامساعد حالات میں بھی آپؐ نے مسلمانوں میں اپنی الگ اور منفرد قومی حیثیت کا شعور پیدا کرنے کی خاطر قریش سے علیحدہ اپنا قبلہ منتخب کیا تھا، لیکن مدینے میں دینی و سیاسی حالات مختلف نوعیت کے تھے۔

یہاں مسلمان ایک تو سیاسی و دینی اعتبار سے خود مختار و آزاد تھے اور دوسرے یثرب میں یہود ان کے دینی و ثقافتی اعتبار سے صحیح معنوں میں حریف تھے، کیونکہ وہ سیاسی، معاشی، ثقافتی ہر لحاظ سے مشرک و بت پرست قبائل پر فوقیت رکھتے تھے۔ علاوہ بریں وہ اہلِ کتاب تھے اور ان کے انبیآاور کتبِ سماوی کی تصدیق اسلام کرتا تھا، لہٰذا مسلمانوں کو ان سے علیٰحدہ اور مُمیّز کرنے کی خاطر ان میں مرکزیت اور ملّی تشخص پیدا کرنا ناگزیر تھا اور اس کے لیے مسلمانوں کا اپنا الگ و جُداگانہ قبلہ ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ آپؐ یہود کے قبلے بیت المقدس کے بجائے کعبے کو مسلمانوں کا قبلہ بنانے کے آرزومند تھے اور آپؐ کی یہ آرزومندی درحقیقت ربِّ کعبہ کی مشیت تھی۔ ہجرت کے تقریباً اٹھارہ ماہ بعد، شعبان ۲ ہجری میں، آپؐ کی یہ آرزو پوری ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی آپؐ کو تحویلِ کعبہ کی اجازت مرحمت فرمائی۔[۲۳]

تحویلِ قبلہ کا واقعہ یہود کے لیے بھی غیر معمولی اہمیت کا حامل تھا۔ ایک تو وہ نسلی اعتبار سے بڑے ذہین، زیرک اور عیّار قوم تھے، دوسرے عرب کے سیاسی و جغرافیائی ماحول میں رہتے تھے۔ ان کی سیاسی حس بہت تیز ہوگئی تھی، لہٰذا مسلمانوں نے بیت المقدس کے بجائے کعبہ کو اپنا قبلہ بنایا تو انھوں نے فوراً بھانپ لیا کہ مسلمانوں میں جذبۂ قومیت اور قومی تشخص کا شعور پیدا ہو گیا ہے، اور وہ آگے چل کر ان کے خطرناک حریف ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہ صورتِ حال ان کے لیے بڑی تشویشناک تھی۔ چنانچہ وہ تحریکِ اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہو گئے اور اپنی قومی روایات کے مطابق منافقت و سازش سے کام لینا شروع کر دیا۔ سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں یہود کی منافقانہ چالوں، سازشوں اور عہدنامے کی خلاف ورزیوں کا بکثرت ذکر ملتا ہے۔

وہ یہودی جو منافقانہ منصوبے کے تحت تحریکِ اسلام میں شامل ہو گئے تھے، ان پر تحویلِ قبلہ بہت ہی شاق گزری، کیونکہ انھیں اپنے اسرائیلی تشخّص سے دست بردار ہو کر نیا ملّی تشخّص قبول کرنا گوارا نہ تھا۔ چنانچہ وہ اپنے جذبات قابو نہ رکھ سکے اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنے بغض و عناد کا برملا اظہار کرنے لگے۔ اس طرح ان کی منافقت آشکارا ہو گئی۔[۲۴]

مسلمانوں کے لیے یہ انتہائی نازک دَور تھا۔ گھر کے اندر یہود سازشوں کا جال بچھا رہے تھے اور منافقوں کو مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیوں پر اکسانے میں بڑی سرگرمی دکھانے لگے تھے اور باہر سے قریش کی جنگی تیاریوں کی اطلاعیں مسلسل مل رہی تھیں۔ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کو ان دونوں محاذوں پر دشمنوں سے نمٹنا تھا اور اس کے لیے انصار کو پہلی مرتبہ ایک

شکیب رُبا امتحان میں ڈالنا، ان کا ردِّ عمل معلوم کرنا اور قریش کے مقابلے میں میدانِ جنگ میں لانا تھا۔ حالات نامساعد خطرناک اور صبر آزما تھے، لیکن آپؐ نہ تو مضطرب و مایوس ہوئے اور نہ ہوش و حواس اور عزم و ہمّت نے آپؐ کا ساتھ چھوڑا۔ آپؐ ہمیشہ کی طرح صبر و استقامت اور ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ اس خطرناک صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کی فکر کرتے اور منصوبہ بناتے رہے، یہاں تک کہ جنگِ بدر کا واقعہ پیش آیا۔

رمضان المبارک کے روزوں کی فرضیّت (اواخر شعبان ۲ھ / اواخر فروری ۶۲۴ء) :

جنگِ بدر اصل میں امتحانِ عشق و وفا تھا۔ اس امتحان سے تقریباً تین ہفتے پہلے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر روزے فرض کر دیے تاکہ ان میں ضبطِ نفس کی قوت اور تقویٰ نشو و ارتقا کرتا رہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، تم پر روزے فرض کر دیے گئے، جس طرح تم سے پہلے انبیآئے کے پیرووں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو۔"[۲۵]

اس آیت قرآنی میں یہ نکتہ مضمر ہے کہ روزہ ایک لازمی عبادت ہے جو ہمیشہ سے لازمی رہی ہے، کیونکہ اس سے انسان میں اللہ تعالیٰ کی محبت و خشیّت، حق کی آرزو و تلاش اور ضبطِ نفس کی صفت پیدا ہوتی ہے۔ اس سے مستنبط ہوا کہ جہاد اور روزے میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اصل یہ ہے کہ روزہ عسکری تربیت کا ایک لازمی حِصّہ ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو میدانِ جنگ میں لانے سے پہلے ان سے روزے رکھوا کر ان کی عسکری تربیت کی تکمیل کر دی گئی۔

حواشی و تشریحات

(۱) مدینہ یثرب کی ایک بستی تھی۔ آپؐ جب وہاں تشریف لے گئے تو وہ مدینۃ النبی کے نام سے مشہور ہو گیا، اور پھر کثرتِ استعمال سے لوگ اسے مدینہ یا مدینۂ منوّرہ کہنے لگے۔

(۲) طبقات ابنِ سعد، ۱ : ۱۶۱، ابن ہشام، ۱ : ۵۰۹ ببعد (اردو)، ابوداؤد، باب بناء المسجد، بخاری، باب المساجد و باب الہجرۃ، عینی : شرح بخاری، ۲ : ۳۵۷۔

(۳) یہ حجرے عرض میں چھ یا سات ہاتھ اور طول میں تقریباً دس ہاتھ تھے اور چھت اتنی اونچی تھی کہ آدمی اسے چھو سکتا تھا۔ دروازوں پر معمولی کمبل کے پردے لٹکے رہتے تھے۔ راتوں کو کبھی کبھار چراغ جلتا تھا۔ دیکھیے مواضع مذکور۔

(۴) حق کور : کسی شخص کی چشمِ بصیرت اندھی ہو جائے اور اس کی حق و باطل میں تمیز کرنے کی صلاحیت ناکارہ ہو جائے تو اس کے لیے حق کور کی تعبیر اختیار کر سکتے ہیں، جیسے رنگوں دھا کے لیے رنگ کور (colour - blind) کی تعبیر اختیار کی جاتی ہے۔

(۵) بخاری، باب بدء الاذان، ۱ : ۱۵۷، طبقات ابن سعد، ۱ : ۱۶۲ ببعد۔

(۶) الانعام ۶ : ۱۶۲ تا ۱۶۴

(۷) صحیح بخاری، باب السّلام علی جماعۃ فیہا المسلم والکافر، ۸ : ۶۹۔

(۸) سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، باب خبر النضیر، ۲ : ۶۷۔

(۹) بخاری، کتاب الجہاد، باب الحراسۃ، ۴ : ۴۱۔

(۱۰) طبقات ابن سعد، ۲ : ۹۰۶، ۹۰۷ ببعد، ابن ہشام، ۱ : ۶۵۰ تا ۶۵۴ ببعد، ابن قیم : زاد المعاد (اردو)، ۲ : ۱۷۴ تا ۱۷۶۔

(۱۱) عبقری Genios

(۱۲) اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے والد کا نام حضرت ابوبکر صدیقؓ اور والدہ کا نام اُمِ

رومان بنت عویمر ہے۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے ان کا نکاح مکہ مکرمہ میں شوال ۱۰ نبوت میں ہوا تھا اور شوال ۲ھ میں رخصتی عمل میں آئی تھی۔ ۱۷ رمضان ۵۷ یا ۵۸ھ میں انتقال فرمایا۔ نمازِ جنازہ حضرت ابوہریرہؓ نے پڑھائی، جنّت البقیع میں دفن کی گئیں۔ (المشکوٰۃ، باب مناقب ازواج النبیؐ، نیز دیکھیے "اکمال فی اسماء الرجال"، مؤلفہ شیخ ولی الدین ابی عبداللہ محمد بن عبداللہ الخطیب در المشکوٰۃ (اردو ایڈیشن) ۳ : ۴۰۷۔

(۱۳) البقرہ ۲ : ۱۹۰ و بمواضع کثیرہ۔

(۱۴) الحج ۲۲ : ۳۹، ۴۰ و بمواضع کثیرہ۔ نیز دیکھیے مشکوٰۃ، کتاب الجہاد، علامہ ابن قیم، زاد المعاد (اردو)، ۲ : ۱۴۰ تا ۱۴۵۔

(۱۵) نسائی، ۱ : ۴۴۸، بحوالہ شبلی، ۱ : ۳۰۸۔

(۱۶) طبقات ابن سعد، ۲ : ۲ ببعد، محمد حمید اللہ : رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی، ص ۲۵۸ تا ۳۶۲۔

(۱۷) صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب العُشیرہ۔

(۱۸) طبقات ابن سعد، ۲ : ۵۶۷ ببعد، طبری، ص ۱۲۷۴۔

(۱۹) مواضع مذکور، و تاریخ ابن خلدون (اردو ایڈیشن)، ۱ : ۷۶، ۷۷۔

(۲۰) مواضع مذکور۔

(۲۱) البقرہ ۲ : ۲۱۷۔

(۲۲) طبری، ص ۱۲۷۵، طبقات ابن سعد، ۲ : ۱۰، تاریخ ابن خلدون (اُردو)، ۱ : ۷۹ تا ۸۱۔

(۲۳) البقرہ ۲ : ۱۴۴، بخاری، کتاب التفسیر۔

(۲۴) سیرۃ ابن ہشام، ۲ : ۱۹۹، تاریخ ابن خلدون، ۱ : ۸۱ ببعد، صحیح بخاری، حدیث قبلہ صلوٰۃ، شبلی، سیرۃ النبی، ۱ : ۲۹۹ تا ۳۰۳۔

(۲۵) البقرہ ۲ : ۱۸۳ ببعد۔

باب : ۱۲

مُملکتِ مدینہ پر جارحیّت کا آغاز

باب ۱۲

مملکتِ مدینہ پر جارحیّت کا آغاز

غزوۂ بدر (۱۲ تا ۱۷ رمضان المبارک ۲ھ / ۸ تا ۱۳ مارچ ۶۲۴ء)[1] :

اسلامی مملکت پر قریش کی جارحیّت شُدنی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کو ابھی تک اپنے مفرور وصابی سمجھتے تھے، لہٰذا مدینے میں اسلامی مملکت کے وجود کو وہ نہ تو برداشت کر سکتے تھے اور نہ انھوں نے کیا۔ چنانچہ اہلِ مکّہ مسلمانوں کے استیصال کے لیے مدینے پر حملے کی تیاریاں کر ہی رہے تھے کہ دو واقعات پیش آگئے۔ ایک تو عمرو بن الحضرمی کے قتل کا اور دوسرا مکّے میں ابوسفیان کے ایلچی کی آمد کا، جس نے مسلمانوں کے ہاتھوں قافلے کی متوقّع غارت گری کی مبالغہ آمیز اطلاع دی۔ اس سے مکّے میں ہیجان پیدا ہو گیا' اور قریش غیظ و غضب کے عالم میں قافلے کو بچانے اور مدینے پر حملہ کرنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

ابوسفیان جس تجارتی قافلے کا امیر تھا' اس میں اہلِ مکّہ نے' جس میں خواتین بھی شامل تھیں، اپنا زیادہ سے زیادہ سرمایہ لگایا تھا۔ مؤرخین کے اندازے کے مطابق قافلے میں پچاس ہزار سُرخ دینار (طلائی اشرفیوں) کی مالیت کا تجارتی سامان تھا۔ اس قدر زیادہ سرمایہ کاری کا مقصد یہ تھا کہ اس سے جو منافعِ کثیر ہو' اسے مدینے پر حملہ کرنے کی تیاری پر خرچ کیا جائے' لہٰذا اس قافلے کے لُٹ جانے کا مطلب ایک تو قریش کی معیشت کی بربادی اور دُوسرے ان کے جارحانہ منصوبے کی ناکامی تھا۔ یہ صورتِ حال نہ تو قریش برداشت کر سکتے تھے اور نہ انھوں نے کی۔

مکّہ و شام کی تجارتی شاہراہ چونکہ خطرے میں پڑ چکی تھی، لہٰذا کارواں عرب کی حدود میں داخل ہوا تو ابوسفیان، جو امیرِ کارواں تھا' بہت زیادہ محتاط ہو گیا۔ اس کے مخبر اور جاسوس

قافلے کے آگے پیچھے دائیں بائیں، ہر طرف لگے ہوئے تھے۔ ایک تو ابوسفیان جہاندیدہ و آزمودہ کار اور زیرک و دُور اندیش تھا، دوسرے مال کی کثرت بھی غیر معمولی حزم و احتیاط کی متقاضی تھی۔ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتا، بدر سے ایک یا دو منزل دُور پہنچا تو اس نے متوقع خطرے کے پیشِ نظر قافلے کو روک لیا اور خود حالات کا جائزہ لینے کی غرض سے بدر پہنچ گیا۔

ادھر مدینے میں پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اطلاع مل چکی تھی کہ منصوبے کے مطابق ابوسفیان کا قافلہ بدر میں پڑاؤ کرے گا، لہٰذا آپؐ نے اس پر چھاپہ مارنے کا منصوبہ بنایا، غرض یہ تھی کہ قریش کی معیشت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا کر ان کی جارحانہ قوت و عزائم کو مفلوج کر دیا جائے۔ چونکہ آپؐ قریش کی ذہنیت و کردار اور ان کی جنگی تیاریوں سے واقف تھے، لہٰذا آپؐ کو یقین تھا کہ کارواں پر حملہ کیا جائے یا نہ کیا جائے، تصادم ناگزیر ہے کیونکہ وہ ہر صورت میں مدینے پر حملہ کریں گے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر آپؐ نے فیصلہ کیا کہ ابوسفیان کے کارواں کو روکنے کی کوشش کی جائے اور قریش کا مقابلہ مدینے سے دُور بدر کے میدان میں کیا جائے۔ اس میں مصلحت یہ تھی کہ اگر قریش مدینے کا محاصرہ کر لیتے تو یہود و منافقین کا ان کے ساتھ مِل جانے کا خطرہ تھا۔ اسلام کی یہ پہلی جنگ تھی اور مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے یہ ازبس اہم، کیونکہ اس میں شکست مسلمانوں کی ہلاکت و بربادی اور تحریکِ اسلام کے استیصال کا موجب بن سکتی تھی، لہٰذا اسے جیتنا ناگزیر تھا۔

رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ۳۱۴ مجاہدین کو منتخب کیا، جن میں ۸۶ مہاجرین اور باقی انصار تھے۔ آپؐ نے حکومت کے وسائل سے انھیں مسلّح کیا، اگرچہ اس تیاری میں مسلمانوں نے بھی مقدور بھر حصّہ لیا۔ چونکہ حکومت اور مجاہدین کے مالی وسائل محدُود تھے، اس لیے اسلحہ، رسد اور سواری کا خاطر خواہ انتظام نہ ہو سکا۔ سواری کے لیے صرف ستّر اونٹ اور دو گھوڑے تھے جن پر آپؐ اور مجاہدین باری باری سواری کرتے تھے۔ منصوبہ بندی آپؐ کی سنّتِ حسنہ تھی۔ آپؐ نے منصوبے کے مطابق تیاری مکمل کر لی، لیکن اس مرحلے پر اسے ظاہر کرنا تحریکِ اسلام اور مسلمانوں کے بہترین مفاد کے خلاف تھا۔ اس کے دو وجوہ تھے: ایک یہ کہ مہاجرین اور خصوصًا انصار کو قریش سے لڑانے اور اس امتحان میں ڈالنے کا پہلا تجربہ تھا، جس میں ان کی ناکامی، ان کی ہلاکت و بربادی کا پیش خیمہ بن سکتی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اگر یہود و منافقین کو پہلے سے یہ معلوم ہو جاتا کہ قریش مدینے پر حملہ آور ہو رہے ہیں اور مسلمان ان کے

مقابلے کے لیے بدر جا رہے ہیں تو ان کو سازشیں، ریشہ دوانیاں اور فتنہ و فساد برپا کرنے کا موقع مل جاتا اور اس کا نتیجہ ان کے عقب سے حملہ کرنے اور مدینے کو تاخت و تاراج کرنے کی صورت میں بھی نکل سکتا تھا۔ ان حالات و مصالح کے پیشِ نظر آپؐ نے یہ تأثّر دیا کہ اس مہم کا مقصد قریش کے تجارتی قافلے کے خلاف کارروائی کرنے کا ہے، اور یہ امرِ واقع بھی تھا۔

آپؐ نے مدینے میں حضرت عمروؓ ابن اُمّ کلثوم کو اپنا قائم مقام مقرّر کیا، اور ۱۲ رمضان المبارک ۲ ہجری / ۸ مارچ ۶۲۴ء کو مجاہدین نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی قیادت میں نامعلوم منزل کی طرف کوچ کیا۔ منزلِ مقصود کے نام و نشان اور اصل منصوبے کو راز میں رکھنا آپؐ کی جنگی حکمتِ عملی تھی۔ امام بخاریؒ نے (کتاب الغزوات میں غزوۂ تبوک کے ضمن میں) آپؐ کے مشہور صحابی حضرت کعب بن مالکؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم جب کسی غزوے کا ارادہ فرماتے تھے تو کسی اور موقع کا "توریہ" فرماتے تھے۔ "توریہ" کے معنی شارحینِ بخاری نے یہ لکھے ہیں کہ آپؐ ایسے موقع پر مبہم اور متحمل المعنیین الفاظ (ایسے الفاظ جس کے متعدّد معانی نکل سکتے ہوں) استعمال فرماتے تھے۔ آپؐ عسکری رازوں کی اس قدر حفاظت فرماتے تھے کہ موقع سے پہلے معتمد صحابۂ کرامؓ تک کو بھی اس کی خبر نہ ہوتی تھی۔ روحاء کے مقام پر پہنچ کر آپؐ نے لشکر میں سے حضرت ابولبابہؓ بن عبدالمنذر کو حاکمِ مدینہ بنا کر واپس بھیج دیا اور اس طرح مجاہدین کی تعداد تین سو تیرہ (۳۱۳) رہ گئی جو روزے سے تھے اور ان کا ورد "احد۔ احد" تھا۔ اس لشکر میں تین علم تھے: ایک حضرت مصعب بن عمیرؓ، دوسرا حضرت علی بن ابی طالبؓ اور تیسرا ایک انصاری سعد بن معاذؓ کے ہاتھ میں تھا۔ آخری دو علم سیاہ رنگ کے تھے۔

ابوسفیان ایک تجربہ کار امیرِ کارواں، ماہرِ حربیّات اور جہاندیدہ سپہ سالار تھا۔ وہ بھی مدینے کے حالات اور مجاہدوں کے عزائم اور ان کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھا اور قریش کے مدینے میں جاسوس اور مخبروں کے ذریعے اسے برابر اطلاعات ملتی رہتی تھیں، چنانچہ اسے آپؐ کی مدینے سے روانگی اور عزم کی اطّلاع مل گئی۔ ابوسفیان صاحبِ رائے، محتاط اور دُور اندیش تھا۔ اس نے حفظِ ماتقدم کے طور پر ضمضم بن عمرو غفاری نامی ایک شخص کو مکّے روانہ کیا اور کہلا بھیجا کہ تمہارا قافلہ (حضرت) محمّد (رسول اللہؐ) اور ان کے

متّبعین کے باعث معرضِ زوال میں ہے۔ دوڑو اور اپنے قافلے کو بچاؤ۔ یہ سُن کر مکّے میں ہیجان برپا ہوگیا اور لوگ قافلے کو بچانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہُوئے۔

دشمن کو فوج کی تعداد اور نقل و حرکت سے بے خبر رکھنا' اور اس کی تعداد' قوت اور نقل و حرکت سے باخبر رہنا آپؐ کا اصول تھا۔ چنانچہ آپؐ نے قریش کے قافلے کی یا فوجی نقل و حرکت کی اطلاعات حاصل کرنے کے لیے دو جاسوس بدر روانہ کیئے' جن کے نام بَسبیس بن عمرو الجہنی اور عدی بن ابی الزغبا بتائے جاتے ہیں اور خود لشکر کو لے کر ایسی راہیں اختیار کیں جو عام طور سے آمد و رفت کے لیے استعمال نہ ہوتی تھیں۔ مجاہدوں کا لشکر منزلیں مارتا ہُوا تیزی سے ذفران پہنچ گیا۔

آپؐ کے جاسوس یا طلایہ گرد بدر میں ایک چشمے پر اُترے' جہاں دو لڑکیاں پانی بھرنے آئیں۔ وہ اُدھار کے بارے میں جھگڑ رہی تھیں۔ مقروض لڑکی کہہ رہی تھی کہ ایک دو دن میں قافلہ آنے والا ہے' میں مزدوری کر کے تمھارا قرض چکا دوں گی۔ اتفاق سے علاقے کا سردار مجدی بن عمرو الجہنی وہاں موجود تھا۔ اس نے قافلے کے آنے کی تصدیق کی اور ان کی مصالحت کرادی۔ یہ وہی سردار تھا جس کی مصالحانہ کوششوں سے قریش کے قافلوں اور مجاہدین کے درمیان دو تین مرتبہ تصادم ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ یہ اطلاع جس کی تصدیق بھی ہوگئی تھی' دونوں طلایہ گردوں کے لیے کافی تھی۔ وہ پروگرام کے مطابق ذفران پہنچے اور آپؐ کو مطلع کر دیا۔

طلایہ گردوں کے بدر کے چشمے سے رخصت ہونے کے بعد ابو سفیان وہاں پہنچ گیا۔ اس نے اپنے دوست مجدی بن عمرو الجہنی سے کسی اجنبی کے آنے جانے کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے دو اجنبیوں (مسلم جاسُوسوں) کے متعلق بتایا' جو چشمے پر اُترے تھے۔ ابو سفیان کو شک گزرا۔ اس نے اونٹوں کی مینگنیوں کو توڑ کر دیکھا اور بھانپ گیا کہ وہ مدینے کے لوگ تھے اور جاسُوسی کرنے آئے تھے۔ وہ تیزی سے لوٹا۔ قافلے کا رُخ بدر سے موڑ دیا اور ساحل کے ساتھ ساتھ تیزی سے مکّے کی طرف چلنے لگا۔

آپؐ چونکہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبرِ اعظم و آخرؐ تھے، اس لیے وحی کے ذریعے آپؐ کا رابطہ اللہ تعالیٰ سے اُستوار تھا۔ مدینے سے کُوچ کے وقت یا پہلے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو بذریعہ وحی مطلع کر دیا تھا کہ دشمن کے دو گروہوں یعنی قافلے یا لشکرِ قریش میں سے ایک ضرور

آپؐ کے ہاتھ لگے گا۔

یاددہانی کے طور پر یہ جتا دینا ضروری ہے کہ آپؐ کے عسکری نظام میں جاسُوسی Espionage اور مخبری Intelligence کو ازلس اہمّیت حاصل تھی اور آپؐ کے جاسُوس اور مخبر تمام عرب میں پھیلے ہوئے تھے' جن کے ذریعے آپؐ قبائل کے احوال و ظروف سے باخبر رہتے تھے۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ جب بھی کسی قبیلے نے شورش برپا کرنے یا مدینے پر حملہ کرنے کی تیاری کی' آپؐ کو اس کی اطلاع بروقت مل گئی اور فتنے کو آغاز ہی میں دبا دیا گیا۔ مکّے میں آپؐ کے جاسوس و مخبر خاص طور سے بڑے فعّال تھے اور آپؐ کو قریش کے منصوبوں اور سرگرمیوں سے برابر باخبر رکھتے تھے۔ چنانچہ ذفران میں' جہاں آپؐ کو اپنے دو جاسُوسوں کے ذریعے یہ اطلاع ملی کہ ابو سفیان کا قافلہ دو ایک روز میں بدر پہنچنے والا ہے' وہاں دُوسرے ذرائع سے آپؐ کو دو اور اہم اطلاعیں ملیں : ایک یہ کہ ابو سفیان اپنے قافلے کو لے کر ساحل کے راستے تیزی سے مکّے روانہ ہوگیا ہے۔ دوسرے یہ کہ قریش کا لشکرِ جرّار اس کی مدد کے لیے تیزی سے بدر کی جانب پیش قدمی کر رہا ہے۔ اس صورتِ حال میں ابو سفیان کا تعاقب نہ صرف بے سُود بلکہ فوجی نقطۂ نظر سے اپنے آپؐ کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف تھا، کیونکہ قریش پیچھے سے مسلمانوں کو گھیرے میں لے کر رسد، کمک اور فرار کی راہیں ان پر مسدُود کر سکتے تھے۔ اب صرف دو صورتیں تھیں : ایک یہ کہ مدینے لوٹ کر اس کا دفاع کیا جائے' دوسری یہ کہ آگے بڑھ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے۔ آپؐ نے دوسری صورت کو ترجیح دی' کیونکہ سیاسی و عسکری حالات اسی کے متقاضی تھے اور مشیّتِ ایزدی بھی یہی تھی۔ چنانچہ بعد میں تاریخ نے ثابت کر دیا کہ آپؐ کا یہ فیصلہ درست تھا' جس نے تاریخ کا رُخ جہتِ صالحہ کی طرف موڑ دیا۔

مجاہدین چونکہ قریش سے جنگ کرنے نہیں' ان کے قافلے پر حملہ کرنے کی نیت سے آئے تھے، لہٰذا ان کا عندیہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ آیا وہ قریش سے آگے بڑھ کر جنگ کریں گے یا نہیں؟ چنانچہ آپؐ نے انھیں جمع کیا اور تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کیا پھر فرمایا : أَشِيرُوا عَلَيَّ أَيُّهَا النَّاسُ! (لوگو! مجھے مشورہ دو)۔ حاضرین میں سے پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اور بعد میں حضرت عمر فاروقؓ نے ایمان افروز تقریر کی' اور آپؐ کو مہاجرین میں سے اپنی وفاداری' جانثاری اور اطاعت کا یقین دلایا' اور آخر میں حضرت

مقداد بن عمروؓ نے آپؐ سے مخاطب ہو کر عرض کیا :

"یا رسول اللہؐ ! اللہ آپ کو جو حکم دیتا ہے، وہی کیجیے۔ ہم آپؐ کے ساتھ ہیں۔ واللہ ! ہم وہ نہ کہیں گے جو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ سے کہا تھا کہ "تم اور تمھارا ربّ دونوں جاؤ اور لڑو۔ ہم تو یہاں بیٹھے ہیں"۔ اللہ کی قسم، جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے، اگر برگ الغماد بھی چلے جائیں تو ہم آپؐ کا ساتھ دیں گے، یہاں تک کہ آپؐ وہاں پہنچ جائیں۔"

یہ سُن کر پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کا چہرۂ مبارک خوشی سے چمک اُٹھا۔ آپؐ نے تعریف فرمائی اور دُعا دی۔ چونکہ یہ تینوں اصحاب مہاجرین میں سے تھے اور آپؐ انصار کی رائے بھی معلوم کرنا چاہتے تھے، لہٰذا آپؐ نے پھر فرمایا : مجھے مشورہ دو۔ انصار سمجھ گئے کہ آپؐ کا اشارہ ان کی طرف ہے۔ چنانچہ حضرت سعد بن معاذؓ اُٹھے اور انھوں نے عرض کیا : یا رسول اللہؐ ! شاید آپؐ ہم سے خطاب فرما رہے ہیں۔ ہم آپؐ پر ایمان لائے ہیں اور آپؐ کی تصدیق کر چکے ہیں کہ جو کچھ آپؐ لائے ہیں، وہ حق ہے۔ ہم آپؐ سے سمع و اطاعت کے پختہ وعدے کر چکے ہیں۔ یا رسول اللہؐ ! جو کچھ آپؐ نے اِرادہ فرمایا ہے، کر گزریں۔ آپؐ جس طرف ارادہ فرمائیں، تشریف لے چلیں۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا، اگر آپ ہمیں لے کر سامنے سمندر میں جا پہنچیں اور اس میں اتر جائیں تو ہم آپؐ کے ساتھ اتر جائیں گے اور ہم میں سے ایک بھی پیچھے نہ رہے گا۔ ہم کو ہرگز یہ ناگوار نہیں ہے کہ کل آپؐ ہم کو لے کر دشمن سے معرکہ آرا ہوں۔ ہم جنگ میں ثابت قدم رہنے والے اور مقابلے کے سچے ہیں۔ امید ہے کہ اللہ آپؐ کو ہم سے ایسے کارنامے دکھائے جن کو دیکھ کر آپؐ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ آپؐ اللہ کی برکت کے بھروسے پر ہمیں لے چلیں۔

اس تقریر سے آپؐ بہت خوش ہوئے۔ دُعا دی اور نُصرتِ الٰہی اور فتح و کامرانی کا مژدہ سُنایا۔

پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مجاہدین کو اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام سنا دیا کہ انھیں قریش کی دو جماعتوں (قافلے اور لشکر) میں سے ایک سے مقابلہ ضرور ہوگا، اور وہ ہر صُورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھے، لیکن پھر بھی جب آپؐ انھیں لے کر بدر کی طرف چلے تو

ان کی آرزو تھی کہ کارواں ہی ان کے ہاتھ آئے۔ یہ نفسیاتی کیفیت بشریت کے لحاظ سے فطری تھی۔ انصار تحریکِ اسلام میں شامل ہونے سے پہلے قریش سے حد درجہ مرعوب تھے اور ہیبت و مرعوبیّت کے اثرات ابھی تک ان کے دلوں سے پوری طرح محو نہیں ہوئے تھے۔ مہاجرین میں بھی اپنی قلتِ تعداد و سامانِ حرب کے باعث قریش کے لشکرِ جرّار سے معرکہ آرا ہونے کی اُمنگ نہ تھی۔ مُجاہدین کے لیے عرب کی سب سے بڑی قوّت سے نبرد آزما ہونے کا یہ پہلا موقع تھا اور خطرے کا خوف خطرے سے زیادہ صبر آزما ہوتا ہے۔

مدینے کی طرف سے تین سو تیرہ مجاہدین کا فوجی دستہ اور مکّے کی جانب سے قریش کا لشکرِ جرّار جو ایک ہزار کے قریب جنگجو سورماؤں پر مشتمل تھا اور جس میں قریش کے نامور و آزمودہ کار مبارز شامل تھے، تیزی سے بدر کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا اور ابو سفیان مجاہدین کے خوف سے قافلے کو لے کر ساحل کے ساتھ ساتھ مکّے کی سمت رواں دواں تھا۔ جحفہ کے مقام پر لشکرِ قریش سے اس کا آمنا سامنا ہو گیا۔ ابو سفیان اور کئی صاحب الرائے سرداروں کی یہ رائے تھی کہ لشکر بھی قافلے کے ساتھ مکّے لوٹ جائے، لیکن ابو جہل اور کچھ دُوسرے شوریدہ سر اور شر پسند سردار بدر جانے پر مُصر تھے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ مراجعت سے ان کی ہوا اُکھڑ جائے گی اور مسلمانوں کے حوصلے بلند ہو جائیں گے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی تجارتی شاہراہ بالکل غیر محفوظ ہو جائے گی۔ بات معقول اور دل لگتی تھی، لہٰذا فیصلہ پیش قدمی کے حق میں ہوا۔ قریش اور مسلمان دونوں تیزی سے منزلیں مارتے ہوئے بدر کے مضافات میں پہنچ گئے۔ قریش پہاڑی کے پیچھے اور دوسری جانب مجاہدین پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے اور قافلہ اطمینان کے ساتھ ساحل کے ساتھ رواں دواں تھا۔ اس صورتِ حال کو قرآن مجید نے اس طرح بیان کیا ہے :

"یہ وہ دن تھا کہ تم قریب کے ناکے پر تھا اور اُدھر دشمن دُور کے ناکے پر تھا، اور قافلہ تم سے نیچے (ساحل) کی طرف (رواں دواں) تھا۔"[۳۵]

رزم ہوتی یا بزم، پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کبھی لحظہ بھر کے لیے بھی غفلت یا سُستی نہ کرتے، بلکہ ہمیشہ مستعد، چوکنّے اور ہر موقع سے فائدہ اٹھانے کی فکر میں رہتے تھے۔ چنانچہ آپؐ نے پڑاؤ ڈالتے ہی جنگی و فوجی معلومات حاصل کرنے اور میدانِ جنگ کا نقشہ اور قریش کا اتا پتا معلوم کرنے کی غرض سے حضرت علیؓ، حضرت سعدؓ اور حضرت زبیرؓ

کو آگے بھیجا۔ اس مہم میں قریش کے دو غلام ان کے ہاتھ لگے، جو غالباً انھوں نے جاسوسی کے لیے بھیجے تھے۔ آپؐ نے ان سے پوچھ گچھ کی تو معلوم ہوا کہ لشکرِ قریش کی تعداد نو سو سے ایک ہزار کے درمیان ہے، اور وہ پہاڑ کی پرلی طرف چھاؤنی ڈالے ہوئے ہیں۔

اب آپؐ کے سامنے میدانِ جنگ میں پہلے پہنچنے اور جنگی و عسکری اعتبار سے موزوں جگہ حاصل کرنے کا مسئلہ تھا۔ حضرت خباب بن منذرؓ بدر کے جغرافیے سے بخوبی واقف تھے۔ ان کے مشورے سے آپؐ نے بدر کے وسط میں میٹھے پانی کے چشموں پر چھاؤنی ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ اِدھر مجاہدین اور اُدھر قریش کا لشکر میٹھے پانی کے چشموں پر پہنچنے اور ان پر قبضہ کرنے کے لیے بڑھ رہے تھے کہ رات کو بارش ہو گئی۔ قریش اس وقت نشیب میں تھے جہاں زمین زرعی اور نرم تھی۔ وہ بارش سے دلدلی ہو گئی اور ان کی پیش قدمی رُک گئی۔ اس کے برعکس مجاہدین کی طرف زمین اونچی اور ریتلی تھی، وہ بارش کی وجہ سے جم کر سخت ہو گئی اور اس پر نقل و حرکت آسان تر ہو گئی۔ آپؐ نے پیش قدمی جاری رکھی اور راتوں رات چشموں پر پہنچ گئے اور حوض بنا کر پانی کا ذخیرہ کر لیا۔

بارش مسلمانوں کے حق میں رحمت، لیکن کُفّار کے حق میں زحمت ثابت ہوئی، جس طرح واٹر لو کے میدان میں وہ نپولین بوناپارٹ کے لیے وجۂ شکست ثابت ہوئی تھی۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

"بعض اوقات قدرتی حوادث کا ایک معمولی سا واقعہ بھی فتح و شکست کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ جنگِ واٹر لو کے تمام مورخین متفق ہیں کہ اگر ۱۷ اور ۱۸ جون ۱۸۱۵ء کی درمیان رات میں بارش نہ ہوتی تو یورپ کا نقشہ بدل گیا ہوتا، کیونکہ اس صورت میں نپولین کو زمین خشک ہونے کا بارہ بجے تک انتظار نہ کرنا پڑتا، سویرے ہی لڑائی شروع کر دیتا، جس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ بلوشر کے پہنچنے سے پہلے ویلنگٹن کو شکست ہو جاتی۔ واٹر لو میں اگر بارش نہ ہوتی تو یورپ کا سیاسی نقشہ بدل جاتا، لیکن اگر بدر میں بارش نہ ہوتی تو کیا ہوتا؟ تمام کرۂ ارضی کی ہدایت و سعادت کا نقشہ اُلٹ جاتا۔ اسی طرف پیغمبرِ اسلامؐ نے اپنی دُعا میں اشارہ کیا تھا:

اللّٰھمّ ان تھلک ھذہ العصابۃ فلا تعبد فی الارض: خدایا! اگر خدّامِ حق کی یہ چھوٹی سی جماعت آج ہلاک ہو گئی تو کرۂ ارض میں تیرا سچا عبادت گزار کوئی نہیں رہے گا۔"[4]

مجاہدین کے لیے بارش کئی طرح سے رحمت ثابت ہوئی۔ وہ سنگلاخ راہوں سے سفر کرتے آتے تھے۔ انھیں کئی دنوں سے نہانے دھونے کا موقع نہ ملا تھا۔ وہ تھکے ماندے اور گرد و غبار سے اَٹے ہوئے تھے۔ انھوں نے بارش کو ایک نعمتِ غیر مترقبہ جانا اور نہا دھو کر جسم و جان کو پاک و صاف کر لیا۔ اس سے راتوں کے جاگے، تھکے ماندے مجاہدوں کو ایسی نیند آئی کہ قریش کی قوت و ہیبت کے تصور سے ان پر جو رعب و دہشت کے اثرات تھے، وہ مٹ گئے اور جسم میں چُستی و توانائی اور دل میں سکینت و طمانیت عود کر آئی۔ صبح ہوئی تو ان کے جسم و دل کی کیفیت ہی بدل چکی تھی۔ ان کے حوصلے بلند اور دل جوشِ جہاد سے معمور تھے۔ وہ میدانِ جنگ میں اس طرح صف بند تھے جیسے شاہین اپنے شکار پر جھپٹنے کے لیے پر تول رہے ہوں۔

بارش کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کا علاقہ جو ریگزار تھا، مضبوط و ہموار ہو گیا جس کی وجہ سے مجاہدین کو تیزی سے نقل و حرکت کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔ اس کے برعکس قریش کا علاقہ نشیب میں تھا اور اس کی زمین زرعی ہونے کی وجہ سے نرم تھی، اس لیے بارش کی وجہ سے اس میں کیچڑ ہو گئی۔ اس سے انھیں یہ نقصان ہوا کہ ان کے پاؤں پھسلنے لگے اور ان کی استعدادِ نقل و حرکت میں کمی واقع ہو گئی۔ اس کا اثر ان کی جنگی کارکردگی پر پڑنا تھا اور پڑا۔ بہر حال بارش اور نیند کے جو مثبت و خوش گوار اثرات مجاہدین کی عسکری صلاحیت و کارکردگی اور حوصلہ و کردار پر پڑے، اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف ایک بڑا بلیغ و فکر انگیز اشارہ کیا ہے: "جب ایسا ہوا تھا کہ اس نے تم پر نیند طاری کر دی تھی کہ یہ اس کی طرف سے تمھارے لیے تسکین و بے خوفی کا سامان تھا اور آسمان سے تم پر پانی برسا دیا تھا کہ تمھیں پاک و صاف ہونے کا موقع دے دے اور تم سے شیطان (کے وسوسوں) کی نجاست دُور کر دے، نیز تمھارے دلوں کو مضبوط کر دے اور (ریگزار میں) قدم جما دے۔"[5]

فوج کی قیادت چونکہ آپؐ کی ذمہ داری تھی، اس لیے حضرت سعد بن معاذؓ نے آپؐ کے لیے ایک محفوظ و موزوں ٹیلے پر سائبان نصب کرایا اور اس کی حفاظت و نگہبانی اپنے ذمے لے لی۔ یہ سائبان آج کل کی عسکری اصطلاح میں فوجی ہیڈ کوارٹر تھا۔ اس مقام سے آپؐ طرفین کی نقل و حرکت دیکھ سکتے تھے اور اپنے لشکروں کو فوجی اشارے بھی دے سکتے تھے۔

صبح ہوئی تو قریش کا لشکر نمودار ہوا۔ آپؐ نے اسے ایک ٹیلے سے اُترتے دیکھا تو دستِ مبارک دُعا کے لیے اُٹھے اور زبانِ مبارک سے یہ دُعا نکلی :

یا اللہ ! یہ قریش اپنے فخر و غرور کے ساتھ آگئے ہیں۔ یہ تیری مخالفت کرتے ہیں اور تیرے رسول کو جھٹلاتے ہیں۔ یا اللہ ! تیری مدد کا طلب گار ہوں جس کا تُو نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے۔ یا اللہ ! یہ صبح انھیں ہلاک کر دے۔ (ابن ہشام ، ص ۶۷۵)۔

کیا موت و حیات کی کشمکش کے ایسے موقع پر ایسی دُعا کسی ایسے شخص کی زبان سے نکل سکتی ہے جو سچا نہ ہو اور جس کی نیت میں فتور ہو ؟ حق کی طلب و جستجو رکھنے والوں کے لیے یہ سوال خیال انگیز بھی ہے اور بصیرت افروز بھی ، اور اس دُعا میں ان کے لیے عبرت کا نشان بھی ہے۔

آپؐ کی کامیاب زندگی کے عوامل میں سے ایک یہ ہے کہ آپؐ کسی موقعے کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے ، نیز دشمن کی غفلت ، سستی اور سہو سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھاتے تھے۔ چنانچہ لشکرِ قریش کے دیر سے میدانِ جنگ میں پہنچنے کا آپؐ نے پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔ دشمن کو پانی سے محروم کر دیا اور اپنے لیے پانی کا ذخیرہ کر لیا۔ صف بندی کے لیے میدانِ جنگ میں موزوں ترین جگہ منتخب کر لی۔ دن کے مختلف اوقات میں سورج اور ہوا کا رُخ معلوم کیا ، عقب ، دائیں اور بائیں سے اچانک حملے کے امکانات کا جائزہ لیا۔ آپؐ کو چونکہ معلوم ہو چکا تھا کہ دشمن کے لشکر کی تعداد نو سو اور ایک ہزار کے درمیان ہے یعنی تین گُنا زیادہ ہے ، لہٰذا ایک عبقری ماہرِ حربیات و سپہ سالار کی طرح آپؐ نے اپنی فوج کی صف بندی اِس طرح کی کہ دشمن حملے کے وقت اپنی ساری فوج بیک وقت کام میں نہ لا سکے ، دوسرے سُورج مجاہدین کے پہلو یا عقب میں اور دُشمن کے سامنے رہے خصوصاً دوپہر کو یعنی گھمسان کے رن کے وقت ، اور اس وقت ہوا کا رُخ بھی دشمن کی سمت ہو ، تاکہ ریت کے جھکڑ چلیں تو ان کا رُخ بھی دشمن کی طرف ہو۔ آپؐ نے قلبِ لشکر کی مدد اور اسے محاصرے سے محفوظ رکھنے کے لیے میمنہ اور میسرہ پر تیر اندازوں کو رکھا اور عقب میں مجاہدین کا ایک مضبوط دستہ محفوظ فوج کے طور پر متعین کیا اور تینوں لشکروں کو علیحدہ علیحدہ ہدایات دیں اور تاکید کی کہ آپؐ کے حکم یا اشارے کے بغیر کوئی اقدام نہ کریں۔

میدانِ جنگ میں دیر سے پہنچنے کی قریش کو یہ سزا ملی کہ وہ ان فوائد سے محروم

ہو گئے جو مسلمانوں کو حاصل ہو گئے تھے۔ انھیں مسلمانوں کی طرح سائنٹفک اصولوں پر صف بندی کی مہلت نہ مِل سکی۔ وہ پانی سے دُور ہو گئے اور زمین دلدلی حصے میں آئی۔

بہر حال جب کُفّار مسلمانوں کے مقابل ہوئے تو یہ بڑا عبرت انگیز نظّارہ تھا۔ ایک طرف توحید کے شمع بردار اور تحریکِ رحمۃ للعالمینی کے علمبردار تھے جو بنی نوعِ انسان کو مشرکانہ عقاید و رسوم اور استحصالی قوتوں سے نجات دلانے ، نیز انھیں سعادت و کامیابی کی راہِ مستقیم دکھانے آئے تھے ، اور دوسری طرف اہلِ شرک و کُفر تھے ، جو شمعِ توحید کو گُل کرنے ، تحریکِ رحمۃ للعالمینی کو کچلنے اور اس کے علمبرداروں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے ، نیز انسانیت کو عدل و احسان ، رحمت و محبّت ، امن و سلامتی ، رُشد و ہدایت ، علم و حکمت اور دُنیوی و اُخروی کامیابیوں اور سعادتوں سے محروم کرنے آئے تھے۔ ان متحارب فریقوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

بلاشبہ تمھارے لیے ان دو گروہوں میں ایک نشانِ عبرت تھا ، جو (بدر میں) ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے۔ ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا کافر تھا۔ دیکھنے والے کُھلی آنکھوں دیکھ رہے تھے کہ کافر گروہ مومن گروہ سے دو چند ہے مگر (نتیجے نے ثابت کر دیا کہ) اللہ اپنی فتح و نصرت سے جس کو چاہتا ہے ، مدد دیتا ہے۔ بلاشبہ ان لوگوں کے لیے جو چشمِ بینا رکھتے ہیں ، اس میں بڑی ہی عبرت ہے۔ [۵]

۱۷ رمضان المبارک ۲ھ / ۱۳ مارچ ۶۲۴ء کو رن پڑا۔ عرب کے دستور کے مطابق جنگ کا آغاز دُو بدُو لڑائی سے ہوا۔ قریش کی طرف سے عتبہ ، اس کا بھائی شیبہ اور ولید بن عتبہ نکلے اور مقابلے کے لیے نعرہ لگایا۔ مجاہدین میں سے حضرت عبداللہ بن رواحہؓ اور عفراء کے دونوں بیٹے حضرت معاذؓ اور معوّذ نکلے۔ یہ تینوں اصحاب انصاری تھے۔ قریش نے ان سے لڑنا پسند نہ کیا اور قریشی مسلمانوں کو طلب کیا۔ یہ سُن کر آپؐ نے حضرت علیؓ ، حضرت حمزہؓ اور حضرت عبیدہ بن حارثؓ کو بھیجا۔ حضرت علیؓ نے اپنے مقابل ولید کو اور حضرت حمزہؓ نے اپنے مقابل عتبہ کو قتل کر دیا (ایک روایت میں شیبہ ان کا مقابل تھا)۔ حضرت عبیدہؓ بن حارث نے بھی اپنے حریف شیبہ کو مار گرایا لیکن خود بھی مہلک زخم کھا کر گر پڑے۔ حضرت علیؓ اور حضرت حمزہؓ نے ان کے مقابل کو قتل کر دیا اور انھیں اُٹھا لائے۔ ان کا پاؤں کٹ گیا تھا۔ چند دنوں بعد شہادت پائی۔

دُو بدُو لڑائی کے بعد قریش نے عام حملے کا آغاز کیا۔ دشمن پیش قدمی کرتا ہوا تیروں کی زد میں آیا تو آپؐ کی ہدایات کے مطابق تیر اندازوں نے انھیں اپنے تیروں پر رکھا اور انھیں بازوؤں پر حملہ کرنے اور عقب میں جانے کا موقع نہ دیا۔ پھر گھمسان کا رن پڑا۔ مجاہدین بے جگری سے لڑ رہے تھے کہ ہوا کا رُخ بدلا اور ساتھ ہی ریگ بدوش ہوائیں چلنے لگیں۔ آپؐ اسی موقع کے منتظر تھے۔ چنانچہ آپؐ نے مٹھی بھر ریت اٹھائی اور دشمن کی طرف پھینکی۔ یہ در اصل عقب کی محفوظ فوج کو آگے بڑھ کر دشمن پر بھرپور حملہ کرنے کا اشارہ تھا۔ ایک تو سورج کی روشنی سے قریش کی آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں، دوسرے ریت کے جھکڑوں کی وجہ سے انھیں کچھ سُجھائی نہ دیتا تھا۔ تیسرے مجاہدین کی تازہ دم فوج ان پر بلائے ناگہانی بن کر ٹُوٹ پڑی۔ اس عالم افراتفری میں ان کے نامور جنگجو سردار مارے گئے؛ قریش اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ وہ بد دل ہو گئے۔ ان کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ مجاہدین نے اس صورتِ حال کا پورا فائدہ اٹھایا۔ ان کا اس زور سے تعاقب کیا کہ وہ منتشر و بے راہ ہو گئے اور انھیں سنبھلنے اور صف بندی کا موقع نہ مل سکا۔ میدان مُسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ یہ فتح اپنے دُور رس نتائج کے اعتبار سے فتح مکّہ کا پیش خیمہ تھی۔

اس جگہ ابو جہل کی ہلاکت کا واقعہ مختصراً بیان کیا جاتا ہے کیونکہ وہ تحریکِ اسلام اور آپؐ کا سخت دشمن تھا اور اس کے اصرار اور ہٹ دھرمی ہی کی وجہ سے یہ جنگ ہوئی تھی۔ اسے اپنی شجاعت و مردانگی پر بڑا ناز تھا۔ وہ میدانِ جنگ میں اپنے بیٹے عکرمہ کے پاس کھڑا تھا کہ عفرا کے دو نوجوان بیٹوں حضرت معاذؓ اور حضرت معوذؓ نے اسے دیکھ لیا۔ وہ چیتے کی پھُرتی اور تیزی سے اس پر جھپٹے اور اسے مہلک ضرب لگا کر گرا دیا۔ یہ دیکھ کر عکرمہ نے حضرت معاذؓ پر وار کیا اور ان کا بازو کاٹ ڈالا، لیکن تسمہ لگا رہا، جسے شیر دل حضرت معاذؓ نے پاؤں تلے رکھ کر جدا کر دیا اور زخم خوردہ شیر کی طرح لڑتے رہے۔ ابو جہل زخموں سے چور میدان میں تڑپتا رہا، لیکن کسی کو اسے اُٹھانے کی ہمّت نہ ہوئی۔ آخر کار حضرت عبدُاللہ بن مسعودؓ نے اس کا سر کاٹ کر حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے سامنے پیش کیا۔ آپؐ نے دیکھ کر فرمایا :

اَللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوْ : اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی اِلٰہ (یعنی معبُود و محبوب اور مطلوب و مقصود) نہیں۔ پھر فرمایا : اللّٰہ اکبر، الحمد للّٰہ الذی

صدق وعدہٗ ونصر عبدہٗ وھزم الاحزاب وحدہٗ : اللہ ہی عظیم ہے۔ اللہ ہی کے لیے حمد و ثنا ہے جس نے اپنا وعدۂ نصرت سچ کر دکھایا، اپنے بندے کی مدد کی، اور اس یگانہ و یکتا خدا نے تمام گروہوں کو شکست دی۔

اس جگہ ایک ازبس اہّم نکتے کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس جنگ میں جو تاریخ کی عظیم اور فیصلہ کُن جنگوں میں شمار ہوتی ہے، طرفین کا جانی نقصان اتنا کم ہوا کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ قریش اور مسلمانوں کے مقتولین کی تعداد بالترتیب ستّر اور چودہ تھی۔ اس کی بنیادی وجہ آپؐ کی جنگی حکمتِ عملی تھی جو اس اصول پر مبنی تھی کہ کم سے کم جانی نقصان کیا جائے اور زیادہ سے زیادہ فائدے حاصِل کیے جائیں۔ آپؐ کی اس حکمتِ عملی کے دو محرّکات تھے : ایک یہ کہ آپؐ طبعًا حد درجہ رحمدل تھے اور بنی نوع انسان کے لیے رحمت بن کر مبعوث ہوئے تھے۔ دوسرے یہ کہ آپؐ کی مردم شناس اور دوربین نگاہوں نے معلوم کر لیا تھا کہ اگر قریش مسلمان ہو گئے تو اپنے طبیعی خصائص کی بدولت نہ صرف تحریکِ اسلام کے ناقابلِ شکست پُشتیبان بن سکتے ہیں بلکہ اس کو عالمگیر بنانے میں سب سے زیادہ اور اعلیٰ خدمات سرانجام دے سکتے ہیں۔ نیز آپؐ کو اس بات کا یقین تھا کہ قریش کے دل اسلام کے عقایدِ جلیلہ و محکمہ کے حریف نہ ہو سکیں گے اور آخر کار مسخّر ہو جائیں گے۔

اس جگہ اس نکتے کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ تاریخ کا عمل قُدرت کا عمل ہوتا ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے جو بندے تاریخ کے عمل میں حُسنِ یقین و عمل کے ساتھ معاونت کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ اس سے اس امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں قرآنِ مجید نے مسلمانوں کے قتال و جہاد کو اور پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کے کنکریاں پھینکنے کے عمل کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسُوب کیا ہے۔

فتح کے بعد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے دو قاصد مدینۂ منورہ میں مسلمانوں کو خوشخبری سنانے کے لیے بھجوائے اور خود آپؐ نے حسبِ معمول مجاہدین کے ساتھ تین روز تک میدانِ کارزار میں قیام فرمایا۔ ۲۰ رمضان المبارک ۲ھ / ۱۶ مارچ ۶۲۴ء کو مجاہدین آپؐ کی قیادت میں فتح و نصرت کے پھریرے اُڑاتے اور راستے میں قبائل کے دلوں پر اپنی دھاک بٹھاتے، مدینے روانہ ہوئے، جہاں مسلمان نویدِ فتح سے مسرُور و خوشدل آپؐ اور مجاہدین کے لیے چشم براہ تھے۔

اہلِ مکّہ کو اپنی اس جارحیّت کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ اتلافِ جان و مال کے علاوہ

ان کی سیاسی و مذہبی شہرت کو نُقصان پہنچا۔ اس ہنگامۂ کارزار میں ان کے ستّر جوانمرد مارے گئے، جن میں عتبہ، ابوجہل، شیبہ، ابوالبختری، عاص بن ہشام، امیّہ بن خلف، زمعۃ بن الاسود، منبہ بن الحجاج ایسے رؤسائے قریش تھے، جو شجاعت میں نامور قبائل کے سپہ سالار تھے۔ تقریباً اتنی ہی تعداد میں ان کے فوجی گرفتار ہوئے۔ جنگی قیدیوں میں مشاہیر قریش یہ تھے : عبّاس (آپؐ کے چچا)، عقیل (حضرت علیؓ کے بھائی)، نوفل، اسود، عبدُ بن زمعہ، ابوالعاص بن ربیع (جو رسول اللہؐ کے داماد، یعنی حضرت زینبؓ کے شوہر) تھے، وغیرہ۔ مقتولین میں گیارہ افراد ان چودہ سرداروں میں سے تھے، جنھوں نے دار الندوۃ میں پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کے قتل کا منصوبہ بنایا تھا۔ تین جو بچ رہے، وہ بعد میں تحریکِ اسلام میں شامل ہو گئے۔

اس زمانے میں خصوصاً عرب کا دستورِ جنگ یہ تھا کہ جنگی قیدیوں کو بے دریغ قتل کر دیا جاتا تھا۔ نعشوں کا مُثلہ کرنے کا بھی رواج تھا، لیکن آپؐ چونکہ رحمۃ للعالمین تھے، اس لیے آپؐ نے ایسا نہ کیا۔ آپؐ کی بعثت کا مقصد بزم و رزم دونوں میں اقوامِ عالم کے لیے اُسوۂ حسنہ قائم کرنا تھا، لہٰذا تاوان کے عوض تمام اسیرانِ جنگ کو رہا کر دیا۔ اس ضمن میں ایک بصیرت افروز نکتے کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جن جنگی قیدیوں کا تاوان دینے والا کوئی نہ تھا، ان کا تاوان آپؐ نے یہ مقرر کیا کہ وہ صفّہ یونیورسٹی میں ایک مقررہ وقت تک طلبا کو تعلیم دیں، لیکن جو ان پڑھ تھے، انھیں ویسے ہی رہا کر دیا گیا۔

آپؐ کی ہدایات کے مطابق مسلمانوں نے جنگی قیدیوں کے ساتھ ایسا حُسنِ سلوک کیا کہ تاریخ شاید ہی اس کی کوئی نظیر پیش کر سکے۔ جنگی قیدیوں کی جاں بخشی و رہائی اور ان کے ساتھ بے مثال حُسنِ سلوک کے بڑے مُفید اور دُوررس نتائج نکلے۔ دنیا میں جنگی قیدیوں کو قتل نہ کرنے بلکہ انھیں رہا کرنے اور ان کے ساتھ حُسنِ سلوک کرنے کی مثال قائم ہو گئی۔ اسلام کا یہ جنگی اُصول تقریباً تیرہ صدیوں بعد اقوامِ متّحدہ کے دستور کی ایک اہم شق بن گیا۔ آپؐ کا یہ فیصلہ اقوامِ عالمِ انسانی پر بہت بڑا احسان اور آپؐ کی رحمۃ للعالمینی کی ایک واضح دلیل ہے۔

آپؐ کے اس طرزِ عمل سے تحریکِ اسلام کو جنگی نقطۂ نظر سے یہ فائدہ پہنچا کہ دشمن کے وہ سپاہی جو نامساعد حالات میں بالخصوص جان پر کھیل جانے سے گھبرایا کرتے ہیں، ان

کے لیے اس اصولِ جنگ نے مسلمانوں کا اسیر بن کر جان بچانے کا نادر موقع فراہم کر دیا۔ جنگی نفسیات کے ماہروں نے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں اسلام کے اس اصول کی اہمیت و افادیت کو صدیوں بعد تسلیم کیا ہے۔

جنگ کے سلسلے میں آپؐ کا بنی نوعِ انسان پر یہ احسان ہے کہ آپؐ نے مُثلے کی ممانعت کر دی۔ اس عہد میں خاص کر عربوں میں مُثلہ کرنے کا عام رواج تھا۔ مُثلہ کا مطلب ہے جنگی قیدیوں اور نعشوں کے اعضا و جوارح کو کاٹنا، ان کا حلیہ بگاڑنا اور ان کی بے حُرمتی کرنا۔ عورتوں بوڑھوں اور بچوں، نیز دشمن کے غیر متحارب لوگوں پر تلوار نہ اُٹھانا بھی آپؐ کا جنگی اُصول تھا، جسے چودہویں / اُنیسویں صدی میں اقوامِ متحدہ کو اپنانا پڑا ہے۔

جنگِ بدر کے نتائج :

اس فتح سے مسلمان قریشِ مکّہ کے مقابلے میں اب ایک برابر کا فریق بن چکے تھے اور یہ وہ حقیقت تھی جس کا قریش تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس ذلّت آمیز شکست سے قریش کو پہلی مرتبہ مسلمانوں کی عسکری قوت اور جداگانہ معاشرتی حیثیت کا احساس ہوا۔ نقطۂ نظر کی اس تبدیلی کا مسلمانوں کے حوالے سے ان کے حوصلے اور کردار پر اثر انداز ہونا فطری تھا، اور یہ دونوں باتیں مسلمانوں کے حق میں دُوررس نتائج کی حامل تھیں۔ علاوہ بریں اس شکست سے قریش کی شہرت اور ان کے سیاسی اثر و رسُوخ کو خاصا نقصان پہنچا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی قدیم تجارتی شاہراہ غیر محفوظ ہو گئی اور اس وجہ سے ان کی بیرونی تجارت اور نتیجۃً معیشت خاصی متاثّر ہوئی۔

بدر کی فتح سے مسلمانوں کو سیاسی لحاظ سے بالخصوص بہت فائدہ پہنچا۔ عرب کے قبائل میں ان کی عسکری قوّت کی دھاک بیٹھ گئی۔ یہود، جو یثرب میں اپنی معاشی سیادت کی وجہ سے ایک زبردست سیاسی و عسکری قوّت بن چکے تھے، مسلمانوں کی اس فتح سے مرعوب بھی ہوئے اور چونک بھی اُٹھے۔ وہ اسلام کی نوزائیدہ مملکت اور تحریکِ انقلاب سے زبردست خطرہ محسُوس کرنے لگے اور وہ خوف بداماں عزم کے ساتھ مسلمانوں کے استیصال کے لیے سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں مشغول ہو گئے۔

بہرحال اس فتح سے مسلمانوں کے سیاسی اور ثقافتی اثر و رسُوخ میں معتدبہ اضافہ

ہوا اور تحریکِ اسلام کو قریب قریب سارے عرب میں سرایت کر جانے کی راہیں بہت حد تک ہموار ہوگئیں۔ اس فتح کا ایک فوری اہم نتیجہ یہ نکلا کہ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی، جو قوت و صولت اور اثر و رسوخ کا مالک اور مسلمانوں کا زبردست حریف اور ان کے لیے ایک مستقل خطرہ تھا، سیاسی مصلحت کی بنا پر اپنے گروہ سمیت تحریکِ اسلام میں شامل ہوگیا۔ سیاسی محاذ پر یہ آپ ﷺ کی زبردست کامیابی تھی۔

جنگِ بدر کی اہمیّت و فضیلت :

جنگِ بدر ایک تاریخ ساز معرکہ ہے۔ دلیل یہ ہے کہ اگر اس میں مسلمانوں کو شکست ہو جاتی تو بنی نوعِ انسان کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ انسانیت خالص توحید کی روشنی اور رحمت و محبّت اور عدل و احسان کی برکات سے محروم رہتی۔ عورت، یتیم، محنت کش، کسی کو معاشرے میں عزت و آزادی کا مقام حاصل نہ ہو سکتا، اور نہ انھیں ان کے انسانی حقوق ہی ملتے۔ انسان استحصالی قوتوں کی غلامی سے نجات حاصل نہ کر سکتا، اور دنیا امن و سلامتی سے محروم رہتی۔ دُنیا میں علم و حکمت کا احیا نہ ہوتا، ثقافتِ انسانی میں جمود و تعطّل برقرار رہتا اور مکارمِ اخلاق کی تکمیل نہ ہو پاتی۔ انسان نجانے کفر و شرک اور ظلم و جہل کی وادیوں میں کہاں تک بھٹکتا پھرتا اور اس کا انجام کیا ہوتا؟ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جنگ کے موقع پر بارگاہِ ربّ العزّت میں جو دُعا مانگی تھی، اس میں یہی حقیقت مضمر تھی۔ آپ ﷺ کی دُعا یہ تھی : اے اللہ ! اگر تیری یہ مُٹھی بھر جماعت ہلاک ہوگئی تو پھر قیامت تک تیری عبادت نہ ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نے جنگِ بدر کا ذکر (خاص کر سورۃ الانفال میں) جن الفاظ میں کیا ہے اس سے بھی اس واقعے کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔ علاوہ بریں بدر اور اہلِ بدر سے متعلق جو احادیث طیبہ منقول ہیں، ان سے بھی اس کی اہمیّت و فضیلت کی تصدیق ہوتی ہے۔ مثلاً صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السّلام نبیِ کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں آئے اور پوچھا : آپ اہلِ بدر کو مسلمانوں میں کیا حیثیت دیتے ہیں؟ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا : میں انھیں سب مسلمانوں سے افضل سمجھتا ہوں۔[۸]

ایک اور حدیثِ طیبہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ بدر کو دیکھا اور فرمایا : اب تم جو چاہو کرو، میں تم کو بخش چکا ہوں۔[۹]

یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ نہ صرف عہدِ نبوی ﷺ میں بلکہ خلافتِ راشدہ میں بھی اہلِ بدر کو دوسرے مسلمانوں سے افضل سمجھا جاتا تھا۔

مختصر یہ کہ جنگِ بدر ایک انقلاب آفرین و تاریخ ساز واقعہ ہے جو اپنے ہمہ گیر و عالمگیر اور مثبت و حسین اثرات اور دُور رس نتائج کے سبب منفرد و یکتا حیثیت رکھتا ہے۔

مالِ غنیمت سے مُتعلّق اِسلام کا فیصلہ :

جنگِ بدر میں مجاہدین کے ہاتھ جو مالِ غنیمت آیا، اس کی تقسیم سے متعلّق ان میں اختلاف پیدا ہوا۔ ایک فریق کی رائے تھی کہ جو مال جس کے ہاتھ آیا، اسی کا ہے۔ دوسرے فریق کا موقف تھا کہ مالِ غنیمت سب مجاہدین میں مساویانہ طور پر تقسیم ہونا چاہیے، کیونکہ سب کی مشترکہ کوششوں سے کفّار کو شکست ہوئی ہے اور تقسیمِ کار کی وجہ سے بعض مجاہدین مالِ غنیمت حاصل کرنے سے محروم رہے ہیں۔ منطقی اعتبار سے یہ موقف درُست تھا، لہٰذا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے بیت المال کے لیے خمس نکال کر مالِ غنیمت سب مجاہدین میں تقسیم کر دیا بلکہ ان مجاہدین کا حصّہ بھی نکال لیا جنھیں آپ ﷺ مدینہ منورہ میں ضروری امور سرانجام دینے کے لیے چھوڑ آئے تھے، مثلاً حضرت عمرو بن ام کلثوم رضی اللہ عنہ، حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ بن عبد المنذر اور حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ۔

مالِ غنیمت کا لالچ عربوں کی گھٹّی میں پڑا ہوا تھا اور اس کی لُوٹ سرمایۂ افتخار سمجھی جاتی تھی۔ اس لالچ کو ان کے دل سے نکالنا اور جنگ سے متعلّق ان کے نقطۂ نظر کو بدلنا، آپ ﷺ کی بعثت کے بنیادی مقاصد میں سے تھا، اور اس کے لیے وقت کی ضرورت تھی۔ ہم عنقریب دیکھیں گے کہ جنگِ اُحد میں یہ مالِ غنیمت کا لالچ تھا جس کی وجہ سے مجاہدین نے لشکرِ قریش کا تعاقب کرنے پر مالِ غنیمت لوٹنے کو ترجیح دی اور اس طرح دُشمن کو پلٹ کر حملہ کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک تو مجاہدین نے فتح کا سُنہری موقع ضائع کر دیا اور دوسرے زبردست جانی نقصان اٹھایا۔ اصل یہ ہے کہ اگر پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم اپنی بے مثال قیادت اور صبر و استقامت کی بدولت اس از حد خطرناک صورتِ حال سے عہدہ برآنہ ہوتے تو مسلمانوں کی شکست اور ہلاکت و بربادی یقینی ہو چکی تھی۔ اللہ تعالیٰ بلاشبہ حق کا حامی و ناصر ہے لیکن دشمن کے مقابلے میں اس کی حمایت و نُصرت

حاصل کرنے کے لیے اس کے بتائے ہوئے اصولوں پر عمل کرنا لازمی ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے سورۂ انفال (۸ : ۴۵ تا ۴۷) میں ان اصولوں کی صراحت کر دی ہے :

(۱) دُشمن سے مقابلے کے وقت ثابت قدم رہو اور
(۲) اللہ کو کثرت سے یاد کرو۔
(۳) اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو، یعنی ان کے احکام پر عمل کرو۔
(۴) آپس میں نہ جھگڑو، کیونکہ اس سے ہوا اُکھڑ جاتی ہے اور صفوں میں انتشار اور دلوں میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔
(۵) صبر کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔
(۶) فخر و مباہات اور ریاکاری سے احتراز کرو۔
(۷) کِسی کو اللہ کی راہ سے نہ روکو۔

زمانے کا یہ دستور رہا ہے کہ جنگ کے محرّکات خواہ کچھ ہوتے، لیکن شکست و فتح کے ساتھ ہی لُوٹ مار اور دار و گیر کا بازار گرم ہو جاتا۔ مال و دولت، عورتیں، بچے، مرد جو کچھ بھی فاتح سپاہ کے افراد کے ہاتھ آتا، وہ انفرادی طور پر ان کا ہو جاتا، حکومت اس سے تعرّض نہ کرتی۔ اس لُوٹ مار کو مالِ غنیمت سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ سپاہی اپنے اپنے اسیروں کو اپنا غلام اور کنیز بنا لیتے یا منڈی میں فروخت کر دیتے۔ اس سے ایک تو غلامی کا رواج بڑھ گیا اور غلاموں کی تجارت کو فروغ ہوا اور دوسرے مالِ غنیمت کا لالچ جنگوں کا محرّک بن گیا۔

دومۃ الکبریٰ میں غلامی کا اس قدر رواج تھا کہ امرا اور مرفّہ الحال لوگوں کے اندر اور باہر کے سب کام کاج غلام ہی کیا کرتے تھے۔ ان کی زراعت، صنعت و حرفت، تعلیم و تربیت اور تفریحی یا ثقافتی مشاغل کا انحصار زیادہ تر غلاموں اور کنیزوں ہی پر تھا۔ قریب قریب یہی صورتِ حال عرب معاشرے میں تھی۔ غلام چونکہ استحصالی معاشروں کے پشتیبان بن گئے تھے، اس لیے ان کی تجارت عام اور نفع بخش تھی۔ چنانچہ مالِ غنیمت کا لالچ جنگ و قتال اور غلامی کے رواج کا ایک زبردست محرّک بن گیا تھا، جسے ختم کرنا نوعِ انسانی کو غلامی کے سلاسل سے نجات دلانے اور معاشرۂ انسانی میں امن و سلامتی قائم کرنے کے لیے وقت کا اہم تقاضا تھا، جسے پورا کرنا اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کے بنیادی فرائض میں سے تھا۔ چنانچہ مالِ غنیمت کے لالچ کو ختم کرنے کی خاطر اسلام نے یہ اصول پیش کیا کہ جنگ میں جو مالِ غنیمت بھی ہاتھ آئے، وہ سپاہیوں کا نہیں حکومت

کا ہے، جس میں خیانت کرنا گناہِ کبیرہ ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

(اے محمدؐ ! لوگ) تم سے مالِ غنیمت کے بارے میں دریافت کرتے ہیں (کہ کیا حکم ہے؟) کہہ دو، مالِ غنیمت دراصل اللہ اور اس کے رسولؐ کا ہے۔ پس اگر تم مومن ہو تو چاہیے کہ (اس کی وجہ سے نہ جھگڑو بلکہ اس معاملے میں) اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو۔ اپنا باہمی معاملہ درُست رکھو، اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت اختیار کرو۔[10]

اسلام کے اس اصولِ مالِ غنیمت میں یہ اصل مضمر ہے کہ جنگ اور جہاد دو مختلف نوعیت کے معرکے ہیں۔ جنگ ذاتی، قبائلی، علاقائی، قومی یا ملکی مفادات کے لیے لڑی جاتی ہے، جبکہ جہاد فی سبیل اللہ یعنی اللہ کی راہ میں ہوتا ہے، جو حق و صداقت، امن و سلامتی، عدل و احسان اور رحمت و محبّت کی راہ ہے، جسے قرآن مجید "تقویٰ" سے تعبیر کرتا ہے۔ ہمارے اس استنباط کی تائید مندرجۂ ذیل احادیثِ طیبہ سے بھی ہوتی ہے :

حضرت موسیٰؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نبیِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا : ایک شخص تو مالِ غنیمت کی خاطر لڑتا ہے اور دوسرا شہرت و ناموری کی خاطر، اور کوئی اس لیے لڑتا ہے کہ لوگ اس کے علوِ مرتبت کو دیکھیں۔ ان میں سے کون اللہ کی راہ میں لڑنے والا ہے؟ آپؐ نے فرمایا : وہ شخص اللہ کی راہ میں لڑنے والا ہے جو اللہ تعالیٰ کی بات (قرآن یا دین) کو بلند کرنے کے لیے لڑتا ہے۔[11]

آپؐ کے اس ارشاد میں جہاد کی حقیقت ایسے واضح طور پر بیان کر دی گئی ہے کہ جہاد کی نوعیّت و غایت سے متعلّق قطعاً کوئی ابہام نہیں رہا۔ اس سے ملتی جُلتی ایک حدیثِ طیبّہ میں ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا : ایک شخص اللہ کی راہ میں جہاد کا ارادہ رکھتا ہے لیکن وہ دنیا کے مال و دولت کی طلب و آرزو بھی رکھتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا : ایسے شخص کو کسی قسم کا اجر و ثواب نہیں ملے گا۔[12]

آخر میں ایک ایسی حدیثِ طیبّہ نقل کی جاتی ہے، جو اس بارے میں قولِ فیصل کا درجہ رکھتی ہے : حضرت معاذؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا : جہاد دو قسم کا ہے : جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی چاہی اور امام کی اطاعت کی، حلال و پاک مال و دولت کو خرچ کیا، شریکِ کار سے اچھا سلوک کیا یعنی اسے سہولت پہنچائی اور اس کے کام کو آسان بنایا اور فساد

سے بچتا رہا تو اس کا سونا اور جاگنا ثواب ہی ثواب ہے، یعنی اسے ہر قول کا پُورا پُورا ثواب مِلے گا، لیکن جس شخص نے فخر اور نام و نمود اور شُہرت و تشہیر کے لیے جہاد کیا اور امام کی نافرمانی کی اور زمین میں فساد کیا تو وہ جہاد سے کوئی بدلہ لے کر نہیں لوٹے گا، یعنی اسے کسی قسم کا اجر و ثواب نہیں ملے گا۔[۱۳]

اسلام کے نزدیک انسانی جان کی قدر و قیمت اور اہمیّت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک فرد کا ناحق قتل ایسا ہے جیسے جملہ افرادِ نسلِ انسانی کو ہلاک کر ڈالنا۔ اسی طرح کسی ایک شخص کو موت کے مُنہ سے بچانا ایسا ہے جیسے پوری نسلِ انسانی کو دوبارہ زندگی عطا کرنا:

"جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا، اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا، اور جس نے کسی کی جان بچائی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔"[۱۴]

فلسفۂ جہاد پر خلوصِ دل کے ساتھ غور و فکر کریں تو اس اصل کا سراغ ملتا ہے کہ جہاد کی غایت ہی "احیائے انسانی" ہے، یعنی انسان کی بقا اور اس کی معنوی زندگی کا احیا۔ اس اعتبار سے جہاد کا اجر و ثواب بھی بے اندازہ ہونا چاہیے اور ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ جہاد میں شہادت پانے کا اجر جنّت کی حیاتِ محض ہے، یعنی حسن و نور کی فضائے بیکراں میں لذّت و سرور کی حیاتِ جاودانی۔

"جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں، انھیں مُردہ نہ سمجھو۔ یہ تو حقیقت میں زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں، جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انھیں دیا ہے اس پر خوش و خرم ہیں اور مطمئن ہیں کہ جو اہلِ ایمان ان کے پیچھے رہ گئے ہیں اور ابھی وہاں نہیں پہنچے ہیں، ان کے لیے بھی خوف و غم کا موقع نہیں ہے۔ وہ اللہ کے انعام اور اس کے فضل پر شاداں و فرحاں ہیں اور ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ مومنوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔"[۱۵]

جہاد کی فضیلت اور اس کے اجر و ثواب سے متعلق بہت سی احادیثِ طیبہ کُتبِ حدیث سے منقول ہیں۔ اختصار کے پیشِ نظر دو احادیث کے اقتباس اور ایک مکمل نقل کی جاتی ہے:

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: صبح کو یا شام کو اللہ کی راہ میں (جہاد کے لیے) جانا دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے بہتر ہے۔[۱۶]

"آپؐ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ میں اس

کو بہت پسند کرتا ہوں کہ اللہ کی راہ میں مارا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر مارا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر مارا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں۔[۱۷]

"آپؐ نے فرمایا: جنت میں سو درجے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لیے تیار کیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں۔ ان دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا آسمان و زمین کے درمیان فاصلہ ہے۔ جب تم اللہ تعالیٰ سے جنت مانگو تو "فردوس" کو مانگو، اس لیے کہ جنّت کا درمیانی و اعلیٰ حِصّہ ہے۔[۱۸]

مُہم یا غزوۃ الکُدر (۲۴-۲۵ رمضان المبارک ۲ھ / ۲۰-۲۱ مارچ ۶۲۴ء):

پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم اگرچہ عرب کی سب سے بڑی قوت کو شکست دے کر اور ایک تاریخ ساز معرکہ سر کر کے واپس مدینۂ منورہ تشریف لائے تھے اور مطمئن و خوشدل بھی تھے لیکن آپؐ کی شخصیّت میں وہی وقار اور جمال و جلال، انداز میں وہی فقر و غنا اور مزاج میں وہی تواضع و اِنکسار تھا، جو پہلے تھا۔ آپؐ تشریف لائے تو مدینے کی فضا خوشیوں سے جگمگا اُٹھی۔ مسلمان بجا طور سے خوش تھے کہ انھیں قریش کے مقابلے میں فتح ہوئی تھی اور وہ امتحانِ وفا میں پُورے اُترے تھے، لیکن ان کی خوشی میں رنگِ تقویٰ نمایاں تھا۔ گھر گھر میں حمد و ثنا اور تسبیح و تکبیر کے مدھم نغموں کی پُر کیف گونج تھی اور صدقات و خیرات کا بازار گرم تھا۔ مسلمان ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے، خوشی سے مصافحہ و معانقہ کرتے اور سجدۂ شکر بجا لاتے۔ یہ تھا مجاہدین کا جشنِ فتح۔ اسلامی ثقافت کی ایک امتیازی خوبی یہ تھی کہ وہ رنگِ لہو و لعب اور نشاطِ غفلت سے ناآشنا تھی۔ آپؐ آتے ہی تحریکِ اسلام اور مملکت کے امور میں مصروف ہو گئے اور مجاہدین بھی اپنے کاموں میں لگ گئے۔ یہ یاد رہے کہ ان کے کاموں میں تحریکِ اسلام کے کام بھی شامل ہوتے تھے۔ بہرحال ابھی آپؐ نے بدر سے واپس آ کر دم بھی نہ لیا تھا کہ اطّلاع ملی کہ بنی سُلیم الکُدر میں مدینے کو تاخت و تاراج کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ فوری اِقدام اور دشمن کو غفلت و بے خبری میں جا لینا آپؐ کا اصولِ جہاد تھا۔ چنانچہ آپؐ نے حضرت سباع بن عرفطہ غفاریؓ (یا حضرت ابنِ اُمِ مکتومؓ) کو مدینے کا نگران مقرر کیا اور خود مجاہدین کے ایک دستے کو لے کر اس فتنے کو فرو کرنے کے لیے الکُدر پہنچ گئے۔ عرب میں شبخون یا چھاپہ مارنے کا عام رواج تھا لہٰذا دشمن سے باخبر و ہوشیار رہنا اور حملہ و فرار کی راہوں کو نگاہوں میں رکھنا ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ چنانچہ بنو سُلیم کو آپؐ

کی پیش قدمی کی اطلاع مل گئی اور وہ آپؐ کے اس غیر متوقّع اور ناگہانی اِقدام سے اس قدر مرعوب سراسیمہ ہوئے کہ منتشر ہو کر پہاڑوں میں روپوش ہو گئے۔[۱۹]

پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حسبِ معمول تین دن وہاں قیام فرمایا اور دشمنوں کے دلوں پر دھاک بٹھا کر مدینے مراجعت فرمائی۔

عید الفطر اور صدقۃ الفطر (۲۸، رمضان المبارک ۲ھ/ ۲۴، مارچ ۶۲۴ء) :

آپؐ اس مہم سے واپس تشریف لائے تو بنی نوعِ انسان کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص جشنِ مسرّت منانے کے آداب سکھانے کے لیے عید الفطر اور صدقۃ الفطر کے احکام نازل ہوئے۔ عیدین اسلامی ثقافت کے دو مظاہر ہیں۔ بہر حال یہ مسلمانوں کی پہلی عید تھی، جو عیدِ فتح بھی تھی اور عیدِ آزادی بھی۔ یہ عید، جو جشنِ فتح بھی تھی، کیا تھی؟ مسلمانوں کا مل کر اللہ تعالیٰ کے حضور سجدۂ تشکّر و عبودیّت۔

فلسفۂ مسرّت یہ ہے کہ اس میں دوسروں کی خوشیاں جس قدر شامل ہوتی جاتی ہیں، اسی قدر وہ کمیّت میں بڑھتی اور کیفیّت میں اعلیٰ ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی مسرّت کو آفاقی بنانے کی خاطر اللہ تعالیٰ نے ملّتِ اسلامیہ پر اجتماعی طور پر عید منانی واجب کر دی ہے۔ اسلامی احکام کے مطابق عید منانے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں پر صدقۂ فطر واجب ہے اور نماز سے پہلے اسے معاشرے کے ضرورت مند افراد میں تقسیم کرنا مسنون ہے، نیز ان پر مجاہدانہ شان سے اجتماعی طور پر عید کی نماز پڑھنا واجب ہے۔ عید کی خوشی میں نہانا، دھونا، حسبِ توفیق نئے یا صاف ستھرے کپڑے پہننا، خوشبو لگانا، عزیز و اقارب اور دوستوں سے ملنا، معانقہ و مصافحہ کرنا، انھیں حسبِ توفیق تحفے تحائف بھیجنا، منہ میٹھا کرنا اور صدقہ و خیرات کرنا مسنون ہے۔ کثرتِ تکبیر و ذکر سے دل کو منوّر و مسرور کرنا بھی مسنون ہے۔ مسلمانوں نے پہلی مرتبہ ایک آزاد قوم کی حیثیت سے آپؐ کی امامت میں عید کی نماز پڑھی اور خطبۂ عید سُنا۔[۲۰]

حضرت فاطمۃُ الزہراؓ کی رخصتی (شوّال ۲ھ/ اپریل ۶۲۴ء) :

آپؐ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم تھے، اس لیے آپؐ کا یہ مشن بھی اتنا ہی عظیم تھا، جسے جلد سے جلد پورا کرنے کی آپؐ میں ایسی لگن اور تڑپ تھی کہ آپؐ طبعاً ایک لحظہ کے لیے

بھی اس سے غافل یا بیکار نہیں رہ سکتے تھے۔ پھر "دوست" کی بھی یہی خواہش تھی کہ آپؐ شب و روز کام میں لگے رہیں، اور اس کے یہ الفاظ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ (الانشراح ۹۴: ۷، یعنی فراغت پاتے ہی پھر کام میں جُٹ جاؤ) آپؐ کے قلبِ منوّر کی فضاؤں میں گونجتے رہتے تھے۔ مدینۂ منوّرہ میں آتے ہی آپؐ مسلمانوں کی تعلیم و تربیت اور تزکیہ میں، نیز صلوٰۃ و زکوٰۃ کے نظام کو زیادہ سے زیادہ مؤثّر و فعّال بنانے میں مصروف ہو گئے۔ علاوہ بریں آپؐ کو مملکت کے استحکام و سالمیّت اور اس کے دفاع کی فکر بھی دامنگیر رہتی تھی، غرضیکہ آپؐ کی نظریں دوست و دشمن اور ملک و معاشرے کے ایک ایک گوشے پر تھیں۔ گھریلو ذمہ داریوں کا بھی آپؐ کو پورا پورا احساس تھا۔ حضرت فاطمۃ الزہراؓ جو آپؐ کی سب سے چھوٹی اور پیاری بیٹی تھیں اور جن کا نکاح چند ماہ پیشتر حضرت علیؓ سے ہوا تھا، ان کی رخصتی بھی ضروری تھی۔ وہ سیّد المرسلینؐ، حکمرانِ مدینہ اور عظیم ترین انسان کی صاحب زادی اور خاتونِ جنّت تھیں، لیکن ان کی شادی اور رُخصتی جس سادگی سے ہوئی، اس میں ان مسلمانوں کے لیے عبرت و موعظت کا سامان ہے جنھوں نے نکاح اور رخصتی کو جہیز سے مشروط کر کے اور اسے نام و نمود اور لعب و لہو کا ذریعہ بنا کر اس کی اہمیّت و تقدّس کو مجروح کر دیا ہے۔ آپؐ نے خاتونِ جنّت کو یہ جہیز دیا تھا: ایک چارپائی، چمڑے کا تھیلا، ایک مشکیزہ، دو چکّیاں اور دو مٹّی کے گھڑے۔[۲۱]

تاریخ شاہد ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا گھر سامانِ آسائش سے ناآشنا، زندگی رہینِ خوف و خطر اور اندازِ زیست زاہدانہ تھے۔ کیا یہ حقیقت ان معترضین کے لیے آئینۂ عبرت نہیں جو آپؐ کی ذاتِ اقدس پر تعیّش پسندی کا بہتان لگاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تعصّب انسان کو "حق کور" بنا دیتا ہے اور اس کی زندہ مثالیں صیہونی و صلیبی اور ان کے ہمنوا مستشرقین ہیں۔

اِنقلاب بالحق کا یہود سے تصادم (۱۵، شوال ۲ھ/ ۱۰، اپریل ۶۲۴ھ) :

مدینے میں اسلام کی تحریکِ انقلاب کے سب سے طاقتور حریف یہودی قبائل بنو قینقاع، نُضیر اور قریظہ تھے۔ اسلام سے پہلے انصار کے قبائل اوس و خزرج قبائلی و نسلی تفاخر و مخاربت اور جنگی اوصاف کی بدولت یہود کے برابر کے جوڑ تھے، لیکن بُعاث کی خانہ جنگی نے ان کی یک جہتی و اتحاد، نیز عسکری، سیاسی اور معاشی قوت کو زبردست نقصان پہنچایا تھا اور یہود کے

مقابلے میں ان کی حیثیت ہر لحاظ سے فروتر ہو چکی تھی۔

زراعت، تجارت، صنعت و حرفت پر قریب قریب یہود کا قبضہ تھا' اس لیے ان کا معیارِ زندگی انصار کے مقابلے میں بہت بلند تھا۔ معاشی وسائل پر ان کی اجارہ داری اور سرمایہ کاری کے سبب انصار ان کے دست نگر اور مقروض تھے۔ شرحِ سود بہت زیادہ تھی۔ اگر کسی کے پاس زر، زمین وغیرہ نہ ہوتی تھی تو یہود انھیں اپنی عورتیں اور اولاد کو رہن رکھنے پر مجبور کرتے تھے۔ یہود نے انصار کو اپنے دامِ قرض و سود میں اس طرح پھنسا لیا تھا کہ اس سے نکلنا ان کے بس کا روگ نہ رہا تھا۔

وسائلِ پیداوار کسی گروہ، طبقے یا جماعت کے قبضے میں آجائیں تو دوسروں کا استحصال کرنا اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے اور اس سے اسے ایسا کرنے کی تحریک و تشویق بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ یہود وسائلِ پیداوار پر اپنی اجارہ داری قائم کر کے غیر یہودی قبائل کا خوب استحصال کرتے تھے اور انھوں نے انھیں معاشی طور پر اپنا غلام بنا لیا تھا۔

علاوہ بریں یہود علم و حکمت اور تہذیب و تمدّن کے لحاظ سے بھی ایک ممتاز قوم تھی اور مشرک و بت پرست قبائل ان پڑھ اور اُجڈ تھے۔ اس اعتبار سے بھی وہ یہود سے مرعوب تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یہود اپنے آپ کو یثرب کی ایک ممتاز قوم اور یثرب کی حکومت و سیادت کو اپنا حق سمجھتے تھے۔ یہود بلاشبہ ایک ذہین و فطین اور مہذّب قوم تھی' لیکن بخل اور سُود خوری نے انھیں قسی القلب بنا دیا تھا۔ دجل و فریب' منافقت و ریاکاری، عیاری و عہد شکنی اور کذب و کتمانِ حق ان کے قومی خصائص بن چکے تھے۔ وہ زناکاری، شراب نوشی، قمار بازی وغیرہ کے بڑے دلدادہ تھے۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے لوگ یہود سے طبعاً نفرت کرتے تھے اور انھیں ان کی سیادت گوارا نہ تھی جس سے وہ نجات حاصل تو کرنا چاہتے تھے' لیکن ایسا کر نہیں پاتے تھے۔ انصار کو اس صورتِ حال سے صرف "انقلاب" ہی رہائی دلا سکتا تھا۔ اسلام کی تحریکِ انقلاب میں انصار کی رضاکارانہ شمولیت کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی تھی۔ یہود کی یہ صورتِ حال تھی' جب تحریکِ اسلام کو مدینے میں قدم جمانے کا موقع ملا تھا۔

اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کے عقایدِ جلیلہ و محرّکہ اور اس کی فطری تعلیمات کی نہ تو یہودیّت حریف ہو سکتی تھی اور نہ ہوئی۔ علاوہ ازیں انصار کے تحریکِ اسلام میں شامل ہو جانے سے یہود کی معاشی، سیاسی اور ثقافتی سیادت کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ اسلام میں چونکہ سُود لینا اور دینا

اور سودی کاروبار کرنا حرام تھا' اس لیے یہود کو انصار کے سود سے جو منافع حاصل تھا' اس میں بتدریج کمی ہوتی جاتی تھی اور اس سے ان کی معیشت اور تجارت متاثّر ہو رہی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ یہودی سرمایہ داروں، جاگیرداروں، سرداروں اور مذہبی پیشواؤں کو اسلام کے عقایدِ اخوّت و مساوات گوارا نہیں ہو سکتے تھے اور نہ ہوئے، کیونکہ ان کی سیادت و عزّت، تفوّق اور امتیازی حقوق کو خطرہ لاحق ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ سرمایہ داری و جاگیرداری کے خوگر معاشرے میں اخوّت و مساوات کے نعرے کو بغاوت سمجھا جاتا ہے، لہٰذا یہود کے ان استحصالی طبقوں نے بھی اسلام کی تحریکِ انقلاب کو اپنے خلاف باغیانہ تحریک سمجھا اور ٹھیک سمجھا۔ ان تمام وجوہ کی بنا پر یہود اسلام کی تحریکِ انقلاب اور مسلمانوں کے دشمن ہو گئے۔ یہود اپنے علم و فراست کے باوجود سیاسی بصیرت و حکمتِ عملی میں آپؐ کا جوڑ نہ تھے۔ آپؐ کو یہود کے خصائص کا پتا تھا، لہٰذا ان کے شر سے بچنا انتہائی ضروری تھا۔ چنانچہ آپؐ نے مدینے میں آتے ہی شہری مملکت قائم کی اور ساتھ ہی یہود سے حلف اور بقائے باہمی کے اصول پر سیاسی و دفاعی معاہدہ کر لیا' جس کا ذکر گزر چکا ہے۔

علاوہ ازیں آپؐ اور آپؐ کے متّبعین ازروئے وحی و تنزیل یہود کے تمام پیغمبروں اور ان کے صحائف و کُتبِ سماوی پر ایمان رکھتے اور اس کا برملا اظہار کرتے تھے۔ اس وجہ سے آپؐ یہود اور خاص کر ان کے علما کا احترام کرتے' ان کے لیے خیرسگالی کے جذبات کا اظہار کرتے اور ان سے تعاون بڑھانے کی جستجو میں لگے رہتے تھے، لیکن علم رکھنے کے باوجود نہ تو یہود کے کان گوشِ حق نیوش تھے اور نہ آنکھیں دیدۂ عبرت نگاہ ہی تھیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے دلوں پر قساوت کی ایسی مُہر لگی ہوئی تھی کہ ان پر حُسن و حق اور مہر و وفا کا اثر ہی نہ ہوتا تھا۔ ان کی سوچ کی راہیں ٹیڑھی اور عقل مکّاری و حیلہ جوئی کی خوگر ہو چکی تھی، لہٰذا مسلمان ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے تو وہ سرد مہری کا مظاہرہ کرتے اور اگر مجبوراً انھیں ہاتھ تھامنا بھی پڑتا تھا تو ان کی نیّت موقع ملتے ہی اسے کاٹ ڈالنے کی ہوتی تھی۔ وہ سیاسی و معاشرتی دباؤ یا کسی اور مصلحت سے مسلمانوں سے معاہدہ کر بھی لیتے تھے تو اس پر کاربند رہنے کے بجائے اسے توڑنے کی فکر میں رہتے تھے۔ مسلمان برملا یہود کو مشرکوں کے مقابلے میں اچھا سمجھ کر ان سے ترجیحی سلوک کرتے تھے' لیکن یہود مشرکوں کو مسلمانوں پر ترجیح دیتے اور انھیں اچھا سمجھتے تھے۔[۲۲] اس کی ایک بنیادی وجہ یہ تھی کہ باطل آمیز یہودیت نہ تو اسلام کی حقّانیّت اور اس کے سچے اور

فطری عقاید کے سامنے ٹھہر سکتی تھی اور نہ اس کا استحصالی معاشرتی نظام اسلام کے ظلم اور استحصال سے منزّہ و ناآشنا معاشرے کا حریف ہی ہو سکتا تھا۔

صدیوں کی محکومی و غلامی، ذلّت و مسکنت اور خانہ بر اندازی و آوارہ گردی کی وجہ سے عیّاری ہر جگہ ملّتِ یہود کی فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اسلام کو بدنام کرنے اور لوگوں کو اس سے بدظن و برگشتہ کرنے کا ایک منصوبہ بنایا۔ وہ یہ تھا کہ چند یہود کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جاتے اور اس کی تشہیر کرتے، اور پھر اچانک اسلام چھوڑنے کا اعلان کر دیتے اور اسے بدنام کرنے کی خاطر طرح طرح کی جھوٹی افواہیں پھیلاتے، لیکن حق کے مقابلے میں ان کا یہ باطل حربہ کامیاب نہ ہو سکا۔

مدینے میں انصار ہی تحریکِ اسلام کے پشتیبان اور مہاجر مسلمانوں کے معاون و مددگار تھے۔ یہود اپنی ان چالوں سے انصار کو مرتد نہ کر سکے تو انھوں نے ایک خطرناک منصوبہ بنایا۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو مسلمانوں اور تحریکِ اسلام کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ مدینے میں انصار کے دو قبائل تھے : اوس اور خزرج۔ اسلام کے ورود سے پہلے یہود کی سیاسی چالوں کی وجہ سے ان میں اتّحاد اور یک جہتی کا فقدان تھا اور وہ ایک دوسرے کے درپئے آزار رہتے تھے۔ جنگِ بُعاث بھی یہودی سازش ہی کا شاخسانہ تھی، جس میں فریقین کے کُشتوں کے پُشتے لگ گئے تھے۔ اسلام کی تعلیمات کی برکت اور آپؐ کے حُسنِ تدبّر کی بدولت یہ دونوں قبائل متّحد و ہم آہنگ ہو گئے تھے اور ان میں قومیّت جڑ پکڑنے لگی تھی۔ یہود نے اس جڑ ہی کو کاٹنا چاہا۔ چنانچہ ایک مجلس میں جہاں اوس و خزرج کے لوگ اور یہود جمع تھے، یہود نے جنگِ بُعاث کا ذکر چھیڑ دیا اور ابلیسی مکّاری کے ساتھ فریقین کے زخموں کو ہرا کر دیا۔ وہ مُشتعل ہو گئے اور ایک دوسرے کو طعن و تشنیع کرنے لگے۔ قریب تھا کہ تلواریں میانوں سے نکل آتیں اور خانہ جنگی شروع ہو جاتی اور اس طرح یہود کی چال کامیاب ہو جاتی کہ آپؐ کو اس کی اطلاع مل گئی۔ آپؐ فوراً اس مجلس میں تشریف لے گئے اور اپنے حُسنِ تدبّر و خطابت سے دونوں قبائل کے غصّے کی آگ کو ٹھنڈا کیا۔ معاملہ ہمیشہ کے لیے رفع دفع ہو گیا اور یہود کی یہ چال بھی ناکام ہو گئی۔[۲۳]

رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول یہود کے قبیلے بنو نُضیر کا حلیف و ہم پیمان تھا۔ وہ بظاہر مسلمان ہو چکا تھا، لیکن اندر سے مسلمانوں کا سخت دُشمن تھا۔ اس سے یہود کو ایک

فائدہ تو یہ ہوا کہ مسلمانوں کے منصوبوں اور تحریکِ اسلام کے احوال و ظروف کی اطلاعات انھیں ملنے لگیں، دوسرے انھیں عبداللہ بن ابی سے مل کر سازشیں کرنے کے بہتر مواقع ہاتھ آنے لگے۔ اس سے آپؐ کی جان کو سب سے زیادہ خطرہ لاحق ہو گیا۔ وجہ یہ تھی کہ تمام اسلام دشمن قوتوں کو یقین ہو گیا تھا کہ اگر آپؐ کو شہید کر دیا جائے تو مسلمانوں کو ختم کرنا بہت آسان ہو جائے گا۔ لہٰذا مسلمان آپؐ کو شب و روز مسلّح پہرے میں رکھتے تھے اور خود بھی یہود و کفّار کے اچانک حملے کے لیے تیار رہتے تھے۔ مدینے کی حفاظت کے لیے آپؐ نے ایسا انتظام کیا تھا کہ دشمن کو شبخون مارنے یا اچانک حملے کا موقع نہ مل سکتا تھا۔[۲۴]

بدر کی شکست قریش کے لیے شکیب رُبا تھی اور ہونی بھی چاہیے تھی، کیونکہ وہ مسلمانوں کو اپنی قوم کے باغی و مفرور افراد سمجھتے تھے۔ ان کے بہترین عمائد و سردار اس جنگ کی نذر ہو چکے تھے اور اس شکست سے ان کی سیاسی و مذہبی سیادت اور اقتصادیات کو زبردست نقصان پہنچا تھا۔ چنانچہ وہ اس ذِلّت آمیز شکست کا بدلہ لینے کے لیے مضطرب اور بے قرار تھے۔ جنگ کی تیاریوں کے ساتھ ساتھ قریش سیاسی طور سے بھی مسلمانوں کو زک پہنچانے کی سوچ رہے تھے۔ چنانچہ انھوں نے مدینے کے یہود کو مسلمانوں کے خلاف اکسانے کی تدبیر کی۔ قریش چونکہ یہود کی مکّاری و حیلہ جوئی سے واقف تھے، اس لیے انھوں نے تہدید و وعید کے ذریعے کام نکالنا چاہا۔ انھوں نے یہود کو الٹی میٹم دیا کہ وہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کو یثرب سے نکال دیں، ورنہ قریش ان کو ہلاک و برباد کر دیں گے۔ ان کے الٹی میٹم کے الفاظ یہ تھے :

"تم لوگوں کے پاس اسلحۂ جنگ اور قلعے ہیں۔ تم ہمارے آدمی (صاحبنا) یعنی حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم) سے جنگ کرو، ورنہ ہم تمھارے ساتھ وہ کریںگے (کہ یاد کرو گے) اور کوئی چیز ہمارے اور تمھاری عورتوں کے زیر جامہ کے درمیان حائل نہ ہو سکے گی۔"[۲۵]

یہود کے پاس بلاشبہ یہ سب کچھ تھا، لیکن ان میں ہم آہنگی و یک جہتی نہ تھی۔ وہ دیکھنے میں تو ایک قوم تھے، لیکن حقیقت میں تضادات اور تشتّت و افتراق کا شکار تھے۔[۲۶] علاوہ بریں مسلمانوں کے جنگی کردار، عزم و حوصلہ، اتحاد و تنظیم اور عسکری قوّت پر بھی ان کی نظر تھی، لہٰذا وہ موقع کی تلاش میں رہنے لگے، لیکن ان کے تیور بدل گئے اور ریشہ دوانیاں زور پکڑ گئیں۔ اس اندرونی عیّار دشمن سے آپؐ کو بالخصوص اور مسلمانوں کو بالعموم زبردست خطرہ

لاحق ہوگیا۔ یہود و قریش کے اچانک حملے اور شبخون وغیرہ کے خلاف آپ ﷺ نے حفاظتی انتظامات سخت کر دیے اور مسلمانوں میں ہنگامی حالت کا "خاموش" اعلان ہو گیا۔ مجاہدین دن رات مسلّح اور چوکس رہنے لگے اور آپ ﷺ کے جاسوس اور مخبر اندرونی اور بیرونی محاذوں پر پہلے سے زیادہ سرگرم عمل ہو گئے۔ کچھ تو قریش کے الٹی میٹم اور کچھ ان کی جنگی تیاریوں اور ان کے مدینے پر متوقع حملے کی اطلاعات کی بنا پر یہود کے حوصلے بڑھ گئے اور وہ اپنی شرارتوں میں دلیر ہو گئے اور میثاقِ مدینہ سے نکلنے کا بہانہ ڈھونڈنے لگے۔[۲۷]

بنو قینقاع کی تنسیخ معاہدہ میں پہل (۱۵ر شوّال ۲ھ / ۱۰ر اپریل ۶۲۴ء) :

یہود میں سب سے پہلے بنو قینقاع کو معاہدۂ صلح توڑنے کی جرأت ہوئی۔ ایک دن چند اوباش یہودیوں نے ایک نقاب پوش مسلمان خاتون کی، جو اُن کے علاقے میں دُودھ بیچنے آئی تھی، شرارت سے نقاب الٹ دی اور اس سے چھیڑ خانی کرنے لگے۔ ایک مسلمان نے یہ دیکھا تو مظلوم خاتون کی مدد کے لیے پہنچا۔ یہودی اس پر پل پڑے۔ اس جھڑپ میں مسلمان نے ایک شرارتی یہودی کو قتل کر دیا اور خود بھی شہید ہو گیا۔ یہود نے اُلٹا بلوہ کر دیا، مسلمانوں کو اشتعال دلایا اور مرنے مارنے پر تیار ہو گئے، لیکن مسلمانوں نے بڑے صبر و تحمّل اور نظم و ضبط کا مظاہرہ کیا۔

آپ ﷺ کو یہودیوں کی اس فتنہ پردازی کی خبر ہوئی تو آپ ﷺ مصالحت کی خاطر خود ان کے علاقے میں تشریف لے گئے اور انھیں شرارتوں سے باز رہنے اور امن و سلامتی سے رہنے کی نصیحت فرمائی اور دعوتِ اسلام بھی دی۔ آپ ﷺ کے خطاب کے الفاظ یہ تھے : "اے گروہِ یہود! اللہ سے ڈرو! کہیں تم پر بھی قریش کی طرح عذاب نہ آجائے، اور امن و سلامتی کی راہ اختیار کرو۔"[۲۸]

یہود نے اس کا یہ جواب دیا : "اے محمد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کیا تم بھی ہمیں اپنی قوم کی طرح سمجھتے ہو؟ اس دھوکے میں نہ رہنا۔ تم نے ایسے لوگوں کا مقابلہ کیا جو جنگ کے متعلق کچھ نہ جانتے تھے، اس لیے تم نے ان پر غلبہ پالیا۔ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ واللہ! اگر ہم تم سے جنگ کریں گے تو تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم خاص قسم کے لوگ ہیں۔"[۲۹]

بنو قینقاع نے کچھ تو غیظ و غضب کے عالم میں، کچھ رئیس المنافقین عبداللہ بن

ابی اور کچھ اپنے حلیفوں کی اِمداد کی امید پر معاہدے کو توڑ دیا۔ یہ یہود کی زبردست سیاسی غلطی تھی اور اس کا اتنا ہی بھاری خمیازہ بھی انھیں بھگتنا پڑا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ میں اس قسم کی نازک اور خطرناک صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے اور فوری جوابی کارروائی کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتّم ودیعت کی تھی۔ بنو نُضیر اور عبداللہ بن ابّی دونوں بنو قینقاع کے حلیف تھے اور ان حلیفوں کی امداد سے انھیں محروم رکھنا ناگزیر تھا، کیونکہ ان تین طاقتوں کا اتحادِ ثلاثہ مدینے کی نوزائیدہ مملکت کے لیے انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ آپ ﷺ نے اس سلسلے میں جو اقدامات کیے، تاریخ نے انھیں محفوظ تو نہ رکھا، البتہ یہ بات متحقق ہے کہ آپ ﷺ اپنے تدبّر اور حکمتِ عملی سے بنو قینقاع کو ان کے حلیفوں کی امداد سے محروم رکھنے میں کامیاب ہو گئے۔ آپ ﷺ کو جب اپنی اس کامیابی کا یقین ہو گیا تو ۱۵ر شوّال ۲ھ / ۱۰ر اپریل ۶۲۴ء کو آپ ﷺ نے عبداللہ بن ابی کی مخالفت کے باوجود بنو قینقاع کے خلاف جوابی کارروائی کا آغاز کیا اور انھیں محاصرے میں لے لیا۔ بنو نُضیر اور عبداللہ بن ابّی کو اپنے حلیف کا ساتھ دینے کا حوصلہ نہ ہوا۔ پندرہ روز انتظار کرنے کے بعد جب بنو قینقاع کو باہر سے کمک ملنے کی کوئی امید نہ رہی تو انھوں نے مایوس ہو کر ار ذلقعدہ ۲ھ/ ۲۶ر اپریل ۶۲۴ء کو غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیے۔ یہود کے جنگی دستور کے مطابق انھیں قتل کرنے کے بجائے آپ ﷺ نے ان کو جلا وطن کرنے پر ہی اکتفا کیا۔ بنو قینقاع جو تعداد میں سات سو تھے، شام کے علاقے اذرعات میں جا بسے۔[۳۰]

قریش کی مدینے پر چھاپہ مارنے کی کوشش یا غزوۂ سویق :

(۵ر ذوالحجہ ۲ھ / ۲۹ر مئی ۶۲۴ء)

ہمیں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ آپ ﷺ پیغمبرِ رحمت تھے اور آپ ﷺ کی زندگی کا نصب العین مظلوم و مقہور انسانیت کو استحصالی اور سامراجی قوتوں کی سیاسی، معاشی اور ذہنی غلامی سے نجات دلانا اور ان کے لیے ایک ایسا متوازن معاشرہ قائم کرنا تھا جس کا اِلٰہ و ربّ صرف اللہ تعالیٰ ہو اور وہ اس میں آزاد و خود مختار اور صالح بھائیوں کی طرح امن و سلامتی سے زندگی گزاریں۔ یہ نصب العین جس قدر ارفع و احسن تھا، اسی قدر وہ انقلابی جذبے، مجاہدانہ جدوجہد اور غیر معمولی تدبّر و حکمت کا متقاضی تھا۔ دلیل یہ ہے کہ شر طبعاً تخریب پسند و فساد انگیز

ہے، اس لیے وہ حرکت و اضطراب کی حالت میں رہنے پر مجبور ہے، لہٰذا تاریخ شاہد ہے کہ شر یا طاغوتی طبائع ہمیشہ تعمیر و توازن، عدل و احسان، امن و سلامتی اور خیر و حق کی دشمن رہی ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔

چنانچہ آپؐ تو مدینہ منورہ میں دلجمعی اور خاموشی سے تعمیری کاموں میں مشغول تھے، کیونکہ تعمیر سکون و طمانیت چاہتی ہے لیکن اہلِ مکہ تخریبی کاموں میں لگے ہوئے تھے، اس لیے وہاں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ اس ہنگامے کی آگ کو شعلہ زن کرنے میں عورتوں اور شاعروں نے اہم کردار ادا کیا، کیونکہ قریش عورت اور شاعر کے طعنوں کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ قریش مسلمانوں سے انتقام لینے کے لیے اپنے تمام وسائل کے ساتھ فیصلہ کن جنگ کی تیاریاں کرنے لگے۔ یہ جنگی تیاریاں اموی خاندان کے سردار ابوسفیان کی قیادت میں ہونے لگیں، جسے جنگِ بدر کے بعد قریش کا سردار و قائد منتخب کیا گیا تھا۔ یہ انتخاب دراصل مشرق و مغرب میں اموی خاندان کی خلافت و امارت کا سنگِ بنیاد تھا۔

ابوسفیان ایک بہادر و تجربہ کار سپہ سالار اور ذہین سیاستدان تھا۔ وہ سفارتی رموز سے واقف اور ساز باز کرنے میں یدِ طولیٰ رکھتا تھا۔ وہ فنِ حرب اور نفسیاتِ حرب سے بھی خوب واقف تھا۔ اس نے بڑی راز داری سے مدینے کے یہودیوں سے ساز باز کر کے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے، زک دینے اور مرعوب کرنے کی خاطر ان پر شبخون مارنے کا منصوبہ بنایا۔ اس مقصد کی خاطر اس نے دو سو چاق و چوبند سواروں کا ایک چھاپہ مار دستہ تیار کیا اور چپکے سے مدینے پہنچ گیا۔ منصوبے کے مطابق اس نے یہود کے قبیلے بنو نُضیر کے سردار سلام بن مشکم کے پاس قیام کیا۔ جاسوسوں اور مخبروں کے ذریعے اطلاعات حاصل کیں اور حالات کا جائزہ لیا لیکن مسلمانوں کے حفاظتی اقدامات کی بنا پر اسے چھاپہ یا شبخون مارنے کا موقع نہ مل سکا۔ بہرحال وہ اپنی شرارت سے باز نہ آیا۔ مدینے پر چھاپہ مارنے کے بجائے اس نے رات کی تاریکی میں مسلمانوں کے ایک نخلستان کو تاراج کیا اور ایک فرد کو شہید کر دیا۔ (۵ ر ذوالحجہ ۲ھ / ۲۹ر مئی ۶۲۴ء)۔ اطلاع ملتے ہی آپؐ نے مجاہدین کے ساتھ تعاقب کیا۔ یہ دیکھ کر ابوسفیان نے راہواروں پر رسد کے لیے ستوؤں کے جو تھیلے لدے تھے، گرانے شروع کر دیے۔ اس سے وہ دوہرا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ ایک تو جانوروں کا بوجھ ہلکا کر کے ان کی رفتار کو تیز تر کرنا تھا، دوسرے مسلمانوں کو مالِ غنیمت کا لالچ دے کر ان کی رفتارِ تعاقب کو کم کرنا تھا۔ چنانچہ

اس کی یہ چال کامیاب رہی۔ وہ بچ کر نکل گیا۔ اس تعاقب میں ستوؤں کے تھیلوں نے چونکہ اہم کردار ادا کیا تھا، اس لیے عربوں نے اسے غزوۂ سویق (یعنی ستوؤں والی لڑائی) کا نام دیا۔[۳۱]

عیدالاضحیٰ اور سنّتِ ابراہیمیؑ کا احیاء (۱۰ر ذی الحجۃ ۲ھ / ۳ر جون ۶۲۴ء) :

حُسنِ اتفاق دیکھیے کہ آپؐ مہم الکُدر سے واپس تشریف لائے تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو مسلمانوں کے لیے دو ثقافتی ارمغان عطا کیے : صدقۃ الفطر اور عیدالفطر۔ اس بار آپؐ نے غزوۂ سویق سے مراجعت فرمائی تو آپؐ کو پھر دو تحفے عنایت ہوئے : عیدالاضحیٰ اور قربانی۔

مسلمانوں نے پہلی مرتبہ عیدالاضحیٰ منائی، آپؐ کی امامت میں نمازِ عیدالاضحیٰ ادا کی اور قربانی دی۔ آپؐ نے اس سال دو مینڈھوں کی قربانی دی اور سُنّتِ ابراہیمیؑ کا احیاء کر دیا۔[۳۲]

قربانی ہمیں دو اہم چیزوں کی یاد دلاتی ہے : آدابِ عبدیّت اور آدابِ فرزندی۔ آدابِ عبدیّت یہ ہیں کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی طرح اپنی عزیز ترین چیز مثلاً بیٹے تک کو بھی قربان کرنے سے دریغ نہ کرے۔ آدابِ فرزندی یہ ہیں کہ اولاد کو حضرت اسماعیلؑ کی طرح فرمانبردار ہونا چاہیے، جنھوں نے باپ کے ایک اشارے پر ذبح ہونا منظور کر لیا تھا۔

یاد دہانی کے طور پر یہ بات دہرائی جاتی ہے کہ عیدینِ اسلام کے دو جشنِ مسرّت ہیں اور دونوں ہی رنگِ حسن و تقویٰ سے مزیّن ہیں، اسی لیے ان سے سچی خوشیاں ملتی ہیں۔ اس اعتبار سے ثقافت کے ارتقا کا مطلب یہ ہوا کہ وہ زیادہ سے زیادہ رنگِ حُسن و تقویٰ سے مزیّن ہوتی جائے۔ یہ یاد رہے کہ حُسن سے طمانیت و مسرّت ملتی ہے اور تقویٰ سے حُسن و حق کی طلب و جستجو پیدا ہوتی ہے۔

مہم یا غزوۂ ذی امر (محرّم ۳ھ / جون ۶۲۴ء) :

یوں تو عرب کے تمام غیر مسلم قبائل تحریکِ اسلام اور مسلمانوں کے دشمن تھے، لیکن مُشرک و جنگجو قبائل جن کا پیشہ ہی غارتگری تھا، مدینے کی نوزائیدہ اسلامی مملکت کو للچائی ہُوئی نظروں سے دیکھتے تھے۔ انھیں مالِ غنیمت کے علاوہ مسلمانوں سے دینی اور سیاسی حسد بھی تھا، نیز انھیں مسلمانوں کی اُبھرتی ہوئی قوت سے خوف بھی لاحق ہو رہا تھا۔ ایسے قبائل میں نجد کا قبیلہ

غطفان بھی تھا۔ چنانچہ اس کے دو خیلوں یعنی بنی ثعلبہ اور بنی محارب نے اپنے سردار دعثور غطفانی کی سرکردگی میں مدینے کو تاخت و تاراج کرنے کا منصوبہ بنایا۔ وہ ابھی تیاریاں ہی کر رہے تھے کہ آپؐ کو اپنے جاسوسوں کے ذریعے اس کی اطلاع مل گئی۔ آپؐ نے حضرت عثمان بن عفانؓ کو مدینے کا حاکم مقرر کیا اور خود محرّم ۳ھ / جون ۶۲۴ء میں چار سو مجاہدین کے ساتھ ان کی طرف پیش قدمی کی۔ مسلمانوں کے اس غیر متوقّع اور بر وقت اقدام کو دیکھ کر قبائلی اس قدر مرعوب اور خوفزدہ ہوئے کہ منتشر ہو کر پہاڑوں میں روپوش ہو گئے۔ آپؐ نے ان لوگوں کی اچھی طرح سے حوصلہ شکنی کرنے اور دوسرے قبائل کو بھی مرعوب کرنے کی خاطر ڈیڑھ ماہ کے قریب نجد ہی میں قیام فرمایا اور بغاوت کو اچھی طرح فرو کر کے واپس تشریف لائے۔ اس مہم کو غزوۂ انمار اور غزوۂ غطفان سے موسوم کیا جاتا ہے۔[۳۳]

یہودی فتنہ گر و سرغنہ کعب بن اشرف کا انجام یا سریۂ محمّد بن مسلمہؓ :

(۱۴ ربیع الاوّل ۳ھ / ۴ ستمبر ۶۲۴ء)

بدر میں مسلمانوں کی شاندار فتح کی خبر سے یثرب کے یہود کو سخت صدمہ اور رنج پہنچا۔ ایک تو وہ تصور تک نہیں کر سکتے تھے کہ مسلمان قریش ایسی عظیم قوت کو شکست دے سکتے ہیں، اور دوسرے مسلمانوں کی عسکری قوت اور سیاسی سطوت کا تصور اب ان کے لیے سوہانِ رُوح بن گیا تھا۔ وہ مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیوں میں پہلے سے زیادہ سرگرمیاں دکھانے لگے۔ ان باغیانہ سرگرمیوں میں حصّہ لینے والوں کا سرغنہ یہود کا ایک سردار کعب بن اشرف تھا۔ وہ عرب کا شعلہ بیان شاعر تھا۔ مسلمان عورتوں سے متعلّق فرضی عشقیہ و جنسی قصے نظم کرنا اور آپؐ کی ہجو لکھنا اس دریدہ دہن کا محبوب مشغلہ تھا۔ قریش کی شکست کی خبر سُن کر اس سے رہا نہ گیا۔ وہ ان کے پاس مکّے گیا۔ وہاں اس نے بدر کے مقتولین کے مرثیے لکھے، قبائل کا دورہ کیا اور سب کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا اور انھیں شکست کا بدلہ لینے پر اُکسایا۔ پھر قریش سے سازباز کر کے مدینے پہنچا اور اپنی باغیانہ سرگرمیوں میں مشغول ہو گیا۔ قریش اور اس کے حلیفوں کے مدینے پر متوقّع حملے کے پیشِ نظر یہود کے خلاف کوئی بڑا اقدام کرنا قرینِ مصلحت نہ تھا۔ چنانچہ آپؐ نے اس موقع پر کعب بن اشرف کی باغیانہ سرگرمیوں کا قلع قمع کرنا ہی مناسب سمجھا۔ آپؐ نے حضرت محمّد بن مسلمہؓ کی قیادت میں ایک چھوٹی سی چھاپہ مار جماعت تیار کی، جس نے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق

ایسے ڈرامائی انداز میں کعب بن اشرف کا خاتمہ کر دیا کہ یہود میں خوف و سراسیمگی کی لہر دوڑ گئی اور انھیں تحریری طور پر عہد کرنا پڑا کہ وہ آیندہ ایسی مذموم حرکات اور باغیانہ سرگرمیوں سے باز رہیں گے۔ اس واقعے سے وہ فتنہ فرو ہو گیا جو جنگِ اُحد میں مسلمانوں کے لیے مہلک ثابت ہو سکتا تھا۔ مورخین اس واقعے کو سریۂ محمد بن مسلمہؓ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔[۳۴]

بنو سلیم کی بغاوت یا غزوۂ بحران (ربیع الآخر ۳ھ / ستمبر، اکتوبر ۶۲۴ء) :

انقلاب کی راہیں ہمیشہ پُرخطر ہوتی ہیں اور انقلابی تحریکوں کو ان راہوں سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ تحریکِ اسلام بھی ایسی ہی راہوں سے گزر رہی تھی اور اسے قدم قدم پر سازشوں، مخالفتوں اور مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ لیکن قائدِ تحریک کے خُلقِ عظیم، بے مثال تدبّر، حوصلہ اور خود اعتمادی اور دیگر اوصافِ حمیدہ کی بدولت یہ تحریک ہر تجربے سے کامیابی سے گزرتی جا رہی تھی۔ فتنے اٹھتے تھے، لیکن انھیں فوراً ہی دبا دیا جاتا تھا۔ چنانچہ ابھی آپؐ کو بنو غطفان کی بغاوت کو فرو کرنے اور یہودی فتنہ پرداز کی باغیانہ سرگرمیاں دبانے سے مہلت ملی ہی تھی کہ بحران سے بنو سلیم کی بغاوت کی اطلاع ملی۔ آپؐ صاحبِ عزیمت و ہمّت تھے اور تھک کر بیٹھ جانا نہ جانتے تھے۔ ہر صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہر وقت و برمحل اقدام کرنا آپؐ کا شعار تھا۔ یہ اطلاع پاتے ہی آپؐ نے حضرت عبداللہ بن اُمّ کلثومؓ کو مدینے کا حاکم مقرر کیا اور خود تین سو مجاہدین کا ایک دستہ لے کر بحران پہنچ گئے۔ اسلامی لشکر کی اچانک اور غیر متوقّع آمد سے بنو سلیم اس قدر مرعوب و خوفزدہ ہُوئے کہ منتشر و فرار ہو گئے۔ اس مہم کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔ فتنہ دب گیا، آپؐ نے حسبِ معمول کچھ عرصہ وہاں قیام فرمایا اور پھر مدینے مراجعت فرمائی۔[۳۵]

قریش کی اپنی تجارتی ناکہ بندی توڑنے کی کوشش یا سریۂ زید بن حارثہؓ :

(جمادی الآخر ۳ھ / اکتوبر، نومبر ۶۲۴ء)

قریش سے متعلّق آپؐ کی حکمتِ عملی یہ تھی کہ انھیں اخلاقی، سیاسی اور معاشی دباؤ سے تحریکِ اسلام کی مخالفت سے باز رکھا جائے اور جنگ و جدال کے بغیر ان کا مرکز یعنی مکّہ معظمہ فتح کر لیا جائے، کیونکہ اس طرح قریش کی تالیفِ قلوب کرنے سے انھیں تحریکِ اسلام میں شامل کرنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل ہو سکتے تھے۔ چونکہ قریش کی معیشت کا انحصار شام و

عراق کی تجارت پر تھا، لہٰذا آپؐ ان کو بساطِ سیاست پر تجارتی ناکہ بندی کے ذریعے مات دینا چاہتے تھے۔ بدر کی فتح کے بعد مسلمانوں نے شام اور مکّہ کی قدیم تجارتی شاہراہ قریش پر بند کردی تو انھیں مجبوراً عراق کی طرف رُخ کرنا پڑا۔ چنانچہ ان کا ایک قافلہ بھاری قیمت کا مالِ تجارت لے کر عراق روانہ ہوا، جس میں عمائدینِ قریش بھی شامل تھے، مثلاً ابوسفیان بن حرب، صفوان بن اُمیّہ، عبداللہ بن ابی، ربیعہ اور حویطب بن عبدالعزیٰ۔ آپؐ کو اپنے جاسوسوں کے ذریعے بروقت اس قافلے کی اطلاع مل گئی۔ قریش کو معاشی محاذ پر زک پہنچانے کا یہ بہت اچھا موقع تھا جس سے آپؐ نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ آپؐ نے بڑی رازداری سے قافلے کو روکنے کے لیے حضرت زید بن حارثہؓ کی قیادت میں ایک سو مجاہدین کا دستہ روانہ کیا۔ مجاہدین نے اتنی سرعت اور خاموشی سے قافلے کو جالیا کہ اہلِ قافلہ ششدر رہ گئے اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ اُٹھے لیکن قافلے کا رہنما فرات بن حیان مُجلی گرفتار ہوگیا۔ مجاہدین لاکھوں روپے کا مالِ غنیمت لے کر واپس ہوئے۔ اس واقعے کو عام طور سے سریہ زید بن حارثہؓ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔[۳۶]

اس کاروانِ تجارت کے لُٹ جانے سے قریش پر شام اور عراق کی دونوں شاہراہیں مسدود ہوگئیں۔ یہ دونوں شاہراہیں ان کی معیشت کے لیے ریڑھ کی ہڈّی کی حیثیت رکھتی تھیں۔ وہ بلبلا اُٹھے۔ معاشی بدحالی سے بچنے کے لیے ان کے سامنے دو راستے رہ گئے تھے : مسلمانوں سے مصالحت یا ان سے مسلح تصادم۔ قریش کے لیے مصالحت کی راہ اختیار کرنا مسلمانوں کی جداگانہ قومیت، ان کی آزاد سیاسی حیثیت اور حکومت کو تسلیم کرنا تھا، اور اسے وہ اپنی قومی، سیاسی اور دینی خُودکُشی سمجھتے تھے، لہٰذا ان کو جارحیت ہی کی راہ اختیار کرنا تھی اور کی۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ عرب کی بیرونی اور اندرونی تجارت پر قریشِ مکّہ کی اجارہ داری تھی، جو ان کی خوشحالی کا بہت بڑا ذریعہ تھی۔ مسلمانوں نے ان کی تجارتی شاہراہوں کی ناکہ بندی کر کے ایک تو ان کی تجارتی اجارہ داری ختم کردی اور دوسرے ان کی جگہ خود لے لی۔ مہاجرین چونکہ قرشی مکّی اور تجارت پیشہ تھے، اس لیے اُنھوں نے قریش کے تجارتی منظر سے ہٹ جانے کے بعد جو خلا واقع ہوا، اسے پُر کرنے اور اسلامی معاشرے کی معیشت کو مستحکم کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس سے یہ استنباط ہوتا ہے کہ آپؐ "عبقریتِ کُل"[۳۷] تھے، آپؐ کی نظر میں ہر گوشۂ حیات ہوتا تھا اور آپؐ ایک عظیم و جلیل ماہرِ معاشیات بھی تھے۔

اس جگہ اس حقیقت کی نشاندہی کی جاتی ہے کہ آپؐ اس لیے رحمۃ للعالمین تھے کہ بنی نوعِ انسان کو زندگی کے ہر گوشے میں آپؐ سے فوائد حاصل ہوئے اور یہ اس لیے ممکن ہوا کہ آپؐ "عبقریتِ کُل" تھے اور آپؐ کی فکر و نظر ہر گوشۂ حیات کو محیط تھی۔

اُمّ المؤمنین حضرت حفصہؓ سے نکاح (شعبان ۳ھ/جنوری، فروری ۶۲۵ء) :

اللہ تعالیٰ نے چونکہ آپؐ کی زندگی کو ہر زمان و مکان کے انسان کے لیے رحمت اور مثالی بنایا تھا، اس لیے آپؐ کو ہر گوشۂ حیات میں سفر کرنا تھا اور آپؐ نے کیا اور اس طرح کیا جیسے رحمۃ للعالمین اور عبقریتِ کُل کو کرنا چاہیے تھا۔ آپؐ کی خودی بلاشبہ کُل جہانوں کو محیط تھی لیکن اس کا مرکز گھر تھا، اور گھر جنّت ہوتا ہے، جو سفرِ زندگی کو حسین و خوشگوار بنانے میں ازبس اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آپؐ نے مدینے میں جہاں آپؐ حکمران تھے، مٹّی کے چھوٹے چھوٹے گھروندوں میں زندگی گزاری اور اس سادگی اور فقر سے گزاری کہ امیر و سلطان تو کیا، ایک غریب شخص بھی اس کا تصوّر نہیں کر سکتا۔ گھر میں آرام و راحت کی چیزوں کا فقدان تھا، نانِ جویں، کھجور وغیرہ پر بسر اوقات ہوتی تھی۔ پہننے کو موٹے کھدّر کا کرتا، تہبند اور عمامہ ہوتا تھا۔ نعلین مبارک انتہائی معمولی ہوتے تھے۔ ازواجِ مطہراتؓ کا لباس اور زندگی بھی اسی طرح سادہ اور زاہدانہ تھی۔ اس بے سروسامانی کے عالم میں بھی آپؐ کا گھر طمانیت و مسرت کا بہشت تھا۔ شعبان ۳ھ/جنوری، فروری ۶۲۵ء میں آپؐ نے اپنی جنّت کی رونق میں اضافہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس میں مشیّتِ ایزدی بھی تھی اور حکمتِ نبویؐ بھی۔ اس کا فوری محرّک حضرت عمر فاروقؓ کی تالیفِ قلب تھا۔ آپؐ رفقائے تحریک کی تالیفِ قلوب کا بہت خیال رکھتے تھے۔ قائدِ تحریکِ اسلام، حکمران اور سپہ سالار کی حیثیت سے آپؐ کا ایسا کرنا سیاسی و عسکری اعتبار سے بھی ضروری تھا۔

حضرت عمر فاروقؓ آپؐ کے بہترین صحابۂ اربعہؓ میں سے تھے۔ انھوں نے تحریکِ اسلام کے لیے جو گرانقدر خدمات انجام دی تھیں، ان کے صلے کے طور پر آپؐ نے ان کے خاندان سے رشتۂ صِہر قائم کرلے کا فیصلہ کیا تھا۔ چنانچہ جنگِ بدر میں مہلک زخم کھانے کے بعد حضرت حفصہؓ کے شوہر حضرت خنیسؓ کا کچھ دنوں بعد انتقال ہوگیا اور وہ بیوہ ہوگئیں تو حضرت عمرؓ کو اپنی بیٹی کے نکاحِ ثانی کی فکر دامنگیر ہوئی۔ آپؐ نے ان کی تالیفِ قلب کی خاطر حضرت حفصہؓ سے نکاح کر لیا۔ (شعبان ۳ھ/ جنوری، فروری ۶۲۵ء)[۳۸]

حواشی و تشریحات

(۱) غزوۂ بدر سے متعلق ہمارے بڑے بڑے مآخذ مندرجۂ ذیل ہیں :

(۱) قرآن مجید، سورۃ الانفال، (۲) بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ البدر، (۳) سیرۃ ابن اسحاق، باب غزوۃ البدر، (۴) سیرۃ ابن ہشام، باب ۴۹، ص ۶۵۹ تا ۷۱۲ (اردو)، (۵) طبقات ابن سعد ۲ : ۶ تا ۲۸ بعد، (۶) طبری ۱۳۳۰ تا ۱۳۳۸ بعد (۷) ابن قیم : زاد المعاد (اردو)، ۲ : ۱۷۴ تا ۱۸۴، (۸) تاریخ ابن خلدون (اردو)، ۱ : ۸۲ تا ۸۸، (۹) تاریخ تمدنِ اسلام (اردو)، ۱ : ۶۴ تا ۶۶، (۱۰) شبلی : سیرۃ النبی ۱ : ۳۱۵ تا ۳۶۵، (۱۱) رسولِ رحمت، مرتبہ غلام رسول مہر، ص ۲۶۹ تا ۲۹۳۔

(۲) المائدہ ۵ : ۲۴۔

(۳) الانفال ۸ : ۴۱۔

(۴) ابوالکلام احمد، ترجمان القرآن، ۲ : ۵۶، ۵۷، حواشی۔

(۵) الانفال ۸ : ۱۱۔

(۶) آلِ عمران ۳ : ۱۳۔

(۷) الانفال ۸ : ۱۷۔

(۸) بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ البدر۔

(۹) موضوع مذکور، نیز دیکھیے ابوداؤد، کتاب المغازی۔

(۱۰) الانفال ۸ : ۱۔

(۱۱) بخاری و مسلم در مشکوٰۃ، کتاب الجہاد، ح ۲۸۔

(۱۲) ابوداؤد، در مشکوٰۃ، کتاب الجہاد، ح ۵۷۔

(۱۳) مالک، ابوداؤد، نسائی، موضوع مذکور، ح ۵۸۔

(۱۴) النّسآء ۴ : ۳۲۔

(۱۵) آلِ عمران ۳ : ۱۷۱۔

(۱۶) بخاری و مسلم در مشکوٰۃ، کتاب الجہاد، ح ۶۔

(۱۷) بخاری و مسلم، موضوع مذکور، ح ۴۔

(۱۸) بخاری، موضوع مذکور، ح ۱۔

(۱۹) ابن ہشام : سیرۃ النبیؐ (اردو)، ۲ : ۱۔

(۲۰) مشکوٰۃ، باب صلوٰۃ العیدین، طبقات ابن سعد، ۱ : ۲۴۸۔

(۲۱) موضوع مذکور، نیز دیکھیے الخطیب : اکمال فی اسماء الرجال، در مشکوٰۃ (اردو) ۳ : ۴۱۰ (الف)۔

(۲۲) قرآن مجید، بمواضع کثیرہ، ابوداؤد، کتاب الجہاد، ۲ : ۹ بعد، بخاری، باب اتیان الیہود النبیؐ، سیرۃ ابن ہشام (اردو)، ۱ : ۵۳۵ تا ۵۴۰، ۵۸۷ تا ۵۸۹ بعد، شبلی : سیرۃ النبیؐ، ۱ : ۳۹۵ تا ۴۰۱ بعد۔

(۲۳) ابن ہشام، سیرۃ النبیؐ، ۱ : ۵۸۹، ۵۹۰ بعد۔

(۲۴) شبلی : سیرۃ النبیؐ، ۱ : ۴۰۲، ابن ہشام، سیرۃ النبیؐ، ۱ : ۵۴۸، ۵۴۹، ۶۳۲ بعد۔

(۲۵) سنن ابوداؤد، کتاب الخراج والامارۃ، ذکر نضیر، شبلی، سیرۃ النبیؐ، ص ۴۰۳۔

(۲۶) الحشر ۵۹ : ۱۴۔

(۲۷) طبقات ابن سعد، ۱ : ۱۹ بعد، شبلی : سیرۃ النبیؐ، ص ۴۰۳، ۴۰۴ بعد۔

(۲۸) سیرۃ ابن ہشام (اردو)، ۲ : ۳۔

(۲۹) وہی کتاب، ص ۴۔

(۳۰) طبقات ابن سعد، ۳ : ۱۹۹، سنن ابی داؤد، بحوالہ شبلی : سیرۃ النبیؐ، ۱ : ۴۰۳ تا ۴۰۵، ابن ہشام : سیرۃ النبیؐ، (اردو)، ۲ : ۳ تا ۶۔

(۳۱) طبقات ابن سعد، ۲ : ۳۰، تاریخ ابن خلدون (اردو)، ص ۹۲، ابن ہشام، سیرۃ النبیؐ، ۲ : ۱، ۲ بعد۔

(۳۲) طبقات ابن سعد، ۱ : ۲۴۸۔

(۳۳) ابن ہشام : سیرۃ النبیؐ (اردو) ۲ : ۳۔

(۳۴) موضوع مذکور۔

(۳۵) موضوع مذکور۔
(۳۶) وہی کتاب، ۲: ۷، ۸۔
(۳۷) عبقریتِ کُل سے مراد یہ ہے کہ آپ زندگی کے ہر شعبے میں عبقری یا genius تھے۔
(۳۸) الخطیب: اکمال فی اسماء الرجال در مشکوٰۃ (اردو)، ۳: ۳۴۳ (الف)، اُصابہ فی تمیز الصحابہ، ۴: ۲۶۴۔ حضرت حفصہ بنت عمر فاروقؓ کا پہلا نکاح حضرت خنیسؓ بن حذافہؓ سے ہوا تھا۔ انھوں نے ۶۰ برس کی عمر میں ۴۵ھ میں وفات پائی۔

باب : ۱۳

غزوۂ اُحُد

پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کی مثالی قیادت، صبر و استقامت اور حوصلہ و جُرأت کا ایک تاریخی کارنامہ

(۱) غزوۂ اُحُد کے بنیادی عوامل۔
(۲) مکّے کی اتحادی فوجوں کی مدینے پر یلغار اور وادیٔ اُحُد میں مورچہ بندی۔
(۳) پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کی مجلس مشاورت، فیصلہ اور لشکرِ اسلام کا محاذِ جنگ۔
(۴) عبداللہ بن اُبّی کی غدّاری۔
(۵) محاذِ جنگ : ابوسفیان کا جنگی منصوبہ، جنگ کا آغاز اور اتحادی فوجوں کی پسپائی، ابوسفیان کی چال، دشمن کا تعاقب چھوڑ کر مجاہدین کا' اور درّے کو خالی چھوڑ کر تیر اندازوں کا مالِ غنیمت کو لُوٹنا اور خالد بن ولید کا عقب سے حملہ کر کے جنگ کا پانسہ پلٹ دینا۔
(۶) آپؐ پر اتحادی سورماؤں کی یلغار اور آپؐ کا اپنی بے مثال جُرأت و استقامت اور صبر و استقلال کا مظاہرہ کرنا۔
(۷) قریش کی اپنے مقصد میں ناکامی اور جنگی چال کے تحت میدانِ جنگ سے کُوچ۔
(۸) دُشمن کے متوقّع حملے، پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کی جوابی کارروائی اور حمراء الاسد میں مورچہ بندی۔
(۹) قریش کا حوصلہ ہار کر بے نیلِ مرام لوٹنا۔
(۱۰) سیرتؐ کا ایک الہامی و لافانی ریکارڈ۔

(۱۱) حضرت اُمِّ عمّارہؓ کی بے مثال جرأت وشجاعت۔
(۱۲) غزوۂ اُحد کا حربی نقطۂ نظر سے تجزیہ۔
(۱۳) متفرق واقعات : حضرت زینبؓ بن خزیمہ سے نکاح، آپؐ کی صاحب زادی حضرت اُمِّ کلثومؓ کا حضرت عثمانؓ سے نکاح، حضرت امام حسن علیہ السّلام کی ولادتِ سعید۔
(۱۴) حواشی وتشریحات۔

باب ۱۳

غزوۂ اُحد (۶ شوّال ۳ھ / ۲۲ مارچ ۶۲۵ء)[۱]

یا

پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کی مثالی قیادت، صبر و استقامت اور حوصلہ وجُرأت کا ایک تاریخی کارنامہ

تاریخ کی اپنی ایک جہت ہے جس پر وہ چلتی رہتی ہے۔ یہ سمت ظلم وگناہ اور فتنہ وفساد سے غلط ہوجاتی ہے، جسے جنگ ہی درست کرتی ہے۔ اس سے اس امر کی توجیہ ہوجاتی ہے کہ اسلام نے کیوں جہاد فی سبیل اللہ کو اُمّتِ مسلمہ پر فرض قرار دیا ہے۔ اسے "ناموسِ تاریخ" سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ چنانچہ غزوات کا ایک بنیادی مقصد تاریخ کی جہت کو صالح اور درست کرنا تھا۔ تاریخ کی روش یہ ہے کہ وہ اپنی جہت درست کرنے کے لیے خود ہی انقلاب کی راہ بھی اختیار کرلیتی ہے۔ غزوۂ بدر دراصل تاریخ ہی کی ایک ایسی کوشش تھی جس کے سلسلے کی دوسری کڑی، جو اس کا فطری نتیجہ تھی، جنگِ اُحد تھی۔

جنگِ اُحد کے دو قدیم و بنیادی عوامل تھے، جو دینی ومعاشرتی نوعیت کے تھے۔ ان میں سیاسی عسکری اور معاشی نوعیت کے تین اور عوامل شامل ہوگئے۔ دینی عوامل یہ تھے : مُشرکانہ عصبیت اور دینی سیادت کو خطرہ۔ ان سب عوامل سے علیحدہ علیحدہ بحث کی جاتی ہے:

(۱) **مُشرکانہ عصبیّت** : قریش چونکہ مشرک وبت پرست تھے، اس لیے وہ اسلام کی خالص توحید کے حریف نہ ہوسکتے تھے اور نہ ہوئے۔ مذہبی لحاظ سے بالخصوص وہ انتہا پسند و قدامت پسند تھے، لہٰذا انھیں اپنا آبائی دین چھوڑنا یا اس کے خلاف کوئی بات سُننا گوارا نہ تھا۔ اسلام نے جب دلائل وبراہین کے ذریعے ان کے باطل عقاید کو بے نقاب کرنا شروع کیا تو ان

کی مشرکانہ عصبیّت کو ایسی چوٹ لگی کہ وہ بلبلا اُٹھے، اور تحریکِ اسلام، اس کے بانی اور مسلمانوں کا استیصال کرنے پر تُل گئے۔

(۲) دینی سیادت کو خطرہ : قریش کو کعبے کے متولّی ہونے کے باعث عرب بھر میں دینی سیادت حاصل تھی۔ ان کی حیثیت عرب میں ایسی تھی جیسی ہندوستان میں برہمنوں کی۔ اسلام کی انقلابی تحریک اس قسم کی دینی پیشوائیت کی مخالف تھی، لہٰذا قریش اسے اپنی دینی سیادت کے لیے خطرہ سمجھتے تھے اور ہر قیمت پر اس سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔

(۳) معاشرتی عوامل : اسلام حقوقِ انسانی کا علمبردار اور استحصالی طبقوں کا مخالف تھا اور قریش استحصالی طبقے سے تعلّق رکھتے تھے۔ اسلام اخوّت، مساوات اور حرّیت کا نقیب تھا اور ان کے قریش مخالف تھے۔ وہ یہ تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے کہ سب افرادِ نسلِ انسانی بھائی بھائی یا برابر ہیں اور آزادی ان کا پیدائشی حق ہے۔ قریش کو نسلی اور طبقاتی غرور تھا۔ وہ اپنے آپ کو معزّز و محترم اور دوسروں کو اپنے سے کمتر سمجھتے تھے اور اسلام میں سب انسان برابر تھے اور عزّت و تکریم کا معیار صرف تقویٰ تھا۔ اسلام امیر و غریب، آقا و غلام، حاکم و محکوم سب کو معاشرے میں ایک جیسا درجہ دیتا تھا، اور یہ بات قریش کے لیے سوہانِ رُوح تھی۔ اصل یہ ہے کہ تحریکِ اسلام انسانی معاشرے میں ایک ہمہ گیر انقلاب لانا چاہتی تھی جس کے تصوّر کے حریف قریش کے دل نہ ہو سکتے تھے۔ تاریخِ انسانی بتاتی ہے کہ شرک و بت پرستی اور قدامت پسندی لازم و ملزوم ہیں اور یہ تینوں چیزیں انقلابیت کی حریف نہیں ہو سکتیں جو توحید کا خاصّہ ہے۔

(۴) سیاسی عوامل : تحریکِ اسلام جب تک مکّے میں محبوس رہی، مسلمانوں کی معاشرتی یا سیاسی کوئی حیثیت نہ تھی۔ وہ قریش کی پناہ میں تھے اور ان کی اجازت کے بغیر نقلِ مکانی تک نہ کر سکتے تھے۔ وہ کھُلے بندوں عبادت بھی نہ کر سکتے تھے۔ قریش انھیں "اپنے آدمی" سمجھتے تھے۔ اسی بنا پر انھوں نے شہنشاہ نجاشی سے مہاجرین کو ان کے حوالے کرنے کی درخواست کی تھی اور یہود سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم اور مسلمانوں کو مدینے سے باہر نکال دیں۔ لیکن ہجرت کے بعد مدینے میں اسلامی مملکت معرضِ وجود میں آئی اور مسلمانوں کی قومی سیاسی حیثیت متعیّن ہو گئی، نیز ان کے سیاسی اثر و رسوخ کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہونے لگا تو

قریش کو یہ بات سخت ناگوار گزری اور انھوں نے اسے اپنی سیاسی سیادت و آزادی کے لیے کھُلا چیلنج سمجھا، جسے قبول کرنے کے سوا ان کے پاس کوئی اور چارۂ کار نہ تھا۔

(۵) عسکری عوامل : یہ دو تھے، ایک مستقل اور دُوسرا فوری نوعیت کا تھا۔ مسلمانوں نے جنگِ بدر میں قریش کو شکستِ فاش دے کر ثابت کر دیا تھا کہ وہ ایک زبردست عسکری قوّت بن چکے ہیں اور قریش انھیں اپنے لیے ایک مستقل خطرہ سمجھنے لگے تھے۔ دوسرا اور فوری سبب مقتولینِ بدر کا انتقام تھا اور انتقام نہ لینے کو وہ بے حمیّتی و بزدلی اور قومی غیرت و وقار کے منافی سمجھتے تھے۔

(۶) معاشی عوامل : اسلام نے سُود اور سُودی کاروبار کو حرام قرار دیا تھا، اور سُود قُریش کی معیشت کی شیطانی ضرورت بن چکا تھا۔ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ سُودکاری کے بغیر وہ کاروبار کیسے کر سکیں گے! واقعہ یہ ہے کہ سرمایہ داری کے خوگر لوگوں کی سمجھ میں واقعی یہ بات نہیں آتی، اور سمجھ میں آ بھی جائے تو وہ یہ حقیقت قبول کرنے سے اس طرح خوف کھاتے ہیں جیسے اِستحصالی طبقے، مثلاً جاگیردار و سرمایہ دار مزارعوں اور محنت کشوں کے حقوق دینے سے یا ان کا استحصال نہ کرنے کے تصوّر سے لرزہ بر اندام ہو جاتے ہیں۔ اسلام انسان کو نظری ہی نہیں عملی پروگرام بھی دیتا ہے کیونکہ وہ فطری انداز میں زندگی گزارنے کی تحریک ہے۔ چنانچہ اس نے سودکاری و استحصال کاری کے بغیر صدیوں معاشی نظام کو کامیابی سے چلایا اور دُنیا پر واضح کر دیا کہ اسلامی نظام فطری ہے۔ اس لیے ایک وہی نظامِ حیاتِ انسانی کی ہمہ گیر خوشحالی و ترقّی اور امن و سلامتی کی ضمانت فراہم کر سکتا ہے۔ مارکسیّت دراصل اسلام کے اس کامیاب تجربے سے استفادہ کرنے کی "غیر فطری" کوشش ہے، جس کے لیے سیکولر Secular کی گمراہ کن اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ قریش چونکہ استحصال سے منزّہ معاشرے کا تصوّر تک نہیں کر سکتے تھے، اس لیے وہ ایسے معاشرے کی تعمیر کے بانی اور اس عقیدے کے نقیب پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم اور تحریکِ اسلام کے استیصال کے درپے ہو گئے۔

قریش کی معیشت اور قوت کا انحصار تجارت اور تجارتی اجارہ داری پر تھا۔ مسلمانوں نے ان کی دونوں تجارتی شاہراہوں کی ناکہ بندی کر کے ان کی معیشت کو زبردست نقصان پہنچایا تھا اور یہ صُورتِ حال ان کے لیے اِنتہائی سنگین بن چکی تھی۔ پھر جب قریش نے ناکہ بندی توڑنے کی

کوشش میں اپنا قافلہ لُٹوا دیا تو اس نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور مکّے کے گھر گھر میں انتقام انتقام کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔

رؤسائے مکّہ کے مشورے سے ابوسفیان نے، اپنے قافلے کے مالِ تجارت سے جو منافع ہوا، اسے جنگی مصارف کے لیے وقف کر دیا اور اصل سرمایہ مالکوں کو واپس کر دیا۔ یہ منافع پچاس ہزار دینار کے لگ بھگ تھا۔ اللہ تعالیٰ کی نظر میں یہ جنگی تیاریاں دراصل بنی نوع انسان کو اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکنے کیلیے تھیں، اس لیے باطل تھیں اور ان کا ناکام ہو جانا ایک فطری امر تھا :

"جن لوگوں نے حق کو ماننے سے انکار کیا ہے، وہ اپنا مال اس لیے خرچ کر رہے ہیں کہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکیں، وہ ابھی اور مال خرچ کرتے رہیں گے حتیٰ کہ یہ خرچ کرنا ان کے لیے پچھتاوا بن جائے گا۔"[۲]

قریش اپنے تمام وسائل کے ساتھ جنگی تیاریاں کرنے لگے،[۳] جن میں شاعروں[۴] اور عورتوں نے بھی نمایاں حصّہ لیا۔ شعرائے عرب اپنی شعلہ نوائی کے ذریعے جنگجو قبائل میں انتقام و مبارزت طلبی کی آگ لگا دینے میں یدِطولیٰ رکھتے تھے۔ اسی طرح عورتیں بھی اپنی طلاقت اور طعنہ زنی سے مردوں کو غیرت دلانے اور مرنے مارنے پر آمادہ کرنے میں اپنا جواب نہ رکھتی تھیں۔

اہلِ مکّہ نے جنگ کی تیاریاں مکمل کر لیں تو شوّال ۳ھ/ مارچ ۶۲۵ء میں انھوں نے ایک لشکرِ جرّار کے ساتھ مدینے کی طرف پیش قدمی کی۔ یہ لشکر جس کی قیادت ابوسفیان ایسا ماہرِ حربیات اور تجربہ کار سپہ سالار کر رہا تھا، تین ہزار جنگجو سورماؤں پر مشتمل تھا، جن میں قریش کے علاوہ بنو کنانہ اور اہلِ تہامہ بھی تھے۔ ان میں تین ہزار شتر سوار اور دو سو گھڑ سوار بھی تھے۔ زرہ پوش سپاہیوں کی تعداد سات سو کے قریب تھی۔ اس لشکر میں قریش کے گھرانوں کی پندرہ عورتیں بھی تھیں،[۵] جن کی موجودگی لشکریوں کی غیرت و حمیّت پر تازیانہ لگانے، جم کر لڑنے اور میدانِ جنگ سے فرار ہونے سے باز رکھنے کے لیے ضروری سمجھی گئی تھی۔[۶]

قریش سے جنگِ بدر میں جو غلطیاں سرزد ہوئی تھیں، ابوسفیان نے ان سے بچنے کی پوری کوشش کی۔ اس نے جنگ کا منصوبہ بڑی سوچ بچار اور محنت و احتیاط سے بنایا اور اس قدر صیغۂ راز میں رکھا کہ اسلامی مملکت کے جاسوسوں اور مخبروں کو اس کی تفصیلات کا علم نہ ہو سکا، حتیٰ کہ انھیں یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ قریش براہِ راست مدینے پر حملہ کریں گے یا کسی اور مقام کو محاذِ جنگ بنائیں گے۔

قریش کی وادیِ اُحد میں مورچہ بندی :

آپؐ کو قریش کی جنگی تیاریوں کی اطلاعات تو ملتی رہتی تھیں، لیکن ان کے منصوبے کا علم نہ ہو سکا تھا، اس لیے آپؐ نے اس انتظار میں جوابی کارروائی کے خطوط متعین کرنے میں تاخیر کی، یہاں تک کہ قریش کی متحدہ افواج نے اُحد کی وادی میں چھاؤنی ڈال دی۔ ان کی افواج مدینۂ منوّرہ کے شمال میں بئرِ رومہ اور غابہ کے درمیان پھیلی ہوئی تھیں۔ جغرافیائی اور جنگی لحاظ سے یہ بہترین جگہ تھی۔ یہاں پانی بھی تھا اور جانوروں کے لیے چارے کی سہولت بھی تھی، پھر عقب اور دائیں اور بائیں سے اچانک حملے کا امکان بھی بہت کم تھا۔ جنگِ خندق میں بھی وہ اسی جگہ اُترے تھے۔

نبیِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو قریش کی پیش قدمی کی اطلاعیں مسلسل مل رہی تھیں۔ چنانچہ جب اُنھوں نے وادیِ اُحد میں چھاؤنی ڈالی تو آپؐ نے ان کی تعداد اور دیگر فوجی معلومات حاصل کرنے کے لیے فضالہ کے بیٹوں انسؓ اور مونسؓ کو اور پھر حباب بن منذرؓ کو بھیجا، جو لشکر میں گھوم پھر کر ضروری معلومات فراہم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

آپؐ نے فوراً مسجدِ نبویؐ میں شوریٰ کا اجلاس طلب فرمایا۔ اکابرِ مہاجرین اور انصار نے مشورہ دیا کہ عورتوں کو مدینے کے اردگرد جو گڑھیاں ہیں ان میں بھجوا دیا جائے اور خود شہر میں مورچہ بند ہو جائیں۔ آپؐ کو بھی اس رائے سے اتفاق تھا۔ رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبَی نے بھی اس رائے کی پُرزور تائید کی، لیکن نوجوانوں کی بھاری اکثریت نے اسے اپنی پست ہمّتی، کمزوری اور بزدلی پر محمول کیا اور میدانِ اُحد میں لڑنے کا مشورہ دیا۔ دونوں فریقوں کو اپنی اپنی رائے پر اصرار تھا۔ جب اتفاقِ رائے نہ ہو سکا تو آپؐ کو پیغمبر اور سپہ سالار کی حیثیت سے خود فیصلہ کرنا پڑا۔

اتفاق سے جُمعہ کا دن تھا۔ آپؐ نے جُمعے کا خُطبہ دیا، جہاد و شہادت کے فضائل بیان فرمائے اور صبر و ثابت قدمی کی وضاحت فرمائی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپؐ گھر کے اندر تشریف لے گئے اور مسجد میں مسلمان آپؐ کے فیصلے کا انتظار کرنے لگے۔ اس دوران میں بزرگ صحابۂ کرام حضرت سعد بن معاذؓ اور حضرت اسید بن حضیرؓ نے نوجوانوں سے خطاب کیا اور انھیں ہٹ دھرمی چھوڑنے کی نصیحت کی جو موثّر ثابت ہوئی، لیکن وقت نکل چکا تھا۔ آپؐ کثرتِ رائے کی بنا پر باہر نکل کر معرکہ آرا ہونے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ چنانچہ آپؐ مسلّح ہو کر

باہر تشریف لائے اور اپنے فیصلے کا اعلان کیا تو نوجوان مجاہدین نے اپنی رائے سے دستبرداری اور ندامت کا اظہار کیا۔ آپؐ نے جواب میں فرمایا :

اللہ کے رسولؐ کے شایانِ شان نہیں کہ ہتھیار پہن کر اُتار دے جب تک کہ اللہ تعالیٰ اس کے اور دشمن کے درمیان فیصلہ نہ کر دے۔

آپؐ کا یہ فیصلہ وحی کے عین مطابق تھا :

(اے پیغمبرؐ!) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو، اور اگر کہیں تم تند خو اور سخت دل ہوتے تو یہ سب تمھارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے، ان کے قصور معاف کردو، ان کے حق میں دُعائے مغفرت کرو اور (تحریک اسلام کے) کاموں میں ان سے بھی مشورہ کیا کرو، پھر جب کسی کام کا پختہ ارادہ کرلو تو اللہ پر بھروسہ کرو (اور کام کر گزرو)۔ بے شک اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس پر توکّل کرنے والے ہیں۔[۷]

ساتھ ہی آپؐ کو اس حقیقت کی بھی نشاندہی کرادی گئی کہ اللہ کی مدد شامل حال ہو تو کوئی طاقت غلبہ نہیں پاسکتی :

(اے پیغمبرؐ!) اللہ تمھاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں، اور وہ تمھیں چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمھاری مدد کرسکتا ہو اور مومنوں کو چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسہ رکھیں۔[۸]

پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم نے سُنّتِ حسنہ کے مطابق حضرت ابن امّ مکتومؓ کو مدینے کا حاکم مقرر کیا، شہر کی حفاظت اور دیگر امورِ مملکت سے متعلق ضروری ہدایات دیں۔ اس اثنا میں جہاد کی تیاری مکمل ہوچکی تھی۔ چنانچہ ۶/ شوال ۳ھ / ۲۲/ مارچ ۶۲۵ء کو بعد از نماز جمعہ مجاہدین کے لشکر نے اُحد کی طرف کُوچ کیا۔ آپؐ اس وقت گھوڑے پر سوار تھے، کندھے پر کمان اور ہاتھ میں نیزہ تھا۔ حضرت سعد بن معاذؓ اور حضرت سعد بن عبادہؓ آگے آگے دوڑ رہے تھے اور باقی مجاہدین دائیں بائیں اور پیچھے تھے۔ مجاہدین کی تعداد ایک ہزار تھی اور صرف ایک سو زرہ پوش تھے۔ جب آپؐ شوط کے مقام پر پہنچے تو عبداللہ بن ابی اپنے تین سو آدمیوں سمیت لشکر سے الگ ہوگیا اور آپؐ سے عُذر یہ پیش کیا کہ "آپ نے میری رائے نہیں مانی، لہٰذا ہم بے وجہ اپنی جانیں ہلاکت میں کیوں ڈالیں؟ یہ جنگ نہیں ہے۔ اگر ہم اسے جنگ سمجھتے تو آپؐ کا ساتھ دیتے۔"

مسلمانوں نے عبداللہ بن ابی کو جنگ میں حِصّہ لینے پر آمادہ کرنے کی خاطر سمجھانے بُجھانے کی کوشش کی تو اس نے یہ موقف اختیار کیا کہ ہمیں یقین ہے کہ آج جنگ نہیں ہوگی، اس لیے ہم واپس جارہے ہیں، ورنہ اگر ہمیں یہ توقع ہوتی کہ آج جنگ ہوگی تو ہم ضرور ساتھ چلتے۔ ان منافقوں سے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے " وہ منافق کہ جب ان سے کہا گیا : آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا کم از کم (اپنے شہر کی) مدافعت ہی کرو، تو کہنے لگے : اگر ہمیں علم ہوتا کہ آج جنگ ہوگی تو ہم ضرور تمھارے ساتھ چلتے۔ یہ بات جب وہ کہہ رہے تھے تو اس وقت وہ ایمان کی بہ نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے۔ وہ اپنی زبانوں سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں، اور جو کچھ وہ دلوں میں چھُپاتے ہیں، اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو خود تو بیٹھے رہے اور ان کے بھائی بند لڑنے گئے اور مارے گئے تو ان سے متعلق انھوں نے کہہ دیا کہ اگر وہ ہماری بات مان لیتے تو مارے نہ جاتے۔ ان سے کہو! اگر تم اپنے قول میں سچے ہو تو خود تمھاری موت جب آئے، اسے ٹال کر دکھا دینا۔"[۹]

منافقین کی اس غدّاری کا اثر انصار کی دو جماعتوں بنو سُلیم اور بنو حارثہ پر بھی پڑا۔ وہ بھی منافقوں کی باتوں میں آکر علیٰحدگی کی باتیں کرنے لگے۔ آپؐ کو خبر ہوئی تو آپؐ تشریف لائے اور سمجھایا بجھایا تو وہ مان گئے۔ فوجی نقطۂ نظر سے یہ بے حد خطرناک صورتِ حال تھی، جس پر آپؐ نے اپنے تدبّر سے قابو پالیا۔ اس واقعہ کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اسے قرآنِ مجید نے اپنے اندر محفوظ کرلیا ہے :

"(اے پیغمبرؐ!) یاد کرو جب تم میں سے دو گروہ بزدلی دکھانے پر آمادہ ہوگئے تھے، حالانکہ اللہ ان کی مدد پر موجود تھا اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔"[۱۰]

دشمن کی بہ نسبت فوج، اسلحہ اور رسد بہت کم، سواری کا فقدان اور منافقوں اور یہودیوں کی غدّاری کا خطرہ، یہ سب کچھ تھا، لیکن آپؐ کو خوف تھا نہ غم، آپؐ کا عزم غیر متزلزل، ہمّت جواں اور حوصلہ بلند تھا۔ چونکہ شام ہونے والی تھی، اس لیے آپؐ نے شیخین ہی میں رات گزارنے کا فیصلہ کیا۔ دشمن سے آپؐ ہمیشہ ہوشیار رہتے تھے اور حفاظتی اقدامات کو از بس اہمیت دیتے تھے اور اس سے کبھی غافل نہ ہوتے تھے۔ چنانچہ آپؐ نے پہرہ داری کے لیے پچاس مجاہدین کو چُنا اور ان کا سالار محمد بن سلمہؓ کو مقرّر کیا۔ رات کے پچھلے پہر آپؐ نے مجاہدین کو کُوچ کا حکم دیا اور ابو خیثمہؓ کو رہبری کا کام تفویض ہوا۔ صبح کی نماز القنطرہ میں ہوئی اور دن چڑھے

آپؐ وادیِ اُحد میں اس جگہ اُترے جو آپؐ پہلے ہی منتخب کر چکے تھے۔

قریش کا لشکر چونکہ پہلے میدانِ جنگ میں پہنچ چکا تھا، لہٰذا ابوسفیان کو اپنی مرضی کا محاذ و مقامِ جنگ منتخب کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ چنانچہ اس نے میدانِ جنگ کے جغرافیائی و عسکری حالات و ظروف کا معائنہ کیا اور ان کے مطابق اپنی افواج کی صف آرائی کی۔ جنگ کے واقعات و کوائف کا استقصاء کرنے سے اس بات کا سُراغ ملتا ہے کہ ابوسفیان کی جنگی سکیم یہ تھی کہ مُسلمانوں کو جُل دے کر ان کے عقب میں درّے پر قبضہ کر لیا جائے اور اس طرح پیچھے سے بھی حملہ کر کے انھیں گھیرے میں لے کر ان کا قلع قمع کر دیا جائے اور پھر مدینے کو تاخت و تاراج کیا جائے۔ چنانچہ ابوسفیان نے اپنی اس سکیم کے مطابق اپنی افواج کی صف بندی کی تھی۔ اس نے میمنہ پر خالد بن ولید کو، میسرہ پر عکرمہ بن ابوجہل کو اور قلب پر صفوان بن امیّہ کو سالار مقرر کیا۔ تیر اندازوں کے دستے عبداللہ بن اُبّی ربیعہ کی کمان میں دیے۔ خالد بن ولید کی نظر اور جھپٹ عقاب کی ، ترت پھرت اور عیّاری چیتے کی اور قوت و شجاعت شیر کی تھی۔ چنانچہ درّے پر قبضہ کر کے مسلمانوں پر عقب سے حملہ کرنے کی ذمہ داری ان کی تھی اور انھیں بروقت کمک پہنچانے کا کام عکرمہ بن ابوجہل کو تفویض ہوا۔ یہ دونوں گھُڑسوار دستوں کے سالار تھے۔ عکرمہ بھی بسالت و شجاعت اور فنِ سپہ گری میں بڑی شہرت رکھتا تھا۔ صفوان بن امیّہ بھی آزمودہ کار مبارزو سالار تھا۔ علاوہ بریں ابوسفیان نے اپنے اس جنگی منصوبے کے مطابق مسلمانوں کی متوقّع صف بندی کے مقام کے قریب جابجا گڑھے کھدوا دیے اور ان کو کھجور کے پتوں اور چھال وغیرہ سے ڈھانپ دیا۔ چال یہ تھی کہ جب مسلمانوں پر عقب سے حملہ کیا جائے تو وہ سراسیمہ ہو کر یا دفاع کی غرض سے اِدھر اُدھر بھاگیں تو ان گڑھوں میں جا گریں۔ چنانچہ ایسے ہی ایک گڑھے میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم زخمی ہو کر گرے تھے۔ ان گڑھوں کا دوسرا مقصد ان سے کمین گاہوں یا خندقوں کا کام لینا تھا۔ ابوسفیان نے ان گڑھوں میں اپنے فوجی چھپا دیے تھے۔ چنانچہ جب حضرت حنظلہؓ نے ابوسفیان پر دوڑ کر حملہ کرنا چاہا تو ایسے ہی ایک گڑھے سے شدّاد بن اسود لیثی نے، جو وہاں گھات لگائے چھُپا بیٹھا تھا، اچانک نکل کر حضرت حنظلہؓ پر وار کر کے انھیں شہید کر دیا۔[۱۱]

اگرچہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم تاخیر سے میدانِ جنگ میں پہنچے تھے، لیکن آپؐ کو اس کا حربی و عسکری نقطۂ نگاہ سے جائزہ لینے کی مہلت مل گئی۔ آپؐ کی نظر ایک عبقری و مثالی ماہرِ حربیّات و سپہ سالار کی طرح فوراً درّے پر پڑی۔ آپؐ نے صف بندی کے وقت جغرافیائی ماحول

سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ لشکر کے عقب ، دائیں اور بائیں اُحد کی پہاڑیوں کو رکھا اور فوج کو تین اطراف سے محفوظ کر لیا، البتّہ سامنے مشرق جنوب کی جانب عینین میں ایک درّہ تھا، جس سے پیچھے کی طرف سے حملہ ہو سکتا تھا۔ آپؐ نے اس کی حفاظت کے لیے حضرت عبداللہ بن جُبیرؓ کی کمان میں پچاس تیر اندازوں کا ایک دستہ مقرر کر دیا اور انھیں واضح اور قطعی ہدایات دیں کہ لڑائی کے دوران یا بعد میں، نیز فتح ہو یا شکست ، انھیں کسی حال میں بھی درّے کو خالی چھوڑ کر جانا نہیں ہوگا۔ یہ مقام اس اعتبار سے بھی اہم تھا کہ قریش کے دباؤ کی صورت میں مجاہدین پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو جائیں تو تیر انداز ان کی مؤثر مدد کر سکتے تھے۔ صف بندی میں آپؐ کو یدِطولیٰ حاصل تھا۔ چونکہ مجاہدین اور قریش کی عددی نسبت ۱ : ۴ کی تھی، لہٰذا آپؐ نے مجاہدین کی صف بندی اس طریق سے کی کہ قریش اپنی ساری فوج بیک وقت ان کے مقابل نہیں لا سکتے تھے اور نہ انھیں گھیرے میں لے سکتے تھے۔

اس دَور کی جنگوں میں پرچم کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ وہ فوج کے عزم و ہمّت اور ثابت قدمی کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ جب وہ سرنگوں ہو جاتا تو فوج کے پاؤں بھی اُکھڑ جاتے، لہٰذا اسے ہر قیمت پر بلند رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ ابوسفیان نے اپنا فوجی پرچم بنو عبدالدّار کو دینے سے پہلے ان سے یہ حلف لیا کہ وہ ہر قیمت پر اسے بلند رکھیں گے اور انھوں نے بھاری جانی نقصان اٹھانے کے باوجود اسے سرنگوں نہ ہونے دیا۔ ان کا پہلا علمبردار طلحہ بن ابی طلحہ تھا۔ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم نے بھی اپنا پرچم حضرت مصعبؓ بن عمیر کو تفویض فرمایا، جو خانوادۂ عبدُالدّار سے تھے۔ آپؐ نے میمنہ پر حضرت زبیر بن عوامؓ کو اور میسرہ پر منذر بن عمروؓ کو سالار مقرر کیا اور اپنی تلوار حضرت ابودجانہؓ کو دی جو بڑے شہ زور، شجاع اور فنِ سپہ گری میں ماہر تھے۔ انھوں نے اس طرح شمشیر زنی کی کہ اس کا حق ادا کر دیا۔[۱۲]

جنگِ اُحد میں مجاہدین کا نعرہ اَمِتْ اَمِتْ تھا، یعنی مارو مارو۔

جنگ کا آغاز قریش کی طرف سے ہوا۔ سب سے پہلے خواتین، سپہ سالار ابوسفیان کی بیوی ہندہ کی قیادت میں دف بجاتی اور رجزیہ اشعار گاتی ہوئی میدانِ کارزار میں نکلیں۔[۱۳] ان کا پہلا ترانہ تھا :

ویہا بنی عبد الدّار ویہا حماۃ الادبار ضرب بکل بتّار

بنی عبدالدّار! اُٹھ کھڑے ہو! اپنے پیچھے رہنے والوں کی حفاظت و مدد کرنے والو!

اُٹھ کھڑے ہو اور ہر شمشیر زن پر کاری ضرب لگاؤ!

ان کا دوسرا جنگی ترانہ یہ تھا :

نحن بنات طارق نمشی علی النمّارق ان تقبلوا نعانق

او تدبروا نفارق

ہم آسمان کے تاروں کی بیٹیاں ہیں۔ ہم قالینوں پر چلتی ہیں۔ آگے بڑھ کر مقابلہ کرو گے تو تمھیں گلے لگا لیں گی۔ پیٹھ پھیرو گے تو تم سے جُدا ہو جائیں گی۔

فراق غیر وامق : جدائی ایسی ہوگی جو نفرت کرنے والے کی ہوتی ہے۔

محاذِ جنگ :

جنگ کا آغاز ڈرامائی انداز میں ہوا۔ سب سے پہلے قریش کے حلیف قبیلۂ ہوازن کے سورماؤں نے اپنی قوت و شجاعت کے نشّے میں پیش قدمی کی اور پھر دفعتاً مسلمانوں پر چڑھ دوڑنے کے لیے لپکے۔ لیکن قدر اندازوں نے اس زور سے تیر افگنی کی کہ ان کے منہ پھیر دیے۔ اس کے بعد بنو عبد الدّار پرچم لیے آگے بڑھے۔ علمبردار طلحہ نے مرد مقابل کے لیے نعرہ مارا۔ یہ سُن کر حضرت علیؓ اس کے مقابلے کو نکلے، شیر کی طرح اس پر جھپٹے اور چشم زدن میں تلوار کے ایک ہی وار سے اس کے سر کے دو ٹکڑے کر دیے۔ پرچم کو بڑھ کر طلحہ کے بھائی عثمان بن طلحہ نے تھاما، لیکن اسے حضرت حمزہؓ نے ہلاک کر دیا۔ اب پرچم ابو سعید بن ابی طلحہ کے ہاتھ میں آیا، لیکن اسے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ قریش کے پرچم کے گرد گھمسان کا رن پڑا۔ فریقین بڑی بے جگری سے لڑے۔ پرچم بلند رکھنے کی کوشش میں خاندانِ عبد الدّار کے نو افراد ہلاک ہو گئے۔[۱۴] اس معرکے میں حضرت ابو دجانہؓ، حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ نے خاص طور سے بہادری کے وہ جوہر دکھائے کہ دیکھنے والے حیران رہ رہ جاتے تھے۔ حضرت حمزہؓ ارطاۃ بن عبد شرحبیل کو قتل کر کے سباع بن عبد العزّیٰ کی طرف بڑھ رہے تھے کہ وحشی نے دیکھ لیا جو ان کی گھات میں بیٹھا تھا۔ وہ حبشیوں کا ہتھیار حربہ چلانے میں مہارت تامّہ رکھتا تھا؛ موقع ملتے ہی حربہ مار کر اُس نے حضرت حمزہؓ کو شہید کر دیا۔[۱۵]

مجاہدین کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر ابو سفیان نے ایک چال چلی۔ اس نے اپنے فوجی دستوں کو اس محاذ سے پیچھے ہٹا لیا جہاں ان کا کچھ اسلحہ اور سامانِ رسد تھا۔ وہ مسلمانوں کو مالِ غنیمت کا لالچ دے کر انھیں تعاقب سے باز رکھنا اور غافل کر دینا چاہتا تھا۔ اس نے مزید دھوکا دینے

کی خاطر مکمّل پسپائی کا انداز اختیار کیا اور اپنی سانڈنیوں کا رُخ مکّے کی طرف موڑ دیا، حالانکہ یہ جنگ کا ابتدائی مرحلہ تھا۔ دشمن پر کوئی کاری ضرب بھی نہیں لگی تھی اور ان کے میمنہ و میسرہ بالخصوص بالکل محفوظ اور تازہ دم تھے، لیکن اس کے باوجود مجاہدین ابو سفیان کی اس چال میں آگئے۔ دشمن کا پیچھا کر کے ان پر کاری ضرب لگانے کے بجائے وہ مالِ غنیمت پر ٹوٹ پڑے۔ ابو سفیان یہ نظارہ دیکھتا رہا۔ پھر غضب یہ ہوا کہ درّے کے محافظ تیر انداز بھی مالِ غنیمت کے لالچ میں آگئے۔ انھوں نے اپنے کمانڈر حضرت عبد اللہ بن جبیرؓ کے احکام ماننے سے انکار کر دیا اور ان میں سے چالیس مجاہدین درّے کو خالی چھوڑ کر مالِ غنیمت لُوٹنے چلے گئے۔

خالد بن ولید جو اسی تاک میں تھے، انھوں نے برق نما رفتار کے ساتھ پہاڑ کے پیچھے سے ہو کر درّے پر قبضہ کر لیا۔ ان کے پیچھے عکرمہ بن ابو جہل بھی کمک لے کر آ پہنچا اور دونوں نے اس زور اور تیزی سے حملہ کیا کہ مسلمانوں کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ادھر سامنے سے ابو سفیان نے پوری قوت کے ساتھ ان پر ہلّہ بول دیا۔ ایک تو مسلمانوں نے مالِ غنیمت کے لالچ میں خود ہی اپنی صفوں کو درہم برہم کر دیا تھا، اور دوسرے قریش کے چاروں طرف سے غیر متوقع حملے نے ان کو بدحواس کر دیا۔ نتیجتاً ان میں نظم و ضبط نہ رہا اور اپنے سالار پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم سے بھی ان کا رابطہ منقطع ہو گیا۔ فوج میں نظم و ضبط اور رابطہ نہ رہے تو ان میں عسکریّت بھی نہیں رہتی اور عسکریّت نہ رہے تو وہ مسلّح ہجوم کی طرح ہو جاتی ہے اور پھر اس میں قوّتِ تسخیر رہتی ہے نہ قوّتِ مقاومت ہی۔ قریب قریب یہی حال اسلامی لشکر کا ہوا۔ قریش میدانِ جنگ میں چھائے ہوئے تھے اور مسلمانوں کو تہہ تیغ کیے جا رہے تھے، لیکن آپؐ کی غیر معمولی بسالت و حوصلہ مندی اور استقامت و ثابت قدمی کی بدولت مسلمانوں نے میدان نہ چھوڑا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قریش مسلمانوں کو شکستِ فاش دینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ چنانچہ اب ان کے حملے کا ہدف آپؐ کی ذاتِ اقدس تھی۔ آپؐ کے اردگرد خوب رن پڑا۔ مجاہدین پروانوں کی طرح آپؐ پر نثار ہوتے گئے اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ صرف گنتی کے چند مجاہدین آپؐ کے گرد رہ گئے۔ دشمن آپؐ کو نرغے میں لے کر تیروں، تلواروں اور نیزوں سے مسلسل حملے کرتا رہا، لیکن آپؐ کو اپنی جگہ سے ہٹا نہ سکا۔

کہتے ہیں کہ قریش کے چند دلیر اور جری سورماؤں، مثلاً عتبہ بن ابی وقّاص، ابی قمیّہ لیثی، اُبّی بن خلف جمحی، عبد اللہ بن حمید اسری، عبد اللہ بن شہاب زہری نے رسول اللہ صلّی اللہ

علیہ وسلّم کو شہید کرنے کا حلف اٹھایا تھا، چنانچہ وہ سر دھڑ کی بازی لگا کر آپؐ کے قریب پہنچ گئے۔ عبداللہ بن شہاب زہری نے آپؐ کے چہرۂ مبارک کو گھائل کیا، عتبہ بن ابّی وقاص نے آپؐ پر سنگباری کی اور ایک پتھر لگنے سے آپؐ کا نیچے کا دندانِ مبارک شہید ہو گیا اور ہونٹ زخمی ہو گئے۔ آپؐ پتھروں کی زد سے نکلنے کی خاطر مجاہدین کے ساتھ پہاڑ کی اوٹ میں ہونے لگے کہ قریش کے روپوش گڑھوں میں سے ایک میں گر پڑے۔ حضرت علیؓ اور حضرت طلحہؓ نے فوراً آپؐ کو نکال لیا۔ اتنے میں ابن قمیئہ نے آپؐ کے سر پر اس زور کا وار کیا کہ خود کے دو حلقے چہرۂ مبارک میں دھنس گئے اور آپؐ لڑکھڑا کر گر پڑے۔ پھر عبداللہ بن حمید اسری آگے بڑھا لیکن حضرت ابو دجانہؓ نے اسے ہلاک کر ڈالا۔

اب لڑائی کا سارا زور آپؐ کے اردگرد تھا۔ دشمن آپؐ کو شہید کرنے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا، لیکن صحابۂ کرامؓ آپؐ کی مدافعت میں سینہ سپر تھے اور پروانوں کی طرح شہید ہوتے جاتے تھے۔ آپؐ تیروں کی بوچھاڑ اور تلواروں کے سائے میں تھے، لیکن عزم و ہمت کا پیکر بنے کھڑے تھے۔ چہرۂ پُرنور مجروح ہوا تو شوخئ خون سے سُرخ چاند بن گیا۔ چہرۂ مبارک سے لہُو صاف کرنے کی سعادت حضرت مالک بن سنان خدریؓ (ابو سعید خدریؓ کے باپ) کے حصّے میں آئی۔ خود کے حلقے جو چہرۂ مبارک میں دھنس گئے تھے، انھیں حضرت ابو عبیدہ بن جرّاحؓ نے نکالا۔ دشمن کا ہدف اب صرف آپؐ کی ذات تھی۔ آپؐ پر تیروں کی بارش ہو رہی تھی۔ حضرت ابو دجانہؓ آپؐ کو چھپائے تیروں پر تیر کھائے جاتے تھے لیکن حرکت تک نہ کرتے تھے، یہاں تک کہ زخموں کی تاب نہ لا کر شہید ہو گئے۔ یہ دیکھ کر ابن قمیئہ لیثی آپؐ پر حملہ آور ہوا لیکن حضرت مصعب بن عمیرؓ، جو علمبردارِ لشکر تھے، بیچ میں حائل ہو گئے اور سخت مقابلے کے بعد شہید ہو گئے۔ اس موقع پر حضرت طلحہؓ نے اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے اور دشمنوں کو پرے دھکیلنے میں کامیاب ہو گئے۔[16]

دشمن کے پرے ہٹنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ابن قمیئہ نے غلطی سے حضرت مصعبؓ کو رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سمجھ لیا تھا اور اپنی دانست میں اس نے پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کو شہید کر دیا تھا، لہٰذا وہ فرطِ شادمانی میں اپنے رفیقوں سمیت پلٹا اور ابو سفیان کے پاس ایک اونچی جگہ چڑھ کر چلّایا :

الا ان محمّدًا قد قتل : سنو! محمدؐ شہید ہو گئے۔

دشمن آپؐ کو نرغے میں لے کر مسلسل دباؤ ڈالے جا رہا تھا اور آپؐ تک پہنچنے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔ اس کے تیر افگن مسلسل آپؐ پر تیر برسا رہے تھے، لیکن آپؐ ایسی زہرہ گداز صورتِ حال میں بھی بُنیانِ مرصُوص کی طرح جمے ہوئے تھے۔ آپؐ کے پائے ہمت میں لغزش تک نہ ہوتی تھی۔ آخر کار آپؐ کی استقامت اور ثابت قدمی رنگ لائی اور آپؐ چند جانثاروں کے ساتھ دشمن کے نرغے سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ اتنے میں دفعتاً اُبّی بن خلف سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا آپؐ کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے مکّہ مکرّمہ میں آپؐ کو دھمکی دی تھی کہ وہ برق رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر آپؐ کو قتل کر دے گا۔ آپؐ نے جواب میں فرمایا تھا : میں تجھے قتل کروں گا۔ چنانچہ صحابۂ کرامؓ اسے مارنے کو اُٹھے تو آپؐ نے منع فرمایا اور خود حارث بن صمّہؓ سے نیزہ لے کر اُبّی کی گردن پر مارا۔ وہ بلبلا اٹھا اور بھاگ گیا۔ پھر لشکر کے ساتھ مکّے واپس جاتے ہوئے سفر کے دوران میں زخم کی تاب نہ لا کر مر گیا۔ بہر حال آپؐ چند صحابہؓ کے ساتھ ایک دُشوار گزار ٹیلے کے اوپر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ دیکھ کر قریش کے ایک دستے نے جو خالد بن ولید یا ابو سفیان کی کمان میں تھا، آپؐ کے تعاقب میں اوپر چڑھنے کی بہت کوشش کی لیکن مہاجرین کی ایک جماعت نے زبردست مزاحمت کی اور انھیں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔

اس اثنا میں یہ افواہ قریش اور مسلمانوں میں مشہور ہو چکی تھی کہ آپؐ شہید ہو گئے ہیں۔ یہ افواہ مسلمانوں کے لیے جس قدر رُوح فرسا، ہمّت شکن اور مایوس کن تھی، اہلِ مکّہ کے لیے اُسی قدر خوش کن و جانفزا تھی۔ اس افواہ سے انھیں اپنی فتح و کامیابی کا یقین ہو گیا اور انھوں نے لڑائی سے ہاتھ روک لیا۔ یہ ان کی ناقابلِ تلافی غلطی تھی۔ انھیں یقین تھا کہ آپؐ چونکہ شہید ہو چکے ہیں، اس لیے مسلمان مایوس و بے دل ہو کر ہتھیار ڈال دیں گے اور مدینہ آسانی سے فتح ہو جائے گا۔

اگرچہ مجاہدین تتّر بتّر ہو گئے تھے، لیکن انھوں نے نہ ہتھیار ڈالے تھے اور نہ میدان ہی چھوڑا تھا۔ چنانچہ انھیں جب سب سے پہلے حضرت کعب بن مالکؓ کے پُرجوش نعروں سے یہ معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم زندہ و سلامت ہیں تو ان کے تنِ مُردہ میں جان پیدا ہو گئی، حوصلوں میں توانائی آ گئی اور وہ جانفروشانہ انداز میں پھر آپؐ کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔

اگرچہ آپؐ اور مجاہدین جنگ کی تکان کی وجہ سے نڈھال ہو چکے تھے، لیکن ظُہر کا وقت

ہوا تو آپؐ اور تمام صحابۂ کرامؓ نماز کے لیے تیار ہو گئے۔ میدانِ جنگ شہدا کی نعشوں سے پٹا پڑا تھا۔ زخمی کراہ رہے تھے، فضا خونیں و دہشتناک تھی، دشمن ابھی میدان میں موجود تھا اور آپؐ اپنے معمول کے مطابق مجاہدین کے ساتھ اپنے الٰہ و ربّ کے حضور سر بسجود تھے۔ رزم ہوتی یا بزم، غم و اندوہ کا عالم ہوتا یا شادی و شادمانی کا، آپؐ نہ تو اپنے الٰہ کو بھول سکتے تھے اور نہ ہی کبھی بھولے۔ "دوست" کی یاد تو آپؐ کی حرزِ جان تھی۔ اسی سے آپؐ کا قلبِ مبارک ہمیشہ اور عالمِ خواب میں بھی بیدار و فعّال رہتا اور مہیب سے مہیب خطرے میں مطمئن رہتا۔ اصل یہ ہے کہ "دوست" کی یاد ہی سے دل کی دنیا حسن و سرور سے معمور رہتی ہے۔ مومن اس راز سے آگاہ تھے، اس لیے اہلِ حسن و سرور تھے۔

اگلا قدم اٹھانے سے پہلے ابوسفیان اس افواہ کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ اس نے چند ساتھیوں کو لے کر آپؐ اور اکابر صحابہؓ کی نعشوں کو تلاش کیا۔ پھر وہ مسلمانوں کے کیمپ کے قریب ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ کر پکارا: کیا یہاں محمدؐ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) ہیں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: کوئی جواب نہ دے۔ پھر اس نے باری باری حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کا نام پکارا۔ جب کوئی آواز نہ آئی تو خوشی سے نعرہ زن ہوا کہ سب مارے گئے۔ زندہ ہوتے تو ضرور جواب دیتے۔ اس پر حضرت عمرؓ سے ضبط نہ ہو سکا۔ انھوں نے بآوازِ بلند کہا: دشمنِ خدا ہم سب زندہ ہیں۔

یہ خبر ابوسفیان کے لیے سوہانِ رُوح تھی، لیکن اس نے اپنے جذبات کو چھپانے کی خاطر نعرہ مارا: اعل ھبل: اے ہبل تو بلند رہے۔ آپؐ کے ارشاد پر صحابہ کرامؓ نے بھی جوابی نعرہ مارا: اللہ اعلیٰ و اجلّ: اللہ بلند اور جلیل ہے۔ ابوسفیان نے کہا: لنا العزّیٰ ولا عزّیٰ لکم: ہمارے لیے عزّیٰ ہے، تمھارے لیے عزّیٰ نہیں ہے۔ صحابہؓ بولے: اللہ مولانا ولا مولیٰ لکم: اللہ ہمارا مددگار ہے، تمھارا کوئی مددگار نہیں۔ پھر ابوسفیان نے مسلمانوں کو یہ چیلنج دیا: ان موعدکم البدر للعام المقبل: آیندہ سال بدر میں پھر ہمارا تمھارا مقابلہ ہوگا۔ آپؐ نے یہ چیلنج قبول فرمایا اور ایک صحابی کے ذریعے جواب دیا: نعم، ھی بیننا و بینک موعد: ٹھیک ہے۔ یہ بات ہمارے تمھارے درمیان طے ہو گئی۔ یہ جواب سن کر ابوسفیان اپنے لشکر کو لے کر پلٹ گیا۔ لیکن یہ صورتِ حال دیکھ کر اس کو اپنی ناکامی کا احساس ہوا۔ اس کا منصوبہ ناکام ہو چکا تھا۔ قریش نہ تو آپؐ کو شہید کر سکے تھے اور

نہ مسلمانوں کو شکستِ فاش ہی دے سکے تھے اور نہ انھیں ہلاک و اسیر ہی کر سکے تھے۔ ابوسفیان اپنا مقصد حاصل کیے بغیر واپس نہیں جانا چاہتا تھا، لہٰذا اس کے سامنے اب دو صورتیں تھیں: ایک یہ کہ قریش اور اس کے اتحادیوں کی دوبارہ صف بندی کر کے معرکہ آرائی کے لیے میدانِ جنگ میں لایا جائے، دوسری یہ کہ مدینے پر شبخون مار کر مسلمانوں کو تہہ تیغ کر دیا جائے۔ ابوسفیان نے دوسری صورت کو ترجیح دی کیونکہ اس میں اس کی کامیابی کے امکانات زیادہ روشن تھے۔ چنانچہ اس نے ایک چال کے ذریعے آپؐ کو مات دینے کا فیصلہ کیا۔ اس کی چال یہ تھی کہ وہ لشکر کو لے کر میدانِ جنگ چھوڑ دے اور بظاہر مکّے کی طرف کوچ کر دے اور مسلمان یہ سمجھ کر کہ قریش مکّے لوٹ گئے ہیں، غافل ہو جائیں۔ اس طرح قریش کو پلٹ کر مدینے پر شبخون مارنے اور مسلمانوں کے استیصال کرنے کا زریں موقع مل جائے گا۔

لیکن آپؐ اس دھوکے میں نہ آئے۔ آپؐ نے حالات کے تیور پہچان لیے اور آپؐ کو یقین ہو گیا کہ یہ ابوسفیان کی چال ہے۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ جنگ کا پانسہ قریش کے حق میں پلٹ چکا تھا اور اس کی کامیابی کا امکان بھی تھا۔ قریش، جنھوں نے بہت زیادہ جنگی مصارف برداشت کیے تھے، آسانی سے بے نیلِ مرام نہیں جا سکتے تھے۔ پھر ایسے حالات سے فائدہ اٹھائے بغیر بے وجہ ناکام لوٹ جانے کی توقع ابوسفیان ایسے جہاندیدہ و تجربہ کار سپہ سالار سے نہیں کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ آپؐ نے فی الفور ابوسفیان کی اس چال کو ناکام بنانے کا منصوبہ بنایا، اور اس کے مطابق آپؐ اسی روز مجاہدین کو لے کر مدینے پہنچ گئے اور اس کے حفاظتی انتظامات سخت کر دیے۔

حمراء الاسد:

دوسرے روز یعنی ہفتہ ۱۶ شوّال ۳ھ / ۱ اپریل ۶۲۵ء کو آپؐ نے قریش کے تعاقب کا اعلان کیا، لیکن ساتھ ہی یہ احکام بھی صادر فرمائے کہ لشکر میں صرف وہی مجاہدین شامل ہوں گے جنھوں نے گزشتہ روز کی جنگ میں حصّہ لیا تھا۔ یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ اس امر کے باوجود کہ منافقین مجاہدین کو قریش کے تعاقب میں جانے سے منع کرتے تھے اور ان کی قوت میں مبالغہ کرتے اور مسلمانوں کو مقابلے کے انجام سے ڈراتے تھے، مجاہدین نے آپؐ کے اعلانِ جہاد پر لبیک کہا اور ایک نئے ولولے سے جہاد کے لیے آپؐ کے پرچم تلے جمع ہو گئے۔ اسی روز

شام کو آپؐ حمراء الاسد پہنچ گئے، جو مکّے کی جانب آٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ دشمن اسی راستے سے مدینہ منوّرہ پر حملہ کرسکتا تھا۔ آپؐ نے لشکر کی حفاظت کے سخت انتظامات کیے تاکہ دشمن شبخون نہ مار سکے۔

صبح ہوئی تو آپؐ نے مجاہدین کی صف بندی کی اور دفاعی جنگ کی تیاریاں مکمّل کرلیں۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مجاہدین کا جانی نقصان اگرچہ زیادہ ہوا تھا اور پریشانیاں بھی زیادہ اٹھانی پڑی تھیں، لیکن ان کے دل شوقِ جہاد سے معمور اور ان کا جنگی کردار بہت بلند تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ان کے دل قوّتِ ایمان سے مضبوط تھے اور دوسرے انھیں پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کی قیادت پر پورا بھروسہ تھا۔ نیز وہ اپنی غلطی و مسامحت کا ازالہ کرنے کے لیے بھی بیتاب تھے۔ چنانچہ جب وہ صف آرا ہوئے تو ہیبت و جلالت کے اس نظارے کا دل حریف نہیں ہوسکتا تھا۔

اس علاقے میں بنو خزاعہ آباد تھے۔ یہ قبیلہ اگرچہ تحریکِ اسلام میں شامل نہیں ہوا تھا لیکن اس کی ہمدردیاں مسلمانوں کے ساتھ تھیں۔ اگرچہ قریش سے بھی ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ ان کا ایک سردار معبد خزاعی رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوا، اپنی نیک خواہشات اور ہمدردی کا اظہار کیا، پھر کچھ راز کی باتیں ہوئیں، بعد ازاں وہ یہاں سے اٹھ کر سیدھا ابوسفیان سے ملنے الروحا گیا، جہاں لشکرِ قریش فروکش تھا۔ ابوسفیان اور اس کے مشیر مسلمانوں سے لڑنے کا متفقہ فیصلہ کیے بیٹھے تھے اور کہہ رہے تھے: ہم نے مسلمانوں کے بہترین آدمیوں، اشراف اور عمائدین کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے تو ان کا استیصالِ کلّی کیے بغیر کیسے لوٹ سکتے ہیں؟ ہم ضرور ان پر حملہ کرکے ان کا صفایا کریں گے۔

ابوسفیان کی معبد خزاعی کے ساتھ دوستی تھی اور پھر کفر و بت پرستی کا بھی مذہبی رشتہ تھا۔ اس نے معبد سے پوچھا: تمھارے پیچھے کیا حال ہے؟ اس نے جواب دیا: محمدؐ اپنے رفقا کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ، جس کی مثال پہلے دیکھنے میں نہیں آئی، تمھاری تلاش و تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ اب تو ان میں وہ لوگ بھی شامل ہوگئے ہیں جو کسی وجہ سے پیچھے رہ گئے تھے۔ وہ پیچھے رہ جانے پر سخت پشیمان ہیں اور تمھارے خلاف ان میں ایسا غیظ و غضب موجزن ہے جو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ ابوسفیان نے کہا: تیرا برا ہو، تُو کیا کہتا ہے؟ ہم تو مسلمانوں کا استیصالِ کلّی کرنے کا عزم بالجزم کیے ہوئے ہیں۔ لیکن معبد نے اپنی چرب زبانی

اور شعر گوئی سے ابوسفیان اور اس کے مشاہیر کو مکّے واپس جانے پر قائل کرلیا۔

ابنِ ہشام نے ایک روایت نقل کی ہے کہ معبد خزاعی سے پہلے صفوان بن اُمیّہ نے بھی اُحد سے واپسی کے وقت ابوسفیان بن حرب کو مکّے لوٹ جانے کا مشورہ دیا تھا اور اسے متنبّہ کیا تھا کہ مسلمان سخت غیظ و غضب کے عالم میں ہیں اور ڈر ہے کہ اب وہ اس طرح نہیں لڑیں گے جیسے لڑ چکے ہیں، لہٰذا اب ان سے دوبارہ جنگ نہیں کرنی چاہیے اور واپس چلنا چاہیے۔

دل آخر دل ہوتا ہے۔ ان باتوں سے ڈر گیا۔ جذبات پر عقل غالب آگئی اور ابوسفیان کو مجبوراً اور بادلِ نخواستہ بے نیلِ مرام لوٹنا پڑا۔[17] قریش کی ناکام مراجعت کے بعد پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حمراء الاسد میں دو روز اور قیام فرمایا اور ۱۹ر شوال ۳ھ/ ۴ر اپریل ۶۲۵ء کو مدینے واپس تشریف لے آئے۔[18]

اس جنگ میں ستّر مجاہدین شہید اور چالیس زخمی ہوئے۔ دشمن کے تیس آدمی ہلاک ہوئے۔ زخمیوں کی تعداد معلوم نہیں ہوسکی۔

سیرت کا ایک لافانی ریکارڈ :

اللہ تعالیٰ کی نظر میں جنگِ اُحد کی غیر معمولی اہمیّت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے متعلّق کثرت سے آیات نازل ہوئی ہیں۔ ایسی ہی ایک آیت میں مجاہدین کی اس قلت کا انتہائی مختصر مگر اتنا ہی جامع نقشہ کھینچا گیا ہے جب وہ مالِ غنیمت کے لالچ میں خود ہی دشمن کے نرغے میں آگئے تھے اور جان کے خوف سے بدحواس ہوکر اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے :

اللہ نے (تائید و نصرت کا) جو وعدہ تم سے کیا تھا، وہ تو اس نے پورا کر دیا۔ ابتدا میں اس کے حکم سے تم ہی ان کو قتل کر رہے تھے مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا، اور جونہی کہ وہ چیز اللہ نے تمھیں دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے (یعنی مالِ غنیمت)، تم اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے۔ اس لیے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کی طلب و آرزو رکھتے تھے اور بعض آخرت کے طلبگار تھے۔ تب اللہ نے تمھیں کافروں کے مقابلے میں پسپا کر دیا تاکہ تمھاری آزمائش کرے۔ اور حق یہ ہے کہ اللہ نے پھر بھی تمھیں معاف ہی کر دیا کیونکہ مومنوں پر اللہ بڑی نظرِ عنایت رکھتا ہے۔

یاد کرو جب تم بھاگے چلے جا رہے تھے، کسی کی طرف پلٹ کر دیکھنے تک کا ہوش تمھیں نہ تھا اور رسولؐ تمھارے پیچھے تم کو پکار رہا تھا، اس وقت تمھاری روش کا بدلہ اللہ نے تم کو یہ دیا کہ تم کو رنج پر رنج دیے تاکہ آیندہ کے لیے تمھیں یہ سبق ملے کہ جو کچھ تمھارے ہاتھ سے جائے یا جو مصیبت تم پر پڑے، اس پر ملول نہ ہو، اللہ تمھارے سب اعمال سے باخبر ہے۔"[۱۹]

یہود اور خاص کر منافقین جنگِ اُحد سے متعلق تبصرہ کرتے پھرتے اور یہ کہتے کہ پیغمبرِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو مفت میں مروا دیا۔ اگر آپؐ عبداللہ بن ابی ایسے دانا اور دیدہ ور انسان کی بات مان جاتے اور باہر نکل کر لڑنے کے بجائے مدینے ہی میں مورچہ بند ہو کر لڑتے تو یہ بھاری جانی نقصان نہ ہوتا۔ اس پراپیگنڈے سے مقصود یہ تھا کہ مسلمانوں کو آپؐ کی قیادت پر جو یقین و اعتماد تھا، وہ متزلزل ہو جائے، دوسرے مسلمان آیندہ آپؐ کے کہنے پر جان دینے پر تیار نہ ہو جائیں۔ تیسرے وہ مسلمانوں کو بالخصوص یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ اگر آپؐ پیغمبرِ خدا ہوتے تو آپؐ کو اس انجام کا پہلے ہی علم ہوتا اور آپؐ وہاں لڑنے نہ جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر یہ حقیقت آشکارا کی ہے کہ پیغمبر ہو یا کوئی اور، علمِ غیب کسی کو نہیں ہوتا۔ غیب کا علم صرف خدا ہی کو ہے۔[۲۰] پھر یہود و منافقین کے پراپیگنڈے کا رد کرنے اور مسلمانوں میں اس حقیقت کا اذعان و ایقان پیدا کرنے کی خاطر کہ شہادت موت نہیں، حیاتِ محض ہے، فلسفۂ شہادت کو مختصراً بیان کیا ہے، لیکن اس کے اختصار میں معانی کی وسعتیں سمائی ہوئی ہیں:

یہ (یعنی منافق) وہی لوگ ہیں جو خود تو بیٹھے رہے اور ان کے جو بھائی بند لڑنے گئے اور قتل ہوئے، ان کے متعلق انھوں نے کہہ دیا کہ اگر وہ ہماری بات مان لیتے تو قتل نہ ہوتے۔ ان سے کہو: اگر تم اپنے قول میں سچے ہو تو خود تمھاری موت جب آئے، اسے ٹال کر دکھا دینا۔

جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں، انھیں مُردہ نہ سمجھو، وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں اور اپنے ربّ کے پاس رزق پا رہے ہیں۔ جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انھیں دیا ہے اس پر خوش و خرّم ہیں اور مطمئن ہیں کہ جو اہلِ ایمان ان کے پیچھے رہ گئے ہیں اور ابھی وہاں نہیں پہنچے ہیں، ان کے لیے بھی خوف و غم کا موقع نہیں ہے۔ وہ اللہ کے انعام اور اس کے فضل پر شاداں و فرحاں ہیں اور ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ مومنوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔[۲۱]

اللہ تعالیٰ نے ان مجاہدین کو اجرِ عظیم کی خوشخبری دی، جنھوں نے میدانِ جنگ میں گھاؤ کھانے کے باوجود پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کی آواز پر لبیک کہا اور آپؐ کے ساتھ قریش کے

تعاقب میں چلنے پر تیار ہو گئے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"جن مجاہدوں نے زخم کھانے کے بعد اللہ اور اس کے رسولؐ کی پکار پر لبیک کہا، ان میں جو لوگ محسن اور متّقی ہیں، ان کے لیے اجرِ عظیم ہے، اور وہ جن سے لوگوں نے کہا کہ تمھارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں، ان سے ڈرو، تو یہ سُن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔ آخرِ کار وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل کے ساتھ پلٹ آئے۔ انھیں کسی قسم کا ضرر نہ پہنچا اور اللہ کی رضا پر چلنے کا شرف بھی انھیں حاصل ہو گیا۔ اللہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ اب تمھیں معلوم ہو گیا کہ وہ دراصل شیطان تھا جو اپنے دوستوں سے خواہ مخواہ ڈرا رہا تھا۔ لہٰذا آیندہ تم انسانوں سے نہ ڈرنا، مجھ سے ڈرنا اگر تم حقیقت میں صاحبِ ایمان ہو۔"[۲۲]

ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے اطمینان کے لیے آپؐ کو کفّار و منافقین سے متعلق چند اہم حقائق سے پہلے ہی مطلع فرما دیا:

"(اے پیغمبرؐ!) جو لوگ آج کفر کی راہ میں دوڑ دھوپ کر رہے ہیں، ان کی سرگرمیاں تمھیں آزردہ نہ کریں۔ یہ اللہ کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے۔ اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ ان کے لیے آخرت میں کوئی حصّہ نہ رکھے اور بالآخر ان کو سخت سزا ملنے والی ہے۔ جو لوگ ایمان کو چھوڑ کر کفر کے خریدار بنے ہیں، وہ یقیناً اللہ کا کوئی نقصان نہیں کر رہے ہیں، ان کے لیے دردناک عذاب تیار ہے۔ یہ ڈھیل جو ہم انھیں دیے جاتے ہیں، اس کو یہ کافر اپنے حق میں بہتر نہ سمجھیں۔ ہم تو انھیں اس لیے ڈھیل دے رہے ہیں کہ یہ خوب بارِ گناہ سمیٹ لیں، پھر ان کے لیے سخت رُسوا کُن عذاب ہے۔

"اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہرگز رہنے نہ دے گا جس میں تم اس وقت پائے جاتے ہو۔ وہ پاک لوگوں کو پلید لوگوں سے الگ کر کے رہے گا، مگر اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ تم کو غیب پر مطلع کر دے۔"[۲۳]

زنانہ نرسنگ کا سنگِ بنیاد:

جنگِ اُحد میں مسلم خواتین کے خدمتِ انسانی کے جذبہ و عمل سے عالمِ انسانی کو ایک عظیم فائدہ پہنچا اور اس نے مستقبل میں ایک مستقل رحمتِ انسانی کی شکل اختیار کر لی۔ اس اجمال

کی تفصیل یہ ہے کہ جنگِ اُحد میں مجاہدین خاصی بھاری تعداد میں شہید اور گھائل ہوئے تھے (شہدا کی تعداد ستر اور زخمیوں کی چالیس تھی)۔ چنانچہ اس کی اطلاع مدینے پہنچی تو مسلم خواتین جذبۂ انسانیت سے سرشار ہو کر میدانِ جنگ میں پہنچیں۔ انھوں نے خواہرانہ جذبے کے ساتھ زخمیوں کو پانی پلایا اور حالات و بساط کے مطابق ان کی خدمت اور دیکھ بھال کی۔ ان دردمند اور صاحبِ دل خواتین میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ، خاتونِ جنّت حضرت فاطمۃ الزہراؓ، حضرت اُمِ سلیمؓ (جو حضرت انسؓ کی والدہ تھیں)، حضرت اُمِ سلیطؓ (جو حضرت ابو سعید خدریؓ کی ماں تھیں) کے اسمائے گرامی سرِ فہرست ہیں۔[۲۴] اگر مسلم خواتین کے اس خواہرانہ جذبۂ تیمار داری کو "نرسنگ" کی تحریک کا، جس کی بانی فلورنس نائٹنگ گیل تھی، سنگِ بنیاد کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔

حضرت اُمِّ عمارہؓ کی بے مثال جُرأت و شجاعت :

اِس ضمن میں اِسلام کی ایک عظیم، جری اور بہادر خاتون کا ذکر کیا جاتا ہے جسے تاریخ نے ان کے جرأت آموز کارنامے کی بنا پر اُمِ عمارہؓ کے نام سے زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ وہ میدانِ جنگ میں کب اور کیونکر پہنچیں، یہ تو معلوم نہیں ہو سکا، لیکن تاریخ انھیں اس ہنگامۂ کارزار میں نبیِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے پاس دیکھتی ہے، جب آپؐ دشمنوں کے نرغے میں پھنسے ہوئے تھے اور آپؐ پر تیر و تلوار کے پے در پے حملے ہو رہے تھے۔ صورتِ حال اس قدر خطرناک و مہیب تھی کہ بڑے بڑے سورماؤں کا زہرہ گداز ہوتا تھا، لیکن اُمِ عمارہؓ آپؐ کے دفاع میں سینہ سپر ہو گئیں اور اس بے جگری سے لڑیں کہ اگر اس زمانے میں جرأت اور بہادری کے اعزاز کا رواج ہوتا تو وہ اعلیٰ ترین اعزاز کی مستحق قرار پاتیں۔ ان کی غیر معمولی جرأت و شجاعت اور جانفروشانہ کردار کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ قریش کا ایک نامور سورما ابن قمیۃ تیزی سے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم پر حملہ آور ہوا۔ اُمِ عمارہؓ نے دیکھا تو لپک کر آگے بڑھیں اور اسے روکا۔ ابن قمیۃ نے جھنجھلا کر ان پر وار کیا اور تلوار ان کے کندھے میں اُتر گئی۔ اُمِ عمارہؓ زخم کھانے کے بعد زخمی شیرنی کی طرح اس پر جھپٹیں اور تلوار ماری۔ ابن قمیۃ دُہری زرہ پہنے ہوئے تھا، بچ گیا۔

اس جنگ سے یہ بات بھی نمایاں ہوئی کہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیم و تربیت کی بدولت مسلمان خواتین کو اپنی اجتماعی ذمہ داریوں کا پورا شعور تھا، لہٰذا وہ تحریکِ اسلام میں بھرپور

حصّہ لیتی تھیں۔ علاوہ بریں تحریکِ اسلام کی کامیابی کے لیے انھیں پیغمبرِ اسلامؐ کی ضرورت اور آپؐ کے کردار کی اہمیت کا شعور تھا، اس لیے وہ جان و مال، اولاد، ماں باپ بلکہ ہر چیز سے زیادہ آپؐ کی زندگی و سلامتی کو عزیز رکھتی تھیں۔ اس ضمن میں تاریخ نے ایک بڑا ہی بصیرت آموز واقعہ محفوظ کر لیا ہے۔ ایک انصاری خاتون کو میدانِ جنگ سے یہ اطلاعیں ملتی رہیں کہ ان کا بھائی باپ اور شوہر شہید ہو گئے ہیں، لیکن وہ ہر شکیب رُبا خبر کے بعد یہی پوچھتی رہیں کہ رسُول اللہؐ کیسے ہیں؟ آپؐ کی شہادت کی افواہ سے وہ از حد مضطرب و غمزدہ تھیں۔ چنانچہ جب اس مجاہد خاتون نے آپؐ کی زیارت کی تو بے اختیار پکار اُٹھیں : کلّ مصیبۃٍ بعدکَ جلل تیرے ہوتے سب مصیبتیں ہیچ ہیں۔[۲۵]

جنگِ اُحد میں مُشرکین نے مسلمانوں کی نعشوں کی بے حرمتی اور مُثلہ کیا اور آپؐ کو بھی شہید کرنے کی کوشش میں گھائل کیا۔ یہ دیکھ کر بعض رقیق القلب صحابہؓ کا دل بھر آیا اور انھوں نے آپؐ سے عرض کیا کہ مشرکوں کے حق میں بد دُعا فرمائیں۔ آپؐ چونکہ رحمۃ للعالمین بن کر مبعوث ہوئے تھے، آپؐ نے جواب میں فرمایا : اِنّی لَمْ اُبْعَثْ لَعّاناً وَّلٰکِنْ بُعِثْتُ دَاعِیاً وَّ رَحْمَۃً۔ اَللّٰھُمَّ اِھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ : میں ہرگز لعنت کرنے کے لیے مبعوث نہیں کیا گیا ہوں۔ مجھے تو داعی اور رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اے اللہ! ہماری قوم کو ہدایت فرما کہ اسے (حق و صداقت کا) علم نہیں ہے۔[۲۶]

تحریکِ اسلام کے نُقطۂ نظر سے اس جنگ میں مجاہدین کی ناکامی کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ ان میں اپنی کمزوریوں کا، نیز اطاعتِ امیر اور عسکری نظم و ضبط کی غیر معمولی اہمیت کا شعور پوری طرح بیدار ہو گیا۔ اس سے دوسرا فائدہ یہ پہنچا کہ اس میں جو دشمن منافقت کا لبادہ اوڑھ کر گھُس آئے تھے، ان کا پردہ فاش ہو گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ تحریکِ اسلام کو نقصان بھی پہنچا۔ ایک تو یہ کہ کچھ وقت کے لیے تحریکِ اسلام کی رفتار سُست پڑ گئی، دوسرے غیر مسلم قبائل میں، جن میں مشرکین اور یہود دونوں شامل تھے، اس کے خلاف سازشیں اور شرارتیں کرنے کی جسارت پیدا ہو گئی۔

جنگِ اُحد کا حربی نقطۂ نظر سے تجزیہ :

جنگ کے آغاز میں مسلمانوں کا اپنی عسکری تربیت اور صف بندی کی بدولت پلڑا بھاری تھا اور وہ دشمن کو پیچھے دھکیلنے میں کامیاب بھی ہو گئے تھے لیکن انھوں نے مالِ غنیمت کے

لالچ میں دشمن کا پیچھا نہ کیا اور اس طرح انھوں نے قریش کو مار بھگانے اور ان کی عسکری قوت پر کاری ضرب لگانے کا زرّیں موقع کھو دیا۔ حربی نقطۂ نظر سے یہ ان کی مہلک غلطی تھی اور اس کی انھیں بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ جنگ کا یہ بالکل ابتدائی مرحلہ تھا، دشمن پر ابھی کوئی کاری ضرب نہ لگی تھی اور نہ اس کی جارحانہ قوّت کو کوئی نقصان ہی پہنچا تھا۔ اُدھر مجاہدین نے غضب یہ کیا کہ ایسے نازک موقع پر جب دشمن اپنی پوری قوت کے ساتھ ابھی میدانِ کارزار میں موجود تھا، انھوں نے مالِ غنیمت کے لالچ میں خود ہی اپنی صفوں کو درہم برہم کر دیا اور مالِ غنیمت لُوٹنے میں اس طرح لگ گئے کہ ان میں نہ تو اپنے سپہ سالار سے رابطہ اور نہ خود ان کی صفوں میں نظم و ضبط رہا۔ چونکہ فوج میں نظم و ضبط ہی کی بدولت "عسکریّت" پیدا ہوتی ہے، اس لیے اسلامی لشکر میں عسکریّت کی جگہ "اژدحامیّت" نے لے لی۔ یہ دیکھ کر قریش کو جوابی کارروائی کر کے مسلمانوں کو تہ تیغ کرنے کا موقع مل گیا۔ تیر اندازوں کا درّے کو خالی چھوڑ دینا' دشمن کو حملے کی دعوت دینا تھا، اس سے دشمن نے پورا فائدہ اٹھایا' اور اسے مسلمانوں کو اپنے گھیرے میں لینے اور منتشر کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا، لیکن قریش نے بھی اس سے متوقّع فائدہ نہ اُٹھایا۔

یہ درست ہے کہ ہمارے اربابِ سیرت اور مؤرّخین نے یہ دیکھ کر کہ اس جنگ میں مسلمانوں کو زیادہ جانی نقصان برداشت کرنا اور وقتی طور پر منتشر ہونا پڑا' یہ لکھنا شروع کر دیا کہ مسلمانوں کو ناکامی یا شکست ہوئی تھی، حالانکہ حربی نقطۂ نظر سے اسے شکست یا ناکامی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس موقف کی تائید میں متعدد دلائل پیش کیے جا سکتے ہیں : اوّل' مسلمان قریش کے جوابی حملے کی تاب نہ لانے اور منتشر ہونے کے باوجود میدانِ جنگ میں موجود رہے، بالآخر اپنے سپہ سالار کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے اور قریش کے میدان سے چلے جانے کے بعد بھی وہیں ڈٹے رہے۔ دوم : انھوں نے اپنے دار الحکومت مدینے پر دشمنوں کے متوقّع حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے الحمراء الاسد میں اپنا دفاعی مورچہ بنا لیا اور اس طرح ان کے منصوبے کو ناکام بنا دیا۔ قریش کو اس اعتبار سے تو یقیناً کامیابی ہوئی کہ انھوں نے مسلمانوں کو خاصا جانی نقصان پہنچایا اور ان کا پلڑا بھاری رہا، لیکن پانچ وجوہ سے انھیں سخت ناکامی ہوئی :

ایک یہ کہ انھوں نے مسلمانوں کی طاقت کچلنے اور انھیں فیصلہ کُن شکست دینے کا موقع جو خود مسلمانوں نے فراہم کر دیا تھا' ہمیشہ کے لیے ضائع کر دیا۔ دوسرے یہ کہ وہ تحریکِ اسلام کے قائدِ اعلیٰ' پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کو شہید یا گرفتار کرنے میں ناکام رہے' جو اُن کا سب

سے بڑا ہدف تھا۔ تیسرے یہ کہ مسلمانوں کے دار الحکومت اور تحریکِ اسلام کے مرکز و مُستقر کو تاخت و تاراج کرنے کا جو منصوبہ انھوں نے بنایا تھا' ہمیشہ کے لیے ناکام ہو گیا۔ چوتھے' اقتصادی نقطۂ نظر سے قریش کا مقصود یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کی عسکری قوت پر ایسی کاری ضرب لگائیں اور انھیں اس قدر مرعوب کر دیں کہ وہ ان کی تجارتی شاہراہ کی ناکہ بندی کرنے کے قابل نہ رہیں' اور نہ ہی ان میں اس قسم کے اِقدام کا حوصلہ رہے۔ نیز ان کی یہ کمزوری دیکھ کر ان کے حلیف ان کا ساتھ چھوڑ دیں، لیکن اس مقصد میں بھی قریش کو بُری طرح ناکامی ہوئی۔ پانچویں' اقتصادی، سیاسی یا جنگی لحاظ سے قریش کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ انھیں اس قدر جنگی مصارف برداشت کرنا پڑے کہ اس سے ان کی معیشت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا اور اس سے ان کی عسکری قوّت کا متاثر ہونا لازمی تھا' اور وہ ہُوئی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ معاشی بدحالی کی وجہ سے قریش کو مسلمانوں کے مقابلے میں اپنی عسکری قوّت کو منظم کرنے اور اس میں اضافہ کرنے کا موقع نہ مل سکا اور اس میں اضمحلال و ضعف کے آثار پیدا ہونے لگے' جن کو دیکھ کر آپؐ نے مکّے میں عمرہ کرنے کا فیصلہ کیا اور قریش کو معاہدۂ حدیبیہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ اصل یہ ہے کہ اس موقع پر قریش کا مسلمانوں سے مقابلہ نہ کرنا اور معاہدۂ حدیبیہ پر دستخط کرنا' اپنی کمزوری و شکست کو تسلیم کرنے کے مترادف تھا اور اس کا سبب جنگِ اُحد کے دُور رس نتائج تھے۔

اس سلسلے میں ہمیں یہ ازبس اہم بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ کسی مسلمان نے نہ تو اس جنگ میں ہتھیار ڈالے اور نہ وہ میدانِ جنگ سے فرار ہوئے اور نہ اہلِ مکہ کسی مسلمان کو جنگی قیدی ہی بنا سکے۔

اس جنگ کے واقعات سے دو نتائج مستنبط ہوتے ہیں : ایک یہ کہ امیر کی اطاعت سے رُوگردانی کرنا یا نظم و ضبط (یا ڈسپلن) قائم نہ رکھنا، فتح کے موقع کو ضائع کرنا اور شکست کو دعوت دینا ہے۔ دوسرا یہ کہ قیادت اعلیٰ ہو تو یقینی شکست سے بچا جا سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس چیز نے مسلمانوں کو یقینی شکست اور ہلاکت و بربادی سے بچایا' وہ آپؐ کی قیادت تھی' یعنی ایک عظیم و بے مثال انسان کی عظیم و مثالی قیادت، جس کے چند بنیادی اوصاف یہ تھے :

(۱) آپؐ کو اپنی قیادت پر اور مجاہدوں کو آپؐ کی قیادت پر پورا اعتماد تھا۔

(۲) بڑی سے بڑی قوّت، مہیب سے مہیب خطرہ' حوصلہ شکن و ہلاکت آفریں صورتِ حال بھی آپؐ کو مرعوب و ہراساں نہ کر سکتی تھی۔

(۳) آپؐ میں صبر و تحمّل، قوتِ برداشت اور حوصلہ بدرجۂ اتم موجود تھا۔
(۴) آپؐ کی شمعِ ایمان و امید کو بڑے سے بڑا طوفانِ حوادث بھی بُجھا نہ سکتا تھا۔
(۵) آپؐ کی نظر میں شاہین کی دُور بینی، دل میں شیر کا حوصلہ، حملے میں چیتے کی تیزی اور پُھرتی تھی۔
(۶) آپؐ میں دشمن کی چالوں کو فوراً سمجھنے اور ضروری جوابی کارروائی کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔
(۷) مجاہدین سے احسان یا حُسنِ سلوک کرنا اور ان کی بڑی سے بڑی لغزش سے بھی صرفِ نظر کرنا، آپؐ کا شعار تھا۔
(۸) منصوبہ بندی آپؐ کے معمولات میں سے تھی۔ آپؐ دشمن کی جارحانہ و مدافعانہ قوت اور منصوبے سے متعلّق ضروری معلومات کو پیشِ نظر رکھ کر جنگی منصوبہ بناتے تھے اور اس کے مطابق عمل کرنا آپؐ کا شعار تھا۔
(۹) آپؐ سائنٹفک طریقے سے صف بندی کرتے تھے اور اس میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے۔
(۱۰) آپؐ اپنے عسکری کردار کی عظمت سے دشمن کو مرعوب کرنے میں کمال رکھتے تھے۔

جنگِ اُحد کے وقت آپؐ کا سنِ مبارک ۵۶ برس تھا، لیکن ابھی آپؐ کو "عشقِ الٰہی" کے کئی صبر آزما امتحانوں سے گزرنا تھا۔ یہ عشق کبھی آپؐ کو میدانِ وفا میں مشغول رکھتا اور کبھی بساطِ سیاست پر، کبھی تعمیرِ معاشرہ میں مصروف رکھتا اور کبھی تزکیہ و تعلیم افراد میں۔ رات لوگوں کے لیے آرام و راحت اور فراغت و خواب کا پیام لے کر آتی، لیکن آپؐ کے لیے "دوست کا قاصد" بن کر آتی اور "حضوری" کا سندیسہ لاتی، لہٰذا آپؐ رات کو سوتے کم اور جاگتے زیادہ تھے۔
چونکہ آپؐ پیغمبرِ اعظم و آخر (صلّی اللہ علیہ وسلّم) تھے اور آپؐ نے افرادِ نسلِ انسانی کو بھرپور زندگی بسر کرنے کا حسین و عملی طریقہ بتانا تھا، لہٰذا مملکت، تحریکِ اسلام اور معاشرے کے کُل اُمور کو سر انجام دینے کے ساتھ ساتھ آپؐ ازدواجی زندگی کی ذمّے داریوں کو بھی باحسن وجوہ پُورا کرتے تھے۔ ہمیں یہ اصل یاد رکھنی چاہیے کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے سچّے اور آخری پیغمبرؐ تھے۔ اس لیے آپؐ کی ازدواجی زندگی بھی لوازماتِ نبوّت میں سے تھی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آپؐ کو بحکمِ ربّی تحریکِ اسلام کے بہترین مفادات کی خاطر، پیرانہ سالی میں بیوہ عورتوں سے نکاح کرنے پڑے۔

ایسا ہی ایک نکاح اس سال کے اواخر میں حضرت زینب بن خزیمہؓ سے کیا جو پہلے تین بار بیوہ ہو چکی تھیں۔ (شوّال تا ذوالحجہ ۳ھ / مارچ تا مئی ۶۲۵ء)۔ فیاضی کی وجہ سے وہ امّ المساکین کے لقب سے مشہور تھیں۔ نکاح کے دو یا تین ماہ بعد انتقال کر گئیں۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور جنّت البقیع میں دفن ہوئیں۔[۲۷]

زمانہ آپؐ کے لیے پُر آشوب ہی رہا، لیکن آپؐ حیاتِ پیغمبرانہ یعنی حسین اور بھرپُور زندگی گزارتے رہے، اس لیے کہ آپؐ رازِ زندگی سے آشنا اور صاحبِ حُسن و سرور تھے۔ بنی نوعِ انسان کی ہدایت و اصلاح کے لیے ہر گوشے میں حسین انقلاب اور ایک ارتقائی۔ مثالی معاشرہ تعمیر کرنے کی عظیم ذمہ داریوں کے باوصف آپؐ ہمسایوں، رشتہ داروں، دوستوں، رفیقوں، سب سے محبت و اخلاص کے ساتھ ملتے جلتے تھے، ان کی ہر غمی اور خوشی میں شریک ہوتے، بیماروں کی تیمار داری کرتے، حاجت مندوں کی احتیاج رفع کرتے اور ہر کسی کے کام آتے تھے۔ علاوہ ازیں آپؐ بچّوں کے ساتھ کھیلتے اور کھیل کھیل میں انھیں آداب سکھاتے، اور پھر گھریلو زندگی کی ذمّے داریوں کو باحسن وجوہ پورا کرتے تھے۔ چنانچہ جنگِ اُحد کا ہنگامہ ختم ہوتے ہی آپؐ نے اپنی صاحبزادی حضرت اُمّ کلثومؓ کا نکاح حضرت عثمانؓ سے کر دیا۔ اس طرح حضرت عثمانؓ کو "ذوالنّورین" کا لقب پانے کی سعادت نصیب ہوئی۔[۲۸]

انھی دنوں میں اللہ تعالیٰ نے وحی و تنزیل کے ذریعے مسلمانوں کو مُشرکہ عورتوں سے نکاح کی ممانعت کر دی۔[۲۹] عسکری لحاظ سے اس ممانعت کا یہ فائدہ ہوا کہ ایسی عورتوں کے ذریعے اہم رازوں کے افشا ہونے کے جو امکانات تھے، ان کا آیندہ کے لیے سدِّ باب کر دیا گیا۔ دُوسرے مسلمانوں کی نئی نسل پر ایسی عورتوں کی مشرکانہ تعلیم و تربیت کا اثر پڑنا لازمی تھا، لہٰذا اس امکان کو بھی ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا۔ اسی سال ۱۵ رمضان المبارک ۳ھ کو امام حسن علیہ السّلام پیدا ہوئے۔[۳۰]

حواشی و تشریحات

(۱) جبلِ اُحد یا اُحد کا پہاڑ مدینۂ منورہ کے شمال میں تین میل کے فاصلے پر شرقاً غرباً پھیلا ہُوا ہے۔ جنوب کی طرف اس کے وسط میں نعل نما وسیع خلا ہے جسے گھاٹی یا شعب کہتے ہیں۔ اس کے جنوبی کنارے پر ایک ٹیلا ہے جسے جبلِ عینین یعنی دو چشموں والا ٹیلا کہتے ہیں۔ جنگِ اُحد کے بعد اسے جبل الرماۃ بھی کہتے ہیں یعنی وہ ٹیلا جس پر مجاہد تیر اندازوں کا مورچہ تھا۔

(۲) الانفال ۸ : ۳۶۔

(۳) کہتے ہیں کہ صفوان بن امیہ نے جنگی تیاریوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔

(۴) ان شاعروں میں ابوعزّہ بھی، جو بدر کے جنگی قیدیوں میں سے تھا فدیہ ادا نہ کر سکتا تھا، بغیر فدیہ کے رہائی کے لیے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے استدعا کی۔ آیندہ جنگ میں حصہ نہ لینے کے وعدے پر رہا کر دیا گیا تھا، لیکن صفوان بن امیہ نے لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس نے مسافع بن عبد مناف کے ساتھ مل کر بنو کنانہ کو جنگ میں شامل کرنے کے لیے بڑی سرگرمیاں دکھائیں۔

(۵) قریش کے معزز گھرانوں کی عورتیں مردوں کی طرح مبارزت طلب، نڈر اور منتقم المزاج تھیں۔ لشکر کے ہمراہ آنے والی ان خواتین میں سے چند ممتاز نام یہ ہیں:

ا: ہند بنت عُتبہ، سپہ سالار ابوسفیان کی بیوی، جو اپنے باپ عُتبہ کا بدلہ لینے کے لیے بیتاب تھی۔

ب: فاطمہ بنت ولید، حضرت خالد بن ولیدؓ کی بہن، ابوجہل کے بھائی حارث بن ہشام کی زوجہ۔ اسے اپنے باپ ولید اور ابوجہل کا انتقام لینا تھا۔

ج: اُمِّ حکیم بنت حارث، عکرمہ بن ابوجہل کی بیوی اور ابوجہل کی بھتیجی۔ یہ ابوجہل کا انتقام

لینے کی خواہاں تھی۔

د: ریطہ بنت منبہ بن الحجّاج، عمرو بن العاص کی بیوی، اپنے باپ کا انتقام لینا چاہتی تھی۔

ر: خناس، حضرت مصعبؓ بن عمیر کی ماں جو مشرکہ تھی۔

س: برزہ بن مسعود ثقفی، صفوان بن امیہ کی بیوی، امیہ کے انتقام کی متمنی تھی۔

(۶) یہ درُست ہے کہ عورتوں کی موجودگی میں عرب زیادہ دلیری سے لڑتے تھے، لیکن جنگِ حنین کے موقع پر طائف کے مشہور و جہاندیدہ سپہ سالار درید بن صمّہ کی یہ رائے درست ثابت ہوئی کہ پاؤں اُکھڑ جائیں تو عورت وغیرہ کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ جنگ میں صرف تلوار کام دیتی ہے۔

(۷) آلِ عمران ۳ : ۱۵۹۔

(۸) آل عمران ۳ : ۱۶۰۔

(۹) آل عمران ۳: ۱۶۷ و ۱۶۸۔

(۱۰) آل عمران ۳ : ۱۲۲۔

(۱۱) تاریخ ابن خلدون (اردو)، ۱ : ۱۰۲۔

(۱۲) حضرت ابودجانہؓ : ابن ہشام لکھتا ہے : اس موقع پر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی تلوار دستِ مبارک میں لے کر صحابہؓ سے فرمایا : من یاخذ ھذا السّیف بحقہ۔ یعنی کون ہے جو یہ تلوار لے کر اس کا حق ادا کرے گا؟ یہ سُن کر بہت سے صحابہؓ تلوار لینے کی خواہش میں کھڑے ہو گئے مگر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے یہ تلوار حضرت ابودجانہؓ سماک بن خرشہ کو عنایت فرمائی جو بڑے شہ زور، دلیر اور جنگجو تھے۔ انھوں نے واقعی تلوار کا حق ادا کیا اور پھر آپؐ کی مدافعت و حفاظت میں شہید ہو گئے۔

(ابن ہشام، سیرۃ النبیؐ (اردو) ۲ : ۲۹ ببعد)۔

(۱۳) ابن ہشام، وہی کتاب، ۲ : ۳۱۰۔

(۱۴) موضوع مذکور۔

(۱۵) وہی کتاب، ۲ : ۳۳، ۳۴ ببعد۔

(۱۶) وہی کتاب، ۲ : ۳۷ ببعد۔

(۱۷) ہمارے اس موقف کی تائید ہند کے مندرجۂ ذیل اشعار سے بھی ہوتی ہے جو اس نے

لشکرِ قریش کی واپسی پر کہے تھے :

رجعت و فی نفسی بلابل جمّۃ — وقد فاتنی بعض الذی کان مطلبی

من اصحاب بدر من قریش وغیرھم — بنی ھاشم منھم و من اھل یثرب

ولکنّنی قد نلت شیئاً ولم یکن — کما کنت ارجو فی سیری و مرکبی

میں اس حالت میں واپس آئی کہ میرے دل میں بہت سے غم باقی رہ گئے اور میرے بعض مقاصد فوت ہوگئے ، جو میں اصحابِ بدر کے سلسلے میں پورا کرنا چاہتی تھی جن میں قریش وغیر قریش ، بنو ہاشم اور اہلِ یثرب شریک تھے۔ اگرچہ میں نے کسی حد تک اپنا مقصد پورا کر لیا ، مگر اس سفر ، بادیہ پیمائی اور جنگجوئی سے جو حاصل کرنے کی امیدیں لے کر آئی تھی ، وہ سب بر نہ آئیں۔ (دیکھیے سیرۃ ابن ہشام ' ۲ : ۱۷۲ اُردو ایڈیشن)۔

(۱۸) اس باب کی تیاری میں مندرجۂ ذیل مآخذ سے مدد لی گئی ہے :
(۱) قرآن مجید ' خاص کر سورۃ آل عمران اور انفال ' (۲) صحاح ستہ ' خاص کر صحیح بخاری ' کتاب المغازی ' (۳) تاریخ ابن اسحاق ' (۴) سیرۃ ابن ہشام (اردو) ۲ : ۲۱ تا ۱۰۵ ببعد ' (۵) طبقات ابن سعد ' ۲ : ۳۸ تا ۴۴ ببعد (۶) طبری ' ۳ : ۱۳۸۸ تا ۱۴۳۰ ببعد ' (۷) تاریخ ابن خلدون (اردو) ' ۱ : ۹۹ تا ۱۰۹ ' (۸) شبلی : سیرۃ النبی ؐ ' ۱ : ۳۶۹ تا ۳۸۷ ' (۹) ابن کثیر ' ۴ : ۶۴ تا ۸۱ ببعد (۱۰) ابن قیم : زاد المعاد (اردو) ' ۲ : ۱۸۷ تا ۱۹۸۔

(۱۹) آلِ عمران ۳ : ۱۵۲ ' ۱۵۳۔ (۲۰) آلِ عمران ۳ : ۱۷۹۔
(۲۱) آلِ عمران ۳ : ۱۶۸ تا ۱۷۱۔ (۲۲) آل عمران ۳ : ۱۷۲ تا ۱۷۵۔
(۲۳) آل عمران ۳ : ۱۷۶ تا ۱۷۹۔ (۲۴) صحیح بخاری ، کتاب المغازی۔
(۲۵) طبری ۳ : ۱۴۲۵۔ (۲۶) صحیح مسلم ، غزوۂ اُحد۔
(۲۷)۔ (۲۸) اصابہ فی تمیز الصحابہ ' ۴ : ۴۶۶۔
(۲۹) البقرہ ۲ : ۲۲۱۔
(۳۰) الخطیب : اکمال فی اسماء الرجال ' در مشکوٰۃ ' ۳ : ۳۳۶۔

باب : ۱۴

یہود و کفّار کی فتنہ انگیزیوں اور جبل و فریب کا دور

(غزوۂ اُحد کے بعد سے غزوۂ احزاب تک)

۱ : طلحہ اور سلمہ کی ناکام بغاوت یا سریۂ ابی سلمہ مخزومی رضؓ
۲ : حضرت عبد اللہ بن اُنیس رضؓ کا کارنامہ
۳ : رجیع کا المناک واقعہ یا سریۂ ابی مرثد الغنوی رضؓ
۴ : جماعت قراء کی شہادت یا بئرِ معونہ کا انسانیت سوز واقعہ
۵ : یہودی فتنہ گر بنو نُضیر سے نجات
۶ : حُرمتِ شراب
۷ : بنو غطفان کی شورش یا غزوۂ ذات الرقاع
۸ : حضرت اُمِّ سلمہ بنت امیہ رضؓ سے نِکاح

باب ۱۴

یہُود و کُفّار کی فِتنہ انگیزیوں اور دجل و فریب کا دَور

(غزوۂ اُحد کے بعد سے غزوۂ احزاب تک)

انقلاب کی منزل تو متعین ہوتی ہے، لیکن راہ نہیں ہوتی۔ اسے خُون دے کر خُود بنانا پڑتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رجعت پسند قوتیں اپنے جمود و تعطل کے ٹوٹنے سے گھبراتی، ڈرتی اور اپنے اس ڈر کی وجہ سے تحریکِ انقلاب کو کچلنے کے لیے خون کرنے اور خون دینے پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ یہ خون ہی راہِ انقلاب کو متعین و ہموار کرتا ہے۔ جنگِ اُحد میں مجاہدین کا خون جتنی بہتات سے گرا تھا، راہِ انقلاب کو اس نے اتنا ہی رنگین کر دیا تھا۔ اس رنگ سے جہاں دشمنوں کے حوصلے زیادہ ہوئے، وہاں صاحبِ نظر، داعیِ انقلاب اور تحریکِ انقلاب کے نقیبوں پر انقلاب کی راہ دُور تک واضح و متعیّن ہو گئی۔

آپؐ کی تحریکِ اسلام کا مقصود صرف سیاسی انقلاب نہ تھا بلکہ ہر زمان و مکان کے انسان کے لیے حیاتِ انسانی کے ہر گوشے میں حسین انقلاب لانا اور اسلامی معاشرے کی تعمیر کرنا تھا۔ چنانچہ جنگِ اُحد سے فارغ ہوتے ہی آپؐ تحریکِ اسلام کے کام میں مصروف ہو گئے۔ یہاں اس اہم حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے کہ آپؐ چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحریکِ اسلام کو کامیابی سے چلانے پر مامور ہوئے تھے، اس لیے آپؐ کو اس سلسلے میں ایک مستقل نوعیت کا ہدایت نامہ ملا تھا، اور وہ یہ ہے :

جُونہی فراغت پاؤ (اپنے) کام میں جُٹ جاؤ اور اپنے رب کی طرف ہی رغبت رکھو۔[۲]

اس ارشادِ الٰہی میں آپؐ کی نجی (پرائیویٹ) اور اجتماعی (پبلک) زندگی کی رُوداد مضمر ہے۔ یہ رُوداد ایک جُملے میں بیان کرنی ہو تو وہ ہے : بنی نوع انسان کی خاطر تحریکِ اسلام کو کامیاب

کرنے کے لیے مسلسل و پیہم جدّ و جہد اور اپنے اِلٰہ کے قرب و وصال کی طلب و آرزو۔ تاریخ شاہد ہے کہ آپ ﷺ کی زندگی آغاز سے انجام تک اس جدّ و جہد اور طلب و آرزو کے عالم میں رہی۔ آپ ﷺ کی زندگی کی راتیں "دوست" اور دن اس کے بندوں کے لیے وقف تھے۔

مشن جتنا عظیم ہو، اتنا ہی زیادہ عزم و حوصلہ، محنت و مشقّت، ایثار و قربانی اور صبر و استقامت کا متقاضی ہوتا ہے، جہاں تک آپ ﷺ کے مشن کا تعلّق ہے وہ اتنا عظیم تھا کہ کُل حیاتِ انسانی اور زمان و مکان کو محیط تھا۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے اس مشن کو کامیاب بنانے کی خاطر کس عزم و ہمّت سے کتنے زیادہ مصائب جھیلے، رنج و محن اٹھائے اور قربانیاں دی ہوں گی۔ آپ ﷺ کی تحریکِ انقلاب چونکہ رحمۃ للعالمینی تھی، اس لیے آپ ﷺ کو ہمیشہ یہ طلب و جستجو رہی کہ اس کی راہ کو پُرامن طریقے سے ہموار کرنا چاہیے۔ لیکن شر پسند طبائع کو نہ تو خود اس راہ پر چلنا اور نہ دوسروں کو اس راہ پر چلتے دیکھنا گوارا ہوتا ہے، لہٰذا انھیں یہ گوارا نہ ہوا۔ چنانچہ جنگِ اُحد میں مسلمانوں کی کمزوری اور نقصان کی مبالغہ آمیز خبریں سُن سُن کر ان میں تحریکِ اسلام کے خلاف سازشیں اور بغاوتیں کرنے کی جسارت پیدا ہوگئی۔ اصل یہ ہے کہ سنہ ۴ ہجری تحریکِ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مشرکین اور یہود کی ریشہ دوانیوں اور دجل و فریب کا سال ہے جس کی مختصر رُوداد پیش کی جاتی ہے۔

(۱) طلحہ اور سلمہ کی ناکام بغاوت یا سریۂ ابی سلمہ مخزومی رضؓ :

(یکم محرم ۴ھ / ۱۳ر جون ۶۲۵ء)

ہم دیکھ چکے ہیں کہ آپ ﷺ قبائل عرب کی سرگرمیوں پر کڑی نگاہ رکھتے تھے اور ان سے متعلق جاسوسوں اور مخبروں کے ذریعے آپ ﷺ کو بروقت اطلاعات ملتی رہتی تھیں، جن کی بنا پر آپ ﷺ بروقت کارروائی کرتے تھے۔ اس بے نام محکمۂ سراغ رسانی[۳] کو آپ ﷺ کی عظیم کامیابیوں کے بنیادی اسباب میں شمار کرنا چاہیے۔ چنانچہ ۳ ہجری کے آخری مہینے میں آپ ﷺ کو اطلاع ملی کہ فید کے کوہستانی علاقے قطن میں خویلد کے بیٹے طلحہ اور سلمہ جو قبیلہ بنو اسد کے سردار تھے، اپنی قوم کو مسلمانوں کے خلاف مدینے پر چڑھائی کرنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے اس فتنے کو آغاز ہی میں دبانے کی غرض سے یکم محرّم ۴ھ / ۱۳ر جُون ۶۲۵ء کو حضرت ابو سلمہ رضؓ کی قیادت میں ڈیڑھ سو مجاہدین کا ایک دستہ بھیجا۔ اس فوری و غیر متوقّع جوابی کارروائی کا خاطر خواہ اثر ہوا اور دُشمن مرعُوب و خوف زدہ ہو کر

منتشر و رُوپوش ہوگئے۔ آج کل کی سیاسی اصطلاح میں اسے پولیس کارروائی (پولیس ایکشن[۴]) سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ مؤرخین و اربابِ سیرت اس واقعے کو سریہ ابی سلمہ مخزومی رضؓ کہتے ہیں[۵]۔

(۲) حضرت عبدُاللہ بن اُنیس رضؓ کا کارنامہ (۵ر محرّم ۴ھ / ۱۷ر جون ۶۲۵ء) :

آپ ﷺ کی سیاسی و عسکری حکمتِ عملی کا جوہر یہ تھا کہ آپ ﷺ جنگ و جدل پر صلح و امن کو ترجیح دیتے تھے، دشمن کو جنگ سے باز رکھنے اور جنگ نہ کرنے کے معاہدے پر مجبور کرنے کی خاطر پہلے مذاکرات اور پھر رُعب و داب سے کام نکالنے کی کوشش کرتے تھے۔ جب لڑائی ناگزیر ہو جاتی تو پھر کم سے کم کُشت و خُون کے ذریعے اس کا فیصلہ کرنے کی سعی فرماتے۔ چنانچہ ابھی قطن کی بغاوت فرو کرنے سے فراغت ہی ملی تھی کہ آپ ﷺ کو اطلاع ملی کہ بنو لحیان کا رئیس سفیان بن خالد عُرنہ میں مُسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاریاں کر رہا ہے اور اس بغاوت کی آگ دُوسرے قبائل میں بھی پھیلانا چاہتا ہے۔ بصیرتِ رحمۃ للعالمین ﷺ نے یہ فیصلہ دیا کہ ایک فتنہ گر و مفسد سفیان بن خالد کے خوُن سے بہت سی جانیں بچ سکتی ہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس مہم کے لیے حضرت عبداللہ بن اُنیس رضؓ کو منتخب کیا اور ۵ر محرّم ۴ھ / ۱۷ر جون ۶۲۵ء کو انھیں عُرنہ روانہ کیا، جو مکّے سے زیادہ دُور نہ تھا۔

عُرنہ پہنچ کر حضرت عبداللہ رضؓ نے بھیس بدل لیا اور اپنی طلاقت و حکمتِ عملی سے سفیان بن خالد کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے اور پھر موقع پاکر رات کو اس کا سر قلم کر کے پہاڑوں میں رُوپوش ہوگئے۔ اس سے فتنہ دب گیا۔ اس مہم سے اٹھارہ دن بعد ۲۳ محرم ۴ھ / ۵ر جولائی ۶۲۵ء کو حضرت عبداللہ بن اُنیس رضؓ مسجدِ نبویؐ میں آپ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں پہنچے اور رُوداد پیش کی تو آپ ﷺ نے خوش ہو کر انھیں عصا عطا کیا اور فرمایا : اسے پکڑو اور جنّت میں چلے جاؤ۔ حضرت عبداللہ رضؓ کی وفات ہوئی تو ان کی وصیّت کے مطابق یہ عصائے مبارک کفن میں رکھ دیا گیا۔ اسے سریۂ عبداللہ بن اُنیس رضؓ بھی کہتے ہیں[۶]۔

(۳) رجیع کا المناک واقعہ (صفر ۴ھ / جولائی۔اگست ۶۲۵ء) :

رجیع کا واقعہ دراصل جنگِ اُحد کے عواقب کا ایک شاخسانہ تھا۔ اس جنگ میں قریش کی نام نہاد کامیابی کے مبالغہ آمیز قصّے سُن کر دشمنِ اسلام و فتنہ گر خالد بن سفیان ان کو مبارکباد دینے مکّے گیا۔ اس نے وہاں سُنا کہ طلحہ کی بیوی سلافہ نے منّت مانی ہے کہ وہ حضرت عاصم رضؓ بن ثابت کے

کاسۂ سر کو جامِ شراب بنائے گی، جنھوں نے غزوۂ اُحد میں اس کے بیٹے مسافع بن طلحہ کو تیر مار کر ہلاک کیا تھا اور اس کاسۂ سر کی قیمت اس نے ایک سو اونٹ لگائی تھی۔ یہ یاد رہے کہ طلحہ بن ابی طلحہ غزوۂ اُحد میں قریش کا علمبردار تھا۔ اس کے دو بھائی اور تین بیٹے اس جنگ میں کام آئے تھے۔ علاوہ ازیں قریش کے اور گھرانے بھی اپنے مقتولین کا بدلہ لینے کے لیے بے تاب تھے۔

خالد بن سفیان مکّار و سنگ دل بھی تھا اور لالچی بھی۔ اس نے انعام کے لالچ میں حضرت عاصم بن ثابتؓ اور دوسرے مسلمانوں کو دھوکے سے گرفتار کرنے کا منصوبہ بنایا۔ وہ خود تو قتل ہو گیا، لیکن اس کے قبیلے والوں یعنی بنو لحیان نے اس کے منصوبے کو عملی جامہ پہنایا۔ بنو لحیان مسلمانوں کو خود اپنے ہاں بلا نہیں سکتے تھے، لہٰذا انھوں نے عضل و قارہ کے لوگوں سے ساز باز کی۔ چنانچہ ان کے سات افراد پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ ہمارے لوگ اسلام کی طرف رُجحان رکھتے ہیں، آپؐ چند مسلمانوں کو ہمارے ساتھ کر دیں کہ وہ ہمارے لوگوں میں دین کا فہم پیدا کریں، قرآن پڑھائیں اور شریعتِ اسلامیہ کی تعلیم دیں۔ انھوں نے حضرت عاصمؓ بن ثابت کا خاص طور سے نام لیا۔ آپؐ نے ان کی درخواست قبول فرمائی اور سات مسلمانوں کی جماعت ان کے ہمراہ کر دی، جن کے امیر حضرت عاصمؓ بن ثابت یا حضرت مرثد بن ابی مرثدؓ تھے۔ دھوکے باز کفّار نے اس کی اطلاع خفیہ طور سے بنو لحیان کو پہنچا دی تھی۔ مسلمان معلّمین و مبلّغین کی یہ جماعت رجیع کے چشمے پر پہنچی، جو عسفان اور مکّے کے درمیان واقع ہے، تو دفعتاً مُسلّح بنو لحیان ان پر جھپٹ پڑے۔ وہ دو سو تھے، جن میں ایک سو تیر انداز تھے۔

مسلمانوں کی اس مختصر سی جماعت نے سرفروشانہ مزاحمت و مقاومت کی، چار شہید ہو گئے۔ تین سے امان دینے کا وعدہ کر کے ہتھیار ڈلوا لیے اور انھیں گرفتار کر لیا۔ اِن اصحابِ ثلاثؓ کے نام یہ ہیں : حضرت خبیب بن عدیؓ، حضرت زید بن الدثنہؓ اور حضرت عبداللہ بن طارقؓ۔ مرّ الظہران کے مقام پر حضرت عبداللہ بن طارقؓ نے اپنے آپ کو چھڑا لیا لیکن دشمنوں نے انھیں شہید کر دیا۔ کفّار کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ حضرت عاصم بن ثابتؓ کا سر کاٹ کر سو اونٹ حاصل کریں، لیکن ان کی یہ آرزو داغِ حسرت بن کر رہ گئی۔ پہلے تو حضرت عاصمؓ کی نعش پر شہد کی مکھیوں نے ہجوم کیا، جس کی وجہ سے کفّار کوشش کے باوجود اس کے قریب نہ جا سکے۔ وہ ابھی موقع کے انتظار میں تھے کہ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی جو نعش کو نہ جانے کہاں بہا کر لے گئی۔ یوں کفّار یہ حسرت لے کر لوٹے۔ انھوں نے دونوں قیدیوں کو مکّے میں لے جا کر فروخت

کر دیا۔ حضرت حبیب بن عدیؓ کو حارث کے بیٹوں نے اور حضرت زید بن الدثنہؓ کو صفوان بن امیّہ نے خرید لیا۔ ان دونوں جلیل القدر صحابہ کو قریش نے حرم کے باہر تنعیم میں شہید کر دیا۔

حضرت حبیبؓ کو تنعیم کی مقتل میں لایا گیا تو انھوں نے قریش سے اجازت لے کر بڑے خشوع و خضوع سے دو رکعت نماز پڑھی اور اس طرح اس عاشقِ اِلٰہ و رسولؐ نے شہادت سے پہلے نماز پڑھنے کی رسم کی طرح ڈالی۔

حضرت زیدؓ کو مقتل میں لایا گیا تو وہاں ابوسفیان بھی موجود تھا۔ اس نے حضرت زیدؓ سے پوچھا :
"سچ بتاؤ، اگر اس وقت تمھارے بدلے محمدؐ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) قتل کیے جاتے تو کیا تم اسے اپنی خوش نصیبی نہ سمجھتے ؟"

بادۂ عشقِ رسولؐ سے سرشار حضرت زیدؓ نے بے ساختہ جواب دیا : "واللہ ! مجھے تو یہ بھی گوارا نہیں کہ میرے بچاؤ کے بدلے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے پائے مبارک میں کانٹا بھی چُبھ جائے۔"

یہ سُن کر ابوسفیان کی زبان سے بے ساختہ نکلا : "اللہ کی قسم ! میری نظر سے کوئی شخص ایسا نہیں گزرا جو دوسرے شخص سے ایسی محبت کرتا ہو جیسی اصحابِ محمّد محمدؐ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) سے کرتے ہیں۔"

حضرت زیدؓ کو صفوان کے حکم پر اس کے غلام نسطاس نے شہید کیا۔ رجیع کے واقعے کو سریہ ابی مرثد الغنویؓ بھی کہتے ہیں۔

(۴) جماعتِ قُرّا کی شہادت یا بئرِ معونہ کا انسانیّت سوز واقعہ :

(صفر ۴ھ / جولائی۔ اگست ۶۲۵ء)

صفر کا یہ مہینا مسلمانوں کے لیے ایک اور بھیانک اور انسانیّت سوز واقعے کا پیغام لے کر آیا۔ اس واقعے کی مختصر داستان یہ ہے کہ قبیلہ کلاب کا رئیس ابو براء بن مالک کلابی آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ نے اسے دعوتِ اسلام دی، جسے اس نے ردّ کیا، نہ قبول۔ البتہ آپؐ سے درخواست کی کہ مسلمان مبلّغین و معلّمین کی ایک جماعت اہلِ نجد کے ہاں بھیج دیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ لوگ دعوتِ اسلام قبول کر لیں گے۔ آپؐ نے جواب میں فرمایا : "انی اخشی علیهم اهلِ نجدٍ۔" یعنی مجھے اپنے آدمیوں کے متعلق اہلِ نجد سے اندیشہ ہے۔ ابو براء نے کہا : "انا لهم جار

یعنی میں ان کا ضامن ہوں۔ آپؐ نے چالیس یا ستر مبلّغین کی ایک جماعت تیار کی جن میں اکثریت اصحابِ صُفّہ کی تھی اور انھیں نجد روانہ کیا۔ اس جماعت کے امیر حضرت منذر بن عمرو ساعدیؓ مقرر ہوئے جو حضرت عمر فاروقؓ کے خسر اور عاصم بن عُمرؓ کے نانا تھے۔ مسلمانوں میں یہ جماعت قُرّا کے نام سے مشہور تھی اور اپنے زہد و ورع کی وجہ سے بڑی مقدس سمجھی جاتی تھی۔

بئرِ معونہ کے مقام پر صحابۂ کرامؓ کی اس مقدس جماعت نے قیام کیا اور حضرت حرام بن ملحانؓ کو رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا نامۂ مبارک دے کر بنو عامر کے رئیس عامر بن طفیل کے پاس بھیجا۔ وہ شقی القلب فرعونِ وقت، قاصدِ رسولؐ کو دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے نہ تو نامۂ مبارک پڑھا اور نہ سفارتی اصول و آداب کا لحاظ ہی کیا، اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا جس نے حضرت حرامؓ کو نیزہ مار کر شہید کر دیا۔ پھر اس نے اپنے قبیلے کے لوگوں یعنی بنی عامر کو اس مقدس جماعت کو قتل کرنے کو کہا، لیکن انھوں نے اس بنا پر کہا ماننے سے انکار کر دیا کہ عامر بن طفیل کے چچا ابو براء نے مسلمانوں کی ضمانت دی تھی۔ ان سے مایوس ہو کر اس نے بنو سُلیم سے رجوع کیا اور ان کے قبائل عصَیّہ، رِعل اور ذکوان کو لے کر مسلمانوں کی اس مختصر جماعت پر حملہ کر کے اسے شہید کر دیا۔

اس جماعت میں سے صرف دو اشخاص زندہ بچے، ایک حضرت کعب بن زید انصاریؓ جنھیں مُردہ سمجھ کر چھوڑ دیا گیا تھا اور دوسرے عمرو بن امیّہ ضمریؓ، جن کو عامر بن طفیل نے یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ اس کی ماں نے قبیلۂ ضمری کے کسی شخص کو آزاد کرنے کی منّت مان رکھی ہے۔

حضرت عمرو بن امیّہؓ مقدس بزرگوں کے قتلِ عام کے اِنسانیت سوز نظارے کے صدمے سے نڈھال واپس مدینے آ رہے تھے کہ راستے میں انھوں نے بنو کلاب کے دو اشخاص کو جوشِ اِنتقام میں قتل کر ڈالا۔ انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم انھیں امان دے چکے تھے۔ آپؐ سے جب حضرت عمرو بن امیّہؓ نے اس واقعے کا ذکر کیا تو آپؐ کو اس کا سخت رنج پہنچا اور ناراضگی کا اظہار اور مقتولین کے خون بہا دینے کا اعلان کیا۔ آپؐ خون بہا دینے کے سلسلے میں بنو کلاب کے حلیف بنو نُضیر کے پاس گئے تھے تو انھوں نے آپؐ کو ہلاک کرنے کی سازش و کوشش کی تھی۔ اس طرح یہ واقعہ غزوہ بنی نُضیر کا ایک فوری سبب بن گیا۔[۹]

یہودی فتنہ گر بنو نُضیر سے نجات : (یکم ربیع الاوّل ۴ ھ / اگست، ستمبر ۶۲۵ء):

بنو نُضیر یہود کا ایک مرفّہ الحال جنگجو قبیلہ تھا۔ ان کے پاس قلعے تھے جن میں اسلحہ کے ذخائر

تھے۔ وہ قریش کے جاسوس اور راس المنافقین عبد اللہ بن ابی کے حلیف تھے اور مسلمانوں کے لیے مارِ آستیں بنے ہوئے تھے۔ مُسلمانوں کے خلاف ان کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کی وجہ سے ان کا وجود اسلامی ریاست کے لیے مُستقل خطرہ بنا ہوا تھا۔ آپؐ ان باتوں کو برداشت تو کرتے تھے لیکن ان پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے۔ جنگِ اُحد کے بعد سے وہ آپؐ کی جان لینے کی فکر میں رہنے لگے تھے۔ ایک روز انھیں ایک ایسا موقع ہاتھ آنے لگا تھا کہ آپؐ کی پیغمبرانہ بصیرت نے انھیں ناکام بنا دیا۔ ہوا یوں کہ آپؐ بنو عامر کے دو اشخاص کا، جنھیں عمرو بن امیّہ ضمریؓ نے لاعلمی میں قتل کر دیا تھا، خون بہا دینے کے سلسلے میں بنو نُضیر کے پاس تشریف لے گئے جو مسلمانوں کی طرح بنو عامر کے بھی معاہد تھے۔ یہود ظاہری طور پر بڑے تپاک سے ملے، لیکن انھوں نے فوراً آپؐ کو ہلاک کرنے کی سکیم بنا لی۔ آپؐ کو بڑے احترام سے سایۂ دیوار میں بٹھایا اور عمرو بن حجاش نضری نامی ایک شخص کو کوٹھے پر سے ایک بھاری پتّھر آپؐ پر گرانے پر مامُور کیا۔ آپؐ کی حسِّ پیغمبری نے حالات و ظروف کے تیور پہچان لیے اور آپؐ فوراً وہاں سے تشریف لے گئے۔

یہود نے یہ موقع ضائع کر دینے کے بعد ایک اور تدبیر کی، جو رجیع اور بئرِ معونہ کے واقعات کی روشنی میں تیار کی گئی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ آپؐ اسلام کی نشر و اشاعت کے لیے بے قرار رہتے ہیں اور ایسا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ چنانچہ اُنھوں نے آپؐ کو پیغام بھیجا کہ ہم اپنے علمائے دین کا آپؐ سے مناظرہ کرانا چاہتے ہیں۔ اگر ہم پر اسلام کی حقّانیت ثابت ہو گئی تو ہم اسے قبول کر لیں گے، لہٰذا آپؐ اپنے تیس آدمیوں کے ساتھ تشریف لائیں، ہمارے علماء کی تعداد بھی اتنی ہی ہو گی۔ یہود کا منصوبہ یہ تھا کہ ان کے آدمی خنجروں وغیرہ سے مسلّح ہوں گے، مناظرے کے دوران یکبارگی حملہ کر کے آپؐ کو شہید کر دیں گے۔ اس خُفیہ منصوبے سے ایک خاتون نے اپنے انصاری بھائی کو مطلع کر دیا اور اس طرح آپؐ نے یہود سے مناظرہ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا، ساتھ ہی ان کے فتنوں کا سدِّباب کرنے کا بھی فیصلہ کیا۔ آپؐ کو قریش کے اس خط کی بھی اطّلاع مل گئی جس میں انھوں نے بنو نُضیر کو الٹی میٹم دیا تھا کہ (حضرت) محمدؐ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو قتل کر دو، ورنہ ہم تم سے جنگ کریں گے۔

قریش، عبد اللہ بن ابی اور ان کے حلیف قبائل کی مدد پر تکیہ کر کے بنو نُضیر کے مسلمانوں پر اچانک حملہ کرنے کے امکانات بہت زیادہ ہو گئے تھے۔ آپؐ نے حسبِ معمول بنو نضیر کو کسی قسم کی پہل کرنے کا موقع نہ دیا۔ بنو نُضیر اپنے ہم مذہب قبیلے بنو قریظہ سے معاہدۂ حلف کرنا چاہتے

تھے، لیکن آپؐ نے پہل کر کے بنو قریظہ سے معاہدے کی تجدید کرالی، اور بنو نُضیر کو ان کی امداد سے محروم کر دیا۔ بلاشُبہ یہ آپؐ کی بہت بڑی سیاسی کامیابی تھی۔ اس کے بعد آپؐ بنو نُضیر کی طرف متوجہ ہوئے اور انھیں تجدیدِ معاہدہ کے لیے کہا، لیکن انھوں نے عبداللہ بن ابیّ کی شہ اور بھرپور امداد کی یقین دہانی پر ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ میثاقِ مدینہ کی کھُلّم کھُلّا خلاف ورزی تھی۔ آپؐ نے مدینے کے تمام دفاعی انتظام مکمل کر کے بنو نضیر کو دس دن کے اندر اندر مدینہ چھوڑ کر چلے جانے کا الٹی میٹم دے دیا۔ انھوں نے الٹی میٹم ٹھکرا دیا اور جنگ کے لیے قلعہ بند ہو گئے۔ آپؐ نے اپنی دفاعی اور جارحانہ قوّت کا اس طرح مظاہرہ کیا کہ عبداللہ بن ابیّ، بنو غطفان یا بنو قریظہ کسی کو بھی ان کی مدد کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ عبداللہ بن ابیّ کے وعدے شیطان کے وعدے تھے، وہ سراب ثابت ہوئے تو بنو نُضیر جی ہار بیٹھے۔ وہ اکیلے مسلمانوں کے محاصرے کی تاب نہ لا سکے اور پندرہ دن بعد مایوس ہو کر، جلاوطنی پر رضامند ہو گئے اور معاہدے کے مطابق چھ سو اونٹوں پر اپنا اثاثہ لاد کر ترکِ وطن کر گئے۔ ان میں سے کچھ لوگ تو وادیِ القریٰ اور شام کی طرف کوچ کر گئے اور باقی خیبر میں جا بسے، جن میں ان کے رئیس حُیَیّ بن اخطب، ابو رافع بن ابوالحُقیق وغیرہ تھے۔ ہم آگے جا کر معلوم کریں گے کہ یہی یہودی فتنہ گر جنگِ احزاب کا باعث بنے اور بنو قریظہ کو غدّاری پر مجبور اور برباد کرنے کے ذمّہ دار بھی وہی تھے۔[۱]

مدینے سے بنو نُضیر کے چلے جانے سے مسلمانوں کو سیاسی اور معاشی فوائد حاصل ہوئے۔ مدینے کا دفاع پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گیا۔ ان کی معاشی حالت پہلے سے بہتر ہو گئی۔ اس سے ان کی عسکری قوّت میں بھی اضافہ ہوا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انھیں ایک خطرناک اندرونی دُشمن سے نجات مل گئی۔ اگر آپؐ بنو نُضیر کے خلاف بروقت جوابی کارروائی نہ کرتے اور انھیں مدینے میں رہنے کی مُہلت مل جاتی تو غزوۂ احزاب یا خندق کی جنگ میں مدینے میں ان کی موجودگی مسلمانوں کے لیے ہلاکت و بربادی کا سبب بن سکتی تھی۔ یہ اور اس قسم کے واقعات آپؐ کے بے مثال تدبّر، حیرت انگیز مستقبل بینی اور بے عدیل تاریخی و سیاسی بصیرت کے تاریخی ثبوت ہیں۔

حُرمتِ شراب :

"معاشرتی زندگی میں فساد نتیجہ ہوتا ہے اس کے افراد کی داخلی زندگی میں فساد برپا ہونے کا۔"

یہ کلّیہ جسے قرآنِ مجید کی تعلیمات سے مستخرج کیا گیا ہے، فلسفۂ حکمت کا جوہر ہے۔ آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے بنی نوعِ انسان کا معلّم و مزکّی بنا کر مبعوث فرمایا تھا تو اس میں یہی حکمت مضمر تھی کہ آپؐ لوگوں کی اندر کی دُنیا کا تزکیہ کریں، یعنی ان کے دل و دماغ کی بیماریوں کو شفا بخشیں اور صالح بنائیں، ان میں مضمر استعدادوں کو قوّت سے فعل میں لائیں، ان کے خیالات و نظریات اور جذبات و خواہشات کی تطہیر کریں، اور ان کے فکر و نظر کی جہت کو صالحہ بنائیں، نیز ان کی اندر کی دُنیا کو علم و حکمت کے چراغ سے روشن کریں۔ اس کا طبعی نتیجہ یہ نکلے گا کہ افراد اپنی مطہّر، حسین اور مطمئن داخلی دنیا کی طرح، اپنی خارجی یا معاشرتی دنیا کو بھی حسین و پُرامن بنانے میں لگ جائیں گے۔

ہم دیکھ آئے ہیں کہ نبیِ کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی مکّی زندگی صالح انسانوں کی ایک جماعت تیار کرنے میں گزری تھی، کیونکہ ایسے لوگوں کے بغیر صالح معاشرے کی اساس نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ جب یہ جماعت تیار ہو گئی تو آپؐ اس کے ساتھ مدینے ہجرت کر گئے، جہاں آپؐ نے جاتے ہی ایک صالح معاشرے کی تعمیر کا کام شروع کر دیا، لیکن ساتھ ہی تزکیہ و تعلیم کا سلسلہ قائم رکھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید کا وہ حصّہ جو مکّے میں نازل ہُوا، اس کا تعلّق افراد کی شخصیّت کی تعمیر و تحسین سے ہے اور جو حصّہ مدینے میں نازل ہُوا، اس کا تعلّق زیادہ تر معاشرے کی تعمیر و تحسین سے ہے، لیکن افراد کے تزکیہ و تعلیم کا بھی برابر خیال رکھا گیا ہے۔ چونکہ یہ دونوں کام جو ایک ہی سلسلے کی دو کڑیاں ہیں اور تدریجی نوعیّت کے تھے، اس لیے ان سے متعلق ہدایات بھی بتدریج نازل ہوتی رہیں۔ اس سے اس امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں اللہ تعالےٰ نے قرآن مجید کو یکبارگی نہیں، بتدریج نازل کیا۔ علاوہ بریں بشر کو انسان اور انسان کو عبد بنانا دیر طلب اور تدریجی نوعیّت کا کام ہے، لہٰذا اللہ تعالےٰ مناسب وقت اور موقع و محل پر بتدریج آپؐ کو ہدایات بھیجتا رہا۔

یہ بات مسلّمات میں سے ہے کہ عادت کا ترک کرنا انتہائی مُشکل ہوتا ہے اور آپؐ کا وظیفۂ نبوّت پہلے مرحلے میں اہلِ عرب سے عاداتِ قبیحہ کو چھُڑانا تھا، لہٰذا آپؐ نے ایک مثالی حکیمِ حاذق کی طرح لوگوں کی عادات کو یک دم نہیں، رفتہ رفتہ چھڑانے کی کامیاب حکمتِ عملی اختیار کی۔ اس کی ایک مثال حرمتِ شراب ہے۔ دُنیا کی بیشتر اقوام کی طرح شراب عربوں کی گھُٹی میں پڑی ہوئی تھی اور اسے معاشرتی رُخصت[۱] حاصل تھی۔ اس کو جمالیاتی معروض ثقافت کا جُزو اور اہلِ ذوق کا مشروب سمجھا جاتا تھا۔ شراب سے مُتعلّق یہ تصوّر ابلیس کا جمالیاتی

مغالطہ ہے، جس کے ذریعے وہ انسان کو ہر زمان و مکان میں گمراہ کرتا آیا ہے۔ ظاہر ہے اس غلط و گمراہ کُن تصور کو مٹائے بغیر بادہ خواروں سے شراب نوشی کی عادت چھڑانا ازبس دُشوار ہوتا، لہٰذا قرآن حکیم نے انسان پر یہ حقیقت آشکارا کر دی کہ شراب حسین نہیں، قبیح ہے۔ لہٰذا اسے جمالیاتی معروض سمجھنا غلط ہے۔[13] ظاہر ہے قبیح چیز کو کور ذوق لوگ ہی پسند کرسکتے ہیں اور اہلِ حُسن و ذوق کو اس سے طبعاً نفرت ہوگی۔ اسلامی ثقافت چونکہ حسین و پاکیزہ ہے، وہ اہلِ حُسن و ذوق کی ثقافت ہے، اس لیے وہ اس میں راہ نہیں پاسکتی۔ اس لطیف جمالیاتی حقیقت کی صراحت کے لیے قرآن مجید نے رفتہ رفتہ دوسرے اسالیب بیان اختیار کیے : انسان چونکہ طبعاً منفعت پسند ہے، لہٰذا اسے اس اصل سے آگاہ کیا کہ شراب نوشی اور قمار بازی میں اگرچہ فائدے بھی ہیں، لیکن فائدوں کے مقابلے میں نقصان بہت ہی بڑا ہے۔[14] یہ نقصان مادّی، اخلاقی، مُعاشی، مُعاشرتی اور رُوحانی ہر اعتبار سے بہت بڑا ہے۔ یہ دُنیوی و اُخروی لحاظ سے گھاٹے کا سودا ہے اور عقلِ سلیم کا فتویٰ یہ ہے کہ گھاٹے کا سودا نہ کیا جائے۔

تیسرے مرحلے پر مسلمانوں پر یہ بندش لگائی گئی کہ وہ اس کے مجاز نہیں ہیں کہ نشّے کی حالت میں نماز پڑھیں یا اس کے قریب بھی جائیں۔[15] نشّے کی حالت میں نماز کے قریب جانے کی ممانعت میں یہ نکتہ مضمر ہے کہ نشّے کی حالت میں کوئی شخص مسجد یا اس مقام کے قریب بھی نہیں جاسکتا، جہاں باجماعت نماز پڑھنے کا عارضی یا مُستقل انتظام ہو۔ اگرچہ بادی النظر میں یہ معمولی نوعیت کی پابندی ہے، لیکن اس دَور کے اسلامی معاشرے کے لحاظ سے یہ بہت بڑی پابندی تھی۔ اس پابندی سے ترکِ نماز لازم آتی ہے، جو گناہِ کبیرہ ہے۔ دوسرے مسجد عہدِ نبویؐ میں ثقافتی یا دینی (دونوں اپنے وسیع ترین معنوں میں) سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ یہ کُھلی درسگاہ بھی تھی اور مرکزِ تربیت بھی۔ یہ عدلیہ بھی تھی اور انتظامیہ بھی، یہ سفارت خانہ بھی تھی اور عسکری صدر مقام بھی، یہ مجلس ذکر و فکر بھی تھی اور مجالسِ شوریٰ کا مقام بھی، غرضیکہ مسجد اسلامی زندگی کی کُل سرگرمیوں کا مرکز تھی اور اس سے دُوری اہلِ ایمان کے لیے سب سے بڑی محرُومی و نامُرادی تھی، لہٰذا اس قدغن سے بادہ خواری کم کرنے میں مؤثر مدد ملی۔

چوتھے اور آخری مرحلے پر بادہ خواری کو شیطانی عمل قرار دے کر اس کی قطعی ممانعت کر دی گئی اور اس حکم کے جواز میں دلائل و براہین بھی پیش کیے گئے جو قرآنِ حکیم کا شیوہ ہے، نیز اس حکم میں بعض دوسرے قبیح اعمال کو بھی حرام قرار دے دیا گیا۔

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، یہ شراب، یہ جُوا اور یہ آستانے اور پانسے، یہ سب گندے شیطانی کام ہیں۔ ان سے پرہیز کرو۔ امید ہے کہ تمھیں فلاح نصیب ہوگی۔ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جُوئے کے ذریعے تمھارے درمیان عداوت اور بُغض ڈال دے اور تمھیں اللہ کی یاد اور نماز سے روک دے۔ پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے ؟ اللہ اور اس کے رسولؐ کی بات مانو اور باز آجاؤ، لیکن اگر تم نے حکم عدولی کی تو جان لو کہ ہمارے رسولؐ پر بس صاف صاف حُکم پہنچا دینے کی ذمّہ داری تھی"۔[16]

مختصر یہ کہ آپؐ کی انقلابی، تعمیری سرگرمیوں اور تعلیمات کے مُطالعے سے یہ اُصُول مستنبط ہوتا ہے کہ معاشرے کو صالح بنانے کے لیے افراد کو صالح بنانا ناگزیر ہے، کیونکہ صالح افراد ہی صالح معاشرے کی تشکیل و تعمیر کرسکتے ہیں۔

بنو غطفان کی شورش یا غزوۂ ذات الرقاع : (جمادی الاوّل ۴ھ / اکتوبر، نومبر ۶۲۵ء)

ایک طرف رحمۃٌ للعالمینؐ لوگوں کی اصلاح و تربیت کرنے اور انھیں رُشد و ہدایت کی راہ پر چلانے میں سرگرمِ عمل تھے تو دوسری جانب اہلِ شرک و کُفر مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مشغول تھے۔ چنانچہ یہود کے مفسد و متفنّی قبیلے بنو نُضیر کے فتنے سے فراغت ملے ابھی چند ہفتے ہی ہوئے تھے کہ آپؐ کو اطلاع ملی کہ بنو غطفان کے قبائل بنی محارب اور بنی ثعلبہ مدینے کو تاخت و تاراج کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ یہ قبائل خونخوار و جنگجُو تھے۔ اگر ان کو جنگی تیاریوں کی مُہلت اور مدینے پر چڑھائی کرنے کا موقع مل جاتا تو سخت خونریزی و غارت گری کے قوی امکان تھے۔ علاوہ بریں ان کے اس جارحانہ اقدام میں انھیں دیگر قبائل خصُوصاً یہُود کی معاونت حاصل ہو جانا بھی بعید از امکان نہ تھا۔ چنانچہ آپؐ نے حسبِ معمول مدینے میں حضرت عثمانؓ کو اپنا نائب مقرر کیا اور جمادی الاوّل ۴ھ / اکتوبر، نومبر ۶۲۵ء میں خود چار سو یا سات سو مجاہدین کے ساتھ باغی قبائل کی شورش فرد کرنے نجد روانہ ہوئے اور ذات الرقاع پہنچ گئے جہاں وہ مجتمع تھے۔ آپؐ کی غیر متوقّع پیش قدمی اور جنگی حکمتِ عملی سے وہ اس قدر مرعُوب ہوئے کہ نبرد آزما ہونے کی جرأت نہ کرسکے اور پہاڑوں میں رُوپوش ہو گئے۔ اس پیش قدمی سے آپؐ کی غرض بھی یہی تھی کہ ان شوریدہ سر قبائل کو مرعُوب و خوف زدہ کر کے مدینے پر یلغار کرنے سے باز رکھا جائے، لہٰذا تصادم کی نوبت نہ آئی۔[17] اس غزوے کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ

دُشمن کے چھاپہ مارنے کے خوف سے آپؐ نے یہاں صلوٰۃِ خوف پڑھائی تھی۔

اس مہم کو غزوۂ ذات الرّقاع کہا جاتا ہے' اور بقول ابنِ سعد اس کی وجۂ تسمیہ یہ ہے کہ ذات الرّقاع ایک پہاڑی کا نام ہے جس پر مختلف رنگوں کے نِشان تھے' اور جہاں آپؐ نے چھاؤنی ڈالی تھی۔[۱۸] ابنِ خلدون کے نزدیک یہ واقعہ محرم ۴ ہجری میں ہوا تھا۔[۱۹]

آپؐ کی عظمت و رحمۃ للعالمینی کا تقاضا تھا کہ آپؐ نے معاشرتی زندگی کی ذمّے داری اُٹھالی تھی۔ آپؐ کی نظر میں ایک ایک خاندان اور فرد کے مسائل رہتے تھے۔ چنانچہ غزوات و سرایا' بالخصوص غزوۂ اُحد میں مجاہدین کے بکثرت شہید ہو جانے کے سبب معاشرے میں بیواؤں اور یتیموں کا مسئلہ پیدا ہوا تو آپؐ نے اِسلام کے قانونِ تعدّدِ ازدواج کے ذریعے اسے بڑی خوش اسلوبی سے حل کر دیا۔ حضرت ابوسلمہؓ مہاجر و بدری تھے' اور انھوں نے تحریکِ اسلام میں بھرپور حِصّہ لیا تھا اور اس کی خاطر بڑے مصائب جھیلے اور قربانیاں کی تھیں۔ جنگِ اُحد میں انھیں زخم لگا تھا' جو کچھ عرصے بعد مہلک ثابت ہوا۔ اب اس شہید کے خاندان کی کفالت کا سوال پیدا ہوا۔ آپؐ نے ان کے افرادِ خاندان کی تالیفِ قلوب کی خاطر یہ ذمّے داری خود اُٹھا لی اور ان کی بیوہ حضرت اُمّ سلمہؓ بنتِ اُمیہؓ سے نِکاح کر لیا۔ (شوال ۴ ھ/ مارچ ۶۲۶ء)، اس وقت رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا سِن مُبارک ستاون برس کے لگ بھگ تھا۔[۲۰]

قُریش کا مقابلے سے گُریز یا غزوۂ بدر الاُخریٰ (ذیقعد ۴ ھ/ اپریل ۶۲۶ء) :

یہ سوال اکثر میرے دل میں خلش پیدا کرتا تھا کہ وہ کونسی اہم چیز تھی' جس کے ذریعے آپؐ نے وحشی' جنگجو اور کینہ پرور طاقت ور دُشمنوں کے نرغے میں رہتے ہوئے مدینے کے اندر شہری مملکت کی بنیاد رکھی' اس کی روز افزوں توسیع کی اور پھر اسے اس قدر مضبوط و مستحکم بنا دیا کہ یہود و قریش وغیرہ جو قوتیں بھی اس سے ٹکرائیں' پاش پاش ہوگئیں ؟ اس سوال پر حربیاتی نقطۂ نظر سے مسلسل غور و فکر کرتے کرتے آخر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپؐ نے یہ سب کچھ سرد جنگ کے اصول کی بدولت حاصل کیا' جسے اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے :

"سرد جنگ کے ذریعے دشمن کے عزائم کو متزلزل' حوصلہ و ہمت کو پست اور دِل کو مرعوب کر دو" اور سرد جنگ میں کامیابی مندرجۂ ذیل پانچ چیزوں سے مشروط ہے :

(۱) اعلیٰ و محبوب قیادت (۲) اتحاد و یکجہتی' طاعت اور نظم و ضبط۔

(۳) جنگی تیاریاں (۴) معاشرتی امن اور نظریاتی ہم آہنگی۔

(۵) عقایدِ جلیلہ و محرّکہ پر یقین محکم اور اس کا اظہار۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اور آیندہ بھی دیکھیں گے' آپؐ نے دُشمنانِ اسلام یہُود' بُت پرست قبائل اور بعد میں قریش کو بھی سرد جنگ کے ذریعے بیدل و مضمحل اور مرعوب و خوفزدہ کر کے مسخّر کیا تھا۔ غزوۂ بدر الاُخریٰ میں مسلمانوں کی کامیابی بھی آپؐ کی سرد جنگ ہی کی مرہُونِ منّت تھی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اُحد سے لَوٹتے وقت قریش کے سپہ سالار و قائد ابوسفیان نے آپؐ کو یہ چیلنج دیا تھا کہ اب ہمارا اور تمھارا مقابلہ اگلے سال بدر میں ہوگا۔ آپؐ نے اس کا یہ چیلنج قبول کر لیا تھا' لیکن آپؐ دل سے جنگ نہیں چاہتے تھے' کیونکہ آپؐ کا طویل المیعاد منصُوبہ جنگ کے بغیر مکّے کو فتح' قریش کے دلوں کو مسخّر اور انھیں تحریکِ اسلام میں شامل کرنا تھا۔ چنانچہ آپؐ اس منصُوبے کو سرد جنگ کے ذریعے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش میں رہتے تھے۔ آپؐ نے اس طرح قریش کے اعصاب کو اس قدر مُضمحِل اور ہمت کو اتنا پست کر دیا کہ وہ مسلمانوں کے مقابل آنے سے جی چُرانے لگے۔ ابُوسفیان قریش کی قوت و صولت کا بھرم رکھنے اور اپنی کمزوری و کم ہمّتی کو چھپانے کی غرض سے یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح مسلمان اس کے چیلنج کا جواب دیتے وقت پھر بدر میں نہ پہنچ جائیں۔ چنانچہ اس نے بھی سرد جنگ کے ذریعے یہ مقصد حاصل کرنا چاہا' مگر کامیاب نہ ہوا۔ اس نے مسلمانوں کو مرعوب و ہراساں کرنے کے لیے مدینے میں یہ پراپیگنڈا کرایا کہ قریش مسلمانوں کے استیصالِ کُلّی کے لیے زبردست تیاریاں کر رہے ہیں' لہٰذا بدر میں ان سے لڑنے جانا خودکشی کے مترادف ہوگا۔ یہ پراپیگنڈا دو وجوہ کی بنا پر غیر مؤثر رہا۔ ایک یہ کہ قابلِ اعتماد جاسوسوں اور مخبروں کے ذریعے مسلمانوں کو قریش کی معاشی و سیاسی کمزوریوں اور ان کے جنگی کردار کے اضمحلال کی سچّی خبریں ملتی رہتی تھیں' دُوسرے غزوات و سرایا کی شکل میں مسلسل و کامیاب جنگی مشقوں کی وجہ سے مجاہدوں کے دلوں میں پہلے سے زیادہ خود اعتمادی اور حوصلوں میں توانائی پیدا ہو چکی تھی۔ آپؐ کی سیاسی بصیرت تاڑ گئی کہ قریش نے اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی غرض سے یہ پراپیگنڈہ کرایا ہے۔

بہر حال' آپؐ قریش کی کمزوری سے سرد جنگ کے ذریعے پورا پورا فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے' لہٰذا آپؐ نے مدینے میں عبداللہ بن رواحہؓ کو عامل بنایا اور پورے ساز و سامان کے ساتھ پندرہ سو مجاہدین کا لشکر لے کر بدر میں پہنچ گئے۔ (ذیقعد ۴ ھ/ اپریل ۶۲۶ء)۔ ابوسفیان دو ہزار

کا لشکر لے کر بادلِ نخواستہ مقابلے کے لیے نکلا۔ وہ اس لشکر کے ساتھ مرالظہران کے مقام پر پہنچا تو اس میں پیش قدمی کی ہمت نہ رہی۔ وہ جی ہار بیٹھا۔ اصل یہ ہے کہ وہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلّم کی سرد جنگ سے شکست کھا چکا تھا۔ اس بات میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ شکست پہلے دل میں، پھر میدان میں ہوتی ہے۔ شاید ابوسفیان اس جنگی کلیے سے واقف تھا۔ اس نے میدانِ جنگ میں شکست کھانے اور جانی و مالی نقصان اُٹھانے پر شکست آمیز مراجعت کو ترجیح دی۔

چونکہ ایسی عسکری مُہمّیں مجاہدین کے لیے جنگی مشقیں بھی ہوتی تھیں اور دشمنوں کو مرعوب بددل کرنے کا ذریعہ بھی، لہٰذا آپؐ ان سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے تھے۔ چنانچہ آپؐ نے لاؤ لشکر کے ساتھ بدر میں آٹھ روز یعنی ۸ ذی قعدہ ۴ھ / ۱۲ اپریل ۶۲۶ء تک قیام فرمایا، اگرچہ قریش کی رضا کارانہ پسپائی کی اطلاع آپؐ کو مل چکی تھی۔ مؤرخین اس غزوے کو بدر الآخری، غزوۂ بدرِ موعود اور بدرِ ثانیہ وغیرہ سے تعبیر کرتے ہیں[۲۱]۔

یہ مہم سیاسی اور عسکری ہر لحاظ سے واضح اور دُور رس نتائج کی حامل تھی۔ جنگِ اُحد میں مسلمانوں کو جو جانی نقصان اُٹھانا پڑا تھا، اور اس سے مشرکین و یہود کے مبالغہ آمیز پراپیگنڈے کے سبب ان کی جو ہوا اُکھڑ گئی تھی، وہ پہلے سے زیادہ بندھ گئی اور یہ بات سب پر واضح ہو گئی کہ قریش ہوں یا یہود یا کوئی اور، تنہا مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس واقعے نے مسلمانوں کے جنگی کردار کو مستحکم اور قریش کے جنگی کردار کو مُضمحل کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

یہود کی ایک کاروباری بددیانتی کا سدِّباب :

جس طرح مکّے کی تجارت پر قریش کی اجارہ داری تھی، اسی طرح یہود مدینے کی تجارت کے اجارہ دار تھے۔ اسلامی شہری مملکت کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد مہاجرین، جن کا پیشہ تجارت تھا، کاروبار میں یہود کے حریف بن گئے جس سے ان کی اجارہ داری کو خطرہ لاحق ہو گیا۔ یہود کی اسلام دشمنی کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ یہود چونکہ غیر یہودی لوگوں کا استحصال کرنے اور مکر و فریب سے اُن کا مال ہتھیا لینے کو جائز سمجھتے تھے، لہٰذا اس غرض کے لیے وہ عبرانی زبان میں کاروبار کرتے تھے، جس سے ان کے سوا دوسرے لوگ واقف نہ تھے۔ اس طرح عبرانی زبان ان کے لیے لوگوں کا اِستحصال کرنے کا ایک ذریعہ بن گئی تھی۔ وہ بہی کھاتوں وغیرہ میں تحریف کرنے، رقوم کو کم و بیش اور خورد برد کرنے کے عادی

بن چکے تھے۔ آپؐ کو جب اس کی خبر ہوئی تو آپؐ نے اس کا فوری توڑ یہ کیا کہ حضرت زید بن ثابتؓ کو بہت جلد عبرانی زبان سیکھنے کا حکم دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زیدؓ کو عبرانی زبان کی شُدبُد تھی کیونکہ انھوں نے چند ہی دنوں میں اس میں دسترس حاصل کر لی۔ ظاہر ہے کہ ان کی طرح دُوسرے مسلمانوں نے بھی یہ زبان سیکھی ہوگی۔ اگرچہ یہ فوری نوعیّت کا انتظام تھا، لیکن اتنا مؤثّر ثابت ہوا کہ یہود بلبلا اُٹھے اور مسلمانوں کو بجا طور سے دین و سیاست کی طرح اقتصادی میدان میں بھی اپنا زبردست رقیب سمجھنے لگے۔ ان کی عقلِ عیّار نے بھانپ لیا تھا کہ اسلامی تحریک و مملکت ان کی دینی، سیاسی اور اقتصادی اجارہ داری و سیادت کے لیے زبردست خطرہ بن چکی ہے، لہٰذا اس کا فوری استیصال ناگزیر ہے۔ اس غرض کے لیے انھوں نے مسلمانوں کے خلاف عرب قبائل کا ایک متحدہ محاذ بنانے کا فیصلہ کیا اور اس سلسلے میں جو کارروائیاں کیں، جنگِ احزاب (جنگِ خندق) انہی کا نتیجہ تھی۔

آپؐ طبعًا رحمۃٌ للعالمین تھے، اگرچہ دنیا سے کُفر و شرک، ظلم و استحصال اور جرم و گناہ کا استیصال کرنے اور بنی نوعِ انسان کو فرعونی، ہامانی اور قارونی طاقتوں سے نجات دلانے کی خاطر آپؐ کو انقلاب کی خون آشام راہوں سے گزرنا بھی پڑتا تھا، لیکن اصل یہ ہے کہ آپؐ کا قلبِ مبارک سوزِ محبت سے گداز تھا، جس سے لطف و کرم، مؤدّت و رافت اور احسان و رحمت کے چشمے پھُوٹتے اور گوشۂ حیات کو سیراب کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی تحریکِ انقلاب کے قائد، اسلامی معاشرے کے معمار و حُکمران اور مجاہدین کے سپہ سالار کو ہم بچّوں کی معصوم دنیا میں ان سے پیار کرتے اور کھیلتے بھی دیکھتے ہیں۔ یوں تو سارے بچّے ہی آپؐ کو پیارے تھے، لیکن حضرت فاطمۃ الزّہراؓ اور حضرت علیؓ کی طرح ان کی اولاد بھی آپؐ کو سب سے زیادہ محبُوب تھی۔ اس حوالے سے سنہ ۴ ہجری کا ایک اہم واقعہ حضرت امام حسین کی ولادتِ سعید ہے (۵ شعبان ۴ھ) جن کی قسمت میں شہادتِ عظمیٰ لکھی تھی[۲۲]۔

تحریکِ اسلام نے مدینے میں انقلاب کے صبر آزما و خون آشام تجربوں سے کامیابی کے ساتھ گزر کر ہجرت کے ۴ سال پورے کر لیے، لیکن منزلِ مقصود جوں جوں قریب آتی جاتی تھی راستے کی ناہمواریاں اور دُشواریاں بڑھتی جاتی تھیں۔ آپؐ کی حیاتِ طیّبہ کی منزلِ آخر بھی قریب آ گئی تھی۔ عمر کے ستاون برس گزر چکے تھے۔ مسلسل غور و فکر، تگ و دو، جدّوجہد، غمِ انسانیّت اور مسلسل شکیب رُبا تجربوں سے گزرنے کی وجہ سے آپؐ کا جسمِ اطہر متأثّر ہونا شروع ہو گیا تھا، لیکن

آپؐ کی ہمت بدستور جوان، عزم اسی طرح پختہ اور آپؐ کی قیادت اسی طرح ولولہ انگیز تھی۔ سنہ ۴ھ کی طرح یہ سال بھی مسلمانوں کے لیے دشمنوں کی ریشہ دوانیوں، فتنہ انگیزیوں اور جنگ و جدال کا پیام لے کر آیا۔

غزوۂ دومۃ الجندل (۲۵ ربیعُ الاوّل ۵ھ/ ۲۴ اگست ۶۲۶ء) :

عرب کے بیشتر قبائل وحشی و شوریدہ سر تھے اور رہزنی و غارت گری ان کا مشغلہ تھا، لیکن اسلامی مملکت کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد آپؐ نے عرب میں وسیع پیمانے پر امن و امان قائم کرنے کی کوششوں کا آغاز کیا تو ان قبائل کو سخت ناگوار گزرا۔ وجہ یہ تھی کہ اس طرح ان پر رہزنی و غارت گری کی راہیں مسدود ہونے لگی تھیں جو ان کی معیشت کا ایک اہم ذریعہ تھیں۔ علاوہ ازیں وہ سیاسی و دینی وجوہ کی بنا پر بھی اسلامی تحریک و مملکت کو اپنے لیے مستقل خطرہ سمجھنے لگے تھے اور اس خطرے سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ آپؐ ان کے احوال سے بے خبر نہ تھے۔ آپؐ کو ان کے حالات کی سچی اطلاعیں ملتی رہتی تھیں، اور آپؐ ہر فتنے کو آغاز ہی میں کچلنے کے لیے ہر وقت مستعد رہتے تھے۔

ربیع الاوّل ۵ھ/ اگست ۶۲۶ء میں آپؐ کو اطّلاع ملی کہ دومۃ الجندل میں، جو مدینے سے پندرہ روز کی مسافت پر ہے، مشرکین کثیر تعداد میں جمع ہو رہے ہیں اور ان کا منصوبہ قافلوں کو لُوٹنا اور مدینے کو تاخت و تاراج کرنا ہے۔ فتنے کو سر اُٹھاتے ہی کچل دینا آپؐ کی کامیاب حکمتِ عملی تھی، لہٰذا آپؐ نے فوراً ۲۵ ربیع الاوّل ۵ھ/ ۲۴ اگست ۶۲۶ء کو ایک ہزار مجاہدین کے ساتھ دومۃ الجندل کی طرف پیشقدمی کی۔ مدینے میں اس مرتبہ آپؐ نے سباعؓ بن عرفطہ غفاری کو اپنا نائب مقرر فرمایا۔ آپؐ کا دبدبہ اور رُعب اس قدر تھا کہ مضبُوط سے مضبُوط جنگجو قبائل بھی مرعوب ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ان شوریدہ سر اور فتنہ گر مشرکین کو اسلامی لشکر کی پیش قدمی کی اطّلاع ملی تو وہ سراسیمہ ہو کر بھاگ اُٹھے، بغاوت فرو ہو گئی اور فتنہ دب گیا۔

آپؐ ایسی مہمّوں سے اور بھی بہت سے کام لیتے تھے، مثلاً دعوتِ اسلام اور تحریکِ اسلام سے روشناس کرانے کا، طلایہ و قراولی کا، جغرافیائی و جنگی معلُومات حاصل کرنے اور قبائل کو مرعوب کرنے کا۔ لہٰذا آپؐ نے اس غرض کے لیے دومۃ الجندل میں چند روز قیام فرمایا۔ مجاہدین کے دستوں کو اطراف و جوانب میں بھیجا اور دینی، سیاسی اور فوجی مقاصد حاصل کرنے

کے بعد ۲۰ ربیع الآخر ۵ھ/ ۱۸ ستمبر ۶۲۶ء کو مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔[۲۳]

بنو المصطلق کی ریشہ دوانیاں یا غزوۂ مریسیع (۲ شعبان ۵ھ/ ۲۸ دسمبر ۶۲۶ء) :

اس پُرآشوب دَور میں ایک فتنہ فرو ہوتا تھا تو دُوسرا اُٹھ کھڑا ہو جاتا تھا۔ دومۃ الجندل کا فتنہ فرو کرنے کے بعد آپؐ اصلاحی و تعمیری اور تعلیمی و تربیتی سرگرمیوں میں مشغول ہوئے ہی تھے کہ بنو المصطلق کی ریشہ دوانیوں کی اطلاعیں ملنے لگیں۔ آپؐ نے تصدیق کے لیے حضرت زید بن خصیبؓ کو بھیجا، جنھوں نے واپس آکر بتایا کہ قبیلے کا سردار اور رئیس حارث بن ابی ضرار واقعی مدینے پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ بنو المصطلق قبیلہ بنی خزاعہ سے تعلق رکھتے تھے اور قدید کے علاقے میں رہتے تھے، جو ساحلِ بحرِ احمر پر جدّے اور رابغ کے درمیان واقع ہے۔ یہاں ایک بڑا چشمہ تھا جس کا نام مریسیع تھا، جس کے آس پاس ان قبیلوں کے لوگ آباد تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ آپؐ دُشمن کو پہل کرنے کی مُہلت نہیں دیتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں پہل کرنا آپؐ کی سُنّتِ حَسَنہ ہے۔ آپؐ نے مجاہدوں کی فوج کو بہت زیادہ سریع الحرکت بنا دیا تھا۔ چنانچہ آپؐ نے مدینے میں زید بن حارثہؓ کو قائم مقام بنا کر اس تیزی و سُرعت اور خُفیہ طریقے سے پیش قدمی کی کہ دُشمن کو بے خبری میں جا لیا۔ وہ اس غیر متوقّع اور اچانک حملے سے اس قدر مرعوب و خوف زدہ اور سراسیمہ ہو گئے کہ بھاگ اُٹھے۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک جماعت نے مزاحمت بھی کی تھی اور تیر اندازی بھی ہوئی تھی۔ دشمن کے دس مبارز مارے گئے، چھ سو کے قریب جنگی قیدی بنا لیے گئے اور غنیمت میں دو ہزار اونٹ اور پانچ ہزار بکریاں ہاتھ آئیں۔

بنو المصطلق کو قریش و یہوُد سے دُور رکھنے اور اسلام کے قریب لانے کی خاطر حکمتِ نبوی کا فیصلہ یہ ہوا کہ ان کے ساتھ رشتۂ صہر قائم کیا جائے۔ عرب کی روایات کے مطابق دوستی و حلف قائم کرنے کا یہ بڑا موزوں طریقہ تھا۔ چنانچہ آپؐ نے ان کے رئیس حارث بن ابی ضرار کی بیٹی حضرت جویریہؓ سے نکاح کر لیا اور تالیفِ قلوُب کی خاطر تمام جنگی قیدیوں کو رہا کر دیا۔[۲۴]

اس غزوے میں منافقت کے دو بھیانک واقعات رُونما ہوئے : ایک رئیس المنافقین عبدُاللہ بن ابی کی شیطنت کا ہے اور دوسرا منافقین کی بہتان تراشی کا، جسے واقعۂ اِفک کہتے ہیں۔

عبدُاللہ بن ابی کے دل میں یثرب کا بادشاہ بننے کی جو آرزو تھی، وہ حالات کے بدلنے سے بھی نہ مٹی، بلکہ حسرت بن کر اس کے دل میں جاگزیں ہو گئی۔ چنانچہ وہ اس طلب و جستجو میں رہتا تھا

کہ کسی طرح انصار اور مہاجرین میں ٹھن جائے اور انصار انھیں مدینے سے باہر نکال دیں تاکہ اس کے بادشاہ بننے کا پھر امکان پیدا ہو جائے۔ اس غزوے میں اسے اپنی اس خواہش و نیت کے اظہار کا اور ابلیسی کردار ادا کرنے کا موقع مل گیا۔ ایک انصاری اور مہاجر کا پانی بھرنے پر جھگڑا ہو گیا۔ عرب کے قدیم دستور کے مطابق انصاری نے یا للانصار (انصار کی مدد اور جے ہو) کا اور مہاجر نے یا معاشر المہاجرین کا نعرہ مارا۔ قریب تھا کہ مہاجرین اور انصار میں تلوار چل جاتی کہ چند صاحبِ دل مجاہدین نے معاملہ رفع دفع کرا دیا۔ عبداللہ بن ابی کو یہ مصالحت سخت ناگوار گزری۔ وہ تو خانہ جنگی چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے انصار کو مشتعل کرنے کی خاطر ان سے مخاطب ہو کر کہا: "تم نے یہ بلا خود مول لی ہے اور مہاجرین کو اتنا سر چڑھا لیا ہے کہ وہ اب تم سے ہمسری کرتے ہیں۔ معاملہ اب بھی ہاتھ سے نہیں گیا ہے۔ اگر تم ان کی مدد اور حمایت سے دستکش ہو جاؤ تو وہ خود مدینے سے نکل جائیں گے۔"[۲۵]

زاد المعاد میں ہے کہ عبداللہ بن ابی نے واپسی پر کہا: "مدینے پہنچ کر عزت والے (یعنی انصار) ذلت والوں (یعنی مہاجرین) کو نکال دیں گے۔" حضرت زید بن ارقمؓ کے ذریعے یہ بات آپؐ تک پہنچ گئی۔ عبداللہ بن ابی کو افشائے راز کا علم ہوا تو آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور قسمیں کھا کر مکر گیا۔ آپؐ نے طبعی حلم اور سیاسی مصلحت کی بنا پر اس سے درگزر فرمایا۔[۲۶]

منافقت کا دوسرا واقعہ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ پر بہتان تراشی کا ہے۔ بات بالکل معمولی سی تھی، لیکن عبداللہ بن ابی اور دوسرے منافقین نے اسے بتنگڑ بنا دیا اور اتنا چرچا کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُمّ المؤمنینؓ کو ایک ماہ تک کرب میں مبتلا رکھا۔ صحابۂ کرامؓ بھی سخت رنجیدہ و پریشان تھے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے اُمّ المؤمنینؓ کی بریت کا اعلان کیا تو آپؐ کی ازدواجی زندگی کی مسرّتیں پھر لوٹ آئیں۔ ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بہتان تراشی اور افواہ پر یقین کرنے سے منع بھی کر دیا۔ چنانچہ سورۃ النّور میں ارشاد ہوتا ہے:

"جو لوگ یہ بہتان گھڑ لائے ہیں، وہ تمھارے اندر ہی کا ایک ٹولہ ہے۔ اس واقعے کو اپنے حق میں شر نہ سمجھو، بلکہ یہ بھی تمھارے لیے خیر ہی ہے۔ جس نے اس میں جتنا حصّہ لیا، اس نے اتنا ہی گناہ سمیٹا اور جس شخص نے اس کی ذمّے داری کا بڑا حصّہ اپنے سر لیا تو اس کے لیے تو عذابِ عظیم ہے۔

"جس وقت تم لوگوں نے اسے سُنا تھا، اسی وقت کیوں نہ مومن مردوں اور مومن

عورتوں نے اپنے آپ سے نیک گمان کیا اور کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ صریح بہتان ہے۔ وہ لوگ (اپنے بہتان کے ثبوت میں) چار گواہ کیوں نہ لائے؟ اب کہ وہ گواہ نہیں لائے ہیں، اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں۔ اگر تم لوگوں پر دنیا اور آخرت میں اللہ کا فضل اور رحم و کرم نہ ہوتا تو جن باتوں میں تم پڑ گئے تھے ان کی پاداش میں بڑا عذاب تمھیں آ لیتا۔ (غور تو کرو، اس وقت تم کیسی غلطی کر رہے تھے) جبکہ تمھاری ایک زبان سے دوسری زبان اس جھوٹ کو لیتی جا رہی تھی اور تم اپنے مُنہ سے وہ کچھ کہے جا رہے تھے جس کے متعلّق تمھیں کوئی علم نہ تھا۔ تم اسے معمولی بات سمجھ رہے تھے، حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ بڑی بات تھی۔

"کیوں نہ اسے سُنتے ہی تم نے کہہ دیا کہ ہمیں ایسی بات زبان سے نکالنا زیب نہیں دیتا، سبحان اللہ یہ تو ایک بہتانِ عظیم ہے۔" اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ آیندہ کبھی ایسی حرکت نہ کرنا، اگر تم مومن ہو۔ اللہ تمھیں صاف صاف ہدایات دیتا ہے اور وہ علیم و حکیم ہے۔"[۲۷]

عقیدۂ تبنیت کا استیصال:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی ان اہلِ فکر و نظر کے لیے بصیرت افروز ہے جو خلوصِ نیّت کے ساتھ آپؐ کی عظیم و پہلو دار شخصیّت کا کُلّی حیثیت سے اور اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کرتے ہیں کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے سچّے، عظیم اور آخری نبی تھے اور آپؐ کا ہر قول و فعل وحی و تنزیل کے تابع اور مشیّت ایزدی کے عین مطابق تھا۔ یہ نکتہ بھی ہمارے پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ آپؐ کو کبھی دشمنوں کی اور کبھی اپنوں کی تالیفِ قلوب کی خاطر اور کبھی کسی اور دینی مصلحت کی بنا پر پیرانہ سالی اور زندگی کے آخری مرحلے میں نکاح کی ذمّے داریوں کو قبول کرنا پڑا تھا۔ چنانچہ حضرت زینب بنتِ جحشؓ سے نکاح کی ذمّے داری آپؐ کو اس وجہ سے اٹھانا پڑی تھی کہ آپؐ کو اللہ تعالیٰ کے امتثالِ امر میں عربوں کے اس غلط اور غیر فطری عقیدے کا ابطال کرنا تھا کہ مُتبنّیٰ حقیقی بیٹے کی طرح ہوتا ہے۔

حضرت زینب بنت جحشؓ قریش کے معزّز گھرانے سے تعلّق رکھتی تھیں اور رشتے میں آپؐ کی پھوپھی کی بیٹی تھیں۔ رنگ و نسل اور لسان و قوم کے قدیم و غیر فطری امتیازات کو مٹانے کی خاطر آپؐ نے ان کا نکاح اپنے آزاد کردہ غُلام اور مُتبنّیٰ حضرت زید بن حارثہؓ سے کرا دیا۔ اسلامی یا انسانی مساوات و حریّت کی یہ ایک انقلاب انگیز مثال تھی۔ چونکہ میاں بیوی کے

مزاج و ذوق میں بہت زیادہ تفاوت تھا، لہٰذا دونوں میں زیادہ دیر تک نہ نبھ سکی۔ آپؐ نے دونوں میں مصالحت کرانے کی بار بار کوشش کی مگر اختلافات کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی اور آخر کار حضرت زیدؓ کو طلاق دینا پڑی۔

عرب میں مُتبنّٰی کو حقیقی بیٹے کا درجہ حاصل تھا، اس لیے مُتبنّٰی بنانے والے کا اس کی بیوہ یا مطلقہ سے نکاح ناجائز سمجھا جاتا تھا۔ قدرت نے اس غیر فطری عقیدے کے استیصال کا بہترین موقع فراہم کردیا اور آپؐ کو اپنے مُتبنّٰی کی مُطلقہ سے نکاح کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ اس طرح آپؐ کو تقریباً اٹھاون برس کی عمر میں حضرت زینبؓ سے نکاح کی ذمے داری کو اُٹھانا پڑا۔ (شوال ۵ ھ/ فروری، مارچ ۶۲۷ء)[۲۸]۔

حجاب کے احکام (یکم ذیقعد ۵ ھ/ ۲۴ مارچ ۶۲۷ء):

دیگر اقوامِ عالم کی طرح عربوں میں بھی پردے کا رواج نہ تھا۔ لوگ ایک دُوسرے کے گھروں میں بے تکلف آتے جاتے تھے، اور اسے دوستی و محبت اور اپنائیت پر محمول کرتے تھے۔ گھریلو پردہ داری، آزادی اور خلوت کا تصوّر تھا، نہ پاس۔ اس رواج سے مردوں اور عورتوں کو خلوت میں بیٹھنے اور مِلنے کے مواقع مل جاتے تھے۔ ایسے موقعوں سے چونکہ جنسی خواہش کو تحریک ملتی ہے اور جنسی لمحے[۲۹] کے وقوع پذیر ہونے کا امکان رہتا ہے، لہٰذا اس رواج کو ختم کرنے کی غرض سے اللہ تعالیٰ نے حجاب یا پردے کے احکام نازل فرمائے:

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اپنے گھروں کے سوا دوسروں کے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو جب تک کہ گھر والوں کی رضا نہ لے لو اور گھر والوں پر سلام نہ بھیج لو۔ یہ طریقہ تمھارے لیے بہتر ہے۔ توقع ہے کہ تم اس کا خیال رکھو گے۔ پھر اگر وہاں کسی کو نہ پاؤ تو داخل نہ ہو، جب تک کہ تم کو اجازت نہ دے دی جائے۔ اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس چلے جاؤ تو واپس ہو جاؤ۔ یہ تمھارے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اسے خوب جانتا ہے، البتہ تمھارے لیے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ تم ایسے گھروں میں داخل ہو جاؤ جو کسی کے رہنے کی جگہ نہ ہوں اور جن میں تمھاری متاع یا فائدے کی کوئی چیز ہو۔ تم جو کچھ ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ چھپاتے ہو سب کی اللہ کو خبر ہے۔

"اے نبیؐ! مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی

حفاظت کریں۔ یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے۔ جو کچھ وہ کرتے ہیں، اللہ اس سے باخبر رہتا ہے۔

"اور اے نبیؐ! مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں، بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں۔ وہ اپنا بناؤ سنگھار (میک اپ) نہ ظاہر کریں مگر ان لوگوں کے سامنے: شوہر، باپ، شوہروں کے باپ، اپنے بیٹے، شوہروں کے بیٹے، بھائی، بھائیوں کے بیٹے، بہنوں کے بیٹے، اپنے میل جول کی عورتیں، اپنے مملوک، وہ خادم مرد جو کسی اور قسم کی غرض نہ رکھتے ہوں، اور وہ بچے جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے ابھی واقف نہ ہوئے ہوں۔ وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انھوں نے چھپا رکھی ہو اس کا لوگوں کو علم ہو جائے۔ اے مومنو! تم سب مل کر اللہ سے توبہ کرو، توقع ہے کہ فلاح پاؤ گے"[۳۰]

حواشی و تشریحات

(۱) Directive

(۲) اصل میں ہے : فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَاِلٰی رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝ (انشراح ۹۴ : ۷-۸)۔

(۳) Intelligence Department یہ محکمہ بھی اسی نوعیت کا تھا جس طرح نوزائیدہ اسلامی مملکت کے دوسرے محکمے تھے، جن کی تنظیم جدید خطوط سے مختلف خطوط پر ہوئی تھی۔

(۴) Police action

(۵) طبقات ابن سعد، (طبع اوّل)، ۲ : ۳۵، ابن قیم : زاد المعاد (اردو)، ۲ : ۱۹۹،

(۶) طبقات ابن سعد، ۲ : ۳۶، زرقانی، ۲ : ۸۸، ۸۹۔

(۷) ان سات صحابہ کرامؓ کے اسمائے گرامی یہ ہیں :

۱- حضرت عاصم بن ثابت بن ابی الاقلحؓ

۲- حضرت عبداللہ بن طارقؓ

۳- حضرت مُرشد بن ابی مُرثد الغنویؓ

۴- حضرت معتّب بن اُسیدؓ

۵- حضرت خالد بن البکیر اللیثیؓ

۶- حضرت خبیب بن عدیؓ

۷- حضرت زید بن الدثنہ بن بیاضہؓ

(۸) صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوہ الرجیع و رعل و ذکوان و بئرِ معونہ، زرقانی، ۲ : ۹۲ ببعد، ابن کثیر : البدایہ والنہایہ، ۴ : ۷۳۔

(۹) موضوع مذکور، زرقانی، ۲ : ۸۸ ببعد۔

(۱۰) سیرۃ ابن ہشام، ۳ : ۱۹۹، زرقانی، ۲ : ۹۳، سیرۃ حلبیہ، ۲ : ۲۷۷۔

(۱۱) معاشرتی رخصت = Social Sanction

(۱۲) جمالیاتی معروض : Aesthetic object

(۱۳) النّحل ۱۶ : ۶۷۔

(۱۴) البقرہ ۲ : ۲۱۹۔

(۱۵) النّسآء ۴ : ۴۳۔

(۱۶) المائدہ ۵ : ۹۱، ۹۲۔

(۱۷) طبقات ابن سعد، ۲ : ۳۴۔

(۱۸) موضوع مذکور، سیرۃ ابن ہشام (اردو)، ۲ : ۲۱۹ تا ۲۲۱ ببعد۔

(۱۹) تاریخ ابن خلدون، ۳ : ۱۱۸۔

(۲۰) اُمّ المومنین امّ سلمہؓ کا انتقال ۵۹ ہجری میں ہوا۔ اس وقت ان کی عمر ۸۴ سال تھی۔ ان کا مدفن جنت البقیع میں ہے۔ دیکھیے الخطیب : اکمال فی اسماء الرجال، در مشکوٰۃ (اردو)، ۳ : ۳۶۷۔

(۲۱) سیرۃ ابن ہشام، ۳ : ۲۲۰، ابن قیم : زاد المعاد (اردو)، ۳ : ۲۰۴۔

(۲۲) حضرت امام حسین بن علیؓ ۵ شعبان ۴ھ کو پیدا ہوئے اور ۱۰ محرم ۶۱ھ کو کوفہ و دجلہ کے درمیان کربلا کے میدان میں شہید ہوئے (خطیب : اکمال فی اسماء الرجال در مشکوٰۃ (اردو)، ۳ : ۳۳۶، ۳۳۷)۔

(۲۳) سیرۃ ابن ہشام، ۳ : ۲۲۴، تاریخ ابن خلدون، (اردو)، ۱ : ۱۱۹۔

(۲۴) طبقات ابن سعد، ۲ : ۶۴، ۶۵، شبلی : سیرۃ النبیؐ، ۱ : ۴۱۳ تا ۴۱۸ ببعد۔

(۲۵) موضوع مذکور۔

(۲۶) زاد المعاد، ۲ : ۲۰۵ تا ۲۰۸۔

(۲۷) النّور ۲۴ : ۱۱ تا ۱۸، نیز دیکھیے ابوالاعلیٰ مودودی : تفہیم القرآن، ۳ : ۳۰۶ تا ۳۷۰، شبلی : سیرۃ النبیؐ، ۱ : ۴۱۸ تا ۴۱۹۔

(۲۸) ابوالاعلیٰ مودودی : تفہیم القرآن، ۳ : ۳۰۸، ۳۰۹۔

(۲۹) جنسی لمحہ = Sexual moment

(۳۰) النّور ۲۴ : ۲۷ تا ۳۱، الاحزاب ۳۳ : ۵۳، ۵۹، نیز دیکھیے تفسیر ابن کثیر، ۳ : ۵۱۸۔

باب : ۱۵

جنگِ احزاب سے معاہدۂ حُدیبیہ تک

(۱) جنگِ احزاب یا غزوۂ خندق :

(ا) عرب کی اتّحادی فوجوں کی مدینے پر چڑھائی (ب) پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کی دفاعی تیاّریاں : خندق کی تیاری وغیرہ۔ (ج) مدینے کے محاصرے کا آغاز (د) اتحادیوں کی بنو قُریظہ سے سازباز اور انھیں عقب سے مسلمانوں پر حملہ کرنے پر آمادہ کرنا (ہ) بنو قریظہ کا مسلمانوں سے دفاعی مُعاہدہ توڑ دینا (و) آپؐ کی جوابی کارروائی اور بنو غطفان کو اتّحادیوں سے توڑنے کی کوشش (ز) بنو قُریظہ اور اتحادیوں میں بدگمانی (ح) اتّحادیوں کی مایوسی اور محاصرے کی ناکامی (ط) بنو قریظہ کا محاصرہ اور ان کا کیفرِ کردار کو پہنچنا (ی) جنگِ احزاب کے نتائج۔

(۲) قبائل کی ریشہ دوانیاں، ان کی سرکوبی اور طلایہ و قراولی کی مُہمّیں :

(۱) مہم یا سریۂ نجد یا سریۂ محمد بن مسلمہ انصاریؓ (۲) مہم یا غزوۂ بنو لحیان (۳) مہم یا غزوۂ ذی قرد (۴) مہم غمر یا سریۂ عکاشہؓ بن محصن (۵) مہم یا سریۂ ذی القصّہ (۶) مہم یا سریۂ

بنو ثعلبہ (۷) مہم یا سریۂ جموم (۸) مہم یا سریۂ عیص (۹) مہم یا سریۂ وادی القریٰ (۱۰) مہم یا سریۂ دومۃ الجندل (۱۱) مہم یا سریۂ فدک (۱۲) مہم بنی فزارہ یا سریۂ اُمّ القرفہ (۱۳) مہم یا سریۂ عبداللہ بن رواحہؓ (۱۴) مہم یا سریہ کرز بن جابر الفہریؓ۔

(۳) فتحِ عظیم یا مُعاہدۂ حُدیبیہ :

(ا) آپؐ کا عُمرے کی نیّت سے مکّے کی طرف کُوچ اور حُدیبیہ پر وُرُود (ب) قریش کی مزاحمت (ج) سفارتی مذاکرات کا آغاز (د) حضرت عثمانؓ کی شہادت کی افواہ (ہ) بیعت رضوان (و) مُعاہدۂ حُدیبیہ (ز) معاہدۂ حُدیبیہ کی غیر معمولی اہمیّت۔

(۴) مشرکوں سے مناکحت کی مُمانعت

(۵) حضرت اُمّ حبیبہؓ سے نِکاح

(۶) حضرت خالد بن ولیدؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ کا ایمان لانا اور تحریکِ اِسلام میں شامل ہونا۔

(۷) حواشی و تشریحات

باب ۱۵

جنگِ احزاب سے مُعاہدۂ حُدیبیہ تک

یہود کے قبائل بنو قینقاع اور بنو نُضیر کے مدینے سے اخراج اور خیبر میں جا بسنے کی وجہ سے یہُود کی جنگی قوّت میں معتدبہ اضافہ ہوگیا۔ خیبر مسلمانوں کے خلاف سازشوں اور سفارتی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا اور اس اعتبار سے مکّے کی حیثیت ثانوی ہوگئی۔ خیبر کے پاس ایک آزاد و طاقتور اسلامی مملکت کا وجود نہ تو یہود برداشت کر سکتے تھے اور نہ انھوں نے کیا۔ انھوں نے انتقام کی آگ بُجھانے کی خاطر مسلمانوں کے خلاف اس قدر شدید، وسیع اور مؤثّر پراپیگنڈا کیا کہ سارے عرب میں آگ لگا دی، اور قبائل مسلمانوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اس پراپیگنڈہ کرنے والی یہودی جماعت کے سرغنہ یہ تھے : سلام بن مشکم، حی بن اخطب، کنانہ بن ربیع وغیرہ۔ یہ رُؤسائے بنی نُضیر تھے۔ ہوذہ بن قیس اور ابو عمارہ وغیرہ، یہ روسائے بنی وائل تھے۔ یہود کے پراپیگنڈے کی نوعیّت قریش کے پراپیگنڈے سے مختلف، لیکن اس سے زیادہ مؤثّر تھی۔ اس کا دُہرا مقصد تھا۔ ایک تو مسلمانوں کی تبلیغِ اسلام کو غیر مؤثّر بنانا اور دوسرا بُت پرستوں میں دین کے اعتبار سے احساسِ برتری پیدا کرنا۔ ہم معلوم کر چکے ہیں کہ تحریکِ اسلام کے فروغ کے دو بڑے اسباب تھے : ایک اس کی صداقت و حقانیت، دوسرا مسلمانوں کی یہ تبلیغ کہ ان کا دینِ اسلام سب ادیان سے افضل ہے۔ یہُود نے مسلمانوں کی اس تبلیغ کا توڑ یہ کیا کہ بُت پرست قبائل میں یہ پراپیگنڈا کیا کہ ان (یعنی بُت پرست قبائل) کا دین مسلمانوں کے دین سے افضل و اعلیٰ ہے۔ یہُود اپنے آپ کو توحید پرست اور شرک و بُت پرستی کا مخالف کہا کرتے تھے۔ ان کا یہ پراپیگنڈا کہ شرک و بُت پرستی توحید سے افضل و اعلیٰ ہے، اپنے دعویٰ توحید کے منافی، بلکہ خود اپنی اور اپنے دین کی تکذیب کے مترادف تھا۔ بہرحال انھیں اپنے اس پراپیگنڈے میں، جو کتمانِ حق، تکذیبِ وحی و تنزیل،

حمایتِ باطل اور خبثِ باطن کا مظہر تھا، خاطر خواہ کامیابی ہوئی اور کفر ہر جگہ استیصالِ اسلام پر آمادہ ہوگیا۔

پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم یہود کے اس پراپیگنڈے اور اس کے اثرات و نتائج سے نہ تو غافل رہ سکتے تھے اور نہ رہے۔ آپؐ کا نظامِ جاسوسی فعّال اور جاسوس سچّے تھے، اور ان کی اطلاعات رازدارانہ طریقے سے براہِ راست آپؐ کو ملتی تھیں۔ اس طریق کار سے دو اہم فوائد حاصل ہوئے : ایک یہ کہ تمام اطلاعات صیغۂ راز میں رہتی تھیں اور مدینے میں یہود و قریش کے جاسوسوں کو ان اطلاعات کا پتا نہیں چلتا تھا اور اس طرح دشمن کو یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ مسلمان ان کے منصوبوں، تیاریوں وغیرہ سے واقف ہو چکے ہیں، دوسرے ان اطلاعات کی بنا پر آپؐ جو دفاعی منصوبے بناتے تھے، ان کی نوعیت و اصلیت کے بارے میں بھی منافق غافل و بے خبر رہتے تھے۔ تحریکِ اسلام کی کامیابی اور دشمنوں کی شکست میں آپؐ کے جاسوسی نظام نے جو کردار ادا کیا، اس کی اہمیت میں مبالغہ نہیں ہو سکتا، اگرچہ یہ اور بات ہے کہ آپؐ کے نظامِ دفاع کا یہ اہم پہلو آپؐ کے اوّلین سیرت نگاروں کی نظر سے اوجھل رہ گیا، پھر بعد میں تقلید پسند طبائع نے اس طرف توجہ ہی نہیں دی۔

بہرحال، ۵ ہجری کا سال تحریکِ اسلام کے لیے طوفانوں اور کڑی آزمائشوں کا دور تھا۔ آپؐ نے ان طوفانوں پر اپنی بے مثال جرأت و استقامت اور قیادت و حکمتِ عملی کی بدولت قابو پایا۔

جنگِ احزاب یا غزوۂ خندق (۸، ذیقعدہ ۵ھ / ۳۱، مارچ ۶۲۷ء) :

۵ھ / ۶۲۷ء میں اسلامی مملکت کے خلاف سب سے بڑا اور آخری طوفان اُٹھا، جسے یہود نے پوری قوّت سے اُٹھایا اور اس میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ یہود نے مکّے کے قریش کے علاوہ دیگر قبائل کو بھی اپنے ساتھ ملا کر ایک متّحدہ لشکرِ جرّار تیار کیا اور مدینے پر حملہ کر دیا۔ مسلمان خندق کھود کر محصور ہو گئے، لہٰذا اسے غزوۂ احزاب یا غزوۂ خندق کہتے ہیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ پہلے تو قریشِ مکّہ ہی یہودیوں کو مسلمانوں کے خلاف جنگ کی ترغیب دیتے رہتے تھے، لیکن اس جنگ میں یہود نے قریش کو جنگ پر اُکسایا اور انھیں یقین دلایا کہ ان کی مشترکہ کوششوں اور متّحدہ فوجوں کی مدد سے مسلمانوں کا استیصال ہو سکتا

ہے۔ قریش کے لیے تحریکِ اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا تھا۔ انھوں نے یہود سے مُعاہدہ کر کے جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ پھر ان دونوں کی مشترکہ کوششوں سے غطفان، بنو اسد، بنو سُلَیم اور بنو سعد بھی اس جنگ میں ان کے حلیف بن گئے۔ چنانچہ مشرق کی طرف سے غطفان کے قبائل (بنو سُلَیم، فزارہ، سعد، اسد، اشجع اور مُرّہ وغیرہ) نے، اور جنوب کی سمت سے قریش نے، اپنے حلیفوں کے ساتھ مدینے کی طرف پیش قدمی کی، اور شمال کی جانب سے بنی النَّضِیر اور بنی قَیْنُقاع آگے بڑھے۔ اتحادیوں کی افواج دس بارہ ہزار کے لگ بھگ تھیں اور ان کا سپہ سالارِ اعظم[1] ابوسُفیان تھا[2]۔

اتّحادیوں کو اپنی کثرت اور جنگی قوّت پر اتنا گھمنڈ تھا کہ انھوں نے فقط قلیل المُدّت جارحانہ جنگ کا منصوبہ بنایا اور اس کے مطابق اپنی افواج کو مسلّح کیا اور دیگر تیّاریاں کیں۔ طویل اور مدافعانہ جنگ کے امکان کو سرے سے نظر انداز کر دیا، لہٰذا انھوں نے نہ تو اس نوعیّت کی جنگ کا منصُوبہ بنایا اور نہ اس کے لیے تیّاری ہی کی اور یہ کوتاہی ان کی ناکامی کی وجۂ حقیقی ثابت ہوئی۔

دُشمنوں کے منصوبوں، تیّاریوں اور ان کی حربی و افرادی قوّت کی مکمّل و مصدّقہ اطلاعات برابر آپؐ کو ملتی رہتی تھیں۔ آپؐ نے ان کے اس منصوبے کو ناکام بنانے کے لیے جوابی منصوبہ تیار کر لیا۔ منصوبہ یہ تھا کہ دُشمن چونکہ طویل جنگ کے لیے تیار نہیں ہے، اس لیے ان کو جارحانہ اقدام کا موقع نہ دیا جائے اور جنگ کو طول دے کر ان کی جارحانہ قوّت اور عزائم کو ناکارہ بنا دیا جائے۔ چنانچہ آپؐ نے مدافعانہ جنگ کی تیاریوں کا آغاز کرنے سے پہلے صحابہؓ سے مشاورت کی۔ حضرت سلمان فارسیؓ کی اس رائے سے سب نے اتفاق کیا کہ مدینے کے گرد ایک خندق کھودی جائے اور دشمن کو خندق پار کرنے کا موقع نہ فراہم کیا جائے۔ حصار بندی کا یہ طریقہ اہلِ عرب کے لیے بالکل نیا اور مقتضیاتِ احوال کے لیے موزوں ترین تھا۔ چنانچہ آپؐ نے مجاہدین کو خندق کھودنے کا حکم دیا اور اس کام کا آغاز خود کیا اور اس کی تکمیل تک آپؐ برابر مجاہدین کے ساتھ کام کرتے رہے۔ آپؐ کا یہ طرزِ عمل، جو ایک پیغمبر، حکمران و سپہ سالار کا تھا، مجاہدین کے لیے رُوح پرور و حوصلہ افزا ہونے کے علاوہ مساوات و اخوّت کا بہترین عملی نمونہ بھی تھا۔ اصول و قواعد کے مُطابق کام کرنا آپؐ کی عادت تھی۔ چنانچہ آپؐ نے خندق کھودنے کے لیے دس دس آدمیوں کی ٹولیاں بنائیں۔ ہر ٹولی کے ذمّے

دس گز خندق تیار کرنا تھی، جس کی گہرائی پانچ گز رکھی گئی تھی۔ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کی قیادت میں مجاہدین خندق کھودتے، مٹّی ڈھوتے اور جذبۂ ایمان سے سرشار، ہم آواز ہو کر یہ شعر پڑھتے جاتے تھے:

نَحْنُ الَّذِیْنَ بَایَعُوْا مُحَمَّدًا
عَلَی الْاِسْلَامِ مَابَقِیْنَا اَبَدًا

ہم وہ ہیں کہ جنھوں نے محمّد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے ہاتھ پر بیعت کی اور ہم ہمیشہ عمر بھر اسلام پر قائم رہیں گے۔

اَللّٰھُمَّ اِنَّہٗ لَا خَیْرَ اِلَّا خَیْرُ الْاٰخِرَۃ
فَبَارِکْ فِی الْاَنْصَارِ وَالْمُھَاجِرَۃ

فائدہ تو دراصل آخرت ہی کا فائدہ ہے۔ اے اللہ! انصار اور مہاجرین میں برکت عطا فرما۔

شعر و آواز سے محنت و مشقّت کا بارِ گراں ہلکا محسُوس ہوتا ہے اور جسم و جان کو آسُودگی ملتی ہے، شاید یہی وجہ تھی کہ آپؐ بھی مٹّی ڈھوتے اور ساتھ ساتھ ابن رواحہؓ کے یہ شعر پڑھتے جاتے تھے:

اَللّٰھُمَّ لَوْلَا اَنْتَ مَا اھْتَدَیْنَا　　وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّیْنَا
فَاَنْزِلَنْ سَکِیْنَۃً عَلَیْنَا　　وَثَبِّتِ الْاَقْدَامَ اِنْ لَاقَیْنَا
اِنَّ الْاُلٰی قَدْ بَغَوْا عَلَیْنَا　　وَاِنْ اَرَادُوْا فِتْنَۃً اَبَیْنَا

اے اللہ! اگر تو ہدایت عطا نہ کرتا تو ہمیں ہدایت کہاں ملتی؟ ہم نہ زکوٰۃ دیتے اور نہ نماز ہی پڑھتے۔ اے اللہ! ہمیں تسکین عطا فرما، اور دشمن کے مقابلے کے وقت ہمیں ثابت قدم رکھنا۔ انھوں نے ہم پر ظلم سے چڑھائی کی ہے۔ اگر یہ ہم سے فتنہ طلب کریں گے تو ہم نہیں مانیں گے۔

آپؐ آخری مصرع کو زور سے پڑھتے اور تکرار کرتے۔[۳]

ربِّ جلیل و جمیل کے آخری پیغمبر و حبیبؐ اور مجاہدوں کے مناجاتی شعروں اور پُرسوز آواز سے فضا یقیناً نُور و سرُور سے معمُور ہو جاتی ہوگی۔ مجاہدین نے آپؐ کی ولولہ انگیز قیادت میں اس مشکل کام کو بڑی سرعت کے ساتھ صرف دو ہفتوں میں پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔[۴] دشمن کی افواج کے وہاں پہنچنے سے پہلے خندق تیّار اور تمام دفاعی انتظامات مُکمّل ہو چکے تھے، اور

خندق کے دفاع کے لیے تین ہزار مجاہدین مورچے سنبھال چکے تھے۔

اس خندق کے پیچھے کوہِ سلع تھا، جس کے نیچے بنو قُریظہ آباد تھے۔ ان یہُودیوں نے وہاں قلعے تعمیر کر رکھے تھے۔ یہ خندق شہر کے چاروں طرف نہ تھی بلکہ شمال مغرب کی جانب تھی جہاں سے حملہ ہو سکتا تھا۔ جنوب کی طرف سے حملے کا خطرہ نہ تھا، کیونکہ وہاں درختوں کے بکثرت جُھنڈ تھے، جہاں سے لشکر کشی کا امکان نہ تھا۔ مشرق میں لاوے کی چٹانیں (حرّات) تھیں، اور جنوب مغرب کا علاقہ بھی سخت دشوار گزار تھا، لہٰذا ان اطراف سے بھی دشمن کے حملہ کرنے کا امکان نہ تھا۔ اس طرح خندق کے ذریعے آپؐ نے مدینۂ منوّرہ کو محفوظ کر لیا، اور جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، یہ خندق مجاہدین کی نگرانی میں اتّحادی افواج کے لیے ناقابلِ عبُور ثابت ہوئی۔

اِتّحادی افواج کو اپنی کثرت پر گھمنڈ تھا۔ وہ، قوّت کے نشّے میں سرشار، فتح کے خواب دیکھتی مدینے کے نواح میں پہنچ گئیں۔ وہ عرب کے دستورِ حرب کے مطابق فوری جنگ کی متوقّع تھیں، لیکن جب انھوں نے خندق اور آپؐ کے دفاعی اِنتظامات دیکھے تو دنگ رہ گئیں ——— انھوں نے نہ تو اس قسم کی حصار بندی دیکھی تھی اور نہ اس نوع کی جنگ کا انھیں تجربہ ہی تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اس جنگ کے لیے حربی و نفسیاتی طور پر تیّار نہ تھے۔ پھر سخت جاڑے کا موسم تھا، جو محاصرے کے طول پکڑ جانے کی صورت میں ان کے لیے ہمّت شکن اور شکیب رُبا ہو سکتا تھا۔

بہر حال دُشمن نے خندق عبور کرنے کے لیے مشورے کیے، ترکیبیں سوچیں اور کوششیں بھی کیں، مگر کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ ایسی ہی ایک کوشش میں عرب کا نامور بہادر عمرو بن عبد ودّ اور اس کا ساتھی نوفل حضرت علیؓ کے ہاتھوں مارے گئے، اور باقی دو ساتھی ضرار اور جبیرہ بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہُوئے۔[۵] اِتّحادیوں نے کئی روز مسلسل تیر اندازی بھی کی، جس کی وجہ سے مُجاہدوں کو اپنے مورچوں سے نکلنا دُشوار ہو گیا اور ایک سے زائد نمازیں قضا ہو گئیں، لیکن وہ مسلمانوں کو مرعوب و ہراساں کرنے اور مورچہ چھوڑنے پر مجبور نہ کر سکے۔ اس موقع پر قبیلہ اوس کے سردار اور تحریکِ اسلام کے زبردست پشتیبان حضرت سعد بن معاذؓ کی کلائی پر تیر لگا اور یہ زخم مہلک ثابت ہُوا۔ یہ تیر حبّان بن قیس معروف بہ ابن العرقہ نے مارا تھا۔[۶] اسی جنگ میں حضرت حمزہؓ کے قاتل وحشی نے

حضرت طفیل بن نعمان رضؓ کو حربہ (چھوٹا تیر) مار کر شہید کیا تھا۔ محاصرہ جُوں جُوں طول پکڑتا گیا، اتحادی فوجوں کے ذخائرِ رسد کم ہوتے گئے اور مصارفِ جنگ کا بوجھ بڑھتا گیا۔ سخت سردی کے دن تھے، ایندھن بھی ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ فیصلہ کُن جنگ کی کوئی صورت دکھائی نہ دیتی تھی۔ اِتحادی کھُلے میدان میں پڑے ہوئے تھے اور اس کٹھن زندگی کے سردارانِ قریش عادی نہ تھے۔ ہر نیا دن ان کے لیے قنوطیت کا پیغام لے کر آتا تھا۔ لشکریوں میں بد دلی پھیلتی جارہی تھی۔ پھر حالات ایسے تھے کہ اتحادیوں میں پھُوٹ پڑ جانے کا بھی اندیشہ تھا۔ ابوسفیان اِس صورتِ حال سے باخبر تھا، لیکن اس سے عہدہ برآ ہونا اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔

پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم نے بیرونی جارحیّت کے دفاع کا تو خاطر خواہ انتظام کر لیا تھا، لیکن اپنے اندر کے دوست نُما دشمن بنو قریظہ کا مسئلہ بڑا نازک تھا۔ فوج کی قِلّت کی وجہ سے اس طرف کے دفاع کا خاطر خواہ انتظام نہ ہو سکا۔ ان کے علاقے کے قریب مسلمانوں کی گڑھیاں تھیں، جہاں مسلمان عورتیں اور بچّے رکھے گئے تھے۔ ان کی دیکھ بھال اور حملے کی صورت میں ابتدائی دفاعی خط کے طور پر ایک سو مجاہدین کا گشتی دستہ وہاں متعین کر دیا گیا تھا۔ ابوسفیان مسلمانوں کی اس دفاعی کمزوری کو جانتا تھا، اور اس سے فائدہ اُٹھانے کا اس نے منصوبہ بنایا۔ منصوبہ یہ تھا کہ بنو قریظہ کو، جو مسلمانوں کے حلیف اور مُعاہد تھے، ساتھ ملا کر آگے اور پیچھے سے ایک ساتھ حملہ کیا جائے۔ چنانچہ اس نے اس غرض سے یہُود کے قبیلہ بنی النَّضِیر کے سردار حُیَیّ بن اخطب کو ان کے پاس بھیجا۔ پہلے تو بنی قریظہ نے مسلمانوں سے دفاعی معاہدہ توڑنے سے انکار کر دیا، لیکن جب حُیَیّ بن اخطب انھیں یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گیا کہ فتح و نصرت کا، اور مسلمانوں اور ان کی دینی تحریک کے استیصال کا یہ نادر موقع پھر کبھی ہاتھ نہیں آئے گا، نیز اگر بنی قریظہ اتحادیوں کے ساتھ مل کر عقب سے حملہ کر دیں گے تو مدینے کو فتح کرنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہو گا، تو وہ معاہدہ توڑنے پر آمادہ ہو گئے، لیکن اس شرط پر کہ حُیَیّ بن اخطب، فتح و شکست، ہر حال میں ان کے ساتھ رہے گا۔ یوں بھی نقضِ عہد یہود کا قومی خاصّہ ہے۔

آپ ؐ کے ذرائع سُراغ رسانی کیا تھے؟ ان کا ٹھیک پتا تو نہیں چلتا، لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ دُشمن کے فوجی رازوں، منصوبوں اور نقل و حرکت وغیرہ کا پتا آپ ؐ کو بر وقت چل جاتا تھا۔ چنانچہ بنو قریظہ کے اس نقضِ عہد کی اطّلاع بھی آپ ؐ کو بر وقت

مل گئی، اور آپ ؐ نے فوراً انصار کے سرداروں حضرت سعد بن عبادہ رضؓ، حضرت سعد بن معاذ رضؓ، حضرت خوات بن جبیر رضؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضؓ کو ان کے پاس بھیجا کہ وہ اپنے سابقہ دوستانہ اور حلفی تعلّقات کی بنا پر انھیں معاہدہ توڑنے سے باز رکھیں۔ طوطا چشمی بھی یہود کا قومی خاصّہ ہے۔ چنانچہ بنو قریظہ نے اپنے دیرینہ حلیف انصار کی ایک نہ سُنی اور ان سے برملا کہہ دیا کہ لا عقد بیننا و بین محمّد ولا عہد : ہمارے اور محمّد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے درمیان کوئی عہد و پیمان نہیں ہے۔

انصار مایوس ہو کر لوٹے۔ اگرچہ آپ ؐ کی ہدایات کے مُطابق انھوں نے اِس صورتِ حال سے آپ ؐ کو راز دارانہ طریقے سے آگاہ کیا، لیکن یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح اسلامی لشکر میں پھیل گئی۔ منافقوں اور کمزور دل مسلمانوں کے لیے یہ خبر ہمّت شکن و شکیب رُبا تھی۔ انھوں نے مجاہدین میں بد دلی اور انتشار پھیلانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ ان میں سے کچھ تو غدّاری کی باتیں کرنے لگے اور کچھ لوگ واقعی گھروں کو لوٹ جانے کی اجازت مانگنے لگے۔ اگرچہ یہ صورتِ حال بڑی نازک، خطرناک اور پیچیدہ تھی، لیکن آپ ؐ اس سے عہدہ برآ ہونے میں کامیاب ہو گئے۔[۵]

اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاحزاب میں اس جنگی صُورتِ حال کی کیفیّت اس طرح بیان فرمائی ہے :

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ کے احسان کو یاد کرو جو (ابھی ابھی) اس نے تم پر کیا ہے۔ جب فوجیں تم پر چڑھ آئیں تو ہم نے ان پر ایک سخت آندھی بھیج دی، اور ایسے لشکر روانہ کیے جو تم کو نظر نہیں آتے تھے۔ اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو تم لوگ اس وقت کر رہے تھے۔ جب اُوپر سے اور نیچے سے (دشمن) تم پر چڑھ آئے۔ جب خوف کے مارے آنکھیں پتھرا گئیں، کلیجے مُنہ کو آ گئے، اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ اس وقت ایمان لانے والے خوب آزمائے گئے اور انھیں بُری طرح جھٹکے لگے۔

"یاد کرو وہ وقت جب منافقین اور وہ سب لوگ جن کے دلوں میں روگ تھا، صاف صاف کہہ رہے تھے کہ اللہ اور اس کے رسول ؐ نے جو وعدے ہم سے کیے تھے، وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھے۔ جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ اے یثرب کے لوگو! تمھارے

لیے اب ٹھہرنے کا موقع نہیں ہے، پلٹ چلو۔ جب ان کا ایک فریق نبیؐ سے یہ کہہ کر رُخصت طلب کر رہا تھا کہ ہمارے گھر خطرے میں ہیں، حالانکہ وہ خطرے میں نہ تھے۔ دراصل وہ (محاذِ جنگ) سے بھاگنا چاہتے تھے۔ اگر شہر کے اطراف سے دُشمن گھُس آئے ہوتے اور اس وقت انھیں فتنے کی دعوت دی جاتی تو یہ اس میں جا پڑتے اور مُشکل ہی سے انھیں شریکِ فتنہ ہونے میں کوئی تامّل ہوتا۔ ان لوگوں نے اس سے پہلے اللہ سے عہد کیا تھا کہ وہ پیٹھ نہ پھیریں گے، اور اللہ سے کیے ہوئے عہد کی باز پُرس تو ہونی ہی تھی۔[۸]

جہاں تک جنگ کی صورتِ حال کا تعلق ہے، وہ سخت مخدوش و خطرناک ہو گئی تھی۔ بنو قُریظہ کے عقب سے حملے کی صورت میں عورتوں اور بچّوں کو بچانے کی کوشش، اتّحادی فوجوں کو خندق عبور کرنے کا موقع فراہم کرنے کے مترادف تھی۔ آپؐ نے بنو قُریظہ کی علیٰحدگی کی تلافی کی یہ تدبیر سوچی کہ بنو غطفان کو اتّحادیوں سے علیٰحدہ کر دیا جائے۔ چنانچہ آپؐ نے ان سے خُفیہ طور سے صلح کی بات چیت شروع کی، اور مدینے کے پھلوں کی پیداوار کا ایک تہائی (۱/۳) حصّہ دینے کے وعدے پر ان کو قریش سے علیٰحدہ ہونے اور میدانِ جنگ چھوڑنے پر آمادہ کر لیا۔ تحریری طور پر معاہدہ کرنے سے پہلے انصار کو اعتماد میں لینا ضروری تھا، لہٰذا آپؐ نے ان کے سرداروں حضرت سعد بن معاذؓ اور حضرت سعد بن عبادہؓ سے مشورہ طلب کیا۔ انھیں یہ شرط قابلِ قبول نہ تھی۔ انھوں نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! ایسا آپؐ چاہتے ہیں یا یہ اللہ کا حکم ہے، جس کی تعمیل ناگزیر ہے، یا ہمیں بچانے کی خاطر آپؐ ایسا کر رہے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: تم لوگوں کو بچانے کی خاطر ایسا کر رہا ہوں، کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ سارا عرب متّحد ہو کر تم پر ٹوٹ پڑا ہے۔ میری خواہش ہے کہ میں ان کو ایک دوسرے سے توڑ دوں۔ انھوں نے عرض کیا: ہمیں یہ شرط قبول نہیں۔ ہم اور ہماری قوم مشرک تھی۔ بتوں کی پوجا کرتی تھی۔ اس وقت یہ لوگ ہمارے پھل صرف مہمان یا مشتری بن کر کھا سکتے تھے۔ اب جب کہ اللہ نے ہم کو اسلام سے قوّت بخشی، ہمیں ہدایت دی اور آپؐ کی قیادت سے ہمیں عزّت عطا فرمائی ہے تو ہم انھیں اپنا مال دیں؟ اللہ کی قسم! ہم لڑے بغیر انھیں ہرگز مال نہیں دیں گے۔ آپؐ نے ان کی رائے کی تصویب فرمائی۔ سعد بن معاذؓ نے معاہدے کا مسودہ لیا اور تحریر کو مٹا ڈالا۔[۹]

بنی غطفان سے معاہدہ تو نہ ہوا، لیکن اس کا چرچا ضرور ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش و

یہود بنی غطفان سے بدگمان ہو گئے۔ بدگمانی سے باہمی اعتماد اور اتحاد کی بنیادیں متزلزل ہو جاتی ہیں، اور ہوئیں۔

اس کامیابی کے بعد آپؐ نے بنی قریظہ اور اِتّحادیوں میں بدگمانی پیدا کرنے کی تدبیر سوچی اور اس کے لیے نعیم بن مسعودؓ کو منتخب کیا۔ نعیم بن مسعودؓ بنی غطفان کی شاخ اشجع کے فرد تھے، اور تحریکِ اسلام میں شامل ہو چکے تھے، لیکن سیاسی و انقلابی مصلحتوں کی بنا پر انھوں نے اپنا اسلام ظاہر نہیں کیا تھا، اور اپنے قبیلے ہی میں رہتے تھے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سفارتی حکمتِ عملی یا سیاسی جوڑ توڑ میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ ممکن ہے بنی غطفان سے سلسلے میں انھوں نے قاصد وغیرہ کا کردار ادا کیا ہو۔ بہرحال حضرت نعیم بن مسعودؓ آپؐ کی سکیم کے مطابق بنی قریظہ کے پاس گئے اور انھیں یقیناً بنی غطفان اور پیغمبرِ اسلام صلّی اللہ علیہ وسلّم کے درمیان مذاکرات سے آگاہ کیا ہو گا۔ بہرحال وہ انھیں یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گئے کہ اتّحادیوں کے محاصرہ اُٹھا کر واپس چلے جانے کا قوی امکان ہے۔ ایسی صُورت میں ان کا تو کچھ نہیں بگڑے گا، لیکن تمھاری شامت آجائے گی، کیونکہ تمھیں بہرحال مدینے میں رہنا ہے، لہٰذا میری رائے یہ ہے کہ تم اس وقت تک جنگ میں حصّہ نہ لینا جب تک اتّحادی اپنی چند ممتاز شخصیّتیں تمھارے پاس یرغمال کے طور پر نہ بھیج دیں۔ اگر ان کی نیّت ٹھیک ہو گی تو وہ یقیناً ایسا کریں گے، ورنہ نہیں۔ یہ بات ان کے دِل میں اُتر گئی اور انھوں نے اِتّحادیوں سے یرغمال کا مطالبہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

حضرت نعیمؓ کی یہ اہم سفارتی جیت تھی۔ اس کے بعد وہ بنو غطفان اور قریش کے سرداروں سے ملے اور انھیں اعتماد میں لے کر بنی قریظہ کے متعلّق بتایا کہ وہ بیٹھتے دکھائی دے رہے، اور مسلمانوں سے مصالحت کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ چنانچہ انھیں اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لیے عین ممکن ہے کہ وہ تم سے تمھارے ممتاز آدمیوں کو یرغمال رکھنے کا مطالبہ کریں اور پھر انھیں مسلمانوں کے حوالے کر دیں، لہٰذا میری رائے میں ان سے احتیاط سے معاملہ کرنا چاہیے۔ حضرت نعیمؓ نے اپنی طلاقت اور حکمت سے اتّحادیوں کو بنی قریظہ سے بدگمان کر دیا، اور ان کا یہ تیر بھی ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔[۱۰]

اب اتّحادیوں نے اپنے منصوبے کے مطابق بنی قریظہ سے ایک ساتھ حملہ کرنے کو کہا تو انھوں نے یرغمال کا مطالبہ کر دیا۔ اتّحادی چونکہ پہلے ہی بدگمان تھے، انھیں اس

مطالبے سے یقین ہوگیا کہ بنی قریظہ ان سے چال چل رہے ہیں۔ وہ بدک گئے، اور انھوں نے یہ مطالبہ مسترد کر دیا۔ اس انکار سے بنو قریظہ بھی اِتحادیوں سے بدک گئے۔ چنانچہ اس جنگی چال سے اِتحادیوں میں پھوٹ پڑ گئی اور مدینے پر حملہ کرنے کا منصوبہ خاک میں مل گیا، اور ساتھ ہی مدینے کی فتح کی آخری شمعِ امید بھی بجھ گئی۔ اس سے وہ انتشارِ ذہنی اور یاسیت کا شکار ہو گئے۔[۱۱]

اب جنگ کی صورت ایسی بن چکی تھی کہ اتحادیوں کے لیے محاصرہ اُٹھا لینے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہ گیا تھا۔ محاصرہ کیے پچیس دن گزر چکے تھے، لیکن فیصلے کا آخری امکان بھی معدوم ہو چکا تھا۔ اب انھیں یقین ہو گیا تھا کہ محاصرے کو طول دینا بے فائدہ ہی نہیں نقصان دہ بھی ہے۔ چنانچہ وہ محاصرہ اٹھانے کی سوچ ہی رہے تھے کہ قدرت نے انھیں ایسا کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔

سخت جاڑے کی اندھیری رات تھی۔ یخ بستہ ہوا چل رہی تھی، لشکری سردی سے ٹھٹھر رہے تھے اور آگ تاپ رہے تھے کہ دفعتاً آندھی اُٹھی، جس نے دیکھتے ہی دیکھتے تند و تیز طوفان کی شکل اختیار کر لی، خیموں کی طنابیں ٹوٹ گئیں، چولھے اور خیمے اُلٹ گئے اور لشکریوں میں افراتفری پھیل گئی۔ اس صورتِ حال کو بہانہ بنا کر اتحادی افواج کے سپہ سالارِ اعظم ابو سفیان نے محاصرہ اٹھانے کا اعلان کر دیا۔ دشمن کی فوجیں راتوں رات میدان چھوڑ کر چلی گئیں۔ صبح ہوئی تو میدانِ جنگ دشمنوں سے صاف تھا۔ آپؐ نے یہ دیکھ کر فرمایا: لن تعزوکم قریش بعد عامکم ھٰذا ولکنکم تعزونھم: اب قریش تم پر چڑھائی نہیں کر سکیں گے بلکہ تم ان پر چڑھائی کرو گے۔

یہ آندھی اگر اہلِ کفر و ظلم کے لیے بلائے ناگہانی اور حسرت و ناکامی کی پیامی بن کر آئی تو اہلِ ایمان و حق کے لیے بلائے رُبا بھی تھی، اور پیامبرِ فتح و نصرت بھی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا مسلمانوں پر احسانِ عظیم بھی تھا اور عہد آفریں واقعہ بھی جسے تاریخ نے محفوظ کر لیا ہے:

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ کے اس احسان کو یاد کرو کہ جب تم پر لشکر چڑھ آئے تو ہم نے ان پر سخت آندھی بھیجی اور ایسے لشکر بھی بھیجے جو تمھیں دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو تم لوگ اس وقت کر رہے تھے۔"[۱۲]

ظاہر ہے یہ پیش گوئی ایک اہلِ نظر مدبّر اور عبقری ماہرِ حربیات ہی کر سکتا تھا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے حالات و ظروف پر آپؐ کتنی گہری نظر رکھتے تھے۔ آپؐ نے بالکل صحیح اندازہ لگایا تھا کہ اقتصادی ناکہ بندی اور جنگوں سے قریش کی معاشیات اور جنگی کردار کو جو زبردست نقصان پہنچ چکا ہے، اس کی تلافی کا اب کوئی امکان نہیں رہا، لہٰذا وہ مسلمانوں کی اُبھرتی ہوئی قوت کو پھر کبھی چیلنج کرنے کی جرأت نہیں کر سکیں گے۔ بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ آپؐ کی پیشگوئی سو فیصد درست تھی۔

۲۳ ذی قعدہ ۵ھ / ۱۵ اپریل ۶۲۷ء کو اس اعصاب شکن، حوصلہ فرسا اور شکیب رُبا اِمتحان سے کامیابی کے ساتھ گزرنے کے بعد آپؐ نے مجاہدین کو اپنے گھروں کو لوٹ جانے کی اجازت دے دی۔ ظہر کا وقت تھا کہ آپؐ اپنے گھر تشریف لائے۔ اتنے میں حضرت جبرئیل علیہ السّلام اللہ تعالیٰ کا پیام لے کر تشریف لائے کہ ابھی ہتھیار نہ اُتارے جائیں کہ جنگ کا ایک مرحلہ باقی ہے، اور بنو قریظہ کا بھی حساب چکا دینا چاہیے۔ جنگ کے دوران میں بنو قریظہ کا معاہدہ حلف کو توڑنا غدّاری کے مترادف تھا۔ وہ اسلامی مملکت کے خطرناک دشمن اور اس کے سر پر مسلط تھے۔ فوجی نقطۂ نگاہ سے اس خطرے کا فوری استیصال ضروری تھا۔ چنانچہ فرمانِ الٰہی ملتے ہی آپؐ نے منادی کرا دی کہ جو بھی سمع و طاعت پر قائم رہے، اسے چاہیے کہ عصر کی نماز بنی قریظہ کی بستی میں جا کر پڑھے۔

اس اعلان کے ساتھ ہی آپؐ نے مجاہدین کے ایک دستے کو حضرت علیؓ کی قیادت میں مقدمۃ الجیش کے طور پر، بنی قریظہ کی طرف روانہ کر دیا، اور پیچھے پیچھے خود فوج لے کر پہنچ گئے۔ بنی قریظہ قلعہ بند ہو گئے اور آپؐ نے ان کا مُحاصرہ کر لیا جو تقریباً تین ہفتے جاری رہا اور ان کی اس درخواست پر ختم ہوا کہ حضرت سعد بن معاذؓ جو فیصلہ دیں، انھیں منظور ہو گا۔ حضرت سعدؓ کا قبیلہ اوس زمانۂ جاہلیت میں بنو قریظہ کا حلیف اور ہم عہد رہا تھا، لہٰذا یہود کو ان سے جانبداری و پاسداری کی اُمید تھی، لیکن بنو قریظہ کا جُرم اتنا سنگین تھا کہ وہ کسی بھی رعایت کے مستحق نہ تھے۔ ایک تو انھوں نے مسلمانوں سے ایسے موقع پر غدّاری کی تھی کہ ان کی ہلاکت و بربادی میں کوئی کسر باقی نہیں رہی تھی۔ دوسرے مسلمانوں نے اس سے پہلے جن یہودی قبائل (بنی نضیر اور بنی قینقاع) سے لطف و کرم کا برتاؤ کیا تھا، انھوں نے ہی جنگِ احزاب کی آفت ڈھائی تھی، ان حالات میں حضرت سعدؓ کو مجبوراً بنی قریظہ کا فیصلہ ان کی الہامی کتاب تورات کے مطابق کرنا پڑا۔ اس طرح انھیں اپنی غدّاری کی سزا اپنی ہی شریعت کے مطابق مل گئی، اور یہ فتنہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

یہ بھی مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کا احسان تھا کہ بنو قریظہ نے مرعوب ہو کر ہتھیار ڈال دیے اور لڑائی کے بغیر مسلمانوں نے انھیں مسخر کر لیا اور ان کی سرزمین اور مال و متاع وغیرہ کے وارث بن گئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں، جو تاریخ کی ایک سچی اور محفوظ دستاویز بھی ہے، ارشاد فرماتا ہے :

" پھر اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں نے ان حملہ آوروں کا ساتھ دیا تھا، اللہ نے ان کی گڑھیوں سے انھیں اُتار لیا اور ان کے دلوں میں اس نے تمھارا رُعب ڈال دیا۔ ایک گروہ کو تم قتل کر رہے تھے اور دوسرے گروہ کو قید کر تے تھے۔ اس نے تم کو ان کی زمین، ان کے گھروں اور ان کے اموال کا وارث بنا دیا، اور وہ علاقہ تمھیں دیا جسے تم نے کبھی پامال نہیں کیا تھا۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔"[۱۳]

بنو قریظہ کے استیصال کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مدینہ دشمنوں اور مشرکوں سے پاک و صاف ہو گیا اور اسلامی مملکت کو صحیح معنوں میں ایک آزاد و خود مختار حیثیت حاصل ہو گئی۔[۱۴]

تحریکِ اسلام کے لیے یہ جنگ ایک زبردست طوفان اور ان کے عزم و ہمت اور صبر و شکیب کا سب سے بڑا امتحان تھا۔ یہ طوفان یہود و کُفّار نے شمعِ اسلام کو بُجھانے کے لیے اُٹھایا تھا، لیکن یہ طوفان خود ان کی بربادی کا پیش خیمہ بن گیا۔ اتّحادی فوجوں کا مقصد محض تخریبی تھا، اس لیے باطل تھا اور باطل حق کے مقابلے میں بودا اور شکستنی ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے یہ جنگ ان کی تحریکِ اسلام کے لیے زبردست چیلنج تھی، جسے قبول کرنا ان کی انتہائی اہم اور مقدس ذمّے داری تھی۔ چونکہ ان کا مقصدِ حیات حق کے لیے جینا اور مرنا تھا، اس لیے اس جنگ میں ان کے لیے صرف دو ہی راستے تھے : فتح یا شہادت۔ اس اعتبار سے یہ تخریبی و تعمیری قوتوں یا باطل پرست گروہوں اور حق پرست جماعت کے درمیان جنگ تھی۔ علاوہ بریں چونکہ اتّحادیوں کا مقصد قتال و تخریب تھا، اور ان کا کوئی مثبت و اعلیٰ نصب العین نہ تھا، اس لیے ان میں آخری دم تک لڑنے یا جنگ کو فیصلہ کُن بنانے کا عزم و ثبات نہ رہا، اور وہ جنگ کو بے نتیجہ چھوڑ کر فرار ہو گئے۔

جنگِ احزاب کو دُور رس نتائج کے اعتبار سے فیصلہ کُن ثابت ہونا تھا۔ اس ناکامی سے اتّحادیوں کے حوصلے اس قدر پست ہو گئے کہ انھیں یقین ہو گیا کہ وہ نہ تو مسلمانوں کا استیصال کر سکتے ہیں اور نہ ان کی تحریکِ اسلام کو ختم کر سکتے ہیں، لہٰذا انھیں پھر مسلمانوں کے خلاف اس طرح حملہ آور

ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔ اسی طرح اس طوفانِ عظیم سے بچ کر مسلمانوں کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ اب عرب کی کوئی طاقت انھیں مغلوب و مسخر نہیں کر سکتی اور یہ کہ ان کی تحریکِ اسلام ایک حسین و ہمہ گیر انقلاب لانے میں کامیاب ہو جائے گی۔ مسلمانوں کو اپنے عقایدِ جلیلہ و محرّکہ کے افضل و اعلیٰ ہونے کا تو ایقان و اذعان تھا، لیکن دشمنوں کے مقابلے میں انھیں اپنے حربی و مالی وسائل اور افرادی قوّت کی قلّت کا احساس بھی تھا جو کمزور طبائع میں احساسِ کمتری پیدا کر دیتا تھا۔ اس جنگ کے بعد یہ احساسِ کمتری بھی جاتا رہا۔

یہود کے آخری قبیلے بنو قریظہ کے خاتمے سے مدینے کی اسلامی ریاست کو اس مستقل اندرونی خطرے سے ہمیشہ کے لیے نجات مل گئی، نیز مسلمانوں کو ایک آزاد و خود مختار قوم کی حیثیت حاصل ہو گئی اور ان کی ہئیتِ اجتماعیہ انفرادیت و تشخّص کے رنگ سے پوری طرح مزیّن ہو گئی۔ عرب کی متحدہ قوتوں کی ناکامی سے جہاں ان کی ہوا اُکھڑ گئی، وہاں مسلمانوں کی ہوا بندھ گئی۔ جہاں تک تحریکِ اسلام کا تعلق ہے، جنگِ احزاب کا طوفان گزر گیا تو بادِ مخالف کا زور بھی بتدریج کم ہوتا گیا اور بادِ شُرط چلنے لگی، اور اس کی ترقی کی راہیں بڑی تیزی سے ہموار ہونے لگیں۔ تحریکِ اسلام کا مرکز اندرونی اور بیرونی خطروں سے محفوظ ہو گیا تو آپؐ کی زیرِ نگرانی مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا کام وسیع پیمانے پر ہونے لگا۔ آپؐ معلّمِ انسانیت بھی تھے اور اسلام کے نزدیک معلّم کا وظیفہ تعلیم کے ساتھ تربیت دینا بھی ہے، یعنی علم و حکمت سکھانا بھی اور اخلاق و کردار کی تہذیب و تحسین کرنا بھی ہے تاکہ لوگ صالح بنیں اور صالح افراد ہی معاشرے کو صالح بناتے ہیں۔ صالح معاشرے کی ایک شناخت یہ ہے کہ اس میں اخیار بہت زیادہ اور اشرار بہت کم ہوتے ہیں۔ آزادی، اخوّت اور مساوات کا دَور دَورہ ہوتا ہے اور وہ استحصالی قوّتوں مثلاً فرعونیّت، ہامانیّت اور قارونیت سے پاک ہوتا ہے۔ اس میں حکم صرف ایک اللہ کا چلتا ہے اور وہی معاشرے کا الٰہ اور ربّ ہوتا ہے۔

اسلام کا فلسفۂ تعلیم یہ ہے کہ علم و حکمت اور حُسنِ خُلق ایک ہی سلسلے کی مربُوط و لاینفک کڑیاں ہیں، لہٰذا عالم وہ ہے جو اخلاقِ حسنہ کا مالک ہو، حسین و صالح زندگی گزارتا ہو اور فاضل ہو۔ اصل یہ ہے کہ علم و حکمت اور اخلاقِ حسنہ سے انسان میں عظمت و فضیلت پیدا ہوتی ہے، اور انسان کو عالم و فاضل بنانا تحریکِ اسلام کے بنیادی مقاصد میں سے ہے اور ایسا بننے کی عمر بھر طلب و سعی کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر واجب ہے۔ قرآن مجید اور آپؐ کی سیرت سے یہ بھی ثابت ہے کہ معاشرے میں ایسی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام کرنا اسلامی حکومت کی اوّلین ذمے داریوں

میں سے ہے۔

علاوہ بریں آپؐ چونکہ رحمۃٌ للعالمین بن کر مبعوث ہوئے تھے، اس لیے اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کو اس کے پہلے مرحلے میں عرب کے گوشے گوشے میں پھیلانا اور دُوسرے مرحلے میں اس کے لیے عرب سے نکل کر دوسرے ممالک میں پھیلنے اور قدم جمانے کے لیے راہیں ہموار کرنا آپؐ کا فرضِ منصبی تھا۔

کوئی قوم جب اندھی ہوجاتی ہے تو اس میں خیر و شر، حُسن و قُبح کی طرح رحمت و زحمت میں امتیاز کرنے کی قوّت مفلوج ہوجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السّلام کی ان کی قوموں نے مخالفت کی، حالانکہ وہ ان کے لیے رحمت بن کر آئے تھے۔ اگر دین کی تحریکِ رحمت کے لیے مخالفت ضروری ہوئی تو پھر اس مخالفت کو دُور کرنا بھی ضروری ٹھہرا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر تحریکِ دین کی رُوح انقلابی تھی۔ اِسلام کی تحریک چونکہ ہمہ گیر و عالمگیر اور ہر زمان و مکان کے لیے تھی، اس لیے اس کی مخالفت بھی اسی نسبت سے زیادہ اور اس کی رُوح میں انقلابیت بھی اسی قدر زیادہ تھی، اور آپؐ کو اس حقیقت کا پورا شعُور تھا۔ چنانچہ ایک طرف تو آپؐ مسلمانوں کا تزکیہ کرنے، انھیں علم و حکمت سکھانے، مُتّقی و صالح اور بنی نوعِ انسان بلکہ کُل مخلوقات کے لیے رحمت بنانے کے فرائض سرانجام دیتے تھے، اور دوسری جانب تحریکِ رحمۃ للعالمینی کو عرب کے گوشے گوشے میں پھیلانے کے لیے مخالفتوں کو دُور کرنے اور حسین معاشرتی انقلاب کی راہیں ہموار کرنے میں کوشاں رہتے تھے۔ آپؐ کو انسانیّت کا غمِ محبّت ہی نہ تھا، اپنے اِلٰہ و ربّ کا غمِ عشق بھی تھا۔ لہٰذا رات آتی اور آپؐ اپنی گوناگوں مصروفیات سے فراغت پاتے تو "دوست" کی بارگاہ میں پہنچ جاتے۔ آپؐ "احسان" کے بلندترین مقام "شاہدیت" پر متمکن تھے، جہاں آپؐ کو "دوست" کے قُرب و دید کے علاوہ ہمکلامی کی سعادت و مسرّت بھی حاصل ہوتی تھی۔

اسلامی معاشرہ ابھی تشکیل و تعمیر کے مرحلے میں تھا اور معاشرتی انقلاب کا سلسلہ جاری تھا۔ معاشرتی انقلاب جب تک پایۂ تکمیل کو پہنچ نہیں جاتا، اسے اندر اور باہر سے ہر وقت مخالفت و بغاوت کا خطرہ لاحق رہتا ہے، لہٰذا آپؐ کو ہر قدم بڑے حزم و احتیاط سے اُٹھانا پڑتا اور ہر تبدیلی بتدریج لانا پڑتی تھی۔ آپؐ کا طریقِ کار یہ تھا کہ آپؐ قرآن و خطابت کے ذریعے پہلے لوگوں میں کسی تبدیلی کی استعداد و قبولیت پیدا کرتے، پھر اسے معاشرے میں لاتے، اس طرح اسے جدید خطوط پر تعمیر کرتے۔ اس سے اس امر کی توجیہ ہوجاتی ہے کہ کیوں قرآن مجید، جو اسلام کے

ہمہ گیر معاشرتی انقلاب اور تعمیر و تشکیلِ معاشرہ کے رہنما اصولوں کی زندہ کتاب ہے، آپؐ پر بتدریج نازل ہُوا۔ اصل یہ ہے کہ تعمیر تدریجی ہی ہوا کرتی ہے۔

اتّحادیوں کی ناکامی کے بعد بلاشبہ مدینۂ مُنوّرہ پر سے جنگ کے بادل چھٹ گئے تھے، لیکن نابود نہیں ہوئے تھے۔ آپؐ جنگجُو عربوں کے خصائص سے بخُوبی واقف تھے۔ قریش اور ان کے حلیف قبائل دلوں میں ناکامی اور انتقام کی آگ لے کر واپس ہوئے تھے، اور یہ آگ خود بخود بُجھنے والی نہ تھی، اسے کسی نہ کسی طرح بُجھانا ضروری تھا، کیونکہ اس کے بغیر ان کے دِلوں میں اسلام کی شمع روشن کرنا ازبس دشوار تھا۔ علاوہ ازیں اسلام کی خاطر ان قبائل کو رام کرنا بھی ضروری تھا، جو جنگِ احزاب میں تو شریک نہیں ہوئے تھے، لیکن ان کی ہمدردیاں دُشمنانِ اسلام کے ساتھ تھیں۔ عرب اکھڑ، ضدّی اور متشدّد لوگ تھے۔ مبارزت طلبی اور قتل و غارت گری ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ آن پر جان دینا اور آزادی کی خاطر جان پر کھیل جانا ان کا قومی شعار تھا۔ جنگِ خندق میں اتّحادیوں کی ناکامی کے بعد عرب قبائل اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگے تھے، لیکن ایک وحشی و جنگجُو قوم کی طرح وہ انجام سے بے پروا مسلمانوں سے صلح و امن کا سمجھوتہ کرنے کے بجائے بغاوت و سرکشی پر اُتر آئے۔

آپؐ کے جاسوس عرب کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے تھے۔ ہر قبیلے پر آپؐ کی کڑی نظر تھی۔ مقصد یہ تھا کہ جو قبیلہ سرکشی کرے، اسے کسی دوسرے قبیلے کی حمایت حاصل کرنے یا جارحانہ پیش قدمی کی مُہلت نہ دی جائے بلکہ بغاوت کو موقع پر ہی کچُل دیا جائے۔ چنانچہ آپؐ نے دشمنوں کو مرعوب کرنے اور انھیں سرکشی و بغاوت سے باز رکھنے کا ایک طریقہ وہ اختیار کیا، جسے عسکری اِصطلاح میں قراولی و طلایہ کا طریقہ کہتے ہیں۔ آپؐ مُجاہدین کے دستوں کو مدینۂ منوّرہ کے اطراف و جوانب میں دُور دُور تک بھیجتے رہتے تھے۔ اس کا ایک مقصد تو دشمنوں کے حالات سے باخبر رہنا اور اپنی قوت و ہمّت کے مظاہروں سے انھیں مرعوب و بددل کرنا تھا، اور دوسرا مقصد جنگی اہمیّت کے مختلف راستوں مقامات اور نشانیوں[۱۵] سے مجاہدین کو آشنا کرنا تھا ——— آپؐ نے اس سال یعنی ۶ ھ/ ۶۲۷، ۶۲۸ء میں طلایہ و قراولی کی جو مُہمّیں بھجوائیں، ان کا ایک مقصد دعوتِ اسلام دینا بھی تھا۔ مؤرّخین نے انھیں سرایا/ غزوات سے تعبیر کیا ہے۔ ان کی صرف نشاندہی کی جاتی ہے :

(۱) سریۂ نجد یا سریۂ محمدؓ بن مُسلمہ انصاریؓ (۱۰ محرم ۶ھ / یکم جون ۶۲۷ء) :
اس کامیاب مہم میں نجد کے بنی حنفیہ کا سردار ثُمامہ بن اُثال گرفتار کر کے مدینے لایا گیا۔ تین دن بعد آپؐ نے اسے آزاد کر دیا۔ ثُمامہ بن اُثال اس عرصے میں مسلمانوں کو با جماعت نماز پڑھتے دیکھتا اور ان کے اور بالخصوص آپؐ کے طرزِ عمل و کردار کا بخوبی مطالعہ کرتا رہا تھا۔ وہ مسلمانوں کے زُہد و تقویٰ اور اخلاق سے اس قدر مُتاثّر ہوا کہ آزاد ہوتے ہی مسلمان ہو گیا۔ یمامہ (نجد میں) زرخیز علاقہ اور غلّے کی منڈی تھا۔ اہلِ مکّہ یہاں ہی سے غلّہ حاصل کرتے تھے۔ ثُمامہ بن اُثالؓ اس علاقے کا سردار تھا۔ اس نے اہلِ مکّہ کو غلّے کی ترسیل بند کر دی۔ مکّے میں قحط پڑ گیا۔ قریش نے مجبور ہو کر آپؐ کی وساطت سے غلّہ حاصل کرنے کی درخواست کی۔ آپؐ رحمۃ للعالمین تھے، یہ درخواست کیسے ردّ کر سکتے تھے۔ آپؐ کے ارشاد پر ثمامہ نے اہلِ مکّہ کو غلّے کی ترسیل پھر سے شروع کر دی۔[۱۶]

تالیفِ قلوب کے ذریعے قریش کو تحریکِ اسلام میں شامل کرنا آپؐ کے مقاصدِ جلیلہ میں سے تھا، لہٰذا آپؐ ایسا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ اس قحط کے موقع پر آپؐ نے قریش کو پانچ سو اشرفیاں بھجوائیں کہ انھیں مفلوک الحال لوگوں میں تقسیم کر دیں، علاوہ بریں آپؐ نے مدینے کی مصنوعات اور پیداوار بھی انھیں تحفے کے طور پر بھجوائیں اور اس اقدام سے عوام کے دل موہ لیے۔ قریش سے تجارتی تعلقات قائم کرنے کی خاطر آپؐ نے ان سے کھالیں خریدنے کی بھی پیش کش کی، نیز ان سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے لیے آپؐ نے ان کے سردار ابو سفیان کی بیٹی اُمّ حبیبہؓ سے، جو ہجرت کر کے حبشہ چلی گئی تھیں، وہاں کے شاہ نجاشی کی وساطت سے عقدِ غائبانہ کر لیا۔ ان دوستانہ و مصالحانہ کوششوں نے عوام کے دلوں کو اسلام کی تحریکِ رحمۃ للعالمینی کی طرف مائل کرنے میں خاطر خواہ حصّہ لیا۔[۱۷]

(۲) مُہم یا غزوۂ بنو لحیان (یکم ربیع الاوّل ۶ھ / ۲۱ جولائی ۶۲۷ء) :
اس مہم کا مقصد حضرت عاصم بن ثابتؓ اور دیگر شہدائے رجیع کا انتقام لینا تھا۔ اس کی قیادت آپؐ نے کی تھی۔ بنو لحیان خوف سے پہاڑوں میں روپوش ہو گئے۔ آپؐ اہلِ مکّہ کو مرعوب کرنے کی خاطر اور آگے بڑھے اور مکّے کی حدود میں پہنچ کر مراجعت فرمائی۔[۱۸]

(۳) مُہم یا غزوۂ ذی قرد (ربیع الآخر ۶ھ / اگست، ستمبر ۶۲۷ء) ذی قرد ایک چشمے کا

نام ہے۔ یہاں اسلامی مملکت کی اونٹنیوں کی چراگاہ تھی۔ اس پر عبدالرحمٰن بن عُیَینہ نے اپنے چھاپہ مار گروہ کے ساتھ حملہ کیا، چرواہے کو قتل کر دیا، اس کی بیوی اور اونٹنیاں لے کر بھاگ گیا۔ آپؐ نے مجاہدین کے ساتھ تعاقب کیا۔ لڑائی ہوئی، کچھ اونٹنیاں چھڑا لیں، مشرکین کے چند آدمی ہلاک ہوئے، باقی بھاگ گئے۔[۱۹] سب سے پہلے اس واقعے کی اطّلاع حضرت سلمہ بن الاکوعؓ کو ملی۔ وہ مانے ہوئے تیر انداز تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کو مدد کے لیے پکارا اور خود چھاپہ ماروں کے تعاقب میں دوڑے، خوب تیر اندازی کی۔ حملہ آور اونٹنیاں چھوڑ کر بھاگ گئے۔[۲۰]

(۴) مہم غمر یا سریہ عکاشہ بن محصنؓ (ربیع الآخر ۶ھ / ستمبر ۶۲۷ء) : یہ مہم حضرت عکاشہ بن محصن کی قیادت میں غمر بھیجی گئی تھی، جہاں بنی اسد رہتے تھے۔ بنی اسد ڈر کر بھاگ گئے۔

(۵) مُہم یا سریۂ ذی القصّہ (ربیع الآخر ۶ھ / ستمبر ۶۲۷) : آپؐ نے یہ مختصر مہم محمّد بن مسلمہؓ کی قیادت میں ذی القصّہ بھیجی، جہاں بنی ثعلبہ اور بنی غوال نے شورش برپا کر رکھی تھی۔ اُنھوں نے شبخون مار کر اس جماعت کو، جو دس صحابہ کرامؓ پر مشتمل تھی، شہید کر دیا، سوائے حضرت محمّد بن مسلمہؓ کے، جو شدید مجروح ہو گئے تھے، لیکن بچ رہے۔

(۶) دوسری مُہم ذی القصّہ یا سریہ بنو ثعلبہ (ربیع الآخر ۶ھ / ستمبر ۶۲۷ء) :
اس مہم کا ایک مقصد بنی ثعلبہ سے شہدائے ذی القصّہ کا انتقام لینا تھا۔ بنو ثعلبہ ڈر کر پہاڑوں میں رُوپوش ہو گئے تھے۔ اسے سریۂ ذی القصّہ ثانی بھی کہتے ہیں۔

(۷) مُہم یا سریۂ جموم (ربیع الآخر ۶ھ / ستمبر ۶۲۷ء) : جموم مدینے سے چار کوس کے فاصلے پر بطن نخلہ کے قریب واقع ہے، جہاں بنی سلیم رہتے تھے۔ اس مہم کے قائد حضرت زید بن حارثہؓ تھے۔ لڑائی کی نوبت نہ آئی۔

(۸) مہم یا سریۂ عیص (جمادی الاوّل ۶ھ / ستمبر، اکتوبر ۶۲۷ء) : اس مہم کا مقصد قریش کی تجارتی ناکہ بندی توڑنے کی کوشش کو ناکام بنانا تھا۔ اس کے قائد حضرت زید بن حارثہؓ تھے۔

مسلمانوں نے جو ستر کے قریب تھے، قریش کے قافلے والوں کو گرفتار کر لیا۔ ان میں آپؐ کے داماد حضرت ابو العاصؓ بھی تھے، جن کو حضرت زینبؓ نے پناہ دے دی اور آپؐ نے رہا کر دیا۔

(۹) مُہم یا سریۂ وادی القُریٰ (رجب ۶ھ / نومبر، دسمبر ۶۲۷ء) : بارہ مجاہدین کی اس جماعت کے قائد حضرت زید بن حارثہؓ تھے۔ بنی فزارہ نے وادی القُریٰ میں اچانک اس جماعت پر حملہ کر کے نو کو شہید اور ایک کو گھائل کر دیا۔

(۱۰) مُہم یا سریۂ دومۃُ الجندل (شعبان ۶ھ / جنوری ۶۲۸ء) : اس مہم کا ایک بنیادی مقصد دومۃُ الجندل کے عیسائیوں کو دعوتِ اسلام دینا تھا۔ اس مہم کے قائد حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ تھے۔ ان کے ہمراہ سات سو مجاہدین تھے۔ تین دن کی تبلیغی سرگرمیوں کے بعد دومۃ الجندل کے عیسائی رئیس اصبغ بن عمر نے اپنے بہت سے آدمیوں کے ساتھ اسلام قبول کر لیا۔ آپؐ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو اس عیسائی قبیلے سے رشتۂ صہر قائم کرنے کی ہدایت کی تھی، چنانچہ انھوں نے رئیسِ قبیلہ کی صاحبزادی تُماضر سے نکاح کر لیا، اور یہ مہم بڑی کامیاب رہی۔

(۱۱) مہم یا سریۂ فدک (شعبان ۶ھ / جنوری ۶۲۸ء) بنی سعد بن بکر نے یہود کی مدد کے لیے فدک کے قریب ایک لشکر جمع کیا، جس کی اطلاع بروقت آپؐ کو مل گئی۔ آپؐ نے ان کے خلاف فوراً ایک مہم بھیجی جو دو سو مجاہدین پر مشتمل تھی، اور ان کے قائد حضرت علیؓ تھے۔ حضرت علیؓ نے اس تیزی سے ان کو جا لیا کہ وہ اس غیر متوقع اور اچانک حملے سے حواس باختہ ہو کر بھاگ اُٹھے۔

(۱۲) مُہم بنی فزارہ یا سریۂ اُمِّ قِرفہ (رمضان المبارک ۶ھ / جنوری، فروری ۶۲۸ء) : اُمِّ قِرفہ بنو فزارہ کی سردار تھی۔ یہ مہم بنی فزارہ کی سرکوبی کے لیے بھیجی گئی تھی، جنھوں نے زید بن حارثہؓ پر حملہ کر کے ان کا مال چھین لیا تھا اور انھیں زخمی کر دیا تھا۔ یہ مہم کامیاب رہی۔

(۱۳) مُہم یا سریۂ عبدُاللہ بن رواحہؓ (شوال ۶ھ / مارچ ۶۲۸ء) : آپؐ کو اطلاع ملی کہ یہود کا سردار اُسیر بن رِزام مسلمانوں کے خلاف جنگی تیاریاں کر رہا ہے اور اس نے بنی غطفان اور

دیگر قبائل کو اپنا حلیف بنا لیا ہے۔ آپؐ نے حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کو تیس مجاہدین کے ساتھ اُسیر بن رِزام کے پاس بھیجا کہ اسے اس معاملے پر گفتگو کرنے کے لیے مدینے لے آئیں۔ اُسیر بن رِزام بھی تیس آدمیوں کو لے کر حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کے ساتھ مدینے روانہ ہوا، لیکن راستے میں یہود نے غداری کی اور مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ خوب لڑائی ہوئی جس میں ایک کے سوا تمام یہودی کیفرِ کردار کو پہنچ گئے۔

(۱۴) مُہم یا سریۂ کرز بن جابر الفہریؓ (شوال ۶ھ / مارچ ۶۲۸ء) : عُکل اور عُرینہ کے قبائل کی ایک جماعت نے مدینے میں آکر اسلام قبول کر لیا اور مدینے سے باہر حکومت کی چراگاہ میں رہنے لگے۔ ایک دن موقع پا کر انھوں نے ایک چرواہے کو قتل کر دیا، اس کا مُثلہ کیا اور سرکاری اونٹ بھگا کر لے گئے۔ اطلاع ملتے ہی آپؐ نے حضرت کرز بن جابر الفہریؓ کو بیس مجاہدین دے کر ان کے تعاقب میں بھیجا۔ مرتدین راستہ بھول گئے اور گرفتار کر لیے گئے۔ انھیں مدینے میں لا کر چرواہے کے قتل اور ارتداد کے جرم میں قتل کر دیا گیا۔[۲۱]

بیتُ اللہ کی بدولت مکّہ معظمہ اور قریش، دونوں کو عرب میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ آپؐ کو علم تھا کہ جب تک قریش مغلوب اور مکّہ فتح نہیں ہوتا، اسلام کے خلاف دشمنی کی آگ سرد نہیں پڑ سکتی۔ چنانچہ اب آپؐ کی توجہ کا مرکز مکّہ معظمہ بن گیا۔ جیسا کہ ہم معلوم کر چکے ہیں، آپؐ کا طویل المیعاد منصوبہ یہ تھا کہ سرد جنگ کے ذریعے قریش کو نفسیاتی طور پر شکست خوردہ بنا دیا جائے تاکہ موقع آنے پر وہ مؤثر مزاحمت نہ کر سکیں، اور خون خرابے کے بغیر مکّہ فتح اور ان کے قلوب مسخر ہو جائیں۔ جنگِ احزاب میں قریش کی ناکامی نے انھیں بے دل و پست ہمّت کر دیا تھا۔ پھر جنگی مصارف اور تجارتی ناکہ بندی کی وجہ سے ان کی معیشت بُری طرح متاثر ہوئی تھی۔ آپؐ اس صورتِ حال سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے۔ چنانچہ آپؐ نے اپنے اس منصوبے پر رازدارانہ طریقے سے عمل کرنا شروع کر دیا۔

آپؐ مکّے کی طرف مختلف راستوں سے مسلسل قراولی اور طلایہ کی مُہمّیں بھجوانے لگے، اور ان راستوں اور ان کے "عسکری ماحول" کی معلومات باقاعدگی سے حاصل کرتے رہے۔ اس طرح آپؐ کو قطعی طور پر معلوم ہو گیا کہ مکّے پر لشکر کشی کی صورت میں اسلامی لشکر کو کون سے راستے اختیار کرنے ہوں گے۔ عسکری ماحول سے ان راستوں کے جغرافیائی اور جنگی خصائص مُراد ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ آپؐ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ کون سے راستے آباد ہیں

اور کون سے غیر آباد؟ ان کے دونوں طرف کون کون سے قبائل آباد ہیں، اور ان کا اتحاد یا حلف کس کس قبیلے سے ہے؟ ان میں دشمن کون سے ہیں اور ان کی جنگی قوت کتنی ہے اور اسلامی لشکر کے گزرتے وقت ان کا طرزِ عمل کیا ہو گا؟ نیز راستے میں کہاں کہاں پانی دستیاب ہے؟ ان معلومات کی بنا پر آپؐ نے فتحِ مکّہ کے وقت ایسی غیر مانوس راہیں اختیار کی تھیں کہ قریش کو اسلامی لشکر کی پیش قدمی کی اطّلاع اس وقت ملی جب وہ ان کے سر پر پہنچ چکے تھے۔

فتحِ عظیم یا معاہدۂ حُدیبیہ (یکم ذیقعد ۶ھ / ۱۳ر مارچ ۶۶۲۸):

وقت گزرتا گیا۔ آپؐ کی مجاہدانہ سرگرمیاں بڑھتی گئیں، قبائل مرعوب و مطیع ہوتے گئے اور فتحِ مکّہ کی راہ بڑی تیزی سے ہموار ہونے لگی۔

مملکتِ مدینہ اب سارے عرب میں مضبوط ترین قوت تھی۔ اس کے مقابلے میں ریاستِ مکّہ کی حیثیت سیاسی و فوجی لحاظ سے ثانوی ہو چکی تھی ——— زمانے کی نگاہوں کا مرکز اب مدنی مملکت تھی۔ عرب میں اب کوئی قبیلہ ایسا نہ تھا جو مدینے پر چڑھائی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ قریش بے شک بڑے شجاع اور طاقتور تھے، لیکن اپنے مشرکانہ و مردہ اعتقادات کی وجہ سے ایک مُردہ قوم تھے، اور ان کا کوئی نصب العین بھی نہ تھا۔ مسلمانوں کے مقابلے میں ان کی ناکامیوں کا ایک بنیادی سبب یہ تھا کہ ان کی جنگ باطل اور بے مقصد تھی۔ جنگِ احزاب کی زبردست ناکامی سے بھی انھوں نے کوئی سبق نہ سیکھا، اور نہ اپنی ناکامی کی وجوہ معلوم کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش ہی کی۔ اقتصادی بدحالی کی وجہ سے انھوں نے نہ تو اپنی عسکری طاقت کو مضبوط کیا اور نہ سیاسی وقار کو بحال کرنے کے لیے کوئی ٹھوس اقدام کیے۔ وہ مسلمانوں کی جُرأت و شجاعت کے کارنامے اور غیر مسلم قبائل کی مرعوبیت و شکست کے احوال سُنتے، لیکن انھیں عبرت نہ ہوتی تھی۔ انھیں اب بھی یہ زعم تھا کہ مسلمان مکّے پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے اور اگر اُنھوں نے جُرأت کی تو وہ ان کے ہاتھوں بچ کر واپس نہیں جا سکیں گے، لہٰذا وہ نشاطِ غفلت میں پڑے رہے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے سامنے زندگی کا ایک واضح مقصد اور ان کی تحریکِ اسلام کا ایک صاف نصب العین تھا۔ چنانچہ وہ اپنی اخلاقی، معاشی، سیاسی اور عسکری قوت میں مسلسل اضافہ کرتے رہے اور ان کی ثقافتی زندگی روز بروز ترقی کرتی اور قابلِ رشک بنتی گئی۔

آپؐ کی یہ آرزو تھی کہ سارے عرب میں جلد سے جلد دینی انقلاب لایا جائے، تاکہ عرب

کی مجتمع قوت کے ذریعے دُوسرے ممالک میں بھی اسلام کی تحریکِ رحمۃٌ للعالمینی کو مقبول بنا کر انقلاب لایا جا سکے۔ یہ آرزو فتحِ مکّہ کے بغیر پوری نہیں ہو سکتی تھی، لہٰذا آپؐ نے اپنی توجّہ مکّے پر مرتکز کر دی اور اس کی فتح کا جو منصوبہ بنایا تھا، اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ٹھوس، مؤثّر اور مدبّرانہ اِقدام کرنے کا فیصلہ کیا، لیکن اس فیصلے سے کسی کو آگاہ نہ کیا اور نہ اس معاملے میں کسی کو اپنا ہمراز ہی بنایا۔ ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم اجتماعی نفسیات کے عظیم ترین عالم تھے۔ آپؐ کی ایک نظر اگر کسی قوم کے احوال و ظروف پر ہوتی تو دوسری نظر ان کے دلوں پر ہوتی تھی، علاوہ بریں بروقت و برمحل اور موزوں اِقدام کرنا، آپؐ کی سُنّتِ حسنہ تھی۔

چنانچہ عمرے کا موسم آیا تو آپؐ نے صحابۂ کرامؓ کے ساتھ عمرے کا ارادہ کیا۔ یکم ذیقعد ۵ ہجری کو آپؐ نے چودہ سو مسلمانوں کے ساتھ مدینے میں احرام باندھا، قربانی کے جانور ساتھ لیے اور قریب قریب غیر مسلح حالت میں مکّے کی طرف کُوچ کیا۔ آپؐ چونکہ قریش کے حملے کے امکان کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے، لہٰذا مصلحتاً تھوڑی دُور جانے کے بعد آپؐ نے فوجی مخزن منگوا لیا، اور غیر مانوس راستے سے پیش قدمی کی تاکہ اہلِ مکّہ کو پہلے سے پتا نہ چلے۔ حسبِ عادت آپؐ نے قریش کے تجسّسِ احوال کے لیے آگے جاسُوس بھیج دیے تھے۔ ذیقعدہ عرب میں امن و سلامتی اور حُرمت کے مہینوں میں سے تھا، جن میں دوست و دشمن تمام قبائل اور اقوام کو عمرہ و حج کرنے کی عام اجازت تھی اور اس میں جنگ و قتال اور غارت گری حرام و ممنوع تھی۔ عرب کی اس روایت کے پیشِ نظر آپؐ نے احرام کی حالت میں اپنے جانی دشمن قبائل کے شہر میں جانے کا جُرأت مندانہ قدم اُٹھایا تھا۔

قریش کو مسلمانوں کی آمد کی اطّلاع ملی تو وہ ششدر رہ گئے اور مرعوب بھی ہوئے۔ کسی کو عمرے سے روکنا عرب کی روایت کے خلاف اور قریش کے لیے باعثِ بدنامی تھا، لیکن ایک بھاری جمعیّت کے ساتھ آپؐ کا مکّے کی طرف بے خوف و خطر کوچ کرنا ان کے لیے بدر کی شکست اور جنگِ احزاب کی ناکامی سے بھی زیادہ ذِلّت آمیز تھا۔ پھر وہ مسلمانوں کی قوّت سے خوف زدہ بھی تھے۔ آپؐ نے ان کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا، جس سے وہ بلبلا اُٹھے، اور انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ مسلمانوں کو کسی قیمت پر مکّے میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے خالد بن ولید کو دو سو سواروں کے دستے کا سالار بنا کر بھیجا اور خود بڑے حملے کی تیاری کرنے لگے۔

قریش کی اطلاعات آپؐ کو برابر ملتی رہتی تھیں۔ خالد بن ولید کی آمد کی اطلاع ملی تو تصادم سے بچنے کی خاطر آپؐ نے دوسری راہ اختیار کی، اور تیزی سے حُدیبیہ کے مقام پر پہنچ گئے، جو دُشمن کے حملے کی صورت میں دفاع کے لیے موزوں جگہ تھی۔ حُدیبیہ مکّہ معظّمہ سے صرف دس بارہ میل دُور ہے اور یہاں سے حدودِ حرم کا، نیز دُشوار گزار وادیوں اور پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ فوجی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کے اس طرح قریش کے سر پر پہنچ جانے سے انھیں قریش پر فوقیت حاصل ہوگئی تھی، لیکن آپؐ قریش سے تصادم کے لیے نہیں آئے تھے۔ پھر آپؐ کو حرمت کے مہینے کا پاس و احترام بھی تھا اور عرب کی اس مقدّس و اہم روایت کو توڑنا بھی گوارا نہ تھا، لہٰذا آپؐ نے بڑی تیزی، جُراَت اور حُسنِ تدبّر سے قریش کو مذاکرات پر رضامند کر لیا۔ فوری جنگ کا خطرہ ٹل گیا اور بساطِ سیاست پر قریش مات کھا گئے۔ یہ مات ان کی شکست کا پیش خیمہ تھی۔ تحریکِ اسلام کے نقطۂ نظر سے قریش کو مذاکرات پر آمادہ کر لینا مسلمانوں کی عظیم فتح تھی جو در اصل اس تحریک کی آئندہ عظیم کامیابی کا فتح باب تھی۔

بیعتِ رضوان : اس واقعے کی مختصر رُوداد یہ ہے کہ آپؐ نے قریش سے سفارتی سطح پر باقاعدہ گفت و شنید کرنے کے لیے حضرت عثمانؓ کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ مکّہ معظّمہ میں ان دِنوں عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ نظم و ضبط کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قریش کا سردارِ اعظم تجارت کی غرض سے چُھپ چُھپا کر شام گیا ہوا تھا، لہٰذا حضرت عثمانؓ کو اپنے سفارتی مشن کی تکمیل کے لیے ناچار وہاں ضرورت سے زیادہ رُکنا پڑا، جسے مؤرخین اور اربابِ سیرت نے نظر بندی سے تعبیر کیا ہے۔ اس سے مسلمانوں کو لازمی طور سے تشویش ہونی تھی اور ہوئی۔ اس تشویش کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ قریش اور ان کے حلیف قبائل جو مسلمانوں کے مقابل چھاؤنی ڈالے ہوئے تھے، ان کے شرارت پسند عناصر کی شرارتیں اور اشتعال انگیزیاں بڑھتی جاتی تھیں۔ کشیدگی بڑھتے بڑھتے بہت زیادہ بڑھ گئی، لیکن آپؐ کے غیر معمولی صبر و تحمّل اور حُسنِ تدبّر نے بات تصادم تک نہ بڑھنے دی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ تصادم ہرگز آپؐ کا مقصود نہ تھا، کیونکہ آپؐ تحریکِ اسلام کے وسیع ترین مفادات کی خاطر سرد جنگ کے ذریعے قریش کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرنا چاہتے تھے۔ آپؐ کے مصالحانہ طرزِ عمل کے باوجود حالات روز بروز غیر یقینی اور مخدوش ہوتے چلے گئے۔ اس اثنا میں یہ افواہ آندھی کی طرح اُڑی اور مسلمانوں کے لیے غبارِ خاطر

بن گئی کہ حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا گیا ہے۔ آپؐ نے صورتِ حال کی نزاکت کے پیشِ نظر، حفظِ ماتقدّم کے طور پر، مجاہدین سے جو محض عمرے کی نیّت سے آئے تھے، جنگ کی صورت میں آخری دم تک لڑنے اور شکست قبول نہ کرنے پر بیعت لی۔ یہ بیعت آپؐ نے ایک درخت کے نیچے سارے مجاہدین سے لی، اور حضرت عثمانؓ کی طرف سے خود اپنا دستِ مُبارک اپنے دوسرے دستِ مُبارک پر رکھا۔ اسے بیعتِ رضوان کہتے ہیں۔ اس بیعت کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کیا ہے:

"(اے پیغمبر!) جو لوگ تم سے بیعت کر رہے تھے، ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا۔ اب جو اس عہد کو توڑے گا، اس کی عہد شکنی کا وبال اس کی اپنی ہی ذات پر ہوگا۔ اور جو اس عہد کو وفا کرے گا، جو اس نے اللہ سے کیا ہے، اللہ عنقریب اس کو بڑا اجر عطا فرمائے گا۔[۳۳]

بیعتِ رضوان کے بعد آپؐ نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کیلیے تیزی سے جنگ کی تیّاریاں شروع کر دیں اور مجاہدین کو ہتھیاروں سے پُوری طرح لیس کر دیا اور انھیں چوکنّا اور تیّار رہنے کا حکم دے دیا۔ کچھ تو حضرت عثمانؓ کی سفارتی کوششوں سے اور کچھ بیعتِ رضوان کی خبر اور مجاہدین کی جنگی تیاریوں سے قریش گھبرا اُٹھے۔ وہ جنگِ خندق کی ناکامی کے بعد اب اپنے ہی گھر میں ایک اور جنگ کا خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہ تھے۔ صورتِ حال کی سنگینی کے پیشِ نظر قریش نے مذاکرات کے ذریعے جنگ کو ٹالنے کا فیصلہ کیا اور اپنے سفیر آپؐ کی خدمت میں بھیجنے شروع کیے۔ سفارتی سطح پر یہ آپؐ کی پہلی کامیابی تھی۔ آخر میں قریش نے عرب کے مشہور شعلہ بیان خطیب سُہیل بن عَمرو کو مختارِ کُل بنا کر بھیجا۔ اس نے قریش کی طرف سے باقاعدہ صلح کی شرائط پیش کیں، جو بادی النظر میں مسلمانوں کے وقار اور مفادات کے منافی تھیں، لیکن درحقیقت وہ ایسی نہ تھیں، بلکہ ان میں مشرکین کی شکست و ناکامی اور مسلمانوں کی فتح اور تحریکِ اسلام کی کامیابی کے عوامل مضمر تھے۔ آپؐ کی نظر مضمرات پر تھی، لہٰذا آپؐ نے شرائط منظور کر لیں، لیکن بعض صحابۂ کرامؓ کی نظر الفاظ پر تھی اور مضمرات ان کی نظروں سے اوجھل تھے، اس لیے ان کے لیے یہ شرائط قابلِ قبول نہ تھیں۔ بہر حال آپؐ نے معاہدے کو ضبطِ تحریر میں لانے کے لیے حضرت علیؓ کو مقرّر کیا اور فرمایا: لکھو، بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ لیکن سُہیل نے اس پر اعتراض کیا اور اپنی روایات کے مُطابق بِاسْمِکَ اَللّٰھُمَّ لکھوایا۔ اسی طرح اس نے "رسول اللہؐ" کے لفظ پر اعتراض کیا اور معاہدے پر محمد بن عبداللہ لکھوایا۔ یہ بات بھی مسلمانوں

کو سخت ناگوار گزری۔ معاہدے کا اُردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے :

معاہدۂ حُدیبیہ :

(۱) تیرے نام سے اے اللہ !

(۲) یہ وہ مُعاہدہ ہے جو محمدؐ بن عبداللہ اور سُہیل بن عَمرو میں طے ہوا۔

(۳) دونوں نے اس بات پر صُلح کرلی ہے کہ جنگ دس برس تک روک لی جائے، جس دوران میں لوگ امن سے رہیں اور ایک دوسرے سے رُکے رہیں۔

(۴) یہ کہ محمدؐ کے ساتھیوں میں سے جو حج یا عمرے یا تجارت کے لیے مکّے آئے تو اس کی جان و مال کو امان ہوگا اور قریش کا جو شخص تجارت کے لیے مصر یا شام (بروایت ابو عُبیدہؒ عراق یا شام) جاتے ہوئے مدینے سے گزرے تو اسے جان و مال کا امان حاصل ہوگا۔

(۵) یہ کہ قریش کا جو شخص اپنے ولی کی اجازت کے بغیر محمدؐ کے پاس آئے گا، تو آپؐ اُسے ان کے سپرد کردیں گے، لیکن محمدؐ کے ساتھیوں میں سے جو شخص قریش کے پاس جائے گا، وہ اُسے آپؐ کے حوالے نہیں کریں گے۔

(۶) یہ کہ ہم میں باہم سینے ہر طرح بند رہیں گے (جس میں باہر سے کوئی غدّاری داخل نہ ہوسکے گی) اور نہ تو خُفیہ کسی دوسرے کو مدد دی جائے گی، نہ علانیہ خلافِ عہد دغا کریں گے۔

(۷) یہ کہ جو محمدؐ کے معاہدے اور ذمّے داری میں داخل ہونا چاہتا ہے، وہ بھی ایسا کرسکے گا۔ اسی طرح جو قریش کے معاہدے اور ذمّے داری میں داخل ہونا چاہتا ہے، وہ بھی ایسا کرسکے گا۔

(۸) یہ کہ تم اس سال ہمارے یہاں سے واپس چلے جاؤ گے، اور ہمارے ہاں مکّے میں نہیں آؤ گے۔ البتّہ اگلے سال ہم باہر چلے جائیں گے اور تم اور تمھارے ساتھی وہاں (مکّے میں) داخل ہوکر تین راتیں ٹھہر سکیں گے۔ تمھارے ساتھ سوار کا ہتھیار ہوگا، یعنی تلوار میان میں ہوگی۔ اس کے سوا کوئی اور ہتھیار تم لے کر نہیں آؤ گے۔

(۹) یہ کہ قربانی کے جانور وہیں رہیں گے، جہاں ہم نے ان کو پایا (یعنی حدیبیہ میں) اور ان کو ذبح کردیا جائے گا اور ان کو ہمارے پاس (مکّہ قربانی کے لیے) نہیں لایا جائے گا،

اور صراحت کی جاتی ہے کہ ہمارے اور تمھارے حقوق اور واجبات برابر کے ہوں گے۔

گواہانِ اسلام : حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عُمر فارُوقؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت عبداللہ بن سُہیل بن عَمروؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت محمُود بن مسلمہؓ، حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ وغیرہ۔

گواہانِ قریش : مکرز بن حفص وغیرہ۔ کاتب : حضرت علی بن ابی طالبؓ[۲۳]

صُلحِ حدیبیہ تاریخِ اسلام کے اہم ترین واقعات میں سے ہے۔ اس سے تحریکِ اسلام کی تاریخ کا درخشندہ باب شروع ہوتا ہے۔ اس نے سارے عرب میں اسلام کے ثقافتی انقلاب کے لیے زمین ہموار کردی، اسی لیے قرآنِ مجید نے صُلحِ حدیبیہ کو "فتحِ مُبین" سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے بعض اہم نتائج وعواقب کی طرف مجمل اشارے کیے جاتے ہیں : قریش جواب تک مسلمانوں کو مفرور و رذیل افراد سمجھتے تھے، اور ان کے علیحدہ قومی تشخص اور آزاد حیثیت کو تسلیم نہیں کرتے تھے، اس معاہدے کی رُو سے انھوں نے نہ صرف یہ سب کچھ، بلکہ مدینے کی اسلامی ریاست کو بھی تسلیم کرلیا۔ یہ دونوں باتیں وہ تھیں جن کا قریش تصور بھی نہیں کرسکتے تھے، لہٰذا یہ ان کی زبردست ذہنی اور سیاسی شکست تھی اور یہی آپؐ کا مطمحِ نظر بھی تھا۔ ان کی یہ شکست خوردہ ذہنیت ہی تھی، جس کی وجہ سے انھوں نے بالآخر بغیر مزاحمت کے مکّے کو مسلمانوں کے حوالے کردیا اور شکست قبول کرلی۔

قریش کے سامنے کوئی نصبُ العین نہ تھا، لہٰذا صُلح کے بعد مسلمانوں کی دُشمنی و مخالفت کا جذبہ سرد پڑا تو وہ مُردہ اقوام کی طرح نشاطِ غفلت میں مست ہوگئے۔ اس کے برعکس مسلمان ایک زندہ و بیدار قوم تھے اور ان کے سامنے ایک واضح نصبُ العین تھا، یعنی تحریکِ اسلام کے ذریعے ایک عالم گیر ثقافتی یا دینی انقلاب لانا، لہٰذا انھوں نے سچّے، سرگرم اور جانفروش انقلاب پسند مجاہدوں کی طرح اسلام کی تحریکِ انقلاب کو جاری رکھا، اور اس صُلح کی بدولت انھیں بے خوف و خطر ہوکر عرب کے گوشے گوشے میں اسلام پھیلانے کا موقع مل گیا۔ آپؐ چونکہ تمام اقوامِ عالم کے لیے رحمۃٌ للعالمین بن کر مبعوث ہوئے تھے، اس لیے آپؐ نے قریش سے فراغت پاتے ہی دوسرے ممالک کی طرف توجّہ فرمائی اور ان کے حُکمرانوں کو دعوتِ اسلام دی۔ اس طرح آپؐ نے باہر کی دُنیا کو اسلام سے روشناس کرانے کی کوششوں کا آغاز کیا۔

اس صُلح کی بدولت جہاں مُسلمانوں کے دِلوں میں خود اعتمادی اور حوصلوں میں توانائی

بدرجۂ اتم پیدا ہوئی، وہاں یہود و نصاریٰ اور ان کے حلیف بُت پرست قبائل کی ہمتیں پست ہوگئیں اور ان کے دلوں میں مسلمانوں کا رُعب بیٹھ گیا، اور مسلمانوں کو آسانی سے انھیں مغلوب کرنے کا موقع مل گیا۔

قریش کے سرداروں اور مذہبی پیشواؤں نے اہلِ مکّہ اور بدویوں کو اسلام، بانیِ اسلام اور مسلمانوں سے بدظن کرنے کی خاطر ان سے بہت سی لغو و بے بنیاد باتیں منسُوب کر رکھی تھیں، معاہدۂ امن و صُلح کی بدولت جب انھیں مدینے جاکر رحمۃٌ لِلعالمین اور مسلمانوں سے گھُل مل کر ملنے اور قرآن مجید سُننے اور سمجھنے کا موقع ملا تو ان کے دِلوں میں اسلام اور بانیِ اسلام سے عقیدت پیدا ہونے لگی اور وہ برضا و رغبت اسلام میں داخل ہونے لگے۔ علاوہ بریں مسلمانوں نے زندگی کے ہر شعبے میں حیرت انگیز ترقّی کی تھی۔ اسے دیکھ کر بھی لوگ مرعوب و متاثر ہوتے تھے، نیز اسلام کی ثقافتی زندگی میں بھی عوام کے لیے بڑی کشِش تھی۔

فوجی نقطۂ نظر سے اس معاہدے کا بنیادی مقصد یہود اور دیگر دُشمن قبائل کو قریش کی اِمداد و حمایت سے محرُوم کر کے ان کی ریشہ دوانیوں اور فتنوں کا استیصال کرنا اور ان سے اسلامی ریاست کو جو مستقل خطرہ لاحق تھا، اسے ہمیشہ کے لیے دُور کرنا تھا۔ چنانچہ قریش سے صُلح ہوتے ہی آپؐ سب سے پہلے خیبر کے یہُود کی طرف متوجّہ ہوئے، جو جنگِ احزاب کے ذمّے دار تھے اور سارے عرب کو مسلمانوں کا استیصال کرنے کی خاطر متّحد کر کے مدینے پر چڑھا لائے تھے۔ اصل یہ ہے کہ جنگِ احزاب کے تھوڑے ہی عرصے بعد قریش کو صُلح کے لیے مجبور کر دینا آپؐ کے تدبّر اور سیاسی حکمتِ عملی کی ایک واضح فتح (فتحِ مُبین) تھی۔ اس اعتبار سے مُعاہدۂ حُدیبیہ آپؐ کے تدبّرِ بے مثال کا ایک مثالی شاہکار تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تحریکِ اسلام کو قریش اور یہُود کے خطرے سے نجات ملتے ہی وہ حیرت انگیز تیزی سے ترقّی کرنے لگی اور تین برس کے اندر اندر سارے جزیرہ نمائے عرب میں پھیل گئی اور اسے مسخّر کر لیا۔ بقول ڈاکٹر محمد حمیدُاللہ :

"مسلمانوں کے لیے سخت ترین نازک زمانے میں حُدیبیہ میں قریش کا اس صُلح پر آمادہ ہو جانا اسلامی سیاستِ خارجہ کی ایک واقعی "فتحِ مُبین" اور "نصرِ عزیز" تھی، جس کے باعث ان کے ہاتھ کھُل گئے اور فوری خطرات سے نجات ملنے پر انھوں نے آزادی کے ساتھ تین ہی سال میں پُرامن ذرائع سے اپنی مملکت کو تقریباً دس گُنا پھیلا کر پورے جزیرہ نمائے عرب کو اپنا مطیع بنا لیا اور وہاں سے رُومی اور ایرانی اثرات کو بالکل خارج کر کے ایک ایسی مستحکم ریاست

قائم کر دی جو پندرہ ہی سال میں تین برّاعظموں پر پھیل گئی اور جو اس سے ٹکرایا، پاش پاش ہو کر رہ گیا اور جس نے سرِ تسلیم خم کیا وہ اسلام کی رنگ و زبان سے بالا قومیّت میں برابری کے حصّے کے ساتھ شریک ہوگیا۔ یہی وہ صُلحِ حُدیبیہ ہے جسے عہدِ نبویؐ کی سیاستِ خارجہ کا شاہکار کہنا چاہیے۔"[۲۴]

قریش نے معاہدۂ حُدیبیہ میں ایک شرط یہ رکھی تھی کہ مکّے کا کوئی مسلمان مدینے میں نہیں رہ سکے گا۔ یہ شرط اکابر صحابہؓ تک کو سخت ناگوار گزری تھی، لیکن آپؐ کی نظر کہ نبیِّ برحق کی نظر تھی، اس کے مضمرات کو تاڑ گئی اور آپؐ نے دیکھ لیا کہ یہ شرط خود قریش کے لیے وبالِ جان اور باعثِ ذِلّت و ناکامی بن جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔

مُعاہدے کی رُو سے چونکہ آپ مکّے کے مسلمانوں کو مدینے میں رہنے کی اجازت نہیں دیتے تھے، اس لیے وہ (سب سے پہلے ابُوبصیرؓ، پھر ابوجندلؓ وغیرہ) فرار ہو کر ساحلِ سمندر کے قریب عیص نامی مقام پر بستے گئے، جس کے قریب سے شام کو جانے والی تجارتی شاہراہ گزرتی تھی۔ قریش نے چونکہ ان مظلوم و بے کس مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا، اس لیے وہ کچھ انتقاماً اور کچھ معاشی حالات سے مجبور ہو کر قریش کے تجارتی قافلوں پر چھاپے مارنے لگے۔ قریش کی بیرُونی تجارت اور معیشت کا انحصار زیادہ تر اس شاہراہ پر تھا۔ وہ پھر خطرے میں پڑ گئی تو قریش سخت پریشان ہوئے اور بے بس ہو کر انھوں نے آپؐ سے لکھ کر درخواست کی کہ معاہدے سے یہ شرط خارج کر دی جائے اور چھاپہ مار مسلمانوں کو مدینے بُلا لیا جائے۔ قریش کی یہ واضح ناکامی اور ذِلّت بھی تھی اور ان کی کمزوری کی ایک دلیل بھی۔ آپؐ نے ان کی درخواست قبول کر لی اور اس طرح ان تمام لوگوں پر مدینے اور اسلام کے دروازے کھول دیے جو ظاہرہ یا خفیہ طور پر مسلمان تھے، یا جو مسلمان ہونے کی طلب و جستجو میں تھے۔[۲۵]

اس بحث سے اس امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم نے معاہدۂ حُدیبیہ کو قبول کیا اور اللہ تعالیٰ نے اسے فتحِ مُبین سے تعبیر کیا ہے :

"(اے نبیؐ!) ہم نے تمھیں فتح دی، صاف و واضح فتح، تاکہ اللہ تمھاری ہر اگلی پچھلی کوتاہی سے درگزر فرمائے اور تم پر اپنی نعمت پُوری کر دے اور تمھیں سیدھے راستے پر چلائے اور تمھاری زبردست مدد کرے۔"[۲۶]

جب سورۃ الفتح نازل ہوئی تو بعض صحابہ کرامؓ نے یہ آیت سُن کر پُوچھا : یارسُول اللہؐ! کیا یہ فتح ہے؟ آپؐ نے فرمایا : ہاں۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے یقیناً یہ فتح ہے۔[27]

صُلحِ حُدیبیہ، جس نے تحریکِ اسلام کو تین برِاعظموں (افریقہ، ایشیا اور یورپ) کی تاریخ کو صحیح سمت میں موڑ دینے اور ان کی ثقافت پر گہرے اثرات مرتّب کرنے کے قابل بنانا تھا، اللہ تعالیٰ کی نظر میں بھی اس قدر اہم تھی کہ اس نے سورۃ الفتح میں بھی کئی مقام پر اس کا ذکر کیا ہے اور ان مجاہدین سے اپنی خوشنودی کا اظہار فرمایا ہے، جنھوں نے اس موقع پر "فتح یا شہادت" کے عہد پر آپؐ سے بیعت کی تھی :

"اللہ مومنوں سے خوش ہوگیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے۔ اسے ان کے دلوں کا حال معلوم تھا، اس لیے اس نے ان پر سکنیت نازل فرمائی، ان کو (انعام میں) قریبی فتح بخشی، اور انھیں بہت سامالِ غنیمت عطا کر دیا، جسے وہ (عنقریب) حاصل کریں گے۔ اللہ زبردست اور حکیم ہے۔ اللہ تم سے بکثرت مالِ غنیمت کا وعدہ کرتا ہے، جنھیں تم حاصل کرو گے۔ فوری طور پر تو یہ فتح اس نے تمھیں عطا کر دی اور لوگوں کے ہاتھ تمھارے خلاف اُٹھنے سے روک دیے تاکہ یہ مومنوں کے لیے ایک نشانی بن جائے اور اللہ سیدھے راستے کی طرف تمھیں ہدایت بخشے۔ اس کے علاوہ وہ دُوسری اور غنیمتوں کا بھی تم سے وعدہ کرتا ہے، جن پر تم ابھی تک قادر نہیں ہوئے ہو، اور اللہ نے ان کو گھیر رکھا ہے۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

"یہ کافر لوگ اگر اس وقت تم سے لڑ گئے ہوتے تو یقیناً پیٹھ پھیر جاتے اور کوئی حامی مددگار نہ پاتے۔ یہ اللہ کی سُنّت ہے جو پہلے سے چلی آرہی ہے اور تم اللہ کی سُنّت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔"[28]

چونکہ اس اہم بیعت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مومنوں سے خُوش ہُوا تھا، اس لیے اسے بیعت الرضوان کہتے ہیں۔ ان آیات میں ایک قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ اس میں قریبی فتح سے مُراد فتح خیبر ہے، نیز اس میں سارے جزیرہ نمائے عرب کی فتح کی بھی پیش گوئی کی گئی ہے۔

مُشرکوں سے مناکحت کی ممانعت : معاہدۂ حُدیبیہ کی رُو سے اہلِ مکّہ اور ان کے مُشرک حلیفوں کے مدینے کے مسلمانوں کے ساتھ میل جول کے راستے کُھل گئے تو اللہ تعالیٰ نے

مسلمان مرد اور عورتوں کو مُشرِک وبت پرست عورتوں اور مردوں سے مناکحت کی ممانعت کردی۔ اس طرح ایک ایسے فتنے کی راہ بند ہوگئی، جس کے ذریعے قریش و یہود کے لیے مسلمانوں کے فوجی راز معلوم کرنے، ان میں پھُوٹ ڈالنے اور بالواسطہ طریقے سے مُشرکانہ عقاید پھیلانے کی راہ ہموار ہوسکتی تھی۔[29]

حضرت اُمّ حبیبہؓ سے نکاح : (ذوالحجۃ ۶ھ/ اپریل۔ مئی ۶۲۸ء) ان کا اصلی نام رملہ اور کنیّت اُمِّ حبیبہؓ تھی۔ وہ قریش کے سردار ابوسفیان کی بیٹی اور مہاجرینِ حبشہ میں سے تھیں۔ حبشہ ہی میں ان کے شوہر عبداللہ بن جحشؓ کا انتقال ہوگیا تھا۔ آپؐ کو ان کے غریب الوطنی میں بیوہ ہوجانے کی اطّلاع ملی تو حکمتِ نبویؐ نے ان کے دُکھوں کا مداوا یہ کیا کہ حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے ذریعے ان سے نکاح پڑھوالیا۔ مہر کی رقم جو چار سو دینار تھی، آپؐ کی طرف سے خود نجاشی نے ادا کی، اور حضرت اُمِّ حبیبہؓ کو بڑے احترام کے ساتھ آپؐ کے قاصد حضرت عمرو بن امیہ ضمریؓ کے ہمراہ مدینے روانہ کردیا۔ سیاسی نقطۂ نظر سے اس نکاح سے مقصود قریش کے سردارِ اعظم ابُوسفیان سے رشتۂ صہر قائم کرکے ان سے دوستی کی راہ ہموار کرنا تھی۔ اُمّ المؤمنینؓ کا انتقال ۴۴ ہجری میں ہوا۔[30]

صُلحِ حُدیبیہ کے بعد اس سال کا اہم ترین واقعہ حضرت خالدبن ولیدؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ کا ایمان لانا اور تحریکِ اسلام میں شامل ہونا ہے۔ اسلام کی یہ دو عظیم شخصیتیں بلاشبہ دُنیا کے عظیم ترین سپہ سالاروں اور فاتحین میں سے ہیں۔ ان میں سے حضرت خالدبن ولیدؓ، جن کو آپؐ نے "سیفُ اللہ" کا لقب عطا کیا تھا، فاتح شام اور حضرت عمرو بن العاصؓ فاتح مصر[31] ہیں۔ فلپ حتّی نے ان دو عظیم جرنیلوں کی عسکری مہموں کو ہنی بال، سکندر اور نپولین کی عسکری مُہموں سے افضل قرار دیا ہے۔[32]

حواشی وتشریحات

(۱) Generalissimo

(۲) طبقاتِ ابنِ سعد' ۲ : ۴۷ (طبع اوّل)۔

(۳) صحیح بخاری' کتاب المغازی' باب ۴۹۷' غزوۃ الخندق۔

(۴) مولانا شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ خندق بیس دنوں میں مکمل ہوئی تھی۔ (سیرۃ النبیؐ ۱ : ۴۲۱)۔ لیکن یہ درست نہیں۔ دیکھیے محمد حمیدُاللہ : رسُولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی ، ص ۱۳۷۔

(۵) طبقاتِ ابن سعد' ۲ : ۴۷۔

(۶) سیرۃ ابن ہشام' (اردو)' ۲ : ۲۴۶' ۲۴۷ ببعد۔

(۷) طبری' ۳ : ۱۴۷۴' سیرۃ ابن ہشام (اردو)' ۲ : ۲۴۲' ۲۴۳۔

(۸) الاحزاب' ۳۳ : ۹ تا ۱۵۔

(۹) سیرۃ ابن ہشام (اردو)' ۲ : ۲۴۹ تا ۲۵۱۔

(۱۰) وہی کتاب' ۲ : ۲۵۲ ببعد۔

(۱۱) بخاری' کتاب المغازی' باب ۴۹۷' غزوۃ الخندق۔

(۱۲) الاحزاب' ۳۳ : ۹۔

(۱۳) الاحزاب' ۳۳ : ۲۶-۲۷۔

(۱۴) غزوۃ الخندق کے مآخذ مندرجہ ذیل ہیں :

(۱) قرآن مجید' سورۃ الاحزاب' (۲) بخاری' کتاب المغازی' (۳) طبریؒ ۳ : ۱۴۷۴ تا ۱۴۸۰ ببعد۔ (۴) ابن قیّم : زاد المعاد (اُردُو)' ۲ : ۲۰۹ تا ۲۱۲۔ (۵) سیرۃ ابن ہشام' ۲ : ۲۳۲ تا ۳۰۸ (اُردو)۔ (۶) طبقاتِ ابنِ سعد' ۲ : ۴۷ تا ۵۵ ببعد۔ (۷) ابنِ کثیر ۴ : ۱۱۲ تا ۱۱۶ ببعد' (۸) زرقانی' ۲ : ۱۲۱ تا ۱۳۸۔ (۹) مسعُودی' التنبیہ والاشراف'

ص ۲۴۸' (۱۰) ابن عبدالبر: استیعاب' سوانح عمری ۲۷۸' (۱۱) سرخسی' مبسُوط' ۱۰ : ۹۱ ببعد' (۱۲) شبلی' سیرۃ النبیؐ' ۱ : ۴۱۹ تا ۴۳۹۔ (۱۳) محمد حمیداللہ : رسُولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی' ۱۸۸' ۱۱۹' ۱۳۴' ۱۳۷ ببعد۔

(۱۵) Featur es.

(۱۶) ابن قیّم : زاد المعاد' ۲ : ۲۱۳ ببعد' سیرۃ ابن ہشام' ص ۹۹۷' ۹۹۸' ابن عبدالبر : استیعاب' سوانح عمری' عدد ۲۷۸۔

(۱۷) سرخسی' مبسُوط' ۱۰ : ۹۱' ۹۲' شرح السیر الکبیر سرخسی' ۱ : ۶۹' ۷۰۔

(۱۸) ابن ہشام (اُردو) ۲ : ۳۱۶۔

(۱۹) وہی کتاب' ۲ : ۳۱۷ تا ۳۲۲ ببعد۔

(۲۰) شبلی' سیرۃ النبیؐ' ۱ : ۴۷۹۔

(۲۱) ان مہمّوں یا سرایا کے لیے دیکھیے ابنِ قیّم : زاد المعاد' ۲ : ۲۵۴ تا ۳۶۱' محمد حمیداللہ: رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی' ص ۱۲۱' ۲۹۶ ببعد' طبقاتِ ابنِ سعد۔

(۲۲) الفتح ۴۸ : ۱۰

(۲۳) محمد حمیداللہ : الوثائق السیاسیّۃ' مصر ۱۳۶۰ھ' رسولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی' ص ۱۲۶ تا ۱۳۸۔

(۲۴) محمد حمیداللہ : رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی' ص ۱۲۵ تا ۱۲۶۔

(۲۵) صُلحِ حُدیبیہ کے مآخذ: (۱) قرآن مجید' سورۃ الفتح۔ (۲) بخاری' کتاب المغازی' (۳) طبقاتِ ابنِ سعد' ۱ : ۳۸ تا ۴۷ ببعد' ۲ : ۷۰' ۷۱ ببعد' (۴) تاریخ ابنِ کثیر' ۴ : ۱۶۸ تا ۱۶۹۔ (۵) تاریخ ابن الاثیر' ۲ : ۱۵۶' (۶) سیرۃ ابن ہشام' ۳ : ۳۲۰ تا ۳۳۸۔ (۷) تاریخ طبری' ص : ۱۵۴۶' ۱۵۴۷ ببعد۔ (۸) ابن قیّم : زاد المعاد ۲ : ۲۱۵ تا ۲۲۹۔

(۲۶) الفتح ۴۸ : ۱

(۲۷) مسند احمد' ابوداوٗد' ابن جریر۔

(۲۸) الفتح ۴۸ : ۱۸ تا ۲۳۔

(۲۹) الممتحنہ' ۶۰ : ۱۰' ۱۱۔

(۳۰) الخطیب : اکمال فی السّمآء الرّجال، در مشکوٰۃ (اُردو)' ۳ : ۳۴۳۔
(۳۱) کتاب مذکور، ۳ : ۳۴۴، ۳۹۱ تا ۳۹۲۔
(۳۲) فلپ حتّی : تاریخِ عرب (انگریزی)' ص ۱۴۲۔

باب : ۱۶

تحریکِ اسلام کو عالمگیر بنانے کی کوششوں کا آغاز

اور

اسلام کا ثقافتی انقلاب

باب : ۱۶

تحریکِ اسلام کو عالمگیر بنانے کی کوششوں کا آغاز

مسلمانوں کے لیے قریش سے دس سالہ امن کا سمجھوتا ہوجانے کا مطلب ان کی طرف سے ایک مُستقل، قریبی اور حقیقی خطرے کا ٹل جانا اور جزیرہ نمائے عرب کی تسخیر کی راہ ہموار ہو جانا تھا۔ چنانچہ اُدھر سے فراغت ملتے ہی آپؐ نے اپنے رسالتی مشن کی تکمیل یعنی تحریکِ اسلام کو عالمگیر بنانے کی خاطر اسے بیرونی ممالک سے رُوشناس کرانے کی کوششوں کا آغاز کر دیا۔ یہ اہم حقیقت ہمیشہ ہمارے ذہن نشین رہنی چاہیے کہ آپؐ تمام بنی نوع انسان کے لیے پیغمبر اور تمام جہانوں کے لیے رحمت بن کر مبعوث ہوتے تھے۔ یہ زمانہ بادشاہت و شہنشاہیت، سرداری، سرمایہ داری اور جاگیرداری کا تھا، لہٰذا اس عہد کے عوام کا دین دینِ مملوک ہوتا تھا۔ چنانچہ آپؐ نے اپنے وسائل اور حالات و مقتضیات کے مطابق شہنشاہوں اور ان کے حکامِ اعلیٰ کو دعوتِ اسلام دی اور سفیروں کے ذریعے انھیں خطوط بھجوائے۔

غالباً یکم محرّم ۷ ھ / ۱۱ جولائی ۶۲۸ء کا عہد آفریں دن تھا کہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو جمع کیا اور خطبہ فرمایا : "اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام جہانوں کے لیے رحمت اور پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ دیکھو! عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کی طرح اختلاف نہ کرنا۔ اُٹھو اور میری طرف سے پیغامِ حق پہنچاؤ۔" بعد ازاں آپؐ نے ایک ہی دن میں چھ حکمرانوں کے نام دعوتِ اسلام کے خطوط لکھوا کر سفیروں کے ذریعے بھجوائے۔ ان کے نام یہ ہیں :

۱ : حضرت دحیہ بن خلیفہ الکلبیؓ	قیصرِ رُوم
۲ : حضرت عمرو بن اُمیہ الضمریؓ	نجاشی بادشاہِ حبشہ
۳ : حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمیؓ	خسرو پرویز، شہنشاہِ ایران
۴ : حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ	عزیزِ مصر
۵ : حضرت سلیط بن عمرو عامریؓ	روسائے یمامہ
۶ : حضرت شجاع بن وھب الاسدیؓ	حارث غسّانی، رئیسِ حدودِ شام

یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ ان میں سے ہر سفیر اس ملک یا علاقے کی زبان جانتا تھا' جہاں اسے بھیجا گیا تھا۔[1]

پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلّم کے دعوت نامے حکمرانوں کے نام

(۱) ہرقل' قیصرِ روم کے نام :

بسمِ اللهِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمؕ ۔ محمدؐ کی طرف سے جو اللہ کا بندہ اور رسُول ہے، بنام ہرقل "عظیم روم"۔

سلامتی ہے اس پر جو ہدایت کی پیروی کرتا ہے۔ بعدازیں' میں تمھیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ مسلمان ہو جاؤ ، سلامت رہو گے اور اللہ تمھیں دُہرا اجر دے گا۔ اگر تم نے روگردانی کی تو تمھاری جاہل رعایا کا گناہ بھی تم پر ہو گا۔ اے اہلِ کتاب (اختلاف و نزاع کی ساری باتیں چھوڑ کر) اس بات پر آجاؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں طور پر مسلّم ہے' یعنی اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ کسی ہستی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو ربّ (ان داتا۔ خدا) نہ بنائے۔ پھر اگر اس (اصول) سے روگردانی کرو تو گواہ رہنا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار بندے (مسلمان) ہیں۔[2]

مہر اللہ
رسول
محمد

آپؐ کا مکتوبِ گرامی حضرت دحیہ کلبیؓ نے امیرِ بُصریٰ (علاقہ حوران) کی وساطت سے قیصرِ روم ہرقل کو دیا' جو ان دنوں ایران کے کسریٰ کو شکستِ فاش دینے کی خوشی میں بیت المقدس میں سجدۂ شکر ادا کرنے گیا ہوا تھا۔ ہرقل نے خط سُن کر اہلِ دربار سے دریافت کیا کہ مُدّعیِ نبوّت کی قوم کا کوئی شخص اس شہر میں موجود ہو تو اسے حاضر کرو۔ قریشِ مکّہ کی ایک جماعت کو' جو کاروبار کے سلسلے میں وہاں گئی ہوئی تھی' دربار میں پیش کیا گیا۔ ہرقل نے امیرِ جماعت ابوسفیان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے متعلق متعدّد سوال پوچھے۔ ابوسفیان کا بیان ہے کہ اس خوف سے کہ کہیں اپنے ساتھیوں کی موجُودگی میں جھوٹ بول کر بدنام نہ ہو جاؤں' مجھے لامحالہ آپؐ کے متعلق سچ بولنا پڑا۔ ان کے سوال و جواب کا خلاصہ یہ ہے :

"محمدؐ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم) عالی نسب ہیں۔ آپؐ کے خاندان میں نہ تو کوئی بادشاہ گزرا ہے اور نہ کسی نے نبوّت کا دعویٰ کیا ہے۔ دعویٰ نبوّت سے پہلے آپؐ نے کبھی جھُوٹ نہیں بولا۔ آپؐ کی پیروی کمزور لوگ کرتے ہیں' جن کی تعداد گھٹتی نہیں' بڑھتی جاتی ہے۔ جنگ میں کبھی ہم اور کبھی آپؐ غالب رہتے ہیں۔ آپؐ نے کبھی عہد شکنی نہیں کی' لیکن حال ہی میں ہم نے آپؐ سے معاہدہ کیا ہے۔ دیکھیں آپؐ کیا کرتے ہیں۔"[3]

ابوسفیان کے جواب سُن کر ہرقل اس قدر متاثّر ہوا کہ اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا کہ یہ تمام علامتیں سچے نبیؐ کی ہیں۔ اس نے پھر پوچھا "اچھا' یہ بتاؤ کہ آپؐ کس بات کا تم لوگوں کو حکم دیتے ہیں؟" ابوسفیان بولا "نماز' روزہ' صلۂ رحمی اور عفاف کا۔" ہرقل نے کہا "اگر یہ صحیح ہے تو آپؐ بالیقین نبیؐ ہیں۔ ہم یہ تو جانتے تھے کہ ایک نبیؐ کا ظہور ہونے والا ہے' لیکن اس کا علم نہیں تھا کہ اس کا ظہور تم لوگوں میں سے ہو گا۔" اس نے عقیدت کا اظہار بھی کیا' مگر اسلام نہ لایا۔ اصل یہ ہے کہ قوّت و حکومت اور دولت و شہرت کے نشے میں سیاہ مست فرعون' ہامان اور قارون نہ اس طرح ایمان لا سکتے تھے اور نہ لائے۔ لیکن اس دعوت کا فائدہ یہ ہوا کہ تحریکِ اسلام کو دربارِ شاہی میں اپنے اظہار کا اور اہلِ دربار سے اپنے آپ کو متعارف کرانے کا موقع مل گیا۔ یہ معمولی نہیں' تاریخی واقعہ تھا۔ اس کا چرچا ہونا تھا اور خوب ہُوا۔[4] ——— یہ بات معنی خیز ہے کہ ہرقل نے' جو رومۃُ الکبریٰ کا شہنشاہ اور فاتح ایران تھا' کیوں آپؐ کے نامۂ مبارک میں اس قدر دلچسپی اور عقیدت کا اظہار کیا اور پھر جواب میں مندرجۂ ذیل خط لکھا :

قیصرِ رُوم کا جوابی خط :

بحضور احمد رسول اللہؐ' جن کے ظہور کی بشارت عیسیٰؑ نے بھی دی۔ من جانب قیصرِ روم۔

حضوؐر کا فرمان آپؐ کے سفیر کے توسّل سے موصول ہوا۔ میں آپؐ کے رسُولؐ ہونے کا اقرار کرتا ہوں۔ آپؐ کے ظہوُر کی بشارت عیسیٰؑ بن مریم نے بھی انجیل میں دی۔ میں نے اپنی ساری رومی رعیّت کو آپؐ پر ایمان لانے کی دعوت دی' لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ اگر وہ آپؐ پر ایمان لے آتے تو ان کے حق میں بہتر ہوتا۔ حضوؐر! کاش! میں آپؐ کی خدمت میں باریاب ہو سکوں اور آپؐ کے پاؤں دھوؤں۔[5]

(۲) شاہِ فارس کسریٰ پرویز کے نام[7] :

"بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ : محمد رسول اللہ کی طرف سے کسریٰ کے نام، جو فارس کا حکمران ہے۔

سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے، اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے اور گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ (معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود) نہیں۔ وہ ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور محمدؐ اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہے۔ میں تمھیں اللہ کی طرف آنے کی دعوت دیتا ہوں۔ میں جملہ نوعِ انسانی کے لیے اللہ کا رسولؐ ہوں تاکہ جو لوگ "زندہ" ہیں، انھیں بدعملیوں سے ڈرایا جائے اور کافروں پر حجّت قائم ہو۔ اِسلام قبول کرلو، سلامت رہو گے۔ اگر انکار کروگے تو سارے مجوسیوں کا وبال تم پر ہوگا۔"[8]

اللہ
رسول
محمدؐ مہر

حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمیؓ نے یہ نامۂ نبویؐ والیِ بحرین کے توسط سے کسریٰ کو پہنچایا۔ کسریٰ نے یہ خط سُنا تو غصّے سے آگ بگولا ہوگیا اور اسے چاک کرکے پُرزے پُرزے کردیا، لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ خود ہلاک ہوگیا، اور پھر اس کی سلطنت کے پرخچے اُڑ گئے اور حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے مجاہدین کو اس کا وارث بنا دیا گیا۔

آپؐ پیغمبر تھے اس لیے آپؐ کے خط کا اسلوب پیغمبرانہ تھا، اور سرنامے پر پہلے آپؐ کا اور پھر شہنشاہِ ایران کا نام لکھا تھا۔ خسرو پرویز فرعونِ وقت تھا، اس نے اسے اپنی توہین سمجھا اور از حد برافروختہ ہُوا۔ اس نے فوراً والیِ یمن باذان کو حُکم بھجوایا کہ وہ حجاز سے مُدّعیِ نبوّتؐ کو گرفتار کرکے دربار میں حاضر کرے۔ باذان نے اِمتثالِ امر میں بابَویہ اور خرخسرہ نامی دو اہلکاروں کو آپؐ کے پاس بھیجا۔ انھوں نے بارگاہِ رسالتؐ میں پہنچ کر آپؐ کو ایران چلنے کیلیے کہا اور دھمکی دی کہ انکار کی صورت میں شہنشاہِ ایران مدینے کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔ آپؐ پیکرِ حلم و رحمت اور آدابِ سفارت کا پاس کرنے والے تھے۔ ایلچیوں سے صرف یہ فرمایا "تم واپس جاؤ اور کہہ دو کہ اسلامی سلطنت کسریٰ کے پایۂ تخت تک پہنچے گی"۔ ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ جاؤ، کسریٰ ہلاک ہوچکا ہے۔ چنانچہ جب

وہ یمن پہنچے تو اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ خسرو پرویز اپنے بیٹے شیرویہ کے ہاتھوں ہلاک ہوچکا ہے۔[9]

(۳) شاہِ حبش کے نام :

"بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ : از جانب محمد رسول اللہ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) بنام نجاشی اصحم (یا اصحمہ) بادشاہِ حبشہ۔

"سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کی طلب و جستجو رکھتا ہے، واضح ہو کہ میں تمھارے سامنے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرتا ہوں، جس کا کوئی شریک نہیں۔ وہ بادشاہ (الملک) ہے۔ ہر قسم کے نقص سے منزّہ (القدّوس)، خود سلامت (السّلام)، امن دینے والا (المؤمن) اور نگہبان (المہیمن) ہے۔

میں گواہی دیتا ہوں کہ عیسیٰ بن مریمؑ اللہ کی رُوح اور کلمہ ہیں۔ اللہ نے اسے پاکدامن کنواری مریم میں القا کیا، جس سے وہ حاملہ ہوئیں تو اللہ نے عیسیٰؑ کو اپنی رُوح اور نفخ سے پیدا کیا جس طرح آدم کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور میں تم کو اور تمھارے حبش کو اللہ عزّوجلّ کی طرف بُلاتا ہُوں۔ میں نے اللہ کا حُکم پہنچا دیا اور نصیحت کردی۔ تم میری نصیحت قبول کرو، اور سلام اس پر جو اللہ کی ہدایت کی پیروی کرتا ہے۔"[10]

اللہ
رسول
محمدؐ مُہر

اس بات کا یاددہانی کے طور پر اعادہ کیا جاتا ہے کہ عرب اور حبش کے درمیان ایک مُدّت سے تجارتی اور دوستانہ تعلقات تھے۔ چنانچہ جب مکّے میں قریش نے مُسلمانوں کی زندگی اجیرن کردی تھی تو انھوں نے ہجرت کرکے حبشہ ہی میں پناہ لی تھی۔ نجاشی نے مُسلمانوں اور اسلام سے اپنی گہری دلچسپی کا اظہار کیا تھا اور وہ اسلام کے عقاید سے آگاہ ہوگیا تھا۔ چنانچہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا نامۂ مُبارک اسے ملا تو اس نے اس کی بہت تعظیم کی، پھر اسلام اور آپؐ سے اپنی عقیدت کا اس قدر اظہار کیا کہ اس سے مؤرّخین اور اربابِ سیرت نے یہ استنباط کیا کہ نجاشی نے اسلام قبول کرلیا تھا۔[11] بہرحال، آپؐ کے اس غیر معمولی نوعیت کے نامۂ مبارک کا خوب چرچا ہوا اور اس سے تحریکِ اسلام کو حبشہ کے عوام سے روشناس کرانے میں بڑی مدد ملی۔ نجاشی نے آپؐ کی خدمت میں خطوط بھی بھیجے تھے، جو محفوظ ہیں۔ دو خط پیش

کیے جاتے ہیں :

"بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ : بخدمت جناب محمدؐ رسول اللہؐ من جانب اصحم ابن ابجر۔ اے اللہ کے نبیؐ ! میں آپؐ کے حضور سلام اور اللہ تعالیٰ کی رحمت و برکت کا ہدیہ پیش کرتا ہوں۔ اس اللہ کی طرف سے جو تنہا معبُودیت کے لائق ہے اور جس نے مجھے اسلام قبول کرنے کی توفیق فرمائی۔ اے رسول اللہؐ ! یہ جو آپؐ نے عیسیٰؑ کی ولادت کے متعلق تحریر فرمایا ہے، تو خداوندِ ارض و سما کی قسم ! حضرت عیسیٰؑ میں اس سے زیادہ کوئی اور بات نہیں اور آپؐ پر جو قرآن نازل ہوا ہے تو اس کے من جانب اللہ ہونے پر بھی مجھے یقین ہے۔ آپؐ کے عم زاد بھائی اور ان کے رفقا ہمارے ہاں تشریف لے آئے ہیں۔ ہم نے آپؐ کے بھائی کے ہاتھ پر آپؐ کی بیعت کر لی ہے اور خدائے ربّ العالمین کی وحدانیت کا اعتراف کر لیا ہے۔

آپؐ کی خدمت میں اپنے بیٹے اریا ابن اصحم بن ابجر کو بھیج رہا ہوں، لیکن اپنے نفس کے سوا دوسروں کی ذمّے داری لینے سے قاصر ہوں۔ اگر حکم ہو تو میں خود بھی حاضر ہونے کے لیے آمادہ ہوں۔ یا رسول اللہؐ ! جب میں آپؐ کی رسالت پر ایمان لے آیا تو آپؐ کے حکم کی تعمیل کیا مشکل ہے۔ والسّلام علیک یا رسول اللہؐ۔"

"بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ : بخدمت جناب محمدؐ نبی (صلّی اللہ علیہ وسلّم) من جانب نجاشی اصحمہ۔ السّلام علیک یا رسول اللہ من اللہ و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔ بعدازیں،

میں نے آپؐ کے خاندان کی مسلمان بی بی سیّدہ اُمِّ حبیبہؓ بنتِ ابوسفیان کا آپؐ سے نکاح کر دیا ہے اور آپؐ کے لیے مندرجۂ ذیل اشیا ہدیۃً اریحا کے ہمراہ بھیج رہا ہوں۔ ایک قمیص، ایک پاجامہ، ایک ردا اور چرمی موزوں کی ایک جوڑی۔ والسلام علیک و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔"

(۴) والیِ مصر کے نام :

"بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ : محمدؐ کی جانب سے جو اللہ کا بندہ اور رسولؐ ہے۔ مُقَوَّقِس کے نام جو قبط (مصر) کا حکمران ہے۔

سلامتی ہے اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔ بعدازیں میں تم کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام قبول کرو، سلامت رہو گے (یا تم سے کوئی تعرّض نہیں کیا جائے گا)۔ اسلام قبول

کرو، اللہ تمھیں دُہرا اجر دے گا۔ اگر تم نے روگردانی کی تو اہلِ قبط کا وبال تم پر ہو گا۔

اے اہلِ کتاب ! اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے تمھارے درمیان متّفق علیہ ہے: یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں، ہم میں سے بعض بعض کو اللہ کے سوا اپنا ربّ (ان داتا۔ رازق و مالک) نہ بنائیں۔ پھر اگر اس (اصُول) سے رُوگردانی کرو تو گواہ رہنا کہ ہم اللہ کے فرماں بردار بندے (مسلمان) ہیں۔"

مہر
اللہ
رسول
محمدؐ

حضرت ابنِ بلتعہؓ یہ نامۂ مبارک لے کر والیِ مصر مُقَوَّقِس کے دربار میں پہنچے اور اس موقع پر اُنھوں نے اس سے مؤثّر و بلیغ انداز میں خطاب بھی کیا، جس کا مُلخّص یہ ہے :

"مصر میں پہلے بھی ایک ایسا شخص (فرعون) ہو گزرا ہے، جو اپنے آپؐ کو ربِّ اعلیٰ کہتا تھا۔ اس کے انجام سے نصیحت پکڑو۔ ایسا نہ ہو کہ دوسرے تم سے عبرت حاصل کریں۔ میں تمھیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں، جس میں ایک اللہ ہی کافی ہے۔ بلاشُبہ حضرت عیسیٰؑ کی بشارت حضرت محمدؐ کے حق میں ایسی ہی ہے جیسی حضرت موسیٰؑ کی بشارت حضرت عیسیٰؑ کے حق میں۔ میں تم کو قرآن کی طرف بلاتا ہوں، جس طرح تم یہود کو انجیل کی طرف بلاتے رہے۔ تم نے نبیؐ کا زمانہ پایا ہے۔ غور کرو کہ اب تمھیں کیا کرنا چاہیے؟"

مُقَوَّقِس نے جواب دیا : میں نے ان کے متعلق غور کیا ہے۔ وہ کسی بُری بات کا حکم نہیں دیتے اور نہ کسی اچھی بات سے منع ہی کرتے ہیں۔ نیز میں نہ تو انھیں جھوٹا جادوگر اور نہ جھوٹا کاہن ہی سمجھتا ہُوں۔ میں ان میں نبوّت کی علامات بھی محسُوس کرتا ہوں اور مزید غور کروں گا۔

چنانچہ اس نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا نامۂ گرامی تعظیم سے لیا اور اسے ایک قیمتی ڈبّے میں بند کر دیا۔ پھر اس نے عربی لکھنے والے کاتب کو بُلایا اور آپؐ کی خدمت میں مندرجۂ ذیل خط لکھوایا :

"بِسمِ اللہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم : محمدؐ بن عبدُاللہ کے نام، مُقَوَّقِس عظیم قبط کی طرف سے۔ سلام ہو آپؐ پر۔ امّا بعد، میں نے آپؐ کا مکتُوب پڑھا اور اس میں جو کچھ آپؐ نے ذکر کیا ہے اور جس بات کی طرف آپؐ بُلاتے ہیں، اس کو سمجھا۔ مجھے یہ معلُوم ہے کہ ایک نبی باقی ہے، مگر میرا گمان تھا کہ اس کا خروج شام میں ہو گا۔ میں نے آپؐ کے قاصد کی عزّت و تکریم کی

اور آپ ﷺ کے لیے دو کنیزیں بھیجی ہیں، جن کا قبط (مصر کی قوم) میں بلند مقام ہے۔ میں نے آپ ﷺ کے لیے خلعت اور سواری کے لیے ایک خچّر تحفے کے طور پر بھیجے ہیں۔ والسّلام علیک۔"

ان کنیزوں کا نام ماریہ اور سیرین تھا۔ خچّر کو دُلدُل کہتے تھے، جو حضرت معاویہ رضؓ کے عہدِ خلافت تک زندہ رہا۔ مُقَوقِس نے حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضؓ کو خلعت اور ایک سو مثقال سونا دیا۔[۱۳]

مُقَوقِس نے اسلام تو نہ قبول کیا، لیکن اہلِ دربار اور عوام پر یہ حقیقت آشکارا ہو گئی کہ عرب میں نبیِّ مُنتظَر کا ظہور ہو چکا ہے۔ آپ ﷺ کے نامۂ مبارک نے مصر کی سرزمین میں غیر مرئی انداز میں اسلام کا ایسا بیج بویا جس نے دو تین عشروں ہی کے بعد ایک عظیم و بار آور شجر بن کر سارے ملک کو اپنے سائے میں لے لینا تھا۔

(۵) حاکمِ یمامہ ہوذہ کے نام :

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیم : از محمّد رسول اللہ ﷺ بنام ہوذہ بن علی۔

سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔ جان لو کہ میرا دین وہاں تک پھیلے گا، جہاں تک چوپائے اور گھوڑے جا سکتے ہیں۔ اسلام قبول کرو تو سلامت رہو گے (یا تم سے تعرّض نہیں کیا جائے گا) اور جو علاقہ تمھارے ماتحت ہے، اسے تمھارا بنا دیں گے۔[۱۴]

اللہ
رسول
محمّد
مہر

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے قاصد حضرت سلیط بن عمرو عامری رضؓ کو ہوذہ کے دربار میں عزّت و احترام سے لایا اور بٹھایا گیا۔ ہوذہ نے بڑی توجّہ سے نامۂ مبارک کو سُنا اور جواب میں آپ ﷺ کو لکھوایا :

"کتنی اچھی اور حسین بات ہے، جس کی طرف آپ ﷺ ہمیں بُلاتے ہیں۔ عرب میرے رُتبے کی عزّت کرتے ہیں۔ بعض اختیارات مجھے تفویض کیجیے۔ ہم اتّباع کریں گے۔"

ہوذہ نے حضرت سلیط رضؓ کے ذریعے اپنا خط اور تحفے کے طور پر ہجر کا کپڑا آپ ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ آپ ﷺ نے یہ خط سُنا تو فرمایا : "اگر وہ مجھ سے ایک بالشت زمین بھی طلب کرے گا تو میں نہیں دوں گا۔ جو کُچھ اس کے قبضے میں ہے، وہ جانے والا ہے۔"[۱۵] سچّے نبی کی سچّی بات

تھی، سچ ثابت ہوئی۔

(۶) حارث بن شمر غسّانی کے نام :

"بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیم : از محمّد رسول اللہ ﷺ بنام الحارث ابن ابی شمر۔

سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے اور اس پر ایمان لائے اور اس کی تصدیق کرے۔ میں تمھیں اس بات کی دعوت دیتا ہوں کہ اللہ پر ایمان لاؤ، جو ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس طرح تمھارا ملک تمھارے پاس باقی رہے گا۔"[۱۶]

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ان کے علاوہ اور بھی حکمرانوں اور قبائلی سرداروں کو وقتاً فوقتاً تبلیغی خطوط لکھے اور اپنا فریضۂ رسالت احسن و مؤثر طریقے سے ادا کر دیا۔ یاد دہانی کے طور پر اس نکتے پر پھر زور دیا جاتا ہے کہ آپ ﷺ کے ہر کام میں حکمت ہوتی تھی اور حکمت منصوبہ بندی کو چاہتی ہے۔ منصوبہ فوری نوعیت کا بھی ہوتا ہے اور طویل المیعاد بھی۔ آپ ﷺ چونکہ تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے، اس لیے آپ ﷺ کا تبلیغی منصوبہ زمانی و مکانی بھی تھا اور عالمگیر و سرمدی نوعیت کا بھی۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے ان تبلیغی خطوط کے ذریعے بیرونی ممالک میں اسلام کا جو بیج بویا، اسے زود یا بدیر شجرِ طیّبہ بننا اور اپنے ثمرات سے اہلِ دُنیا کو مستفیض کرنا تھا۔ اسلام کے بڑے بڑے ثمرات کیا ہیں ؟ توحید، حسن و نور، حق و صداقت، عدل و اخوّت، امن و سلامتی وغیرہ۔

ہمیں یہ حقیقت کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ آپ ﷺ کے رسالتی یا تبلیغی خطوط تاریخ کی انتہائی اہم و مستند دستاویزات اور رُوحِ اسلام و نبوّت کے آئینہ دار ہیں۔ تاریخ کا یہ ریکارڈ صیہونی و صلیبی مشنریوں کے لیے، جن کا منصب و مقصود اسلام اور پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم سے متعلق مسلمانوں میں بالخصوص اور غیر مسلموں میں بالعموم تشکیک پیدا کرنا ہے، ایک ایسا چیلنج ہے جس کے وہ کبھی حریف نہیں ہو سکتے اور جس نے ان کے ابلیسی پراپیگنڈے کی قلعی کھول دی ہے۔

خیبر : یہود کی فتنہ انگیز قوّت کا استیصال (محرّم ۷ھ/مئی، جون ۶۲۸ء) :

فسق و فجور سے قساوتِ قلبی پیدا ہوتی ہے، جو فرد ہو یا قوم، اسے عاقبت نااندیش بنا

دیتی ہے۔ قساوت دل کی موت ہے اور مُردہ دل میں خیر و حسنہ کے چشمے خشک ہو جاتے اور فسق و فجور اور ظلم و جرم کے سوتے پھوٹ پڑتے ہیں، جو کشتِ حیات کو ویران کر دیتے ہیں۔ یہود کی قساوتِ قلبی نے انھیں عاقبت نااندیش بنا دیا تھا۔ پھر ان کے سینوں میں اسلام اور اسلامی مملکت کے خلاف عداوت و حسد اور انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی، لہٰذا انھوں نے جنگِ احزاب سے بھی کوئی عبرت حاصل نہ کی اور اسلامی مملکت کو نیست و نابود کرنے کے منصوبے بناتے رہے۔ آخرِ کار انھوں نے چھ ہجری کے اواخر میں اپنے ہمسایہ اور حلیف قبیلہ غطفان کو مدینے پر حملہ کرنے پر آمادہ کر لیا اور ان دونوں کی مشترکہ کوششوں سے یثرب کے دوسرے چھوٹے موٹے قبائل بھی مالِ غنیمت کے لالچ میں ان کے اتحاد میں شامل ہو گئے۔

آپ ﷺ یہود کی رگ رگ سے واقف تھے، لہٰذا ان سے نہ تو غافل رہ سکتے تھے اور نہ رہے۔ ان پر آپ ﷺ کی کڑی نظر تھی اور جاسوسوں کے ذریعے ان کے حالات اور منصوبوں کے متعلق آپ ﷺ کو برابر اطلاعات ملتی رہتی تھیں۔ یہود اور ان کے حلیف قبائل کو اگر پہل کرنے کا موقع مل جاتا تو مدینے کا دفاع خطرے میں پڑ جاتا۔ مدینے کے اندر عبداللہ بن اُبی کی انگیخت پر منافق دشمنوں سے ساز باز رکھتے تھے اور انھیں حملے پر اُکسا رہے تھے۔ اصل یہ ہے کہ عبداللہ بن اُبی نے یہود کو تحریکِ اسلام کے مرکز پر حملہ کرنے کی دعوت دی تھی اور وہ یہود کا سب سے بڑا جاسوس اور ایجنٹ تھا۔ ان منافقین کے ذریعے انھیں مسلمانوں کے عسکری رازوں کی اطلاعات ملتی رہتی تھیں۔ آپ ﷺ نے یہود کے منصوبے کو ناکام بنانے کا جوابی منصوبہ بنایا جس کا مقصد یہ تھا کہ یہود اور ان کے حلیفوں کی افواج کو یکجا ہونے اور مدینے کی طرف پیش قدمی کرنے کا موقع نہ دیا جائے، بلکہ علیحدہ علیحدہ حملہ کر کے انھیں دفاعی جنگ لڑنے پر مجبور کیا جائے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے بروقت راز دارانہ طریقے سے جوابی کارروائی کی تیاری شروع کر دی اور محرّم ۷ ہجری میں خیبر کی طرف تیزی سے پیش قدمی کی۔ مدینے کے دفاع اور مملکت کے نظم و نسق کا نگران حضرت سباع بن عُرفطہ غفاریؓ کو مقرر کیا۔ مجاہدین کے لشکر کی تعداد سولہ سو تھی، جن میں دو سو سوار تھے۔ اس فوج کشی میں پہلی مرتبہ تین عَلَم تیار کیے گئے۔ راہ میں ذکرِ الٰہی کرنا اسلامی لشکریوں کا شیوہ تھا، کیونکہ وہ اعلائے کلمۃ الحق ہی کے لیے تو جہاد کرتے تھے۔ اس لشکر میں بھی رضاکار عورتوں کی ایک جماعت نرسنگ وغیرہ کے لیے ساتھ گئی تھی۔[۱۷]

اپنے جنگی منصوبے کے مطابق آپ ﷺ نے تیزی سے رجیع پہنچ کر چھاؤنی ڈال دی۔ یہ غطفان اور خیبر کے درمیان فوجی اہمیت کا ازبس اہم مقام تھا۔ اس اقدام سے مقصود غطفان سے خیبر کو جانے والی شاہراہ کو کاٹ دینا تھا تاکہ دونوں حلیف (بنو غطفان اور یہود) آپس میں مل نہ سکیں۔ خیبر کی طرف پیش قدمی سے پہلے آپ ﷺ بنو غطفان کے عقب سے حملہ کرنے کے امکان کو ختم کر دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ان کے متوقّع حملے کے پیشِ نظر اپنے لشکر کی صف بندی دفاعی جارحانہ انداز میں کی۔ بنو غطفان کو یہ اطّلاع مل چکی تھی کہ مسلمان خیبر پر لشکر کشی کے ارادے سے کوچ کر چکے ہیں۔ ان پر عقب سے حملہ کرنے کی خاطر وہ مسلّح ہو کر نکلے، لیکن جب انھوں نے رجیع کے مقام پر اسلامی لشکر کو جارحانہ انداز میں صف آرا دیکھا تو وہ ششدر رہ گئے۔ اب ان کے لیے شبخون مارنے یا حملہ کرنے کا کوئی امکان نہ رہا تھا۔ وہ مجاہدین سے اس قدر مرعوب و خوفزدہ ہوئے کہ انھوں نے جارحیّت کا ارادہ ترک کر دیا اور انھیں اپنے گھروں کو بچانے کی فکر دامنگیر ہو گئی۔ چنانچہ وہ جلدی سے لوٹ گئے اور اپنے علاقے میں مورچہ بند ہو گئے۔ چونکہ بیک وقت دو محاذ کھولنا آپ ﷺ کی عسکری حکمتِ عملی کے منافی تھا، لہٰذا آپ ﷺ نے منصوبے کے مطابق پہلے خیبر کے فتنے کو فرو کرنے کا قصد فرمایا اور رجیع کو اپنا عسکری صدر مقام بنا کر حضرت عثمانؓ کو اس کا نگران مقرّر کیا۔ رسد کا سامان اور نرسنگ کے لیے خواتین کا کیمپ بھی یہیں لگایا اور اس کی حفاظت کے لیے مجاہدین کا ایک مضبوط دستہ متعیّن کر کے خود فوج کو لے کر، راز دارانہ طریق سے، خیبر تشریف لے گئے۔

یہود چونکہ بڑی احتیاط اور خفیہ طور سے بنو غطفان سے مل کر مدینے پر چڑھائی کی تیاریاں کر رہے تھے، لہٰذا انھیں یہ گمان بھی نہ تھا کہ مسلمانوں کو ان کے منصوبے کی اطّلاع مل جائے گی اور پھر وہ اتنی عجلت اور تیزی سے خیبر پر چڑھ دوڑیں گے۔ انھوں نے اچانک اسلامی لشکر کو دیکھا تو حیران رہ گئے اور اس قدر مرعوب و خوفزدہ ہوئے کہ قلعوں میں محصور ہو گئے۔ خیبر میں ان کے آٹھ قلعے تھے: ایک طرف النّطاط، صعب بن معاذ، الشّق اور النّاعم کے اور دوسری جانب الکتیبہ، الوطیح، السّلالم اور القموص کے قلعے تھے۔ موخّر الذکر ابن ابی الحقیق کا قلعہ تھا، جو اپنے غیر معمولی استحکام کی وجہ سے ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا۔

پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم نے یہود کو دعوتِ اسلام دی اور جب وہ صلح پر آمادہ نہ ہوئے تو آپ ﷺ نے حملے کے احکام صادر فرما دیے۔ سب سے پہلے قلعہ النّطاط پر حملہ ہوا اور

وہ سر ہو گیا۔ اس کے بعد قلعہ النّاعم فتح ہوا۔ اس قلعے کے محاصرے کے دوران میں حضرت محمودؓ بن مُسلمہؓ شہید ہوئے تھے۔ کنانہ ابن ابی الحقیق یا مرحب نے انھیں قلعے کے نیچے سوتے دیکھ کر اوپر سے پتھر گرا کر شہید کر دیا۔ پھر قلعہ صعب سر ہوا جو سامانِ رسد سے بھرا پڑا تھا۔ فتح کی رات مجاہدین نے قدیم رواج کے مطابق اہلی گدھوں کا گوشت پکایا۔ آپؐ کو اطلاع ہوئی تو آپؐ نے فرمایا "یہ گوشت نجس ہے۔ اسے پھینک دو۔"

اب قلعہ قموص کی باری تھی، لیکن اسے سر کرنا دُشوار ہو گیا اور محاصرہ طول پکڑ گیا۔ آخر کار آپؐ نے حضرت علیؓ کو عَلَم عطا فرمایا۔ وہ میدانِ جنگ میں نکلے تو ان کے مقابلے کے لیے مرحب آیا جو قوت و دلیری میں سارے عرب میں مشہور تھا، لیکن حضرت علیؓ نے اسے قتل کر دیا۔ ایک روایت میں ہے کہ مرحب نے چونکہ محمدؓ بن مسلمہؓ کے بھائی کو پتھر گرا کر شہید کر دیا تھا، لہٰذا انھوں نے بدلہ لینے کی خاطر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم سے لڑنے کی اجازت لی اور اس کی پنڈلیاں کاٹ ڈالیں اور اسے تڑپتا چھوڑ دیا۔ بعد ازاں حضرت علیؓ نے اسے قتل کر دیا۔

مرحب کے بعد اس کا بھائی یاسر نکلا، جسے حضرت زبیرؓ بن العوامؓ نے قتل کر دیا۔ اس کے بعد حضرت علیؓ کی قیادت میں مجاہدین نے قلعے پر بھرپور حملہ کر دیا اور دروازہ توڑ کر اندر جانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس معرکے میں حضرت علیؓ نے غیر معمولی جُراَت و بہادری کا مظاہرہ کیا۔ یہود حملے کی تاب نہ لا سکے۔ انھوں نے ہتھیار ڈال دیے اور صلح کی درخواست کی جسے آپؐ نے قبول فرما لیا۔ اس معرکے میں ۹۳ یہودی کھیت رہے اور ۲۰ مجاہد شہید ہوئے۔

ایک طرف کے تو تمام قلعے سر ہو چکے تھے لیکن دوسری جانب کے تین قلعے الکتیبہ، الوطیع اور السّلالم کو فتح کرنا باقی تھا۔ ان قلعوں میں یہود اِدھر اُدھر سے آ کر پناہ گزیں ہو گئے تھے اور اپنا مال و دولت بھی یہیں جمع کر رکھا تھا۔ آپؐ نے ان قلعوں کو محاصرے میں لے لیا۔ چودہ دن کے بعد یہود نے ہتھیار ڈال دیے اور خیبر کا سارا علاقہ فتح ہو گیا۔[۵۱]

آپؐ چونکہ پیغمبرِ رحمت تھے۔ یہود کے ساتھ لُطف و کرم سے پیش آتے اور کسی مُجاہد کو ان کی جان و آبرُو سے تعرّض کرنے کی اجازت نہ دی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ خیبر کی اراضی نصف بٹائی کے قاعدے پر اُنھیں کے پاس رہنے دی۔ چونکہ شر انگیزی، فتنہ گری اور عہد شکنی یہوُد کی فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی، لہٰذا یہ سب کچھ آپؐ نے مشروط طور پر منظور کیا اور تحریری طور پر ان پر یہ واضح کر دیا کہ اگر انھوں نے آیندہ فتنہ انگیزی یا عہد شکنی کی تو اسلامی حکومت ان سے اراضی واپس لینے

اور انھیں ملک بدر کرنے کی مجاز ہو گی۔ چنانچہ خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں یہوُد نے معاہدے کی خلاف ورزی کی تو اس کی رُو سے ان سے اراضی واپس لے لی گئی اور انھیں ملک بدر کر دیا گیا۔

تالیفِ قلوب آپؐ کی کامیاب حکمتِ عملی تھی۔ چنانچہ جنگِ خیبر میں یہود مغلُوب ہوئے تو آپؐ نے ان کے دلوں کو بھی مسخّر کرنا چاہا اور اس غرض کے لیے ایک تو ان سے بے مثال رواداری اور احسان سے کام لیا اور دوسرے ان کے رئیس حییّ بن اخطب کی صاحبزادی حضرت صفیہؓ سے نکاح کر کے ان سے رشتۂ صِہر قائم کیا۔

اہلِ فدک نے جب خیبر کے یہود کا حال سُنا اور مال دیکھا تو انھوں نے بھی ایسی ہی شرائط پر صُلح کر لی۔ چونکہ آپؐ مملکتِ اسلامیہ کے سربراہ بھی تھے اور اس حیثیت سے آپؐ کو مصارف بھی برداشت کرنا پڑتے تھے، اس لیے فدک کی آمدن آپؐ کے لیے مخصُوص کر دی گئی۔

تحریکِ اِسلام کا اگرچہ سارا عرب ہی مخالف و دُشمن تھا، لیکن مکّے میں قُریش اور یثرب میں یہود اس کے سب سے زیادہ طاقتور اور خطرناک دُشمن تھے۔ مکّے میں قریش کو خاص طور سے مذہبی اور تجارتی سیادت حاصل تھی، اس لیے قبائل میں ان کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ یثرب میں یہوُد کو بُت پرست قبائل پر ثقافتی (یعنی دینی، معاشی اور معاشرتی) برتری حاصل تھی، اس وجہ سے وہ بڑے اثر و رسُوخ کے مالک تھے۔ علاوہ بریں یہود اپنی قومی عیّاری اور سیاسی حکمتِ عملی سے یثرب کے مُشرک قبائل کو ایک دوسرے سے لڑاتے، انھیں فوجی، سیاسی، معاشی ہر لحاظ سے کمزور کرتے اور اپنا دست نگر بنائے رکھتے تھے۔ یہ دونوں قوتیں اسلامی تحریک و مملکت کے لیے مستقل خطرہ تھیں۔ یہود چونکہ مدینے کے سر پر بیٹھے تھے اور معاہدوں کی خلاف ورزی ان کا قومی شعار تھا، اس لیے ان کے مفاجاتی حملے کا ہر وقت خطرہ رہتا تھا۔ یہوُد کے مغلُوب و مطیع ہو جانے سے یہ خطرہ ہمیشہ کے لیے ٹل گیا اور مدینے کا دفاع ناقابلِ تسخیر بن گیا۔ اب اسے قریش یا کسی اور عرب قوت کی مؤثر جارحیّت کا خطرہ نہ رہا۔

تحریکِ اسلام کی راہ میں یہود سدِّ سکندری کی طرح حائل تھے۔ ان کے نو بہ نو فتنوں سے تحریکِ اسلام کے اندر منافقت پھیلتی تھی۔ مؤرخین نے عبداللہ بن ابیّ کو رئیسُ المنافقین لکھا ہے اور یہ درست بھی ہے، لیکن اصل یہ ہے کہ تحریکِ نفاق کے بانی اور محرّک یہود تھے۔ عبداللہ بن ابیّ تو اُن کا محض آلۂ کار تھا۔ سیاسی مصلحتوں کے علاوہ آپؐ اسی لیے اس کا وجود برداشت کرتے

اور نفاق کے سرچشمے کو خشک کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔ آپؐ کی نظر ہر مسئلے کی فروع سے زیادہ اس کے اصل پر رہتی تھی اور یہ بات بھی آپؐ کی فقید المثال کامیابی کے اہم ترین اسباب میں سے ہے۔

مختصر یہ کہ یہودی فتنے کے استیصال کے ساتھ تحریکِ اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ دُور ہو گئی اور اس پر ترقی کے دروازے کُھلتے چلے گئے، نیز مکّے میں اس کے فاتحانہ داخلے کے امکان روشن ہو گئے۔

معاشی نقطۂ نظر سے فتحِ خیبر کے دُور رس نتائج برآمد ہوئے۔ مخابرت یا مزارعت کی وجہ سے زرعی پیداوار اور تجارت پر یہود کی بالادستی بلکہ اجارہ داری جاتی رہی اور اس سے ایک صحت مند مسابقت کا بازار گرم ہو گیا۔ علاوہ بریں اس سے مسلمانوں کی معیشت پر نہایت خوش گوار اثرات مرتّب ہوئے اور ان پر زرعی اور تجارتی میدان میں ترقّی کرنے کی بہت سی مسدُود راہیں کُھل گئیں ـــــــ یہود کی عسکری، سیاسی اور اقتصادی قوّت کے مفلوج ہو جانے کے سبب عرب میں طاقت کا پلڑا مسلمانوں کے حق میں جُھک گیا اور وہ عرب کی سیاسی دُنیا میں سب سے بڑی طاقت کے طور پر اپنا کردار ادا کرنے لگے۔ یہود کی شکست و تسخیر سے قریش اپنے ایک طاقتور اور زیرک حلیف سے محرُوم ہو گئے۔ ان کے دوسرے حلیف بھی مرعُوبیّت کا شکار ہو گئے جس کے سبب وہ اپنے آپؐ کو تنہا و کمزور محسوس کرنے لگے، انھیں مسلمانوں کی طرف سے ایک مستقل خطرے کا اندیشہ لاحق ہو گیا اور وہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گئے۔

وادی القریٰ کے یہوُد :

خیبر کے بعد اب یہود صرف وادی القریٰ میں باقی رہ گئے تھے۔ یہ وادی خیبر اور تیما کے درمیان واقع تھی۔ یہاں کے یہود بھی شر پسند اور تحریکِ اسلام کے دُشمن تھے۔ اس فتنے سے نجات حاصل کرنے کی تین صورتیں تھیں: ایک یہ کہ ان کا استیصال کر دیا جاتا، دوسری یہ کہ ان کو جلاوطن کر دیا جاتا اور تیسری یہ کہ ان کو اپنی رعایا بنا لیا جاتا۔ آپؐ رحمۃٌ للعالمین تھے۔ آپؐ نے بقائے باہمی کے اصول پر ان سے معاہدہ کرنے کو پسند فرمایا اور اس مقصد کی خاطر آپؐ نے ادھر کا رُخ کیا۔ یہوُد کو اس وقت خبر ہوئی جب اسلامی لشکر ان کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ آپؐ کا یہ طریقِ اقدام دُشمن کو مرعوب و بے بس کرنے میں ہمیشہ بڑا مؤثر ثابت ہوا۔ ان میں سے بعض نے گھبراہٹ اور جلد بازی میں اسلامی لشکر پر تیر برسائے اور ایک مسلمان کو شہید کر دیا، لیکن آپؐ نے

عفو و درگزر سے کام لیا۔ یہود نے مزاحمت کے بغیر ہتھیار ڈال دیے اور رعایا بن کر رہنے پر رضامند ہو گئے۔[۱۹]

مسلمانوں کا مکّے میں پہلا ورُود :

آپؐ کو مسلمانوں کے ساتھ مکّے میں داخل ہونے اور عُمرہ کرنے کا اشتیاق و انتظار تھا۔ یہ حقیقت آپؐ پر آشکارا تھی کہ مکّے میں آپؐ کا اس طرح داخل ہونا جہاں قریش کی مکمّل نفسیاتی شکست تھی، وہاں مسلمانوں کی نفسیاتی فتح تھی۔ قریش، جو کل تک مسلمانوں کو اپنے مفرُور سیاسی و مذہبی مجرم خیال کرتے تھے اور ان کے خون کے پیاسے تھے اور انھوں نے ان پر مکّے کے دروازے بند کر رکھے تھے، جب انھیں ایک آزاد قوم کی حیثیت سے شہر میں داخل ہونے اور مناسکِ عُمرہ ادا کرنے کی اجازت دینے پر مجبُور ہوں گے تو یہ نظّارہ ان کے لیے اس قدر رُوح فرسا ہو گا کہ ان کے دل اس کے حریف نہ ہو سکیں گے۔ اس کا ان پر اتنا زیادہ نفسیاتی دباؤ پڑے گا کہ ایک تو وہ ذہنی طور پر شکست خوردہ ہو جائیں گے اور دوسرے اپنے احساسِ شکست خوردگی کو دُور کرنے کی خاطر موقع ملتے ہی معاہدے کی خلاف ورزی کر بیٹھیں گے۔ آپؐ کی نظر ایک حقیقی مدبّر کی نظر اور عقلِ سلیم اور فکرِ صالح تھی، لہٰذا آپؐ کا قیافہ درُست ثابت ہُوا۔

صُلحِ حُدیبیہ کا سال گزُرتے ہی آپؐ نے مکّے جانے کا اعلان کر دیا۔ آپؐ نے ان مسلمانوں کو خاص طور سے اپنے ساتھ لیا، جو گزشتہ سال آپؐ کے ساتھ عُمرے کے لیے گئے تھے، مگر مُعاہدۂ حُدیبیہ کی وجہ سے عُمرہ نہ کر سکے تھے۔

۷ ہجری کو آپؐ مسلمانوں کے ساتھ مکّے میں داخل ہوئے۔ قریش نے شہر خالی کر دیا تھا اور دُور سے یہ نظّارہ دیکھتے تھے۔ آپؐ نے معاہدے کے مطابق تین روز وہاں قیام فرمایا اور عُمرہ کیا۔

مکّے پر قبضہ کرنے کا یہ زرّیں موقع تھا، لیکن معاہدے سے انحراف اور دغا پیغمبرِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم کی شانِ اقدس سے بعید تھی۔ مسلمان اس کا تصوّر تک نہیں کر سکتے تھے۔ ان تین دنوں میں کسی مسلمان نے کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں کی۔ وہ ایک منظّم قوم تھے، مکّے اور بیت اللہ کے محافظ و نگہبان بن کر رہے۔

مسلمانوں کی قوّت و صولت کے نظّاروں سے اگر ایک طرف اہلِ مکّہ کے دلوں میں ہیبت و رُعب پیدا ہوا تو دُوسری طرف اُن کی حُریّت و مساوات، اخوّت و محبّت اور زُہد و تقویٰ کے مناظر سے

اُن کے دِل پسیج گئے۔ نفرت کے جذبات سرد پڑ گئے اور دِلوں میں محبتِ اسلام کا بیج پڑ گیا، جس کی قسمت میں جلد بار آور ہونا لکھا تھا۔ یہود کے برعکس قریش میں تحریکِ اسلام میں شامل ہونے کے قوی اور روشن امکانات تھے، جن کے پیشِ نظر آپؐ تصادم و جارحانہ اِقدام کے بغیر مکّے کو فتح اور عفو و درگزر اور تالیف کے ذریعے قریش کے دلوں کو مسخر کر کے انھیں تحریکِ اسلام میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ یہ محض خواہش نہ تھی، سچّی آرزو تھی، جس کی تکمیل کے لیے آپؐ نے طویل المیعاد منصوبہ بنایا تھا۔ اس منصوبے کی پہلی کامیابی مُعاہدۂ حدیبیہ اور دوسری کامیابی آپؐ اور مجاہدین کا مکّے میں آزادانہ ورُود تھا۔ ان دونوں کامیابیوں نے فتحِ مکّہ کی راہ ہموار کی تھی۔

غزوۂ موتہ : جمادی الاوّل ۸ھ/ اگست، ستمبر ۶۲۹ء

مُوتہ شام کے علاقے میں واقع ہے۔ رسول اللہ صلّی علیہ وسلّم نے قیصرِ روم کی طرح اس کے باجگزار شام یا بُصریٰ کے حکمران کو بھی دعوتِ اسلام دی اور اسے نامۂ مبارک لکھا، جسے لے کر حضرت حارثؓ بن عمیر ازدیؓ شام روانہ ہوئے۔ سرحد پر بلقاء کا علاقہ تھا جس کا حاکم شرُجیل بن عمرو تھا اور وہ بھی قیصرِ رُوم کا باجگزار تھا۔ شرُجیل عرب نژاد عیسائی تھا۔ حضرت حارثؓ اس کی وساطت سے شام کے حکمران کو حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا نامۂ مبارک پہنچانا چاہتے تھے۔ شرُجیل سرکش و مغرور تھا۔ اس نے سفارتی آداب و روایات کی پروا نہ کرتے ہوئے حضرت حارث بن عمیر ازدیؓ کو شہید کر دیا۔

اسلامی مملکت کو یہ کھُلا چیلنج بلکہ الٹی میٹم تھا۔ چونکہ شرُجیل بن عمرو عرب تھا، اس لیے جانتا تھا کہ عرب مسلمان قصاص لیے بغیر چین سے نہیں بیٹھیں گے، لہٰذا اُس نے قیصرِ رُوم کو بھی مسلمانوں کے خلاف جنگ کے لیے اُکسایا اور خود بھی جنگ کی تیاری کرنے لگا۔ آپؐ کو شرُجیل بن عمرو کی معاندانہ سرگرمیوں کی اطّلاع ملی تو آپؐ نے ایک عظیم مدبّر و ماہرِ حربیات کی حیثیت سے یہ فیصلہ کیا کہ شرُجیل اور قیصر کی افواج کو کسی قیمت پر عرب کی سرزمین کو پامال کرنے اور مدینے پر چڑھائی کرنے کی مُہلت نہ دی جائے، ورنہ مدینہ بیرونی حملہ آوروں کی گھُڑ دوڑ کا میدان بن جائے گا۔ چنانچہ آپؐ نے تین ہزار مجاہدین کا لشکر تیار کیا اور اسے شرُجیل کے لشکر کو شام کی سرحد پر روکنے کے لیے روانہ کر دیا۔ اس لشکر کے سپہ سالار حضرت زید بن حارثہؓ مقرر ہوئے، جو آپؐ کے آزاد کردہ غلام تھے۔

شرُجیل حملے کی تیاریوں میں مصروف تھا کہ اسے مسلمانوں کی پیش قدمی کی اِطّلاع ملی۔

اگرچہ اس نے ایک لاکھ فوج اپنے جھنڈے تلے جمع کر لی تھی اور اسے قیصرِ رُوم کی بھاری کمک بھی میسّر تھی، لیکن اسے آگے جا کر مسلمانوں پر حملہ کرنے کی جُرأت نہ ہُوئی۔ قیصرِ رُوم بھی شرُجیل کی مدد کے لیے ایک لشکرِ جرّار کے ساتھ بلقاء کے قریب جنگی اہمیّت کے ایک مقام تاب میں ڈیرے ڈالے پڑا تھا۔

اپنے سے تینتیس گنا لشکر اور تقریباً اتنی ہی کمک سے نبرد آزما ہونے سے پہلے حضرت زیدؓ نے اکابر صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ حضرت زیدؓ کو اپنی ذمّے داری کا احساس تھا، لہٰذا انھوں نے بارگاہِ رسالتؐ سے مزید احکام لینے کی رائے دی، مگر حضرت عبداللہ بن رواحہؓ اور دیگر صحابہؓ نے توقّف و انتظار کرنے کے بجائے دشمن سے نبرد آزما ہونے کا مشورہ دیا کہ ان کے نزدیک اطاعتِ رسولؐ کا یہی تقاضا تھا۔ حضرت زیدؓ نے مُٹھّی بھر مجاہدین کو دشمن کی ایک لاکھ فوج پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ شام کی سرحد کے نزدیک مُوتہ کے مقام پر گھمسان کا رن پڑا۔ مسلمانوں کے تین سپہ سالار حضرت زیدؓ، حضرت جعفرؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ باری باری شہید ہو گئے۔ اس کے بعد حضرت خالد بن ولیدؓ سپہ سالار بنے۔ انھوں نے ایسی جُرأت اور جنگی مہارت کا مظاہرہ کیا کہ دشمن ششدر رہ گیا اور اس کی صفیں درہم برہم ہو گئیں۔ چونکہ اتنے بڑے لشکر کو شکست دینے کے لیے کمک و رسد کی ضرورت تھی، جو میسّر نہ تھی، اس لیے حضرت خالدؓ نے دشمن کو درہم برہم اور مرعوب کر کے اس کے نرغے سے اپنا لشکر نکال لیا۔ دشمن اس قدر ہراساں و مرعوب ہو چکا تھا کہ اسے مجاہدین کا تعاقب کرنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ اس بےمثال جُرأت و ہمّت اور جنگی مہارت سے خوش ہو کر آپؐ نے حضرت خالدؓ کو "سیف اللہ" کا لقب دیا۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمان اپنی بے حد قلیل فوج و رسد اور کمک کے فقدان کے سبب شرُجیل کے لشکرِ جرّار کو شکست نہ دے سکے اور ان کا جانی نقصان بھی ہوا، لیکن اِس سے تحریکِ اسلام کو قریب قریب وہی فوائد پہنچے جو جنگِ اُحد سے پہنچے تھے۔

فوجی نقطۂ نگاہ سے جنگِ مُوتہ میں شرُجیل اور ہرقل (قیصرِ روم) کو ناکامی ہُوئی تھی۔ اس کے تین دلائل ہیں : اوّلاً وہ دونوں اپنی کثیر افواج اور وسائل کے باوجود مسلمانوں کے مرکزِ حکومت مدینے پر چڑھائی نہ کر سکے اور دفاعی جنگ لڑنے پر مجبور ہوئے۔ ثانیاً، مُٹھی بھر مُجاہدین کو نہ تو محصور کر سکے اور نہ ان کا استیصال ہی کر سکے۔ ثالثاً مسلمانوں کی جُرأت و ہمّت اور جنگی مہارت سے اس قدر مرعوب ہو گئے کہ انھیں ان کا پیچھا کرنے کا حوصلہ نہ ہُوا۔

نتائج کے لحاظ سے مسلمانوں کو اس جنگ سے دو ازبس اہم فوائد حاصل ہوئے۔ ایک یہ کہ کسی بیرونی حکومت یا قوت کو مسلمانوں کے دارالحکومت پر چڑھائی کرنے کی ہمت نہ ہوئی، دُوسرے اسلامی مملکت بیرونی دُنیا میں ایک نئی اُبھرتی ہوئی قوت کے طور پر متعارف ہوگئی۔ اس سے تحریکِ اسلام کو بیرونی دُنیا میں نفوذ کرنے میں مدد ملی۔[۲۰]

فتح مکّہ اور قریش کی تالیفِ قلوب : ۱۰ رمضان ۸ھ / یکم جنوری ۶۳۰ء

یہود کے بعد تحریکِ اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قریش تھے، جسے دُور کرنے کے لیے مکّے کی فتح اور قریش کی تسخیرِ قلوب ناگزیر تھی۔ اس وقت یہی آپؐ کا مطمحِ نظر بھی تھا۔ جنگِ احزاب کے بعد سے قریش اور ان کے حلیف قبائل کے دلوں میں تشتت و افتراق پیدا ہوگیا تھا، اگرچہ وہ بظاہر متّحد نظر آتے تھے۔

شرک سے فرد ہو یا قوم، اس کی شخصیّت پر جو تباہ کُن اثرات مرتّب ہوتے ہیں اور اس سے اس کی نفسیاتی حالت جس حد تک بگڑ جاتی ہے، اس سے آپؐ بخوبی واقف تھے۔ آپؐ کو اس بات کا ایقان تھا کہ قریش معاہدۂ حدیبیہ کی خلاف ورزی ضرور کریں گے، لہٰذا آپؐ اس موقع سے فائدہ اُٹھانے کے لیے رازدارانہ طریقے سے مُسلسل تیّاریاں کرتے رہے۔ آپؐ کی ان تیّاریوں کی غایتِ حقیقی حسین انقلاب کے ذریعے معاشرے کی تشکیل و تعمیرِ نو تھی۔ اس کے برعکس قریش کا کوئی نصبُ العین نہ تھا، لہٰذا صُلحِ حُدیبیہ کے بعد وہ نشاطِ غفلت میں مست ہوگئے۔ یہ اسی غفلت و مستی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے اپنے حلیف قبیلے بنو بکر کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے حلیف قبیلے خزاعہ پر حملہ کر دیا، اور حرم کے اندر بھی انھیں تہ تیغ کر دیا۔ یہ معاہدۂ حُدیبیہ کی سنگین خلاف ورزی تھی۔

بنو خزاعہ کا ایک وفد عمرو بن سالم کی قیادت میں فریاد لے کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ قتل و غارت کے اس انتہائی بھیانک اور شرمناک واقعے سے آپؐ اور مسلمانوں کو سخت صدمہ ہوا اور ہر طرف سے قصاص قصاص کی آوازیں بلند ہُوئیں۔ اس مسئلے کو سفارتی سطح پر حل کرنے کی خاطر آپؐ نے قریش کے پاس اپنا سفیر بھیجا اور تین شرائط پیش کیں کہ ان میں سے کوئی ایک منظور کی جائے: (۱) مقتولوں کا خون بہا دیا جائے۔ (۲) قریش فوراً بنو بکر کی حمایت سے الگ ہو جائیں اور (۳) معاہدۂ حُدیبیہ کے ٹوٹ جانے کا اعلان کر دیا جائے۔

قریش نے جوشِ ظلم اور نشاطِ غفلت میں تیسری شرط منظور کرنے کا فیصلہ کیا اور ان کے ترجمان قرط بن عمر نے تنسیخِ مُعاہدہ کا اعلان بھی کر دیا۔ سفیر کے چلے جانے کے بعد قریش نے اس معاملے پر غور کیا تو انھیں اپنے اس فیصلے کی غلطی اور اس کے خطرناک نتائج کا احساس ہوا اور وہ سخت نادم ہوئے۔ انھوں نے تجدیدِ معاہدہ کی خاطر ابوسفیان کو اپنا سفیر بنا کر مدینے بھیجا۔ ابوسفیان نے مہاجرین کو صلۂ رحمی کا واسطہ دیا اور بڑے ہاتھ پاؤں مارے مگر بے سود۔ اسے بالآخر بے نیلِ مرام واپس جانا پڑا۔

جنگِ احزاب کے بعد آپؐ نے فتح مکّہ اور تسخیرِ قُلوبِ قریش کا جو منصوبہ بنایا تھا اور معاہدۂ حُدیبیہ جس کی کامیابی کا دیباچہ تھا، اس کی تکمیل کا وقت آ پہنچا تھا۔ آپؐ نے اتحادی قبائل کو بھی سفیروں کے ذریعے اس مہم میں شمولیّت کی دعوت دی اور قریش کو اِس منصوبے اور اِقدام سے بے خبر رکھنے کے لیے ہر ممکن تدابیر اختیار کی گئیں۔ ۱۰ رمضان ۸ ہجری کو آپؐ نے دس ہزار مجاہدین کے ساتھ مکّے کی طرف پیش قدمی کی، لیکن عام شاہراہ اختیار نہ کی۔ مکّہ معظّمہ سے ایک منزل دُور مرّالظہران کے مقام پر آپؐ نے چھاؤنی ڈال دی اور فوجوں کو اس نہج سے دُور دُور پھیلا دیا کہ قریش ان کی تعداد کو اصل سے زیادہ سمجھ کر مرعوب و خوفزدہ ہو جائیں اور ہمّت ہار کر بلا مزاحمت ہتھیار ڈال دیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

قریش کو اسلامی لشکر کی اطّلاع ملی تو حیران رہ گئے۔ وہ اس مفاجاتی حملے کے لیے نہ ذہنی اور نہ فوجی لحاظ سے تیّار تھے۔ اس غیر متوقّع صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ان میں نہ تو حوصلہ تھا اور نہ عزم و ہمّت۔ بہرحال، انھوں نے اسلامی لشکر کی تعداد، منصوبے اور جنگی نوعیّت کی معلومات حاصل کرنے کے لیے ابوسفیان، بُدیل بن ورقا اور حکیم بن حزام کو بھیجا۔ ابوسفیان پکڑا گیا، لیکن آپؐ نے تحریکِ اسلام کے بہترین مفاد کی خاطر اسے معاف کر دیا۔ ابوسفیان نے اپنی رضا یا جان کے خوف سے اسلام کی صداقت کا اقرار کر لیا۔

لشکرِ اسلام کو مکّے کی طرف پیش قدمی کا حکم دینے سے پہلے آپؐ نے لشکرِ قریش میں اعلان کرا دیا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے گا یا ابوسفیان کے ہاں پناہ لے گا، یا گھر کا دروازہ بند کر لے گا، یا خانۂ کعبہ میں داخل ہو جائے گا، اسے معاف کر دیا جائے گا۔

یہ عام معافی کا اعلان تھا، جس کا خاطر خواہ اثر ہُوا۔ ویسے بھی مسلمانوں کے لشکرِ جرّار کو دفعتاً اپنے سر پر دیکھ کر قریش کا زہرہ آب ہو چکا تھا۔ انھوں نے اس اعلانِ معافی سے فائدہ اُٹھانے

کا فیصلہ کیا۔ مسلمانوں نے بلا مقابلہ مکّہ فتح کر لیا اور قریش کی مزاحمت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

مکّہ معظّمہ میں آپؐ کا اوّلین کارنامہ حرمِ کعبہ اور خانۂ کعبہ کو مورتیوں اور بتوں (تماثیل و اصنام) نیز دیواری تصاویر سے پاک وصاف کرنا تھا۔ کہتے ہیں حرمِ کعبہ میں ۳۶۰ مجسّمے تھے۔ آپؐ کے حکم سے سب کو مسمار کر دیا گیا اور دیواروں پر تصویروں کو مٹا دیا گیا۔ آپؐ جب حرمِ کعبہ میں داخل ہوئے تو عصا کی نوک سے ایک ایک بُت کو ٹھوکا دیتے جاتے اور ساتھ ساتھ یہ پڑھتے جاتے : جَاءَ الحَقُّ وَزَهَقَ البَاطِلُ ۚ اِنَّ البَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۝ (بنی اسرآئیل ۱۷ : ۸۱) 'یعنی حق آ گیا اور باطل نابود ہو گیا۔ بے شک باطل نابود ہونے والا ہے)۔ صحیح بخاری میں یہ آیت ہے : جَاءَ الحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ البَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُ۝ (سبا ۳۴ : ۴۹ : یعنی حق آ گیا' باطل نہ تو کچھ تخلیق کر سکا اور نہ کچھ دوبارہ پیدا کر سکے گا)۔ آپؐ نے بیتُ اللہ کا دروازہ کُھلوایا۔ حضراتِ بلالؓ اور طلحہؓ کے ساتھ اندر داخل ہوئے، تکبیریں کہیں اور نماز پڑھی۔

فتحِ مکّہ کے بعد مسلمان عملاً عرب کے حکمران بن چکے تھے۔ آپؐ کے سامنے اب قیصر و کسریٰ کے استحصالی معاشرے تھے، جن کی بنیادوں میں انقلاب لا کر ان کی تعمیرِ نو کرنا تھی، لہٰذا آپؐ نے فتحِ مکّہ کے بعد جو خطبہ ارشاد فرمایا' اس میں خطاب اہلِ مکّہ سے نہیں، سب افرادِ نسلِ انسانی سے تھا۔[۲۱]

خُطبۂ فتح :

لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریکٌ لہ صدق وعدہ ونصر عبدہ هزم الاحزاب وحدہ الا کل ماثرہ او دم او مال یدعی فھو تحت قدمی ھاتین الاسدانہ البیت و سقایہ الحاج .... یا معشر قریش ان اللّٰہ قد اذھب عنکم نخوہ الجاھلیہ و تعظمھا بالآباء الناس من آدم و آدم من تراب : اللہ کے سوا اور کوئی اِلٰہ (یعنی معبود و محبوب اور مقصود و مطلوب) نہیں ہے۔ وہ ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس نے اپنا وعدہ سچا کیا اور اپنے بندے کی مدد کی اور تمام جتھوں (جماعتوں) کو تنہا توڑ دیا۔ خبردار! ہر قسم کا مطالبہ خواہ وہ خون کا مطالبہ ہو یا مال کا' میرے پاؤں کے نیچے ہے (یعنی منسوخ و ممنوع ہے)' البتّہ بیت اللہ کی تولیت یا دربانی اور حاجیوں کو پانی پلانے کے مناصب مستثنیٰ یعنی بحال کے توں ہیں۔ اے گروہِ قریش! آج کے دن اللہ نے تم سے جاہلیّت کا غرور چھین لیا اور آباؑ و اجداد کے بل پر

بڑائی حرام کر دی۔ کُل بنی نوعِ انسان آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹّی سے پیدا ہُوا تھا۔

پھر قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی : يَا اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۚ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ۝ (الحُجرات ۴۹ : ۱۳) : لوگو! ہم نے تم کو مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمھاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کی شناخت کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ متقی ہے۔ بلاشبہ اللہ سب کچھ جاننے والا اور سب خبر رکھنے والا ہے۔

خطبہ جتنا مختصر ہے، جامعیّت و بلاغت میں اتنا ہی زیادہ ہے۔ ختم ہوا تو آپؐ نے اہلِ مکّہ سے فرمایا : تم جانتے ہو کہ میں تم سے کیا سلوک کرنے والا ہوں؟ قریش کو اپنے مظالم کا احساس تو تھا، لیکن رحمۃٌ للعالمین کے رحم و کرم اور عفو و درگزر کا شعور بھی تھا، یک زبان ہو کر بول اُٹھے : أَخٌ كَرِيمٌ وَابْنُ أَخٍ كَرِيمٌ : آپؐ بخشش و کرم کرنے والے بھائی اور بخشش و کرم کرنے والے بھائی کے بیٹے ہیں۔ آپؐ نے برملا اعلان فرمایا : لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء : آج تم پر کوئی الزام و مواخذہ نہیں۔ جاؤ، تم سب آزاد ہو۔

آپؐ کا یہ خطبہ اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ یہ محض کسی شہنشاہ، آمر، فاتح یا حکمران کا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے رسولِ برحقؐ ہی کا ہو سکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کے پہلے ہی جملے میں اللہ تعالیٰ کے سوا تمام معبُودوں کی نفی و تردید ہے، نیز اس بات کا بھی بُطلان کر دیا گیا ہے کہ اس کی خدائی اور صفات میں اور بندوں کی عبادات میں کسی کا عمل دخل یا حصّہ ہو سکتا ہے۔ مشرک لوگوں کا سب سے بڑا اِلٰہ یا معبود ان کا نفس ہوتا ہے اور ان کے تین بڑے معرُوضی معبُود فرعون، ہامان اور قارون ہوتے ہیں۔ یہ یاد رہے کہ فرعونیت میں آمریّت کے علاوہ پیشوائیّت بھی شامل ہے۔ اس عہد کی شخصی حکومت، شہنشاہیّت یا آمریّت کے دَور میں حکمران یا فاتح عموماً اپنے نفس کے پرستار ہوتے تھے اور ان میں لوگوں کا اِلٰہ بننے کی طلب و جُستجو ہوتی تھی اور رعایا ان کے علاوہ ان کے ہامانوں اور قارونوں کو بھی اپنا اِلٰہ بنا لیتی تھی۔ لیکن آپؐ چونکہ اللہ تعالیٰ کے سچے پیغمبر تھے، اس لیے آپؐ نے صرف اللہ تعالیٰ کی اُلُوہیت کا اِقرار کیا اور تمام معبُودانِ باطل کا رد کیا۔ علاوہ بریں، آپؐ چونکہ بحیثیّت نبی کے بنی نوعِ انسان کے مُعلّمِ اخلاق اور مُصلحِ اعظم تھے' اس لیے آپؐ نے عصبیت، انتقام، غرور و نخوت اور نسبی تفاخر و تکبّر کو حرام قرار دیا اور لوگوں

کو اخوّت و مساوات کا درس دیا، نیز ان میں تاریخی شعور و ایقان پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ خطبہ اپنے موضوع کے لحاظ سے مطلق و عالمگیر دینی اقدار کا حامل ہے۔ آپؐ نے انسان کے لیے عزّت کا معیار تقویٰ قرار دے کر ثابت کر دیا کہ آپؐ کا دین یعنی اسلام سچا، فطری اور الہامی ہے۔

اس خطبۂ فتح کے بین السطور میں حکومتِ الٰہیہ کا انقلابی عقیدہ موجود ہے، جو اُس سامراجی اور استحصالی دَور کے لوگوں کے لیے بالخصوص ایک حیرت انگیز انقلابی نظریہ تھا۔ اسی طرح یہ عقیدہ بھی ان کے لیے عجیب، انقلابی اور ناقابلِ عمل تصوّر تھا کہ حکمران معبود نہ ہو، بندہ ہو، اور انسان کی عزّت و تکریم قوّت و دولت، حسب و نسب اور حکومت و سطوت کی وجہ سے نہ ہو، بلکہ خشیّتِ الٰہی اور طلبِ حق و صداقت کی بنا پر ہو۔

آپؐ نے اس خطبے میں اس ازبس اہم، عبرت انگیز اور بصیرت افروز حقیقت کی نشاندہی کی ہے کہ ایک شخص جس کا بچپن صحرا میں بکریاں چراتے اور شباب و جوانی تجارت کرتے گزری، اس نے تنِ تنہا محض نصرتِ الٰہی کی بدولت تحریکِ اسلام کے دُشمنوں، یہود و نصاریٰ اور مُشرکوں اور بُت پرستوں کی جماعتوں کو صرف بارہ برس کی قلیل مدّت میں، پے بہ پے شکستیں دے کر توڑ کے رکھ دیا اور قریب قریب سارے عرب کی سرزمین اور اس کے باشندوں کے دلوں کو فتح و مسخّر کر لیا۔ کیا یہ معجزہ نہیں ہے؟ یقیناً ہے، کیونکہ ایسا نہ ماننے کی ہمارے پاس کوئی معقول وجہ نہیں، تو اس سے پھر دو باتیں تسلیم کرنا لازم ہو جاتا ہے: ایک یہ کہ کوئی غیبی قوّت آپؐ کی نگہبان اور حامی و ناصر تھی، دوسرے یہ کہ آپؐ کی تحریکِ اسلام عقاید و اصول اور مقاصد و غایت بلکہ ہر اعتبار سے سچی تھی، بلکہ ہے۔

یہ تاریخی واقعیت بھی آپؐ کی نبوّت و رحمۃ للعالمینی کی ایک قوی دلیل ہے کہ آپؐ نے اُس زمانے اور خاص کر عرب کے انسانیّت سوز جنگی دستور اور روایات کے برعکس مفتوحین کے مال و جان اور عزّت و ناموس سے قطعاً تعرّض نہ کیا، بڑے سے بڑے جنگی مجرم سے بھی مواخذہ نہ کیا اور سب کو معاف اور آزاد کر دیا۔ آپؐ کے اس رویّے نے جنگ کے عالمی دستور کو انسانی اقدار کے منافی سمجھ کر ردّ کر دیا اور دُنیا کو اپنا جنگی دستور دیا، جو رحمت یا انسانی اقدار کا حامل اور بیسویں صدی کی اقوامِ متحدہ کے دستورِ جنگ کا مآخذ ہے، اور اس سے قرآنِ حکیم کی حقّانیّت و صداقت ثابت ہوتی ہے کہ اس نے چودہ سو برس پہلے کہا تھا کہ آپؐ کی پیغمبرانہ زندگی میں نوعِ انسانی کے لیے حسین مثالی نمونہ (اُسوۂ حسنہ) ہے۔ تحریکِ اسلام کو عالمگیر بنانا اور اقوامِ عالم کے مشرکانہ و استحصالی معاشروں میں

حسین انقلاب لانا آپؐ کی رسالتی ذمّے داری تھی، اور اس ذمّے داری کو پورا کرنے میں چونکہ قریش بڑے ممدّ و معاون ثابت ہو سکتے تھے، اس لیے آپؐ نے ان کی تالیفِ قلوب کے لیے جو احسانات کیے، ان میں ایک یہ بھی تھا کہ مہاجرین کی املاک جو قریش کے قبضے میں تھیں، انھیں قریش کے پاس ہی رہنے دیا، حالانکہ مہاجرین نے انھیں واپس لینے کی درخواست بھی کی تھی۔

فتحِ مکّہ سے آپؐ کا مقصودِ حقیقی اہلِ مکّہ کے دلوں کی تسخیر تھا، لہٰذا آپؐ اہلِ مکّہ کو تحریکِ اسلام میں رسمی طور پر شریک کرنے کی خاطر مقامِ صفا پر تشریف لے گئے اور ایک بلند جگہ پر لوگوں سے بیعت لینے کا سلسلہ شروع کیا۔ مردوں کے بعد عورتوں سے بیعت لی۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں عورت بھی مرد کی طرح اعتقاد و رائے کے معاملے میں آزاد و خود مختار ہے، اور اپنا جُداگانہ تشخّص و کردار رکھتی ہے۔ بہرحال لوگ جوق در جوق تحریکِ اسلام میں شامل ہو رہے تھے۔ حق کی فتح اور تقلیب و تسخیرِ قلوب کا یہ منظر بڑا ہی رُوح پرور و بصیرت افروز تھا، لیکن شقی القلب لوگوں کے لیے یہ نظّارہ انتہائی رُوح فرسا تھا اور وہ شقاوت و غصّہ کی آتشِ فروزاں میں جل رہے تھے۔ کچھ رؤسائے مکّہ خوف کے مارے بھاگ نکلے تھے، انھیں بھی آپؐ نے امان دے دی۔ یہ بات بے حد اہم اور قابلِ غور ہے کہ آپؐ یا کسی اور مسلمان نے کسی شخص کو تحریکِ اسلام میں شامل ہونے پر مجبور نہیں کیا۔ سب نے اسلام کے اصول "لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْن" پر سختی سے عمل کیا۔ چنانچہ جن لوگوں نے اسلام قبول نہیں کیا، ان کی آزادی، جان و مال اور حقوقِ شہریت سے کسی قسم کا کوئی تعرّض نہ کیا گیا۔ مکّہ معظّمہ کا نظم و نسق درست کرنے اور تحریکِ اسلام کو شدّ و مدّ سے جاری رکھنے کا اہتمام کرنے کے بعد آپؐ مدینے تشریف لے گئے اور ان دونوں امور کی نگرانی کے فرائض حضرت معاذ بن جبلؓ کو تفویض ہوئے۔[۲۲]

قریش تحریکِ اسلام کے اوّلین دشمن تھے اور انھوں نے اس کو اپنے وقار و حمیّت کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ وقار و حمیّت پر اپنا سب کچھ قربان کر دینے سے دریغ نہ کرنا، اہلِ عرب کا قبائلی و شعوبی شعار تھا۔ علاوہ بریں مسلمانوں کا مکّہ فتح کر لینے کا مطلب قریش کے وقار و حمیّت اور دین و آزادی کا خاتمہ تھا۔ پھر وہ جنگجو، شجاع اور آزادی و آن پر مر مٹنے والے تھے، اور اپنے آپ کو دینِ ابراہیمیؑ اور بیت اللہ کا محافظ سمجھتے تھے، اور اس کی خاطر سب کچھ قربان کرنے کا عزم و داعیہ رکھتے تھے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوصف ان کا مسلمانوں کے خلاف ہتھیار نہ اُٹھانا، بلا مزاحمت مکّہ معظّمہ اور بیت اللہ کو ان کے حوالے کر دینا، آپؐ کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی مثال تاریخ شاید ہی پیش کر سکے۔ یہ تاریخ ساز

واقعہ آپؐ کے بے مثال تدبّر اور حربی نفسیات، د منصوبہ بندی میں مہارتِ تامّہ پر دلالت کرتا ہے۔

مکّہ معظّمہ، جسے بیتُ اللہ کے طفیل سارے عرب میں مرکزی حیثیت حاصل تھی، اِمتدادِ وقت کے ساتھ شرک و بُت پرستی کا مرکز بن چکا تھا۔ اس وادیِ مقدّس اور اللہ کے پاک گھر کو توحید کا مرکز بنانا، آپؐ کا مقصد تھا۔ ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ شرک سے بُت پرستی اور مذہبی پیشوائیت جنم لیتی ہے۔ شرک سے فرد اور قوم دونوں کی شخصیت پارہ پارہ ہو جاتی ہے اور اس میں نظریاتی انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فرد کا وجود ہو یا قوم کا، اس میں کثرت پیدا ہو جانے کے سبب نشو و ارتقا کا امکان ختم ہو جاتا ہے، اور انحطاط و زوال اس کا مقدّر بن جاتا ہے۔ مذہبی پیشوائیت معاشرے میں شرک کو پھیلاتی اور اس کے انتشار و انحطاط کے عمل کو جاری رکھتی ہے، اس عمل سے فکری تضادات پیدا ہوتے ہیں اور معاشرہ نظریاتی و مادّی لحاظ سے مختلف طبقات میں منقسم ہونے لگتا ہے۔ یہاں اس عالمگیر غلط فہمی کا ازالہ کرنا ضروری ہے کہ یہ دین نہیں، مذہبی پیشوائیت یا کلیسائیت ہے جو معاشرے میں طبقات و تضادات پیدا کرتی ہے، اور اس طرح اسے ابلیسی و استحصالی بنا دیتی ہے۔ لہٰذا یہ دین نہیں، مذہبی پیشوائیت ہے جو انسان کی دُشمن ہے۔ اگر مارکس، لینن اور ماؤزے تنگ وغیرہ کمیونسٹ رہنماؤں کی نظر میں یہ حقیقت ہوتی تو وہ دین کے بجائے مذہبی پیشوائیت کے دشمن ہوتے اور صرف اسی کے خلاف جنگ کرتے اور دین سے ہرگز تعرض نہ کرتے۔

عرب کی دینی پیشوائیت قریش کے پاس تھی اور جب تک اس پیشوائیت کا خاتمہ نہ ہوتا عرب معاشرے میں شرک و بُت پرستی اور استحصال و طبقہ بندی کا خاتمہ نہیں ہو سکتا تھا، لہٰذا آپؐ نے قریش کی پیشوائیت و سیادت کو ایسے حُسنِ تدبّر سے ختم کیا کہ نہ تلوار چلی نہ خون بہا، اور پھر قریش کی اس طرح نفسیاتی تطہیر کی کہ وہ خود ہی دُنیا سے ابلیسی و استحصالی معاشروں کو ختم کرنے اور توحید کی بنیادوں پر خالص انسانی معاشرے کی تعمیر و تشکیل کرنے کی خاطر تحریکِ اسلام کے سرگرم کارکن بن گئے۔ اس حکمتِ عملی کا یہ مقصد بھی تھا کہ مکّہ معظّمہ کو بیت اللہ کی بدولت جو فضیلت، تقدّس اور مرکزی حیثیت حاصل ہے، اسے آپؐ نہ صرف قائم رکھنا بلکہ عالمگیر بنانا چاہتے تھے۔ تحویلِ کعبہ آپؐ کے اس منصوبے کی ابتدا اور فتحِ مکّہ اس کی تکمیل تھی۔

آپؐ کی اس حکمتِ عملی کا تحریکِ اسلام کو ایک فائدہ یہ پہنچا کہ اس میں قریش کا جوان و تازہ خون شامل ہو گیا، اور مکّہ معظّمہ تحریکِ اسلام کا ناقابلِ تسخیر حصار بن گیا۔ قریش مدّتِ مدید سے تجارت کی غرض سے بیرونی ممالک جاتے رہتے تھے، اور وہ طبعاً ذہین اور سیاسی بصیرت رکھتے

تھے، اس لیے ان کے جغرافیہ و تاریخ اور قومی خصائل سے واقف تھے۔ چنانچہ تحریکِ اسلام عرب سے نکل کر بیرونی دُنیا میں سرایت کرنے لگی تو قریش اور ان کی معلومات اس کے بڑے کام آئیں۔

شرک و بُت پرستی کا مرکز فتح ہوا تو کُفّار کے قبائل پر اس کا بہت زیادہ نفسیاتی دباؤ پڑا، اور ان کی خود اعتمادی متزلزل ہو کر رہ گئی۔ وہ اپنے آپ کو بے یار و مددگار خیال کرنے لگے، لیکن اس کے باوجود ان میں جذبۂ حمیّت اس قدر زیادہ تھا کہ ان میں سے بعض مضبوط قبائل تحریکِ اسلام کا آخری دم تک مقابلہ کرتے رہے۔

قبائلِ ہوازن و ثقیف کی بغاوت اور جنگِ حنین (شوّال ۸ھ/جنوری فروری ۶۳۰ء)

فتحِ مکّہ اور اہلِ مکّہ کی اکثریت کے تحریکِ اسلام میں شامل ہونے کے سبب ان کے معاہدات جو دیگر قبائل سے تھے، خود بخود کالعدم ہو گئے۔ اہلِ مکّہ کی بلامزاحمت شکست قبول کر لینے کی وجہ سے ان کے حلیف و ہمسایہ قبائل ان سے نفرت کرنے لگے تھے، لہٰذا ان کی اراضی، باغات اور جاگیریں جو طائف میں تھیں، ان پر ہوازن اور ثقیف کے قبائل نے قبضہ کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ دونوں قبائل مبارزت طلبی، جنگی مہارت اور تیر افگنی میں مشہور تھے، لیکن انھیں مسلمانوں کی جوابی کارروائی کا خطرہ تھا، لہٰذا انھوں نے بڑے سوچ بچار کے بعد مکّہ معظّمہ پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس طرح انھیں متعدّد سیاسی و مادّی فوائد حاصل ہو سکتے تھے۔ مکّہ معظّمہ پھر بُت پرستی کا مرکز بن سکتا تھا اور دینی قیادت ان کو میسّر آ سکتی تھی، نیز وہ اسلام کی تحریکِ انقلاب کے خطرے سے، جو ان کے سروں پر منڈلا رہا تھا، ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو سکتے تھے۔

آپؐ ایک سچّے انقلابی، بیدار مغز اور دُور اندیش مدبّر و سپہ سالار کی طرح کسی حال میں بھی غافل نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ فتحِ مکّہ کی مسرّت بھی آپؐ کو تحریکِ اسلام کے دشمنوں سے غافل نہ کر سکی۔ ہر طرف سے معتبر مخبروں اور جاسوسوں کے ذریعے آپؐ کو باقاعدہ اطلاعات ملتی رہتی تھیں۔ جونہی آپؐ کو ان قبائل کے مکّہ معظّمہ پر حملے کی تیّاریوں کی اطلاع ملی، آپؐ نے اپنی سُنّت کے مطابق فوراً جوابی کارروائی کا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے کی خاص بات یہ تھی کہ ان قبائل کو مکّے پر حملہ کرنے کی مُہلت نہ دی جائے بلکہ جنگ ان کی سرزمین میں لڑی جائے۔ جنگی نقطۂ نظر سے یہ حکمتِ عملی بالکل موزوں تھی۔ اس سے ایک تو مجاہدین کا جنگی کردار جو فتحِ مکّہ کے بعد بہت بلند

ہو گیا تھا' اور بلند ہو گیا۔ دوسرے مکے کی سرزمین میں جنگ ہوتی تو مکے کی غیر مسلم آبادی اور منافق لوگوں کی غداری کا خطرہ تھا اور وہ پیچھے سے چھرا گھونپ سکتے تھے۔ آپ ﷺ نے مکہ معظمہ میں مختلف ذرائع سے اسلحہ اور رسد کی فراہمی کا انتظام کیا اور ان شوریدہ سر قبائل کی بغاوت فرو کرنے کے لیے شوال ۸ ہجری میں طائف کی طرف پیش قدمی کی۔

قبائل ہوازن و ثقیف نے بنی مضر اور بنی ہلال کو اس جنگ میں اپنا حلیف و اتحادی بنا لیا' لیکن بنو کعب اور بنو کلاب کو اپنے ساتھ ملانے میں ناکام رہے۔ ان کا متحدہ لشکر چار ہزار بہادر، نڈر اور آزمودہ کار جنگجو جوانوں پر مشتمل تھا' جن میں عرب کے بہترین ناوک افگن بھی شامل تھے۔ اس کا سپہ سالار مالک بن عوف مقرر ہوا اور عرب کا مشہور اور مانا ہوا ماہرِ حرب اور آزمودہ کار سپہ سالار دُرَید بن الصمہ اس کا مشیر بنایا گیا۔ یہ لشکر مکے کی طرف بڑھا' لیکن اسلامی لشکر کی پیش قدمی کی خبر سن کر مالک بن عوف نے وادیِ حنین میں جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا اور وہیں پڑاؤ ڈال دیا۔ درید بن الصمہ نے کھلے میدان کے بجائے اس سے زیادہ محفوظ اور موزوں کوہستانی مقام پر چھاؤنی ڈالنے کا مشورہ دیا، لیکن مالک بن عوف نے اسے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ دُرَید کو جب بنو کعب کی جنگ میں شمولیت نہ کرنے کا پتا چلا تو اس نے اسے بدشگونی پر محمول کیا۔

مالک بن عوف اگرچہ جوان تھا' لیکن بڑا جنگجو اور ماہرِ حرب تھا۔ اس نے لشکر کو کھلے میدان میں رکھا، مگر اس کی حفاظت کے لیے تیر اندازوں کو تین اطراف میں' پہاڑی گھاٹیوں' دروں اور حربی ادٹوں Features میں اس طرح چھپا دیا کہ اسلامی لشکر کو اس کا پتا نہ چل سکا۔ مسلمانوں کو نصرتِ الٰہی سے زیادہ اپنی کثرت پر بھروسہ ہو گیا تھا اور وہ دشمن کی چالوں اور منصوبوں سے غافل و بے پروا ہو گئے تھے۔

صبحِ صادق ہوتے ہی اسلامی لشکر کے مقدمۃ الجیش نے' جس میں اہلِ مکہ کے نومسلم منافق اور غیر مسلم حلیف جوان شامل تھے، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قیادت میں دشمن پر دھاوا بول دیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اپنے معمول کے مطابق بجلی کی سرعت کے ساتھ حملہ کیا اور دشمن پر اس قدر دباؤ ڈالا کہ وہ پیچھے ہٹتا گیا۔ میرے نزدیک دشمن کی اتحادی فوج کا اس منظم طریقے سے پیچھے ہٹنا' مالک بن عوف کی ویسی ہی جنگی چال تھی' جیسی ابوسفیان نے جنگِ احد میں چلی تھی۔ اسلامی لشکر کے جوان جوش میں آگے بڑھتے گئے یہاں تک کہ تیر اندازوں کی زد میں آ گئے، لیکن انھیں اس کی خبر نہ تھی۔ پھر غضب یہ ہوا کہ مالِ غنیمت نے انھیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ادھر وہ مالِ غنیمت پر لپکے' ادھر تیر اندازوں نے تین

طرف سے ان پر تیروں کی بارش کر دی۔ وہ سراسیمہ ہو کر بھاگے۔ اس بھگدڑ میں سارے لشکر کی صفیں درہم برہم ہو گئیں۔ قریب تھا کہ یہ صورتِ حال اسلامی لشکر کی شکست پر منتج ہوتی کہ آپ ﷺ کی بے مثال جرأت و ثابت قدمی نے صورتِ حال کو سنبھالا اور آپ ﷺ کی ولولہ انگیز قیادت نے مجاہدین کے حوصلوں میں توانائی پیدا کر دی۔ آپ ﷺ نے نئی جنگی صورتِ حال کے مطابق نیا جنگی منصوبہ بنایا۔ برق رفتاری سے ان کی صفوں کو درست کیا۔ مقدمۃ الجیش میں انصار اور مہاجرین کو رکھا' اور اس سے پہلے کہ دشمن حملہ کرتا' آپ ﷺ نے انھیں نئے جنگی منصوبے کے مطابق دشمن پر بھرپور حملہ کرنے کا حکم دیا۔ نعرۂ تکبیر کی لرزہ خیز و فلک شگاف گونجوں میں مسلمانوں نے اس جوش و بے جگری سے مقابلہ کیا کہ کفار اس کی تاب نہ لا سکے۔ ان کے دلوں پر اس قدر ہیبت طاری ہو گئی کہ وہ میدان سے بھاگ اٹھے۔ اس حملے میں ان کے تیر انداز بھی بے بس ہو کر رہ گئے' کیونکہ مسلمان ان کی زد سے باہر تھے۔ چنانچہ وہ بھی سراسیمہ ہو کر میدانِ جنگ چھوڑ گئے۔

دشمن کا اتحادی لشکر شکست کھانے کے بعد دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک حصہ دُرَید بن الصمہ کی سرکردگی میں وادیِ حنین ہی میں اوطاس کے مقام پر جمع ہوا' اور دوسرا حصہ مالک بن عوف کی قیادت میں طائف میں پناہ گزین ہو گیا۔

آپ ﷺ نے حسبِ معمول تیزی' پھرتی اور برق رفتاری سے دشمن کے تعاقب کا منصوبہ بنایا۔ اوطاس پر حملے کے لیے حضرت ابو عامر اشعری رضی اللہ عنہ کی قیادت میں فوج بھیجی۔ دُرَید کے پاس اگرچہ کئی ہزار کا لشکر تھا' جس میں تیر افگن بھی تھے' لیکن مسلمانوں کی ہیبت اور رعب کی وجہ سے ان کے دلوں میں نہ وہ ولولہ تھا اور نہ جوش، ہمت بھی پست ہو چکی تھی، لہٰذا وہ بے دلی کے ساتھ لڑے اور شکستِ فاش کھائی۔ اس بار مسلمانوں نے انھیں بھاگنے کا موقع نہ دیا اور انھیں جنگی قیدی بنا لیا۔[۲۳]

محاصرۂ طائف (شوال ۸ھ/فروری ۶۶۳۰ء):

طائف حصار بند شہر تھا' جس میں ایک بڑا مضبوط و مستحکم قلعہ تھا۔ یہاں کے امرائے عرب میں رؤسائے قریش کی ٹکر کے تھے۔ لوگ خوش حال' تند خو' جنگجو اور اپنے عہد کے جدید قسم کے آلاتِ جنگ سے واقف تھے۔ ان کے بعض افراد نے اس فنِ حرب کو یمن ہی جا کر سیکھا تھا۔ مالک بن عوف اپنی شکست خوردہ فوج لے کر اس قلعے میں محصور ہو گیا۔ محصورین نے بڑی عجلت سے قلعے کی مرمت کی، اس میں سال بھر کا سامانِ رسد جمع کیا' چاروں طرف منجنیقیں نصب کیں، اہم مقامات

پر تیر انداز متعین کیے اور اس طرح اسے ناقابلِ تسخیر بنا دیا۔

آپؐ نے اپنی قیادت میں فوج کو طائف کی طرف پیش قدمی کا حکم دیا اور حضرت خالد بن ولیدؓ کو مقدمۃ الجیش کا سالار مقرر کر کے پہلے روانہ کر دیا۔ اسلامی لشکر نے قلعے کا محاصرہ کر کے پہلی مرتبہ قلعہ شکن آلات، دبابہ اور منجنیق استعمال کیے، لیکن اہلِ قلعہ محاصرین سے زیادہ اس فن میں ماہر تھے، اور پھر وہ قلعے کے اُوپر بلند اور محفوظ مقامات میں تھے، لہٰذا وہ بروقت جوابی کارروائی کر کے حملہ آوروں کو نقصان پہنچا کر پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیتے تھے۔

محاصرہ بیس دن تک رہا۔ محصورین میں قلعے سے باہر نکل کر لڑنے کی جُرأت و ہمّت نہ تھی اور محاصرے کو طول دینا تحریکِ اسلام کے مفاد کے خلاف تھا، اور آپؐ کو یہ گوارا نہ تھا۔ آپؐ نے مجلسِ شوریٰ منعقد کی۔ اہلِ رائے کا موقف یہ تھا کہ محصورین کا جنگی کردار متزلزل ہو چکا ہے اور وہ ذہنی طور پر بھی شکست کھا چکے ہیں، لہٰذا ان کے دوبارہ بغاوت کرنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ علاوہ بریں، ان کے نخلستان اور کھیت جن پر ان کی معیشت کا انحصار تھا، برباد ہو چکے ہیں اور اقتصادی ناکہ بندی انھیں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دے گی، لہٰذا سرد جنگ کے ذریعے ان کو مطیع کرنا زیادہ مناسب ہے۔ مشورہ معقول تھا، آپؐ نے قبول فرمایا اور محاصرہ اُٹھا لیا۔ اس موقع پر بعض صحابہ کرامؓ نے آپؐ سے ثقیف کو بددُعا دینے کی درخواست کی۔ رحمۃٌ للعالمینؐ نے آسمان کی طرف دیکھا اور دُعا کی: "اللہ تعالیٰ ثقیف کو ہدایت دے کہ وہ میرے پاس چلے آئیں"۔ یہ دُعا تحریکِ اسلام کی غایت اور اس کی انقلابی و مجاہدانہ سرگرمیوں کے مقصودِ حقیقی کی مظہر ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہدایت و رحمت ہی آپؐ کی تحریکِ رحمۃٌ للعالمینی کی غایتِ حقیقی تھی، اور ہے۔[۲۴]

طائف سے آپؐ واپس جعرانہ تشریف لائے، جہاں آپؐ نے مالِ غنیمت کو مجاہدین میں تقسیم کیا۔ آپؐ کی نظر ہمیشہ قریش کی غیر معمولی صلاحیتوں پر رہتی تھی۔ مقصود یہ تھا کہ ان کے دلوں کو مسخّر کر کے ان سے تحریکِ اسلام کو کامیاب بنانے کے لیے پورا پورا کام لیا جائے۔ مسلمانوں سے برسرِ پیکار رہنے اور تجارتی دشواریوں کی وجہ سے قریش کی معاشی حالت ابتر ہو چکی تھی، لہٰذا انھیں مال و دولت دے کر ان کے دلوں کی تالیف و تسخیر کا یہ بہترین موقع تھا۔ آپؐ حقیقی معنوں میں بلند پایہ مُدبّر تھے، لہٰذا آپؐ کے حُسنِ تدبّر نے اس موقع سے پُورا پُورا فائدہ حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ مالِ غنیمت کثیر تھا۔ آپؐ نے اس کا کثیر حصّہ قریش کو عطا کر دیا۔

انسان بہرحال بشر ہے۔ انصار میں سے وہ لوگ جن کی نظر آپؐ کی اس حکمتِ عملی پر نہ تھی،

انھیں قریش پر آپؐ کی اس عطائے کثیر سے رنج پہنچا، اور پھر اپنی اس محرومی کا ملال بھی ہوا۔ یہ اصحاب سچّے اور سادہ دل تھے اور انھیں آپؐ سے والہانہ محبّت تھی۔ حرفِ شکایت زبان پر آ ہی گیا۔ آپؐ کو ایک ایک بات کی خبر ہو جاتی تھی۔ آپؐ نے یہ سُنا تو انصار کی غلط فہمی کو دُور کرنے کے لیے فوراً ان کا اجلاس بلایا۔ انصار جمع ہوئے تو آپؐ نے اس موقع پر ایسا خطبہ دیا جو ایجازِ بلاغت کی بہترین مثال ہے۔ آپؐ نے انصار کو مخاطب کر کے فرمایا:

"کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم پہلے گمراہ تھے، اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعے تمھیں ہدایت کی۔ تم منتشر و پراگندہ تھے، اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعے تم میں وحدت و جمعیت پیدا کی۔ تم مفلس تھے، اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعے تمھیں تونگری دی؟" آپؐ کے ہر جُملے پر انصار کہتے جاتے تھے کہ اللہ اور رسولؐ کا احسان سب سے بڑھ کر ہے۔ دفعتاً آپؐ نے کلام کا رُخ بدلا اور فرمایا:

"نہیں۔ تم یہ جواب دو کہ اے محمدؐ! لوگوں نے جب تیری تکذیب کی تو ہم نے تیری تصدیق کی۔ لوگوں نے تجھے چھوڑ دیا تو ہم نے پناہ دی۔ تو مفلوک الحال آیا تھا، ہم نے تیری ہر قسم کی مدد کی۔" پھر ذرا توقّف کے بعد آپؐ نے فرمایا "تم یہ جواب دیتے جاؤ اور میں کہتا جاؤں گا کہ تم سچ کہتے ہو۔ لیکن اے انصار! کیا تمھیں یہ پسند نہیں کہ لوگ اُونٹ اور بکریاں لے جائیں اور تم محمدؐ کو لے کر اپنے گھر جاؤ؟" انصار، جن کے دلوں پر پہلے ہی رقّت طاری تھی، آپؐ کے اس سوال سے تڑپ اُٹھے اور بیساختہ پکار اُٹھے:

"ہمیں اور کُچھ نہیں، صرف محمدؐ چاہیے۔"[۲۵]

مجمع پر عجیب کیفیت طاری تھی۔ دل گداز، آنکھیں اشکبار اور لبوں پر آہ و فغاں تھی۔ احساسِ ندامت سے سر جُھکے ہُوئے تھے۔ صحابہ کرامؓ کی ڈاڑھیاں آنسوؤں سے تر تھیں اور خشیّتِ الٰہی سے دِلوں پر لرزہ طاری تھا۔ ساتھ ہی آپؐ کی زبانِ مبارک سے یہ مُژدۂ جانفزا سُن کر کہ رحمۃ للعالمینؐ ان کے ہیں اور ان کے پاس ہی رہیں گے، ان کے دل نورِ مسرّت سے جگمگا اُٹھے۔ وہ لذّتِ سوز و سازؔ کے اس عالم میں تھے کہ آپؐ نے ان سے ناصحانہ انداز میں فرمایا: "اہلِ مکّہ نو مسلم ہیں۔ ان کو حق کی بنا پر نہیں بلکہ تالیفِ قلوب کی خاطر مال دیا ہے"۔ بات سچ تھی، دلوں میں اُتر گئی۔ انصار کا شکوہ دراصل رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے والہانہ محبّت کی وجہ سے تھا، اور جب انھیں یہ یاد دلایا گیا کہ "آپؐ" ان کے ہیں اور دونوں جہاں کی یہ متاعِ بے بہا ان کے پاس رہے گی تو ان کے دلوں میں طمانیّت و مسرّت کی جنّتیں بس گئیں۔ اہلِ حُسن و نظر جانتے ہیں کہ مدینہ آپؐ کی برکت سے آج بھی مہبط

انوار و ملائکہ اور زیارت گاہِ خلائق ہے۔

آپؐ کے پاس چھ ہزار کے قریب جنگی قیدی تھے۔ اس موقع پر بھی آپؐ نے حسبِ معمول عفو و درگزر اور رحمت و شفقت کا مظاہرہ کیا اور فدیہ و شرط کے بغیر سب کو رہا کر دیا۔ ان جنگی قیدیوں میں آپؐ کی رضاعی بہن حضرت شیماؓ بھی تھیں۔ آپؐ نے ان کو پہچانا تو جوشِ محبت سے آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ ان کے لیے آپؐ نے خود اپنی رِدائے مبارک بچھائی، انھیں چند اونٹ اور بکریاں مرحمت فرمائیں اور ان کی خواہش پر انھیں عزت و احترام کے ساتھ ان کے خاندان کے پاس پہنچا دیا۔[۱۶۵]

اس سال کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو حضرت ماریہ کے بطن سے ایک بیٹا عطا فرمایا۔ آپؐ نے ان کا نام ابراہیم رکھا۔ لیکن آپؐ کا یہ پیارا بیٹا تقریباً ڈیڑھ برس کے اندر ہی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ وفات کے دن اتفاق سے سورج کو گرہن لگا۔ لوگوں نے اسے وفاتِ ابراہیم سے منسوب کیا، کیونکہ اہلِ عرب کا عقیدہ تھا کہ کسی عظیم انسان کی موت پر سورج گرہن ہوا کرتا ہے۔ آپؐ کو خبر ہوئی تو آپؐ نے اس عقیدے کے بطلان کے لیے لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا:

"سورج اور چاند قدرت کی تخلیقات ہیں، کسی کے مرنے یا جینے سے ان کو گرہن نہیں لگتا۔" اس کے بعد آپؐ نے نمازِ کسوف باجماعت ادا کی۔

سورج گرہن سے متعلق باطل عقیدے کے بطلان کا یہ واقعہ سطح بیں نظروں کو شاید معمولی سا نظر آئے، لیکن اہلِ نظر کے نزدیک یہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس بات کے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ سورج گرہن کے متعلق قدیم عرب کے عقیدے سے لوگوں کے دلوں میں آپؐ کے جلیل القدر فرزند کی عظمت کا سکّہ بیٹھتا تھا، اور اس سے خود بخود دل میں یہ عقیدہ پیدا ہوتا تھا کہ اگر بیٹا اتنا عظیم ہے کہ اس کے انتقال پر سورج کو گرہن لگ گیا تو باپ کی وفات پر نہ جانے دنیا پر کیا قیامت ٹوٹے گی۔ آپؐ چونکہ اللہ تعالیٰ کے سچے نبی تھے، اس لیے آپؐ نے اس جھوٹے عقیدے کی فوراً تردید کر دی۔ یہ تردیدِ باطل اہلِ صدق و نظر کے نزدیک آپؐ کی صداقت کی دلیل ہے۔

آپؐ کا نمازِ کسوف باجماعت ادا کرنا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ آپؐ کو اللہ تعالیٰ کی حضوری کس قدر محبوب و مرغوب تھی، اور اس سے جو دولتِ دل ملتی ہے، اس سے دوسروں کے

دامنِ زندگی کو معمور کرنا بھی آپؐ کا شعارِ زندگی تھا۔

عورت کتنے ہی عظیم اور جلیل القدر انسان کی بیوی کیوں نہ ہو، وہ اپنی ذات کو فراموش نہیں کر سکتی۔ وہ گھریلو زندگی میں ربوبیت چاہتی ہے اور اس کے لیے مادّی وسائل کا ہونا لازمی ہے، لہٰذا عورت مادّی وسائل سے صرفِ نظر نہیں کر سکتی۔ آپؐ کی ازواجِ مطہرات ایک تو خوشحال گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں، دوسرے انھیں بھی مادّی وسائل کی حاجت تھی، تیسرے مسلمانوں میں خوشحالی کا دَور شروع ہو چکا تھا، اس لیے انھوں نے بھی آپؐ سے بنیادی ضروریات کی فراہمی کا مطالبہ کیا۔ وہ آپؐ کو لوگوں میں مالِ غنیمت کے خزانے تقسیم کرتے اور خالی ہاتھ گھر آتے دیکھتی تھیں۔ لوگوں کے دلوں کو منوّر اور ان کے چولھوں کو روشن کرنے والے رحمۃٌ للعالمینؐ کے گھر میں کئی کئی دن تک چولھا روشن نہ ہوتا تھا، اور نانِ جویں تک میسّر نہیں آتی تھی۔ ازواجِ مطہرات کے دل بہرحال صنفِ نازک ہی کے تو دل تھے، وہ گھر کی بے سروسامانی، مفلوک الحالی، معیشت کی تنگی اور محرومی کے شکیب رُبا منظر کے حریف نہ ہو سکے اور بھر آئے، بات لبوں پر آئی، لیکن شنوائی نہ ہوئی۔ بات بڑھی، شکوے تک پہنچی، لیکن مداوا نہ ہوا تو شکایت کے دفتر کھل گئے۔ گھریلو نقطۂ نظر سے یہ مطالبات ناجائز نہ تھے، لیکن ان کی نظر سے یہ بات اوجھل ہو گئی کہ وہ عام عورتیں نہیں ہیں بلکہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی ازواجِ مطہرات ہیں جو ایک مثالی انسان ہیں، جنھوں نے افرادِ نسلِ انسانی کو عملاً یہ دکھانا تھا کہ عظیم مقاصد اور معاشرے کے وسیع تر مفادات کی خاطر وہ ایسے تجربات سے کیسے گزر سکتے ہیں۔ نیز آپؐ نے اپنی سیرت کے حوالے سے یہ ثابت کرنا تھا کہ اسلام محض نظریاتی نہیں عملی دین ہے، لہٰذا نبی کی شریکِ حیات ہونے کی حیثیت سے انھیں آپؐ کے عظیم و آفاقی مقاصد کی خاطر ایثار و قربانی بھی اتنی ہی زیادہ کرنا ہو گی۔ انھیں اس حقیقت کا احساس دلانے کی خاطر آپؐ نے ایک ماہ کے لیے ان سے علیحدہ رہنے کا فیصلہ کیا اور بالائی منزل کے ایک الگ تھلگ حجرے میں خلوت گزیں ہو گئے۔ اس خلوت کدے میں کسی شخص کو آنے کی اجازت نہ تھی۔

قرائن سے مترشّح ہوتا ہے کہ آپؐ کی اس مکمل خلوت گزینی کا ایک یہ مقصد بھی تھا کہ آپؐ کو اب معاشرے کی تعمیر و تشکیل اور تحریکِ اسلام کے آئندہ لائحہ عمل کو مرتب کرنے کے لیے فراغت و تنہائی اور مسلسل غور و فکر کی ضرورت تھی۔ ایک ماہ کی علیحدگی اور محبت سے محرومی کا ازواجِ مطہرات پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کے حوالے سے ان میں اپنی حیثیت، عظمت

اور ذمّے داریوں کا شعور بیدار ہو گیا اور انھوں نے اپنے دل میں آپ ﷺ کی رفاقت میں ہر امتحان و تجربے سے گزرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اگرچہ یہ قطعی طور سے معمولی قسم کا گھریلو معاملہ تھا، لیکن وہ جو منافق تھے، انھوں نے بات کا بتنگڑ بنا دیا اور یہ افواہ اُڑا دی کہ آپ ﷺ نے ازواجِ مطہرات کو طلاق دے دی ہے۔ اس افواہ سے ان کا مقصد آپ ﷺ اور صحابۂ کرام رضؓ میں ناچاقی پیدا کرنا تھا، جن سے آپ ﷺ کا رشتۂ صہر تھا۔ ان کے نزدیک اس دور کی قبائلی عصبیتی زندگی میں یہ گھریلو مسئلہ ایک زبردست معاشرتی خلفشار اور خانہ جنگی کی صورت پیدا کر سکتا تھا، لیکن آپ ﷺ کی محبت صحابۂ کرام رضؓ کے دلوں میں اپنے جان و مال، والدین، اولاد سب کی محبت پر حاوی تھی۔ منافقوں کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ ایک ماہ ہوا تو آپ ﷺ پر وحی نازل ہوئی، جس میں آپ ﷺ کو ازواجِ مطہرات سے متعلق واضح ہدایات دی گئی تھیں :

"اے نبی ﷺ! اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینت کی طلب و آرزو رکھتی ہو تو آؤ، میں تمھیں مال و متاع دوں اور حسین طریقے سے رُخصت کر دوں۔ لیکن اگر تمھیں اللہ تعالیٰ، رسول ﷺ اور آخرت کے گھر (جنّت) کی طلب و جستجو ہے تو تم میں جو احسان کرنے والی ہیں، ان کے لیے اللہ نے اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔" (الاحزاب ۳۳ : ۲۸، ۲۹)۔

جو بات پہلے ہی آپ ﷺ کے قلبِ مبارک میں تھی، وہی کلامِ الٰہی میں تھی، کیونکہ آپ ﷺ کی موضوعی و معروضی زندگی رنگِ الٰہی سے مزیّن تھی۔ آپ ﷺ ایک ماہ کے بعد خلوت سے جلوت میں آئے اور اہلِ شوق کو اذنِ باریابی ہوا۔ آپ ﷺ کے رُخِ روشن کو دیکھا تو یوں محسوس ہوا کہ عید کا چاند طلوع ہو گیا ہے۔ وہ دن اہلِ دید کے لیے روزِ عید تھا۔ صحابۂ کرام رضؓ کے چہرے جو پہلے اداس و مغموم تھے، فرطِ مسرّت سے شاداب ہو گئے۔ معاشرتی زندگی میں جو انقباض پیدا ہو گیا تھا، وہ دُور ہو گیا، اور اس میں پھر بسط و کشادگی پیدا ہو گئی۔

اہلِ شوق و دید سے رُخصت ہو کر سب سے پہلے آپ ﷺ حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کے پاس تشریف لے گئے اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے کو ان کے سامنے پیش کیا۔ دل تو پہلے ہی بدل چکا تھا، انھوں نے فوراً جواب دیا : مجھے اللہ اور رسول ﷺ کے سوا کچھ نہیں چاہیے۔ یہی جواب دوسری ازواجِ مطہرات کا بھی تھا۔ آپ ﷺ گھر تشریف لائے تو عید کا سماں بندھ گیا۔ ہر حجرہ، جو فراق میں تاریک و سوگوار تھا، عیدِ وصال کی مسرّتوں سے جگمگا اُٹھا۔ گھر حُسن المآب بن گیا۔

عظیم انسانوں کے سوانحِ حیات سے اس تلخ حقیقت کا پتا چلتا ہے کہ ان میں بہتوں کی

گھریلو زندگی بڑی تلخ تھی اور انھیں گھر کی مسرّتیں میسّر نہ تھیں۔ اس کا عموماً یہ سبب ہوتا ہے کہ ایسے انسان اپنے مشن میں اس قدر کھو جاتے ہیں کہ گھر کی طرف بہت کم توجّہ دیتے ہیں۔ عورت شوہر کی اس کم التفاتی کو اس کی بے مہری اور بے وفائی پر محمول کرتی ہے اور اس کا انتقام یہ لیتی ہے کہ گھر کو جہنّم بنا کر شوہر کو اس کی مسرّتوں سے محروم کر دیتی ہے۔ لیکن آپ ﷺ کی یہ امتیازی خوبی ہے کہ آپ ﷺ عظیم ترین انسان بھی تھے، اور آپ ﷺ کو گھریلو زندگی کی مسرّتیں بھی اتنی ہی زیادہ میسّر تھیں، حالانکہ گھر میں مفلوک الحالی اور بے سر و سامانی کا عالم رہتا تھا۔ اس کے دو بنیادی اسباب تھے : ایک یہ کہ آپ ﷺ بھرپور زندگی گزارتے تھے۔ اس سے مُراد یہ ہے کہ انفرادی و اجتماعی زندگی کا ایک ایک گوشہ آپ ﷺ کی نظر و عمل میں رہتا تھا۔ دوسرے یہ کہ آپ ﷺ پیکرِ مہر و وفا تھے اور اپنی ہر شریکِ حیات کے جذبات و احساسات اور حقوق و مراعات کا پورا پاس و لحاظ رکھتے تھے۔

احکامِ قرآنی کی متابعت میں آپ ﷺ ازدواجی زندگی کو غیر معمولی اہمیّت دیتے تھے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ معاشرتی زندگی کی اساس ہوتی ہے۔ چونکہ گھروں سے خاندان اور خاندانوں سے معاشرہ تشکیل پاتا ہے، اس لیے جس قسم کی گھریلو اور خاندانی زندگی ہوتی ہے، اسی قسم کی معاشرتی زندگی بھی ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ جیسا کہ آپ ﷺ کی احادیثِ طیبہ سے ثابت ہے، شیطان (جو انسان کا دشمن ہے) کی انتہائی کوشش میاں بیوی میں بدگمانی و ناچاقی پیدا کر کے گھریلو زندگی میں فساد برپا کرنا ہوتا ہے اور اسے وہ اپنی سب سے بڑی کامیابی سمجھتا ہے۔ ایسی ہر کوشش اسلام میں انتہائی مذموم اور گناہ ہے۔

غزوۂ تبوک : (رجب ۹ھ / نومبر ۶۳۰ء)

موتہ کی جنگ میں رُومی سلطنت اپنی فوج اور جنگی وسائل کی بہت زیادہ کثرت کے باوجود مسلمانوں کے قلیل التعداد لشکر کا کچھ نہ بگاڑ سکی تھی۔ اہلِ روما اسے بجا طور پر اپنی ذلّت و ناکامی سمجھتے تھے۔ انھوں نے عرب کی سرحد پر اپنے باجگزار عیسائی عرب قبائل کو اسلامی مملکت پر حملہ کرنے کے لیے تیّار رہنے کا حکم دیا اور خود بھی تیّاریاں کرنے لگے۔ آپ ﷺ کے جاسُوسوں میں نبطی سوداگر بھی تھے۔ ان کے ذریعے آپ ﷺ کو رومیوں کے جنگی منصوبے، تیّاریوں اور فوجی نقل و حمل کی اطلاعات ملیں تو آپ ﷺ نے اپنے دستور کے مطابق فوری طور سے جوابی کارروائی کرنے کا منصوبہ بنایا، جس کی ایک اہم شق یہ تھی کہ دُشمن کو نہ تو حملہ کرنے میں پہل کا موقع دیا جائے اور نہ اسے اپنی سرحد کے اندر آنے دیا جائے۔ ان دنوں عرب میں قحط پڑا ہوا تھا اور گرمی جوبن پر تھی، اس لیے سفر انتہائی دشوار گزار تھا۔

فوج کا ان حالات میں اتنا دُور دراز پیدل صحرائی سفر کرنا قریب بغریب ناممکن تھا، اور سب مجاہدین کے لیے سواری کا انتظام بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر قحط میں رسد کی فراہمی کا مسئلہ بھی درپیش تھا۔ حالات اس قدر نامساعد و شکیب رُبا تھے کہ بڑے سے بڑا جانباز و تجربہ کار سپہ سالار بھی ایسی مہم پر جانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا، لیکن آپؐ نے اپنی ولولہ انگیز قیادت اور حُسنِ تدبر کی بدولت تیس ہزار مجاہدین کا لشکرِ جرّار تیار کر لیا جس میں صرف دس ہزار سوار تھے، یعنی تین مُجاہدوں کے حصّے میں ایک گھوڑا آیا، جس پر انھیں باری باری سفر کرنا تھا، لیکن مُجاہدوں کی ایک خاصی تعداد کے لیے سواری کا یہ انتظام بھی نہ ہو سکا۔ وہ جہاد و شہادت کی سعادت سے محرومی پر روتے تھے۔ ان کے آنسوؤں کی ایک قیمت تو یہ لگی کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں ان کی اس کیفیت کا ذکر کر کے انھیں زندۂ جاوید کر دیا اور دوسری قیمت یہ لگی کہ انھیں جنّت کی حیاتِ محض عطا کر دی۔

اس لشکر کی تیاری میں صحابۂ کرامؓ نے مثالی ایثار و قربانی کا مظاہرہ کیا۔ زاد و راحلہ کی بہت زیادہ کمی کے سبب اسے "جیشُ العُسرت" بھی کہتے ہیں۔ اہلِ روما کی جنگی تیّاریوں سے متعلق نبطی سوداگروں کی اطلاعات بے بنیاد تو نہ تھیں مگر مبالغہ آمیز ضرور تھیں۔ رومیوں اور غسانی قبائل نے عرب پر حملہ کرنے کا منصوبہ ان اطلاعات کی بنا پر بنایا تھا کہ پیغمبرِ اسلام صلّی اللہ علیہ وسلّم کا انتقال ہو چکا ہے، اسلامی مملکت کا شیرازہ بکھر چکا ہے اور قحط نے عربوں کو کمزور و لاچار کر دیا ہے۔ لیکن جب ان کو مسلمانوں کے لشکرِ جرّار کی پیش قدمی کی اطلاعات ملیں تو وہ اس قدر حیران و مرعوب ہوئے کہ انھیں نبرد آزما ہونے کی ہمت نہ ہوئی۔ آپؐ نے تبوک کے مقام پر چھاؤنی ڈالی اور بیس دن تک دشمنوں کا انتظار کیا، لیکن انھیں مقابل آنے کی جرأت نہ ہوئی۔ مسلمانوں کی یہ عسکری و سیاسی فتح تھی اور اس سے تحریکِ اسلام کو متعدد فوائد حاصل ہوئے۔ سرحدی علاقے کے کئی قبائل مرعوب ہو کر مطیع ہو گئے اور انھوں نے جزیہ دینا منظور کر لیا، مثلاً ایلہ کے سردار یوحنا اور دومۃ الجندل کے سردار اکیدر۔ اس رقم سے اسلامی حکومت کے وسائلِ آمدن میں اضافہ ہو گیا اور تحریکِ اسلام کے اثر و نفوذ کے آفاق حدودِ عرب سے ماوراء ہو گئے۔[۲۷]

زندگی کے ہر گوشے میں آپؐ کی کامیابی کا ایک سبب یہ تھا کہ آپؐ کی نظر بیک وقت حال اور مستقبل پر رہتی تھی۔ تحریکِ اسلام بنیادی طور سے ایک عالمگیر انقلابی تحریک تھی، لہٰذا اس کی حدُود کو وسیع سے وسیع تر کرنا آپؐ کے ہر اقدام و مُہم کی مضمر غایت ہوتی تھی۔ اس مُہم سے آپؐ کو اس مقصد میں خاص کامیابی ہوئی۔ دُور رس نتائج کے اعتبار سے اس مُہم کی اہمیت و افادیت میں مبالغہ نہیں ہو سکتا۔

مسجدِ ضرار کی تخریب

اس مہم میں دو اور ایسے واقعات رونما ہوئے جن کا اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں ذکر فرمایا ہے: ان میں سے ایک مسجدِ ضرار کا واقعہ ہے۔ یہ مسجد منافقوں نے مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے اور ان کے خلاف سازشوں کا اڈہ بنانے کی غرض سے تعمیر کی تھی۔ آپؐ نے اس مہم سے مراجعت فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو منافقوں کے ارادہ و نیت سے آگاہ کر دیا۔ آپؐ نے اس مسجدِ ضرار کو نذرِ آتش کرا دیا۔

دوسرا واقعہ بالخصوص ان تین صحابۂ کرامؓ کا ہے جو محض تساہل کے باعث اس جہاد میں شرکت نہ کر سکے تھے۔ یہ تین شخص حضرت کعب بن مالکؓ، حضرت ہلال بن امیہؓ اور حضرت مرارہ بن ربیعؓ تھے۔ چونکہ یہ سچّے مسلمان اور مجاہد تھے، جہاد و شہادت کی طلب و آرزو رکھتے تھے اور محض تساہل کی وجہ سے جہاد میں شریک نہ ہوئے تھے اور پھر انھوں نے آپؐ سے سچ بولا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی اور مسلمانوں میں جہاد کی غیر معمولی اہمیت کا ایقان پیدا کرنے کے لیے اس واقعے کو قرآن مجید میں بیان فرمایا۔[۲۸]

ایک تاریخی اعلان (ذیقعد ۹ھ / فروری۔ مارچ ۶۳۱ء):

اس میں شک نہیں کہ مدینہ منوّرہ کو دارالحکومت ہونے کے باعث ازبس اہمیت حاصل تھی، لیکن مکّہ معظمہ کو بیت اللہ کی وجہ سے مرکزِ اسلام بننا تھا، لہٰذا اسے اہلِ شرک و کفر سے پاک و صاف کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ فتحِ مکّہ کے ایک برس کے اندر امن و امان بحال ہو گیا اور سیاسی حالات سازگار ہو گئے تو آپؐ نے ۹ ہجری میں، حج کے موسم میں، تین سو مسلمانوں کی ایک جماعت کو حضرت ابوبکر صدیقؓ کی قیادت میں مکّہ معظمہ روانہ کیا اور حضرت علیؓ کو ایک تاریخی اعلان دے کر نقیبِ اسلام مقرر فرمایا۔ حضرت سعد بن وقاصؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت جابرؓ وغیرہ کو معلّمی کے فرائض تفویض ہوئے۔

تمام مسلمانوں نے سُنّتِ ابراہیمیؑ کے مطابق مناسکِ حج ادا کیے۔ قربانی کے دن حضرت ابوبکر صدیقؓ خطبہ دے چکے تو حضرت علیؓ نے پہلے سُورۃ براءت کی چالیس آیات تلاوت کیں اور پھر حکومت کی طرف سے یہ اعلان کیا کہ آج کے بعد کوئی مشرک و کافر خانۂ کعبہ میں داخل نہ ہو سکے گا،

اور نہ کوئی شخص برہنہ ہو کر حج کر سکے گا۔ نیز وہ تمام معاہدے جو مشرکین سے طے پائے تھے، ان کی خلاف ورزیوں کے سبب آج سے چار ماہ بعد منسوخ ہو جائیں گے۔

اس تاریخی اعلان سے چار عظیم مقاصد حاصل ہوئے : ایک تو حج کے متعلق سنّتِ ابراہیمیؑ کا احیا ہوا، دوسرے مکّہ معظّمہ کی مقدّس سرزمین کفّار و مُشرکین سے پاک و صاف ہو گئی، تیسرے وہ بھاری تعداد میں تحریکِ اسلام میں شامل ہو گئے اور چوتھے کہ مکّہ معظّمہ عالمِ اسلام کا مرکز بن گیا اور اس طرح آپؐ کے مشن کی تکمیل ہو گئی۔[۲۹]

حواشی و تشریحات

(۱) ابن ہشام، باب خروج رسول اللہؐ الی الملوک، طبری، ۳ : ۱۵۵۹۔

(۲) صحیحین، ڈاکٹر محمد حمید اللہ : سیاسی وثیقہ جات (اردو ترجمہ)، ص ۵۱، ۵۲۔ اِس نامۂ مبارک کا متن مفصلۂ ذیل ہے :

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ من محمد رسول اللہ الیٰ ھرقل عظیم الروم۔ سلام علیٰ من اتبع الھدیٰ۔ اما بعد۔ فانی ادعوکَ بدعایة الاسلام۔ اسلم تسلم۔ یوتکَ اللہ اجرکَ مرتین۔ فان تولیت فان علیکَ اثم الاریسیین۔ ویاھل الکتب تعالوا الی کلمه سوآء بینا وبینکم الاتعبد الا اللہ ولا نشرکُ به شیئاً۔ ولایتخذ بعضنا بعضنا ارباباً من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون۔"

(۳) اس خط کے اصل ہونے کے متعلق مغرب کے بعض صیہونی و صلیبی مستشرقین (مثلاً گولڈ تسیہر، کاتانی وغیرہ) نے جانتے بوجھتے ہوئے شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے اور اسے جعلی ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے ان اسلام دشمن مستشرقین کا مدلل و مسکت جواب دیا ہے۔ (دیکھیے ان کی کتاب رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی، ص ۲۳۴ تا ۲۴۷ بعد)۔

(۴) ڈاکٹر محمد حمید اللہ : سیاسی وثیقہ جات، ص ۵۲، ۵۳۔

(۵) موضوع مذکور۔

(۶) اس بادشاہِ ایران کا نام پرویزین، ہرمزین، نوشیروان تھا۔ اس نامۂ مبارک کا متن مندرجۂ ذیل ہے :

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ من محمد رسول اللہ الیٰ کِسریٰ عظیم فارس، سلام علیٰ من اتبع الھدیٰ وآمن باللہ ورسوله وشھد ان لا الٰه الا اللہ

وحدہٗ لاشریکَ لہٗ وان محمّداً عبدہٗ و رسول - ادعوکَ بدعایة اللہ فانّی انا رسول اللہ الی الناس کافة لینذر من کان حیا ویحق القول علی الکٰفرین۔ اسلم تسلم فان ابیت فعلیك اثم المجوس۔"

(۷) قرآن مجید کی اصطلاح میں زندہ وہ شخص ہے جس کا قلب یا ضمیر مُردہ نہ ہو، بلکہ زندہ ہو' اور اس میں سننے اور سمجھنے کی صلاحیّت مفقود نہ ہوگئی ہو' اور اسے حق کی طلب و جستجو ہو۔ اصل میں زندہ شخص وہ ہوتا ہے جس کا قلب زندہ ہو اور قلبِ زندہ وہ ہوتا ہے جس میں تقویٰ ہو۔

(۸) ڈاکٹر محمد حمیداللہ : سیاسی وثیقہ جات، ص ۴۷، ۵۷، ابوالبرکات عبدالرؤف داناپوری : اصح السیر' کراچی، تاریخ ندارد، ص ۴۳۵ بعد۔

(۹) طبری، ۳ : ۱۵۷۲ بعد، ڈاکٹر محمد حمیداللہ نے اس موضوع پر محقّقانہ و مفصّل بحث کی ہے اور اس خط سے متعلق اسلام دشمن مستشرقین کے اعتراضات کا مسکت جواب دیا ہے۔ (رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی، ص ۲۳۳ تا ۲۵۳)۔

(۱۰) نامۂ نبویؐ کا متن :

"بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم۔ من محمّد رسول اللہ الیٰ النجاشی ملكُ الحبشه۔ اسلم انت فانّی احمد الیكَ اللہ الّذی لا الٰہ الا ھو الملكُ القدوس السّلام المومن المھیمن واشھد ان عیسیٰ بن مریم رُوح اللہ وکلمة القاھا الی مریم البتول الطیبه المحصنة فحملت بعیسیٰ فخلقه اللہ من روحه ونفخه کما خلق آدم بیده وانی ادعوكَ وجنودكَ الیٰ اللہ عزوجل وبلغت و نصحت فاقبلو نصیحتی والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ۔" (دیکھیے داناپوری : اصح السیر، ص ۴۳۶، نیز دیکھیے ڈاکٹر حمیداللہ : سیاسی وثیقہ جات، ص ۴۶، ۴۷ بعد۔ وہی مصنف؛ رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی، ص ۱۸۷، ۱۸۸ بعد۔ اس کتاب میں ڈاکٹر موصوف نے اس نامۂ مبارک سے متعلق مستشرقین کے اعتراضات کا مدلّل و مفصّل جواب دیا ہے)۔

(۱۱) طبری، ۳ : ۱۵۶۹ تا ۱۵۷۰، صبح الاعشیٰ، ۶ : ۴۶۶ تا ۴۶۷، ابن کثیر، ۳ : ۸۴۔ ابن قیم : زادالمعاد، ۳ : ۶۰ تا ۶۱، محمد حمیداللہ : رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی، ص ۱۶۴ تا ۱۸۴۔ نجاشی کے خطوط جو اس نے آپؐ کی خدمت میں بھیجے تھے۔ ڈاکٹر محمد حمیداللہ نے مستشرقین کے اعتراضات سے بڑی دلچسپ اور محقّقانہ بحث کی ہے۔

(۱۲) رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی، ص ۱۹۹ تا ۲۲۲۔ اس خط کے اصلی ہونے پر بعض مستشرقین نے اعتراضات کیے ہیں اور بعض نے تائید کی ہے۔ ڈاکٹر محمد حمیدُاللہ نے معترضین کے اعتراضات کا مدلّل و مسکت جواب دیا ہے۔

آپؐ کے گرامی نامہ کا متن :

"بسمِ اللہِ الرّحمٰنِ الرّحِیمِ۔ من محمّد عبد اللہ ورسول الیٰ المقوقس عظیم القبط۔ سلام علی من اتبع الھدیٰ۔ امابعد۔ فانی ادعوكَ بدعایة الاسلام۔ اسلم یوتكَ اللہ اجركَ مرتین۔ فان تولیت فعلیكَ اثم اھل القبط۔ یا اھل الکتب تعالوا الی کلمه سوآء بیننا وبینکم ان لا نعبد الا اللہ۔ ولا نشركُ به شیئاً۔ ولا یتخذ بعضنا بعضاً اربابا من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون۔"

مہر
اللہ
رسول
محمد

دیکھیے طبری، ۳ : ۱۵۶۹ تا ۱۵۷۰، صُبح الاعشیٰ، ۶ : ۴۶۶ تا ۴۶۷، ابن کثیر، ۳ : ۸۴، زادالمعاد، ۳ : ۶۰ تا ۶۱۔

(۱۳) محلّ مذکور، نیز دیکھیے ابن القیم : زادالمعاد، ۳ : ۱۸۴ تا ۱۸۶، داناپوری : اصح السیر، ص ۴۳۸ بعد۔

(۱۴) آپؐ کے نامہ مبارک کا متن، جسے آپؐ نے سلیط بن عمروؓ کے ذریعے بھجوایا :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ من محمد رسول اللہ الیٰ ھوذہ بن علی۔ سلام علیٰ من اتبع الھدیٰ واعلم ان دینی سیظھر الیٰ منتھی الخف والحافر فاسلم تسلم واجعل لكَ ماتحت یدیكَ۔

مہر
اللہ
رسول
محمد

(۱۵) زادالمعاد، ۳ : ۱۹۴ تا ۱۹۵، اصح السیر، ص ۴۳۹ بعد۔
دیکھیے (۱) سیرۃ ابن ہشام، ۲، (۲) قلقشندی : صُبح الاعشیٰ، ۶ : ۳۷۷ تا ۳۸۰ بعد، ۴۶۶ بعد۔ (۳) مسند احمد بن حنبل، ۲ : ۱۳۳ بعد، ۴۴۰ تا ۴۵۰ بعد (۴) سُہیلی : روض الانف،

۲: ۳۲۰ تا ۳۲۵ بعد، (۵) تاریخ طبری، ص ۱۵۶۵ تا ۱۵۷۰ بعد (۶) بلاذری: فتوح البلدان، ص ۴۶۰ تا ۴۷۰۔

(۱۶) آپؐ کے نامۂ مبارک کا متن، جسے آپؐ نے شجاع بن وہب کے ذریعے بھجوایا:

بسم اللہِ الرحمن الرحیم۔ من محمّد رسول اللہ الی الحارث ابن ابی شمر۔ سلام علیٰ من اتبع الھدیٰ و امن بہ وصدق و انی ادعوکؑ الیٰ ان تومن باللہ وحدہٗ لاشریکؑ لہ یبقی لکؑ ملکؑ۔

اللہ
رسول
محمد
مہر

(۱۷) اسلام میں نرسنگ: کوئی قوم جب بنتی اور اُبھرتی ہے تو اس میں اپنے عقایدِ جلیلہ و متحرّکہ کی بدولت زندگی، ندرتِ فکر اور جرأتِ عمل ہوتی ہے۔ مسلمان اس وقت ایک ملّت کی حیثیّت سے اُبھر رہے تھے، لہٰذا مردوں اور عورتوں، سب میں ایمان کا جذبہ بھی تھا اور نورِ بصیرت بھی، ندرتِ فکر و عمل بھی تھی اور جرأتِ اقدام بھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان عورتیں میدانِ جنگ میں زخمی مجاہدین کی مرہم پٹّی، دیکھ بھال اور سقّہ گری (پانی پلانے) کی خدمات سرانجام دیتی تھیں۔

(۱۸) بخاری: کتاب الفضائل، باب غزوۂ خیبر، ج ۵، ۷، ص ۱۷۳۔

(۱۹) بخاری: کتاب الفضائل، باب غزوۂ خیبر، ج ۵، ۷، ص ۱۶۸۔

(۲۰) بخاری: کتاب المغازی، باب غزوہ من ارض الشام، ج ۵، ص ۲۸۲۔

(۲۱) سیرت ابنِ ہشام ج ۴، ص ۸۴، بخاری کتاب المغازی: باب منزل النبیؐ یوم الفتح ج ۵، ۷، ص ۱۹۰۔

(۲۲) سیرۃ ابن ہشام ج ۴، ص ۵۲، ۵۳۔ طبقات ابن سعد ج ۲، ص ۱۴۴۔

(۲۳) بخاری: کتاب المغازی، باب غزوۂ حنین ج ۵، ص ۱۹۵، سیرۃ النبی ج ۱، ص ۳۹۱۔

(۲۴) سیرۃ ابن ہشام ج ۴، ص ۱۳۲۔

(۲۵) طبقات ابن سعد ج ۲، ص ۱۵۸۔

(۲۶) صحیح بخاری: کتاب المغازی، باب غزوہ الطائف ج ۵، ص ۲۰۰۔

(۲۷) بخاری: کتاب المغازی، باب غزوہ تبوک ج ۶، ص ۳۰۲، سیرۃ ابن ہشام، ج ۴، ص ۱۵۹۔

(۲۸) سیرۃ ابن ہشام ج ۴، ص ۱۵۹ تا ۱۷۳۔

(۲۹) بخاری: کتاب الحج: باب لایطوف بالبیت عریاں ج ۲، ص ۱۸۸، سیرۃ ابنِ ہشام ج ۲، ص ۱۸۸، سیرۃ ابن ہشام ج ۴، ص ۱۹۵، طبری ج ۴، ص ۱۷۲۲۔

باب ١٧

رحمۃ للعالمین کا دوسرا رُخ

رحمۃ للعالمین کے پہلے رُخ کی کامیابی و تکمیل

حجۃ الوداع و تاریخی خطبہ

اور دوسرے رُخ کی ابتدا کی بشارت

وصال بالرفیق

باب : ۱۷

رحمۃ للعالمینی کا دوسرا رُخ

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَالۡفَتۡحُ ۝ وَرَاَيۡتَ النَّاسَ يَدۡخُلُوۡنَ فِىۡ دِيۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا ۝
فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ وَاسۡتَغۡفِرۡهُ‌ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝[1]

جب آ چکی نصرت اللہ تعالیٰ کی اور فتح، اور آپ نے دیکھ لیا لوگوں کو داخل ہوتے ہوئے اللہ کے دین میں فوج در فوج، تو اب تسبیح کیجیے اپنے رب کی حمد کے ساتھ، اور بخشوائیے۔ لاریب اللہ تعالیٰ نظرِ التفات فرماتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ازلی و ابدی ہے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا :

"کنت نبیا و آدم بین الماء و الطین"[2]

مفہوم یہ ہے کہ جب جسم و جسمانیت کے اعتبار سے انسان ابھی اپنی تخلیق کے ابتدائی مراحل میں تھا، اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے میری نبوت مقدر فرمائی تھی۔

پھر آخری بار ہمیشہ کے لیے تمام ازمنہ اور ادیان پر اسلام کے غلبے کے لیے آپؐ کا ظہور کیا گیا۔ ارشاد ہے :

"لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ"[3]

آپؐ نے نبوت کے اعلان سے قبل اپنی چالیس سالہ زندگی میں عملی طور پر معاشرتی فلاح و بہبود، انسانی ہمدردی، معاشی صداقت و امانت اور راست بازی کا درس دیا، اور روحانی پاکیزگی کی تعلیم کے ساتھ انسانی زندگی کے انفرادی و اجتماعی تمام گوشوں کی نبوت کے اعلان کے بعد تکمیل فرمائی تو خداوندی تصدیق نامہ نازل ہوا :

"اَلۡيَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ لَـكُمۡ دِيۡنَكُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ نِعۡمَتِىۡ وَرَضِيۡتُ
لَـكُمُ الۡاِسۡلَامَ دِيۡنًا"[4]

"آج میں نے تمہارے لیے دین کو مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمت اور رحمت تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے دینِ اسلام میری پسند ہے۔"

ان حالات میں وہ معاند عناصر بھی جو قریشِ مکہ اور قیصرِ روم کے ہاتھوں آپؐ کی تحریک کے خاتمے کے خواب دیکھ رہے تھے، مایوس ہو کر اب آپؐ ہی کے دامنِ رحمت میں جگہ پانے کے لیے قدم بوسی سے مشرف ہونے لگے۔ اس طرح رفتہ رفتہ تمام قبائلِ عرب اور عجم کے نمائندہ اشخاص دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ اب اسلام کی اپنی حرکی قوتیں خودکار طور پر کام کرنے لگیں۔ ۹، ۱۰ ھ کو آپؐ کی خدمت میں بے پناہ وفود حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوئے۔ ۹ ھ کو بالخصوص عام الوفود کہا جاتا ہے۔ ؎

جب سارے عرب میں اسلام کی روشنی پھیل گئی، جب خُدا کی بھٹکی ہوئی مخلوق کو مرکزِ اصلی نصیب ہو گیا، اسلام کے اعمال و عقاید، شریعت و طریقت، معاشرت، معیشت و عمرانیت، سیاست و ریاست کی علمی و عملی تکمیل ہو چکی اور قیامت تک عالمِ کون و مکان کی ہدایت کے خودکار سامان تیار ہو چکے اور لوگ عمل پیرا ہو گئے تو مژدۂ خداوندی نازل ہوا اور سورۃ النّصر میں خداوندی نصرت و فتح مبین کے ساتھ دینِ اسلام میں، مجموعی داخلہ اور غلبے کی خوشخبری اور تصدیق کی گئی۔

رحمۃٌ للعالمینی کا پہلا رُخ اپنی تکمیلی اور حرکی انداز کے ساتھ کتاب اللہ، اُسوۂ الرسولؐ اور تعاملِ امت کی صُورت میں محفوظ ہو گیا تو اس کے ساتھ آپؐ کو رحمۃٌ للعالمینی کے دوسرے ابدی فریضے کی سرانجام دہی کی طرف متوجہ کیا گیا کہ اب آپؐ کو تسبیح ربانی میں مشغول ہونا ہو گا۔ تاکہ شفاعتِ کبریٰ اور مقامِ محمود کے رفیع تر درجات حاصل کرنے کے لیے آپؐ اپنی اُمت کے لیے استغفار کریں اور اسے بخشوائیں۔ یہی وہ سورت تھی جس کو رازدارِ نبوت صدیق اکبرؓ نے سنا تو آبدیدہ ہو گئے کہ اب جسم و جسمانیت کے اعتبار سے رحمۃ للعالمین کی ہم سے جدائی کا وقت قریب آگیا ہے۔

چنانچہ آپؐ نے "وصال بالرّفیق الاعلیٰ" سے پہلے آخری حج کا ارادہ فرمایا۔ اِعلان فرمایا گیا کہ اس سال آنحضرتؐ خود حج کی قیادت فرمائیں گے۔ عرب و عجم سے تمام مسلمان آپؐ کے ساتھ حج کی شرکت کی سعادت حاصل کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

۲۶ ذی القعد ۱۰ ھ کو آپؐ مدینۂ منورہ سے عازمِ سفرِ حجِ بیت اللہ ہوئے۔ ذوالحلیفہ پہنچ کر احرام باندھا۔ فرزندانِ اسلام کا موجزن سمندر آپؐ کے ہمرکاب تھا۔ خدائے بزرگ و برتر کے حضور تسلیم و رضا کے اعلان کے لیے لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ. لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَۃَ وَالْمُلْکَ لَکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ کی حسن آفریں صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ اسلام کی حرکی قوت کے خودکار عمل اور غلبۂ اسلام کا یہ عجیب پُر رُعب اور حسین و جمیل اور دلنواز

مظاہرہ تھا۔ آپؐ ہر مرحلے پر مناسک حج اور تسلیم و رضا کی حسن پرور اداؤں کی علمی و عملی تعلیم دیتے ہوئے مکۂ مکرمہ کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ہر طرف اس کا عملی ثبوت تھا اور ہر زبان پر تھا:

"اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہ لَا شَرِیْکَ"

بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میرا اس دنیا میں رہنا اور میرا اس دنیا سے کوچ کر جانا سب اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔؎

مکے میں پہنچ کر آپؐ نے سنّتِ ابراہیمیؑ کے مطابق حج ادا فرمایا۔ اس دوران آپؐ نے صفا اور مروہ کے مقام پر مختصر مگر جامع خطبے دیے، مگر ذُوالحجۃ کی ۹ کو عرفات کے مقام پر آپؐ نے آخری خطبہ دیا جو آنے والی تمام نسلِ انسانی کے لیے بالعموم اور مسلمانوں کے لیے بالخصوص مشعلِ راہ ہے۔ یہ تاریخِ انسانی کا بے نظیر و بے مثل خطبہ ہے۔ اس خطبے میں نہایت جامع انداز میں، حسین و جمیل اسلوب کے ساتھ، اسلامی انقلاب کے اصولوں کو بیان کیا گیا ہے، رسُومِ جاہلی کی نفی کی گئی ہے۔ انسانی زندگی کے انفرادی و اجتماعی، معاشرتی و معاشی، سیاسی، عمرانی، فکری و عملی پہلوؤں کو نہایت ایجاز و اعجاز کے ساتھ تعلیم فرمایا گیا ہے اور خاندان کی بنیادی اکائی مرد و عورت کے حقوق سے لے کر انسانی اجتماع کے اہم ترین مسائل کا نہایت لطیف انداز سے مثبت حل پیش کیا گیا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ آپؐ نے اسلام کے غلبہ اور شوکت کو اپنی آنکھوں سے جی بھر کر دیکھ لیا تو حسبِ اختیار:

"انّ عبداً من عباداللہ خیرہ اللہ بین الدنیا و بین ما عندہ"

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں سے ایک بندے کو اختیار دیا ہے، چاہے وہ اس دنیا میں رہنا پسند کرے یا اللہ کے ہاں جانا۔ ؎

اللہ کے ہاں جا کر اُمت کی بخشش کا سامان کرنے کو ترجیح دی اور وصال بالرفیق کا فیصلہ فرمایا۔ اس کے مطابق پہلا اعلان فرمایا:

"یا ایّھا النّاس اسمعو! منی بین لکم فانی لا ادری لعلی لا القاکم بعد عامی ھذا فی موقفی ھذا۔"

لوگو! مجھ سے سُن لو! میں تمھیں باتیں وضاحت کے ساتھ بتاتا ہوں کیونکہ میں نہیں سمجھتا کہ ایک سال کے بعد میں اس جگہ تم سے کبھی آیندہ ملوں گا۔ ؎

اس کے بعد آپؐ نے اپنے خطبے کے دَوران کئی بار فرمایا:

"الاھل بلغت ، اللّٰھُمَّ اشھد"

یاد رکھو! میں نے پیغامِ خداوندی کے فرائض کی بجاآوری کر دی ہے۔ اے اللہ! تو گواہ رہنا۔ اب یہ فریضہ میری جانب سے میری امّت پر ہے۔

"فلیبغ الشاھد الغائب"

یعنی جو یہاں موجود ہیں وہ آنے والی نسلوں تک میرا پیغام پہنچاتے رہیں تاکہ اسلام کی خود کار حرکیّت کے تقاضے پورے ہوتے رہیں۔

آپؐ کے خطبے کے چند چیدہ چیدہ نکات بالاختصار درج ذیل ہیں[9]:

(۱) اس بات کی اطلاع کہ یہ آپؐ کا آخری سال ہے۔ اب آپؐ نے اللہ کے وصال کو ترجیح دی ہے۔

(۲) انسانی مساوات کا درس : کہ لسانی، نسلی، جغرافیائی امتیازات کے مقابلے میں ہر انسان کی فضیلت کا مدار اکتسابی فضائل ہیں۔

(۳) جاہلی رسوم کی نفی : یکہ خدا کے حضور مقام، خاندانی شرف اور جدّی فخر پر نہیں بلکہ ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق مقام نصیب ہوگا۔

(۴) انسان پر انسانیت کا خون اور اس پر ظلم ہمیشہ کے لیے حرام ہے۔ اس سلسلے میں کی گئی بے اعتدالیوں کی باز پرس ہوگی۔

(۵) مسلمانوں کی سب سے بڑی گمراہی آپس کا کُشت و خون ہے۔

(۶) امانت کا احترام اور اس کی واپسی ضروری ہے۔

(۷) دنیاوی مراتب کے فرق کے باوجود ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان کے ساتھ اسی طرح پیش آنا چاہیے۔

(۸) جاہلیت کے باہمی انتقام اور دشمنیاں آج سے ختم ہیں۔ اب انھیں کوئی یاد نہ کرے، اور ایک دوسرے پر تمام غیر قانونی واجبات بھی اس کے ساتھ ختم ہیں۔

(۹) قانونِ وراثت کے تعیّن کے بعد کوئی اپنے قانونی وارث کے لیے وصیّت نہیں کر سکے گا (کیونکہ بعض لوگ اپنے بعض ورثا کو محروم کر دیا کرتے تھے۔)

(۱۰) ازدواجی رشتہ بچّے کا نسب ثابت کرنے کے لیے ایک حتمی قانونی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے اس کو کوئی دوسرا چیلنج نہیں کر سکتا۔

(۱۱) اپنے خاندان کو چھوڑ کر دوسروں سے رشتے جوڑنا یا اپنے سررشتہ کو چھوڑ کر دوسروں سے رابطہ قائم کرنا لعنتِ خداوندی کا موجب ہے۔

(۱۲) باہمی تعامل میں دیانت، عزّتِ نفس، رواداری اور مدارات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

(۱۳) افراد کو باہم لین دین اور تعامل و تعاشر میں باہمی تراضی کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہیے۔

(۱۴) ازدواجی رشتے سے خاوند بیوی یا بیوی خاوند کی جائیداد کی مالک نہیں بن جاتی، اس لیے ایک دوسرے کے حقوق اور حدُود کا احترام اس کے باوجود لازمی ہے۔

(۱۵) ازدواجی رشتہ حقوق زن و شوئی تک ہے، اس لیے دونوں کو اس کا پورا پورا احترام کرنا چاہیے۔ عورت پر لازم ہے کہ وہ مرد کی غیرت پر آنچ نہ آنے دے۔

(۱۶) مردوں کو میری طرف سے خصُوصی وصیّت ہے کہ عورتوں سے بہتر سلوک اور احسان کریں۔ عقدِ نکاح اس طرح نہیں جیسے عام لین دین ہوتا ہے بلکہ یہ خداوندی حکم اور امانت ہے۔ اس میں حق اللہ تعالیٰ بھی شامل ہے۔

(۱۷) میرے بعد رہنمائی کتاب اللہ سے حاصل کیجیے اور دین میں غُلو سے بچیے۔

(۱۸) انسان اچانک گمراہ نہیں ہو جاتا۔ گمراہی کی ابتدا چند ایسی باتوں سے ہوتی ہے، جو ابتدائی طور پر اہم نظر نہیں آتیں، مگر جو انجام کار شدید بے راہ روی کا باعث بنتی ہیں۔

(۱۹) دینِ اسلام کی بدنی، مالی عبادات کی پابندی کرنا، نیز ان لوگوں کی اطاعت بھی عبادت میں شامل ہے جن کو اجتماعی اصولوں کے مطابق تم پر حکومت کرنے اور تمھیں امر کرنے کا اختیار ہے۔

(۲۰) مجرم اپنے جُرم کا بذاتِ خود ذمّے دار ہے۔

(۲۱) جو لوگ آج موجود ہیں وہ آنے والی نسلوں کو نسل بنسل میرا پیغام پہنچاتے رہیں۔

(۲۲) تم سے میرے متعلّق بھی پوچھا جائے گا کہ میں نے اپنے فرائض کو کیسے ادا کیا؟

سب نے کہا :

"نَشْھَدُ اِنَّکَ قَدْ اَدَّیْتَ الْاَمَانَۃَ وَ بَلَّغْتَ الرِّسَالَۃَ وَ نَصَحْتَ۔"

اس پر آپؐ نے تین بار فرمایا :

"اللّٰھُمَّ اَشْھَد"[10]

وصال بالرَّفیق الاعلیٰ (۲ شنبہ ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ / ۷ جون ۶۶۳۲ء) :

حجۃ الوداع کے تقریباً ایک ماہ بعد، ماہ صفر ۱۱ھ میں، پہلی بار آپؐ کو دردِ سر کی معمولی سی شکایت ہوئی۔ یہ رفیقِ اعلیٰ کے وصال کی عملی تیاریوں کی ابتدائی علامت تھی۔ آپؐ جنت البقیع میں تشریف لے گئے۔ وہاں آپؐ نے اپنے ان اصحابہ کے لیئے جو غزوۂ اُحد میں اسلام کی راہ میں شہید ہوئے تھے، دُعا فرمائی۔ گویا ان سے بھی الوداع کہنا مقصود تھا، وہاں سے واپس تشریف لائے تو طبیعت قدرے زیادہ ناساز تھی۔ اس دوران کئی بار طبیعت ناساز ہوئی اور پھر آپؐ نے افاقہ محسُوس فرمایا۔ آپؐ نے کئی بار ابوبکر صدیقؓ کو حکم فرمایا کہ وہ نماز پڑھائیں، جس پر انھوں نے نماز پڑھائی۔

ایک روز ظہر کے وقت آپؐ نے غسل فرمایا اور مسجد میں تشریف لاکر حضرت ابوبکرؓ کے پہلو میں بیٹھ کر نماز پڑھی۔ اس طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ آنحضورؐ کی اقتدا کر رہے تھے اور تمام لوگ ابوبکرؓ کی۔ نماز کے بعد آپؐ نے مختصر خطبہ دیا، جس میں اسی بات کو دُہرایا کہ اللہ نے آپؐ کو اختیار دیا ہے کہ دنیا میں رہیں یا اللہ کے ہاں رہنا قبول کریں۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں نے اب اللہ کے ہاں رہنے کو اختیار کیا ہے۔

۲ شنبہ ۱۲ ربیع الاوّل کو آپؐ نے صُبح کی نماز کے وقت اپنے حجرۂ مبارک کا پردہ اُٹھا کر دیکھا۔ لوگ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی قیادت میں نماز ادا کر رہے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر آپؐ کو بہت خوشی ہوئی اور آپؐ نے تبسّم فرمایا۔ اسی روز تیسرے پہر آپؐ نے مسواک فرمائی۔ یہ مکمل تیاری تھی۔ پھر رُک رُک کر فرمایا : "اَلصَّلٰوۃُ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ۔" (نماز اور غلام)

پھر آپؐ نے ہاتھ اُٹھا کر تین مرتبہ فرمایا :

"بل الرّفیق الاعلیٰ" (بلکہ وصال رفیقِ اعلیٰ مطلوب ہے۔)[۱۱]

یہ کہتے ہی آپؐ پر جسم و جسمانیت کے اعتبار سے مکمل سکتے کی کیفیت طاری ہوگئی اور آپؐ خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

صحابہؓ میں حیاتِ نبویؐ کا تصوّر عام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وصال کے واقعے کے بعد صحابہؓ کو عموماً اور حضرت عمرؓ کو بالخصوص آپؐ کے وصال کا یقین نہیں آتا تھا۔ حیاتِ نبویؐ جس کی بشارت سورۃ النصر اور دیگر آیات میں دی گئی ہے، فی الحقیقت مابعد الوصال کی ایک کیفیت ہے۔ جنگِ اُحد میں جس وقت یہ مشہور کر دیا گیا تھا کہ آپؐ شہید ہوگئے تو صحابۂ کرامؓ کی عام ذہنی کیفیت کے پیشِ نظر

قرآن مجید نے اس وقت نہایت واشگاف الفاظ میں اس کی واقعی صورت کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس حادثۂ فاجعہ کی تاب نہ لاکر صحابۂ کرامؓ پر وارفتگی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ حضرت عمرؓ شدتِ الم و فرطِ غم سے تلوار لے کر کھڑے ہوگئے کہ جو شخص بھی یہ بات مُنہ سے نکالے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم انتقال فرما گئے ہیں، تو میں اس کی گردن قلم کر دوں گا۔ اس موقع پر خلیفۂ اوّل، رازدارِ نبوّت، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، تشریف لائے۔ وہ پہلے اس حجرے میں گئے جہاں آپؐ محوِ استراحت تھے اور رُخِ انور سے نقاب اُٹھا کر پیشانی کو بوسہ دیا، پھر باہر آکر صحابۂ کرامؓ سے مخاطب ہوئے اور انھیں حیاتِ نبویؐ کی واقعی کیفیت کو قرآن مجید کی اس آیت کے حوالے سے سمجھایا جو غزوۂ اُحد کے موقع پر اُتری تھی۔ اس تقریر سے صحابہؓ کو تسلّی ہوئی۔[۱۲]

وصال کے دن اسی کیفیت میں شام ہوگئی تھی، اس لیے اگلے روز آپؐ کے حسبِ فرمان کہ "نبی کا جسم وہیں امانت رکھا جاتا ہے، جہاں اس پر وصال کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔" آپؐ کے لیے حضرت عائشہؓ کے حجرے میں جگہ بنائی گئی۔ پھر مسلمان باری باری اندر جاکر صلوٰۃ و سلام پیش کرتے رہے۔ اس کے بعد کونین کی یہ امانت دوشنبہ ۱۲ ربیع الاوّل ۱۱ھ پس پردہ مسکن آرا ہوگئی۔

۶۳ سال یہ نورِ ازلی و ابدی دنیا کو غیر فانی تنویرات سے مستنیر کرنے کے بعد ہمیشہ کے لیے پردہ پوش ہوگیا تاکہ حمدِ ربانی کے ساتھ اُمت کے لیے بخشش کا سامان کرے۔

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا

حواشی و تشریحات

(۱) النّصر ۱۱۰ : ۱ تا ۴۔
(۲) الحدیث۔
(۳) الفتح : ۴۸ : ۲۸۔
(۴) مائدہ : ۴۔
(۵) سیرت ابن ہشام ج ۴، ص ۲۰۵، ۲۴۵۔
(۶) سیرت ابن ہشام ج ۴، ص ۲۴۸، ۲۵۲، بخاری کتاب المغازی، باب حجۃ الوداع ج ، ص ۲۴۴۔
(۷) صحیح بخاری : کتاب المغازی، باب مرض النّبی و وفاتہ، ج ۶، ص ۱۰، ۱۹۔
(۸) ابنِ سعد ج ۲، ص ۱۸۲، ۱۸۵، ابن ہشام، ج ۴، ص ۶۰، بخاری ج ۳، ص ۶۰، ابن ماجہ ج ۲، ص ۱۰۱۵ باب الخطبہ یوم النحر، سیرۃ الحلبیہ ج ۳، ص ۲۹۹، مسند احمد ج ۵، ص ۵۱۱۔
(۹) خطبے کا اصل متن مع اردو انگریزی ترجمہ آخر میں ملحق ہے۔
(۱۰) صحیح بخاری : کتاب المغازی : باب مرض النبی و وفاتہ، ج ۶، ص ۱۰-۱۹۔
(۱۱) صحیح بخاری : کتاب المغازی : باب مرض النبی و وفاتہ، ج ۶، ص ۱۷۔
(۱۲) طبقات ابن سعد ج ۲، ص ۲۸۰، طبقات ابن سعد ج ۲، ص ۲۸۸، ۲۹۲۔

ضَمِیمَہ

خُطبَہ حجّۃ الوَداع

إِذَا كَانَ يَوْمُ الْحَجِّ اَتَىٰ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَرَفَةَ فَنَزَلَ بِهَا حَتّٰى إِذَا زَاغَتِ الشَّمْسُ اَمَرَ بِالْقَصْوَاءِ فَرُحِلَتْ لَهٗ فَاَتٰى بَطْنَ الْوَادِىْ فَخَطَبَ النَّاسَ خُطْبَتَهُ الَّتِىْ بَيَّنَ فِيْهَا مَا بَيَّنَ .

حج کے دن حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم عرفہ تشریف لائے اور آپؐ نے وہاں قیام فرمایا۔ جب سورج ڈھلنے لگا تو آپؐ نے قصوا (اپنی اونٹنی) لانے کا حکم فرمایا۔ اونٹنی تیار کر کے حاضر کی گئی تو آپؐ (اس پر سوار ہو کر) بطنِ وادی میں تشریف فرما ہوئے۔ اور اپنا وہ خُطبہ ارشاد فرمایا جس میں دین کے اہم امور بیان فرمائے۔

فَحَمِدَ اللهَ وَثْنٰى عَلَيْهِ قَائِلاً لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ صَدَقَ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ۔

آپؐ نے خدا کی حمد و ثنا کرتے ہوئے خطبے کی یوں ابتدا فرمائی : خدا کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے۔ وہ یکتا ہے۔ کوئی اس کا ساجھی نہیں۔ خدا نے اپنا وعدہ پورا کیا، اس نے اپنے بندے (رسولؐ) کی مدد فرمائی اور تنہا اس کی ذات نے باطل کی ساری مجتمع قوّتوں کو زیر کیا۔

اَيُّهَا النَّاسُ ! اِسْمَعُوْا قَوْلِىْ فَاِنِّىْ لَا اَرَانِىْ وَاِيَّاكُمْ اَنْ نَجْتَمِعَ فِىْ هٰذَا الْمَجْلِسِ اَبَدًا بَعْدَ عَامِىْ هٰذَا۔ اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ اللهَ يَقُوْلُ " يَا اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا، اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ اَتْقٰكُمْ ط فَلَيْسَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ فَضْلٌ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلٰى اَبْيَضَ وَلَا لِاَبْيَضَ عَلٰى اَسْوَدَ فَضْلٌ اِلَّا بِالتَّقْوٰى۔

لوگو! میری بات سنو، میں نہیں سمجھتا کہ آئندہ کبھی ہم اس طرح کسی مجلس میں یک جا ہو سکیں

گے (اور غالباً اس سال کے بعد میں حج نہ کرسکوں گا) لوگو! اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "انسانو! ہم نے تم سب کو ایک ہی مرد و عورت سے پیدا کیا ہے اور تمھیں جماعتوں اور قبیلوں میں بانٹ دیا کہ تم الگ الگ پہچانے جاسکو۔ تم میں زیادہ عزّت و کرامت والا خُدا کی نظروں میں وہی ہے جو خدا سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔" چنانچہ اس آیت کی روشنی میں نہ کسی عرب کو عجمی پر کوئی فوقیت حاصل ہے نہ کسی عجمی کو کسی عرب پر۔ نہ کالا گورے سے افضل ہے نہ گورا کالے سے۔ ہاں بزرگی اور فضیلت کا کوئی معیار ہے تو وہ تقویٰ ہے۔

اَلنَّاسُ مِنْ اٰدَمَ وَاٰدَمَ مِنْ تُرَابٍ اَلَا كُلُّ مَاْثَرَةٍ اَوْدَمٍ اَوْمَالٍ يُدَّعٰى بِهٖ فَهُوَ تَحْتَ قَدَمَيَّ هَاتَيْنِ اِلَّا سَدَانَةُ الْبَيْتِ وَسِقَايَةُ الْحَاجِّ ثُمَّ قَالَ يَامَعْشَرَ قُرَيْشٍ لَا تَجِيْئُوْا بِالدُّنْيَا تَحْمِلُوْنَهَا عَلٰى رِقَابِكُمْ وَيَجِيْئُ النَّاسُ بِالْاٰخِرَةِ فَلَا اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا۔

انسان سارے ہی آدم کی اولاد ہیں اور آدم کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ وہ مٹّی سے بنائے گئے۔ اب فضیلت و برتری کے سارے دعوے خون و مال کے سارے مطالبے اور سارے انتقام میرے پاؤں تلے روندے جاچکے ہیں۔ بس بیت اللہ کی تولیت اور حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمات علیٰ حالہٖ باقی رہیں گی۔ پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا، قریش کے لوگو! ایسا نہ ہو کہ اللہ کے حضور تم اس طرح آؤ کہ تمھاری گردنوں پر تو دُنیا کا بوجھ لدا ہو اور دوسرے لوگ سامانِ آخرت لے کر پہنچیں۔ اور اگر ایسا ہُوا تو میں خدا کے سامنے تمھارے کچھ کام نہ آسکوں گا۔

مَعْشَرَ قُرَيْشٍ! اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَذْهَبَ عَنْكُمْ نَخْوَةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَتَعَظُّمَهَا بِالْاٰبَاءِ اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ دِمَائَكُمْ وَاَمْوَالَكُمْ وَاَعْرَاضَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ اِلٰى اَنْ تَلْقَوْا رَبَّكُمْ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَكَحُرْمَةِ شَهْرِكُمْ هٰذَا فِيْ بَلَدِكُمْ هٰذَا وَاِنَّكُمْ سَتَلْقَوْنَ رَبَّكُمْ فَيَسْئَلُكُمْ عَنْ اَعْمَالِكُمْ۔

قریش کے لوگو! خدا نے تمھاری جھوٹی نخوت کو ختم کر ڈالا اور باپ دادا کے کارناموں پر تمھارے فخر و مباہات کی کوئی گنجائش نہیں۔ لوگو! تمھارے خون و مال اور عزتیں ایک دوسرے پر قطعاً حرام کردی گئی ہیں ہمیشہ کے لیے۔ ان چیزوں کی اہمیّت ایسی ہی ہے جیسی اس دن کی اور اس ماہ مبارک (ذی الحجّہ) کی خاص کر اس شہر میں ہے۔ تم سب خدا کے آگے جاؤ گے اور وہ تم سے

تمھارے اعمال کی بازپُرس فرمائے گا۔

اَلَا فَلَا تَرْجِعُوْا بَعْدِيْ ضُلَّالًا يَّضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ۔ فَمَنْ كَانَتْ عِنْدَهٗ اَمَانَةٌ فَلْيُؤَدِّهَا اِلٰى مَنِ ائْتَمَنَهٗ عَلَيْهَا۔

دیکھو کہیں میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ آپس میں ہی کشت و خون کرنے لگو۔

اگر کسی کے پاس امانت رکھوائی جائے تو وہ اس بات کا پابند ہے کہ امانت رکھوانے والے کو امانت پہنچادے۔

اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ كُلَّ مُسْلِمٍ اَخُو الْمُسْلِمِ وَاِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ اِخْوَةٌ اَرِقَّاءَكُمْ اَرِقَّائَكُمْ اَطْعِمُوْهُمْ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ وَاكْسُوْهُمْ مِمَّا تَلْبَسُوْنَ۔

لوگو! ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور سارے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اپنے غلاموں کا خیال رکھو، ہاں غلاموں کا خیال رکھو۔ انھیں وہی کھلاؤ جو خود کھاتے ہو، ایسا ہی پہناؤ جو خود پہنتے ہو۔

اَلَا كُلُّ شَيْءٍ مِنْ اَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ تَحْتَ قَدَمَيَّ مَوْضُوْعٌ وَدِمَاءُ الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوْعَةٌ وَاِنَّ اَوَّلَ دَمٍ اَضَعُ مِنْ دِمَائِنَا دَمُ ابْنِ الرَّبِيْعَةِ بْنِ الْحَارِثِ وَكَانَ مُسْتَرْضَعًا فِيْ بَنِيْ سَعْدٍ فَقَتَلَهٗ هُذَيْلٌ۔ وَرِبَا الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوْعٌ وَاَوَّلُ رِبًا اَضَعُ رِبَانَا رِبَا عَبَّاسِ بْنِ عَبْدُ الْمُطَّلِبِ فَاِنَّهٗ مَوْضُوْعٌ كُلُّهٗ۔

دَورِ جاہلیت کا سب کچھ میں نے اپنے پیروں سے روند دیا۔ زمانۂ جاہلیت کے خون کے سارے انتقام اب کالعدم ہیں۔ پہلا انتقام جسے میں کالعدم قرار دیتا ہوں، میرے اپنے خاندان کا ہے۔ ربیعہ بن حارث کے دودھ پیتے بیٹے کا خون جسے بنو ہذیل نے مار ڈالا تھا، اب میں معاف کرتا ہوں۔ دَورِ جاہلیت کا سُود حیثیت نہیں رکھتا۔ پہلا سُود جسے میں چھوڑتا ہوں، عباس بن عبدالمطلب کے خاندان کا سُود ہے۔ اب یہ ختم ہوگیا۔

اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ قَدْ اَعْطٰى كُلَّ ذِيْ حَقٍّ حَقَّهٗ فَلَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ۔

لوگو! خدا نے ہر حق دار کو اس کا حق خود دے دیا۔ اب کوئی کسی وارث کے حق کے لیے وصیت نہ کرے۔

اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللهِ۔

بچّہ اس کی طرف منسوب کیا جائے گا جس کے بستر پر وہ پیدا ہوا۔ جس پر حرام کاری ثابت ہو، اس کی سزا پتھر ہے۔ حساب وکتاب خدا کے ہاں ہوگا۔

مَنِ ادَّعَىٰ إِلَىٰ غَيْرِ أَبِيهِ أَوْ تَوَلَّىٰ إِلَىٰ غَيْرِ مَوَالِيهِ فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللهِ۔

جو کوئی اپنا نسب بدلے گا یا کوئی غلام اپنے آقا کے مقابلے میں کسی اور کو اپنا آقا ظاہر کرے گا، اس پر خدا کی لعنت۔

اَلدَّيْنُ مَقْضِيٌّ وَالْعَارِيَةُ مُؤَدَّاةٌ وَالْمِنْحَةُ مَرْدُودَةٌ وَالزَّعِيمُ غَارِمٌ۔

قرض قابلِ ادائی ہے۔ عاریتاً لی ہوئی چیز واپس کرنی چاہیے۔ تحفے کا بدلہ دینا چاہیے اور جو کوئی کسی کا ضامن بنے، وہ تاوان ادا کرے۔

وَلَا يَحِلُّ لِامْرِئٍ مِنْ أَخِيهِ إِلَّا مَا أَعْطَاهُ عَنْ طِيبِ نَفْسٍ مِنْهُ فَلَا تَظْلِمُنَّ أَنْفُسَكُمْ۔

کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی سے کچھ لے، سوائے اس کے جس پر اس کا بھائی راضی ہو اور خوشی خوشی دے۔ خود پر اور ایک دوسرے پر زیادتی نہ کرو۔

أَلَا لَا يَحِلُّ لِامْرَأَةٍ أَنْ تُعْطِيَ مِنْ مَالِ زَوْجِهَا شَيْئًا إِلَّا بِإِذْنِهِ۔

عورت کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے شوہر کا مال اس کی بغیر اجازت کسی کو دے۔

أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ لَكُمْ عَلَىٰ نِسَائِكُمْ حَقًّا وَلَهُنَّ عَلَيْكُمْ حَقًّا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ أَلَّا يُوطِئْنَ فُرُشَكُمْ أَحَدًا تَكْرَهُونَهُ وَعَلَيْهِنَّ أَنْ لَا يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ فَإِنْ فَعَلْنَ فَإِنَّ اللهَ قَدْ أَذِنَ لَكُمْ أَنْ تَهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَأَنْ تَضْرِبُوهُنَّ ضَرْبًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ فَإِنِ انْتَهَيْنَ فَلَهُنَّ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ۔

دیکھو! تمھارے اُوپر تمھاری عورتوں کے کچھ حقوق ہیں۔ اسی طرح ان پر تمھارے حقوق واجب ہیں۔ عورتوں پر تمھارا یہ حق ہے کہ وہ اپنے پاس کسی ایسے شخص کو نہ بلائیں جسے تم پسند نہیں کرتے اور وہ کوئی خیانت نہ کریں، کوئی کام کھُلی بے حیائی کا نہ کریں اور اگر وہ ایسا کریں تو خدا کی جانب سے اجازت ہے کہ تم انھیں معمولی جسمانی سزا دو۔ اور وہ باز آجائیں تو انھیں اچھی طرح کھلاؤ پہناؤ۔

وَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا فَإِنَّهُنَّ عَوَانٍ لَكُمْ لَا يَمْلِكْنَ لِأَنْفُسِهِنَّ شَيْئًا فَاتَّقُوا اللهَ فِي النِّسَاءِ فَإِنَّكُمْ أَخَذْتُمُوهُنَّ بِأَمَانِ اللهِ وَاسْتَحْلَلْتُمْ فُرُوجَهُنَّ بِكَلِمَاتِ اللهِ۔

عورتوں سے بہتر سلوک کرو، کیونکہ وہ تو تمھاری پابند ہیں اور خود اپنے لیے وہ کچھ نہیں کرسکتیں۔ چنانچہ ان کے بارے میں خدا کا لحاظ رکھو کہ تم نے انھیں خدا کے نام پر حاصل کیا اور اسی کے نام پر وہ تمھارے لیے حلال ہوئیں۔ لوگو! میری بات سمجھ لو، میں نے حقِ تبلیغ ادا کر دیا۔

وَإِنِّي قَدْ تَرَكْتُ فِيكُمْ مَا لَنْ تَضِلُّوا بَعْدَهُ أَبَدًا إِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهِ كِتَابَ اللهِ وَإِيَّاكُمْ وَالْغُلُوَّ فِي الدِّينِ فَإِنَّمَا أَهْلَكَ مَنْ قَبْلَكُمُ الْغُلُوُّ فِي الدِّينِ۔

میں تمھارے درمیان ایک ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں کہ تم کبھی گمراہ نہ ہوسکو گے اگر اس پر قائم رہے، اور وہ خدا کی کتاب ہے۔ اور ہاں دیکھو، دینی معاملات میں غلو سے بچنا کہ تم سے پہلے کے لوگ انہی باتوں کے سبب ہلاک کر دیے گئے۔

وَإِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ يَئِسَ مِنْ أَنْ يُعْبَدَ فِي أَرْضِكُمْ هٰذِهِ أَبَدًا وَلٰكِنْ سَتَكُونُ لَهُ طَاعَةٌ فِيمَا تُحَقِّرُونَ مِنْ أَعْمَالِكُمْ فَسَيَرْضَىٰ بِهِ فَاحْذَرُوهُ عَلَىٰ دِينِكُمْ۔

شیطان کو اب اس بات کی کوئی توقع نہیں رہ گئی ہے کہ اب اس کی اس شہر میں عبادت کی جائے گی، لیکن اس بات کا امکان ہے کہ ایسے معاملات میں جنھیں تم کم اہمیّت دیتے ہو اس کی بات مان لی جائے اور وہ اس پر راضی ہے۔ اس لیے تم اس سے اپنے دین و ایمان کی حفاظت کرنا۔

اَلَا فَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَصَلُّوْا خَمْسَكُمْ وَصُوْمُوْا شَهْرَكُمْ وَاَدُّوْا زَكٰوةَ اَمْوَالِكُمْ طَيِّبَةً بِهَا اَنْفُسُكُمْ وَتَحُجُّوْا بَيْتَ رَبِّكُمْ وَاَطِيْعُوْا وُلَاةَ اَمْرِكُمْ تَدْخُلُوْا جَنَّةَ رَبِّكُمْ۔

لوگو! اپنے ربّ کی عبادت کرو۔ پانچ وقت کی نماز ادا کرو۔ مہینے بھر کے روزے رکھو۔ اپنے مالوں کی زکوٰۃ خوش دلی کے ساتھ دیتے رہو۔ اپنے خدا کے گھر کا حج کرو اور اپنے اہلِ امر کی اطاعت کرو تو اپنے ربّ کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

اَلَا لَا يَجْنِىْ جَانٍ اِلَّا عَلٰى نَفْسِهٖ اَلَا لَا يَجْنِىْ جَانٍ عَلٰى وَلَدِهٖ وَلَا مَوْلُوْدٌ عَلٰى وَالِدِهٖ۔

اب مجرم خود ہی اپنے جرم کا ذمہ دار ہو گا اور اب نہ باپ کے بدلے بیٹا پکڑا جائے گا نہ بیٹے کا بدلہ باپ سے لیا جائے گا۔

اَلَا فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ فَرُبَّ مُبَلَّغٍ اَوْعٰى مِنْ سَامِعٍ۔

سنو، جو لوگ یہاں موجود ہیں انھیں چاہیے کہ یہ احکام اور یہ باتیں ان لوگوں کو بتا دیں جو یہاں نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی غیر موجود تم سے زیادہ سمجھنے اور محفوظ رکھنے والا ہو۔

وَاَنْتُمْ تُسْئَلُوْنَ عَنِّىْ فَمَاذَا اَنْتُمْ قَائِلُوْنَ۔

اور لوگو! تم سے میرے بارے میں (خدا کے ہاں) سوال کیا جائے گا۔ بتاؤ تم کیا جواب دو گے؟

قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ قَدْ اَدَّيْتَ الْاَمَانَةَ وَبَلَّغْتَ الرِّسَالَةَ وَنَصَحْتَ۔

لوگوں نے جواب دیا کہ ہم اس بات کی شہادت دیں گے کہ آپؐ نے امانت (دین) پہنچا دی اور آپؐ نے حقِ رسالت ادا فرما دیا اور ہماری خیر خواہی فرمائی۔

فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِاِصْبَعِهِ السَّبَّابَةِ يَرْفَعُهَا اِلَى السَّمَاءِ وَيَنْكُتُهَا اِلَى النَّاسِ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ۔

یہ سن کر حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی انگشتِ شہادت آسمان کی جانب اٹھائی اور لوگوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تین مرتبہ ارشاد فرمایا "خدایا گواہ رہنا! خدایا گواہ رہنا! خدایا گواہ رہنا"۔

مآخذ

اللہ جل شانہٗ	القرآن الحکیم	انجمن حمایت الاسلام، لاہور
شاہ عبدالقادر الدھلوی	ترجمہ القرآن	طبع ہند
البخاری محمد بن اسماعیل	الجامع الصحیح	مصطفٰے البابی الحلبی ۱۹۵۴ء
مالک امام	الموطا	طبع منیریہ ۱۹۳۱ء
مسلم بن الحجاج	الجامع الصحیح	محمد بن علی صبیح و اولادہ، مصر ۱۳۳۴ھ
الترمذی محمد بن عیسیٰ	جامع السنن	مطبع متیریٔ مصر ۱۹۳۱ء
ابوداؤد السجستانی	السنن	مطبع السعادہ، مصر ۱۹۵۰ء
النسائی احمد بن شعیب	″	المطبعۃ المصریہ، ۱۹۳۰ء
ابن ماجہ محمد بن یزید القزوینی	″	عیسی البابی الحلبی ۱۹۵۳ء
الخطیب	مشکوٰۃ المصابیح	طبع ہند
ابن الاثیر الجرزی	اسد الغابہ	مطبع اسلامیہ، تہران ۱۳۷۷ھ
ابن الاثیر	الکامل فی التاریخ	ادارہ الطباعۃ المنیریہ، مصر ۱۳۴۸ھ
ابن تیمیہ احمد بن عبدالحلیم	الجوامع السیاسیہ الالٰہیہ	دارالمعارف، قاہرہ ۱۹۳۴ء
ابن تیمیہ مجدالدین عبدالسلام	المنتقی من اخبار المصطفٰے	″ ″ ″
ابن جریر الطبری	جامع البیان فی تفسیر القرآن	″ ″ ۱۹۵۷ء
″	تاریخ الامم والملوک	مطبعۃ الاستقامہ القاہرہ ۱۹۴۹ء
ابن حجر العسقلانی	الاصابہ فی تمیز الصحابہ	مصطفی محمد قاہرہ ۱۳۲۳ھ
″	فتح الباری شرح البخاری	مطبعۃ البہیہ مصر ۱۳۴۸ھ
ابن خلدون	المقدمہ	دارالکتب اللبنانی بیروت ۱۹۶۱ء
ابن سعد	الطبقات الکبریٰ	طبع بیروت ۱۹۵۷ء
ابن عبدالبر	الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب	مصطفٰی محمد قاہرہ ۱۳۵۸ھ

ابن عبد البر	جامع بیان العلم وفضلہ	المکتبۃ العلمیہ مدینہ منورہ
ابن عبد ربہ	العقد الفرید	مطبعۃ الاستقامہ، قاہرہ ۱۹۵۳ء
ابن فارس	مقاییس اللغہ	مصطفی البابی الحلبی مصر ۱۳۹۲ھ
ابن قتیبہ	عیون الاخبار	دار الکتب بیروت ۱۹۵۶ء
〃	الشعر والشعرآ	دار الثقافۃ بیروت ۱۹۶۴ء
ابن قیم شمس الدین ابی عبد اللہ محمد	زاد المعاد فی ہدی خیر العباد	مطبعۃ التجاتہ، قاہرہ ۱۹۶۲ء
ابن قیم	اعلام الموقعین	〃 〃 ۱۹۵۵ء
ابن کثیر الدمشقی	تفسیر القرآن الکریم	مکتبہ ملکیہ، مصر ۱۳۶۷ھ
ابن منظور	لسان العرب	طبع بیروت ۱۹۵۲ء
ابن ہشام	السیرہ النبویہ	مصطفی البابی الحلبی مصر ۱۹۳۶ء
ابو عبید قاسم بن سلام	کتاب الاموال	مطبعۃ الاستقامہ مصر ۱۹۵۳ء
ابو یوسف الامام	کتاب الخراج	مطبعۃ الموسوعات مصر ۱۳۰۲ھ
احسان النص الدکتور	الخطابہ السیاسیہ فی عصر بنی اُمیّہ	دار الفکر بدمشق
احمد بن حنبل	مسند احمد	دار المعارف مصر ۱۹۳۶ء
احمد شہاب الدین	نسیم الریاض	〃 〃 ۱۹۴۹ء
البخاری محمّد بن اسماعیل	الادب المفرد	مطبع سلفیہ قاہرہ، ۱۳۴۸ھ
بلاذری احمد بن یحییٰ	فتوح البلدان	مطبع الموسوعات مصر ۱۳۱۹ھ
〃	انساب الاشراف	دار المعارف مصر ۱۹۵۹ء
بدر الدین عینی	عمدہ القاری	دار الاستقامہ مصر ۱۳۴۹ھ
ثناء اللہ پانی پتی	التفسیر المظہری	مجلس اشاعت علمی حیدر آباد دکن
الجاحظ عمرو بن بحر	البیان والتبیین	دار الاستقامہ قاہرہ ۱۹۵۶ء
الجزایری عبد الرحمٰن	الفقہ علی المذاہب الاربعہ	دار الکتب العربی قاہرہ ۱۹۵۰ء
حاکم محمد بن عبد اللہ	مستدرک حاکم	دار المعارف حیدر آباد دکن ۱۳۳۴ھ
حسن ابراہیم حسن الدکتور	تاریخ الاسلامی السیاسی	مطبعۃ النہضۃ العصریہ ۱۹۴۸ء
〃 〃	النظم الاسلامیہ	〃 〃 ۱۹۳۹ء

خطاب محمود شیث	الرّسول القائد	مکتبہ الحیواۃ بغداد ۱۹۶۰ء
خطیب بغدادی	الکفایہ فی علم الروایہ	مصطفیٰ البابی الحلبی مصر، ۱۳۵۷ھ
خطیب التبریزی	مشکوٰۃ المصابیح	اصح المطابع دہلی، دمشق
خطیب العجاج	السنۃ قبل التدوین	مکتبہ وہبہ مصر ۱۹۶۳ء
دار قطنی	سنن دار قطنی	مطبع مصر
الدّارمی عبد اللہ بن عبد الرحمٰن	سنن الدّارمی	مطبعۃ الاعتدال دمشق ۱۳۴۹ھ
رازی فخر الدین	مفاتیح الغیب	المطبعۃ البہائیہ قاہرہ
راغب الاصفہانی	مفردات القرآن	مکتبہ القاسمیہ، لاہور
رشید رضا	المنار	دار المنار مصر
زرقانی	شرح مواہب اللدینہ	مطبعۃ الازہریہ مصر ۱۳۲۵ھ
زمخشری جار اللہ	الکشّاف	مطبعۃ الاستقامۃ مصر ۱۹۴۶ء
سخاوی شمس الدین	مقاصد المخستہ فی بیان کثیر من	
	الاحادیث المشہوہ علی الالسنۃ	
سرخی شمس الائمہ	المبسوط	مطبعۃ السعادتہ قاہرہ ۱۳۴۴ھ
سُہیلی عبد الرحمٰن	الروض الانف	دار المعارف مصر ۱۹۱۴ء
سیوطی جلال الدین	شرح جامع الصغیر للمناوی	عیسیٰ البابی الحلبی مصر ۱۹۵۴ء
〃 〃	تفسیر در منثور	مکتبۃ الاسلامیہ تہران
〃 〃	مفتاح الجنۃ فی الاحتجاج بالسنۃ	مطبوعہ مصر
شوقی ضیف الدکتور	تاریخ الادب العربی العصر الجاہلی	دار المعارف مصر ۱۹۶۳ء
〃 〃	تاریخ الادب (العصر الاسلامی)	〃
الشوکانی محمد بن علی بن محمّد	نیل الاوطار	مصطفیٰ البابی الحلبی ۱۳۴۷ھ
صبحی صالح	علوم الحدیث	مطبع جامع دمشق ۱۹۶۳ء
صبحی محمصانی	فلسفہ التشریع فی الاسلام	دار العلم للملائیں بیروت ۱۹۶۱ء
الطحاوی الامام	شرح معانی الآثار	دار المعارف مصر ۱۳۱۷ھ
عثمانی شبّیر احمد	فتح الملہم شرح مسلم	طبع ہند

العقاد عباس محمود — العبقریات الاسلامیہ — دارالہلال قاہرہ ۱۹۶۶ء
علیؓ امیرالمؤمنین — نہج البلاغہ مع شرح شیخ عبدہٗ — مطبع عیسیٰ البابی الحلبی مصر ۱۳۲۰ھ
علی بن برہان الحلبی — السیرہ الحلبیہ — 〃 〃 〃 〃
علی متقی — کنز العمال — دارالمعارف حیدرآباد ۱۳۱۲ھ
عیاض بن موسیٰ القاضی — الشفاء — مصطفیٰ البابی الحلبی مصر
قاسمی جمال الدین — محاسن التاویل — دار الحیاء الکتب المصریہ ۱۹۵۷ء
قرطبی محمد بن احمد الانصاری — الجامع لاحکام القرآن — دار الکتب العربیہ القاہرہ ۱۹۶۷ء
القسطلانی احمد بن محمدؐ — مواہب الادنیہ — مکتبہ الازہریہ مصر ۱۹۰۸ء
الکتانی الشیخ عبدالحیٔ — نظام الحکومتہ النبویہؐ — احیاء التراث الاسلامی بیروت
کرد علی — الاسلام و الحضارتہ العربیہ — دار الکتب المصریہ قاہرہ ۱۹۳۸ء
محمد انور شاہ کشمیری — فیض الباری — مطبع حجازی قاہرہ ۱۹۳۸ء
محمد حسین ہیکل — حیات محمدؐ — مطبعۃ النہضہ العصریہ ۱۹۴۷ء
محمد حمیداللہ الدکتور — الوثائق السیاسیہ — لجنتہ التالیف مصر ۱۹۵۶ء
محمد طاہر الدکتور — الخطابیتہ فی العصر الذہبی — دار المعارف مصر ۱۹۶۳ء
محمد سعید مولانا — تشید المنانی تخریج الاحادیث — 〃 ۱۹۶۸ء
مصطفیٰ السباعی الدکتور — السنتہ و مکانتہا فی التشریع الاسلامی — مکتبہ دار العروبہ قاہرہ ۱۹۶۱ء
مصطفیٰ محمد عمارہ — نفرتہ النور شرح مختارات الاحادیث النبویہؐ — مصطفیٰ البابی الحلبی مصر
ملّا علی قاری — اسر المرفوعہ فی احادیث الموضوعہ — دار الامانہ بیروت ۱۳۹۱ھ
المناوی محمد عبدالرؤف — مختصر شرح جامع الصغیر — عیسیٰ البابی الحلبی مصر ۱۹۵۴ء
منذری عبدالغیظم بن عبدقوی — ترعیب الترہیب — مصر
ولی اللہ شاہ المحدث — حجۃ اللہ البالغہ — دار الکتب الحدیثہ قاہرہ
ابوالکلام آزاد — ترجمان القرآن — سندھ ساگر اکادمی لاہور ۱۹۶۷ء
〃 — رسولِ عربیؐ — مکتبہ عظمت لاہور
اسماعیل شہید شاہ — منصب امامت — حکیم محمد احمد لاہور ۱۹۴۹ء
اکبر خاں میجر جنرل — اسلامی طریق جنگ — فیروز سنز لاہور ۱۹۵۹ء

اکبر خان میجر جنرل — حدیثِ دفاع — فیروز سنز لاہور ۱۹۵۴ء
امین احسن اصلاحی مولانا — دعوتِ دین اور اس کا طریقِ کار — مکتبہ جماعت اسلامی، لاہور
امین احسن اصلاحی مولانا — اسلامی ریاست — 〃 〃 〃 〃
بدر عالم میرٹھی مولانا — ترجمان السنتہ — ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۶۴ء
حامد الانصاری مولانا — اسلام کا نظامِ حکومت — 〃 〃 〃 〃
حسن ابراہیم حسن — مسلمانوں کا نظم مملکت — 〃 〃 〃 ۱۹۴۷ء
خالد علوی — اسلام کا معاشرتی نظام — مکتبہ علمیہ لاہور ۱۹۶۸ء
〃 — حفاظت حدیث — 〃 〃
سندیلوی مولانا محمد اسحاق — اسلام کا سیاسی نظام — مطبع معارف اعظم گڈھ ۱۹۵۷ء
سیوہاروی حفظ الرحمٰن — اسلام کا اقتصادی نظام — ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۵۹ء
شبلی نعمانی — سیرۃ النبیؐ — مطبع اعظم گڑھ ۱۲۳۲ھ
صدیقی عبدالحمید — انسانیت کی تعمیرِ نو اور اسلام — مکتبہ جماعتِ اسلامی لاہور ۱۹۵۶ء
صدیقی فضل الرحمٰن نعیم — محسن انسانیتؐ — مکتبہ رحمانیہ سرگودھا
〃 〃 〃 — تحریکِ اسلامی
عزائم عبدالرحمٰن — تاجدارِ دو عالم — نفیس اکیڈمی کراچی
عثمانی شبیر احمد — فوائد عثمانی حاشیہ ترجمہ قرآن حکیم — مطبع بجنور
محمد ادریس کاندھلوی مولانا — سیرۃ المصطفیٰؐ — مطبع تعلیمی لاہور
محمد ادریس میرٹھی مولانا — سنت کا تشریعی مقام — مکتبہ اسلامیہ کراچی
محمد حمیداللہ ڈاکٹر — رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی — ادارۂ اسلامیات لاہور
〃 — عہدِ نبویؐ کا نظامِ حکمرانی
منصورپوری قاضی سلمان — رحمۃ للعالمینؐ — شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۲ء
ندوی سید سلیمان — سیرۃ النبیؐ — مطبع اعظم گڈھ ۱۳۳۲ھ
〃 — خطبات مدارس — لاہور اکیڈمی لاہور
ندوی معین الدین — تاریخ الاسلام — مکتبہ معارف اعظم گڈھ ۱۹۶۶ء
مودودی ابوالاعلیٰ — اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی — مکتبہ جماعت اسلامی اچھرہ لاہور ۱۹۵۵ء

مودودی ابوالاعلیٰ — اسلامی ریاست — اسلامک پبلیکیشنز لاہور ۱۹۷۲ء

〃 — تفہیمات — مکتبۂ جماعت اسلامی لاہور ۱۹۵۱ء

〃 — تفہیم القرآن — مکتبۂ تعمیرِ انسانیت لاہور ۱۹۵۴ء

〃 — الجہاد فی الاسلام — مکتبۂ جماعت اسلامی لاہور

〃 — سُود — اسلامک پبلیکیشنز لاہور ۱۹۶۷ء

〃 — معاشیاتِ اسلام — 〃 〃 ۱۹۷۰ء

〃 — تذکارِ محمدؐ — ہمدرد اکیڈمی کراچی ۱۹۷۲ء

رسائل وجرائد

چراغِ راہ — اِسلامی قانون نمبر

ترجمان القرآن — منصبِ رسالتؐ نمبر

الاعتصام — حجیت حدیث نمبر

سیارہ ڈائجسٹ — رسولؐ نمبر

W. Montgomery Watt, Mohammad at Mecca, Oxford, 1953.

Richard Bell, The Origin of Islam in its Christian Environments, London, 1926.

Nicholson, A Literacy History of the Arabs (2nd Edn.), Cambridge, 1930.

C.C. Torry, The Jewish foundation of Islam, New York, 1933.

Tor Andrae, The Man and His Faith, London, 1936 (Translated from Swedish).

P.K. Hitti, History of the Arabs.

Sir Hamilton Gibb, Mohammadanism, London, 1949.

Kenneth Cragg, Call of the Minaret, New York and London, 1956.

Sir William Muir, Life of Mohammad.

Joseph Schacht, Origin of Mohammadan Jurisprudence, Oxford, 1950.

W. Montgomery Watt, Mohammad: Prophet and Statesman, Oxford, 1961.

W. Montgomery Watt, Mohammad at Madina.

Maxine Rodison, The Life of Mohammad and the Sociological Problem of the Beginnings of Islam, (English Edition).

W. Montgomery Watt, Islam and the Integration of Society, London, 1961.